مطالب القرآن

فی

دروس القرآن

از غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ

(جلد سوم)

سُورَۃُ البَقَرَۃ

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ○ 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

CamScanner

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ البقرۃ (جلد ۳)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

CS CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
		سورۃ البقرہ جلد سوم
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	فروری 2011ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

سورة البقرة

میں نے اس سورت کے متن کو امعانِ نظر سے پڑھا ہے۔
الحمد اللہ یہ ہر قسم کی اغلاط سے پاک ہے۔
لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ ان کے متن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

قاری عطاء اللہ

حافظ قاری عطاء اللہ

مستند پروف ریڈر، تاج کمپنی لمیٹڈ

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

CS CamScanner

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔

اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ البقرہ (3)

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نوٹ: سورۃ البقرۃ کے سلسلے میں ضروری گزارشات جلد اوّل کے شروع میں تحریر کردی گئی ہیں۔

اکتالیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3)' (آیات 189 تا 195)

مذہب اور دین کا تقابلی جائزہ 1
قرآن حکیم کے نزدیک کوئی مہینہ نہ مقدس ہوتا ہے اور نہ ہی منحوس 3
دین میں بنی نوعِ انسان کی حیات اجتماعیہ کے پیش نظر حج کے
اجتماعات کو ایک مرکزی حیثیت سے پیش کرنا مقصود تھا 4
امت مسلمہ کا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ تاحیات انسانیت کی
خدمت کے فرائض سرانجام دے 4
مذہب کی نگہ چند ایک رسومات کے سلسلہ میں ثواب پر تو ہوتی ہے'
نتائج اور حکمت پر نہیں ہوتی 5
قانون کی غایت و حکمت بتائے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل ہی نہیں ہو سکتے 6
دین کا ماحصل رہبانیت نہیں' پوری انسانیت کی منفعت بخشی ہے 7
دین خداوندی کی اس قدر زیادہ مخالفت کیوں ہوتی رہی ہے؟ 7
ہجرت کے بعد نظام صلوٰۃ کی مخالفت ہی مدینے پر چڑھائی کی حقیقی وجہ تھی 8
قرآن حکیم کا پیش کردہ دین کبھی تلوار کے زور پر نہیں پھیلا 10
قرآن حکیم کے نزدیک فی سبیل اللہ کا اور اللہ کی طرف منسوب
کرنے کا حقیقی مفہوم 10
حضرت صالح علیہ السلام کے عہد میں نظامِ سرمایہ پرستی کی نوعیت و شرائط
کے برعکس قرآن حکیم کے معاشی نظام کے خدوخال اور
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذہنی کیفیت 11
حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے مخالفین کے لیے ایک اونٹنی
کی شرط کا معاملہ و معاہدہ 13
قرآنِ حکیم کے نزدیک ارض اللہ کی حیثیت اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان 13
نظامِ خداوندی کے تحفظ کی خاطر جنگ کی اجازت 13
فی سبیل اللہ جنگ کا مقصد صرف مظلوم کا تحفظ ہی نہیں
بلکہ دوسروں کے مندروں کی حفاظت کرنا بھی ہے 14
مذہبی تعلیم عمر بھر وعظ و نصیحت تک ہی محدود رہتی ہے 15
قرآنِ حکیم کی روشنی میں Defensive War (دفاعی جنگ)
کی اصطلاح کا حقیقی مفہوم 15
قرآن حکیم کے نزدیک فی سبیل اللہ جنگ کی تصریح کا دوسرا پہلو 16
سبیل اللہ جنگ اور طاغوتی جنگ میں بنیادی فرق ہے 17
نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے ایران (کسریٰ) اور روم (قیصر)
ملوکیت کا گٹھ جوڑ تھا 17
نبی اکرم ﷺ کا رومن امپائر اور ایران کی حکومتوں کو پہلے
خط و کتابت کا مقصد طاغوتی نظام کا خاتمہ تھا 18
فی سبیل اللہ جنگ میں دشمن سے بھی انصاف لازم ہے 19
فی سبیل جنگ کے دوران دارالامن میں پناہ حاصل کرنے کی
نوعیت اور اس کا حل 20

فتنے کے ختم ہونے کے وقت تک جنگ جاری رکھنے کی اصل نوعیت اور
ہمارے ہاں پایا جانے والا غلط تصور 21
قرآنی تصورِ رب کے مطابق رب کو رب کہنے والوں کی مخالفت
کرنا بہت بڑا جرم ہے 21
قرآن حکیم کے مطابق ہر شخص کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے دل ودماغ
کی رضامندی سے کس دین کو اپناتا ہے اور سیز فائز کی شرط 22
لڑائی کی صورت میں انسانی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر
شہر الحرام میں حرمت کی ترغیب اور باہمی معاہدہ 23
زندگی بھر خدا تعالیٰ کو اپنے ساتھ رکھنے کا طریق 24

بیالیسواں باب: سورة البقرة (3)، (آیات 196 تا 207)

دین کے برعکس مذہب میں ہر سوال کا جواب صرف آخرت کا
ثواب ہی ہوتا ہے 28
مذہب کے مقابلے میں دین کی سطح پر حج اپنے اندر ایک عظیم
پروگرام کی طرف دعوت دیتا ہے 28
حج کے اجتماعات کے لیے کچھ Formalities (رسومات)
کا بروئے کار لانا ضروری قرار پاتا ہے 29
دین میں محسوس مظاہر کا مقصد نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا ہے 29
حج تو عالمگیر سطح پر ایک ایسی کانفرنس ہے جس کا مقصد انسانیت
کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنا ہے 30
قرآن حکیم کی اصطلاحات کے بدل جانے سے ہماری سوچ
کا رخ ہی بدل گیا ہے 30
اغراض کی ہم آہنگی مفادات کے ٹکراؤ کو ختم کر دیتی ہے 31
حج کے موقعہ پر قربانی کے تصور کی اصل حقیقت اور لفظ ہدیہ کا قرآنی مفہوم 31
حج کے دوران انسانیت کی مرفع الحالی کے اجتماعات میں شریک
رہنے کی خاطر وقت کی اہمیت کو سامنے رکھنا زیادہ ضروری ہوگا 32
حج کی اصل روح کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اس کی
رسومات کو پورا کرنے والوں کے لیے خدا کی گرفت کا نتیجہ 33
ہمارے اس اجتماعِ حج کی دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ 34
حج کے اجتماع کا تعین وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر سال مقرر کیا جائے گا 35
حج کے اجتماع میں حاضر ہونے والوں کو ہر قدم پر ہر حال میں
شائستگی کو ملحوظ رکھنا ہوگا 36
حج کے اجتماعات میں کسی ڈسکشن (بحث ومباحثہ) کے دوران
اپنی رائے کو مجادلے کی شکل میں پیش نہیں کیا جائے گا 37
ہمارے ہاں کے مذہبی تصورات نے تقویٰ کا مفہوم ہی بدل دیا ہے 38
حج عالمی سطح پر عالم انسانیت کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے
کا نام تھا مگر اب یہ نہیں رہا 39
حج کے موقعہ پر الفتح [illegible] والوں کی بے بسی 39
حج کسی رسمی اجتماع کا نام نہیں بلکہ یہ تو ایک عظیم مقصد کے
حصول کا ذریعہ ہے 40
دس ہزار سال تک بابا آدم اور اماں حوا کی جدائی کا ماجرا اور
پھر عرفات میں ملاپ کا قصہ 41
عربی زبان میں لفظ عرفات کے مفہوم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ 41
میدانِ عرفات میں اکٹھے ہونے کے پروگرام کا مقصد نظامِ ربوبیت
کو عملی شکل میں پیش کرنے کی خاطر باہمی مشاورت کرنا مقصد تھا 42
حج کا یہ عظیم اجتماع عہد جاہلیہ کی طرح کوئی میلہ نہیں' یہ عالمی
مسائل کے حل کا مرکز ہے 43
حج کانفرنس سے واپسی کے بعد ذہنوں میں متکبرانہ ذہنیت نہ پیدا کرلو 43
قرآن حکیم کی روشنی میں ذکر کا مفہوم 44
قرآن حکیم نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کے پیش نظر قوانین دے رکھے ہیں 44
قرآن حکیم کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے
قریبی اور مستقبل کے ہردو پہلوؤں کو بیان کرتا ہے 45
قرآن حکیم نے انسانیت کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے 46
کائناتی خزانوں کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں خدا کا قانون

CamScanner

بڑا فراخ دل واقع ہوا ہے 46
قرآن حکیم کے مطابق فطرت کے قوانین اور انسانی زندگی کے
قوانین خدا ہی کے قوانین ہیں' ان سے انحراف جہنم پیدا کرے گا 47
انسانوں کو تمدنی لحاظ سے تین کیٹیگریز میں تقسیم کیا جاسکتا ہے 48
قرآن حکیم کے نزدیک سریع الحساب کا مفہوم 49
حج کے اجتماعات کے دوران وقت کا تعین اور انتظامی امور کی نوعیت 49
حقیقت کے روپ میں باطل کا لبادہ پہننے والوں کا ذکر 50
صحیح راستے کو اپنانے میں پندارِ نفس آڑے آجاتا ہے 52

تینتالیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3)' (آیات 208 تا 214)

سابقہ درس پر نگاہ بازگشت 54
دین کی ماہیت یہ ہے کہ اس میں اجتماعی طور پر پورے کا پورا داخل ہونا ہے 55
دین کا ایک ایک جزو' مشین کے ایک ایک پرزے کی مانند
اپنی اپنی جگہ اہم ہے 55
قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ دین (نظام زندگی)
میں کلی طور پر داخل ہونا ہے 56
دین کے نظام کو عملی طور پر منظم کرنے کا طریق اجتماعی ہے 57
قوانین خداوندی سے ہٹ کر انسان کی اپنی متضاد خیالی کی ایک جھلک 59
دنیا میں سب سے زیادہ خسارے والا عمل جو کبھی ثمر بار نہیں ہوسکتا' کونسا ہے؟ 59
مستقبل کی کامیاب زندگی کا دارومدار حال کی کامیابی پر دلالت کرتا ہے 60
قیمتی سے قیمتی مشین کے پرزے بھی باہمی ربط کے بغیر
کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتے 61
خدا کی طرف سے گرفت کی نوعیت تمہارے تصور کے مطابق نہیں ہے 63
مکافات عمل کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نتائج اور قوم بنی اسرائیل کی مثال 64
قرآن حکیم کے نزدیک کفرانِ نعمت کا انجام کساد بازاری ہوتا ہے 64
ذلت ورسوائی کے عالم میں بُری چیزیں حسین بن کر دکھائی دیتی ہیں 65
جہنمی معاشرے میں دیانتدار کی ہمیشہ تذلیل ہوتی ہے۔ کیوں؟ 66
مذہبی تصورات کے عمل کا سہارا انسان کو مزین دکھائی دیتا ہے۔
یہ ہے اصل مغالطہ 67
القیمۃ کا غیر قرآنی مفہوم' تخریب کاری کی اصل بنیاد اور
اس کو مٹانے کا صحیح طریق 67
قوموں کی موت وحیات کا مدار ہمیشہ اجتماعی نظام سے ہی وابستہ ہوتا ہے 68
حشر اور بغیر حساب کا قرآنی مفہوم 69
انسانی زندگی کی ابتدائی دور کی کیفیت تو اُمت واحدہ کی شکل لیے ہوئی تھی 70
قرآنی حقائق کو خود قرآن حکیم کے آئینہ میں سمجھنے کے طریق کی ایک مثال 70
تنہا عقل انسانی کی مفاد پرستیوں کا نتیجہ ہمیشہ زبوں حالی کی
شکل میں برآمد ہوتا ہے 71
نبی کی ذات انسانی عقل کو وحی کے چراغ سے متعارف کراتی ہے 72
ہمارے ہاں نبی اور رسول میں پایا جانے والا فرق اور قرآن حکیم کا فیصلہ 73
انبیائے کرام کا مقامِ بلند اور فریضۂ حیات 74
فرقے بنانے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد 75
فرقہ بندی کی بنا پر بغداد کی گلیوں میں بہنے والا خون اور
باہمی جنگ وجدل آج بھی بَغْيًا بَيْنَهُمْ (2:213) کے گواہ ہیں 75
اپنی اپنی انا مَنْ يَّشَآءُ اور تفرقہ سے بچنے کا طریق 76
انسان کا زعم باطل زندگی بھر اسے صراطِ مستقیم پر نہیں آنے دیتا 77
جنت کا حصول تو خونِ جگر کی قربانی کا طلب گار ہے 78
جنت کا حصول تو تلوار کے سائے میں جہاد کا بھی متقاضی ہے 79
جنت انسان کو اپنے خون جگر سے ہی حاصل کرنا ہوتی ہے'
یہ کائنات کی طرح مفت نہیں ملتی 80

چوالیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3)' (آیات 215 تا 218)

جنت کو ہمیشہ مال اور جان کے ترازو میں تولا جاتا ہے 82
خدا کے نام پر مملکت قائم کرنے والوں کے لیے ہر فرد کی
ضروریات کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے 83

سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہمیشہ فاضلہ دولت پر استوار ہوتی ہے 83
نظامِ سرمایہ داری انسان کو اگر روٹی دیتا ہے تو غیرت خرید کر دیتا ہے 84
قرآنی نظام کے ابتدائی خدوخال اور اس کے تکمیلی مراحل 85
انسانی برادری میں مغربی اقوام نے فیملی یونٹس کو توڑ کر
بے شمار نفسیاتی بیماریوں کو جنم دیا ہے 86
بچوں کی نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج قرآنی تعلیم میں ہے 86
لفظ احسان کا قرآنی مفہوم اور خدمت میں تحقیر کے جذبے کی ممانعت 87
قرآنی تعلیم کے نزدیک خونی رشتے کی نوعیت اور اطاعت کا مقام 87
معاشرتی طور پر تمدنی زندگی کی ضروریات کے باوجود رشتوں
کے لیے بھی قرآنی آئیڈیالوجی کو ہمیشہ مقدم تصور کرنا ہوتا ہے 88
ازدواجی رشتہ جذباتی یا نسبی بنیادوں کی بجائے آئیڈیالوجی پر اور
چوائس کی بنیاد پر ہی ثمر بار ہوتا ہے 88
گھریلو طور پر ذہنی ہم آہنگی ہی جنتی معاشرے کی بنیاد مہیا کرتی ہے 89
جماعتِ مومنین کا باہمی اشتراک کسی کلب کے ممبران جیسا نہیں ہوتا 90
خالص آئیڈیالوجی کے مقابلے میں خونی رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا 90
جنگ بدر کا معرکہ قرآنی آئیڈیالوجی کے استحکام کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے 91
قرآنِ حکیم کے نزدیک آئیڈیالوجی کے اختلاف کے باوجود
باہمی احترام کے رشتہ کو ختم نہیں کیا جا سکتا 91
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا خلاصہ 92
قرآنِ حکیم کی پیش کردہ آئیڈیالوجی میں ضرورتوں کے تعین کا معاملہ 92
یہودیوں کو ذلیل و خوار قرار دینے والوں کی اپنی حالتِ زار 93
تیرہ سو سال سے قرآنِ حکیم کے ساتھ ہمارا سلوک؟ 93
قرآن کی تعلیم سے قبل عربوں کے ہاں جنگ وجدل کا جذبہ
معرکہ اور اس کی نوعیت 94
قرآنِ حکیم کے نزدیک جہاد کا جذبۂ محرکہ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی 95
عقلِ خود بیں، عقل جہاں بیں کے فرق کو عملی طور پر واضح کرنے
کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدے کا حکم 96
مظلوموں پر ظلم روکنے کی خاطر جنگ کی اجازت اور اس کا نتیجہ 97
مذہبی آزادی کی اہمیت، دین میں جبر اور ارتداد کے قرآنی تصور کی نوعیت 97
مذہبی دنیا میں مرتد کی سزائے قتل کا تجزیہ 98
بغداد کی گلیوں میں مرتد کی سزا میں بہنے والا خون اپنے اندر
ہماری ذہنی پستی کا ایک زندہ ثبوت رکھتا ہے 99
عیدِ قربان کے دن مرتد ہونے والے کو جانور کی جگہ قربان کیا جاتا
تھا اور آج قانونِ شریعت سے کیا کیا جائے؟ 99
ہم نے تو اپنے ہاں مرتد کی سزائے قتل کی قانون سازی پہلے
ہی تیار کر رکھی ہے، تم بس چند دن مزے اڑا لو 100
مذہب کی دنیا انسان کو اس کے اختیار و ارادہ سے محروم کر دیتی ہے 102
ارتداد و اکارتِ اعمال، ہجرت کا مفہوم اور جہاد کی غایت 102
ہجرت کے سلسلے میں صدرِ اوّل کی ایک نادر مثال 104
اس ہجرت کرنے والوں نے اپنی تقدیر کے علاوہ قیصر و کسریٰ
کی تقدیر بھی بدل کر رکھ دی 105

پینتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)، (آیات 219 تا 221)

قرآنِ حکیم کرہ ارض پر ایک نئے نظام کے ساتھ ایک نئی
سوسائٹی کی بنیاد مہیا کرتا ہے 106
قرآنی معاشرے کی تشکیل میں خمر اور میسر کا مفہوم 107
انسانی عقل و شعور اور فہم و فراست کو سب سے زیادہ ڈھانپنے
والی شے انسان کا اپنا خود ساختہ مذہب ہوتا ہے 107
قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیت: عقل و شعور اور فہم و فراست 107
مالی تعاون حاصل کرنے کے لیے مذہب کی تکنیک 108
عقل و شعور کے سلسلہ میں انسانی دماغ کا عمل دخل، اس کا نظام
اور اضطراری عمل کی ماہیت 108
شراب کے نشے میں سرزد ہونے والی حرکات کی نوعیت اور

CamScanner

انسانیت کی نظر میں اس کا مقام 109

قرآنی "میں" اور نطشے کی "میں" میں تقابل وتفاوت 110

تصوف کی دنیا میں پرویزؒ کی "میں" پہچان کروانے کے لیے دی گئی
ایک مثال کا ذکر اور خمر کی نوعیت 111

قرآن حکیم کے نزدیک انسانی نفسیات پر شراب نوشی کے اثرات اور
عیسائیت میں اس کی مقبولیت کے قصے 112

شراب کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے بیان کردہ تدریجی طریق کا ذکر 112

بغیر سوچے سمجھے قرآن حکیم کی تلاوت کے متعلق الفرقان کی
وضاحت اور شراب نوشی کی ممانعت کا ذکر 113

قرآن کریم کے لفظ میسر کی وضاحت اور ہمارے ہاں کے تراجم
نیز لفظ برج کے سہارے کی نوعیت 114

رشوت لینے اور دینے کا ایک دوستانہ کھیل برج، جسے قانونی
طور پر جائز سمجھا جاتا ہے 115

قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بدل کر حرام کو حلال بنالیا 116

قرآنی نظامِ حیات میں سب سے زیادہ مخالفت خمر، میسر اور
چانس کی کی گئی ہے 116

عقل وفکر سے کام لینے کی بجائے فالیں نکلوائی جاتی ہے،
قرعے ڈالے جاتے ہیں 117

عقلِ فریب کار کے تحت خود کو مجرم کی بجائے گناہ گار تصور کرنے
کا نتیجہ اور اِثم کا قرآنی مفہوم 117

شرابی کو اپنے اضمحلال کے علاج کے لیے شراب کی طرف
رجوع کرنا پڑتا ہے تو درماندگی اور بڑھ جاتی ہے 119

نوعِ انسانی کی ہر قسم کی درماندگی اور پس ماندگی کا علاج خمر
اور میسر کے قرآنی علاج میں ہی مضمر ہے 119

اب اس کا کیا کریں؟ انسانی زندگی میں بچی ہوئی دولت
وہ ٹکٹ ہے جو جہانِ فردا کے سفر میں کام آ ہی نہیں سکتا 120

خمر ہو یا میسر یا فاضلہ دولت، یہ تمام چیزیں عقل کو ماؤف کر دینے
والی چیزیں ہیں اور حرام ہیں 121

قرآن حکیم کے مصنف کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس کی یہ کتاب
ہر قسم کی خامیوں سے پاک ہے لیکن یہاں کے فتاویٰ کچھ اور ہیں 121

قرآن حکیم انسان کو حال اور مستقبل یعنی دنیا اور آخرت دونوں
پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے 122

لفظ یتیم کا قرآنی مفہوم یعنی ہر وہ فرد جو بھرے معاشرے میں
خود کو تنہا محسوس کرے، ان کا وارث کون ہوگا؟ 123

لفظ صلح کا قرآنی مفہوم معاشرے کی ناہمواریوں کو مٹانا
اور یتیموں کو بھائی بنانا ہوتا ہے 123

قرآنی معاشرے میں ہر وہ شخص جو تنہا رہ جائے، تمہارا بھائی ہے 124

ہر بڑے پروگرام کی ابتدا ہمیشہ چھوٹے پیمانے سے ہی شروع ہوتی ہے 125

دنیا کے کسی کونے میں، کسی معاشرے کی اگر اصلاح کرنا مقصود ہو تو
اس کی ابتدا اس کے گھر سے کرنا ہوتی ہے 125

کسی گھر کی بنیاد رکھتے وقت پہلے ہی دن مادیت کے ترازو کے
استعمال کی شرط ہی پیش کی جاتی ہے 126

انسانی زندگی میں گھریلو زندگی کی بنیاد ہمیشہ باہمی
تصورات واعتقادات اور مزاج کی رفاقت پر ہے 126

قرآن حکیم نے اپنے ہاں جو کافر، مشرک اور مومن کی
اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ قابلِ صد غور ہیں 127

قرآن حکیم ایک دوسرے کو پسند کرنے کا حق مرد
اور عورت دونوں کو یکساں دیتا ہے 127

چھیالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)، (آیات 222 تا 227)

قرآن حکیم نے عائلی زندگی کی اہمیت کے پیش نظر جذبات
تک کی رہنمائی کے لیے بھی احکام دے رکھے ہیں 129

کسی خاص بات کو بیان کرنے کے لیے قرآن حکیم کا انداز ہمیشہ

CS CamScanner

ایمائیت کا ہوتا ہے 130

افزائش نسل کے سلسلہ میں وہ قرآنی احکام جو بلیغ اشاروں
میں بیان کیے گئے ہیں 132

اختیار وارادہ کی بنا پر انسان کو فطرت کے یہ قوانین خود ہی اپنانے ہوتے ہیں 133

دنیائے انسانیت میں اس سب سے بڑے جنسی فتنے کا علاج
خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے 133

ہمارے ہاں کی خود ساختہ روایات نے قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم
کو کیا سے کیا بنا رکھا ہے؟ 134

حیوانات تو قانون خداوندی کا ادراک کسی اختیار وارادہ کی
بنا پر کرتے ہی نہیں ہیں 134

حیوانی سطح زندگی کی انتہا' اس کے مقصودِ حیات کا ماحصل
اور انسانیت کا مطلوب و مقصود 135

جہالت میں یا غصے کے عالم میں کھائی ہوئی قسم کا انجام اور اس کا حل:
قرآن کریم میں دی گئی ایک مثال 136

قرآن حکیم نے کھائی ہوئی قسموں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے 137

بیوی سے 4 ماہ تک تعلقات منقطع کرنے کی صورت میں عقدِ نکاح
کو ختم کرنا ہوگا 138

جہالت میں بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی 139

بیوی کو ماں کہنے پر قرآن حکیم کی وارننگ اور کفارے کا حکم 140

ناچاکی کی صورت میں طلاق کا فیصلہ کرنا' اس کی نوعیت اور معاشرتی کیفیت 140

آج نکاح کو ختم کرنے یا نہ کرنے کا حق صرف خاوند کو حاصل
ہے بیوی کا کیا قصور؟ 141

مظلوم و بے کس بیوی' طلاق کے حصول کے لیے عدالتوں کے
چکر اور خاوند کی طرف سے اذیت ناک حربے 142

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے عائلی قوانین کی مصالحتی/ ثالثی
بورڈ کی مخالفت کا واویلا 142

قرآن حکیم نے مرد کو عورت پر داروغہ مقرر نہیں کیا بلکہ
اس کا کفیل بنایا ہے: اس پر ملائیت کا اعتراض 143

بلوغت کی شرط پر تمام فرقوں کے علمائے کرام کا بھرپور احتجاج'
اس کی روداد اور عائلی قوانین میں بلوغت کی شرط 144

بلوغت کے سلسلہ میں حضرت عائشہ کے متعلق ایک
وضع کردہ افسانہ اور اس کی حقیقت 145

طلاق کے معاملات کا قرآن حکیم کی روشنی میں پہلا حل
یہ ہے کہ معاشرہ مصالحت کرائے 146

میاں بیوی کے اُلجھے ہوئے معاملے کو حل کرنے کے سلسلہ
میں سربراہِ مملکت کی ذمہ داری: ایک ثالثی بورڈ کا قیام 147

دیگر مذاہب میں میاں بیوی کے ہاں نکاح اور طلاق کی نوعیت 148

قرآنی تعلیم کے پیش نظر کوئی شخص کسی عورت کا زبردستی
مالک نہیں بن سکتا اور عدت کی وجہ جواز 148

باہمی نااتفاقی کی صورت میں حالات کے مطابق فسخ نکاح
کے فیصلوں کی نوعیت اور عدت 149

عدت کے دنوں کے دوران قرآن حکیم کی راہنمائی 150

علیحدگی کے بعد از سر نو ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے کی وضاحت 150

موجودہ شریعت میں حلالہ کا غیر قرآنی تصور 151

تین طلاق کے موجودہ تصور کے برعکس قرآن حکیم کی پیش کردہ وضاحت 151

سنتالیسواں باب: سورة البقرة (3)' (آیات 228 تا 233)

نوعِ انسانی کے لیے اصول و اقدار کے سلسلہ میں
قرآن حکیم کی نوعیت و خصوصیت 154

ازدواجی تعلقات کی اہمیت اور ان کے لیے دیئے گئے احکام 154

طلاق کی صورت میں دیئے گئے متعین اصول و اقدار 155

قرآن حکیم نے بیوہ ہونے کی صورت میں اسے اسی گھر میں
رہنے کو سہولت کے طور پر بیان کیا ہے 157

کوئی مرد کسی عورت کا زبردستی مالک نہیں بن سکتا نیز حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق 157

چار چار شادیوں کے سلسلہ میں قران حکیم کی شرط کا تذکرہ نہ کرنا' قرآن کے خلاف ایک عجیب جسارت ہے 158

دوسری شادی کے سلسلہ میں حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے 159

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کی وضاحت اور نوعیت 160

قرآن حکیم کی روشنی میں طلاق کا طریق کار 162

ہمارے ہاں طلاق پر عمل پیرائی کا طریق نیز ایک غلط فہمی کا ازالہ 162

عورت کو ناکردہ گناہ کی سزا کس لیے؟ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی 164

دومرتبہ طلاق ہونے کے بعد کا سوال؟ 164

باہمی تعلقات کے منقطع ہونے پر بھی حسن کارانہ تعلقات کو نظر انداز نہیں کرنا 165

لفظ زوج کا قرانی مفہوم 166

گھریلو زندگی کو جنتی ماحول عطا کرنے کا طریق 166

عائلی زندگی میں قرآنی قوانین کا اتباع نوع انسانی کے لیے باعث سکون قلب ہے 167

گھریلو زندگی میں' زوجہ کی حیثیت کے بجائے داروغے کا تصور' حکمرانی کی ذہنیت پر مبنی ہے 168

قانون (ضابطہ حیات)' نتائج اور حکمت کا تعلق 169

کیا ہم نے صدیوں سے صلوٰۃ کے اجتماعی نظام کو عملی طور پر نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے؟ 169

صلوٰۃ کے نظام کو صرف نماز کے دکھاوے تک محدود کرنے کا نتیجہ 170

خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی ڈکٹیٹرشپ میں بنیادی فرق 171

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کی بنیادی وجہ غور و فکر کے عمل کو نظر انداز کرنا ہے 172

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر 172

قرآن حکیم کی طرف سے ملنے والے عائلی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ اور تزکیہ نفس کا مروجہ تصور 174

Personality اور مطہر کا قرآنی مفہوم 174

عورت کے لیے رضاعت اور نان ونفقہ کا مسئلہ 175

ازدواجی زندگی میں رضاعت کے لیے قرآنِ حکیم کی وسعتوں کا معیار بیٹھ کر خود طے کرو 176

بچے کے باپ کی وفات کی صورت میں ورثا کی ذمہ داریاں اور رضاعت کا مسئلہ 176

قانون کی پابندی کرنے کا تمام تر دار و مدار اس بنیاد پر ہے کہ اسے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتیجہ مل رہا ہے 177

پاکستان کا وفد چین میں: یہاں چوری نہیں ہوتی لہٰذا تالا ہی نہیں ہوتا 177

چوری کا عمل ''تو میری اور تیری کی تفریق'' سے پیدا ہوتا ہے:

گھریلو زندگی میں چارپائی کی چوری کا تصور بھی کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا 178

انسان کا اپنا نفس اپنی گواہی آپ ہوگا 179

انسانی معاشرے میں امن کا تصور ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا 179

اڑتالیسواں باب: سورة البقرة (3)' (آیات 234 تا 245)

بیوہ کی زندگی میں اس کا اپنا اختیار اور قرآن حکیم کے احکام 181

قرآن حکیم ہمیشہ انسانی عمل کو پیش نظر رکھتا ہے جس کی بنیاد انسانی ارادے پر ہوتی ہے۔ 181

حسن عمل کو اپنی عادت بنالینے کا احسن طریق مکافات عمل کی حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہے 182

قوانین پر Mechanical عمل پیرائی انسان کو جنتی ماحول سے آشنا کرا ہی نہیں سکتی 182

بیوہ کے ساتھ نکاح کا معاملہ' اس کی نوعیت اور وضاحت 182

قرانِ حکیم عورت کی بے بسی کے عالم میں اس کے
جذبات کوExploit کرنے کی اجازت نہیں دیتا 183
لفظ حلیم کا قرانی مفہوم 184
نکاح کے بعد باہمی رابطے سے پہلے فسخ نکاح کی صورت
میں قرآنی راہنمائی 185
قرانِ حکیم نے جن جن جزئیات کو متعین نہیں کیا اس کی وجہ جواز 186
نکاح کے فوری بعد طلاق کی صورت میں حق مہر کی ادائیگی کا معاملہ 186
طلاق کی شکل میں ہر دو فریقین کے حقوق کے متعلق عدالتی فیصلہ ہوتا ہے 187
اپنے باہمی معاملات کو حُسن کارانہ حد تک رکھنے کے بجائے
جذباتِ انتقام کے شعلوں کو ہوا نہ دو 189
عائلی قوانین کی اس قدر وضاحت کے دوران ہی صلوٰۃ کے
ذکر کی مختلف تفاسیر کیوں؟ 189
تصریف آیات کی افادیت کے تحت لفظ صلوٰۃ کا مفہوم متعین
کرنے کا طریق اور اس کی اہمیت 190
خارجی کائنات میں صلوٰۃ پر متواتر عمل پیرا ہونے کی
کیفیت اور چڑے چڑیا کی ایک مثال 191
تسبیح کا لغوی مفہوم اور اس پر پوری کائنات کا عملی مظاہرہ 192
قرانِ حکیم کے الفاظ ہر جگہ ایک ہی مفہوم ادا نہیں کرتے 193
ہمارے ہاں لفظ صلوٰۃ کا کیا جانے والا ترجمہ ہر جگہ نماز ہی ہے 193
لفظ صلوات کا بنیادی اور مرکزی مفہوم فرضِ منصبی کی محافظت
کے لیے اطاعت گزار ہونا ہے 193
لفظ 'قٰنِتِیْنَ' کے حقیقی مفہوم کی اہمیت اور افادیت 194
مومن کا فریضہ تخلیق ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار پر غور و فکر کرنا ہے 195
لفظ ذکر کا قرآنی مفہوم اور ذکر کرنے والوں کی کیفیت 196
ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی اس کتاب کا مقام کیا ہے؟ اور خدا کیا کہتا ہے؟ 196
قرانِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ کائنات کے ایک ایک ذرے کی
طرح ایک مالا کی شکل میں پیش کیا گیا ہے 197
انسان کی اپنی مشرکانہ زندگی قرانی تعلیم کو بے ربط بنا دیتی ہے 198
قرآنِ حکیم کو بے ربط کہنے والوں نے ملت اسلامیہ کی زندگی
کو صدیوں سے بے ربط بنا رکھا ہے 198
انسان کو اس کی یہ صلاحیتیں اور توانائیاں اسے معراج کمال
تک پہنچنے کے لیے عطا کی ہیں 198
خدائے رحیم کسی انسان کو بھی بے سہارا ہوتے نہیں دیکھ سکتا 199
عدل کے بعد فضل کا حکم اطاعت کی شکل میں تسلیم کرنا ہوتا ہے 199
جنت کا حصول اور اس کے نظارے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے
بغیر دکھائی نہیں دے سکتے 200
قرآنی تعلیم کے مطابق گھریلو زندگی کا سکون ہی جنگ میں
فتح کا باعث بنتا ہے 201
موت سے ڈرنے والی قوم جہاد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی 201
موت تو آتی ہی اسے ہے جو موت سے ڈرتا ہے 202
قرآن حکیم کی آئیڈیالوجی یہ ہے کہ موت جسم کو آتی ہے زندگی کو نہیں آتی 203
خدا تعالیٰ کی ذات بڑی بلند ظرف ہے 203
جہاد کا فلسفہ دوسروں پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ عالم گیر سطح پر ظلم کو مٹانا ہے 204
خدا کو قرض دینے کا مفہوم 206
ہمارے ہاں قرض حسنہ کی نوعیت: واپسی کے تصور سے لاتعلق 206
وہ قوم جو خدا کو قرض حسنہ نہیں دیتی وہ آخر کار تباہ ہو جاتی ہے 207
انچاسواں باب: **سورة البقرة** (3) '(آیات 246 تا 247)
جنّت حاصل کرنے والوں کی عملی زندگی کی کیفیت اور
ان کی تگ و تاز کی نوعیت 208
مرتا وہ ہے جسے جہانِ فردا کی زندگی پہ یقین نہیں ہوتا 209
مترفین کی ذہنیت' جنگ اور ضابطہ خداوندی کا تعلق 209
روزوں کی طرح قرآن حکیم کی پوری امت پر جہاد کو فرض

CamScanner

قرار دینے اور اُس پر عمل کرنے کی نوعیت 210

قرآن حکیم نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والوں کو ظالمین کہہ کر پکارا ہے 211

قرآن حکیم میں فوج کے کمانڈر کو مخاطب کرتے ہوئے علیکم کی بجائے لکم کے لفظ کا استعمال کیوں؟ 212

ابلیس وآدم کی داستان انسانی نفسیات کی ترجمان ہے: بلند منصب کا حقدار صاحبِ دولت ہے 213

وراثت میں ملنے والی مفت کی دولت سے انسان کی زندگی کا رُخ تباہی کی طرف مڑ جاتا ہے 213

انسانی معیار کے مقابلے میں وحی کا عطا کردہ معیار' لفظ بسطۃً تین صفات کا حامل ہوتا ہے 214

مَنْ یشآءُ والا تصورِ خدا جو ہمارے ہاں کے تراجم میں صدیوں سے رائج چلا آرہا ہے اور اس کے مضمرات 214

انسانی اختیار وارادے کی صفات کے برعکس عقیدہ جبر' مجوسیت کا رہین منت اور ملوکیت کا بانی ہے 215

قرآن حکیم تو اپنے ہر حکم کے ساتھ اس کی حکمت بھی بیان کرتا ہے 216

مَن یَّشَآءُ کے قرآنی اور مروجہ مفہوم میں تضاد ہے 217

قرآن حکیم اپنے ہر حکم کی تشریح خود اپنے آئینہ میں پیش کر دیتا ہے 218

ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی ایک صفت المضل بتائی جاتی ہے جس سے تضادات ابھرتے ہیں 220

اگر خدا ہی انسان کو گمراہ کرتا ہے تو پھر اسے سزا کس جرم کی؟ 221

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو چیستان بنانے کا نتیجہ عالم اسلام کی ذلت وخواری اور انسانیت کی تباہی کا ایک زندہ ثبوت ہے 221

انسان کے پاس اختیار وارادہ ہی ہے جس کا وہ غلط استعمال کرتا ہے 222

کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں خدا کے قانون کے مطابق نتائج نہ نکلتے ہوں 222

قرآنی فکر کو سب سے زیادہ نقصان عقیدۂ تقدیر یعنی جبر کے تصور نے پہنچایا ہے 224

ہمارے ہاں اپنے اعمال کے نتائج کو خدا کی مرضی کے پردوں میں ڈھانپ دیا جاتا ہے جو کہ شرک ہے 224

کسی انسان کے پاس ان باطل نظریات کی کوئی دلیل نہیں ہے 225

خدا کی طرف سے لکھی گئی کسی بات سے بچنے کی کوشش کا عمل خدا کے خلاف جنگ ہے: عقیدۂ تقدیر کے مضمرات 225

انسانی بدعملیوں سے بچنے کا طریق اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے میں ہے 226

قصہ ابلیس وآدم کی حقیقت اور اس سے سبق آموزی کی کیفیت 226

آپ ملوکیت میں کسی بادشاہ کے حکم کی حکمت نہیں پوچھ سکتے' بس اس کی تعمیل کرنا ہے 227

کسی سے قانون کی اطاعت کروانے کا ملکہ کیسے حاصل ہوتا ہے 228

قانون کی اطاعت کرنے والے کے دل ودماغ کی کیفیت 228

مستبد کے حکم کی اطاعت اور قانون کے تقاضے پر عمل میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ خدا اپنے قوانین کو بدلتا نہیں ہے 228

کسی انسان کی بجائے قرآنِ حکیم کی طرف سے قانون کی اطاعت نوعِ انسانی کے لیے ایک آیہ رحمت ہے: بریرہ کی ایک مثال 229

نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اور آزادیِ رائے کا احترام 231

پچاسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 248 تا 252)

حضرت طالوت اور جالوت کے مابین جنگ کے دوران قوم کا اعتراض اور انتخابِ کماندار کے لیے وحی کا معیار 233

تابوت سکینہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم اور تورات کا بیان 235

عربی زبان کی وسعت' اس کی خصوصیت اور پھر اس سے قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق 235

تابوت کو صندوق کے علاوہ قلب بھی کہا جاتا ہے اور سکینت کو تسکین بھی 236

انسانی ذات کے لیے سب سے بڑی دولت تو اس کا سکونِ قلب ہے 236

CamScanner

آیت تو ایک حقیقت کو سامنے لانے کا ذریعہ ہوتی ہے 237
ایمان کی پہلی اسٹیج وہ علامات ہیں جو اوجھل حقائق کی ترجمان
ہوتی ہیں اور اس کے لیے تربیت ایک لازمی عنصر ہے 237
ڈسپلن کا عادی بنانے کے لیے روزے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں 238
ایک چمکتی ہوئی حدیث جو مومن کی زندگی کی ترجمان ہے:
ڈسپلن کی تربیت 239
لفظ ابتلا کا مروجہ اور قرآنی مفہوم 240
ہمارے ہاں ہمیشہ عقائد پر بحث تو ہوتی ہے عمل پر نہیں ہوتی 241
نبی اکرمؐ کا امتی ہونے کے لیے امتی کی شرائط کو پورا کرنا
ضروری ہے: طالوت کے لشکر کی ایک مثال 241
بنی اسرائیل کی ذلت و مسکنت کیوں؟ 242
تمام قسم کی معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی برائیوں کی وجہ
خدا کے حضور پیش ہونے سے انکار ہے: ذمہ داری نہیں ہے 242
قرآن حکیم کے حقائق کو عملی طور پر سچ کر دکھانے والی میدان بدر کی مثال 243
ہمارے ہاں کے غلط تراجم میں قرآنی تعلیم کو چیستان بنا دینے
کی بنیادی وجہ "من یشاء" کے متعلق غلط سوچ ہے 243
تصورات کی از سر نو ترکیب و تشکیل اور قانون کی ماہیت و نوعیت 244
قانون کا اطلاق: اس سلسلہ میں انسانی تجربات کی ایک جھلک 245
قانونِ خداوندی کے محکم ہونے کے لوازمات 245
کائنات میں Chance (اتفاق) کی نوعیت اور Cause and
Effect (علت و معلول) کے عمل دخل کی اہمیت 246
کائنات کی تمام قوتیں انسان کے سامنے سر تسلیم خم ہیں، ضرورت صرف
ان کا علم حاصل کرنے کی ہے اور یہ صلاحیت انسان میں موجود ہے 247
ہمارا ملک ہر معاملے میں لنڈا بازار اس لیے ہے کہ ہم نے کائناتی
قوتوں کو سرنگوں کرنے کا علم حاصل نہیں کیا 248
موسمیات کو مسخر کرنے والی قوموں نے بادلوں کو اپنے تابع
تسخیر کر رکھا ہے انہوں نے "اذن" کا مفہوم سمجھ لیا ہے 249
اذنِ خداوندی ایک اہم موضوع ہے جس پر دورِ حاضر کی موجودہ
علمی سطح پر غور و فکر کرنا ضروری ہے 250
باذن اللہ یہ ہے کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے ہمیشہ مشتبہ حالت میں زندگی بسر
کرتے ہیں: ان کی مصیبت ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے 251
خدا کا قانون تو انسان کو اس کے نقصان و نفع سے واضح کر دیتا ہے 252
جنگ اُحد کا واقعہ خدا کے باذن اللہ کی وضاحت کے لیے کافی ہے 252
صدیوں سے اُلجھے ہوئے غلط تصورات کو مٹانا کوئی آسان نہیں ہوتا 253
صبر کے سلسلہ میں پھر ایک اور اُلجھن اور پھر اس کا صحیح مفہوم 253
خدا کا ساتھ ہونے کا عملی مفہوم: فارس کے گورنر کی زبانی 254
میدان جنگ میں استقامت کے لیے دعا کے الفاظ آرزو بن
کر زبان پر آ جاتے ہیں 255
اگر خدا انسانوں کی حفاظت انسانوں کے ذریعے کرانے کا
انتظام نہ کرتا تو دنیا میں کسی کی عبادت گاہ محفوظ نہ رہتی 256
اکیاونواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3)، (253)
رسولوں کے مابین باہمی منصب سے ہٹ کر ان کے دائرہ تعلیم،
دائرہ اثر و نفوذ اور ان کی انقلابی جدوجہد میں فرق کی نوعیت 258
تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے شرط اول ہے 259
قرآنی تعلیم کے برعکس ہماری حالت اور کافر گری 260
نبوت اور رسالت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں 261
وحی کی حقیقت اور علمِ انسانی میں فرق 262
قدرت وحی عطا کرنے کے لیے انسانوں میں سے ایک شخصیت
کا چناؤ کرتی تھی 263
نبی کے علاوہ کوئی بھی انسان وحی کی ماہیت کو جان ہی نہیں سکتا 264
مقام نبوت انسانیت کے سلسلہ ارتقا کی اُونچی سطح ہوتی ہے، اس کی
ماہیت نہیں سمجھی جا سکتی 264

CamScanner

نبی کے علاوہ خدا کی ذات انسان کی طرف وحی نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے ہم کلام ہوتی ہے 265
جبریل اور روح القدس کا مفہوم 266
وحی کے لفظ کے ساتھ نزول کے لفظ کی ایک خاص خصوصیت 266
وحی کے تین طریق: پہلا طریق وحی قلب نبوی پر نازل ہوئی 267
دوسرا طریق: موسیٰؑ سے ہم کلامی کے سلسلہ میں آواز آنے کا 267
تیسرا طریق: قرآن حکیم کے ذریعے جسے کلام اللہ کہا گیا ہے 268
قران حکیم کی بنیادی خصوصیات 269
قرآنی تعلیم کے برعکس وحی کی دو قسموں کا غلط عقیدہ یہودیوں کی اختراع ہے 269
نبوت کی مہر کو توڑنے کے لیے تصوف کا عقیدۂ کشف والہام کی نوعیت 270
ایک غور طلب مسئلہ جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہا ہے 271
عیسائیوں کے ہاں کے پیدا کردہ خانقاہی تصور کی آبیاری کا نتیجہ 271
کسی فارمولے سے آگاہی کا حصول ہمیشہ انسانی قوت میں اضافے کا باعث بنتا ہے 272
نبوت کے بعد ذات خداوندی سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا دعویٰ فریب کے سوا کچھ اور نہیں 273
وحی کی عطا کردہ راہنمائی کے باعث نوع انسانی ہر قسم کی بوجھل سلوں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے 273
شخصیت پرست قوم آزادی کی نعمت سے کبھی ہم کنار نہیں ہو سکتی 274
عیسائیت کے زوال کی بنیادی وجہ اور مختلف قوموں میں ایک آنے والے کے تصور کی نوعیت اور اس کا انجام 274
وحی کی تلوار اور تنہا عقل انسانی کی تلوار میں بنیادی فرق آزادی اور محرومی کا فرق ہے 275
اللہ تعالیٰ نے انسان سے ہم کلامی کا اختیار صرف اپنے پاس ہی رکھا ہے اور یہ کسی انسان کو عطا نہیں کیا 276
ہمارے ہاں کے خود ساختہ مذہبی تصورات نے ہمیں محکومیت کی اندھیری رات میں دھکیل دیا ہے: اُقنومِ ثلاثہ کا تصور 276
قرآن حکیم نے روح القدس جبریل کے بھی استعمال کیا ہے 277
قرآنی احکام کے باوجود مسلمانوں کے مابین قتل وغارت کی نوعیت: آزادی کا Retain کرنا ہے 278
اختیار وارادے کی بنا پر بیّنات کے ذریعے حق کو تسلیم کرنا ہی شرفِ انسانیت ہے ورنہ جھگڑے دامن گیر ہوتے ہیں 278
معاشرتی سطح پر زندگی کو سنوارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ایک قرآنی اصول: غیر متوازن نہ ہوں 279
اس پوری کائنات میں صرف انسان کو ہی اختیار وارادہ دینا چہ معنی دارد؟ 280
تخلیق کائنات کے سلسلہ میں کائنات کی ہر شے اپنے اندر ایک پروگرام لیے ہوئے ہے 280
انسان کی عظمت انسان کے اختیار وارادے سے ہی وابستہ ہے 281

باونواں باب: **سورة البقرة** (3) '(آیات 254 تا 255)

جنت کے حصول کا طریق کار: مال ودولت کو کھلا رکھنا اور جان کو پیش کرنا 282
قرآن حکیم کے ہاں لفظ رزق کے علاوہ لفظ دولت کے مفہوم کو بھی بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے 283
دولت خرچ کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ کھلا رکھنے کے لیے ہوتی ہے 284
مکافاتِ عمل کا بنیادی مفہوم اور قوموں کی زندگی پر اس کا اثر 285
کسی نقصان کے خطرے سے پہلے اس کے بچاؤ کی خاطر کچھ اسباب کے مہیا کرنے کو کفارہ کہتے ہیں 285
شفاعت کے مسئلہ کی حقیقت اور درس کا مفہوم 287
خدا کی رحمت' خدا کے بنائے ہوئے قانون کی بنیاد پر ہی ہر شخص کے لیے ظہور پذیر ہوتی ہے 288
ہماری خود ساختہ شریعت وملوکیت کو قانون راس ہی نہیں آتا 288
مقربینِ بارگاہِ الٰہی خدا تک براہِ راست رسائی کے حامل سمجھے

CamScanner

جاتے ہیں	289
نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے قرآنِ حکیم کا ارشادِ عظیم	289
شفاعت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں پائے جانے والے	
غیر قرآنی تصورات کی نوعیت	290
ہمارے ہاں پائی جانے والی قانون شکنی کی وجہ جواز	291
ہمارے ہاں شفاعت کا عقیدہ اور پھر اس پر شاعری کی بھرمار	291
قران حکیم نے زندگی کے اصول دیئے ہیں اس نے شاعری نہیں کی	291
لفظ شفاعت کا قرآنی مفہوم بطورِ شہادت استعمال ہوا ہے	292
قرآن حکیم اپنے ہاں میدان حشر کے منظر کو بات سمجھانے کے	
انداز میں پیش کرتا ہے	293
قرآن کریم کی پیش کردہ تعلیم کے اندر اپنی سوچ کا دخل شرکِ عظیم ہے	294
روزِ قیامت ہر رسول سے اس کی قوم کے متعلق شہادت طلب کی جائے گی	295
نبی اکرمؐ کی اُمت کا فریضہ تھا جو اسے ادا کرنا تھا	296
قرآن نے ہر جگہ شفاعت کو سفارش کے معنی میں پیش کرنے کی تردید کی ہے	296
قرآن حکیم انسانی جذبات کے تابع زندگی کے اصول پیش نہیں کرتا	297
جس نظام میں قانون خداوندی کا اتباع نہ ہو تو وہاں پھر ہر چیز ممکن ہوتی ہے	297
خدا کے حقیقی تصور کے سلسلہ میں ایت الکرسی کی اہمیت اور	
ہمارے ہاں اس کا مقام	298
قانون کی پاسداری سے ہی انسان کی شخصیت کا مقام متعین ہوتا ہے	299
الحی القیوم کی وہ ہستی کہ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا لیکن	
ہر شے کا خالق ہے	300
کائنات کے حسنِ نظم و نسق میں ذی اقتدار ہستی کا کردار:	
نہ اونگھ نہ نیند، ہر شے پروگرام میں مشغول	300
ہمارے ہاں کے تراجم میں لفظ یشفع کے استعمال کی نوعیت	
تو عجیب و غریب ہے	303
قرآنی نظام کے تمام خدوخال دو الفاظ میں ملاحظہ کریں	303
وحی کے علم اور انسانی علم میں لامنتہا فرق کی ایک مثال	304
قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے تراجم میں عرش، تخت اور کرسی	
کے غلط معانی لیے جاتے ہیں	304
قرآن حکیم کی روشنی میں خدا کے صحیح تصور کی نوعیت کی اہمیت	
اور اس کو سمجھنے کا ماحصل	305
ترپنواں باب: سورۃ البقرۃ (3)، (256)	
کائنات اور دین میں ربط باہم	307
خارجی کائنات کی اس قدر وسعت کے اندر حضرت انسان کے	
لیے اختیار و ارادے کی نعمت اور اس کی افادیت	308
قصہ ابلیس و آدم کی اصل لم جسے ایک تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے	308
خیر و شر کا آخری فیصلہ وحی کے بغیر ممکن ہی نہ تھا اور نہ ہے	309
عقل و فکر کو ماؤف کرنے کے بعد کسی بات کو تسلیم کروالینا اکراہ	
کی بدترین قسم ہے	310
ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کے مفہوم کو بدل کر قرآن حکیم کی	
پوری تعلیم کو ہی بدل دیا گیا ہے	311
قران حکیم کا پروگرام نوعِ انسانی کو اختیار و ارادہ اور عقل و فکر	
کی دولت سے نوازتا ہے	312
ہمارے ہاں تو معجزوں پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہوئی ہیں	313
شق القمر کے سلسلہ میں بیان کردہ روایات کی ایک جھلک اور	
دیگر اجرام فلک کے متعلق ہمارے تصورات	313
زمین کو گول کہنے پر گیلیلیو کا، اور اس کے گردش میں رہنے پر	
کوپرنیکس جیسی شخصیت کا حشر	314
چاند پر جانے والے راکٹ کے مسافروں سے اہلِ زمین کا	
حیرت انگیز حد تک رابطہ	315
15 ویں اور 16 ویں صدی عیسوی میں اہلِ مغرب کی ذہنی	
و علمی سطح اور مہیب آسمانی کرّے	316

CamScanner

قرانی حقائق بذات خود ایک معجزہ ہیں 317
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے 317
حضورؐ کی اپنی ساری زندگی ایک بہت بڑا معجزہ ہے 318
حضورؐ کے بیٹے کی وفات پر سورج کو گرہن لگا تو کہا کہ گرہن کا یہ واقعہ
قانونِ طبیعات کے مطابق تھا اس کا موت وحیات سے کوئی تعلق نہیں 319
نبی اکرمؐ نے انسانوں کی عقل کو ماؤف کرنے کی بجائے انسانی
شعور کو قدم قدم پر جلا بخشی ہے 320
کسی انسان کو ایمان لانے سے پہلے ذہن کے اندر اپنے
سینکڑوں بتوں کو نکالنا پڑتا ہے 322
ہر اس گھر میں شیطان کا بسیرا ہوتا جہاں خدا نہ ہو 323
لفظ طاغوت کا مفہوم اپنے اندر ہمیشہ طغیانی اور سرکشی کے
اثرات لیے ہوئے ہوتا ہے 323

چوّن واں باب: سورة البقرة (3)' (257 تا 259)

لغت میں طاغوت کا لفظ مذہبی پیشوائیت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے 325
''ولی'' کا قرآنی مفہوم نیز یہ کہ اولیاء اللہ کوئی الگ گروہ نہیں ہے 326
قرآن کریم نے روشنی کے لیے واحد کا اور ظلمات کے لیے جمع
کے صیغے کیوں استعمال کیے ہیں 326
دنیا بھر میں تباہ حال تمدنی زندگی کی وجہ جواز 327
تکذیب کا قرآنی مفہوم، خدا کی طرف سے عقل و فکر اور استبداد کی اشکال 327
خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو قانون دے کر بھیجنے کا مقصد نیز
آزادی اور غلامی کا قرآنی مفہوم 328
قرآنی اقدار کے تحت اگر کسی کے پاس علم، عقل، فہم اور ادراک
اختیار وارادہ ہے تو نور ہے ورنہ تاریکی 329
انسانی عقل کے پاس اگر وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ عقل اندھی ہوتی ہے 329
انسانیت کے لیے سب سے بڑی تاریکی مذہبی پیشوائیت کی
پیدا کردہ ہوتی ہے 330
تقلید پرستی کی پٹی عقل وشعور اور فہم وفراست کو مفلوج کر دیتی ہے 330
ذکر فرشتوں کے درود وصلوٰۃ کا' اور اس کا کہ ''ہم جانتے ہیں
جو تم نہیں جانتے'' 331
تسخیر کائنات کے سلسلہ میں آدم کی تخلیق کا وہ مقصد جس کا علم
فرشتوں کو بھی نہ تھا: تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانا 332
قرآن حکیم کی روشنی انسانی عقل کو ہر قسم کے خطرات سے آگاہ
کر دیتی ہے اور اگر عقل روشنی سے تاریکیوں میں لے جائے تو؟ 332
قرآن حکیم، جیسی عظیم روشن، مکمل، غیر متبدل اور ہمیشہ کے لیے محفوظ
ضابطہ حیات کی نعمت کے ساتھ ہمارا ناگفتہ بہ سلوک: مدد کون کرے؟ 333
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ روشنی سے محروم قوموں کی
داستان، حضرت ابراہیمؑ کی مثال 334
انسانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، قدرت نے ہر ایک کے لیے
قوانین واقدار مقرر کر رکھی ہیں لیکن امر کی فکر کچھ اور ہوتی ہے 335
کسی نبی یا رسول کی دعوت کا طریق مباحثوں یا مناظروں کی
شکل اختیار نہیں کرتا: اس کی نظر احقاقِ حق پر ہوتی ہے 336
حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے ایک بنیادی مطالبہ کہ بنی اسرائیل
کو ہمارے ساتھ جانے دو: پھر فرعون حکومت کس پہ کرے؟ 336
فرعون کا مطالبہ کہ بتاؤ اسلاف اور بزرگ کس حال میں ہیں:
ایک مذہبی اشتعال 337
ہم مسلمان صدیوں سے علم کلام کی لاحاصل بحثوں میں
اُلجھے چلے آرہے ہیں: فرعون نے بھی اسی میں الجھانا چاہا 337
نظری مسائل میں حقائق او جھل ہو جاتے ہیں: کائنات میں
کس کا اقتدار اعلیٰ ہے؟ 338
مقام آدمیت کے بعد مقام انسانیت صرف تسخیر کائنات سے حاصل
نہیں ہوتا: لہٰذا تمدنی اور خارجی کائنات میں تضاد کیوں؟ 339
نوع انسانی کی اس قدر زبوں حالی کا علاج صرف وحی کی راہنمائی

سے ہی حاصل ہوسکتا ہے: اب ایک اور الجھن 340
داستان بنی اسرائیل بخت نصر کے حملے سے الم انگیز ہے 341
قوم مردہ میں دوبارہ زندگی کے آثار کیونکر پیدا ہوتے ہیں 342
فکر قرآنی تباہ حال سے تباہ حال قوم کو بھی مایوس نہیں ہونے دیتی 343
از سر نو زندگی کی نعمت کے حصول کا طریق کار: اجڑی ہوئی بستی کی ایک مثال 344
رحم مادر میں ایک جنین کی جیتی جاگتی زندگی: ایک دوسری مثال 344
ذات خداوندی نے ہر شے کے لیے اقدار، اصول اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اب بات ان پر عمل کرنے کی ہے 345
ہمارے ہاں اتباع سنت کے وسیع تر مفہوم کو محدود تر کر دیا گیا ہے 345

پچپن واں باب: سورۃ البقرۃ (3) ' (آیت 260)

پچھلے درس کی صدائے بازگشت 347
مردوں کو زندہ کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خدا تعالیٰ سے کیے گئے سوالات و جوابات 348
اصل بات پرندوں کو اپنے پاس بلانے اور پھر انہیں سدھانے کی ہے نہ کہ ان کا قیمہ کرنے کی: ایک الجھن 349
قرآن حکیم کو سمجھنے کے سلسلے میں اصل دشواری 350
روایات کو اکٹھا کرنے کے طریق کی وضاحت اور نوعیت 350
حضرت ابرہیمؑ کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے بیان کردہ ایک روایت اور اس کے مضمرات 351
پرندوں کو پکڑ کر انہیں ذبح کرنے اور پھر ان کا قیمہ کرنے کا ذکر قرآن حکیم میں کہیں نہیں ہے 352
تصریف آیات کی بنا پر قرآن حکیم میں موت و حیات کا مفہوم 352
ہر وہ قوم اور ہر وہ فرد جس کے ہاتھ میں وحی کا چراغ نہ ہو وہ اندھا ہے، وہ مردہ ہے 353
مُردہ قوم جو وحی کا سہارا حاصل نہیں کرتی، پھر زندگی بھر وہ اپنا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی رہتی ہے 353
زندگی کی سرفرازیاں صرف تارِ نفس میں اسیر رہنے سے حاصل نہیں ہوتیں 354
نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد نوع انسانی کو انسانیت کی منزل سے روشناس کرانا تھا اور ہے 354
معراج انسانیت کے بلند ترین مقام پر جلوہ فروز شخصیت ﷺ کے کردار اور آپ ﷺ کے صبر و استقلال کی ایک جھلک 355
اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کا فریضۂ حیات اور مخالفت کی انتہا اور پھر قوم کی ذہنی سطح کا ماجرا 356
ناگفتہ بہ حالت میں خدائے علیم سے حضرت ابراہیمؑ کا استفسار 356
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ چار پرندوں کی مثال ہر مردہ قوم کے لیے باعث تقلید ہے۔ 357
لفظ صُرْهُنَّ کا مفہوم سدھانا ہوتا ہے 359
قوموں کے سدھانے کے لیے محض قانون کی گرفت کافی نہیں ہوتی 359
نبی اکرم ﷺ کے حسنِ سلوک کی گواہی تو قرآن حکیم نے خود دے رکھی ہے 360
دنیا بھر کی قوموں کے لیے تمدنی اصلاح کا ایک غیر متبدل اصول: Affection (پیار و مؤدت) دیئے چلے جایئے 360
قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنے کا طریق 361
کسی معلم، مرشد یا صاحبِ طریقت کی مجلس کی نوعیت 361
مُردوں کے اندر زندگی کی روح پھونکنے کا ایک نادر اصول اور ایک نادر پیمانہ 362
احترام آدمیت سے عاری عقلوں میں انسانوں کی نفسیاتی کیفیت 362
استبدادی قوتوں کے زخم خوردہ سب سے پہلے احکامِ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں 363
بڑے بڑوں کی وہ فرعونی کیفیت جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے 363
صاحب ضرب کلیم کو فرعون کے ساتھ حسن کارانہ انداز سے پیش آنے کی ہدایت 364
نوع انسانی کی حد تک مقامِ نبوت کی ذمہ داریاں کہ دھتکارو نہیں:

CamScanner

کیوں؟ 365
مقامِ نبوت' برداشت' استقامت' بردباری' بلند ظرفی' اور
بلند نگہی کے اعلیٰ ترین مقام پر جلوہ افروز ہوتا ہے 365
عیسائیت کے نام پر خود ساختہ تعلیم اور اس کا عملی نتیجہ 366
وحی کے پیش کردہ حقائق کو کسی صورت بھی تسلیم نہ کرنے والوں
سے حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جانا ہوتا ہے 366
خدا تعالیٰ کی رحمانیت انسانوں کی بد عملی کو اپنے ضابطہ کے
مطابق آخری وقت تک نظر انداز کرتی ہے 367
اسوہ ابراہیمی u کی ایک جھلک 367
ہجرت کے باوجود مخالفین کی یلغار اور نبی اکرم ﷺ کی طرف
سے اس کا ردِ عمل 368
نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے برعکس ہماری بد عملی کی ایک مثال 369
سورۃ عبس میں ایک اندھے صحابی کے واقعہ کی نوعیت اور
اسکی اصل حقیقت 370
انسانی زندگی کا سرمایہ حیات انسان سے نفرت کی بجائے اسکے
جرم سے نفرت میں ہے 371
انسان کی محبت انسان کو زندگی عطا کرنے کا موجب بنتی ہے 371
چھپنواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 261 تا 265)
قرآن حکیم کی طرف سے قوموں میں حیات تازہ کی نمود کے لیے
ایک نسخہ کیمیا کا ذکر 373
جہانِ نو کے لیے ایک جماعت کی ناگزیر تشکیل اور اس کے ثمرات 374
داعیٔ انقلاب اور بعد ازاں اس کی جماعت کے لیے معاشی نظام کی اہمیت 374
قرآنی نظامِ حیات کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے کھیتی کی
مثال پیش کی جاتی ہے 375
ان دیکھے نتائج پر کسان کی بھرپور محنت اپنے اندر ایک عظیم
سبق لیے ہوئے ہے 375
ملائکہ کا نزول تو خدا تعالیٰ کے احکامات کی دل و جاں سے
پیروی کے ساتھ مشروط ہے 376
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا 377
خدا تعالیٰ کے ہاں میزانِ عدل کا دستور 378
خارجی کائنات کی مانند قرآن حکیم اپنے معاشی نظام کو بھی
قدم بہ قدم آگے سے آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے 378
معاشی نظام کے سلسلہ میں قل العفو تو قرآن حکیم کی آخری منزل ہے 379
قرآن حکیم کی تعلیم اور اس کے نظام کو 23 سال میں مکمل کرنا بھی
ایک حکمت ہے 379
خیرات اور صدقات قرآن کے معاشی نظام کی ابتدائی
ترجیحات میں سے ہیں 380
خیرات کے چند ٹکڑوں کا نتیجہ: ایک وقت کی روٹی' عمر بھر کی غلامی 380
گداگروں کا وجود ہی دولت مندوں کیلیے ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے 381
مملکتِ اسلامیہ کی پیشانی پر جلی حروف سے لکھی جانے والی ایک عبارت 381
معاشرتی زندگی میں باہمی رفاقت کے متعلق انقلابی کیفیت کی شکل وصورت 382
قرآن حکیم کی تعلیم تو دلوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے لیکن اس
کے لیے مجموعی تعلیم کا سامنے آنا ضروری ہے 382
احسان کا بدلہ تو حسن کا پیدا کرنا ہوتا ہے کسی کو بے دام غلام بنا لینا نہیں ہوتا 383
عربی میں اِحسان کا مفہوم اور ہمارے اردو تراجم؟ 383
انسان کا ہر عمل بذاتِ خود اسکی جزا ہوتا ہے 384
ایمان کا کوئی بدلہ یا اسکی کوئی ریٹرن باہر سے وصول نہیں کی جاتی 384
خدا کے ہاں سے ملنے والے اجر کی نوعیت: زندگی خوف و حزن
سے پاک ہو جاتی ہے 385
کسی عمل کا اجر حاصل کرنے کے متعلق میں ایک انسانی نفسیاتی کیفیت کی
نشاندہی: EGO (پندارِ نفس) کی SATISFACTION (تسکینِ) کرنا 385
انسانی اعمال کو باطل ہونے سے نہ بچانے کی وجہ: پندارِ نفس

کی تسکین نہیں ہوئی 386
ظاہریت سے بچنے کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی انسانی ذات
پرایمان لانے میں ہے 387
اگر ایک طرف قرآنی تعلیم کو پیش کرتے وقت اس میں اپنے
خیالات کی ملاوٹ شرک عظیم ہے تو دوسری طرف ذات کی اکملیت
(Integration) درکار ہے 388
انسان کے اپنے پندارِ نفس کو ہی قرآن نے شیطان کے الفاظ سے
تعبیر کیا ہے 388
ذات انسانی کی ماہیت، ایمان بالآخرت اور نمازی کے لیے تباہی کی وجہ 389
قرآن حکیم تو انسانی اعمال کی غرض وغایت کو متعین کر دیتا ہے 389
قرآن حکیم شعبدہ بازی پر مبنی اعمال کو اخروی زندگی کے ترازو
میں تولتا ہی نہیں ہے 390
انسانی اعمال کا اجر تو دنیا و آخرت دونوں میں ملتا ہے لیکن ایک
بہت بڑے فرق کے ساتھ 390
دنیا اور آخرت میں ہر دو آجروں کی کیفیات میں فرق کی بنیادی وجہ 391
قرآن حکیم خوف وحزن سے پاک بالحق کی کبریائی اور غیر حق کی کبریائی
کی وضاحت پیش کرتا ہے 392
جماعت مومنین کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت 392
غیر متبدل اصولوں کی پیروی پر غیر متزلزل عمل کا نتیجہ، جنگ ستمبر 1965
کی زندہ مثال اور پھر ہماری احسان فراموشی کی ایک جھلک 393
نامانوس کو سدھانے کا ہمت طلب عمل اور حق کی خاطر کبریائی کے
لیے عالمگیر انقلابِ ربوبیت کی تشکیل 395

ستاون واں باب: **سورة البقرة (3)**' (آیات 266 تا 270)

سابقہ درس سے ربط 396
رزق کی آسودہ حالی کے لیے ضرورتِ انفاق اور کسان کی مثال 397
ہمیں قرآن حکیم کو سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے اس کی
وجہ جواز کیا ہے؟ 397
اگر کسی شخص کا آخرت پر ایمان نہ ہو تو وہ اپنے کسی عمل کو بھی
ثمر بار ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ 398
اگر کسی نے سعی مسلسل کی ہو تو پھر اس کا لگایا ہوا کھجور کا درخت
ہزار ہزار سال پھل دیتا ہے 399
روٹی کے لیے مستقبل کی فکر انسان کے لیے ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے:
آج کی فصل کل کی روٹی کی مثال 399
انسانوں کے خودساختہ نظام زندگی کے نشیب وفراز اور
قرآنی نظامِ حیات کا سہارا 399
کسی فساد انگیز انقلاب برپا ہونے سے پہلے اپنے آپ کو
بچائے رکھنے کا طریق اور ہماری حالتِ زار 400
آج کے مشکل دور میں انشورنس کا سہارا بھی خودساختہ شریعت
نے حرام قرار دے دیا ہے 401
قرآنی نظام ربوبیت کے خدوخال سامنے نہ ہونے کے باعث عقل وفکر
کو ماؤف کر دینے والی الجھی ہوئی پیچیدہ سوچ کے باعث قرآنی
تصورِ رزاقیت پر اعتراض 402
اللہ چاہے تو رزق دے گا، ہم کیوں دیں: کفار کا قول 402
مشیتِ خداوندی کا اگر حقیقی مفہوم ہی سمجھ لیا جائے تو نوید سحر کا
سورج طلوع ہو جائے گا مگر کیسے؟ 403
قرآن حکیم نے مجوسیت کے پیدا کردہ عقائد وتصورات سے
منع کرتے ہوئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے کے لیے کہا ہے 404
پوری انسانیت کے معاشی نظام کے حل کے سلسلہ میں
قرآن حکیم کی بلاغت اپنا حصہ بقدر محنت لو بقیہ دے دو 404
کاشتکاری کی محنت کا معاوضہ اور خدا تعالیٰ کے حصے کی وضاحت 406
خدا تعالیٰ کا حصہ ربوبیت عظمیٰ کی شکل میں ادا کرنا ہوتا ہے 408
خیبر کی زمین تقسیم کرتے وقت نبی اکرم ﷺ کا کردار اور

ہمارے ہاں اللہ واسطے کی روٹی اور برہمن کی گائے کا قصہ 408
عربوں کے ہاں لفظ بخل کا حقیقی مفہوم اور شیطان کا عمل 410
مغفرت کا حقیقی مفہوم اور تحفظِ خویش کی خصوصیت 411
عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں میں فرق 412
کتاب وحکمت یعنی قانون کے ساتھ اس کی حکمت، یہ دونوں
چیزیں قانون کا خاصہ ہیں 412
ڈکٹیٹر کے ہاں قانون تو ہوتا ہے مگر حکمت نہیں ہوتی 413
اَلْحِكْمَةَ وحی خداوندی کا ہی حصہ ہوتی ہے 414
انسانی جذبات کے متعلق تمام مذاہب میں پایا جانے والا تصور 414
انسانی جذبات کو کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں فنا نہیں کیا
جا سکتا، قوتِ ارادی کی بنیاد جذبات پر ہی ہوتی ہے 415
عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں میں تو بنیادی فرق ہے 416
وحی کے حقائق کو سمجھنے کیلیے اولوا الالباب کی صفت کا ہونا ضروری ہے 417
نذر کرنا یا منتیں مانگنے کا تصور قرآن حکیم کی روشنی میں 418
نذر ماننے والوں کی داستان بڑی عجیب ہوتی ہے 418
نذر کرنا یعنی ہنگامی حالات میں رضا کارانہ طور پر وہ شے وہ عطیہ
جواز خود دیا جاتا ہے 419
لغت کے تحت نذر کا مفہوم" عام حالات میں کسی خدمت کو
از خود سرانجام دینا ہے" 420
اٹھاون واں باب: **سورۃ البقرۃ (3)** (آیات 271 تا 280)
ذات خداوندی اور مومن کے مابین مال وجان کی
خرید وفروخت کے معاہدے کی نوعیت 422
ایسی مالی معاونت جو ہر آن دوسرے کے لیے ذہنی اذیت کا
باعث بنی رہے وہ انسان کی اپنی ذات کے لیے زہر قاتل ہے 423
قرآن حکیم کی تعلیم انسان کو نفسیاتی طور پر نہایت مخلص اور
مضبوط شخصیت کی مالک بنادیتی ہے 424
قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظام دوسرے نظاموں سے
کیونکر متمیز ہے؟ ایک اہم سوال 425
دوسروں تک ہدایت کا پہنچانا تو رسول کا فریضہ ہے لیکن
انکے دلوں کو بدلنا اس کے ذمہ نہیں 426
ذہنی تبدیلی ہر بنی آدم کو خود کرنا ہوتی ہے، دوسرا کوئی نہیں کر سکتا 426
من یشآء کا قرآنی مفہوم: یہ خدا کا قانون ہوتا ہے 427
اپنی ذمہ داری خدا پر ڈالنا شیطان کا فعل ہے 428
اختیار وارادہ کی قوت ہی انسان اور حیوان میں تمیز پیدا کرتی ہے 428
تقلید پرستی انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے، دل کی تبدیلی
انسان خود ہی پیدا کرتا ہے 429
انسان کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ خود کوشش کرتا ہے،
کسی کی صحت دوسرے کو منتقل نہیں ہوتی 430
نوع انسانی کی فلاح کیلیے پروگرام کی تشکیل اپنی ذات کی
نشوونما کا ذریعہ ہے 430
نظام کو بدلنے کی بجائے گداگروں کو پالنے کا
مستقل رواج حالات کو مزید برباد کردے گا 431
قرآن حکیم نے "فقرا" کن کو کہا ہے اور ان کی پہچان کیا ہے؟ 431
کیا انسان کا دوسروں کے ساتھ اس حسن عمل کا اجر قیامت تک
اٹھا رکھا جائے گا؟ 432
زندگی میں کسی قسم کا خوف وحزن کا نہ ہونا تو سب سے
بڑا اجر ہے لیکن یہ انفرادی طور پر ممکن نہیں 433
دوسروں کے ساتھ تعاون کا ایک دوسرا رخ جس کا نتیجہ
خدا اور اس کے رسول کی خلاف جنگ ہے 433
ایک نظام کے بالمقابل دوسرا نظام اور انکے بنیادی خدوخال کی وضاحت 434
ربٰو کا معاشی نظام جس کی بنیاد فاضلہ دولت پر ہوتی ہے 434
عقل انسانی کی چابکدستی کی ایک مثال: ربٰو کی اقسام 436

ربٰو جس کو ہمارے ہاں سود کہا جاتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور
پھر بیع اور ربٰو میں کیا فرق ہے: ایک بنیادی سوال 436
تجارت میں محنت کا معاوضہ ہوتا ہے ربٰو میں صرف سرمائے کا 437
ہمارے ہاں کی شریعت نے روپے کی ماحصل کو جائز ہونے
کا فتویٰ دے رکھا ہے 437
ربٰو اور سرمائے کے سلسلہ میں قرآنی وضاحت 438
نظامِ سرمایہ داری میں انسان کی نفسیاتی کیفیت اور لفظ "تکاثر" کا مفہوم 439
محنت کے معاوضے کے علاوہ سرمائے کا معاوضہ ربٰو ہے 439
قانون کے نفاذ کا طریق اور اس کی علت 440
ربٰو انسانی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتا ہے 440
سود در سود کا معاملہ ضعف اور اضعافاً کے مفہوم میں فرق 441
کسی چیز کو چھپا کر رکھنے کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے 441
اثیم کا قرآنی مفہوم 442
INVESTMENT (سرمایہ کاری) کے تحت
حاصل کردہ روپے کی نوعیت 442
قرآن حکیم کے نزدیک کمرشل انٹرسٹ (تجارتی سود) کے
ذریعے روپیہ بڑھتا نہیں بلکہ کم ہوتا ہے 443
ربٰو کے نظام میں WEALTH (دولت) کی کمی کے علاوہ بخل،
تنگ نظری اور اثیم کے باعث انسان محنت کا عادی ہی نہیں رہتا 444
ایک مقروض کی کہانی سود کی زبانی 444
قرآن کی زبانی مقروض کی کہانی 445
قرآنی معاشرے کے خدوخال 446

انسٹھواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 281 تا اختتام)

نگاہِ بازگشت اصل سے اوپر جو کچھ انسان لیتا ہے وہ ربٰو ہے'
وہ دوسرے کی کمائی ہے 448
اس دور میں کوئی کسی کی محنت کو ہڑپ نہیں کر سکے گا 449
قومیں تباہ ہی اس وقت ہوتی ہیں جب ان میں احساسِ زیاں
باقی نہ رہے 450
ظلم کی قوتوں کی بے باکی اور مہاتما بدھ کا فلسفہ حیات' سینٹ
پال کی سوچ اور پھر عیسائیت کا زوال 450
انسانی سوچ کے دو رخ جن کے تباہ کن نتائج کا ماحصل بڑا ہی
قابلِ غور اور باعث عبرت ہے 451
سینٹ پال کے فلسفے کی نوعیت تو بڑی خطرناک ثابت ہوئی ہے 451
انسان کی غلط نگہی کے برعکس قرآن حکیم کا پیغام اور اسکی راہنمائی کا نتیجہ 452
قرآنی نظام یا معاشرہ متشکل ہونے تک کے لیے عبوری
انتظامات کے سلسلہ میں حکمانہ راہنمائی کی تفصیل 452
لفظ رزق کا قرآنی مفہوم 454
انسانی علم حاصل کرنے کی صلاحیتوں کا معاملہ ہو یا زمین کی پیداواری
صلاحیتوں کا معاملہ انہیں خدا اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے 454
کمیونزم اور اسلام میں فرق کی نوعیت یہ ہے کہ خدا انسان سے
اپنا حصہ طلب کرتا ہے 455
قارون کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی اور قرآن حکیم کا ارشاد 455
مملکت کا نظام صرف جذبات کے تابع نہیں چلتا وہ قربانی کا
طلب گار بھی ہوتا ہے 456
زندگی کے معاملات میں عورت کی گواہی کا معاملہ اور اس کی حقیقت 457
معاشرتی طور پر دورِ اولیٰ میں اور آج تک بھی عورت کی حالتِ زار 458
دو عورتوں کی شہادت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت 459
عورت کی نشاۃِ ثانیہ کا دور 459
عورت اور مرد کی تخلیق تو ایک ہی مٹی سے ہوئی ہے 460
سفرِ حیات میں قرآن مرد اور عورت کو دوش بدوش دکھاتا ہے 460
قرآن کے نزدیک زندگی کے معاملات میں تحریری گواہی کی حکمت 461
گواہی دینے والے کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے 462

CamScanner

سفر کے دوران باہمی لین دین کی صورت میں دی گئی قرآنی ہدایت 462
صرف قانون کی بنیاد پر کوئی معاشرہ تشکیل نہیں پاتا 463
شہادت کو چھپانے سے قلب پر افسردگی چھا جاتی ہے اور اسے
اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے 463
سچے معاشرے میں جھوٹے شخص کی قلب ونگاہ کی جرأت پر
مردہ ہو جاتی ہے 463
ہر سورۃ کی آخری آیات میں خداوندی صفات کو لانے کا
مقصد ہوتا ہے 464
انسانی زندگی کا اس خارجی کائنات سے ربط 464
انسانی عمل کا ہر ہر پہلو اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی
اس کا نامہ اعمال ہے 465
اس ارض وسما کو تخلیق کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی انسان
کا کوئی عمل وزن کئے بغیر نہ رہ جائے 466
اس ضابطہ حیات پر خدا کا رسول سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے 467
مذاہبِ عالم کے تمام بزرگوں کی تعظیم کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے 467
ایمان لانے کے بعد کچھ فرائض کی پابندی اور ان کی وجوہات 468
قرآن حکیم کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں ذات انسانی میں
وسعت پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں 468
لفظ کسب اور اکتسب میں فرق اور پھر اس کا نتیجہ 469
دل کے ارادے کے ساتھ کسی عمل کے کرنے اور کبھی کوئی
لغزش کے سرزد ہونے میں بنیادی فرق ہے 470
اعتراف جرم کیے بغیر اصلاح کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا 470
شدت آرزو کا دوسرا نام دعا ہے نیز لاتحمل کا لغوی مفہوم 471
سورۃ الفاتحہ کے لیے گئے غلط تراجم کی نشاندہی 471
کوئی معاشرہ بھی حقوق اور ذمہ داریوں کے توازن کے
بغیر استحکام حاصل نہیں کر سکتا 472
مزدور کا مزدوری لیتے وقت اور آجر کا مزدوری دیتے وقت
رعونت اور محتاجی کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے 472
انسان غلطیوں کا ازالہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ 473
سیات کو صرف حسنات سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے، دعائیں
مانگنے سے نہیں 473
مولنا کا لفظ بڑا ہی عظیم لفظ ہے جو صرف خدا تعالیٰ کی ذات
کے لیے ہی مختص ہے 474

CamScanner

اکتالیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3)' (آیات 189 تا 195)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَہِلَّۃِ ؕ قُلۡ ہِیَ مَوَاقِیۡتُ لِلنَّاسِ وَ الۡحَجِّ ؕ وَ لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ
ظُہُوۡرِہَا وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَ اۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِہَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ
تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۸۹﴾ وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ
الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ وَ اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَ الۡفِتۡنَۃُ
اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوۡہُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ
فَاقۡتُلُوۡہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انۡتَہَوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوۡہُمۡ حَتّٰی لَا
تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ لِلّٰہِ ؕ فَاِنِ انۡتَہَوۡا فَلَا عُدۡوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّہۡرُ الۡحَرَامُ
بِالشَّہۡرِ الۡحَرَامِ وَ الۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی
عَلَیۡکُمۡ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾ وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا
بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَ اَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1969ء کی 27 تاریخ ہے، درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں آج سورۃ البقرۃ کی آیت 189 سے آغازِ کلام ہوتا ہے: (2:189)۔

سابقہ آیات میں روزوں کے متعلق احکام دیئے گئے تھے اور اسی سلسلے میں آیت 186 کی تشریح کرتے ہوئے دعا کے متعلق بھی قرآن کا نظریہ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق بیان کیا تھا۔ بنیادی موضوع رمضان ہی کے متعلق تھا اور اس میں یہ تھا کہ شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ (2:185)۔ رمضان کے مہینے میں قرآن کا نزول ہوا۔

جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے اسلام دین ہے' دین حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی وساطت سے خدا کا عطا کردہ نظامِ حیات ہوتا ہیا ور جب اس میں انسانوں کا نظریات و خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے تو پھر وہ مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب میں اوہام پرستیاں ہوتیں ہیں Superstitions ہوتی ہیں' بے روح رسمیات ہوتی ہیں۔ دین میں عقل وفکر ہوتی ہے' علم وبصیرت ہوتی ہے' اس کے نظام کی جتنی محسوس شکلیں ہیں' وہ رسمیات نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس کے پروگرام کے لاینفق اجزا ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرنے سے کوئی ذہنی تصور' جسے ثواب کہتے ہیں' وہ راہ نہیں پا سکتا بلکہ اسی دنیا میں ان کے عملی نتائج سامنے آتے ہیں اور چونکہ زندگی مسلسل آگے چلتی ہے' یہاں کی زندگی کا حسن مرنے کے بعد بھی اسی طرح قائم رہتا ہے اور اسے ہم کہتے ہیں کہ پھر آخرت بھی سنورتی ہے۔

عزیزانِ من! کہنا یہ تھا کہ مذہب میں اوہام پرستیاں ہوتی ہیں' بے روح رسومات ہوتی ہیں۔ دین میں عقل وبصیرت ہوتی ہے اور اس کے نظام کے اجزا ہوتے ہیں' محسوس شکل میں ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

بات وہاں یہ ہوئی کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185)- رمضان کے مہینے میں قرآن نازل ہوا تو اب یہاں سے مذہب نے فوراً اوہام پرستی کی طرف توجہ کو منتقل کر لینا تھا کہ بعض مہینے مقدس ہوتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ بعض سعد ہوتے ہیں بعض منحوس ہوتے ہیں۔ دن بھی بعض منحوس ہوتے ہیں' بعض مبارک ہوتے ہیں۔ یہ منگل اور سنیچر' صبح کے وقت' جب تک برہمن کو دان نہ دیدیا جائے' وہ دن خیریت سے نہیں گزر سکتا۔ ہر تقریب کے لیے' ہر پروگرام کے تعین کے لیے' پہلے برہمن سے پوچھنا پڑتا ہے۔ یاد رکھیے! برہمن ہندو قوم کے ہی فرد کا نام نہیں' ہر مذہب کے برہمن ہوتے ہیں' نام الگ الگ ہوتے ہیں' روح وہی ہوتی ہے۔ ان سے جا کر پوچھیے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ دن نحس ہے' یہ مسعود ہے اور بیاہ شادی کی تاریخوں میں تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کتنا ''وچار کیتا جاندا اے''[1] شَهْرُ رَمَضَانَ کہنے سے کہ اس میں نزولِ قرآن ہوا' مذہب جو کچھ کرتا ہے' فوراً توجہ اُدھر چلی گئی اور یہ دین ہے جو ساتھ کے ساتھ ہی مذہب کی جڑیں کاٹتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے اور میری کتاب[2] کا نام ہی یہ ہے۔ تو اب آپ کو معلوم ہوگا کہ دین' چیلنج ہوتا ہے' مذہب کے خلاف۔ اسلام کو ایک مذہب فرض کر کے' مذاہبِ عالم کے ساتھ اس کا تقابل' اس کی جنگ' اس کی لڑائی اور پھر بزعمِ خویش اس کو ان سے افضل ثابت کرنا' دین نہیں ہے۔ جو مذہب ہے ہی نہیں اس کا مذہب سے تقابل کیا۔ اس لیے جہاں بھی ایسا مقام آتا ہے جہاں اس چیز کا شبہ ہوتا ہے' امکان ہوتا ہے کہ یہاں مذہب در انداز ہو کر اس کا حلیہ بگاڑے گا' قرآن وہیں اس کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ آپ کو یاد ہے' ابھی ابھی پیچھے وہ آیت گزر چکی ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کشاد اور نیکی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف کرتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب کی جو بے روح رسمی چیز ہے' جس میں وہ عین مقصود بالذات بن جاتی ہے' یہاں اس کے متعلق کہا کہ اس کو یہ نہ سمجھ لینا کہ نیکی اور کشاد کی راہ یہ ہے کہ ہم سب منہ کس طرف کرتے ہیں۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ مال

کی محبت کے باوجود اسے اس کی راہ میں کون خرچ کرتا ہے۔

---

❶ کتنا دھیان دیا جاتا ہے۔

❷ Islam: Achallenge K Religion

قرآن حکیم کے نزدیک کوئی مہینہ نہ مقدس ہوتا ہے اور نہ ہی منحوس

یہاں رمضان کے مہینے کی بات آئی تو فوراً یہ بات آئی کہ مذہب پرست اس کو فوراً مقدس سعد اور منحوس میں تبدیل کر لیں گے کہ یہ مہینہ مقدس ہے اور یہ منحوس ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے نزدیک بعض مہینے ایسے ہیں جن میں شادی نہیں ہوسکتی۔ جونہی شَھْرُ رَمَضَانَ کے متعلق ذہن میں بات آئی۔ کہا یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ (2:189) تم سے اہل کے متعلق پوچھتے ہیں۔ اہل (نیا چاند) ہلال کی جمع ہے یعنی یہ مہینوں کی ابتدا ہے' آپ مہینے سمجھ لیجیے۔ یاد رہے کہ قرآنِ کریم میں غالباً' اگر میں غلطی نہیں کرتا تو کوئی گیارہ❶ مقامات ہیں' جن میں صرف یہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ آیا ہے کہ تجھ سے یہ بات پوچھتے ہیں۔ گویا قرآنِ کریم میں اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی کہ یہ پوچھیں اور وہاں سے بتایا جائے اور جن چیزوں کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ چیزیں تھیں جو عام طور پہ وہاں رائج تھیں اور ان کے متعلق وہ ذرا وضاحت چاہتے تھے۔ جیسے کہا ہے کہ وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ (2:222)۔ حیض کے دنوں کے متعلق بات پوچھی تھی۔ یہاں (2:189) میں صرف چاند کے متعلق پوچھا ہے۔ تو یہ نظر آتا ہے کہ جو توہم پرستی تھی وہ عام تھی چونکہ شَھْرُ رَمَضَانَ (2:189) کہا گیا تو ان کے ذہن میں یہ بات فطری طور پر ابھری کہ کیا کچھ مہینے بھی مقدس ہوتے ہیں' کچھ نحس ہوتے ہیں' کچھ منحوس ہوتے ہیں۔ کہا کہ ان کے ذہن میں مہینوں کی بابت یہ بات ابھری ہے۔ قرآن نے بتایا کہ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (2:189)۔ کہا کہ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ تم کچھ اپنی گنتی پوری کرتے ہو' وقتوں کا تعین کر لیتے ہو اور اسی جہت سے حج کا تعین ہو جاتا ہے۔ یہ تقریبات کے تعین کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ بجائے خویش نہ یہ منحوس ہیں' نہ یہ سعد ہیں' ان میں کوئی تقدیس نہیں ہے۔ پہلی چیز یہ کہہ کر اس کو کاٹ دیا کہ مہینے مہینے ہیں۔ یہ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ (2:189) اوقات کے تعین کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ آگے جب متعلقہ آیت آئے گی تو وہاں میں تفصیل سے عرض کروں گا۔ یہاں اجمالاً بیان کر دوں کہ قرآن کی رو سے کلینڈر چاند یا سورج دونوں کے اعتبار سے مقرر کیا جا سکتا ہے' جس میں بھی سہولت رہے۔ اس نے شمس اور قمر دونوں کے لیے کہا ہے کہ یہ بِحُسْبَانٍ (55:5) ہیں' دونوں حساب کے لیے ہیں' دونوں کے مطابق حساب رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں یہ چیز ایک مِلی روایت ہے' جس کی رو سے ہمارے ہاں قمری مہینے رائج ہیں' سن رائج ہے لیکن اس میں اسلامی یا غیر اسلامی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ

نہیں ہے کہ اگر آپ کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ آپ شمسی کلینڈر اپنے ہاں رائج کریں تو وہ غیر اسلامی ہو جائے گا۔ مذہب کی دنیا میں تو پاجامہ اسلامی اور پتلون غیر اسلامی ہو جاتی ہے۔ دین اتنا چھوئی موئی والا نہیں ہوتا۔ اس لیے شمس اور قمر دونوں کے مطابق حساب رکھے جاسکتے ہیں جیسے بھی آپ کے لیے Convenient (سہولت) ہو وقت کا تقاضا ہو۔ یہاں اتنا ہی عرض کروں گا' جب آیت آئے گی تو وہاں میں عرض کروں گا کہ آپ کے ہاں یہ قمری مہینہ یا قمری سال کیسے بنا تھا' کیسے متعین ہوا تھا' یہاں اتنا ہی عرض کردوں کہ اس میں اسلامی یا غیر اسلامی کی بات نہیں ہے کہا ہے کہ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (2:189)۔ کہہ دو کہ بات اتنی ہے کہ اس سے وقتوں کا تعین ہوسکتا ہے' اسی جہت سے حج کے مہینے کا بھی تعین ہوسکتا ہے۔ (2:189) پھر اس میں بھی ہے جو ان کے ہاں تقاریب متعین ہوئی ہیں۔

دین میں بنی نوعِ انسان کی حیات اجتماعیہ کے پیشِ نظر حج کے اجتماعات کو ایک مرکزی حیثیت سے پیش کرنا مقصود تھا

عربوں میں دور جاہلیہ میں (قبلِ اسلام بھی) حج کو قومی تہوار نہیں بلکہ ایک تقریب کے طور پر مناتے تھے۔ حج ان کے ہاں بھی ایک سالانہ اجتماع ہوتا تھا اور عمرہ سال کے دوران ایک دفعہ وہ چھوٹا اجتماع ہوتا تھا۔ اسے وہ حج کہا کرتے تھے۔ یہی چیز آپ کے ہاں دین کے نظام یا پروگرام کا ایک اہم رکن بن گئی۔ دین حیاتِ اجتماعیہ کے لیے ایک نظام عطا کرتا ہے اور حیاتِ اجتماعیہ کے لیے اجتماعات نہایت ضروری ہیں کیونکہ اس نظام کی بنیاد باہمی مشاورت پر ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) اور جب بھی مشاورت کی ضرورت پڑے گی' اجتماع ہوگا۔ صلوٰۃ کے اجتماعات یوم الجمع' تو ہے ہی اجتماع کا دن۔ وہ محلے واری ہے' یہ ایک شہر کی مرکزی حیثیت لیے ہوئے ہے اور پھر آپ کے ہاں کا بین الملی اجتماع پوری دنیا کے مسلمانوں کا' سال میں ایک دفعہ تو متعین ہے۔ یہ All Wolrd Muslim Annual Conference ہے اور جب بھی ضرورت پڑے' اس کے بعد ہنگامی اجتماعات ہیں۔ اسے عمرہ کہا جاتا ہے۔ حج کے متعلق اس سے پیشتر غالباً جب کعبہ کا ذکر آیا تھا تو میں نے تفصیل سے عرض کیا تھا کہ پوری انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا قرآنِ کریم کا جو بنیادی اصول ہے۔ یہ اس اصول کے لیے ایک عملی پروگرام ہے کہ جس کی دو کڑیاں حج یا عمرہ بھی ہیں۔

امت مسلمہ کا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ تا حیات انسانیت کی خدمت کے فرائض سرانجام دے

یہ حج یا عمرہ صرف مسلمانوں کا اجتماع ہی نہیں ہے۔ یہ تو پوری عالمِ انسانیت میں اعلان کیا جاتا ہے کہ آؤ اور دیکھو یہ اعلان کا ہے کے لیے کیا جاتا ہے؟ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ہم تمہارے فائدے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ

فلاح عام ہے۔اس لیے کہ کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم ایک بہترین قوم ہو اور بہترین اس لیے ہو کہ تمہیں پوری انسانیت کے فائدے اور بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔اب جن کیفائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، ضرورت ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً بلا کر دکھایا جائے کہ دیکھ لیجیے صاحب! ہم نے آپ کے لیے کتنا کام کیا ہے' کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ تو انسانیت کے کام کرنے کے لیے مزدور پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ ان کے لیے طوافین ہیں' میں نے اس وقت یہ بتایا تھا کہ طوافین طائف سے ہے اور طائف وہ چوکیدار ہے کہ جب گھر والے شہر والے' محلے والے سوئیں تو وہ جاگ کر پہرہ دے۔انہیں اس لیے پیدا کیا گیا تھا تو اب ضرورت ہے کہ یہ ان کو بلا کر بتائیں کہ دیکھیے صاحب! ہم تمہاری منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں تا کہ یہ بھی باہمی مشاورت کریں' پروگرام طے کریں اور جن کے لیے یہ کیا جا رہا ہے ان کو دکھائیں اور یہ لِیَشْھَدُوْا (22:28) مشاہدہ کریں کہ مَنَافِعَ لَھُمْ (22:28) آپ ان کی منفعت کی کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اس کا آ کر مشاہدہ کریں۔اس کی تفصیل میں اُس وقت عرض کر چکا تھا۔آگے بھی جب حج کے متعلق آیات آئیں گی تو وہاں مزید تصریحات پیش کر دوں گا۔ یہاں اتنی سی چیز کہی کہ قرآن کی رو سے حج یہ تھا لیکن اس سے پیشتر عربوں کے ہاں یہ حج ایک قومی تہوار تھا' قومی اجتماع تھا اور جیسا کہ مذہب میں ہوتا ہے وہ خواہ بت پرستی کا ہی کیوں نہ ہو' اس میں توہم پرستیاں ہوتی ہیں۔اس اجتماع کے دوران ان میں جو مذہبیت تھی وہ یہی تھی کہ حج کے لیے نکل گئے' میدان میں چلے گئے۔اگر کسی ضرورت کے لیے گھر آنا پڑے تو دروازے کے راستے گھر میں نہیں آتے تھے' دیوار پھاند کر آتے تھے تو کہا وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا [1] (2:189) او! کیا یہ کوئی نیکی کا کام ہے؟ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے ''کہ جی ثواب ہونداا ے ایہدے نال [2]'' یہ کوئی چیز ثواب کی نہیں ہے کہ تم جب اس کے بعد آؤ تو گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہو' دیوار پھاند کر داخل ہوا کرو۔ یہ کونسی نیکی کی بات ہے۔

---

[1] یہ جو تم سمجھتے ہو کہ حج کے دوران' مکانوں میں سامنے کے دروازے سے نہیں آنا چاہیے' پچھواڑے سے آنا چاہیے (تو یہ محض توہم پرستی ہے) سعادت اور کشادکی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں ہوتیں۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص70)

[2] کہ جی! اس سے ثواب ہوتا ہے۔

مذہب کی نگہ چند ایک رسومات کے سلسلہ میں ثواب پر تو ہوتی ہے' نتائج پر نہیں ہوتی

کہا ہے کہ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی (2:189) نیکی اور ثواب کا کام یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کتنی کرتے ہو۔ آپ نے اسی ایک نقطے پر دیکھا کہ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو یہی رسومات ہیں جو مقصود بالذات ہو جاتی ہیں' اسی سے ثواب ہوتا ہے مثلاً تین دفعہ' پانچ دفعہ' سات دفعہ یہاں سے سیدھے رخ چلو' یہاں سے اس طرح سے واپس لوٹو' دائیاں پاؤں ادھر رکھو' بایاں اس طرف

رکھو۔ان تمام چیزوں سے کیا ہوتا ہے؟ کہ جی! ثواب ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ لَيْسَ الْبِرُّ (2:189) اس سے ثواب نہیں ہوتا۔اس سے سعادت اور کشاد کی راہیں نہیں کھلتیں تو سوال یہ ہے کہ ثواب اور کشاد کی کون سی راہیں ہیں۔اس کے لیے کہا کہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (2:189) کشاد کی راہ صرف ایک ہی ہے کہ اور وہ یہ ہے کہ تم کس حد تک قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو اور تم میں کردار کی کتنی بلندی ہوتی ہے لہٰذا تم ان جہالت آمیز باتوں کو چھوڑ و اور سیدھی طرح گھروں میں، جس طرح سے عام دنوں میں آتے ہو اسی طرح ان دنوں میں آ ؤ۔ان خاص دنوں میں کیا ہو گیا؟ اور وہاں کشاد کی راہ کے لیے مَنِ اتَّقٰى کہا تھا تو آگے کہا کہ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (2:189) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔اب یہاں تک یہی چیز تھی کہ صاحب! حکمِ حاکم ہے تو مرگِ مفاجات ہے، یوں نہیں یوں کرو۔اچھا جی! یوں کر لیں گے، آپ کا حکم جو ہوا، وہ ماننا ہے۔آپ کو معلوم ہے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت دی ہے۔قانون کے ساتھ، اس قانون کا جو Object ہے، جو Purpose ہے، جو مقصد ہے، وہ ساتھ بتایا ہے۔اسے حکمت کہتے ہیں۔

قانون کی غایت اور اس مصلحت بتائے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل ہی نہیں ہو سکتے

میں نے جیسا اس وقت بھی عرض کیا تھا، پھر دہرادوں کہ قانون نافذ کرنے سے پیشتر اگر اس کی حکمت، اس کی غایت، مصلحت، غرض، نتیجہ جو مرتب ہونا ہے، اگر اس کو اس طرح واضح کر دیا جائے کہ وہ ہر ایک کی سمجھ میں آ جائے تو آپ دیکھیے گا کہ قانون کا احترام کتنا بڑھ جاتا ہے۔قانون کتنا ہی مصلحت پر مبنی ہو اور اگر اس کی غایت و مصلحت کیے بغیر، اس کو آپ صرف Announce کر دیتے ہیں، وہ ذہنوں میں ایسا آتا ہے جیسے ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے، آمریت ہوتی ہے، ایک ٹھونسا جا رہا ہے تم پہ کوئی حکم Restriction کوئی Super-Imposed ہے تمہارے اوپر۔اس سے انسان کی طبیعت اِبا کرتی ہے۔اسے اگر بتایا جائے کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے، تمہارا ہی فائدہ ہے اور فائدہ یوں ہے تو آپ دیکھیے اِس قانون کی اطاعت میں اور اُس اطاعت میں کہ جسے سمجھا نہ جائے یا سمجھایا نہ جائے اور منوایا جائے، دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے حالانکہ خدا کو تو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ حکم بتا چلا جاتا، جس نے بھی اسے خدا مان لیا ہے، وہ اسے تسلیم کیے جاتا لیکن وہ اپنے آپ کو ڈکٹیٹر نہیں منوانا چاہتا۔اس لیے جہاں ایک بات کہی ہے اس کے بعد لَعَلَّكُمْ کہ یہ اس لیے ہم کہتے ہیں تاکہ۔اور تاکہ کے بعد یہ نہیں ہے کہ ہمارا فلاں کام ہو جائے کہا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (2:189) تاکہ تمہاری محنتیں بار آور ہو جائیں، تمہاری کھتیاں پروان چڑھیں۔یہ سب تمہارے لیے ہم کہہ رہے ہیں۔دین میں احکام کی شکل ڈکٹیٹر کے احکام کی نہیں ہوتی، ڈاکٹر کی ہدایات کی ہوتی ہیں، ڈائریکٹر کی ہوتی ہیں۔ڈاکٹر کا ہر حکم اگر اسے آپ حکم کہنا چاہتے ہیں، ورنہ وہ ہدایت ہوتی ہے۔یہ قرآن کا لفظ ہے۔

اس کی جو ہدایات ہیں، وہ مریض کے فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ کہا کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (2:189) تا کہ تمہاری کھتیاں پروان چڑھیں، تم معمول کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔ یہاں تک یہ چیز آ گئی۔

دین کا ماحصل راہبانیت نہیں بلکہ پوری انسانیت کی جلوہ گری ہے

عزیزانِ من! اس وقت تک آپ نے دیکھا کہ یہ دین کے نظام کی مختلف کڑیاں بیان ہوتی چلی آ رہی تھیں: صلوٰۃ تھی، زکوٰۃ تھی، حج تھا، روزے تھے لیکن یہ تو دین ہے، یہ وہ نظام ہے جس کا ٹکراؤ دنیا کے دوسرے نظاموں سے ہونا ہے۔ ٹکراؤ کی صورت میں پھر کیا کیا جائے گا؟ ان احکام کے ساتھ ہی وہاں یہ بات کی کہ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (2:190) یہ نہ سمجھ لو کہ یہ راہبانیت کا ایک مذہب ہے، گیان دھیان کی ساری باتیں ہو رہی ہیں، خلوت کدوں میں، زاویوں میں، غاروں میں، جا کر تم نے اپنی لو خدا سے لگا لینی ہے تو مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہ تو ایک نظامِ حیات ہے۔ یہ تم نے کسی پہ ٹھونسنا نہیں، اسے اپنے ہاں قائم کرنا ہے لیکن یہ نظام ایسا ہے کہ کہیں بھی یہ قائم ہو گیا، اس کے نتائج اتنے دور رس ہیں کہ باقی دنیا کے لوگ جہاں یہ نظام نہیں ہے، جب اس کے منفعت بخش نتائج کو دیکھیں گے، تو وہ اس سے متاثر ہوں گے۔ مفاد پرست گروہ پر اس کی زد پڑے گی اور جب زد پڑے گی تو تصادم ہو گا۔ جہاں بھی آپ نے قرآن کا نظامِ ربوبیت رائج کیا، سرمایہ دار طبقہ، برہمنیت، مذہبی پیشوائیت کے مفاد پہ زد پڑی، وہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

آخر دین خداوندی کی اس قدر زیادہ مخالفت کرنے والے کون تھے اور پھر اس کی وجہ کیا تھی؟

عزیزانِ من! کبھی آپ نے اس پہ بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکے میں مبعوث ہوئے۔ مکے میں قریش اپنے اسی پرانے مذہب تو ہم پرستیوں کے جیسے بھی مشرکین کفر کا یہ سب کچھ ہوتا ہے وہ اس کے کاربند تھے۔ یہودی وہاں بستے تھے، عیسائی وہاں بستے تھے، مجوسی وہاں بستے تھے، کچھ حنیف بھی تھے جو کہتے تھے کہ ہم پرانی ملتِ ابراہیم پر ہیں، خدا کو بھی وہ مانتے تھے۔ یہ سارے بستے تھے، کبھی ٹکراؤ والی بات نہیں ہوئی، کسی نے دوسرے کو روکا نہیں ہے کہ تم اپنے ہاں یوں کیوں بندگی کرتے ہو، اس طرح کیوں پرستش کرتے ہو، تم اپان تہواریوں کیوں مناتے ہو، اس طرح کیوں نہیں مناتے؟ کوئی کسی قسم کی مزاحمت نہیں، کسی قسم کا تصادم نہیں، کوئی ٹکراؤ نہیں، کوئی کسی کو روکتا نہیں، منع نہیں کرتا۔ اس میں سے یہ ایک اگر جیسا کہ تصور ہے، ہمارا ایک اور مذہب آیا، جسے اسلام کہتے ہیں تو یہ کیا بات ہوئی کہ یہ اٹھا ہے اور ہجوم کر کے یہ سارے اس کے مخالف ہو گئے۔ حالانکہ یہ وہ تھا جس کو حکم دیا گیا کہ ان کے بتوں کو بھی برا نہ کہنا۔ یہ اس قدر صلح پسند کہ دوسرے کے جذبات کا اتنا احترام کرنے والا ہے۔ یہ کیا ہوا کہ سارے ہجوم کر کے اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے؟ اہلِ کتاب بھی اٹھ کھڑے ہوئے، مشرکین بھی اُٹھ کھڑے ہوئے، قریش نے تو پوچھو ہی نہیں، اس کی مخالفت میں کس طرح سے تدبیریں کیں، کیا کیا

سازشیں کیں۔ تیرہ برس تک نبی اکرم ﷺ یہاں رہے۔ یہ کیا تھا کہ نصاریٰ اپنے طور پر خدا کی عبادت کرتے تھے' یہود کرتے تھے' قریش اپنے ہاں کرتے تھے' یہ مخل نہیں ہوتے تھے۔ یہ اپنے طور پہ ہی اگر انہوں نے کچھ کرنا تھا تو کرتے چلے جائیں۔ جہاں پہلے چار پانچ تھے' اس میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تو کیا قیامت آ گئی؟ اس میں کیا تھا کہ اس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے؟ حالانکہ ابھی یہ وہاں عملاً نافذ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ وہاں کیا چیز تھی؟ یہ بات بڑی غور طلب چیز ہے۔ یہ وہی بات تھی' جو اس سے پیشتر قرآن نے بتایا ہے کہ حضرتِ شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ بھئی! تم اپنے طور پہ بھگتی پرستش پوجا کرتے ہو' میں اپنے طور پر کچھ صلوٰۃ ہے ایک چیز' میں اس کو رائج کرنا چاہتا ہوں (11:87)۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے صاحب! ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ ہم گھنٹیاں بجاتے ہیں؟ تم Hymn (بھجن) گا لیا کرو۔ اب جو وہ صلوٰۃ رائج ہونے لگی تو وہ پوچھتے ہیں کہ شعیب! یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ''کیوں'' کیا ہے؟ کہنے لگے کہ کیا تمہاری جو صلوٰۃ ہے' جس کا نام صلوٰۃ ہے یہ کہتی ہے کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے خرچ نہ کر سکیں (11:87)۔ آ نے دیکھا کہ مذہب کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں آ کر کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔

ہجرت کے بعد نظام صلوٰۃ کی مکالفت ہی مدینے پر چڑھائی کا حقیقی مقصد تھا

عزیزانِ من! یہ قرآن کے الفاظ ہیں ❶۔ انہوں نے صلوٰۃ کی اجازت دی تھی' اعتراض ہی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے نماز ہی سمجھا تھا لیکن انہوں نے کہا تھا کہ کیا تمہاری صلوٰۃ ہے یہ تو تمہاری بات ہی کچھ اور نکلی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ مخالفت کیا تھی۔ یہاں وہ نظام تو ابھی رائج نہیں ہوا تھا' اس نئے نظام کی تبلیغ ہو رہی تھی' جس میں مذہبی پیشوائیت کی جڑ کٹے' ہر قسم کی سرمایہ داری کی جڑ کٹے۔ قریش کے پاس یہ دو ہی تو چیزیں تھیں۔ یہ کعبے کے متولی تھے ہمارے ہاں تو ''اے چھوٹے جئے گھوڑے پیر دا متولی نئیں مان ہوندا ❷۔ وہ کعبے کے متولی تھے اور سب سے بڑے تاجر تھے۔ اس زمانے میں یہ سامان رسل و رسائل اس طرح تو عام نہیں تھے' شاہراہوں پہ چلتے تھے۔ یمن سے تجارت کے قافلے شام کی طرف چلتے تھے۔ انہیں مکے سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ شاہراہ کے اوپر سب سے بڑا مرکزی منڈی کا مقام یہ مکہ تھا۔ منڈی کا آڑھتی ہی مان نہیں ہوتا صاحب! ان یمن کے قافلوں کو اس میں سے گزرنا ہوتا تھا۔ یہ مکہ تجارت کا مرکز تھا۔ قریش' بڑے بڑے تاجر' اس کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ تاجر بیٹھے تھے' کعبے کے متولی بیٹھے تھے۔ دونوں ہی چیزیں اس میں آ گئیں۔ یہ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت' دونوں کا مرکز اور دونوں کا گڑھ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ جو صلوٰۃ ہے' یہ نماز نہیں ہے۔ یہاں اس کا یہ پرچار نہیں کرنے دینا چاہتے تھے۔ انہیں یہ پتاہ تھا کہ یہ جس نئے نظام کی بنیاد رکھی جا رہی ہے' یہ کس طرح سے ہمیں جڑ سے کاٹ کے رکھ دے گا' نہ مذہبی پیشوائیت باقی رہے گی' نہ سرمایہ داری باقی رہے گی۔

---

❶ ان الفاظ کا حوالہ (11:87) ہے۔

❷ یہ چھوٹے سے گھوڑے پیر کا متولی ہی فخر و تکبر میں کسی سے کم نہیں ہوتا۔

تیرہ سال یہاں مخالفت ہوئی۔ چلیے صاحب! مذہب کی کسی بات کے اوپر ان کو خیر چلیے' کہہ لیجیے' تکلیف ہوتی تھی۔ یہاں سے تین سو میل دور یہ سارے کے سارے اٹھ کر چلے گئے' انہیں خوش ہونا چاہیے تھا کہ چلیے صاحب! ان سے چھٹی پائی۔ وہاں مدینے جا کر یہ بیٹھے ہیں' یہ قریشِ مکہ ہجوم کر کے' پورا الاؤ لشکر لے کر وہاں مدینے پہ چڑھ دوڑے۔ پوچھو کوئی کہ صاحب! یہ کون سی ایسی چیز تھی کہ وہاں بھی یہ ان کو ''نماز'' نہیں پڑھنے دینا چاہتے تھے۔ (میں کوٹڈ کہہ رہا ہوں)۔ یہ کونسی چیز ہے؟ یہ بڑی گہری چیز ہے اور پھر یہ ایک جنگ میں ہی شکست نہیں کھاتے ❶ ہیں' اس شکست کے بعد پھر پوری تیاریوں کے ساتھ جا کر چڑھ دوڑتے ❷ ہیں' پھر جاتے ❸ ہیں' پھر جاتے ❹ ہیں۔ پھر اُدھر سے یہ قریشِ مکہ جا رہے ہیں' ادھر سے یہودیوں جیسی قوم' جنھوں نے کبھی تلوار کی شکل نہیں دیکھی ہوگی' وہ مخالفت کر رہے ہیں' ان سے جنگ ❺ ہو رہی ہے۔ ایران میں کھلبلی مچ رہی ہے' جو بازنطینی حکومت ہے' اس میں تزلزل پیدا ہو رہا ❻ ہے۔ کیا ''نمازیں'' تھیں؟ کیا روزے تھے؟ یہ کیا حج تھے؟ کیا کر دیا انہوں نے؟ کیا ہو گیا یہ؟ کیا تھا یہ؟ عزیزانِ من! یہ دین تھا اس دین کے لیے کہا ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33)۔ ہر نظامِ زندگی کے اوپر غالب آنے کے لیے یہ نظام تھا۔ سرمایہ پرستی ایک دین ہے' مذہبی پیشوائیت ایک دین ہے۔ اپنے اپنے مذاہب قائم رکھتے ہوئے مختلف مذاہب کے لوگ اس دین کے اندر آ سکتے ہیں' سرمایہ پرست ہو سکتے ہیں' مختلف مذاہب کے مذہبی پیشوائیت میں آ سکتے ہیں مگر یہ الگ دین ہے' جس میں یہ آتے ہیں۔ اس دینِ اسلام کا اس سے ٹکراؤ ہوتا تھا۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے نہ مکے کی تیرہ سال کی زندگی میں انہوں نے چین سے بیٹھنے دیا کہ کہیں اگر یہ خیال عام ہو گیا تو ہم ختم ہو جائیں گے اور وہ سچے تھے' ان کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس کے بعد اتنے ٹکراؤ ہوتے چلے گئے۔ اس ٹکراؤ کے بعد پھر آخری دنوں میں مکے کی نہ تجارتی رہی' نہ وہ تاجرانہ مفاد پرستیاں رہیں' نہ وہ مذہبی پیشوائیاں دسیسہ کاریاں باقی رہیں۔ کعبے کی تولیت بھی ختم ہوئی' قریش کی مفاد پرستیوں کی سرمایہ داری بھی ختم ہو گئی' ایران کی ملوکیت بھی ختم ہوئی اور بازنطینی کی قیصریت بھی ختم۔ اس پہ نگاہیں تھی ان کی۔ مساواتِ انسانیہ کا نیا نظام قائم ہو گیا۔ یہ تھی وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے' جس کو وہ پنپنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنا خون بہا دیا' جانیں دیدیں' کتنا ہی اپنا معاشی معاشرتی نظام تہ و بالا کر دیا' اس چھ سات سال کے عرصے میں ٹکراؤ ٹکراؤ اور ٹکراؤ ہی رہا۔ یہ بات تھی جس کے لیے یہ سب کچھ ہوتا تھا تو یہ جو چیزیں بیان کی گئی تھیں کہ کہیں زکوٰۃ ہے کہیں صیام ہے اور کہیں صلوٰۃ ہے اور کہیں الحج ہے۔ یہ سارے کے سارے' آپ دیکھیے گا' اس دین کے اجزا تھے اور وہ لوگ اس چیز کو سمجھتے تھے کہ یہ' بقول ان کے کیا بلا آ رہی ہے' کیا سیلاب آ رہا ہے' اس لیے وہ اس کے خلاف اٹھتے تھے۔

---

❶ یہ جنگ بدر (17۔رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء) ہے۔
❷ یہ جنگ احد (14۔شوال 3ھ مطابق 29۔مارچ 625ء) ہے۔
❸ یہ جنگ احزاب (ذیقعد 50ھ) ہے۔
❹ یہ جنگ حدیبیہ (ذیقعد 60ھ) ہے۔
❺ یہ غزوۂ خیبر (7ھ) ہے۔
❻ یہ غزوۂ تبوک (رجب 9ھ) ہے۔

قرآن حکیم کا پیش کردہ دین کبھی تلوار کے زور پر نہیں پھیلا

یہ وجہ ہے کہ صیام کا' روزوں کا' حج کا' یہ ذکر ہو رہا ہے' وہاں آیت آ رہی ہے کہ **وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ** (2:190)۔اس نظام کی مخالفت کے لیے یہ اُٹھیں گے۔تم نے تو خواہ مخواہ کے لیے تلوار لے کر یہ نظام قائم کرنا' اسلام کا نظام تلوار کے زور پر قائم ہو ہی نہیں سکتا' اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ایمان نام ہی دل اور دماغ کی کامل رضامندی اور بطیّب خاطر کسی چیز کو ماننے کا ہے' اس لیے کہ یہ **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ** (2:256) ہے یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے' اسے دل کی رضامندی سے قائم اور اختیار کرنا ہے لیکن مخالفین نے یہ نظام قائم نہیں ہونے دینا۔یہ بات پھر نہیں ہے۔انسانیت کی آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی ایک نظام کو تم زبردستی روک دو کہ یہ قائم نہیں ہوگا کہا کہ **قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ** (2:190)۔جو لوگ پھر تمہارے نظام کو روکنے کے لیے تلوار لے کر اٹھ کھڑے ہوں' وہاں پھر یہ نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں جمعہ کے بعد دعائیں مانگ مانگ کر گھر میں واپس آ جایا کرو۔کہا ہے کہ **قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (2:190)۔ان سے جنگ کرنا ہوگا۔یہ اگر جنگ پہ آتے ہیں تو جنگ کرنا ہوگی۔جنگ تو دونوں طرف سے ہو رہی ہے۔پہل ہی سہی مگر یہ انہوں نے آپ علیہ السلام نے جواب ہی دیا سہی' جنگ تو ہوئی۔اب فرق کیا ہے؟

قرآن حکیم کے نزدیک فی سبیل اللہ کا حقیقی مفہوم

قرآن ہے' یہیں کہہ دیا کہ فی سبیل اللہ (2:190)۔اللہ کی راہ میں ہے۔یہ اللہ کی راہ کیا ہوتی ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں خدا نے کسی چیز کو اپنی طرف منسوب کیا ہے' اللہ کے لیے منسوب کیا ہے' اس کے معنی ہیں ''عالمگیر انسانیت کے مفاد کے لیے۔'' جہاں چھوٹی چھوٹی نسبتیں ہیں' وہاں کسی فرد کے لیے' کسی خاندان کے لیے' کسی گروہ کے لیے' کسی وطن کے لیے' کسی قوم کے لیے ہے اور جہاں کوئی چیز عالمگیر انسانیت کے لیے ہے' اس کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔یہ جیسے آپ بیت اللہ کہتے ہیں' خدا نے اس گھر کو اپنی طرف جو منسوب کیا ہے۔اس کے کیا معنی ہیں؟ خدا کے گھر کا تو سوال ہی نہیں ہے' اسے تو ہم لامکان کہتے ہیں' وہ ہے ہی

لامکان: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ایک خاص گھر نہیں ہے۔ وہیں جہاں اس کو بیتی کہا ہے' میرا گھر یا جسے خدا کا گھر کہتے ہیں یہ کہہ دیا کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (3:95) یہ وہ گھر ہے جو انسانیت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہر گھر کسی نہ کسی فرد کا' کسی خاندان کا' زیادہ سے زیادہ کسی گروہ کا' کہہ لیجیے۔ وہ ہوتا ہے حتیٰ کہ پارلیمنٹ بھی کسی ایک قوم کی ہوتی ہے۔ یہاں وُّضِعَ لِلنَّاسِ کہا ہے اور جسے وُّضِعَ لِلنَّاسِ کہا' اسے کہا کہ یہ خدا کا گھر ہے' کوئی شخص اس پہ اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

حضرت صالح علیہ السلام کے عہد میں نظامِ سرمایہ پرستی کے برعکس قرآن حکیم کے معاشی نظام کے خدوخال اور حضرت موسیٰ کی ذہنی کیفیت

آپ کے ہاں بڑی بحث چلی ہوئی ہے کہ کیا یہ سوشل ازم اسلامک ہے یا Un-Islamic (غیر اسلامی) ہے؟ اور کیا اس میں ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی؟ ساری بات اتنی سی ہے' پوچھیے کہ جسے بیت اللہ کہا گیا ہے یعنی اللہ ایک گھر تو کیا اس پر کسی فرد کی' کسی گروہ کی' قوم کی' بادشاہ کی' اس پہ ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو جب اس نے ارض اللہ کہا ہے یہ ویسے ہی ہے جیسے بیت اللہ کہا ہے' اسی طرح اس نے کہا ہے ارض اللہ' اللہ کی زمین۔ جب بیت اللہ پہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی تو ارض اللہ پہ کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ کیوں اس نے ارض اللہ کہا ہے؟ کیا قرآن شاعری کر گیا ہے؟ یہ کچھ کہاں کہا ہے؟ عظیم واقعہ ہے۔ یہ حضرتِ صالح علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس قومِ ثمود کے اندر' نظام سرمایہ پرستی اپنی شدت پہ تھا۔ مویشی پالنا اس زمانے میں معیشت ہوتی تھی' چراہ گاہیں' کھلی ہوئی زمین ہے' پانی کے چشمے خدا کے دیئے ہوئے ہیں' زمین پہ جو کچھ اُگتا ہے' خدا نے دیا ہوا ہے لیکن وہاں انہوں نے لکیریں ماری ہوئی تھیں' صاحب! کہ یہ فلاں سردار کی ہے' یہ فلاں خاندان کے خان کی ہے۔ اب اس میں انہی کی بھیڑیں چر سکتی ہیں' انہی کے مویشی چر سکتے ہیں۔ غریب کی بھڑی نہیں چر سکتی' آپ کو معلوم ہے غریب کی بھیڑ کا قرآن نے کہاں نقشہ کھینچا ہے؟ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مصر کے شاہی محلوں سے بھاگ کر کہیں ایسی جگہ جانا چاہتے تھے' جہاں انصاف ہو وہاں سے نکل کر مدین کے باہر' پیاؤ کے قریب' تھکے ہوئے تھے' ایک درخت کے سائے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سامنے دیکھا پانی ہے' بھیڑیں آتی ہیں' پانی پیتی ہیں' چلی جاتی ہیں۔ دو لڑکیاں ہیں' وہ اپنی بھیڑوں کو لیے دور کھڑی ہوئی ہیں۔ قرآن کا انداز! ملاحظہ لیجیے۔ وہاں لفظ استعمال ہوا ہے کہ بھیڑیں شدتِ پیاس سے پانی کی طرف دوڑ کر جاتی تھیں' لڑکیاں زور سے روک کر پیچھے ہٹا رہی ہیں۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ انہوں نے اٹھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے یا بہن! کیا بات ہے' تم انہیں کیوں روک رہی ہو؟ یہ تو نہیں ہے کہ انہیں پیاس نہیں ہے تم زبردستی کیوں روک رہی ہو' جانے کیوں نہیں دیتیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ بڑے بڑے سرداروں کی بھیڑیں ہیں' ہم بہت کمزور

انسان ہیں، ہمارے گھر میں کوئی مرد بھی بڑا نہیں ہے، باپ ہے، بوڑھا ہو چکا ہے، ہم تو کمزور لڑکیاں ہیں۔ جب تک ان کے سب جانور پیٹ بھر کر پانی پی کر چلے نہ جائیں، ہم اپنے جانوروں کو وہاں کیسے پہنچنے دیں۔ جنہیں پانی پلانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیے کہ ایسوں کو بھی پھر خدا بھیجتا ہے، جو ان کے جانوروں کو پانی پلائیں۔ آپ علیہ السلام اٹھے اور ان کو پانی پلا دیا۔ وہ ایسے پانی پلانے والے نہ تو شکریے کے متمنی ہوتے ہیں اور نہ معاوضے کے آرزومند۔ انہیں پلایا پانی اور وہ چلی گئیں، آپ علیہ السلام پھر آ کر وہاں بیٹھ گئے۔ وہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ یا اللہ! مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں زبردست انسان، زیردست کو جینے نہیں دیتا۔ ذہن میں یہ تھا کہ ان صحرائی آبادیوں میں آ جاؤں یہاں تو یہ صورت نہیں ہوگی لیکن بات تو یہ ہے کہ بہر زمینِ کہ رفت ایم آسماں پیدا، یہاں اس سے بڑی دھاندلی ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں موسیٰ علیہ السلام! تمہیں بھیجا اس لیے گیا ہے کہ یہ دھاندلیاں ختم ہوں۔

عزیزانِ من! میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ یہ تھا قومِ ثمود کے ہاں وہ معیشت کا رنگ۔ سرداروں کی اونٹنیوں کے ہوتے ہوئے غریب کی اونٹنی کو پانی کون پینے دے۔ ان کے ساتھ معاہدہ ہوا، بات طے ہوئی۔ نظر آتا ہے کہ حضرتِ صالح علیہ السلام (قرآن میں ہے وہ یہ بات کہہ رہے تھے) سے کہیں تو وہ یہ کہتے تھے کہ صالح علیہ السلام! تمہاری ذات سے تو ہمیں بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یعنی نظر یہ آتا تھا کہ یہ جو اس وقت کا کارخانہ ایک لاکھ دیتا ہے، تم اس میں ایسی ترقیاں کرو گے کہ صاحب! یہ تو کروڑوں کا نفع دینا شروع کرے۔ ہمیں تو تم سے بڑی بڑی توقعات تھیں ''آ تینوں کی ہو گیا ہے لٹیا ہی ڈوبا دتی ہئیگی۔ اے کہن ڈیاں ہویا ہیگا ایں کہ ملکیت ہی جائز نہیں ہیگی [1]۔'' قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ ان سے یہ کہتے تھے کہ ہمیں تو تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، تم نے کیا کر دیا؟ دوسری جگہ یہ ہے کہ صالح علیہ السلام! جو کچھ تم کر رہے ہو اس کے لیے چاہیے تو یہ تھا کہ ہم تمہیں سنگسار کر کے مار دیتے لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ نظر آیا کہ نبی یونہی عامۃ الناس میں سے نہیں ہوتا تھا، یہ بڑے اونچے قبیلے کا انسان ہوتا تھا اور وہ ذاتی طور پہ بھی اتنے جوہر رکھتا تھا کہ قوم کی نظریں اس کے اوپر جمی ہوتی تھیں۔ اب وہاں حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ کم بختو! نہیں میرے قبیلے کا جو ڈر ہے، وہ تو تمہارے سینے میں ہے مگر جو پوری کائنات کا مالک ہے اس کا ڈر تمہارے سینے میں نہیں ہے۔ بہرحال سرداروں کو ان سے صلح کرنا پڑی۔ انہوں نے کہا کہ بتائیے کہ شرائط میں کیا ہیں؟

حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے مخالفین کے لیے ایک اونٹنی کی شرط کا معاملہ

عزیزانِ من! انہوں علیہ السلام نے کہا کہ شرائط کیا ہیں! یہ مویشی ہیں، انہوں نے پانی پی کر گھاس کھا کر جینا ہے، یہ ان کے لیے سامانِ زیست ہے، یہ رزق ہے، یہ سب کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ انہوں علیہ السلام نے کہا کہ نہیں صاحب! ایک عملی شرط ہونی چاہیے کہ اگر وہ پوری نہ ہو تو ہم سمجھیں کہ معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ کہا کہ لکھ لیجیے شرط کیا ہے۔ سنیے، عزیزانِ من! کہا کہ اس وقت تک کی تو

صورتِ حال یہ ہے کہ یہ بھیڑیں ''خان فتح اللہ'' کی ہیں' یہ بکریاں ''راجہ نتھو خان صاحب'' کی ہیں' یہ زمین جو ہے یہ فلاں ''چوہدری صاحب'' کی ہے۔انہوں نے کہا یہ تم نے یوں کیا ہوا ہے۔شرط یہ ہے کہ **هٰـذِهٖ نَـاقَةُ اللّٰـهِ**(11:64)۔یہ نہ ''نتھو خان'' کی بھیڑ ہے' نہ کسی ''رحمت علی'' کی بھیڑ ہے نہ میری ہے نہ تمہاری ہے' یہ اللہ کی اونٹنی ہے میں کسی نام سے منسوب نہیں کرتا۔یہ **نَـاقَةُ اللّٰـهِ** اور یہ **اَرْضِ اللّٰهِ** (4:97)۔اللہ کی بھیڑ ہے' اللہ کی زمین ہے۔

---

❶ تم نے لٹیا ہی ڈبودی۔تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ ملکیت ہی جائز نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ارض اللہ کی حیثیت اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان

عزیزانِ من! قرآن ہے اور اسی آیہ مقدسہ کا عملی مفہوم ہے جو نبی اکرم ﷺ کی اس جگمگاتی حدیث کے اندر ہے جو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کی زمین' اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔یہ حدیث اسی کا ترجمہ ہے۔یہ تھا وہ نظام جس کی مخالفت ہوتی تھی' یہ تھا جس کے لیے کہا کہ **فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** (2:190)۔آپ نے اب سمجھ لیا کہ اللہ کی طرف جب نسبت ہوتی ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ سبیل اللہ کے معنی پھر آپ نے سمجھ لیے کہ کیا ہوئے؟ انسانیت کے مفاد کی راہ میں ایک جنگ یہ ہوگی' دوسری جنگ ذاتی مفاد کے لیے ہوگی۔اگر یہ فرد کے لیے ہو' خاندان کے لیے ہو' قبیلے کے لیے ہو' وطن کے لیے ہو' قوم کے لیے ہو' تو یہ سبیل اللہ نہیں ہو سکتی۔

نظامِ خداوندی کے تحفظ کی خاطر جنگ کی اجازت

جنگ کا موضوع اپنا ہے' وہاں آؤں گا تو پوری تفصیل سے عرض کروں گا' یہاں صرف دو آیات پیش کرتا ہوں۔سب سے پہلے یہ ہے جہاں انہیں بھی جنگ کی اجازت دی گئی۔دیکھیے! اجازت دی جا رہی ہے۔تیرہ برس مکے کے بعد' مدینے میں آ گئے اور انہوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔کہا ہے کہ **اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39)۔یہ وہ لوگ ہیں جن پہ ظلم ہوتے چلے آئے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ اب یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیئے جاتے' وہ ان کے اوپر چڑھ دوڑے کہ ان کا نظام کہیں قائم نہ ہو جائے۔ہاں! انہیں اب اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی جنگ کریں کہا ہے کہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ** (22:39) چونکہ یہ حق کی خاطر فی سبیل اللہ جنگ کریں گے' اس لیے خدا کے قانون کی تائید و نصرت ان کے ساتھ ہوگی۔کون ہیں یہ لوجو مظلوم ہیں؟ کہا کہ **الَّـذِیْنَ اُخْـرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ** (22:40) پہلی چیز تو یہ ہے کہ ناحق ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا ہے۔ہمارے ذہنوں پہ نہیں چھوڑ دیا کہ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ صاحب! حق کے لیے نکالنا کیا ہوتا ہے اور ناحق نکالنا کیا ہوتا ہے۔قرآن تو وہیں بات صاف کر دیتا ہے۔انہیں کس جرم کی پاداش میں نکالا گیا؟ کہا کہ **اِلَّآ اَنْ یَّـقُـوْلُـوْا رَبُّـنَـا اللّٰـهُ** (22:40)۔جرم یہ تھا کہ یہ کہتے یہ تھے کہ صاحب!

پرورش دینے والا' رزق دینے والا' نشوونما دینے والا' خدا ہے۔ یہ جرم تھا ان کا' اس جرم کی پاداش میں انتہا یہ کی کہ انہیں گھروں سے نکال دیا۔ جرم دیکھ لیا آپ نے! کہا کہ سوال یہی نہیں ہے کہ قریش اور مدینے کے مسلمان یا یہ جونئی جماعت آئی ہے سوال اس کا نہیں ہے۔ ایک اصول ہے جو دیا ہے۔

فی سبیل اللہ جنگ کا مقصد صرف مظلوم کا تحفظ ہی نہیں بلکہ دوسروں کے مندروں کی حفاظت کرنا بھی ہے

برادرانِ عزیز! غور کیجیے فی سبیل اللہ کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے کہا کہ **وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَھُمۡ بِبَعۡضٍ لَّھُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡھَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا** (22:40) اگر یہاں ہماری یہ روش نہ ہو' ہم ایسا نہ کریں کہ ایک سرکش جماعت اٹھی ہے تو اس کے مقابلے کے لیے ان کی روک تھام کرنے کے لیے کوئی دوسری جماعت نہ اٹھے جو دفع اللہ ہو' جو ان کی Agression (جارحیت) کو روکنے کے لیے ہو' اگر دوسری جماعت نہ اٹھے تو کیا ہو؟ آگے پھر یہ ہونا چاہیے تھا کہ صاحب! مسلمان کوئی باقی نہ رہے۔ یہ سوال نہیں ہے۔ قرآن تو ایک عالمگیر اصول دیتا ہے۔ کہا کہ اگر یہ صورت ہو کہ کوئی جو جماعت Agression (جارحیت) پہ اتر آئے' کوئی ان کی مدافعت کے لیے نہ اٹھے' تو اس کا نتیجہ کیا ہو؟ کہا کہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی گرجا باقی نہ رہے' کوئی مندر نہ رہے' کوئی یہودیوں کا معبد باقی نہ رہے' کوئی مسجد باقی نہ رہے۔ گرجوں کی حفاظت کے لیے یہ قوم اٹھ کر کھڑی ہوگی۔ برادرانِ عزیز! یہ ہے دین۔ اس لیے کہ ابھی آتا ہے وہ ویکون دین للہ تاکہ دین کے معاملے کے اندر کسی قسم کا کسی پہ کوئی جبر نہ ہو' کوئی اکراہ نہ ہو۔ جی! کہیے کہ کیا اسلام شمشیر کے زور پہ پھیلا؟ جن کی شمشیر گرجوں' صوموں' مندروں کی حفاظت کے لیے اٹھتی ہے تو کیا وہ شمشیر کے زور پہ پھیلے گا؟ اور پھر وہ اس کے لیے اتنا بڑا فلسفہ صاحب! پوچھیے قرآن سے کہ کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے کہ ان جاحیت کرنے والوں کو روک دیا جائے گا' پھر ان کا نظام قائم ہوگا تو کیا یہ دھاندلی والا نظام ہوگا؟

مذہبی تعلیم عمر بھر وعظ و نصیحت تک ہی محدود رہتی ہے

کہا کہ **اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَھَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ** (22:41)۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر جب انہیں تمکن حاصل ہوگا تو وہ کیا کریں گے؟ تمکن حاصل ہوا ہے۔ ان کو مملکت مل گئی ہے' ان کی حکومت قائم ہوگئی ہے' اب تو حکومت قائم ہونے کے بعد کیا کریں گے؟ یہاں کہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے' ایتائے زکوٰۃ دیں گے۔ امر بالمعروف کریں گے' نہی عن المنکر کریں گے۔ ہر وہ چیز جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہوگی' اس حکماً رائج کریں گے۔ پھر تو یہ اپنی مملکت کی بات ہوگئی۔ حکومت قائم ہونے کے بعد یہ چیزیں ہونے والی ہیں۔

برادرانِ عزیز! یہاں امر آیا ہے۔ یہ امر مذہب میں آ کر وعظ رہ جاتا ہے۔ دین میں امر ہوتا ہے' دین میں قانون ہوتا ہے' مذہب میں وعظ ہوتا ہے' کہا ہے کہ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:31) قوت ہوگی تو آپ اس چیز کو روکیں گے' جس سے انسانیت کے مفاد پہ زد پڑتی ہو۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں Defensive کی اصطلاح کی حقیقی مفہوم

یہاں آپ نے دیکھ لیا کہ جہاں یہ جنگ کی پہلی اجازت مل رہی ہے' آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ Defensive War (مدافعتی جنگ) تھی۔ آج کی اصطلاح میں یہ کہیے کہ وہ چڑھ دوڑے اور انہوں نے ان کی ڈیفنس (دفاع) میں یہ کچھ کیا۔ اور یہ کیا کاہے کے لیے کیا' یہ بھی تو آپ نے دیکھ لیا! گرجوں کو اور صوموں کو اور مندروں کو راہبوں کی کوٹھڑیوں کو بچانے کے لیے لیکن اور آگے چلیے تاکہ بات مزید صاف ہو جائے۔ یہ مسئلہ ہے کہ صاحب! کیا اسلام میں جنگ Defensive (مدافعتی) ہے یا Agressive (جارحیتی) بھی ہو سکتی ہے؟ یہ اصطلاحیں ہم پہلے اپنے ذہن میں وضع کر لیتے ہیں' پھر اسلام کے نظام کو ان اصطلاحوں کے اوپر آ کر پورا اتارنے لگ جاتے ہیں کہ دیکھیے! یہ مدافعت کی جنگ ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا' میں نے لکھا بھی ہے کہ جنگ مدافعت ہی کی ہے لیکن یہ مدافعت کاہے کی ہے؟ آج کی اصطلاح میں ڈیفنس ہوتی ہے' اپنے ملک کو بچانے کے لیے' اپنی حکومت کو بچانے کے لیے' اپنی اسٹیٹ کو بچانے کے لیے' اسے Defensive War (مدافعانہ جنگ) کہتے ہیں۔ دوسروں کی مملکت کو چھیننے کے لیے ہو تو اسے War of Agression (جنگِ جارحیت) کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی ان اصطلاحوں کا مفہوم یہ ہے۔ اب یہ مفہوم ذہن میں رکھ کر ہم فیصلہ کرنے کے لیے چلتے ہیں کہ اسلام کی جو جنگیں تھیں' وہ مدافعانہ (Defensive) تھیں یا Agressive (جارحانہ) تھیں؟ یہ اصطلاحیں ہی بنیادی طور پر غلط ہیں اور آج کے باطل نظام کی ایجاد کردہ ہیں۔ ہیں یہ Defensive War (مدافعانہ جنگ) ہی' ڈیفنس کے لیے ہی ہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن نے وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ (22:40) کہا ہے کہ دفع تو مدافعت ہے اور مدافعت ترجمہ ہے Defensive کا لیکن وہاں مدافعت کس چیز کی ہو رہی ہے؟ گرجوں کی مدافعت' صوموں کی مدافعت' مندروں کی مدافعت۔ وہ مدافعانہ جنگ آپ نے دیکھ لیا۔ ٹھیک ہے اس میں مسجد کا بھی ذکر ہے۔ اگرچہ وہ سب سے آخر میں ذکر ہے' پہلے ان کے مندر بچانے کا ذکر ہے۔ مدافعت کی ایک اور شکل بھی ہوتی ہے۔ یہ مسلمان مدینے میں تھے' دوسرے مقامات کے اوپر وہ لوگ تھے جنہیں وہاں تنگ کیا جا رہا ہے' اذیت پہنچائی جا رہی ہے' ان پہ ظلم کیا جا رہا ہے۔ غور فرمائیے قرآن کن الفاظ میں ذکر کرتا ہے کہا ہے کہ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75)۔ یہ دیکھیے یہاں آ گیا فی سبیل اللہ کا لفظ مَا لَكُمْ (4:75) او! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ''تم اللہ کی راہ میں جنگ

کرنے کے لیے نہیں اٹھ رہے۔'' اب یہاں یہ چیز نہیں جو وہاں کہا تھا کہ وہ جو تمہارے اوپر جن گکر نے کو آ گئے ہیں۔ان کے خلاف کیوں نہیں اٹھتے۔یہاں تو یہ ابھی چیز نہیں' کہا ہے کہ **مَا لَكُمْ** تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک فی سبیل اللہ جنگ کی تصریح کا دوسرا پہلو

نظر آتا ہے کہ ذہن میں ابھی یہی چیز تھی کہ War وہی Defensive (مدافعانہ) ہے جو اس وقت ہونی چاہیے' جب وہ آ کر چڑھ دوڑیں۔کہا ہے کہ **مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (14:75) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے نہیں اُٹھ رہے۔(جنگ) اور آ گے۔عزیزانِ من! فی سبیل اللہ جنگ کی تصریح قرآن کے الفاظ میں سنیے: **وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا** (4:75)۔درآں حالانکہ صورت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان بستیوں میں رہنے والے مستضعفین کو پہلے مختلف طریقوں سے' حربوں سے' کمزور کر دیا گیا' پہلے ان کو کچل کر رکھ دیا ہے ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی مدافعت کر سکیں۔مستضعفین کا لفظ عجیب ہے صاحب! انہیں کمزور بنا دیا گیا ہے' پھر اس کے بعد ان پہ اتنے ظلم کیے ہیں کہ وہاں کے بوڑھے بچے عورتیں مرد چیخ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم کچھ نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اس ظالم بستی سے ہم کو کہیں نکال لے۔آپ غور فرما رہے ہیں کہ کہاں سے یہ چیخ و پکار ہوتی ہے آگے کہا کہ **وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا** (4:75) اپنے ہاں سے کوئی کسی قسم کا Protector (محافظ) ہمارے لیے بھیج' **وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا** (4:75)۔اپنے ہاں سے کوئی مددگار بھیج دو۔عزیزانِ من! یہ بڑا عجیب نکتہ ہے۔پکارنے والے خدا کو پکار رہے ہیں کہ ہماری مدد کر۔خدا اس جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا' سنتے نہیں ہو کہ وہ ہمیں پکار رہے ہیں' تم اٹھتے کیوں نہیں ہو' مدد کے لیے؟ یوں خدا کی مدد آتی ہے۔وہاں سے کیا مشکل تھا کہ ایک اشارۂ ابرو ہوتا' پوری کی پوری بستی غرق کر دی جاتی۔وہاں سے کیا مشکل تھا کہ وہ سبز عماموں والے اور سفید گھوڑیوں والے وہاں سے آ جاتے اور آ کر ان کو تہس نہس کر دیتے۔کیا مشکل تھا کہ آسمان سے کنکریاں برستیں اور یہ سارے کے سارے زمین میں دھنس جاتے۔وہاں کیا کہا؟ یہ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' سنتے نہیں ہو کہ وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور تم بیٹھے ہوئے ہو۔کیا بات ہے قرآن کی! اور بات وہ ہے جس کے لیے میں نے یہ مستضعفین دہرایا تھا' جنہیں کمزور کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی محافظت آپ نہیں کر سکتے' ان پہ ظلم کر دیا گیا ہے۔ظلم کی روک تھام کرنے کی خود ان میں ہمت نہیں ہے اور کہا ہے کہ ان مظلوموں کی مدد کے لیے کیوں نہیں اٹھتے۔اسے کہا ہے جنگ فی سبیل اللہ۔

سبیل اللہ جنگ اور طاغوتی جنگ میں بنیادی فرق ہے

یہ دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لیے ہوتی ہے **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ** (4:76) کفار طاغوت

کے لیے جنگ کرتے ہیں اور اس کے مقابل میں کفر ہے۔ سبیل اللہ کے مقابل میں جو کوئی بھی جنگ ہو گی وہ فی سبیل الطاغوت ہو جائے گی۔ دو ہی آیات ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام میں جنگ کیسے ہوتی ہے' کہاں اجازت اس کی ہوتی ہے؟ اب دونوں میں آپ نے دیکھ لیا کہ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:76) مدافعانہ جنگ ہے لیکن مدافعانہ قرآن کی اصطلاح کے اندر مدافعانہ ہے۔ یہ مدافعت تو مذہبی آزادیوں کی مدافعت کے لیے ہے' کمزوروں پہ جہاں کہیں بھی ظلم ہوتا ہو ان کو روکنے کے لیے ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے تو ایران اور قیصر ملوکیت کا گڑھ سمجھا جاتا تھا

کہنے کو تو ہم کہیں گے کہ وہاں دو ہی سلطنتیں تھیں: ایک ایرانی مملکت اور دوسری رومیوں کی مملکت۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ یہ دو بلاک تھے جیسے خاص نظریوں کے تابع۔ آج یہ دو بلاک بن گئے [1] ہیں اور اُس دور میں ساری دنیا میں یہی دو بلاک سب سے آگے تھے: ایران' ہزاروں سالوں کے ایک خاص نظام تمدن کا مالک تھا اور روم' رومن امپائر تھی اور ان کی تہذیب و تمدن کو تو آپ دیکھتے ہیں کہ کیا تھی۔ یہ دونوں ملوکیت اور کیپٹل ازم کے مرکز تھے۔ ایران کتنا گڑھ تھا' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے ذرا پہلے وہاں مزدکیت پیدا ہوا' جس نے کمیونزم کو اپنی انتہائی مشکل میں وہاں رائج کرنا چاہا۔ یہ اس ملوکیت اور سرمایہ داری کا ردِعمل تھا۔ اس سے نظر آتا ہے کہ وہاں کس شدت کا نظام سرمایہ داری تھا کہ اس کا ردِعمل وہاں مزدکیت کی شکل میں جاری ہوا تھا۔ ایران کی یہ کیفیت تھی اور قیصر کا نام تو ملوکیت کے لیے آج بھی دنیا بھر میں ضرب المثل ہے' ملوکیت کہنی ہو تو قیصریت ہی کہتے ہیں۔ یہ دونوں ان دو نظریۂ حیات کے علمبردار اپنی اپنی جگہ یہ دونوں دین تھے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات اپریل 1969ء کی 27 تاریخ کو کہے گئے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کا رومن امپائر اور ایران کی حکومتوں کو پہلی خطوط و کتابت کا مقصد طاغوتی نظام کا خاتمہ ہی تھا

نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاں سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد' ان دونوں کے ہاں اسلام کی اشاعت کے لیے ان کو چٹھیاں لکھی تھیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے یہ چٹھیاں کیا لکھیں تھیں؟ سنیے! انہیں لکھا یہ تھا کہ اگر تم عدل اور انصاف کا نظام اپنے ہاں رائج نہیں کرو گے تو یاد رکھو! تمہارے ہاں کے کاشتکاروں پہ جو تمہارے ہاں کا زمیندار ظلم کر رہا ہے' اس کا بدلا تم سے لیا جائے گا۔ اب بتا دیجیے کہ اس کے بعد اگر یہ جنگ ہو گی تو اسے آپ مدافعانہ کہیں گے یا یہ جارحانہ ہو گی؟ یہ کس کے لیے ہو گی؟ قرآنِ کریم نے اسے فی سبیل اللہ (4:76) بتایا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہاں کے کاشتکاروں پہ ظلم ہو رہا ہے۔ یہ کون ہیں؟ یہ نسلی اعتبار سے غیر عرب ہیں اور تاریخ میں ساری عمر کا ان دونوں کا آپس میں بیر ہے۔ یعنی یہ جو ہمسایہ قوم ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ عربوں کے مسلسل صدیوں سے دشمن ہے۔ مذہبی اعتبار سے مجوسی ہے'

مذہب دوسرا ہے' وطن دوسرا ہے' قوم دوسری ہے' نسل دوسری ہے' ہمیشہ سے جنگ کے ساتھ' یہ ان کے ساتھ رہنے والے ہیں۔ وہاں اُس علاقے میں غیر مسلم کاشتکاروں پر کوئی ظلم ہو رہے ہیں اور جو پہلی چٹھی یہاں اشاعتِ اسلام کی لکھی جا رہی ہے وہ یہ چٹھی لکھی جا رہی ہے اور یہ چٹھی قیصر کو گئی تھی کہ تمہارے ہاں کے امرا اپنے محکوموں کے اوپر جو زیادتیاں کر رہے ہیں' ان کے ذمہ دار مرکزی طور پہ تم ہو اور تمہارا انظام ہے۔ اگر باز نہیں آ ؤ گے تو یاد رکھو! اس نظام کا تختہ الٹ کر رکھ دیا جائے گا تا کہ اللہ کے کسی بندے پر کسی قسم کا کوئی ظلم نہ ہونے پائے۔ بتایئے اس جنگ کو آپ کیا کہیں گے؟ کیا یہ جوع الارض کے لیے جنگ تھی؟ کیا یہ Colonialism (استعماریت) تھی؟ کیا یہ Imperialism (سامراجیت) تھی؟ سنیے! یہ ہے جنگ فی سبیل اللہ اور اس کے برعکس دوسری جنگ ہے فی سبیلِ طاغوت۔

عزیزانِ من! اگر کوئی اور جذبۂ محرک بھی ہو جائے تو جنگ فی سبیل الطاغوت ہو جائے گی۔ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (2:190) یہ جو تمہارے اوپر چڑھ دوڑے ہیں' ان سے جنگ کرو۔ جنگ کے متعلق یہ مسلمہ چلا آ رہا ہے کہ

Everything is Fair in It❶

وہاں جنگ ہی نہیں بلکہ وہاں تو Love (محبت) میں بھی یہی کہتے ہیں۔ ''تے ہُن تے ساڈے سامنے ہون ڈیا ہیگا جنوں Love کیندے نیں' کی کج Fair (جائز) ہوندا اے اودے وچ❷۔''

Everything is Fair in It❸

یہ دنیا میں مسلمہ ہے۔ یہاں کہ جارحانہ طور پہ' جنہوں نے حملہ کیا ہے' ان کے خلاف اٹھو۔ کہا ہے وَ لَا تَعْتَدُوْا (2:190) جادہ انا صف سے تمہارا ایک قدم آگے نہ بڑھے۔ یاد رکھو! دیکھا فی سبیل اللہ جنگ کیا ہوتی ہے؟ یہ وہ جنگ ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا (5:9) دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس کے اوپر آمادہ کر دے تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ اس جنگ کے متعلق یہ ہے کہ دشمن میدانِ جنگ میں ہے اگر وہاں کا کوئی فرد سفید جھنڈی دکھا کر پناہ کے لیے تمہارے پاس آئے تو اس کو پناہ دو۔ پھر پناہ دے کر کیا کرو؟ کہا کہ اسے قرآن سناؤ کہ یہ ہے ہمارا نظام جس کے لیے ہم یہ کچھ کرتے ہیں۔ پھر کیا کرو؟ کہا کہ اسے قرآن سناؤ کہ یہ ہے ہمارا نظام جس کے لیے ہم یہ کچھ کرتے ہیں۔ پھر کیا کرو؟ اس کے بعد اگر وہ کہے کہ نہیں صاحب! میں تو اپنے ہاں جانا چاہتا ہوں' یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ سنیے' عزیزانِ من! اسلام کا جنگ کیا ہے؟ یہ پناہ کے لیے آ گیا ہے' اس کے لیے یہ ہے کہ اسے پناہ دو۔ چونکہ یہ جنگی قیدی ہے' اس جنگی قیدی کے لیے اور بات ہو گی کہا ہے کہ اسے قرآن سناؤ۔ سننے کے بعد اگر وہ کہے کہ نہیں صاحب! میرا جی نہیں لگتا' جی نہیں ٹھکتا' میں جانا چاہتا ہوں۔ تو اپنی حفاظت میں اس کی پناہ گاہ کی طرف پہنچا کے آ ؤ۔ لَا تَعْتَدُوْا (2:190) اب لَا تَعْتَدُوْا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی مرضی پہ چھوڑ دیا' اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حدود ہم نے مقرر کی ہیں' ان سے تمہارا

ایک قدم آگے نہ بڑھ جائے۔ یادرکھو! اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (2:190) ہمارے لیے حد سے تجاوز کرنے والا پسندیدہ نہیں ہے۔ جنگ کی انتہا یہ ہے کہ تم مجاہد ہو، غازی ہو، جان دیتے ہو، شہید ہو، مقرب ہو، خدا کے نزدیک مقرب ترین ہو جاتے ہو۔ تو بھی کہا ہے کہ اگر اس میں بھی تمہارا پاؤں اس حد سے ایک قدم آگے بڑھ گیا تو لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (2:190) ہم تمہیں پسند نہیں کریں گے۔''فیرا و جنت کتھے ہور تھاں جالینی، ساہڈے لاگے نہ آنا یادرکھو❹۔'' کہا کہ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (2:191)۔ ٹھیک ہے کہ پھر جن گھیے۔ یہاں پھر یہ بات نہیں ہے کہ ایک گال پہ طمانچہ کھاؤ تو دوسرا گال سامنے کر دو۔ یہ ظالم ہیں، تم مظلوم کی مدافعت کے لیے، حفاظت کے لیے اٹھے ہو، پھر تو برابر کی بات ہے، ٹھیک ہے جہاں جنگ ہوتی ہے پھر سختی سے جنگ کرو۔ انہوں نے ناحق گھروں سے نکالا ہے، تم بھی نکال سکتے ہو اگر سمجھو۔ کیسے نکال سکتے ہو؟ سنیے، عزیزانِ من! ایک وہ کہا تھا کہ انہوں نے تمہیں گھروں سے نکالا۔ وہ کہا تھا بغیرِ حق۔ یہاں کہا ہے کہ تم بھی ان کو نکال سکتے ہو۔ تو بات تو کہیں گے کہ صاحب! وہی ہوئی۔ کہا کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (2:191) یہ جو یہاں رہتے ہوئے فساد اور فتنہ پھیلاتے چلے جا رہے ہیں یہ قتل سے بھی زیادہ شدید ہے۔ جنگ یہی نہیں ہے کہ کوئی اعلانِ جنگ کر کے گولی چلانی شروع کر دے اس گولی چلانے کے علاوہ جو وہاں بیٹھے ہوئے یہ سازشی جو کچھ ملکوں کے اندر کرتے ہیں وہ تو جنگ سے کہیں زیادہ خطرناک عواقب کا باعث ہوتا ہے۔

---

❶ اس میں ہر چیز جائز ہے۔

❷ اب تو ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ جسے محبت کہتے ہیں، اس میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔

❸ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

❹ پھر وہ جنت کسی جگہ جالینا، یادرکھو! ہمارے نزدیک نہ آنا۔

فی سبیل جنگ کے دوران دارالامن میں پناہ حاصل کرنے کی نوعیت اور اس کا حل

میں ابھی آگے چل کر عرض کروں گا، یہاں قرآن نے ایک اور بات کہی ہے۔ اب یہ ہو گیا۔ کعبے کے متعلق قرآن نے یہ چیز کہی ہوئی ہے کہ وہ دارالامن ہے کہا کہ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (2:191) کعبے میں اگر ان میں سے کوئی آ جائے، تو وہاں جنگ نہیں کی جائے گی۔ گویا پھر تو یہ موج ہو گئی ''قتل کیتا، مسیتے جاوڑیا'' پولیس وہاں گئی تو شہہ سرخی میں اخباروں کے اندر لگا کہ ہاں صاحب! مسجد کی جو تقدیس ہے اس کو اجاڑ دیا، ختم کر دیا۔ مجرم اندر ہے، صاحب! اندر جا نہیں سکتے، دارالامن ہے، اس لیے کہا ہے کہ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (2:191) لیکن یہ اتنا سا ٹکڑا تو ہمارے مذہب کا ہے آگے کہا کہ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ

(2:191) اگر یہ وہاں بھی باز نہیں آتے ہیں جنگ کرتے ہیں تو **فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ** (2:191) جو ان قوانین کو ہی نہ مانیں پھر اس کا یہی بدلا ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ جنگ کرو۔ یہ اس کی جزا ہے۔ **فَاِنِ انْتَهَوْا** (2:192) انہوں نے جنگ چھیڑ دی ہے۔ وہاں بھی باز نہیں آئے، تم نے ان کو پکڑ لیا انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! ہم رک گئے۔ تو پھر کیا ''مار دے ترے جاؤ گے''❶؟ کہا کہ **فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (2:192) وہ رک گئے، تم بھی رک جاؤ۔ خدا حفاظت دینے والا ہے، اس کے قانون کے اندر رک جانے والے کے لیے حفاظت بھی ہے۔ صرف حفاظت ہی نہیں وہ رحیم بھی ہے، سامانِ نشو و نما بھی بہم پہنچائے گا۔

فتنے کے ختم ہونے کے وقت تک جنگ جاری رکھنے کی اصل نوعیت اور ہمارے ہاں پائے جانے والا تصور

کہا کہ **وَقٰتِلُوْهُمْ** (2:193) ان کے ساتھ جنگ کرتے جاؤ **حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ** (2:193) فتنے کا امکان باقی نہ رہے۔ یہ چیز کیا ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ فتنہ کی قرآن نے خود وضاحت کر دی ہے کہ بات کیا ہے۔ پھر ذہن میں وہ چیز لے آیئے کہ اسلام شمشیر کے زور پہ پھیلا ہے، پھر یہ چیز سامنے لے آیئے جو قرآن نے کہا تھا کہ ان کی مدافعت کرنا ہے۔ پھر اس آیت کو سامنے لایئے اور پھر اس کے غلط مفہوم کو سامنے لایئے پھر قرآنی مفہوم کو سامنے لایئے۔ ان کے ساتھ جنگ کرو تا آنکہ فتنہ ختم ہو جائے۔ فتنے ختم ہونے کے لیے عملی دلیل اور مثال کیا ہو گی؟ کہا کہ **وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ** (2:193) دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔ یہ الفاظ ہیں مگر آپ کے ہاں کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ **وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ** (2:193) ہر جگہ اسلام پھیل جائے اس لیے جنگ کرتے جاؤ۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا دین ہو جائے۔ قرآن میں **وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ** (2:193) ہے، اللہ کا دین نہیں ہے کہ ہر جگہ پھر اللہ کا ہی دین ہو جائے اور اللہ کا جو دین ہے، وہ اسلام ہے، بس ساری دنیا پہ پھر اسلام ہو جائے ''مار دے جاؤ جنگ کر دے ترے جاؤ❶۔'' اس طرح سے ہر جگہ اسلام ہو جائے۔

اپنی اپنی صوابدید کے تحت رب کو رب کہنے والوں کی مخالفت کرنا بہت بڑا جرم ہے

عزیزانِ من! ان کے ہاں یہ ہے وہ چیز جو لی جاتی ہے۔ قرآن نے ابھی ابھی ظالمین کے خلاف جو الزام عائد کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ یہ مظلوم وہ ہیں جن کو گھروں سے اس جرم کی پاداش میں نکال دیا گیا کہ **وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ** وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ انہوں نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ اللہ کو اپنا رب مانیں۔ یعنی یہ اتنی بڑی ظلم کی چیز ہے خود خدا نے کہا ہے کہ کسی کے لیے ایسی صورت پیدا کر دینا کہ کوئی بطیّبِ خاطر کسی مذہب یا دین کو اختیار نہ کرے بلکہ زبردستی کسی سے یہ کرایا جائے کہ تم یہ دین نہیں اختیار کر سکتے۔ کہا کہ یہ ہے ان کا جرم۔ ان کے اس جرم کی پاداشت میں ان کے ساتھ جنگ کرو اور آگے کہا کہ یہ اس لیے کرو کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ مسجدیں، گرجے، مندر، صومعے انسانوں کی دست برد سے آزاد ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں کہ انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں دوسری جماعت Agression (جارحیت) کرنے والوں کو، جارحیت کرنے والوں کو، روک نہ دیں تو یہ مندر اور گرجے، یہ صومعے اور مسجدیں سب ختم

ہو جائیں۔ ان کے لیے تو قرآن یہ کہتا ہے مگر یہ ہیں کہ ان کے ہاں سے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم جنگ کرتے چلے جاؤ تا کہ سارے مندر مسجدوں میں، گرجے اور صومعے جو ہیں ''او ہناں دی تھاں تے مسیتاں بن جان ❺ ''۔ اسلام ہر جگہ رائج ہو جائے۔

---

❶ قتل کیا اور مسجد میں جا گھسا۔

❷ پھر اس کے بعد ان کی خوب خبر لو۔

❸ کیا انہیں قتل کرتے چلے جاؤ گے؟

❹ قتل کرتے چلے جاؤ، جنگ کرتے چلے جاؤ۔

❺ ان کی جگہ پہ مساجد بن جائیں۔

قرآن حکیم کے مطابق ہر شخص کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کی رضامندی سے کس دین کو اپناتا ہے

عزیزانِ من! سوچیے! قرآن کی ایک آیت کے چار لفظوں کو الگ کر کے لے لینے سے، بات کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ خود قرآن میں یہ چیز ہے کہ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (2:256) اس کے یہ معنی تو ہو ہی نہیں سکتے کہ ان سے زبردستی جنگ کرتے چلے جاؤ تا آنکہ فتنہ مٹ جائے یعنی اللہ کا دین سب جگہ قائم ہو جائے کہا ہے کہ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ (2:193) پھر یہاں وہی اللہ کی بات آ گئی، جس میں دین کے معاملے میں، کسی انسان کی زبردستی اور جور و اکراہ کا کوئی دخل نہ ہو، جو شخص چاہے وہ صرف اللہ کے لیے، جو بھی دین اختیار کرنا چاہتا ہے اختیار کر لے، یہ فضا پیدا ہو جائے۔ گرجے بھی رہیں، صومعے بھی رہیں، مندر بھی رہیں۔ گرجے یا صومعے رہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی عمارتیں کھڑی رہیں۔ یہ چیزیں جن جن مذاہب کے سمبل (علالت) ہیں ان کو آزادی ہونی چاہیے وہ ان چیزوں کی تبلیغ کریں۔ یہ تو قلب و ذہن کی رضامندی سے مطمئن ہونے سے، علیٰ وجہ البصیرت کسی چیز کو Accept (قبول) کرنا ہے۔ علیٰ وجہ البصیرت کسی چیز کو Reject (ردّ) کرنا ہے۔ یہ ہے کفر اور ایمان۔ یہ ہے وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ (2:193) کسی انسان کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ جسے کوئی اختیار کرنا چاہتا ہے، اپنے خدا کے لیے، اپنے ایشور کے لیے اپنے God کے لیے، اپنے رب کے لیے، اللہ کے لیے وہ اسے اختیار کرے۔ وہاں تک جنگ کرو تا آنکہ یہ فضا پیدا ہو جائے اور دین کے معاملے میں کوئی کسی قسم کی کوئی زبردستی نہ رہے۔ فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (2:193) ہاں اگر یہ رک جائیں، جہاں بھی یہ رک جائیں، ایسی فضا پیدا ہو جائے، وہیں رک جاؤ، اس سے آگے نہیں بڑھنا زیادتی تو ظالمین پہ کی جاتی ہے، جو ظلم سے باز آ جائے اس پہ زیادتی کیوں کی جائے۔ جنگ میں آج، انٹرنیشنل طور پہ ایک چیز سمجھی جا رہی ہے، ڈسکشن (بحث و تمحیص) ہو رہی ہے، کسی حد تک اس کے اوپر قومیں یو این او وغیرہ والے عمل پیرا بھی ہو رہے ہیں، وہ کیا

چیز ہے؟ سنیے! دو جماعتوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ سیز فائر (جنگ بندی) کرتی ہے کہ بھئی! یہ معاملے تو بعد میں طے ہوتے رہیں گے کہ تم نے کیوں جنگ کی، انہوں نے کیوں مقابلہ کیا، کون حق پہ تھا، کون ناحق ہے، یہ بعد میں طے ہوجائے گا۔ پہلی چیز یہ کرو کہ یہ آتش داری تو بند کرواور اس کی بہت بڑی Achievement (فوز) کہا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ بڑی چیز ہے۔

---

❶ ان کی جگہ پہ مساجد بن جائیں۔

لڑائی کی صورت میں انسانی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر حج اور عمرہ کے ان مہینوں میں حرمت کی ترغیب

جنگ اس وقت ہوتی ہے، جب جذبات شدت اختیار کر جاتے ہیں جیسے دو افراد میں لڑائی اس وقت ہوتی ہے۔ اگر کسی کو غصہ نہ چڑھے تو لڑائی ہوتی نہیں ہے اور جب تک غصہ چڑھا رہے اس وقت تک لڑائی ہوتی ہے۔ اگر کسی طرح لڑتے لڑتے بھی کسی کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ لڑائی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی لیے وہ جو زیادہ تیز ہوتا ہے اس کو ٹھنڈا پانی پلایا کرتے ہیں یا وہ کھڑا ہے تو اس کو بٹھا دیتے ہیں۔ یہ جو چیزیں ہوتی ہیں یہ دورانِ خون کی تیزی کو کم کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اگر غصہ کم ہوجائے تو لڑائی تھم جاتی ہیں۔ سیز فائر (جنگ بندی) سے وہ جو دوسرے کو مارنے کا جذبہ ہوتا ہے، وہ جو بڑھتے چلے جانا، سرکشی اختیار کرنا ہوتا ہے، آپ سیز فائر کر دیجیے، جذباتی طور پہ وہ چیز ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہاں تو یہ چیز ہے کہ کسی طرح سے یہ کوئی مل کر سیز فائر کرائے۔ وہاں جنگ کے قوانین میں، یہ چیز ہے کہ کچھ مہینے ایسے رکھ دیئے گئے کہ جن میں جنگ ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر آج یہ ہے کہ جنگ بڑے زوروں سے چلی آرہی ہے، رمضان میں بھی ہورہی ہے، شوال میں بھی ہورہی ہے۔ اس کے بعد تین مہینے تو فوری آگئے، وہ ہیں ذیقعد، ذی الحج اور محرم ان کو شہرالحرام کہتے ہیں یعنی حرمت والے مہینے، ان میں احترام کرنا چاہیے یعنی ان میں جنگ نہیں ہوسکتی۔ اس سے خود بخود جنگ رک گئی۔ یہ سیز فائر بیک وقت تین مہینوں کے لیے ہوگیا اور اس کے اندران کا وہ جو عالمگیر اجتماع ہے (حج) ہے وہ بھی اسی میں آگیا کہ بیٹھ کر سوچو کہ یہ کیا ہوا ہے، اسے کیسے ہونا چاہیے اور ایک درمیان میں رجب کا مہینہ وہ تھا جس میں ان کا عمرہ ہوا کرتا تھا۔ یہ تین مہینے متواتر شہرالحرام ہوئے ایک مہینہ وہ یہ رجب کا ہوگیا۔ اب سیدھی سی بات ہے کہ سیز فائر ہو۔ یہ تو دو پارٹیوں کے درمیان ہوگا۔ یہ حج بین الاقوامی کنونشن ہوگی، یہ انٹرنیشنل Resprocal Agreement ہوگا۔ اگر صورت یہ ہو کہ ایک پارٹی تو سیز فائر پہ قائم ہو اور دوسری پارٹی اُدھر سے ڈز کرتی چلی جائے تو یہ تو مرہی گئی۔ قرآن کریم نے سیز فائر کے مہینوں کا ذکر کیا اور کہا کہ یاد رکھو! **اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَ الۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ** (2:194) یہ جو حرمت والا مہینہ ہے اور جو اسے حرمت والا مہینہ مانے یہ اسی کے لیے ہے۔

برادرانِ عزیز! عربی جاننے والے جان سکتے ہیں کہ یہ کتنی خوبصورت ترکیب ہے۔ وہ جیسے وہاں آیا تھا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) لیکن وہ میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ اس کا غلط ترجمہ ہوتا ہے کہ آزاد کے بدلے میں آزاد مارا جائے' غلام کے بدلے میں غلام ہی کو مارا جائے یعنی کسی غلام کو آزاد نے مارا ہے تو اس آزاد کو پھانسی نہ دی جائے''لبھو جا کے پئی غلام کیہڑا ہیا اے اوہنوں لیاؤ❶''۔ یہ عربی محاورے سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ یہ ان کے ہاں ایک محاورہ ہے اور اس وقت بولتے ہیں جب دونوں کو یکساں پلڑوں میں رکھنا ہوتا ہے' کامل پوری مساوات قائم کرنا ہوتی ہے تو ان کے ہاں یہ اصطلاحاً اس طرح سے بولتے ہیں کہ قصاص کے معاملے میں پوری پوری مساوات قائم رکھنا ہے۔ یہاں بھی وہی چیز ہے۔ دو پارٹیوں کے درمیان بات آئی ہے۔ کہا ہے کہ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ (2:194) سیز فائر (جنگ بندی) ان کے لیے ہے جو سامنے سے سیز فائر کرے۔ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ (2:194) اور جو اس احترام کا احترام نہیں کرتا تو ان کا پھر بدلا لو۔ کیا بات ہے ان عربی کے الفاظ کی! کیا بات ہے قرآن کے الفاظ کی! یہ عجیب ترکیبیں ہیں کہا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ (2:194) وہ جتنا تم سے زیادتی کرتا ہے' تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو۔ زیادتی کے لفظ میں یہ آ سکتا ہے کہ ایک قدم بھی زیادتی ہے' دس قدم بھی زیادتی ہے' وہ ایک قدم آگے زیادتی میں بڑھے اور تم دس قدم بڑھو۔ اس کے لیے کہا کہ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (2:194) جتنی انہوں نے زیادتی کی ہے' قانون شکنی کی ہے' تم اس حد تک اس کا بدلہ ان سے لے سکتے ہو۔

زندگی بھر خدا تعالیٰ کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے کا طریق

کہا کہ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (2:194) تمہیں تو ہر صورت میں خدا کے قوانین کا اتباع کرنا اور نگہداشت کرنا ہے۔ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (2:194) تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہو' تو اگر اللہ کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کی پوری پوری پابندی کرو۔ پھر اللہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ پھر اللہ ساتھ ہونے سے جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ کو تو معلوم ہے۔ اللہ یوں ساتھ ہوا کرتا ہے۔ ایران کی جنگ میں ہرمزان❶ جب پکڑا ہوا آیا ہے تو اس نے کہا تھا کہ یہ اللہ کا ساتھ ہونا کیا ہے۔ ایران کی یہ اتنی بڑی عظیم سلطنت تھی۔ وہ تو جب میں وہاں اسلامی جنگوں میں آؤں گا تو عرض کروں گا کہ یہ اسلام کا لایا ہوا کتنا عالمگیر انقلاب تھا۔ ایران جیسی سلطنت اور رومن امپائر جیسی سلطنتوں کی ہزاروں سال کی تہذیبوں کو مٹا دیا۔ بہرحال وہاں ایران سے جب ہرمزان آیا ہے گرفتار ہو کر' تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کہو ایران والو! ایران کی کیفیت یہ تھی کہ عربوں کے خلاف جنگ نہیں کرتے تھے' کہتے تھے کہ اس قوم سے جنگ کرنا ہماری ہتک ہے' ان سے جنگ ہمارے باعثِ ذلت ہے یعنی ان سے دوستی کرنا تو ایک طرف رہا' وہ ان سے جنگ بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ زشیر شتر خوردن وسوس مار❷ 'یعنی یہ قوم دودھ پیتی ہے تو اونٹنی کا' گو کا گوشت کھا جاتے ہیں۔ تو ان ہرمزان سے پوچھا کہ کیا بات

ہے‘اس سے پیشتر تو عرب تمہاری نگاہوں میں اس قدر کمزور اور ذلیل ہوتے تھے۔ یہ آج کیا ہوا کہ اتنی سی فوج یہاں سے گئی ہے اور اتنی بڑی تمہاری عظیم سلطنت‘ اس طرح سے شکست کھا گئی۔ عزیزانِ من! ایسے شکست کھا گئی تھی کہ ان کا یزدگرد‘ جو بادشاہ تھا‘ وہ جو بھاگا ہے‘ وہ شہر بہ شہر‘ قریہ بہ قریہ‘ دشت بہ دشت‘ بھاگتا ہوا چلا گیا‘ کہیں اسے پناہ نہیں ملی۔ آٹا پیسنے والے خراش کے اندر جا کر چھپ گیا اور وہاں وہ جو خراش والا تھا‘ اس نے اسے مار دیا۔ پن چکی کے اندر اس کی موت ہوئی تھی‘ اسے کہیں پناہ نہیں ملی تھی۔ کیا ایسی شکست بھی کہیں دنیا میں ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ عرب جن کی کیفیت ایرانیوں کے مقابلے میں کل تک تو یہ تھی۔ آج اتنی بڑی شکست کے حکمران تم ان کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ یہ ہوا کیا؟ ہرمزان کا جواب ہے‘ قابل غور‘ آنکھیں کھول دینے والا۔ یہ لوگ تھے جو اسلام کو سمجھے ہوئے تھے۔ کہا کہ اس سے جو پیشتر لڑائی ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف صرف عرب ہوتے تھے۔ یہ دونوں میں جنگ ہوتی تھی۔ اب جو جنگ ہوئی تو ایک طرف وہی ایرانی تھے اور دوسری طرف عرب اور خدا ان کے ساتھ تھا۔ عربوں کا مقابلہ تو ہم کر لیتے‘ خدا کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ بات سمجھتے تھے کہا ہے کہ **وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ** (2:194) جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے تو اللہ کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں۔ دیکھ لیا اللہ کا قانون کس کے ساتھ ہوتا ہے‘ قانون جنگ میں بھی وہ قانون کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ تو ہو گئے میدانِ جنگ میں لڑنے والے۔

---

❶ ہرمزان ایران کا ایک نامور گورنر‘ جری سپہ سالار‘ ماہر سیاستدان اور نہایت مکار اور عیار حریف تھا۔

❷ اونٹوں کا دودھ پینے اور سوسمار (گوہ) کھانے والے گنوار۔

اب ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود جنگ میں شریک ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے‘ کمزور ہیں‘ بوڑھے ہیں‘ بچے ہیں‘ ان کے لیے کیا کیا جائے؟ یا دوسرے بھی جو لوگ ہیں ان کے لیے کیا کیا جائے۔ کہا کہ جنگ یہی نہیں ہے کہ تلوار لے کر میدان میں آ جانا ہے۔ جنگ کے لیے تو بڑی Provision (گنجائش) کی ضرورت ہوتی ہے‘ بڑے اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (2:195)۔ یہاں پھر سبیل اللہ آ گیا۔ کہا کہ یہ اللہ کی راہ میں جنگ ہو رہی ہے۔ اپنی دولت کی تھیلیاں تمہارے پاس ہیں‘ ان کے منہ کھول دو۔ **اَنْفِقُوْا** کے معنی ہوتے ہیں کہ ان کے منہ کھول دو۔ کہا ہے کہ اور آگے کہا ہے کہ **وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ** (2:195)۔ یہاں پھر ایک آیت آئی ہے‘ جس کا غلط مفہوم وہ لیا جاتا ہے‘ جس سے جہاد کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ** (2:195)۔ اتنا ہی ٹکڑا خدا کہا ہے: اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک میں مت ڈالو بھئی‘ صاحب! میدانِ جنگ میں جانا تو دیکھو کہ کتنے آدمی مر جاتے ہیں۔ اور یہ کہاں ہے؟ یہ جنگ کی آیات ہیں۔ اس قدر شدت سے‘ تاکید سے‘ احکام دیئے

جارہے ہیں۔ درمیان میں ان سے یہ کہا جارہا ہے جو جنگ میں تو نہیں جاتے لیکن مالدار ہیں۔ اب جو روپیہ دینا ہے جو دولت دینی ہے یہ قرآن نے عَلٰی حُبِّہٖ (2:177) کہا ہے کہ اس کی کشش بڑی ہوتی ہے۔ کہا کہ ایسے وقت میں تھیلیوں کے منہ میں کھول دو۔ یادرکھو! یہاں اگر تم نے یہ کیا کہ اپنے لیے رکھا اور منہ بند کیا تو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں پڑ جاؤ گے' تباہی میں آ جاؤ گے۔ اس لیے ایسا نہ کرنا۔ ایسے وقت میں جو Selfishness (خودغرضی) ہوتی ہے۔ کہا کہ اس سے اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ کہا کہ وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (2:195) توازن برقرار رکھو۔ قوم کے مجاہدین وہاں جارہے ہیں' تم ان کے لیے خرچ اخراجات کا پورا انتظام کرو' تم یہ کچھ کرنا یادرکھو۔ یہ ہے قوموں کا وہ توازن برقرار رکھنا۔ جن میں توانائیاں ہیں' جنگ کرنے کی ہمت ہے' طاقت ہے' عمر ہے' وہاں جائے جو ایسے نہیں جاسکتے' جن کے پاس مال ہے' وہ مال دیں۔ یوں پلڑے برابر رکھو۔ انہیں ہی خدا پسند کرتا ہے۔ وقت ہوگیا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت 195 تک ہم آ گئے۔ بات حج سے شروع ہوئی تھی' درمیان میں یہ چیز کہی گئی کہ کیوں یہ جنگ کے احکام دیئے۔ بات پھر حج کے اوپر آ گئی۔ یوں فضا میں امن قائم کرو اور پھر اس اجتماع کے لیے آ جاؤ' آ کر پھر مشورہ کر کے دیکھو کہ آگے کیا کرتا ہے۔ برادرانِ عزیز! آیت 196 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

بیالیسواں باب: سورۃ البقرة (3)' (آیات 196 تا 207)

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ ۚ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1969ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں آج آغاز کلام سورۃ البقرۃ کی آیت 196 سے ہو رہا ہے: (2:196)

دین کے برعکس مذہب میں ہر سوال کا جواب صرف آخرت کا ثواب ہی ہوتا ہے

آپ کو یاد ہو گا کہ حج سے متعلق احکامات کا بیان چلا آ رہا ہے۔ میں اسے پھر دہرادوں کہ اسلام کو اگر بدقسمتی سے مذہب سمجھا جائے تو پھر اس کے یہ جتنے ارکان کہلاتے ہیں' وہ مذہبی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنا ہے کیونکہ ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیوں کرنا ہے؟ اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مذہب میں کیوں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک ہی لفظ میں اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ ''ثواب'' ہوتا ہے اور آگے جب یہ سوال آجائے کہ پھر ''ثواب'' کیا ہوتا ہے تو پھر وہ ''ثواب'' ہوتا ہے۔ ثواب ہوتا ہے یا نہیں ہوتا' اس کے متعلق مرنے کے بعد جا کر پتہ چلے گا لیکن اگر اسلام کو دین کی حیثیت سے' ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے' ایک

ہے یا نہیں ہوتا' اس کے متعلق مرنے کے بعد جا کر پتہ چلے گا لیکن اگر اسلام کو دین کی حیثیت سے' ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے' ایک اجتماعی ہیئت انسانیہ کی حیثیت سے لیا جائے تو اس میں پھر یہ جتنے ارکان کہلاتے ہیں' احکام کہلاتے ہیں' وہ اس کے عظیم پروگرام کے مختلف اجزا بن جاتے ہیں۔ ان میں ہر جز کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے یہ بتایا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور جو ہوگا اس کا پہلا نتیجہ اسی زندگی میں سامنے آ جائے گا تا کہ یہ معلوم ہو جائے' ہر وقت اس کا ٹیسٹ کیا جا سکے کہ جیسا کہا گیا تھا، ویسا ہوا ہے یا نہیں اور پھر اس کا اگلا حصہ یہ ہے کہ جو کچھ یہ ہوتا ہے' زندگی چونکہ مسلسل چلتی ہے' اس لیے انسان اس کو ساتھ لے کر آگے جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ پھر انسان کی آخرت یا عاقبت بھی اس کے ساتھ سنور جاتی ہے۔

مذہب کے مقابلے میں دین کی سطح پر حج اپنے اندر ایک عظیم پروگرام کی طرف دعوت دیتا ہے

حج کو اگر مذہب کی سطح پہ لیا جائے تو یہ ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے' یاترا ہوتی ہے' وہاں جانے سے گناہ دھل جاتے ہیں' ثواب ہوتا ہے۔ دین کی سطح پہ لیا جائے تو اس کے نظام کا یہ ایک عظیم جز ہے۔ دین سے مقصود یہ ایک اس قسم کا نظامِ زندگی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام و ک قائم کرنے والی جماعت یا امت کی فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (2:201)۔ یہ دنیاوی زندگی حسین ہو جائے' خوشگواریاں' مرفع الحالیاں اور سرفرازیاں نصیب ہوں اور اس کے بعد پھر یہی سلسلہ آگے بڑھایا جائے' عالمگیر انسانیت کے لیے بھی یہی چیزیں ہوں' اس میں کوئی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے' کوئی بے کس اور بے بس نہ رہ جائے' کوئی بھی یہاں محروم نہ ہو' کوئی بھی یہاں محتاج نہ ہو۔

یہ نظام ہے اور اس نظام کے مختلف اجزا ہیں' جنہیں آپ ارکانِ اسلام کہتے ہیں۔ حج' اس قسم کا نظام قائم کرنے والوں کی طرف سے انسانیت کے ایک عظیم اجتماع کا نام ہے۔ جیسا کہ میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ صرف مسلمانوں کا ہی اجتماع نہیں ہے۔ اس میں امت کی' مسلمانوں کی حیثیت' ایک Convener کی ہے' انہوں نے اس کا اجتماع کرنا ہے' اس اجتماع کا انتظام کرنا ہے اور عالمگیر انسانیت کو دعوت دینی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) تا کہ وہ وہاں آ کر دیکھ لیں کہ یہ قوم ان کی منعت کے لیے کیا کچھ کر رہی ہے۔ یہ للناس ہے' یہ نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ کم از کم سال میں ایک عظیم اجتماع حج اور ہنگامہ طور پر جب بھی ضرورت پڑے' اس کی چھوٹی چھوٹی کمیٹیوں کے اجتماعات' اس کے خود ایمرجنسی کی صورت میں' خاص حالات میں' اجتماعات ہیں' اسے آپ عمرہ کہہ لیجیے۔

حج کے اجتماعات کے لیے کچھ Formalities کا بروکار لانا ضروری قرار پاتا ہے

دین کے اجزا بھی اگر بنیں تو ایک چیز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ یہ کہ ایک چیز Essence ہوتی ہے' روح ہوتی ہے اور ایک شے اس کی فارم ہوتی ہے' محسوس شکل ہوتی ہے۔ ہر روح ایک محسوس شکل میں سامنے آ سکتی ہے۔ یہ فارم ہی ہے جس سے آپ نے

Formalities کا لفظ لیا ہے۔ یہ Formalities بھی ضروری ہوتی ہے اور ضروری ہوتی ہیں' خصوصیت سے اس وقت' جب کوئی چیز اجتماعی طور پر آپ نے کرنی ہو۔ انفرادی طور پر ایک سپاہی کا جس طرح سے جی چاہے' وہ لباس پہنے' اس پہ کوئی پابندی نہیں ہے لیکن جب اس کو اپنی اس فوج کے جز کی حیثیت سے وہاں رہنا ہوگا' خواہ وہ Exercises کے لیے ہو یا آگے اس نے فوج کے سپاہی کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں جانا ہو' جب وہ وہاں کھڑا ہوگا اسے پھر وہ تمام جو Forms ہیں' وہ اس کے مظاہر' اس کی وردی' اس کا کھڑا ہونا' اس کا چلنا' اس کا اٹھنا بیٹھنا' یہ تمام چیزیں ایک خاص ضابطے کے مطابق کرنی پڑیں گی۔

اجتماعی طور پر دین کی جزیاتی فارمیشن ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہے

یہ جتنی چیزیں ہیں یہ ہیں تو فارم ہی' اس کا اس پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا کہ وہ سپاہی میدانِ جنگ میں سفید کپڑے پہن کر دشمن کے اوپر حملہ کرتا ہے یا اپنی وردی کے ساتھ کرتا ہے۔ اصل غرض تو وہ تھی کہ وہ اپنے وطن کی' اپنے Cause کی' اپنی آئیڈیالوجی کی مدافعت کر رہا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے۔ بہرحال دشمن کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس مقابلے میں اس کی وردی کا تو کوئی دخل نہیں لیکن یہ فارم نہایت ضروری ہو جاتی ہے اور اس کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ فارم کی یک جہتی سے' ذہنیتوں کے اندر یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک قسم کا جب آپ لباس پہناتے ہیں' وردی پہناتے ہیں تو ہر سپاہی اپنے آپ کو اس عظیم گروہ کا ایک فرد محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ ان سے کہا تو یہی جاتا ہے کہ یہاں سے تم نے دس میل کے فاصلے پر آج مارچ کر کے جانا ہے۔ مقصد تو صرف وہاں پہنچنا ہے لیکن یہ کہ وہ ایک فارم میں چلیں' چار چار کی لائن میں چلیں' قدم ان کا ملتا ہوا جائے' یہ ساری چیزیں فارمز ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں اس فارم کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے یک جہتی ہے اور یک رنگی پیدا ہوجتی ہے اور اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ اس میں ایک جذباتی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور یہ وجہ ہے کہ یہ آپکے ہاں کے جو اجتماعات ہیں' اس میں بعض چیزیں Formal بھی رکھی ہیں' فارم کی حیثیت سے رکھی ہیں' اس کے اندر Formalities رکھی ہیں' یہ محسوس مظاہر بھی اس میں رکھے ہیں اور ان میں یک جہتی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس یک جہتی کا عالم یہ ہے۔ یہاں تک وہ تاکید کرتا ہے کہ کچھ لوگ تو وہ ہیں کہ اس اجتماع کے اندر جا کر وہاں شریک ہیں۔ جو وہاں شریک نہیں ہو سکے' ذہنی طور پر انہیں بھی کہتا ہے کہ تم وہاں تو نہیں جا سکے' کم از کم اس فارم میں ہی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اس سے بھی یک جہتی اور یک مقصدی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم ذہنی طور پر ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں یعنی ان کے اس مقصد میں شریک ہو جاتے ہیں۔

حج تو عالم گیر سطح پر ایک وہ کانفرنس ہے کہ جس میں انسانیت کے الجھے ہوئے......میں کنگی کرنا مقصود ہو

حج کا اجتماع تو جیسا میں نے عرض کیا ہے' انسانیت کے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کے لیے ایک عالمگیر کانفرنس ہے' مجلسِ مشاورت ہے' اس میں شرکت سے یہی مقصود ہے لیکن اس میں کچھ Formalities ہیں اور اس میں ایک خاص چیز یہ ہے کہ جس خطہ میں' جس قوم میں' سب سے پہلے اسلام کا ظہور ہوا' ان میں بعض چیزیں چلی آ رہی تھیں۔ جو چیزیں ان میں ایسی تھیں جو انسانیت کے مفاد کے خلاف' دین کی روح کے خلاف تھیں' ان کو تو منسوخ کر دیا گیا لیکن جو چیزیں ایسی تھیں جن میں کوئی مضرت کا پہلو نہیں تھا' جو دین کی روح کے خلاف نہیں جاتی تھیں' ان کو علیٰ حالہ رہنے دیا یا ان میں کچھ ترمیم کر دی گئی۔ حج کے سلسلے میں یہ کہا **وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَۃَ** (2:196)۔ یہاں تک تو یہ بات ہو گئی کہ حج اور عمرہ کو Complete کرو' مکمل کرو اور آگے وہ لفظ ہے کہ جس ایک لفظ سے یہ اجتماع دیگر اجتماعات سے مختلف ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کو اصطلاحات کے بدل جانے سے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل گیا ہے

یہ اجتماع ہی نہیں' ایک لفظ سے اس جماعتِ مومنین کا ہر عمل دوسروں سے مختلف ہو جاتا ہے اور وہ ہے کہ **وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ** (2:196)۔ یہاں اللہ آیا تو یہ چیز دوسروں سے بالکل منفرد ہو گئی۔ اب جس طرح سے ہمارے ہاں اصطلاحیں بگڑی ہیں' کچھ مفہوم ہی اور ہو گیا ہے' یہ بھی آپ دیکھیے گا کہ آپ کے ہاں جو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا کیا معنی ہوتا ہے؟ مثلاً یہ کہ صاحب! اسے تو میرے ساتھ اللہ واسطے کا بیر ہے۔ یہ للہ کا ترجمہ ہے۔ یہ چیز للہ فی اللہ ہونی چاہیے حالانکہ ی بڑی عظیم چیز تھی۔ جو کام بھی دنیا میں انسان کرتا ہے' ایک تو اس میں اس کا انفرادی مقصد ہوتا ہے' اس میں ذاتی مقصد ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے آپ Selfishness کہتے ہیں۔ ایک فرد صرف اپنے اغراض کے لیے کچھ کرتا ہے اور ایک مقصد وہ ہے کہ جس میں وہ پوری عالمگیر انسانیت کے لیے کچھ کرتا ہے' انسانیت کا مفاد اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے' دوسروں کا فائدہ اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے' براہِ راست اپنی غرض اس میں پوشیدہ نہیں ہوتی۔ ہر وہ عمل جس کی یہ کیفیت ہو' اسے قرآن کی اصطلاح میں للہ کہا جاتا ہے۔ اب آپ دیکھیے گا جہاں جہاں قرآن کے یہ احکام آئے ہیں، وہاں للہ ہے مثلاً **قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (6:162)۔ جامعیت کے ساتھ ایک فقرے میں بات ساری کہہ دی کہ میری صلوٰۃ' میری زندگی کے طور طریقے' میری پوری زندگی حتیٰ کہ میری موت للہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ہے۔ اب آپ سوچیے کہ ایک ایسی جماعت' ایسی قوم اور پھر اس کے بعد انسانیت کہ جس میں ہر فرد کے دل میں یہ ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں یا کروں گا' اپنی ذات کے لیے نہیں دوسروں کے لیے کروں گا۔

اغراض کی ہم آہنگی مفادات کے ٹکراؤ کو ختم کر دیتی ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ اتنے سے ہی کہاں سے کہاں بات جا پہنچتی ہے۔ اس ذہنیت کی تبدیلی کا نام اللہ پر ایمان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس میں یہ زندگی بے مقصد یا بے غرض ہو جاتی ہے' بے غرض تو ہو نہیں سکتی لیکن ہوتا یہ ہے کہ میں دوسرے کی غرض پورا کر رہا ہوتا ہوں' دوسرا میری غرض پورا کر رہا ہوتا ہے۔ اب اغراض کا Clash (تصادم) نہیں ہوتا' مفاد کا تصادم نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ نظام جس کی بنیاد للہ پر ہے اور یہاں سے للّٰہیت ہے۔ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (2:196) اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تم خود اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکو تو ان کے ساتھ اس بلند مقصد میں ہم آہنگ تو ہو جاؤ۔ وہ وہاں گئے ہیں' اپنی طرف سے وہاں جانے والے کے ہاتھ کوئی تحفہ بھیج دو۔ ان کی ضروریات بھی وہاں ہوں گی لیکن یہاں لفظ ہدیہ ہی ہے کہ تحفتاً' اپنی طرف سے کچھ بھیج دو۔

حج کے موقعہ پر قربانی کے تصور کی اصل حقیقت اور لفظ ہدیہ کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں اس ہدیے کے لیے بھی قربانی کا جانور کہہ دیا گیا۔ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ جو قربانی کا تصور ہے' وہ بھی قرآنی نہیں ہے اس لیے تو قرآن میں جو قربانی کا تصور ہے' وہ بھی قرآنی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو قرآن میں قربانی کا لفظ تک بھی نہیں آیا۔ وہ تو بات اتنی ہے کہ وہاں اتنا عظیم اجتماع ہونا ہے۔ عرب کی سرزمین' مکے جیسا ملک' وہاں جو رہنے والے ہیں' ان کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اب جو باہر سے مثلاً ایک لاکھ آدمی چلے جائیں تو وہاں انتظام کیا ہوگا۔ وہاں کے کھانے پینے کے انتظامات تھے' جس کے لیے وہاں یہ جانوروں کا ذبح کرنا تھا۔ دین میں یہ چیز تھی۔ سورۃ الحج میں آپ آئیں گے تو میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ یہ لکھا ہے کہ بھئی! وہاں جاؤ تو اپنے لیے سامان ساتھ لے کر جانا' وہاں مکے والے تو خود کھجور کی گٹھلیوں پہ گزارہ کرتے ہیں' تمہیں کہاں سے کھلائیں گے اور ساتھ لے جانے کے لیے اس زمانے میں' جب کہ سامانِ رسل و رسائل کیا تنی کمی تھی' اب تو ہوائی جہازوں سے اور ہیلی کاپٹروں سے بھی دوسری جگہ کھانا پہنچایا جا سکتا ہے' اس زمانے میں تو اس قسم کا انتظام نہیں تھا' ایسا عمدہ انتظام کیا کہ پورے کا پورا سٹور کھانے پینے کا آپ کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے یعنی کسی دوسرے کے اوپر لادا بھی نہیں' آپ نے اٹھایا بھی نہیں' آپ نے باندھا بھی نہیں' آپ کو کوئی پیکج کا انتظام نہیں کرنا پڑا' آپ کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ جہاں آپ کو ضرورت پیش آئی' وہیں وہ حاضر تر و تازہ۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ گوشت کے جانور' کوئی بکریاں' کوئی بھیڑیں' کوئی اونٹ۔ یہ کتنا اچھا انتظام تھا! اور پھر وہاں آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس میں سامانِ تجارت اور اس قسم کی چیزیں بھی لے جانی ہوتی تھیں۔ ٹھیک ہے یہ لاد کے لے جاؤ۔ آپ کا جو کھانا ہے' یہ آپ کا سامان لاد کے ساتھ لیے جا رہا ہے۔

وہاں جب ضرورت پیش آئے تو ذبح کرو اور کھاؤ۔ قرآن نے کہا ہے کہ خود بھی کھاؤ' وہاں والوں کو بھی کھلاؤ' بڑے غریب آدمی ہیں' جو وہاں بستے ہیں۔ بہر حال یہ ایک انتظامی شکل تھی' ایک اجتماع کے لیے اور جو نہیں جا سکا ہے' اس کے لیے کہا ہے کہ اپنی طرف سے کچھ تحفتاً وہاں بھیج دو۔ اب اس میں ان کے ساتھ قلبی ہم آہنگ پیدا ہوگئی۔ وہ وہاں ہیں' آپ جا نہیں سکے' اپنی طرف سے کچھ تحفہ بھیج دیا۔

حج کے دوران انسانیت کی مرفع الحالی کے اجتماعات میں شریک رہنے کی خاطر وقت کی اہمیت کو سامنے رکھنا زیادہ ضروری ہوگا

اب وہاں ان کے لیے کچھ Formalities ہیں' کچھ فارمز ہیں اور اس میں بھی وہ فارم میں یہ چیز ملحوظ رکھی گئی ہے کہ ان لوگوں کا سارا وقت اس مقصد کے لیے صرف ہو' جس کے لیے یہ اتنے دور دراز علاقوں سے آئے ہیں۔ یہ کہا کہ وہاں جاؤ تو اتنے عرصے کے لیے یہ نہ کرو کہ صاحب! صبح اٹھ کر مجھے شیو کرنا ہے' ضروری بات ہے اور آج Hair Cutiting ہوگی۔ اس نے کہا کہ یہی وقت اس میں صرف کرو' جانے دو اتنے دنوں کے لیے' نہ اگر شیو کیا نہ اگر حجامت بنوائی تو کیا ہو جاتا ہے۔ اب وہاں کے لیے تو یہ صورت ہے کہ اتنے عرصے کے لیے وہاں وہ حجامت نہیں بنواتے۔ یہاں والوں کے لیے کہا کہ تم نے ان کے ساتھ ہم رنگ ہونا ہے' ہدیہ تو بھیج دیا۔ وَ لَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَکُمۡ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡهَدۡیُ مَحِلَّهٗ (2:196) تو تم بھی اتنا عرصے تک اپنا ذہن وہیں رکھو کہ اب یہ میرا تحفہ وہاں تک پہنچا' اب یہ ہدیہ وہاں گیا' اب وہ اجتماع ہے اور اس میں پہنچا ہوگا۔ اتنے عرصے میں جتنے عرصے میں وہ بھی اپنے ہاں مصروف ہیں' ان چیزوں میں کہا تم بھی ان کے ساتھ وحدتِ فکر و نظر کے لیے جو وحدتِ مظہر ہے' اس کو بھی ساتھ رکھو' فارم بھی تم اس زمانے میں پوری کرلو' تم بھی حجامت نہ بنواؤ۔ اس خیال سے ہر وقت کہ وہاں میرے بھائی' میرے دوست' یہ ایک گروہ امت کا' اس کام میں مصروف ہے اور ہر وقت تمہارا دھیان ان کے ساتھ لگا رہے۔ یہ ہے اس Formality سے مقصد کہا ہے کہ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًی مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡیَةٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُکٍ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ (2:196) وہاں بھی یہ صورت پیدا کرو کہ وہاں اتنے دنوں میں یہ حجامت نہ بنواؤ۔ اگر کوئی بیمار ہے' سر میں کچھ تکلیف ہے تو خیر پھر تو اس کی مجبوری نہیں ہے کہ ضرور یہی وہاں تم کچھ کرو۔ اس صورت میں پھر یعنی یہ اس کے بعد کی صورت ہے کہ جب یہ تم نے حجامت بنوائی ہو تو اس کے لیے کوئی فدیہ دیدو۔ یہ فدیے مثلاً یہ کہ دو تین دن کے روزے رکھ لیے' کوئی صدقہ دیا' کوئی تحفہ تحائف دیا' یہ بجائے خویش کوئی چیز نہیں ہیں۔ یہ تو ان کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے آپ اپنے دل میں ایک خیال پیدا کرتے ہیں اور اس کی محسوس شکل یہ ہوتی ہے۔ اصل شے وہ Essence ہے' یاد رکھیے! وہ روح ہے لیکن ہر شراب کے لیے ایک بوتل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر مجرد حقیقت Abstract Truth جب بھی عمل میں آئے گا تو وہ محسوس شکل میں عمل میں آئے گا۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب

(1797-1869ء) اپنے انداز میں کہہ گیا ہے لیکن بات یہی کہہ گیا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق کی گفتگو میں ایک Abstract Truth (غیر محسوس صداقت) ہوتا ہے۔ اس کے متعلق جب بات کی جائے گی تو پھر محسوس تشبیہات میں ہی کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ محسوس تشبیہات ہیں جن کو آپ Formalities کہتے ہیں لیکن اس کے بعد تو پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ شراب ختم ہو گئی ہوتی ہے پیالہ ہی خالی رکھا ہوا ہے صاحب! تو پیالے رہ جاتے ہیں، یہی چیزیں مقصود بالذات بن جاتی ہیں کہا ہے کہ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَ سَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (2:196)۔ یہ وہی Formalities ہیں کہ جب پھر امن کی صورت ہو جائے تو اس کے عبد حج میں تین دن کے روزے، اس کے بعد سات دن کے، یہ دس دن کے روزے ہو گئے۔ یہ اس کے لیے ہے جو وہاں کا رہنے والا نہ ہو، جس کے اہل و عیال وہاں نہ ہو اور یہاں تک Formalities آ رہی ہیں، مظاہر آ رہے ہیں۔

حج کی اصل روح کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اس کی رسومات کو پورا کرنے والوں کے لیے خدا کی گرفت کا نتیجہ

اب یہ چیز کہ کہیں انہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا، وہیں کہہ دیا کہ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ (2:196) یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت کرنا مقصود ہے، مقصد یہ ہے اور اس کے بعد ایک اگلا ٹکڑا ہے، اس نے تو عجیب بات بیان کر دی۔ ذہن میں نہیں آتا کہ اس کے بعد اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ (2:196) کے کیا معنی ہیں؟ کہ یاد رکھو! خدا جو پیچھا کیا کرتا ہے، عقوبت لیتا ہے، وہ بڑا ہی سخت ہے، اس کی گرفت اس معاملے میں بڑی محکم ہوتی ہے۔ کہاں یہ بات کہی؟ وہ یہ چیز ہے کہ اگر یہ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (2:196) والی بات نہیں ہے، مقصود قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت نہیں، بلکہ Formalities کی Observance ہو گئی، محض رسومات کا پورا کرنا ہو گیا، تو یاد رکھیے کہ یہ جو چیز ہے یہ بجائے اس کے کہ تمہیں جسے کہتے ہو کچھ ثواب دے گی، یہ تو ایسی چیز ہو گی کہ جس کے اوپر گرفت ہو گی اور خدا کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! گرفت تو ہمارے سامنے ہے۔ حج میں چودہ چودہ لاکھ کا اجتماع ہو رہا ہے۔ اس پہ پوری امت کا جتن ار و پیہ صرف ہوتا ہے۔ اسی کو دیکھ لیجیے۔ وہ جو اس میں زحمتِ سفر ہوتی ہے، اموات ہوتی ہیں، وہ تو چھوڑ

دیجیے' ایک ایک فرد کو الگ ہوئی۔ ملی طور پہ یہ اتنا وقت اس میں صرف ہوتا ہے۔ یہ سارا کچھ ہونے کے بعد وہاں ہوتا کیا ہے؟ پورے عرب کے قلب کے اندر ایک ذرا سی لکیر ہے' جسے آپ اسرائیلی حکومت کہتے ہیں۔ وہ اتنی سی لکیر ان کے لیے دردِ جگر بن کر رہ گئی ہے۔ ان کے لیے ایک اتنی بڑی قیامتِ صغریٰ ہے' ابھی صغریٰ ہی ہے۔ ان کے عزائم کو سامنے دیکھیے تو یہ قیامتِ کبریٰ بننے والی ہے۔

آخر ہمارے اس اجتماع کی دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟

مراکز سے لے کر اگر عربوں تک ہی آپ رہیں تو آپ دیکھیے کہ حجاز تک ساری عربوں کی مملکتیں وہاں موجود ہیں۔ ایک ذرا سی لکیر جس کی ابتدا چودہ لاکھ کی آبادی سے ہوئی تھی' اب بھی کوئی اٹھائیس لاکھ تک زیادہ سے زیادہ پہنچی ہے۔ آپ کے ایک شہر کی آبادی کے برابر ہے۔ انہوں نے ان کو تڑپا تڑپا دیا ہے۔ اس کے لیے تمام دنیا کے نمائندے کم از کم وہاں اجتماع میں تیرہ چودہ لاکھ جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کے بعد ہوتا کیا ہے؟ حج میں دعا کی جاتی ہے کہ یا اللہ! اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں' یہ اسرائیل والوں کے ہاں تو اپنا غضب نازل کر' ان کو تباہ کر دے' برباد کرے اور یہ وہاں دعائیں کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ پنپتے چلے جاتے ہیں' بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! اس سے زیادہ شدید العقاب کی کیا کوئی اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے؟ کہتے ہیں جی! کہ اس قرآن میں ربط نظر نہیں آتا' حج کی بات تھی وَ اتَّقُوا اللّٰهَ بیچ میں آ گیا' ربط بن ہی نہیں سکتا۔ عرفان کے میدان میں آپ گئے' وہاں جا کر آپ نے وہ خطبہ سنا' اس کے بعد وہ پتہ نہیں' آواز آتی ہے یا نہیں' کہتے ہیں کہ کانوں میں آواز آ جاتی ہے ''حاجیاں دا حج قبول۔ آپے ای میں رج کجی آپے ای میرے بچے جیون۔ جو مرضی آواز تہاڈے دل اچ اوتھے ❶۔'' وہ حج قبول ہو گیا آ گئے۔ کیسے آ گئے؟ جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ وہاں آخری مرتبہ چودہ لاکھ کا اجتماع' تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کا ہے اور کیا وہاں بھی وہی جاتا ہے جو یہاں آپ کے ہاں ہر جمعہ میں ہر عید میں ایک دعا مانگی جاتی ہے۔ مانگ رہے ہیں ہزار برس سے دعا۔ اُن کے جو شملہ ہیں' ان کی جو اجتماعی ہے وہ اور مضبوط ہوتی جاتی ہے' ان کے دیار اور زیادہ آباد ہوتے چلے جاتے ہیں اور آپ کے حج میں حاجیوں کی تعداد بھی ہر سال بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (2:196) ہے کہ دیکھا یہ شدتِ عقوبتِ خداوندی۔ اجتماعی طور پہ دولت ہی اگر آپ دیکھیں تو آپ دیکھیے گا کہ کس قدر دولت ہے جو آپ کے ہاں کم ہوتی ہے اور پھر اگر آپ یہ کہیں کہ نہیں صاحب! یہاں سے جا کے وہ دولت وہاں چلی جاتی ہے جو ٹیکسز اور سب کچھ وہاں ہیں۔ ٹھیک ہے وہاں چلی جاتی ہے۔ دس دس حاجیوں کی یہ دولت وہاں ایک جگہ جمع ہوتی ہے' ایک خاتون جو وہاں کی بیروت میں بال بنوانے کے لیے آتی ہیں' ان پہ صرف ہو جاتی ہیں۔ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (2:196) اس سے سخت سزا بھی کسی قوم کو مل سکتی ہے دنیا میں؟ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217) ان کے اعمال غارت ہو جاتے

ہیں، بے نتیجہ ہو جاتے ہیں۔ اعمال تو وہو رہے ہیں، بڑی صعوبات برداشت کی جاتی ہیں، اس سفر میں بڑا روپیہ بھی صرف کیا جاتا ہے، اس سے زیادہ، طت اعمالی کی کوئی اور شکل بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ ایک فریب ہے جو دیا جاتا ہے ایک لمیٹڈ کنسرن ہے، یہاں سے لے کر وہاں تک بنا ہوا ہے۔ معلموں کے یہاں ایجنٹس پھر رہے ہیں، وہاں سارے کے سارے ادھر سے اُدھر اس کمپنی کے حصہ دار پھر رہے ہیں۔ کروڑوں روپیہ اس طرح سے وہاں سمٹ کر چلا جاتا ہے۔ ثواب ہوتا ہے، فریضہ ہے حج کا وہاں سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں یہ اپنی اپنی گٹھڑیاں باندھے ہوئے گھاٹ پر، گناہ دھونے کے لیے۔

حج کے اجتماع کا تعین وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر سال مقرر کیا جائے گا

کہا ہے کہ اگر محض رسومات کو اصل مقصود سمجھنے لگ جاؤ گے تو اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (2:196) اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوگا۔ اور سنو! کہ اَلۡحَجُّ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ (2:197) حج کے مہینے معلوم ہیں، معلوم ہونے چاہئیں، ان کے متعلق اعلان ہونا چاہیے Announcement ہونی چاہیے۔ یہ مہینے تو آپ کے ہاں فکس (مقرر) حج کا مہینہ تو ہر ایک کو پتہ ہے، چلا آ رہا ہے۔ یہ یہاں اس کے لیے خصوصیت سے کیوں کہا گیا کہ وہ تو ایسی چیز ہونی چاہیے، جس کے متعلق معلوم ہو، ہر ایک کو اس کا علم ہو جائے، Announcement ہو جائے۔ نظر آتا ہے کہ یہ ضروریات کے تقاضے کے مطابق ہر سال وہاں مقرر ہوا کرے گا کہ امسال تو یہ ہوا ہے، اس کے بعد حج کب ہونا ہے؟ کب یہ اجتماع ہوگا؟ فیصلہ وہاں ہوگا اور پھر ساری دنیا کے اندر اس کی Announcement ہونی چاہیے۔ یہ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ (2:197) ہے، اس کا علم ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے کوئی ایک ہی وقت ہو تو وہ معلومات میں آ گیا لیکن اگر آپ دین کی ضروریات کے اعتبار سے اجتماعات چاہتے ہیں تو اس کے لیے پھر ضروری ہے کہ اس کے لیے اس کا عام علم ہونا چاہیے، آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے۔ اس کی پبلسٹی عام ہونی چاہیے۔

حج کے اجتماع میں حاضر ہونے والوں کو ہر قدم پر ہر حال شائستگی کو ملحوظ رکھنا ہوگا

کہا ہے کہ فَمَنۡ فَرَضَ فِیۡہِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوۡقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ (2:197) اس اجتماع میں یاد رکھنا! بڑے اہم مقصد کو لے کر تم گئے ہو۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارے اس اجتماع سے دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ نہایت متمدن اور مہذب اور شریف اور نجیب لوگوں کا اجتماع ہے۔ یہاں رَفَثَ آیا ہے۔ یہ ہر وہ بات ہے جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ کہا ہے کہ وہاں کوئی ایسی حرکت نہ ہونے پائے جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہوتا کہ جو لوگ وہاں آ کر موجود ہوئے ہیں وہ تمہارے صرف اجتماع کو، تمہاری نقل و حرکت کو، تمہارے اندازِ گفتگو کو دیکھ کر یہ کہیں کہ ہاں دنیا میں ایک قوم ہے جسے مہذب کہلانے کا حق پہنچتا ہے۔ آگے وَ لَا فُسُوۡقَ کہا

ہے۔فسق کے بنیادی معنیٰ' میں نے کئی دفعہ عرض کیے ہیں کہ ہر پھل اپنے باہر کا جو چھلکا ہوتا ہے' اس کے اندر وہ Develop ہوتا ہے' پختہ ہوتا ہے' نشو ونما پاتا ہے مثلاً کیلے کا چھلکا' آم کا چھلکا' اس کے اندر پھل نشو ونما پاتا ہے اور اگر کبھی ایسا ہو کہ وہ جو چھلکا ہے' ایک طرف سے پھوٹ جائے یا پھٹ جائے' اندر سے ٹیڑھا ہو کر وہ پھل نکل جائے' اسے کیڑا لگ جاتا ہے وہ پکتا نہیں ہے' ناکارہ ہو جاتا ہے۔ یہ جو اپنے پیکر سے نکل کر کسی دوسری طرف چلے جانے والی بات ہے' اسے عربی زبان میں فسق کہتے ہیں۔ اب تو ہمارے ہاں فاسق و فاجر کے لیے لفظ ہی ایک گنہگار رہ گیا ہے۔ ورنہ یہ قرآن کی اصطلاحیں تو بڑی عظیم اصطلاحیں ہیں۔ مثلاً فجور تو فجر سے ہے' شق ہو جانا۔ ہر وہ عمل جس سے انسان کی ذات یا Personality Disintegrate ہو جاتی ہے تو وہ فجور میں آ جاتا ہے۔ یہاں یہ اس پیٹرن (پیکر) سے نکل کر کسی اور طرف کو چلا جاتا ہے' یہ فسق ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو تمہارے لیے ایک پیٹرن تجویز کیا گیا ہے' اس سے نکل کر تم ادھر ادھر کرو۔

حج کے اجتماعات میں کسی ڈسکشن کے دوران اپنی رائے کو مجادلے کی شکل میں پیش نہیں کیا جائے گا

کہا ہے کہ **وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ** (2:198) وہاں بڑے بڑے اہم مسائل سامنے آئیں گے' ان پہ ڈسکشن ہوگی۔ یہ جدال کیا ہوتا ہے؟ کہ خوامخواہ کے لیے وہاں مجادلے شروع نہ کر دینا' مناظرے شروع نہ کر دینا' جھگڑنا ہی نہ شروع کر دینا۔ اجتماع میں تو پھر آپ کو پتہ ہے' جب ڈسکشن ہمارے ہاں ہوتی ہے تو اس میں ہوتا کیا ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا پوائنٹ لیے ہوئے ہے اور اس کو Stress کرتا چلا جا رہا ہے صاحب! بات کی ابتدا تو یوں کرتا ہے کہ صاحب! میری ناقص رائے میں اور وہ جاناقص رائے ہوتی ہے' اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف فیصلہ ہے تو اٹھ کر چلا جاتا ہے' باہر جا کر دوسری پارٹی بنا لیتا ہے۔ یہ جدال ہے کہتا ہے کہ وہاں بہت بڑا عظیم اجتماع ہے۔ یہ نظریئے لے کر نہ چلے جانا کہ جو میں نے بات کہی ہے' وہی مانی جائے اور آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑو اور پھر اس کے بعد تو آپ دیکھتے ہیں بیک وقت دس پندرہ بول رہے ہوتے ہیں' جدال کا یہ عالم ہوتا ہے کہا ہے کہ **وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ** (2:197) ہم یہ چیز دیکھیں گے کہ وہاں تم خیر کے کیا کام کرتے ہو؟ وہاں وہ امور کرنا جن سے تمہارے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی چلی جائیں۔ وہاں وہ کچھ وہاں کرنا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ تَزَوَّدُوْا** (2:197)۔ اس آیت کا بھی ایک عجیب مفہوم لیا جاتا ہے۔ یہ آپکو پتہ ہے کہ یہاں سے اٹھ کر حج کرنے کے لیے چل دیے۔ اول تو یہاں سے ہی بھیک مانگنی شروع کی کہ میری آخری عمر ہوگئی ہے' پتہ نہیں میں نے جینا ہے یا نہیں جینا' ایک حسرت ساری عمر کی دل میں تھی کہ حج کر کے آؤں۔ میرے پاس زادِ راہ نہیں ہے' میرے پاس پیسے نہیں ہیں' ہے کوئی اللہ کا بندہ۔ ایک پھر ہمارے ہاں حجِ بدل نکل آیا یعنی جانا مجھے ہے راولپنڈی' وہاں وہ کام ہے کہ

صاحب! آپ ہوآیئے میری جگہ۔ پھر وہ بھیک منگوں کو پیسے دیئے اور پھر بعض تو ایسے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے وہ یہاں سے چلے جاتے ہیں، سنا ہے وہ جہاز کے انجن روم میں چوری سے گھس جاتے ہیں۔ ''آج کرن تریے ہوئے نیں ❶۔''

---

❶ یہ ہیں کہ حج کرنے چلے ہیں!!

ہمارے ہاں کے مذہبی تصورات نے تقویٰ کا مفہوم ہی بدل دیا ہے

وہاں جانے کے بعد بیٹھے ہوئے ہیں: دے جا بابا! اللہ کے نام پہ، واپسی کے لیے کرایہ ہے نہیں۔ ایک مصیبت ہوتی ہے۔ یہاں آیا ہے: وَ تَزَوَّدُوْا کہ جانے لگے ہو تو زادِراہ کی فکر پہلے کرو لیکن وہ گنجائش کہاں سے نکالتے ہیں کہتے ہیں جی کہ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (2:197)۔ وہ تقویٰ جو ہے، وہ آدمی کے لیے سب سے بڑا زادِراہ ہوتا ہے۔ ''آپوچھے اوہناں نوں پئی اے پی آئی اے والے تہانوں جہاز دا ٹکٹ دے دیں گے نمازاں دے بدلے ❶؟ سب سے بڑا زادِراہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہمارے پاس ہے۔ وہ تو دنیاداروں کی بات ہے، اصل میں کہ صاحب! پیسے بھی پاس ہونے چاہئیں۔ یہاں فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (2:197) عظیم چیز تھی۔ وہ وہاں مصیبت تو یہ ہے کہ تقویٰ کا لفظ آیا اور تقویٰ کا مفہوم ہمارے ہاں ہے۔ جس کو کہتے ہیں نماز، روزہ نیکی پر ہیزگاری، ہوگیا کہ سب سے بہتر زادِراہ یہ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس یہ Justification (وجہ جواز) ہوتی ہے کہ صاحب! وہاں قرآن میں دیکھیے کہ ٹھیک ہے زادِراہ ضروری ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ بہترین زادِراہ تو تقویٰ ہے ''آ ویکھو! ساہڈے کول کڈا اوڈا اسارا تقویٰ ❷ ہیگا'' بات یہ نہیں ہے کہا ہے کہ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (2:197)۔ یاد رکھو! زادِراہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تم اس قسم کی حرکتوں سے، بھیک مانگنے سے، ذلیل ہونے سے محفوظ رہ جاؤ گے۔ تقویٰ کے معنی محفوظ رہ جانا ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے۔ تقویٰ کی یہ چیز تو زادِراہ کے متعلق ہوگی کہ وہاں سے بچ جاؤ گے۔ آگے پھر کہا کہ وَ اتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ (2:197) اس کے لیے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں ہے، جو یہ کہا جائے کہ بھئی! سفر کے لیے تمہارے پاس زادِراہ ہوگا تو ان ذلتوں سے بچ جاؤ گے۔ اسے صاحبانِ عقل و بصیرت! اپنے لیے سامانِ حفاظت ساتھ رکھو۔ یہاں اپیل انسانی عقل کو کی گئی ہے کہ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ ❸ (2:197) اے صاحبان عقل و بصیرت! وہ کون عقل مند ہے جو اتنی بات بھی نہیں جانتا کہ سفر پہ جانے لگے ہو تو تمہارے پاس سفر کا سامان ہونا چاہیے۔

---

❶ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا یہ پی آئی اے (PIA) والے انہیں نمازوں کے بدل مین ٹکٹ دے دیں گے؟

❷ آ ؤ دیکھو! یہ ہمارے پاس کتنا بڑا تقویٰ ہے۔

❸ عربی لغت میں، اَللُّبُّ ایسی تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کی جمع الباب ہے لہٰذا اولی الالباب ان صاحبانِ عقل و

بصیرت کو کہیں گے جو جذبات سے الگ ہٹ کر' معاملات پر عقل خالص کی رو سے غور وفکر کریں..... قرآنِ کریم مومنین کو اولی الالباب کہہ کر پکارتا ہے
(پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1979ء' ص 239)

حج تو عالمی سطح پر ملتِ اسلامیہ کے لیے الجھتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کا نام تھا!

عزیزانِ من! اب آئی وہ بات۔ دین آ گیا۔ آج حج کے لیے جانا' ثواب کی خاطر نیکی کی خاطر ہے۔ حج میں تو خیر دور کی بات ہے' نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانا ہو تو ہاں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہاں دنیا کی کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ اس کے بعد اب حج جیسا اجتماع ہو' وہاں دنیاداری کی بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو حج ہے' آپ کی بدقسمتی دیکھیے کہ انہی دنوں آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا' وہاں کوالالمپور میں آپ کے ہاں اسلامی ممالک کے نمائندوں کی ابھی ابھی کانفرنس ہوئی ہے' اس میں پتہ نہیں کہ چودہ یا انیس یا کتنے ممالک نے شرکت کی اور اس پہ بڑا فخر کیا جاتا ہے کہ ایک نہایت عجیب چیز کی طرح پڑی ہے کہ اسلامی ممالک کے نمائندے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں یعنی یہ جو حج تھا' یہ اسلامی ممالک کے نمائندوں والی بات نہیں تھی یہ تو ہوگئی ثواب والی بات۔ آپ نے دیکھا ہے کہ اس کانفرنس کو کتنا اچھالا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کی کیفیت جن کے ہاں دین کا' ان اجتماعات کا پایہ کانفرنس مستقل رکن ہے۔ حج کو حج کہا جائے گا' اسے کانفرنس کہا جائے گا' کانفرنس اور بات ہوگئی حج اور بات ہوگئی۔ ایک دفعہ طلوعِ اسلام میں حج کے متعلق وہ بڑا سا اوپر کا عنوان ''آل ورلڈ مسلم کانفرنس'' لکھ دیا گیا' کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ اب ان کو حج الگ کرنا پڑتا ہے' کانفرنسیں ان کی الگ منعقد کی جاتی ہیں اور اس کی خصوصیت کبریٰ آتے ہی یہ بتائی جاتی ہے۔ پوچھا گیا کہ صاحب! وہاں کوئی کشمیر کا مسئلہ بھی ڈسکس Discuss ہوا؟ کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو مذہبی معاملات کے متعلق تھی'' اوتھے اسے ڈسکس ہوتی ہے' اسی کہ وٹوانی دا سائز کڈا ہونا چاہیدا اے۔'' یہ کانفرنس مذہبی معاملات کے متعلق تھی۔

حج کے موقعہ پر الفتح والوں کی بے بسی

عزیزانِ من! غور فرمائیے' ذہنیت پھر کہاں چلی جاتی ہے۔ وہاں یہ کیا سوال تھا! وہ کہیں اسرائیل کے بے چارے الفتح والوں نے ذہن میں یہ سمجھ کر کہ وہاں کچھ بھائی جمع ہو رہے ہیں' اتنی اتنی سلطنتوں کے نمائندے اکٹھے ہو رہے ہیں۔

میر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لو

وہ دردِ دل کہنے کے لیے آ گئے۔ یہ ان کی بھول ہوگئی۔ اندر داخلہ نہیں ہونے دیا' کہا کہ اندر جانا ممنوع ہے۔ کیوں بھئی؟ کہا کہ تم تو وہاں سیاسی بات کرو گے۔ ٹھیک ہے جی! اسلام میں سیاسی معاملے کا کیا تعلق!!! اور وہ جوان کو سٹیج کے اوپر اور منبر کے اوپر گلا پھاڑتے ہوئے سنو کہ اسلام میں صاحب دین اور دنیا' دنیا اور آخرت' سیاست اور مذہب تمام یکساں ہیں' اس میں کوئی ثنویت نہیں ہے' کوئی

Duality نہیں ہے۔ایک ''ادبی شاہ پارہ'' ہے جو گلے سے چلا آ رہا ہے اور عملاً کیفیت یہ ہے کہ کانفرنس ہو رہی ہے اور کہہ رہے ہیں کہ جی! اس میں تو صرف مذہبی مسائل کی گفتگو ہوئی۔حج جیسی آپ کے ہاں کی ایک کانفرنس میں تو سوال ہی نہیں، دنیا کی بات ہی نہیں کی جا سکتی۔

حج کسی رسمی اجتماع کا نام نہیں بلکہ یہ تو ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے

دیکھ رہے ہیں آپ کہ حج کے احکام چلے آ رہے ہیں۔وَ اتَّقُوا اللّٰہَ بھی آ رہا ہے، تقویٰ بھی آ رہا ہے، ساتھ ہی یہ کہا کہ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ (2:198) یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی مذہب والوں کا یہ اجتماع ہو رہا ہے۔اس میں یہ چیز ہے کہ وہاں تم اپنی معاشیات کے متعلق گفتگو کرو، وہاں اس کے حصول کے لیے ڈسکشن کرو، وہاں اس کے لیے تجویزیں دیا کرو۔یہ نہ سمجھو کہ یہ کوئی گناہ کی بات ہو جائے گی، بالکل نہیں۔قرآن میں جو فضل ہے، یہ معاشیات کے لیے آتا ہے۔آپ دیکھ رہے ہیں، یہ حج کا اجتماع ہو رہا ہے لیکن خیر! آپ کہیں گے کہ صاحب! پہلے تو بھول ہو گئی یا اللہ! میری توبہ۔یہ تیرہ سو سال کرتے رہے اب تو یہ چیز جو ہے، وہاں ہو رہی ہے۔بیشتر حاجی جاتے ہی اس لیے ہیں کہ آتے وقت کہیں کہ ذلک فضل من اللہ، تو فضلِ ربی کے لیے حج ہوتا ہے۔دیکھیے صاحب! قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ وہاں جایا کرو تو سونا بلیک کر کے لایا کرو۔صاحب! اس کے لیے کوئی سند ہے؟ جی ہاں، لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ (2:198) اللہ نے کہہ دیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، قطعاً ذہن میں یہ بات نہ آ جائے کہ صاحب! حج ایک مذہبی اجتماع ہے اور وہاں تو صرف ثواب ہے یعنی وہاں یہ چیز جو معاشیات کے متعلق یہ گفتگوئیں کرتی ہے، یہ خالص دنیاداروں کا مسئلہ ہے تو یہ بات نہیں ہے کہا ہے کہ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (2:198)۔یہ عرفات کا میدان ہے۔وہاں کا جو عرفات کا میدان ہے جو حضرات حج کر کے آئے ہیں، انہیں پتہ ہے کہ اس میدان میں یہ جا کر بیٹھ جاتے ہیں، جمع ہو جاتے ہیں۔پھر وہاں امام وہ جو جبلِ رحمت ہے، اس پہ کھڑا ہو کر کچھ کہتا ہے۔اب یہ جانے ان کی بلا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔یہ جانتے بھی تو وہاں کیا پلے پڑتا، وہ کچھ لکھے ہوئے چار فقرے ہوتے ہیں، وہ وہاں پڑھ دیتا ہو گا صاحب! اور اس کے بعد یہ مطمئن ہوتے ہیں، آواز آ جاتی ہے ''حاجیوں کا حج قبول ہوا۔'' دو تین دن وہاں ٹھہرنے کے بعد پھر یہ وہاں سے ثواب کما کر آتے ہیں یعنی یہ ساری چیزیں جو ہیں۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

دس ہزار سال تک بابا آدم اور اماں حوا کی جدائی کا ماجرا اور پھر ملاپ کا قصہ؟

وہاں یہ رسومات ساری ہوتی ہیں۔ پھر آتے ہیں آ کر منا میں قیام کیا جاتا ہے۔ تین دن وہاں رہتے ہیں' وہاں قربانیاں ہوتی ہیں' وہاں یہ سب کچھ ہو دیا ہے۔ یہ آپ کے ہاں عرفات ہے۔ یہ عرف سے ہے ''ساہڈے گھراں اچ تے حرفا ہو گیا نا او ہدا ختم دواندے نیں یاد ہے نا تہانانوں ❶ ۔؟ اب تو وہ بھی بات چلی گئی' جہاں ابھی بھی بڑی بوڑھیاں ہیں' ان کے صدقے میں اس دن حلوہ مل جاتا ہے۔ اگلی ہمارے ہاں کی جو جنریشن ہے' انہیں تو اس کا بھی پتہ نہیں۔ عرف حرفا ہوا ''اے حرفے دا ختم او حج توں پہلا جیہڑا ہوندا ہوندا اے ❷ ۔'' لیکن یہاں کا عرف حرفا بنا' اس پہ تو ہم ہنستے ہیں۔ وہاں کا جو عرف ہے یا عرفات ہے' کبھی اس کے متعلق بھی کسی نے سوچا کہ یہ بات کیا تھی؟ مذہب والوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جی! (آپ کو پتہ ہے کہ یہ عرف تعارف سے ہے' وہ جنت سے بابا آدم اور اماں حوّا نکلے تھے تو وہاں سے اکٹھے نکلے تھے' باہر نکلتے ہی وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ''جیویں چراغاں دے میلے اچ بچہ وچھڑ جاندا اے پیو کول'' ❸ ۔ تو وہاں سے وہ جو بھولے بچھڑے' تو وہ دس ہزار سال بابا آدم کہیں روتے رہے' دس ہزار سال اماں حوا روتی رہیں' بڑی مصیبت پڑی۔ وہاں نہ کوئی سڑک' نہ کوئی سائن پوسٹ' نہ کوئی تیسرا آدمی جس سے پوچھ لیں کہ ''بھائی ایہد رکوئی بڈھی جاندی تے نئیں ویکھی توں ❹ ؟''۔ تو وہ اس کے بعد پھرتے پھراتے' معلوم نہیں' کس طرح سے وہ ایک جگہ آ کر تو ان کا ٹکراؤ ہو گیا' آپس میں مل گئے۔ یہ جو میدان ہے' اس کو اس لیے عرف کہتے ہیں کہ یہ وہاں ان کا آپس میں پھر میل ہو گیا تھا' تعارف ہو گیا تھا۔

عربی زبان میں لفظ عرفات کے مفہوم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ عرفات عظیم چیز تھی۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے وہاں جا کر اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں سب سے پہلی چیز یہ باہمی Introduction (تعارف) ہونا چاہیے۔ Introducion کو عربی زبان میں عرفات کہتے ہیں' متعارف ہونا کہتے ہیں اور یہ میدانِ عرفات وہ ہے جہاں ایک دوسرے سے تعارف ہو اور آج اس میدان کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں سے جو حاجی اکٹھے جاتے ہیں' میدانِ عرفات میں ایسے بچھڑتے ہیں کہ ''اک دوہے نوں لبھدا نئیں فیر ایتھے ❺ ''۔ یہ میدانِ عرفات ہے۔ آجیہڑی پچھان پہلاں ہوندی اے آ وی بھل جاندی اے اوتھے جا کے ❻ ۔'' آج یہ ہے عرفات۔ پوچھیے وہاں سے آنے والوں سے کہ اس میدان میں ایک دوسرے کیس اتھ آپکا تعارف ہوا تھا؟ پوری دنیا کے مسلمانوں کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ حج کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے۔ یہ پہلی چیز ہے کہ عرب میں یہ جو طواف وغیرہ قصہ ہے' اصل میں یہ وہ چیز ہے جو وہاں ہوتی ہے۔ اس میدان میں باہمی تعارف ہوگا۔ پھر ان کے ہاں کا' جو اس سیشن کا انہوں نے اپنا چیئرمین چنا ہوگا' وہ وہاں ایک متحدہ پروگرام ہوگا' اس کی وہاں کھڑا ہو کے اس کی Announcement کرے گا' اعلان کرے گا کہ یہ جو اجتماع ہے' اس میں یہ ایجنڈا ہے' اس کے اوپر ڈسکشن Discussion (بحث و تمحیص) ہوگی۔

---

❶ ہمارے گھروں میں تو حرفا ہو گیا۔ اس کا ختم دلاتے ہیں۔ یاد ہے نا آپ کو؟

❷ یہ حرفے کا ختم وہ جو حج سے پہلے ہوتا ہے۔

❸ جیسے چراغاں کے میلے میں باپ سے بچہ بچھڑ جاتا ہے۔

❹ اور بھائی صاحب! یہاں آپ نے کوئی بوڑھی عورت کو جاتے نہیں دیکھی؟

❺ پھر ایک کو دوسرا ملتا نہیں ہے۔

❻ یہ جو پہلی جان پہچان ہوتی ہے، وہاں جا کر وہ بھی بھول جاتی ہے۔

میدانِ عرفات میں ملنے والے پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے میدانِ منا میں باہمی مشاورت کا عمل مقصود تھا

وہاں سے یہ کچھ کرنے کے بعد یہ لوٹیں گے اور پھر آ کر یہ منیٰ اکٹھے ہو جائیں گے۔ کم از کم کوئی تین دن وہاں رہتے ہیں۔ اس ایجنڈا کے اوپر یہاں گفتگو ہو گی اور وہاں یہ اس چیز کا انتظام ہو گا کہ اکٹھے ہوئے ہیں، اب سارے کھانے پکانے میں نہ لگ جائیں۔ آج ہم نے یہ کہہ دیا کہ (مثلاً) پاکستان کے نمائندوں کی طرف سے شام کا کھانا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ سب تو لگے ہوئے ہیں، اس پروگرام کی ڈسکشن میں، جس کی Announcement وہاں ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ **فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ** (2:198) یہاں پہنچنے کے بعد یہ جو مقام مشعر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بیٹھ کر اب تم نے عقل و شعور سے ان چیزوں کیا اوپر گفتگو کرنی ہے، ڈسکشن کرنی ہے، غور و فکر کرنا ہے۔ ہمارے ہاں تو جب بھی **فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ** آیا، جھٹ تسبیح ہاتھ میں آ گئی صاحب! اللہ کا ذکر کرو یا اس کے بعد پھر وہ دل پہ ضربیں لگانے کی بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کس Context میں یہ چیز آ رہی ہے کہ سامنے لاؤ اس ایجنڈے کو، سامنے لاؤ اس پروگرام کو۔ خدا کے دیئے ہوئے مقاصد کی رو سے **مَشۡعَرِ** ❶ **الۡحَرَامِ** میں تم میں بیٹھ کے ان چیزوں کے اوپر غور و فکر کرو۔ حرام یہ ہے کہ اس کی Respect، اس کی جو دلوں کے اندر حرمت ہے، وہ ہر وقت برقرار رہے۔

---

❶ مشعر کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عقل و شعور کی رو سے معاملات پر بحث و تمحیص کی جائے اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہو گا، اس لیے اسے حرام یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا۔ یہ مشعر الحرام منیٰ ہے (پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1979ء ص 24۔

حج کا یہ عظیم اجتماع عہدِ جاہلیہ کی طرح کوئی میلہ نہیں

کتنا بلند و اجالاحترام مقصد ہے، جس کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ اذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰىكُمۡ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ**

قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ (2:198) جس طرح سے تمہیں کہا گیا ہے' جو راہنمائی دی گئی ہے' اس طریق سے اب ان معاملات کے اوپر وہاں بیٹھ کر گفتگو کرو۔ اس سے پیشتر عہدِ جاہلیہ میں تم نے اس کو ایک میلہ ہی سمجھ رکھا تھا۔ یہ بات نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں' یہاں مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ آیا ہے کہ یہ سب کچھ کرنا' اس مقصد کے لیے تھا۔ اس سے پیشتر یہ مقصد تمہاری نگاہوں سے گم تھا۔ اب ہم نے جو راہنمائی کی ہے' اس کے مطابق کیجیے۔ اس راہنمائی کے مطابق وہاں حج ہوا۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ تمام معاملات جو مملکت میں یونیورسل ہوتے تھے' بعض تو مقامی ہوتے ہیں' جن کا تعلق پوری امت سے ہوتا تھا' حج میں وہ معاملات آ کر ڈسکس ہوتے تھے۔ ہم کم از کم خلافتِ راشدہؓ (632-661AD) یا کم از کم خلافتِ حضرت عمرؓ (634-644/45AD) تک تو یہ ہمارے ہاں تاریخ میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ جو اہم مقدمات ہوتے تھے ایسے جنہیں آپ بین الاقوامی کہتے ہیں' جیسے وہ آپ کے ہاں کی انٹرنیشنل کورٹ ہے' اس قسم کے جو معاملات ہوتے تھے' وہ بھی حج میں آ کر ڈسکس ہوا کرتے تھے۔ وہ مقدمات بھی جو اس قسم کے ہوا کرتے تھے مثلاً دو گورنروں میں دو ولایتوں (Empires) میں' آپس میں وہ معاملات بھی وہاں آ کر تصفیہ ہوا کرتے تھے۔

حج کانفرنس سے واپسی کے بعد ذہنوں میں متکبرانہ ذہنیت پیدا نہ کرلو

وَ اذۡکُرُوۡہُ کَمَا ہَدٰىکُمۡ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ - ثُمَّ اَفِیۡضُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ (2:199) اب اس کے بعد وہاں سے آ جاؤ۔ ذہن میں اب یہ ہو گیا کہ "پہلے محمد دین کیندے سن' ہن حاجی محمد دین کہو بھئی ❷!" یعنی وہاں سے آتے ہی ذہن میں یہ کچھ ہو جاتا ہے کہ ہم باقیوں سے کچھ الگ ہو گئے ہیں۔ یہ قرآن ہے' کہا ہے کہ وہاں سے آؤ جیسے عام لوگ آتے ہیں اور تمہارے کون سا کوئی سرخاب کا پر لگ گیا۔ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ (2:199) ہر وقت خدا کی حفاظت طلب کرتے رہو۔ یاد رکھو! کہیں لغزش نہ ہونے پائے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (2:199) یقیناً اس طرح اللہ کا قانون تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دے گا اور پوری پوری نشو و نما کا بھی۔ کہا کہ فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا (2:200)۔ مذہب کی دنیا میں جب بھی کہیں بیٹھو تو پھر وہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ اسلاف کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں' بزرگوں کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔ مذہب کی کوئی مجلس آپ لے لیجیے' تبرکاً پہلے قرآن کی آیت کی تلاوت ہی کیوں نہ ہو تو اس کے بعد جتنی وہاں آپ باتیں سنیں گے' وہ سارے اسلاف کے کارنامے ہوں گے۔ کہا' یہاں جمع ہوئے ہو تو اس مقصد کے لیے نہیں بلکہ یہاں قانونِ کداوندی کے مطابق ذکر کرو۔ جس شدت سے پہلے تم اسلاف کے کارنامے بیان کیا کرتے تھے' اس سے زیادہ شدت سے اب یہاں قانونِ خداوندی کی باتیں کرو۔

---

❶ پہلے محمد دین کہتے تھے' اب بھئی! حاجی محمد دین کہو۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ذکر کا مفہوم

میں نے یہ چیز کہی کہ ذکر سے مراد ہمیشہ قرآن کی رو سے قوانینِ خداوندی کے متعلق گفتگو کرنا ہے' اس نظام کے متعلق گفتگو کرنا ہے۔ یہ چیز میں نے از خود نہیں کہی' قرآن سامنے رکھ کر اپنی طرف سے کچھ کہنا تو شرک ہے' یہ استنباط بھی نہیں ہے' قرآن کی نص ہے۔ یہ آدھی آیت ابھی میں نے پڑھی' جہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ ان چیزوں سے مناسک سے فارغ ہو جاؤ' تو پھر یہ ذکر اللہ کرو۔ باقی آیت کا حصہ یہ ہے کہ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ o وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ o اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (2:200-02) اور اس کے بعد ہے کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (2:203)۔ قرآن سامنے ہے تو ذرا ان الفاظ پہ غور کیجیے گا۔ یہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ (2:198) پہلے آیا ہے' درمیان میں' ان آیات کے تسلسل میں' یہ چیز آئی ہے کہ یہاں سمجھ لو کہ یہ جو وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ہم نے کہا ہے' قانونِ خداوندی کی بات کی ہے' اب دنیا میں کچھ لوگ تو وہ ہوں گے جن کے سامنے صرف یہ طبعی قوانین ہوں گے' Physical Laws ہوں گے' اپنے مفاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے کرنا ہے وہ چیز سامنے ہوگی' ان کے سامنے مقصود صرف اس دنیا کے مفادات ہوں گے' اسی دنیا کو انہیں Conquer (مسخر) کرنا ہوگا۔ اس کے سامنے بھی خدا کے قوانین ہوتے ہیں' وہ صرف قوانینِ فطرت ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ ہیں جن کا مقصودِ حیات صرف یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اس دنیا کی زندگی کے اندر سب کچھ مل جائے۔ کہا کہ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200) پھر مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ ذکر اللہ جو تم نے کرنا ہے' یہ ان لوگوں کی طرح نہ کرنا۔ یہ بڑی گہری بات ہے۔ ایک سائنٹسٹ بھی ذکر اللہ کرتا ہے' قوانینِ خداوندی کی یاد دہانیاں کرتا ہے' ان کے لیے ریسرچ کرتا ہے' ان کے لیے تحقیقات کرتا ہے' وہ بھی خدا کے قوانین ہیں۔

قرآنِ حکیم نے انسانی زندگی کے پہلو کے پیش نظر قوانین دے رکھے ہیں

عزیزانِ من! یہ وہ مقامات ہیں جہاں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ قرآن کس قسم کا مکمل ضابطۂ حیات دیتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں دنیاوی امور یا دنیاوی مقاصد کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جسے آپ سیکولر نظام کہتے ہیں' اس میں جو منتہائے مقصود ہے وہ اسی دنیا کے مفاد ہوتے ہیں' مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ درمیان میں ایک تیسری چیز ہے' جسے ہم نظامِ خداوندی کہتے ہیں' نہ یہ مذہب ہے نہ یہ سیکولر ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ کس قسم کا ایک نظام دیتا ہے؟ مذہب کی دنیا میں دنیاوی مقاصد کی بات کیجیے تو بڑی ہی نفرت سے اسے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مذہب پرست دنیا میں دنیادار تو نفرت اور استحقار کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے ایک اصطلاح ہوگئی ہے۔ مثلاً دنیاوی

معاملات، دنیا کا بندہ، دنیاداروں کی باتیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کتنی حقارت سے یہ چیزیں آتی ہیں۔ نظر آتا ہے کہ خدا کو تو اس سے کوئی تعلق ہے نہیں، خدا کی جو دنیا ہے، وہ مذہب کی دنیا ہے، اس کی باتیں کیجیے تو اللہ کی باتیں ہیں حتیٰ کہ جب آپ کہیں گے اللہ والوں کی باتیں، تو وہ ایسے آپ کو نظر آئیں گے کہ جن کے لیے نہ پہننے کو کپڑا، نہ کھانے کو روٹی، نہ رہنے کو مکان۔ یہ اللہ والوں کی چیز ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو آپ کے ہاں عیسائیت کا تصور چلا آ رہا تھا کہ دنیا اور Matter (مادہ) قابلِ نفرت ہے اور انسانی زندگی کا جو منتہا ہے، وہ عاقبت سنوارنا ہی ہے، اپنی نجات حاصل کرنا ہے۔ یہ اس طرح سے ہمارے رگ وپے میں حلول کر گیا ہے کہ جس طرح وہ دنیا کو قابلِ نفرت کہتے ہیں، اسی طرح سے ہمارے ذہن میں بھی یہ چیز آ گئی کہ دنیا اور دنیاوی مقاصد اور دنیاوی مطالم کی بات کرنا، مذہب کے خلاف جاتا ہے اللہ والوں کا یہ انداز نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر وہ پہلوؤں کو بیان کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن عجیب چیزیں کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسے تم قوانینِ فطرت کہتے ہو، وہ بھی خدا کے قوانین ہیں۔ یہ فطرت کے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ قوانینِ فطرت کے متعلق Researches (تحقیقات) کرنا، ان کے متعلق گفتگو کرنا، ان کو بروئے کار لانا، یہ چیزیں بھی خدا کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں۔ ان کا اتباع کرنا، ان کو Folloow کرنا، ان کے لیے بھی خدا کہتا ہے کہ جو یہ کچھ کرتا ہے، ہماری نصرت وتائید اس کے ساتھ شامل ہوتی ہے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ زندگی کا منتہا یہی نہیں ہے، اس کے علاوہ ایک اور Set of Rules (ضابطہ، قواعد واصول) بھی ہے، ایک اور ضابطہ، قانون بھی ہے، جو انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔ اس کو بھی ساتھ رکھا جائے تو پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے ورنہ بات آدھی رہ جاتی ہے۔ یہ چیز کہ صرف فطرت کے قوانین کے متعلق ریسرچ کرنا، گفتگو کرنا، اتباع کرنا جو ہے، وہ بھی خدائی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ آپ دیکھیے، عزیزانِ من! قرآنِ کریم کس وضاحت اور حسن سے یہ باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ (17:18) جو دنیا کے قریبی مفاد چاہتا ہے، عجلنا لہ ہم اس کو یہ مفاد دیتے ہیں۔ جو بھی ہماری مشیت کے قانون کے مطابق لینا چاہتا ہے، اسے ہم یہ مفاد دے دیتے ہیں تو گویا دنیاوی مفاد اگر ان قوانینِ فطرت کے اتباع سے حاصل ہوتے ہیں، وہ بھی خدا کی طرف سے ملتے ہیں، اس کے قوانین کے اتباع سے ملتے ہیں، نظامِ کائنات کا وہ ایک حصہ ہے۔ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلٰٮهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا (17:18) لیکن اگر منتہائے نگاہ اتنا ہی اس نے رکھا ہے تو یہ کچھ تو اس کو مل جائے گا، اس کے بعد جو مستقبل ہے وہ اس کا تاریکیوں میں ہوگا وہ تباہیوں میں ہوگا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ بڑا ہی افسردہ ومایوس ہوگا، حقارت سے ٹھکرایا ہوا، ایک طرف پھینکا ہوا، وہ اس کی زندگی اس قسم کی ہو جائے گی وَ مَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَ هُوَ

مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُھُمۡ مَّشۡکُوۡرًا (17:19) لیکن جو اس کے ساتھ مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے اور وہ خدا کے قوانین کی صداقتوں پر یقین رکھتا ہے تو اس کی کوششیں مشکور ہوں گی' اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آئیں گے' اس کی سعی مشکور ہوں گی' بھرپور نتائج نکالیں گی۔

قرآن حکیم نے انسانیت کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے

عزیزانِ من! اگلی آیت ہے غور فرمائیے۔ خدا ہی یہ چیز کہہ سکتا ہے کہ کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَ ھٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20) خدا کی طرف سے جتنی چیزیں' یہاں بطور مہبت کے ملتی ہیں' اس کائنات کے اندر اس میں وہ پہلا گروہ ہو یا یہ دوسرا گروہ ہو' کفار کا ہو یا مومنین کا ہو' اس حصے کے اندر جو بھی فطرت کے قوانین کا اتباع کرتا ہے' کُلًّا نُّمِدُّ ہم اس کو بھی مدد دیتے جاتے ہیں' کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَ ھٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20)۔ یہاں رَبِّکَ آیا ہے۔ اب یہاں دیکھیے رب تو نشوونما دینے والے کو کہا ہے اور وہ رب العالمین ہے۔ جو سامانِ نشوونما اور سامانِ زیست' اس نے یہاں' دسترخوانِ عالم پر پھیلا دیا ہے' اس میں پھر اس کی تخصیص نہیں ہے۔ طریقے کے مطابق ہل عبداللہ چلائے یا سن سنگھ چلائے' اگر قاعدے کے مطابق وہ زمین جوتی ہے اور اس کے مطابق دانہ ڈالا ہے اور قاعدے کے مطابق' خدا کے قانون کے مطابق' محنت کی ہے تو دونوں کی کھیتی یکساں اُگے گی۔ اگر عبداللہ نے یہ قانون نہیں استعمال کیا' Follow نہیں کیا' اس کی کھیتی نہیں اُگے گی' سنت سنگھ کی اُگے گی۔ تعجب تو ہوتا ہے۔

کائناتی خزانوں کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں خدا کا قانون بڑا فراخ دل واقع ہوا ہے

عزیزانِ من! اب اس آیت کا اگلا ٹکڑا ہے' اس کو دیکھ کر وہ وجد آ جاتا ہے کہا ہے کہ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) جو چیزیں عطا کہلائی جائیں' جن کو ہم مہبت کے طور پہ یوں لیں' وہ دینے کے بعد وہاں پھاٹک لگا دینا' خدا کو تو زیب نہیں دیتا۔ کہا کہ پھر وہ رب نہیں ہو سکتا جو مخلوق کو پیدا تو کر دے ان کی زیست کے لیے یہ سامان ہو اور اس کے بعد پھر پھاٹک لگا دے کہ یہاں سے ''فتح سنگھ تے اگے نئیں جاسکدا' عبداللہ ای جاسکدا اے[1]۔'' جو عطائے رب ہے' وہاں پھاٹک نہیں لگ سکتا اور اس کے بعد کہا کہ اگر تم یہ چیز مشاہدہ کرنا چاہتے ہو کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے تو اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (17:21) دیکھو! دنیا میں اقوامِ عالم پہ غور کرو' دیکھو تو سہی تمہیں کتنی قومیں آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہیں' جنہیں تم کافر کہتے ہو لیکن وہ قوانینِ فطرت کے مطابق کام کرتی ہیں' زندہ شہادت تمہارے سامنے ہے۔ تم شکوہ کرنے کے لیے آ گئے تھے کہ صاحب! انہیں یہ کچھ کیوں مل گیا۔ جو رب العالمین کہلاتا ہے' اس کو یہ زیبا نہیں دیتا کہ اپنی عطا کے راستوں میں پھاٹک لگا دے۔ دیکھتے نہیں کس طرح سے قومیں ایک دوسرے کے اوپر

سبقت حاصل کرتی' بڑھتی چلی جاتی ہیں؟ یہی ہے وہ کہ عطائے رب کے سامنے پھاٹک نہیں لگا دیئے گئے لیکن وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (17:21) بس یہ ایک نقطہ یاد رکھو کہ یہاں تو یہ سارا کچھ یوں ہے جو ''مستقبل کے متعلق بھی خیال رکھتا ہے اور اس کے لیے بھی سعی کرتا ہے تو دونوں کو جب تم تولو گے تو اس کے مدارج اور اس کے جو طبقات ہیں اس کے مقابلے میں آگے چلے جائیں گے۔'' اسے دونوں چیزیں حاصل ہوں گی' اسے صرف ایک چیز حاصل ہوگی۔ وہ صرف Optional Subjects (اختیاری مضامین) میں پاس ہوگا' یہ Optional (اختیاری) اور Compulsory (لازمی) دونوں میں پاس ہوگا۔

---

❶ فتح سنگھ تو آگے نہیں جا سکتا' عبداللہ ہی جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق فطرت کے قوانین اور انسانی زندگی کے قوانین میں کہیں کوئی تضاد نہیں یا قرآن حکیم کے ایک حصے کو تسلیم کرنا اور دوسرے حصے سے انکار کرنے کا نتیجہ جہنم ہے، تباہی ہے

کہا ہے کہ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (17:22) یاد رکھو! قانون ایک ہی کا یہاں چلتا ہے' دو کے قوانین نہ چلانے شروع کر دینا کہ فطرت کی زندگی کے دائرے میں تمہارا قانون کا ایک ضابطہ ہو اور انسانوں کی تمدنی زندگی کے اندر کسی اور کا ضابطہ لے آؤ۔ یہ شرک ہو جائے گا۔ ایسا کرو گے تو یاد رکھو! اس کے بعد مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (17:22) مذموم ''دنیا کے راندے ہوئے' دھتکارے ہوئے' اور مخذول اس طرح سے جیسے گلے سے بھیڑ کا بچہ کہیں بچھڑ جائے اور بھیڑیئے اس کو اٹھا کر لے جائیں۔ یہ کیفیت ہو جائے گی اگر تم نے Duality (ثنویت) پیدا کر دی' اگر تم نے دو خدا بنا لیے۔ ہم تو دو خدا بنانا' یہی کہتے ہیں کہ بتوں کی پرستش کر لی جائے۔ عزیزانِ من! یہاں الٰہ بنانا ہے۔ اگر تم نے قانون کے دو سرچشمے تسلیم کر لیے۔ فطرت کے دائرے میں تو تم اپنا قانون بنا ہی نہیں سکتے' وہاں تو مجبوری ہے' وہاں تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جو بوؤ اور گیہوں اُگے۔ اختیار تمہیں دیا گیا تھا تمہاری تمدنی زندگی میں' اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ تم یا خدا کے قوانین کا اتباع کرو یا اپنے خود ساختہ یا انسانوں کے خود ساختہ کا اتباع کرو۔ خدا کے قوانین کی اتباع کرو تو توحید ہو گئی' دونں دائروں کے اندر ایک ہی کا قانون چلا اور یہاں اگر تم نے اپنے خود ساختہ یا دوسرے انسانون کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ کیا تو دو الٰہ بن گئے اور کہا ہے کہ دو الٰہ نہ بنانا۔ جو ان دونوں دائروں میں ایک الٰہ بنائے گا۔ اس کو یہاں بھی عطائے رب سے سب کچھ ملے گا اور اس کا مستقبل بھی درخشندہ اور تابناک ہوگا۔ دو الٰہ بناؤ گے تو وہ فطرت کے قانون کے مطابق جو کچھ حاصل کرنا چاہو گے' وہ تو ملتا چلا جائے گا' ہم وہاں پھاٹک نہیں لگائیں گے کہ تم کافر ہو' تمہارا نام رام داس ہے۔ بالکل نہیں' وہ تو ملتا جائے گا۔ یہ جو حصہ ہے یہ تمہارا جہنم ہو جائے گا۔

انسانوں کو تمدنی لحاظ سے تین کیٹگریز میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

برادرانِ عزیز! یہاں تین کیٹگریز ہو گئیں۔ ایک تو ان کی جنہوں نے صرف فطرت کے قوانین کو مسخر کیا۔ وہ اس دنیا میں اس ارض کو چھوڑ کر آسمان تک اور اجرامِ فلکی تک اور چاند اور سورج تک جا پہنچے لیکن انسانی زندگی کے اندر انہوں نے اپنے ہی قوانین کو الٰہ بنایا اس لیے یہ خوشگواریاں تو ان کو مل جائیں گی' انسانیت کا جو مستقبل ہے' وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ جا رہا ہے' آج ہی آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایک کیٹگری یہ ہوئی لیکن بہرحال اس دنیا کی منفعت بخشیاں تو انہیں حاصل ہو گئیں۔ دوسری کیٹگری وہ ہو گئی جنہوں نے ان قوانین کا بھی اتباع کیا' فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اور ان کے ماحصل کا استعمال خدا کے بنائے ہوئے ان قوانین میں کیا جو تمدنی زندگی سے متعلق ہیں' جو وحی کے ذریعے ملتے ہیں' وہ آج قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ ان کو اس دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل ہوئیں اور مستقبل بھی درخشندہ اور تابناک رہا۔ یہ دوسری کیٹگری ہو گئی۔ پہلی تو کہہ لیجیے کہ یہ آج کے اقوامِ مغرب کی ہے۔ دوسری کیٹگری جنہیں قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے ان کی ہے اور تیسری کیٹگری جنہوں نے نہ خدا کے قوانین کا اس دائرے میں اتباع کیا اور نہ اُس دائرے میں اتباع کیا کہا کہ خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (22:11) یہ کون ہو گئے؟ صورت بگیں حالم نہ پرس۔ عزیزانِ من! مجھ سے نہ پوچھیے' اپنے آپ سے پوچھیے تاریخ کے اوراق سے پوچھیے جس کو قرآن نے کہا ہے کہ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (17:22) تمہاری یہ کیفیت ہو جائے گی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں قرآن نے جو ذکر اللہ کہا ہے کہ وہاں آؤ تو پھر ذکر اللہ کرو۔ ربط ملاحظہ فرما۔ جہاں ملّا کو ہر جگہ بے ربطی نظر آتی ہے۔ یہاں ذکر اللہ کے بعد ہے کہ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200)۔ تمہیں اس قسم کی دو کیٹگریز نظر آئیں گی' ایک وہ جو اسی دنیا کے مفاد اور مطالب کو مقصودِ نگاہ بنا لیں گے۔ ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوگا کہا کہ وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (2:201)۔ دوسرا گروہ وہ ہوگا کہ فطرت کے اس دائرے میں ان کی سعی مشکور ہوں گی اور ان کا مستقبل بھی تابناک اور درخشندہ ہوگا۔ یہ ایمان والوں کی جماعت ہے آگے کہا کہ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا (2:202)۔ ان کو بھی یہ نہیں ہے کہ انہوں نے عبداللہ نام رکھ لیا تھا تو اس لیے یہ کچھ ملے گا۔ بلکہ یہ ہے کہ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا (2:202) انہوں نے اس کے لیے جو اکتساب کیا' جو کمائی کی' جو عمل کیا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں دنیائیں ان کی درخشندہ ہو جائیں گی۔

قرآن حکیم کے نزدیک سریع الحساب کا مفہوم

یاد رکھو! وَ اللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (2:202) ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ کے کام کیے جائیں تو وہ قیامت میں' آخرت میں' جا کر اس

کا حساب ہوگا۔ اسے ہی ہم یوم الحساب کہتے ہیں' کہ وہاں میزان گڑے گا' وہاں نیکی بدی تلے گی' وہاں اس کے بعد جہنم ملے گی۔ یہاں وہ سریع الحساب کہتا ہے کہ ہم تو یوں حساب کر دیتے ہیں۔ یہ کونسا حساب ہے جو فوراً سامنے آتا ہے؟ اس زندگی میں نتائج سامنے آئیں گے تو خدا سریع الحساب ہوگا۔ اس لیے جسے یہ کہا گیا ہے کہ اس دنیا کی متاع بھی ان کو حاصل ہوگی' آخرت کی سرفرازیاں بھی ملیں گی۔ یہ سریع الحساب ہے' خدا فوراً حساب کر کے دے دینے والا ہے۔ تو حساب کا جو نتیجہ ہے وہ تو اسی وقت سامنے آنا چاہیے۔ بینک میں آپ جائیے۔ آپ کا کریڈٹ بیلنس جتنا ابھی ہے' وہ فوراً آپ کے سامنے آنا چاہیے' آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کہاں کھڑا ہوں: وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ .

حج کے اجتماعات کے دوران وقت کا تعین اور انتظامی امور

برادرانِ عزیز! وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ سے بات شروع ہوئی تھی آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہنے کے بعد کہا کہ وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ (2:203) اس مقام پر گنتی کے دنوں تک رہتا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھا کہ یہ جو ذکر ہے' اللہ کا وہ ہوتا کیا ہے؟ اور وہاں شدت سے یہ کچھ کرو' تمام دنیا کے نمائندے تم اکٹھے ہوئے ہو' انسانیت کے مسائل اور مشکلات جو ہیں' وہ تمہارے سامنے ہیں' ان کے اوپر Concentrte کرو' اس کے فوراً بعد کہا کہ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ وَ مَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ لِمَنِ اتَّقٰی (2:203)۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر آپ دیکھنا کہ آپ کو کتنی فرصت ہے؟ اگر دو ہی دن کی فرصت ہے' پیچھے کوئی زیادہ اہم کام ہیں' کوئی بات نہیں ہے' اتنے میں واپس آ جاؤ' زیادہ کام ہے زیادہ فصرت نہیں ہے' زیادہ دن وہاں رہ لو۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ تو اب آگے پروگرام کی بات تمہارے آ گئی کہ کس طرح سے تم یہ کرتے ہو کہا ہے کہ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ (2:203) بات یہ نہیں کہ دو دن وہاں ٹھہرنا ہے یا دس دن وہاں ٹھہرنا ہے۔ سوال تو سارا یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے متعلق جو وہاں بحث وتمحیص اور اس کو عملی پیمانوں کے اندر ڈھالنے کی باتیں ہو رہی ہیں' وہ کس طرح سے تکمیل کو پہنچیں گی۔ اس چیز کو یاد رکھو اور یاد رکھو کہ تم جو Responsible (ذمہ دار) ہو' نہ تو اپنی مملکت کے ہو' نہ اپنی قوم کے ہو' تم Responsible To God ہو۔ اللہ کے لیے تم نے یہ سب کچھ کیا ہے اس لیے جو تم مسئول ہو جو تمہاری ذمہ داری ہے' وہ خدا کے لیے ہے۔ اسے سوچ لو کہ اسے ہم نے یہ چیز بتانا ہے کہ ہم کیا کر کے آئے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟ تمہاری نگاہ اس مقصد پر رہنی چاہیے۔ تمہارے اجتماع کی آخری منزل اور غایت وہ ہے جو تمہارے خدائے' تمہارے لیے مقرر کی ہے۔ تمہارا قدم اس کی طرف اٹھنا چاہیے۔ جہاں بھی یہ الیہ راجعون' الیہ تحشرون کے الفاظ آتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے۔

حقیقت کے روپ میں باطل کا لبادہ پہننے والوں کا ذکر

اب آگے وہ ایک اور کیٹگری آتی ہے' یہ بڑی دلچسپ ہے۔ سارا مقصود تو اس دنیا کا منافع ہے لیکن بدقسمتی سے اس قوم میں پیدا ہوگئے۔ جو مذہب پرست ہے' مسلمان ہے' اسلام کی بات سننا چاہتی ہے۔ اب اس کے لیے کیا حکمتِ عملی ہے؟ کبھی تو یہ تھا کہ Honesty is The Best Policy یعنی دیانتداری بہترین پالیسی ہے۔ بہ طور پالیسی اس کو اختیار کرنا چاہیے' یہ بڑا فائدہ دیتی ہے۔ ایک اور کیٹگری ہے جس میں Islam is the Best Policy ہے یعنی بہترین پالیسی یہ ہے کہ جو کچھ کرو اسلام کا نام لیتے چلے جاؤ۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا(2:204) کہتا ہے کہ آ ؤ تمہیں یہ ایک اور کیٹگری بتائیں۔ اوپر جو بتایا تھا وہ کھلی ہوئی بات تھی۔ وہ کھلے بندوں خدا' وحی' مستقل اقدار اور حیات آخرت کا انکار کرتا ہے۔ نہ خود دھوکے میں رہتا ہے' نہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے۔ اس کے افراد کہتے ہیں کہ حیات الدنیا کے جو مفاد ہیں' یہ ہیں' صاحب! ہمارے پاس۔ بالکل نکھری ہوئی کھلی ہوئی بات کرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے' نتائج ملتے ہیں۔ دوسرے گروہ کے افراد ہیں جو خدا' وحی اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن دل سے ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے پیشِ نظر مقصد دنیاوی مفاد ہی ہوتا ہے۔ اس غرض سے کہ کہیں عوام بدک نہ جائیں' مذہب کے ظواہر کا پرچار شدت سے کرتے ہیں۔ اپنی اسلامی خدمات کا ڈھول بجاتے ہیں۔ دیانتداری سے کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! تمدنی اور سیاسی زندگی کے اندر بھی قوانینِ خداوندی کھلی ہوئی بات ہے۔ کہتا ہے کہ یہ اور کیٹگری ہوتی ہے:

ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

دنیاوی باتیں ہورہی ہیں' ان کے بیانات' ان کی Statements' ان کی باتیں ان کے ریزولیشن' تمہیں ورطۂ حیرت میں ڈال رہے ہیں' تعجب میں تمہیں ڈالیں گی۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں کیوں تعجب میں ڈالیں گی؟ کہتا ہے کہ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا(2:204) ان کا مقصد تو سارا یہی دنیاوی مفاد اور یہ کچھ ہے لیکن وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ(2:204) دل میں جو کچھ ہے' وہ تو دل میں ہے۔ خدا کی قسمیں کھائے جائیں گے کہ صاحب! بالکل اسلام کی خاطر' مسلمان کی خاطر' اللہ کے لئے' یہ سب کچھ ہے۔ وہ اپنے دعاوی میں سچا ہونے کے ثبوت میں خدا کو قدم قدم پر گواہ ٹھہرائیں گے کہ یہ شخص وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (2:204)۔ نکھر کر سامنے آنے والا دشمن' کچھ ایسا خطرناک نہیں ہوا کرتا۔ اس کے متعلق تو پوچھو نہیں کہ یہ کس قسم کا دشمن ہے؟ بظاہر یہ Voilent (متشدد) یا Agressive (جارحانہ نظر نہیں آتا۔ قرآن کی یہ Term (اصطلاح) عجیب ہے کہ یہ یوں نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی چیز Voilence کی نہیں' تشدد کی نہیں' کوئی

نہیں، کوئی تغلب نہیں۔ باتیں صاحب ایسی باتیں ہیں کہ یعجبک تمہیں حیرت میں ڈال دیں۔ قدم قدم کے اوپر خدا کو بیچ میں لاتا چلا جائے گا لیکن کہا کہ وہ دشمن جو کھلے ہوئے Agression (جارحیت) سے آتے ہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ان کے دل دشمنی اور خصومت کے جذبات سے لبریز ہوں گے۔ یہ الیکشن تک یہ سارا کچھ یہ کر رہا ہے۔ وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ (2:205) اور جب پھر حکومتی یہ باگیں اس کے ہاتھ میں آ جائیں گی، تخت پہ بیٹھ جائے گا، اس کے پاس قوت آ جائے گی تو اس کے بعد اس کی ساری کوششیں یہ ہوں گی کہ فساد ہی فساد مچ جائے۔ معاشی زندگی کے اندر جو رزق کے سامان ہیں، وہ سارے تلف ہو جائیں، تمدنی زندگی کے اندر انسانوں کی نسلوں کی نسلیں تباہ ہو جائیں، اس کو کچھ پرواہ نہیں ہوگی، اس کا اپنا مقصد ہوگا تو یہ ساری چیزیں جو وہ اللہ کی شہادت میں لایا تھا، وہ سب ختم ہو گئیں: وَ اِذَا تَوَلّٰی (2:205)۔ یہ اس وقت تک تھی، جب تک یہ قوت اس کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ قوت ہاتھ میں آئی تو یہ کیفیت ہے۔ جس خدا کو شہادت میں پیش کر رہا تھا، جس خدا کی وہ بار بار قسمیں کھا رہا تھا اور اسے گواہ بنا کر پیش کر رہا تھا، اس خدا کی کیفیت یہ ہے کہ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (2:205) وہ خدا تو ناہمواریاں پسند ہی نہیں کرتا، وہ خدا تو یہ پسند ہی نہیں کرتا کہ ملک میں تباہی اور ویرانی پھیل جائے۔ کہا کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ (2:206) اس وقت اس سے جب کہا جائے کہ حضرت! آپ تو قدم قدم پہ خدا اور رسول درمیان میں لاتے تھے، ہر سانس میں خدا کی باتیں کی جا رہی تھیں، اب بھئی! خدا کے وہ قوانین کا بھی کچھ لحاظ کرو۔ کہتا ہے کہ جی یہ بات تو ماننے کی ہے، دل تو ضرور مانے گا لیکن اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206) ایک False Prestige ہے، پندارِ نفس ہے، وہ پھر ادھر نہیں آنے دے گا۔ وہ پھر اصلاح کے بجائے انہیں اور خرابیوں کے لیے اکساتا ہے۔

صحیح راستے کو اپنانے کے راستے میں پندارِ نفس آڑے رہتا ہے

یہ کتنی بڑی Psycholigical (نفسیاتی) چیز ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ کہا ہے کہ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206) نشۂ حکومت کی بدمستیاں اور چھوٹی عزت کا خیال اصلاح کے بجائے انہیں مزید خرابیوں کی طرف اکساتا ہے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے گا دنیا میں کتنے لوگ آپ کو ایسے صریحاً نظر آئیں گے، جو غلط راہ اختیار کر رہے ہیں، دھاندلی کر رہے ہیں، زیادتی کر رہے ہیں۔ کہیے تو محسوس کر رہے ہیں، ان کے دل میں یہ بات ہے کہ واقعی غلط ہے مگر ادھر نہیں آتے۔ کونسی چیز انہیں ادھر نہیں آنے دیتی؟ یہ ہے عزت الاثم، پندارِ نفس، False Prestige، وہ ادھر نہیں آنے دیتی لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس سے کیا بنتا ہے اس کا؟ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ (2:206) اس

کا انجام جہنم کی تباہی ہے، جہاں انسانیت ذبح ہوتی ہے۔ اُف! کتنا برا ٹھکانہ ہے وہ جس میں پھر رہے گا! یہ تو رہے غلط بین وغلط کوشش مستبد حکمران اوراس کے مقابلے میں وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ (2:207)۔ دوسری کیٹگری کے وہ لوگ ہیں کہ وہ دنیاوی مفاد کی چیزیں تو ایک طرف رہیں، وہ اپنی جان تک خدا کے اس راستے کے اندر لا کر حاضر کر دیتے ہیں کہ صاحب! یہ ہے وہ چیز جس کے کام یہ آتی ہے، اس کو استعمال کر لیجیے۔ یہ محض خدا کے قوانین سے ہم آہنگی کا جذبہ ہوتا ہے جو مال تو ایک طرف، جان تک ہتھیلی پہ لے کر آ جاتے ہیں وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ (2:207) یہ خدا کے وہ بندے ہیں جن کو سامانِ نشوونما نہایت رافت اور محبت سے ملتا چلا جائے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرۃ کی آیت 207 پر ہم آ گئے۔ اس کے بعد پھر یہ ہے کہ وہ جوان کے مقابلے میں گروہ بتائے تھے ایک خدا کے ماننے والے، ایک الٰہ کو رکھنے والے، ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اور آگے اس کے بعد پھر تاریخ کے شواہد سے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچایا جائے گا۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀……❀……❀

تینتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 208 تا 214)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۲۰۸ فَاِنْ
زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۰۹ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ
ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۲۱۰ سَلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ
اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۲۱۱ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ۲۱۲ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۲۱۳ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ
مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۲۱۴

عزیزانِ من! آج مئی 1969ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 208 سے آغازِ کلام ہوتا ہے: (2:208)

سابقہ درس کی نگاہ باز گشت

سابقہ دو آیات میں دو گروہوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک وہ لوگ ہیں کہ ان کی باتیں سنیے ان کی تقریریں پڑھیے' بیانات دیکھیے' ریزولیشنز پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو حیرت میں ڈال دیں اور پھر اتنی بات ہی نہیں کہ جس طرح ایک ایک سانس میں' خدا رسول قرآن اور اسلام کو دہرائیں گے' اس سے آپ واقعی ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں گے۔ آپ اعتماد کر لیں گے کہ بہت بڑی اسلامی نظام کی خدمت

اسلام کو دہرائیں گے' اس سے آپ واقعی ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں گے۔ آپ اعتماد کرلیں گے کہ بہت بڑی اسلامی نظام کی خدمت ہو رہی ہے' یہ تو اس کے جاں نثار واقع ہوئے ہیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ہے' جب تک اقتدار ہاتھ میں نہ آ جائے۔ قرآن بتاتا ہے کہ وَ اِذَا تَـوَلّٰی (2:205) جونہی اقتدار ہاتھ مین آیا' وہ سب کچھ بھلا دیا اور ہر قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنا شروع کردیں۔ جب کبھی ان سے کہا جائے کہ بھئی! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو' تم نے تو یہ وعدے کیے تھے تو ان کے دل میں تو اس کا احساس ابھرتا ہے لیکن پندارِ نفس ادھر آنے نہیں دیتا۔ کہا کہ ان کا انجام جہنم کی تباہی ہے یا تباہی کا جہنم ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ جماعت ہے جو اپنے آپ کو خدا کے ہاں بیچ دیتی ہے کہ اس سے منشائے خداوندی پورا ہو جائے۔ اس کا تختِ اجلال جیسا حضرتِ مسیحؑ کے الفاظ میں' جیسا آسمانوں پہ ہے زمین پہ بھی اسی کی حکومت کا تختِ اجلال بچھے۔ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے بیچ دیتے ہیں۔ (2:207)

دین کی ماہیت یہ ہے کہ اس میں اجتماعی طور پر پورے کا پورا داخل ہوتا ہے

یہ کچھ کہنے کے بعد اب خطاب جماعتِ مومنین سے ہے۔ کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً (2:208)۔ یہ بڑی عظیم اصولی ہدایت ہے جو دین کو مذہب سے الگ کر دیتی ہے۔ ترجمہ یوں ہوا کہ اے جماعتِ مومنین! تم داخل ہو جاؤ سلم میں سلم امن اور سلامتی کا' تکمیل کا' مکمل کرنے کا نظام ہے۔ اس نظام میں' جو ضمانت دیتا ہے ہر قسم کی سلامتی کی' ہر قسم کے امن کی' تم اس میں داخل ہو جاؤ لیکن اس کے ساتھ ایک بات کہی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے میں نے کہا تھا کہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس سے دین کی ماہیت سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں کَـافَّۃً آیا ہے۔ اس کے دو معنی بنیادی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ پورے کا پورا کسی شے کے اندر داخل ہونا' جزوی طور پہ نہیں' کُلی طور پر پورے کا پورا اور دوسرے کافۃً جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ انفرادی طور پر نہیں' اجتماعی طور پر داخل ہو جاؤ' یہ جو چیز ہے اجتماعی طور پر' یہ دین ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے ہاں پُن کے دان کے' نیکی کے' اس قسم کے کام' جو بتائے گئے ہوں' کرتے جائیے۔ عقیدہ بھی ذاتی طور پہ رکھیے' یہ کام بھی ذاتی طور پر کرتے چلے جائیے تو مذہب کی ڈیمانڈ اور اس کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ دین کی یہ صورت نہیں ہے۔ وہاں کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) ضروری ہے کہ صادقین کی جماعت کے ساتھ مل جانا' وہاں وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ (2:43) ہے کہ جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنے کی صورت کرنا۔

دین کا تو ایک ایک جز مشین کے ایک ایک پرزے کی زمانہ اپنی اپنی جگہ اہم ہے

یہاں قرآنِ کریم میں خطاب کسی ایک مومن سے نہیں ہے۔ ہمیشہ جمع کا صیغہ ہوتا ہے' خطاب پوری جماعت سے ہوتا ہے۔ یہ

والذین معہ سے ہوتا ہے۔ دین اجتماعی نظام کا نام ہے اور نظام ایسا ہے کہ جس کے حصے نہیں کیے جاسکتے، ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس مین سے کسی ایک جز پہ آپ سمجھیں کہ ہم نے عمل کرلیا تو کہہ دیا کہ خیر کوئی بات نہیں صاحب! کوئی 20% کے قریب تو عمل ہوگیا۔ یہ یہاں Perchntage (فی صد) کا سوال نہیں ہے۔ وہ جیسا کہ میں عام طور پر مثال میں کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ ڈاکٹر کا نسخہ لیں، اس نسخے میں اگر انہوں نے چھ سات اجزا لکھے ہیں، دوائیاں لکھی ہیں تو آپ اس میں سے جو سات ہیں، میں کہتا ہوں کہ چار بھی لے لیں جمہوری نظام کی رو سے تو آپ کے حق میں اکثریت ہوگئی، آپ اس کے چار اجزا لے لیں اور انہیں استعمال کریں اور کہیں کہ صاحب! وہ آدمی سے جتنا ہوسکتا ہے، کرلے، باقی کا کیا ہے۔ یہی نہیں کہ اس سے فائدہ نہیں ہوتا اس سے نقصان ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ مختلف اجزا کے ملنے سے اس نسخے کی تکمیل ہوتی ہے اور پھر اجزا بھی ان کے Atrandom نہیں جو اوزان ہیں، ان کی جو مقدار ہے، وہ بھی اسی طرح سے ہونی چاہیے اور بعض اوقات تو جب وہ بتاتا ہے کہ پہلے یہ دوائی، بعد میں یہ دوائی، وہ طریق بھی وہی ہونا چاہیے۔ وہ تمام جزئیات مکمل طور پر آپ کے ساتھ ہوں اور ان پہ آپ عمل کریں تو پھر یہ چیز نتیجہ خیز ہوگی۔ آپ عام نظامِ مملکت میں دیکھ لیجیے۔ اس کا ہر حکم، ہر قانون، اپنی اپنی جگہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان میں سے اگر آپ نے آدھے قوانین کو مان لیا تو اس کے بعد آپ نے سمجھ لیا کہ باقی کا کیا ہے، مانا نہ مانا، اتنا مانا ہے، اتنے کا تو نتیجہ مل ہی جائے گا۔ صاحب! سوال یہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک سائنٹفک فارمولا ہے اور فارمولا تو کلیتاً لیا جائے گا تو اپنا نتیجہ دے گا۔ اگر آپ اس فارمولے کو کلیتاً نہیں لیتے، اس کے کچھ اجزا کر لیتے ہیں تو اس صورت میں تو بات ہی پیدا نہیں ہوسکے گی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کی ایک نسبت سے۔ اگر اس میں آپ کیمکل ایکشن کرتے ہیں تو پانی کا قطرہ بنے گا۔ اس میں سے اگر آپ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! کوئی بات نہیں، آکسیجن ہی لے لیتے ہیں، اس میں سے 50% میں نے یہ کرہی لیا۔ اب تو اتفاق سے Liquid Oxygen (مائع آکسیجن) بھی ملتی ہے۔ ایک گلاس اس کا کہیں پیاس کے وقت پی لیجیے۔ پھر دیکھیے اس سے بنتا کیا ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ دین (یعنی نظام زندگی) میں دخل اندازی شرک بھی ہے اور فریب نفس بھی

نظام اور فارمولا تو وہ چیز ہے کہ ہائیڈروجن خود جلتی ہے، آکسیجن ہر شے کو جلنے میں مدد دیتی ہے۔ جہاں آکسیجن موجود نہ ہو، وہاں کوئی شے جل نہیں سکتی۔ یہ دونوں چیزیں آگ پیدا کرنے والی ہیں۔ ان دو کو خاص نسبت سے جب ملا کر اس میں ایک ایکشن پیدا کیا جائے تو پانی بنتا ہے جو آگ کو بجھانے والی چیز ہے۔ اسے نظام کہتے ہیں۔ نظام کے اجزا الگ الگ نہیں کیے جاسکتے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔ جونہی آپ نے انہیں الگ کیا، مذہب بن گیا۔ اس نے کہا ہے کہ **ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً** (2:208) اس نظامِ امن وسلامتی

میں داخل ہو۔اس کو کلیتاً لو اور اجتماعی طور پر سب کے سب اس میں داخل ہو۔ پورا نظام آپ قائم کریں گے تو اپنے نتائج دے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ شبا شب نہیں ہوسکتا' پہلے دن نہیں ہوسکتا تو آپ یوں کہیں گے کہ اس نظام کی تکمیل کا ہم نے آغاز کردیا' ابتدا کردی ہے لیکن نصب العین آپ کے سامنے وہی ہوگا کہ آپ نے اسے انتہا تک پہنچانا ہے۔ راستے میں کہیں بھی کھڑے ہوکر آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اسلام پر ہم عمل پیرا ہورہے ہیں۔ آپ اس وقت یہ کہیں گے کہ اسلامی نظام کے لیے ہم کوشش کررہے ہیں اور جب اسے کافّة آپ اپنے ہاں اختیار اور نافذ کرلیں گے اور جماعت پوری کی پوری اس کے اندر آ جائے گی تو اس صورت میں آپ کہیں گے کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں۔ اس وقت آپ اپنے آپ کو مومن کہلا سکیں گے یا جماعتِ مومنین کہلا سکیں گے۔ یہ جو قرآن کے احکام کے کسی ایک حصے کو یا ایک حکم کو لے کر اس پہ عمل پیرا ہوجانا اور باقیوں کے متعلق Indifferent (لاتعلق) رہنا' اس پہ عمل ہی نہ کرنا ہے۔ اس کے بعد کہا جائے کہ ''کوئی جتّے جوگا ہووے کرلے' سارے قرآن تے کن عمل کیتا ہیگا؟ ❶''۔ یہ ''جتّے جوگا جیہڑا ہے ❷''۔ یاد رکھیے یہ مذہب کے اندر ہوتا ہے۔

---

❶ کوئی جتنا کرنے کے لائق ہو'وہ کرلے۔ سارے قرآن پہ کس نے عمل کیا ہے؟ (کسی نے بھی نہیں)

❷ یہ جو جتنا کرنے کے جو لائق ہے۔

دین کے نظام کو عملی طور پر منظّم کرنے کا طریق

ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ کسی فارمولے میں' کسی نظام میں' اس کے ٹکڑے کیے ہی نہیں جاسکتے لیکن یہاں تو بڑی آسان بات ہے۔ قرآنِ کریم کے دو حکم آپ دیکھیے بعینہٖ الفاظ وہی ہیں کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) تم پر روزے فرض کیے گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کتنا شدت سے اس کے اوپر عمل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے چار ہی سطروں کے بعد ہے کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (2:216) جہاد بھی تم پہ فرض کیا گیا ہے۔ اب اس کے لیے آپ کے ہاں وہ مخصوص گروہ الگ ہے' اس فریضے کی ادائیگی کے لیے الگ لوگ ہیں۔ صاحب! وہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) کے لیے بھی پھر وہ چند آدمی الگ کیوں نہیں نکال لیتے کہ ''ٹھیک ہے ایت کی تو روزے رکھ' پہلے میں رکھے ہیگے سن ❶۔'' آپ دیکھیے یہ چیزیں بڑی غور طلب ہیں کہ معاشرے میں کیسے رائج ہوتی ہیں اور ہم کبھی کھڑے ہوکر سوچتے نہیں ہیں۔ ایک ہی سورۃ کے اندر چند ہی آیات کے ساتھ ساتھ یہ دو حکم ہیں۔ میں مثال کے طور پر دو حکم دیتا ہوں۔ یہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (2:216) کے ہیں۔ اگر ایک میں آپ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم پوری جماعتِ مومنین کے لیے ہے اور اس میں بہرحال صیام کے لیے وہ شرائط ہیں کہ وہ جو روزے رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے'

قوت رکھتا ہے' قرآن نے خود ان شرائط کو بتا دیا لیکن بہر حال ہے تو پوری جماعت کے لیے حکم بعینہٖ اسی قسم کا حکم' انہی الفاظ کے ساتھ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) ہے۔ ہمیں کبھی بھی خیال آیا ہے کہ یہ بھی ہم پر فرض ہے' یہ بھی ہمارے لیے ایک حکم ہے۔ اس میں سے مذہب کی قسم کی جو آسان آسان چیزیں ہیں' وہ تو چن لیں۔ نہایت آسان صاحب!

---

❶ اس دفعہ تم روزے رکھو' پہلے میں نے رکھے تھے۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

اتنا زور اس پہ ہے۔ میں اس کی تکذیب نہیں کرنا چاہتا' میں اس کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتا۔ نظام کے اندر تو اس کی بڑی اہمیت ہے۔ فوجی سے پوچھیے کہ وقت کیا چیز ہوتی ہے اور اس وقت جنہیں چیزیں کہا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کتنی ہوتی ہے۔ ایک منٹ کی دیر کر دیجیے' آپ وہاں لائن میں کھڑے ہونے سے یا لائن میں کھڑے ہو کر ایک قدم آپ کا آگے پیچھے ہو جائے پھر دیکھیے کہ کیسے قیامت برپا ہوتا ہے۔ کہنے کی بات یہ تھی کہ ٹھیک ہے یہ بھی ایک فریضہ ہے وہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) بھی تو ایک فریضہ تھا۔ یہ کیا ہے کہ آپ کی صف بندی مسجد کے اندر تو صرف ہوتی ہے' مسجد کے باہر نکل تو وہی انتشار پیدا ہو جاتا ہے' آپ کے ہاں۔ یہ قتال کا حکم کس کے لیے ہے؟ کیا وہ ہمارے لیے نہیں ہے؟ نظام میں تو یہ بعض حصے کو لینا اور بعض کو نہ لینا نہیں ہو سکتی۔ ابھی ابھی اس سے پیشتر ہم سورۃ البقرۃ میں ہی وہ آیت آپ کے سامنے آ گئی اور وہاں قرآنِ کریم نے عجیب انداز میں اسے سمجھایا ہے۔ بات کی ہے' اس قوم کی جس کے متعلق یہ چیز ہم دیکھتے چلے آئے کہتے چلے آئے کہ دنیا میں سب سے دھتکاری ہوئی جسے ذلیل قوم کہا گیا وہ یہودیوں کی یہی قوم ہے۔ کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ وہ کرتے کیا تھے؟ وہ کرتے یہ تھے کہ پہلے اپنے میں سے کچھ لوگوں کو ظلم اور تعدی سے باہر نکال دیتے تھے۔ جب دشمن ان کو اُچک کر لے جاتے تھے' وہ وہاں گرفتار ہو جاتے تھے' قیدی ہو جاتے تھے تو ان کے ہاں ان کا مذہب بتاتا تھا کہ قیدیوں کو قید کی بند سے چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے تو یہ پھر ثواب کمانے کے لیے' پھر وہ چندے کرتے تھے اور اس فنڈ سے پھر وہ قیدیوں کو چھڑا کر لاتے تھے اور بڑے خوش ہوتے تھے کہ صاحب! ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ وَ ھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ (2:85) یہ جو تم نے پہلے ان کو اپنے ہاں سے نکال باہر کیا کہ دشمن اچک کر لے جائے' کیا اس دین میں جس میں یہ تھا کہ قیدیوں کو چھڑانا ثواب کا کام ہے' وہاں یہ بھی لکھا ہوا نہیں تھا کہ اپنوں کو اس حالت میں کر دینا جس سے وہ مظلوم و مقہور ہو جائیں' یہ حرام ہے' تمہارے لیے یہ ناجائز ہے؟ وہ تو یوں کیا تم نے اور اس کے بعد پھر ثواب کمانے کے لیے آپ انہیں چھڑانے چلے گئے اور خوش ہو گئے اور اس کے عبد ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا تمہاری یہ کیفیت ہے کہ جو ضابطۂ قوانین ہیں' اس میں سے تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اس کے ایک حصے پر تو تم ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو۔ مذہب کی دنیا کے تصور کے اعتبار سے تو یہ ہو جائے گا! کہ صاحب جتنے حصے پہ ہم نے عمل کیا ہے' وہ اتنا تو ہمیں مل جائے گا' ہم نے وہاں Debit Credit کا رجسٹر کھول رکھا ہے کہ صاحب! اس کا تو مل جائے گا۔ یہ آپ کے ذہن کی بات ہے۔ جو دین دینے والا خدا ہے' اس سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ (2:85) تم میں سے جو کوئی بھی ایسا کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر بھی ذلت اور خواری ہوگا۔ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اور اُخروی زندگی میں شدید ترین عذاب کی طرف چلے جاؤ گے۔ کہاں گیا وہ 50% اس لیے کہ یہاں تو کافۃ کی چیز ہے۔ مذہب کی دنیا میں تو یہ نہیں ہے' دین کے اندر ہے۔

قوانین خداوندی سے ہٹ کر انسان کی اپنی متضاد خیالی کی ایک جھلک

یہ تو اس نے بنی اسرائیل کی بات کہی ہے' قرآن تو ہمیں تاریخی شواہد سے باتیں سمجھاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ روز آپ یہ بات سنیں گے کہ صاحب! دیکھیے یہ غریبی امیری خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے' وہ جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے غریب کر دیتا ہے۔ چلیے! پہلی بات یہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ صاحب! ایسا نظام ہونا چاہیے جس کے اندر یہ تفرقہ تو مٹ جائے۔ اس نے تو دو بچے جب پیدا کیے تھے تو ایک کسی کے ہاتھ مین چیک بک دے کر اس نے نہیں بھیجا تھا اور دوسرے کو خالی ہاتھ بھیج دیا تھا۔ کسی کا بھی اس دن تو بینک بیلنس نہیں تھا' نہ وہ پیٹھ کے اوپر سونے کی ڈلیاں لاد کر لایا تھا۔ وہ تو دونوں کے دونوں بالکل ننگ دھڑنگ پیدا ہوئے تھے۔ پھر تم نے یہ جو تفریق پیدا کی ہے' یہ تو اس کی پیدا کردہ نہیں یہ تمہاری پیدا کردہ ہے۔ تو ایسا نظام ہونا چاہیے کہ یہ تفریق مٹ جائے۔ کہتے ہیں کیا کہہ رہے ہو؟ اگر یہ تفریق مٹ جائے اور آپ کے ہاں یہ محتاج نہ رہیں اور غریب نہ رہیں تو وہ جو خیرات دے کر ثواب کمانے کی بات ہے' وہ کیسے پوری ہو؟ ثواب کمانے کے لیے مستقلاً ایک جماعت آپ کے ہاں رکھی جانی چاہیے جو محتاج رہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ خسارے والا عمل جو کبھی ثمر بار نہیں ہو سکتا

قرآن کہتا ہے کہ خیرات دے کر ان کی ضروریات کو پورا کرنے والو! اور اس سے سمجھنے والو کہ ثواب کا کام ہے' ان کو جو غریب اور محتاج بنانا تھا کیا قرآن کی رو سے یہ حرام نہیں ہے؟ پہلے تو کوشش یہ کرتے ہو کہ تم میں سے ایک طبقہ مستقل طور پر محتاجوں کا رہے اور پھر

ثواب کمانے کے لیے خیرات کے ٹکے نکال کرتم ان کو بھیک منگوں کی صف میں کھڑا کر کے پیسے دو اور پھر اس کے بعد اپنے دل میں مطمئن ہو جاؤ کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے۔ سنو! فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) تم میں سے جو بھی یہ روش اکتیار کرے گا یاد رکھو! پہلی چیز یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کے اندر ذلیل وخوار ہو جاؤ گے۔ جتنی خیرات وزکوٰۃ آپ لوگوں کے ہاں سے نکلتی ہے، جتنی یہ دیگیں کھڑکتی ہیں، مزاروں کے اوپر اور جتنے چندے وہاں جاتے ہیں، ان کے بکسوں کے اندر، مجموعی طور پر ان کو آپ گن کے دیکھیے، بڑی رقم بنتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ساری رقم صرف بھی ہوتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ذلیل ترین قوم آج اس صفحۂ ارض پہ مسلمانوں کی ہے۔ ان کی ذلت کی مثال آسمان کی آں کھ نے نہیں دیکھی کہ جس قوم کو یہ ہزار برس سے ذلیل ترین کہتے چلے آئے تھے، یہودیوں کی قوم اٹھائیس لاکھ کی ساری آبادی، ایک شہر کی آبادی ہوتی ہے، مراکش سے لے کر عریبیا تک کے لیے مسلمانوں کی ساری سلطنتیں، جتنی بھی ہیں، ان کے ہاتھوں میں ذلیل اور خوار ہوتی پھر رہی ہیں۔ ایک حج میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے، ان کا اگر کہیں اجتماعی طور پر وہ اس مقصد کے لیے ایک سال کہیں Preserve کر لیں، آپ دیکھیں ان کی ذلتیں کیسی عزت میں بدل جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ہوتا نہیں ہے۔ قرآن نے جو کہا تھا اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (2:217) ان کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ عمل ہی کوئی نہیں کیا، کام ہی کوئی نہیں کیا، ایک یہ ہے کہ کام کیا ہے اور وہ بالکل رائیگاں گیا ہے۔ اس قوم کی یہ کیفیت ہے کہ کام کرنے کے اعتبار سے تو کم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک روزے کو ہی دیکھ لیا جائے، مئی جون کے مہینے میں اس قدر تپتی دھوپ کے اندر، سولہ سولہ گھنٹے کا وہ روزہ ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس التزام سے، ان کے ہاں کا وہ جسے مسلمان بتایا جاتا ہے کہ اس میں بہت ثواب ہے، وہ بے چارہ کس خلوصِ نیت سے یہ کچھ کرتا ہے۔ یہ بڑی مشقت طلب چیزیں ہیں۔

مستقبل کی کامیاب زندگی کا دارومدار حال کی کامیابی پر دلالت کرتا ہے

خرچ کرنے کے اعتبار سے میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ ان کے ہاں اتنا خرچ ہوتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ ان کی ذلت کے اندر اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ثواب کہاں ہے؟ جب یہ پوچھیے تو اس کے لیے نہایت عمدہ خود فریبی کا ایک جواب دیا جاتا ہے کہ یہ ثواب آخرت میں جا کر ملے گا۔ وہ کہنے والا کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے لیے خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) یہاں ذلت ہے اور جو یہاں ذلت ہے تو وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2:85) مستقبل کی زندگی کے اندر اس سے زیادہ شدید عذاب ہے۔ عزیزانِ من! جس کا حال ذلیل ہو کیا اس کا مستقبل درخشندہ اور تابناک ہو جائے گا؟ آپ سوچیے تو سہی کہ یہ کیا ہے؟ یہی کہ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (2:85)۔ ہمارے ہاں نظام کی مثال، اللہ کا شکر ہے، کہ ابھی فوج میں ملتی ہے، اس لیے

مثال ہی وہاں کی دینی پڑتی ہے۔اس کے باہر کی زندگی میں ہمارے ہاں نظم وضبط اور نظام ہے نہیں۔ یہاں ہمارے ہاں ''کتاب'' نہیں ہے' یہاں کُتِبَ عَلَيْكُمْ کی بات نہیں ہے۔ یہاں جس چیز کو اب کُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا جاتا ہے کہ تم پر یہ چیز فرض قرار دی گئی ہے' وہ بھی ہماری مرضی پہ چھوڑی ہوئی ہے۔ وہ جسے کہتے ہیں کہ اللہ کا خوف' اللہ کا ڈر' کسی کے دل میں ہو تو اس کو قائم کر لے۔ اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھتا تو کیا کر لیتا ہے کوئی دوسرا۔ جب کہا جائے' وہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ اپنی بات ہے' میرے خدا کی ابت ہے' میں نہیں رکھتا ہوں' مجھے اس کا عذاب ہوگا' رکھتا ہوں تو مجھے اس کا ثواب ہوگا ''تو چا چا لگنا ایں وچ ❶ ''۔ یہ کتب کی چیز' جب نظام نہیں ہوتا' تو یہی ہے۔ پوچھیے اس سے جہاں نظام ہے' ابھی فوج کے اندر ہے کہ وہاں وہ شخص بگل بجنے کے اوپر حاضر نہیں ہوتا اور اسی طرح نہیں ہوتا جیسا کتب ہے' تو اس کے لیے وہاں پوچھیے کہ ''فیر چا چا لگدا اے کوئی کہ نئیں ❷ ''۔ اور وہاں پھر اس سے سپاہی سے کہیے کہ ٹھیک ہے جی! بوٹ کے تسمے تو باندھ آیا ہوں' پیٹی میں نے نہیں باندھی' بیس نمبر کاٹ لیجیے آج۔ وہاں اجزا نہیں ہیں' وہاں حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے' نظام ہے' وہ دین ہے' وہ دین میں حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ بندوق ٹھیک ہے' نالی صاف ہے آئل دیا ہوا ہے' صاحب! گولی نہیں ہے' اس میں کچھ نمبر کاٹ دیجیے' جی اس کے اندر بلٹ ہی نہیں ہے۔ نظام میں یہ نہیں ہوسکتا۔

---

❶ تمہارا اس میں کیا تعلق۔

❷ پھر دیکھیے کہ اگر یہ نہیں ہے تو کیا ہوتا ہے۔

قیمتی سے قیمتی مشین کے پرزے باہمی ربط کے بغیر کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتے

آپ کے ہاں مذہب ہے' دین نہیں ہے۔ مذہب اپنے آپ کو فریب دینے کا نام ہے' دین درخشندہ نتائج سے' اس کی صداقت کے پرکھنے کا نام ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر قوم میں خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) تو وہ مومن کی جماعت نہیں نہیں ہوسکتی۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے' میں تو یہ کچھ نہیں کہتا۔ یہ کیوں ہے؟ اس نے کہا تھا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) اجتماعی طور پر' پورے کا پورا جو نظام ہے' یہ متشکل ہوگا تو اس کا چھوٹے سے چھوٹا جز بھی پھر اس کا نتیجہ پیدا کرے گا۔ پھر تو مشینری میں ایک چھوٹا سا جو پیچ ہوتا ہے' وہ بھی اپنی قیمت رکھتا ہے اور اگر اس کے سارے پرزے درست ہوں لیکن آپ نے ان کو میز پر بکھیر دیا ہو تو کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آ گئی اور اگر ایک پیچ بھی Missing (گم) ہے' اس کے اندر مشین میں کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہوگی' نتیجہ برآمد ہوگا۔ وہ مکمل بھی ہو تو کآفة کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) لیکن اگر یہ صورت نہ ہو' اجتماعی نظام نہ ہو یا نظامِ کلی نہ ہو' تو وہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

(2:208)۔عزیزانِ من! سنتے ہیں! اس زندگی کو چھوڑ کر دوسری زندگی کو بزعمِ خویش سمجھ لیا' کہ یہ مذہب پرستی کی ہے سنیے! قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ بڑی صاف بات ہے۔ ماننے کو ہمارا جی نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ وہ جو فریب کی جنت اپنے ذہنوں میں Create (پیدا) کی ہوئی ہے۔ وہ چھن جاتی ہے۔ ہم تو بچپن کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بچے کا کھلونا ٹوٹ جاتا ہے' اس کی کائنات اجڑ جاتی ہے۔ ہم نے اپنے ذہن کے سکون کے لیے مذہب کے کچھ کھلونے بنا رکھے ہیں۔ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بچہ اپنے اس کھلونے کو گھوڑا ہی کہتا ہے۔ یوں ٹھوکر سے اس کو توڑ دیجیے وہ یہی کہتا ہے کہ میرا گھوڑا ٹوٹ گیا۔ وہ سچ مچ پری میں' جن میں Believe کرتا ہے' ذہنی سکون ملتا ہے لیکن یہ تو عہدِ طفولیت کی بات ہے' وہاں تو فریب دے سکتا ہے۔ وہی بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو پوچھیے کہ جو گھوڑا ہے چلاؤ میاں اس کو ذرا سواری کرو۔ ہنس دے گا۔ اباجی! آپ کیا کہہ رہے ہیں' کبھی مٹی کے گھوڑے بھی چلا کرتے ہیں۔ اس بچے کے مٹی کے گھوڑے تو نہیں چل رہے' اس کے ابا کے مٹی کے گھوڑے پھر بدستور چلتے ہیں' پھر ساری عمر چلتے رہتے ہیں۔ یہ وہ مٹی کے گھوڑے ہیں جو مذہب کی فریب کاریاں انسان کو دے دیتی ہیں:

نہ دُکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

چلا جا رہا ہے ساری عمر اسی چیز کو کرتے ہوئے۔ ثواب ہوتا ہے' خیرات کے کام آ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ** (2:208) عزیزانِ من! اس سے بڑی دشمنی کیا ہوگی؟ قوم اتنی محنت کرے' اتنا کچھ خرچ بھی کرے' اتنی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے اور ہر نیا چڑھنے والا سوج مزید ذلتیں اس کے لیے لے کر آئے۔ اتنی بڑی جو دشمنی ہے' وہ تو کھلی ہوئی دشمنی ہے اور اس کے بعد آ گئی ہماری حالت۔ کہا کہ یہ بات ایسی بھی نہیں ہے۔ دادا نے تیغ ماری' کچھ کمائی کر لی' اب نسلاً بعد نسلاً سب کھاتے چلے جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ تم نے نظام قائم کر لیا' اجتماعی حیثیت سے اس میں داخل بھی ہو گئے' نتائج بھی نکلنے شروع ہو گئے تو کیا پھر اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ چلے گی؟ یہ ایک چابی بھرا کلاک ہے کہ آپ نے چابی دی دی اور آٹھ دن چلتی چلی آ رہی ہے۔ یہ یوں نہیں ہے کہا ہے کہ **فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ** (2:209)۔ جب اس قسم کے واضح دلائل نشانیاں تمہارے سامنے آ جائیں' زللتم اور تم اس کے مطابق نظام قائم بھی کر لو' اس قائم کرنے کے بعد اگر پھر تم اس مقام سے پھسل گئے تو یاد رکھو! **اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ** (2:209)۔ اللہ بڑی زبردست گرفت والا ہے لیکن عزیزانِ من! قرآن ہے۔ میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ آیتوں کے آخر میں جو خدا کی صفات آتی ہیں' وہ بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ یہاں یہ **عزیز حکیم** آیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہاں پھر وہ عاجز آ جاتا ہے کہ اچھا بھئی! جو تمہارا جی چاہے کرو' میں تو کہہ ہی سکتا تھا میرا بس کیا ہے' اس کے بعد۔ ہر وعظ یہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد عزیز ہے۔ صاحبِ غلبہ ہے' یہ نہیں ہو جاتا کہ اس کے بعد پھر وہ معطل ہو کر بیٹھ گیا لیکن اس کی گرفت کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔

خدا کی طرف سے گرفت کی نوعیت

برادرانِ عزیز! یہ بڑی لطیف چیز آ رہی ہے۔ ہم خدا کی گرفت کے متعلق اپنے طریقے کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے فلاں شخص ظلم پہ ظلم کیے جا رہا ہے' استبداد ہو رہا ہے۔ اگر خدا ہے تو وہ اس کی کلائی کیوں نہیں مروڑ دیتا۔ وہ جو مظلوم کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے' تو کیوں نہیں اس کا ہاتھ پتھر کا بن جاتا ہے۔ یہ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے عزیز ہونے کا یہ طریق ہو۔ خدا عزیز حکیم ہے یعنی عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے' جو مکافاتِ عمل ہے' وہ بھی اس کی حکمت کے ساتھ ہے' اس کے اندر بھی قانون کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ قوت کے ساتھ حکمت (Reason)[1] ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو' تم یہ چاہتے ہو کہ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ (2:210) صاحب! ہونا یہ چاہیے کہ جونہی کسی قوم نے یہ کچھ کیا' خدا سورج کی رتھوں پہ چڑھ کے بادلوں کے اندر بیٹھا ہوا آ جائے اور "آن کے ایناں دی گچی نپ دیوے[2]"۔ تم یوں چاہتے ہو۔ یہ ایک تصور ہے جو اس سے پیشتر اقوام میں پایا جاتا تھا۔ یہودیوں کے ہاں تو یہ الفاظ بھی ہیں اور Greek Mythology (یونانی دیومالا) میں تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہندوؤں کے ہاں بھی یہی تصورات ہیں۔ وہ رتھ کہ جس میں سورج کے پہیے لگے ہوئے ہوں' دیوتا اس کو چلا رہے ہوں' اس کے اندر جو انتقام لینے والا خدا ہے' بادلوں کے جلو میں خود آئے اور آ کر اپنے ہاتھوں سے ان کو تہ وتیغ کرے۔ تم یہ چاہتے ہو۔ یہ جو یہ چاہتے ہو کہ نہیں صاحب! آسمان سے فرشتے اتریں اور وہ اتر کر ان کا تہس نہس کر دیں۔ یہ تمہارا تصور ہے' مکافاتِ عمل کا نہیں ہے' تم تو کہتے ہو کہ وَقُضِيَ الْأَمْرُ (2:210) اور یوں معاملہ طے ہو جائے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔

---

[1] اگر حکمت کے ساتھ قوت نہ ہو تو وہ وعظ یا فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے:

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں　　قوتِ بے رائے جہل است و جنوں　　(اقبالؒ: پس چہ باید کرد)

[2] وہ آ کر ان کا گلا دبا دے۔

مکافاتِ عمل کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نتائج کی شکل وصورت

ہمارا طریقِ حکمت ہے کہا ہے کہ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (2:210)۔ اب یہاں سے نئی بات شروع ہوتی ہے اور آگے چلتی ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ طریق یہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو۔ طریق یہ ہے کہ جو کچھ بھی عمل ہوتا ہے' جو کچھ بھی کام ہوتا ہے' وہ اپنا نتیجہ پیدا کرنے

کے لیے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف چلا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر نتائج کیسے برآمد ہوتے ہیں؟ برادرانِ عزیز! یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس قومِ بنی اسرائیل کی فوراً تاریخی شہادت لے کر آ گیا۔ جس کی پوری داستان عربوں کے سامنے تھی۔ یہاں یہودی بھی موجود تھے یہ قوم ان کے سامنے تھی۔ جب انہوں نے اس نظام کو اپنے ہاں متشکل کیا تو انہوں نے فرعون اور ہامان اور قارون جیسی قوتیں توڑ کر رکھ دیں۔ ان کی مملکت کے ایک حصے کے اوپر قابض ہو کر وہاں اپنا نظام چلایا۔ انہیں شوکتِ سلیمانی ◆ اور مرتبۂ داؤدی ◆ نصیب ہوا۔ دنیا کی بلند ترین اقوام میں ان کا شمار ہو گیا اور جب اس قوم نے دین کو مذہب میں بدلا' دین کے اجزا ان کے ویسے ہی موجود رہے' مگر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مذہب میں بدلا تو قرآن کی شہادت اور تاریخ کی صداقت کی بنا پر دنیا کی ذلیل ترین قوم ہو گئی۔ یہاں پہنچنے کے بعد کہا کہ آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ ہمارا وہ جو عزیز کے ساتھ حکیم ہونا ہے' وہ قوموں کی تباہی کس انداز سے لایا کرتا ہے۔ خدا خود رتھ میں بیٹھ کر بادلوں کے جلو میں نہیں آیا کرتا۔ وہ اس انداز سے' قوموں کی تباہی' اس کے قانون کی رو سے ہوتی ہے۔ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ (2:211) قومِ بنی اسرائیل سے پوچھو۔ آسمان کی طرف کیا تک رہے ہو کہ خدا نہیں آ رہا' تمہارے سامنے ہے' یہ ذلیل ترین قوم' ان سے پوچھو۔

قرآن حکیم کے نزدیک موجودہ مسلمانوں کی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن اگر آج نازل ہوتا تو وہ دوسری اقوامِ عالم سے یہ کہتا کہ کس طرح سے قومیں ذلیل ہوتی ہیں' جاؤ اور مسلمانوں سے پوچھو۔ آج وہ یہ کہتا۔ اس وقت اس نے یہی کہا تھا کہ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ (2:211) قومِ بنی اسرائیل سے پوچھو۔ کتنے کتنے واضح قوانین ان کے سامنے آئے' واضح دلائل آئے چونکہ اس قومِ بنی اسرائیل کی داستان پہلے قرآن تفصیل سے بیان کر چکا ہے' ضروری نہیں کہ وہ اسے ہر جگہ دہرائے' وہ اشارہ کر رہا ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ کہا ہے کہ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ (2:211)۔ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ میں بات آ گئی کہ جب انہوں نے ان قوانین کا اتباع کیا تو زندگی کی ساری آسائشیں' آرائشیں' گنجائشیں ان کے حصے میں آ گئیں۔ یہ نعمائے خداوندی تھیں۔ ان کو اقوامِ عالم میں افضلیت ملی' ان کو حکومت ملی' مملکت ملی' سرفرازیاں ملیں' مرفع الحالیاں ملیں لیکن جو قوم پھر اس کو خود بدل دے' اس سے کفران اختیار کر لے تو فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (2:211) پھر پوچھو بنی اسرائیل سے کہ پھر اس کا پیچھا کرنا کیسا ہوا کرتا ہے! یہاں تو صرف بنی اسرائیل سے کہا ہے۔ اسی چیز کو دوسرے مقام پہ (14:48) میں ایک عام اصول کے اعتبار سے کہا۔ آیتیں تو پیچھے سے بھی بڑی عجیب و غریب آ رہی ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے میں یہ 28 ویں آیت ہی پڑھتا ہوں۔ آپ نے خود مطالعہ کرنا ہو تو 24 ویں آیت سے مسلسل دیکھیے گا' عجیب و غریب حکمتیں سامنے

آئیں گی۔ کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔ جَهَنَّمَ (29-14:28)۔ بڑی عظیم چیز ہے۔ کہا ہے کہ تم نے اس سالارِ کارواں کو بھی دیکھا جس نے ہماری دی ہوئی نعمتوں کو اس طرح سے کفران اور ناسپاس گزاری کے اندر بدل دیا' ان پہ پردہ پوشیاں کیں' ان کو چھپا چھپا کر رکھا۔ پھر اس کے بعد اس نے کیا کیا؟ عزیزانِ من! کیا الفاظ ہیں! اس نے اپنے اس قافلے کو جا کر اس منڈی میں اتار دیا' جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اس کارواں کو وہاں جا کر اتار دیا۔ جہاں پھ جسے کہتے ہیں کہ مندہ ہی مندہ تھا' کسی نے اس جنس کا سد کا بھاؤ تک نہیں پوچھا۔

اس ذات ورسوائی کی بنیادی وجہ دین کو مذہب میں بدل دینا ہے

کہا ہے کہ تم پوچھا کرتے ہو کہ جہنم کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ یہ ہوتا ہے جہنم۔ قوموں کے دوارِ بیع اور شرح میں جس جنسِ کا سد کی کوئی قیمت نہ رہے۔ کہتا ہے کہ یہ سالارِ کارواں قوموں کو وہاں جا اتارا کرتے ہیں۔ یاد رکھو! اسے کہتے ہیں جہنم یَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (14:29) اتار دے کر آپ چل دیئے۔ کتنی بری جگہ ان کو اتار کر چلا گیا! خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور خواری' اس قوم کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ کہ دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کا عزیز اور حکیم ہونا کیا معنی رکھتا ہے کہا ہے کہ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (2:211) ہم سے کیا پوچھتے ہو' اس قوم سے پوچھو۔ اور آج جیسا میں نے عرض کیا ہے' میں یہ کہوں گا کہ صورت ہگیں حالم نہ پرس' ہم سے پوچھو بھی نہیں' ہماری حالت کو دیکھ لو۔ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (2:211)۔ یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رو سے ہوا جس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ کیوں یہ چیزیں ایسے ہو جاتی ہیں؟ اتنے واضح قوانین، واضح دلائل، اتنی کھلی کھلی بصیرت افروز دلائل و براہین' پھر یہ کیا چیز ہو جاتی ہے کہ کفرانِ نعمت اس درجے تک پہنچ جاتا ہے؟ کہا کہ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (2:212) ہوتا پھر یہ ہے کہ زندگی کا جو مقصد منتہیٰ ہے وہ صرف جائز و ناجائز ہر طریقے سے اس دنیا کا متاع حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ کامیاب وہ گنا جاتا ہے جو کوئی طریقہ اختیار کرے لیکن کسی نہ کسی طرح سے دولت اکٹھی لے کر۔ یہ محلے کا چوہدری ہونا' یہ بڑا باعزت ہونا' یہ الیکشنوں میں کامیابی کا ہونا' یہ دربار سرکار میں اس کے ہاں کی عزت کا ہونا' یہ سب چیز زین بڑی مزین بن جاتی ہے پھر اس کے ہاں یہ۔ اچھا جی! ان کے ہاں تو یہ مزین بن گئی۔

جہنمی معاشرے میں اہلِ دردِ دل کی ہمیشہ تذلیل ہوتی ہے

اس وقت بھی اس کے اندر کچھ لوگ تو ایسے رہتے ہیں جو ان Values کی' ان اقدار کی' ابھی کچھ قدر و قیمت جانتے ہیں' جو دیانت دار بن کر رہنا چاہتے ہیں' جو ایماندار بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ یہ خود کچھ کرتے ہیں کہ وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:212) ان کا مذاق اڑاتے ہیں ''مت ماری گئی بھڑوے دی❶''۔ دیکھ لیں گے صاحب! کئی آئے تھے اس طرح کے دعوے کرنے والے ''بڑے دیانت دار بن کر رہیں گے'' ان کا دیکھو! حال کیا ہوا ہے۔ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ کیا کیفیتیں بیان کرتا جا رہا ہے! وہ اس لیے ہے کہ یہ تو اس خدا کا خلام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کا علم کسی حال کی قوم کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اس کے لیے تو مستقبل اور حال مین تمیز ہی نہیں ہے' وہ تو حقائق بیان کرتا ہے۔ جس کی نگاہوں کے اندر یہ متاعِ حای تہی مقصود و منتہیٰ بن کر رہ جائے اور مزین ہو کر رہ جائے' بات کیا ہے! وہ کیوں ان کا تمسخر اڑتا ہے؟ عزیزانِ من! اگر وہ اس وقت یہ چیز کرے کہ نہیں بھئی! صحیح تو تم ہی ہو' راست بازی کی زندگی تو تمہاری ہی ہے' کریکٹر اور دیانت اسی کو کہتے ہیں' تو اپنے متعلق ان میں ایک Inferiority Complex (احساس کمتری) پیدا ہو جائے گا' وہ اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرنے لگ جائے گا۔ وہ یہ نہیں چاہتا۔ وہ پھر اپنی روش کے صحیح ہونے کے لیے Justificatory Reasons (جواز کی وجوہات) دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے بھائی صاحب! سوال تو یہ ہے۔ یہ ہے دنیا' دنیا تو دنیا داری سے کمائی جائے گی' وہ جو بات ہے' وہ مذہب ہے' ٹھیک ہے نماز پڑھتا ہوں' روزے رکھتا ہوں' خیرات کرتا ہوں' اس میں سے زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک نکالتا ہوں' عرس پہ دیگیں بھی جا کر پکا دیتا ہوں۔ یہ سارا کچھ کرتا ہوں۔

مذہبی تصورات کے عمل کا سہارا انسان کو مزین دکھائی دیتا ہے نیز قرآنی آیات کا صحیح مفہوم

یہ ہیں Justificatory Reason (جواز کی وجوہات) زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ (2:212) یوں وہ چیز جو سرتاپا جذام ہے' برص ہے' مزین بن کر اس کو دکھائی دینے لگ جاتی ہے اور جب وہ مزین بنتی ہے تو یہ جو اس دور میں بھی کچھ صداقت کی' دیانت کی' زندگی بسر کرنے کا عہد کرتا ہے تو يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:212) ان کی ہنسی اڑاتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں۔ کہا ہے کہ ٹھیک ہے' آج ان کے نقطۂ نگاہ سے ان کی حالت ایسی ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑا لیں۔ عزیزانِ من! بڑی عجیب چیز آ گے آئی ہے کہا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (2:212)۔ اور یہی وہ عظیم چیز ہے جس کا جوذا سا غلط مفہوم ہے' اس نے ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور صحیح صداقت کو سامنے نہ آنے دیا۔ اس کا ترجمہ ہو گیا کہ ''کوئی بات نہیں' یہاں یہ ذلیل وخوار ہی سہی' ان کی ہنسی اڑاتے ہیں' اڑانے دیجیے' قیامت کے دن آپ دیکھیے گا کہ یہ اونچے ہوں گے اور یہ نیچے ہوں گے''۔ دیکھا آپ نے قیامت کی تعریف! وہی بات جو میں ابھی کہہ رہا تھا۔ یہ ہوا کیا ہمیں؟ لفظ تو یہ یہاں یہی ہے۔ ہوا یہ کہ ہم نے اس الْقِيٰمَةِ کو سمجھ رکھا ہے کہ یہ صرف مرنے کے بعد کی زندگی میں واقع ہونے والی چیز ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں جو واقعات ہیں برحق ہیں' ان پہ ہمارا ایمان ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ سمجھنا کہ یہ چیزیں صرف مرنے کے بعد واقع ہونے والی چیز ہے' یہ ہے بنیادی مغالطہ۔

---

❶ اس دیوث کی مت ماری گئی' اس کی عقل پہ پتھر پڑ گئے۔

تخریب کاری کی اصل بنیاد اور اس کو مٹانے کا صحیح طریق

یہ اَلْقِیٰمَةِ کیا ہے؟ کہا ہے کہ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (83:6) جس دور میں یہاں انسان خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے آج یہ ہو رہا ہے' اس لیے کہ نظام باطل ہے۔ باطل کے نظام میں یہ انفرادی طور پر جو یوں جینے والے ہیں' ان پہ واقعی سختیاں آئیں گئیں لیکن اس کے بعد اس آسمانی انقلاب کو یہاں آنے دو۔ وہ نظام جو قرآن قائم کرتا ہے' اس کے لیے جب انسانیت اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو اسے اَلْقِیٰمَةِ کہتا ہے۔ یہ ''قیام'' سے ہی تو ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ اس کا طریقہ بھی انفرادی نہیں۔ یہ فرد جو دیانت کی زندگی بسر کر کے غلط نظام میں پس رہا ہے' اگر چاہے گا کہ انفرادی طور پر اپنا دوسرا مقام بنالے' تو وہ یہ نہیں کر سکے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بھی ویسا ہو جائے۔ اگر یہ سب اسی طرح سے ہو جائیں تو اس نظام کے قیام کے لیے کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ تو یہی پسنے والے لوگ ہیں' جنہوں نے یہ کرنا ہے' ان کی غلطی یہ ہوتی ہے کہ یہ انفرادی طور پہ تنہا پستے رہتے ہیں ورنہ اگر یہ بھی کآفّة کی کیفیت اختیار کر لیں' کچھ صداقت پسند دیانت کے اوپر زندگی بسر کرنے والے' اس طرح سے اکٹھے ہو جائیں' آپ دیکھیے ان میں کتنی قوت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ وہ شر پسند' فساد انگیز' بددیانت تو سارے جتھہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں یہ دیانت اور صداقت والے' یہ امن پسند جتنے بھی ہیں' یہ انفرادی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ یہ پچھلے ہی دنوں جو یہاں شرانگیزیاں ہوتی تھیں' یہ شہر کے امن پسند لوگ ڈر کیوں رہے تھے؟ وہ تھے کتنے جو شرانگیز تھے؟ ذرا ان کی Percentage (فی صد) تو نکالیے' ایک شہر کی آبادی سے نکال دیجیے۔ صحیح رپورٹوں کی رو سے ان کی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہیں تھی' جو یہ سارا کچھ یہاں فساد انگیزیں آتش زنیاں تخریب پتھر مار کر یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا' اتنی تھی ان کی تعداد' باقی ان کے پیچھے تماش بین تھے لیکن وہ تھے متحد' وہ تھے ایک نظام کے تابع' وہ سب کچھ کر رہے۔ پیچھے اسکیمیں (Schemes) بن رہی ہیں' فنڈز Create (پیدا) ہو رہے ہیں' ایک نظام ہے جس کے تابع تخریب ہو رہی ہے۔ ہزار کانپ کیوں رہے تھے؟ اس لیے کہ یہ انفرادی زندگی بسر کر رہے تھے' ہر ایک ان میں سے تنہا تھا۔ میں اپنے گھر میں کہہ رہا تھا کہ صاحب! اگر وہ وہاں سے آ گئے۔ کتنے آ گئے؟ یعنی دس بیس تو میں کر کیا لوں گا؟ میرے ساتھ والا' پڑوس والا' اپنے ہاں کہہ رہا تھا کہ ہم کر کیا لیں گے؟

قوموں کی موت وحیات کا مدار ہمیشہ اجتماعی نظام سے ہی وابستہ ہوتا ہے

یہ ہوتا ہے انفرادی طور پر زندگی بسر کرنے کا نتیجہ۔ اسی لیے قرآن ان لوگوں کو جو دیانت میں رہنا چاہتے ہیں' کہتا ہے کہ یہ مذہب کی

بات نہیں ہے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) اٹھو! ان وک آواز دو۔ کوئی دور بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں یہ اس قسم کے بالکل کوئی نہ رہیں۔ اٹھو! یہ مینا دکیوں کہتا ہے پہل کرنے والے کو؟ ڈھنڈورا پیٹو' منادی کرو' آؤ صداقت والو! آؤ' دیانت والو! کہاں ہو؟ داعی اس کو کیوں کہتا ہے؟ اگر انفرادی طور پہ ہی یہ کچھ زندگی بسر کرنی تھی تو یہ کس چیز کی منادی کر رہا ہے' یہ کا ہے کی دعوت دے رہا ہے؟ کہتا ہے کہ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) صادقین کی جماعت کے ساتھ رہو۔ وَ ارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ (2:43) تم بھی ان کے ساتھی بن جاؤ جو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! غنڈے اور بدمعاش دس اکٹھے کیے ہوئے' یہ کچھ کر چھوڑتے ہیں تو جو دیانت دار' حق پرست ہیں' وہ اکٹھے ہوئے ہوئے ہیں تو وہ کیا کچھ نہیں کر لیں گے۔ بتایا تھا کہ اکٹھے ہو کر انہوں نے بدر کے میدان میں کیا کچھ کر لیا تھا! ان کی کیا تعداد تھی؟ اور بدر کے میدان میں تو ابھی ابتدا تھی' قیصر و کسریٰ کی ہزاروں سال سے متمکن چلی آئی ہوئی سلطنتیں اور تہذیبیں کس قدر بلند و بالا تھیں! انہوں نے انہیں ٹاٹ الٹ کے رکھ دیا۔ کس طرح سے الٹ کے رکھ دیا؟ اس لیے کہ انہوں نے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ (9:119) کیا۔ جونہی یہ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ والے الگ الگ ہوئے' مذہب آیا' ان کے ہاں حالت یہ ہوگئی۔

اجتماعی زندگی کے لیے اکٹھے ہونے کا دوسرا نام ہی تو محشر ہے

آج بھی یہ بات نہیں ہے کہ ان میں یہ لوگ نہیں ہیں' وہ ہیں انہوں نے كَآفَّةً کی جو بات تھی' وہ بھلا دی ہے۔ جب كَآفَّةً کی طرح یہ اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر کھڑے ہو جاتے ہیں' پھر اسے الۡقِيٰمَةِ کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ اس وقت اس لیے ہو رہا ہے کہ انفرادی زندگی بسر ہو رہی ہے' ان کو ذرا اجتماعی حیثیت سے اکٹھا ہونے دیجیے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کو حشر کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ محشر کے معنی ہی اکٹھا ہونے کے ہیں۔ انہیں اکٹھا ہونے دیجیے قرآن کہتا ہے کہ يَوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (83:6) ربوبیتِ عالمینی کے لیے جس دن یہ اکٹھے ہو کر کھڑے ہوئے تو وَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (2:212) جب آسمانی انقلاب نمودار ہو جاتا ہے تو اس وقت ساری دنیا دیکھ لیتی ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کی نگہداشت کرتے تھے وہ ان لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں' جو محض دنیاوی مفاد کو مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔ پھر دیکھیں گے کہ وَ اللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ (2:212) یہ آج جو اس طرح سے ایک وقت کی روٹی کے لیے فاقے مر رہے ہیں پھر یہ دیکھیں گے کہ کس طرح رزق کی فراوانیاں بغیر حسات ملتی ہیں۔ یہ بغیر حساب کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ذہن میں نہیں آئے گا کہ یہ کہاں سے کتنا کچھ آ گیا۔ جب حضرت ابو ہریرۃؓ خراسان کا وہ مالیہ وہاں سے اکٹھا کر کے لائے ہیں اور انہوں نے آن کر یہ بتایا' تو انہوں نے پوچھا تھا کہ یہ کتنا ہے؟ انہوںؓ نے کہا تھا کہ جی! بیس لاکھ۔ کہا تھا کہ ابو ہریرۃؓ پتہ بھی ہے کہ لاکھ کتنا ہوتا ہے؟ یعنی ان کی تو گنتی کا یہ حساب تھا' صاحب کہ ہزار سے آگے ان عرب کے ہاں ہندسہ ہی نہیں تھا ''یعنی گھوڑا ای مک جاند اسی اگے ❶''۔ یعنی اگر

ان کو آ کر کہنا پڑتا تو الف سنستہ کہنا ہوتا۔

---

❶ آگے ہندسہ ہی ختم ہو جاتا تھا۔

صحیح نظام کو اگر صحیح خطوط پر استوار کر دیا جائے تو اس کا پھر اجر بے حساب ہوتا ہے

پتہ ہے کہ آپ کو بغیر حساب کیا کہا؟ یہ نہیں کہ ''خدا بغیر حساب کتاب کتے ای انے واہ دئی جاندا گیا سی۔ اے سمجھ لیا بغیر حساب دے معنی ہوندے ہیگے۔ اے جس طراں نال اے ملیا ہو یا ہیگا اینوں سمجھنے آں اسی کہ جی اللہ تعالیٰ دیکھو نا بغیر حساب دیندا اے۔ کل اجے ایناں نے اک پہیہ جیالا یا سی ان کنیاں ملزا کٹھیاں ہویاں ہویاں نیں❶۔''وَ اللّٰـهُ يَـرْزُقُ مَـنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (2:212) جو قوم قانونِ خداوندی کے مطابق رزق حاصل کرنا چاہتی ہے' اسے کس طرح بلا حد و حساب رزق کی فراوانیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتا کہ اتنا بھی مل سکتا ہے۔ یہ ان کی رو سے بغیر حساب ہوتا ہے' خدا کی رو سے نہیں ہوتا۔ پھر وہ یوں دیتا ہے۔ اس سے پوچھا تھا کہ ابو ہریرہؓ پتہ ہے' لاکھ ہوتا کتنا ہے؟ واقعی ان کو لاکھ تو گنتا نہیں آتا تھا' ان کے ہاں تو زبان میں اس کے لیے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' اس کے لیے ہندسہ ہی نہیں تھا لیکن یہ ملا ہے۔ کیوں ملا؟ اس لیے کہ یہ جو صداقت والے تھے' وہ اکٹھے ہوئے تھے' پھر یہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ تو پھر یہ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (2:212) ہوا تھا۔ کہا کہ یہ جو بات تھی آج انتشار کی زندگی میں تمہیں یہ بات کچھ بعید سی نظر آئے گی۔ سنو! بات یہ نہیں ہے کہا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)

---

❶

انسانی زندگی کی ابتدائی دور کی کیفیت تو اُمت واحدہ کی شکل لیے ہوئی تھی

انسانی زندگی کی جب ابتدا ہوئی تھی تو اس وقت بھی یہ کیفیت تھی کہ آبادی ایک امت تھی' اس میں تفرقہ نہیں تھا اور كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) کے معنی ہیں کہ انسانیت نے پھر ایک امتِ واحدہ ہو کر رہنا ہے۔ یہ درمیان میں کیا ہوا؟ قرآن کے الفاظ کو سامنے رکھیے۔ کہا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰـهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (2:213)۔ یہاں اتنا ہی پڑھ لیا جائے تو عجیب چیز ذہن میں آتی ہے کہ انسانیت ساری امتِ واحدہ تھی' کوئی تفرقہ نہیں تھا' کوئی اختلاف نہیں تھا' سب ایک تھے فَبَعَثَ اللّٰـهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) تو اللہ نے ان کے اندر نبی بھیج دیئے یعنی آپ دیکھتے ہیں کہ یوں اتنا سا پڑھ لینے سے کیا بات ذہن میں آتی ہے کہ اچھے بھلے امتِ واحدہ تھے' کوئی اختلاف نہیں تھا' کوئی تفرقہ نہیں تھا تو نبی بھیج دیا یعنی آگے بات آ گئی ذہن میں کہ ''ایناں نے آگے اے

کچھ بنا دتا❶ ۔''اور پھر مذہب والے کہتے ہیں کہ صاحب! وہ دور ٹھیک تھا کہ جس کے اندر نہ کوئی عیسائی تھا' نہ یہودی تھا' نہ کوئی مجوسی تھا' نہ کوئی مسلمان تھا۔ امتِ واحدہ تھے۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) پھر وہ نبی آنے شروع ہو گئے تو چلیے صاحب! کوئی یہودی بن گیا' کوئی یہ بنا۔ یعنی یہ ہے جو اتنے سے یوں مترشح ہوتا ہے۔

---

❶ انہوں نے پھر یہ کچھ بنا دیا۔

قرآنی حقائق کو سمجھنے کا طریق خود قرآن حکیم کے آئینہ میں

میں نے کہا کہ قرآن تصریف آیات سے اپنے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ اس بات کو یاد رکھیے۔ ایک بات جو ایک مقام پہ کہتا ہے' وہ ساری تفصیل ہر جگہ نہیں دہراتا۔ وہی بات اس نے دوسری جگہ کہی ہوئی ہوتی ہے' وہاں کا ٹکڑا اور یہ ٹکڑا دونوں اکٹھے کیجیے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ ہمیشہ قرآن کو اس طرح سمجھیے۔ ہمارے ہاں تو یہ طریقہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو الحمد سے والناس تک' بس اس طرح سے پڑھاتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس لیے کہ قرآن سمجھنے کی چیز تو ہے نہیں' یہ تو ثواب حاصل کرنے کی بات ہے تو ثواب تو حاصل ہو جاتا ہے' ایک حرف بھی اس کا کہہ دیجیے مثلاً الم (ال م) کہیے' یہ کہتے ہیں تیس نیکیوں کا ثواب ہے کیونکہ یہ تین حرف ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن سمجھنے طریقہ یہ تصریفِ آیات ہے۔ یہاں اتنا پڑھیے کہ (10:19) نکالیے۔ اس وقت یہاں ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ وہاں (10:19) یہ دیکھیے' الفاظ ہیں کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (10:19) دیکھا ایک بات۔ وہی الفاظ آ گئے۔ آگے کیا ہے؟ فاختلفوا (10:19) یہ ایک امتِ واحدہ تھے کوئی اختلاف نہیں تھا' کوئی تفرقہ نہیں تھا' فاختلفوا (10:19) پھر انہوں نے باہمی اختلاف پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ اختلافات پیدا کیے تو یہ تنہا عقل کے بس کی بات نہیں تھی کہ اختلافات کو یہ رفع کر سکے کیونکہ یہ اختلاف تو پیدا ہی عقلِ انسانی کی فریب کاریوں نے کیے تھے۔

تنہا عقل انسانی کی مفاد پرستیوں کا نتیجہ ہمیشہ زبوں حالی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے

ہر فرد کی عقل اسے اپنے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے۔ مالک مکان کو یہ سکھاتی ہے کہ دروازے اس طرح سے بند رکھو' چٹخنیاں یوں لگاؤ' اندر مال کو فلاں جگہ رکھو' قفل لگاؤ اور چور کو اس کی عقل یہ سکھاتی ہے کہ دروازہ ایسے توڑو' چابیوں کا گچھا یوں بنواؤ' رات کو یوں اترو' اس طرح سے جاؤ۔ عقل دونوں کو سکھا رہی ہوتی ہے۔ عقل ساتھ نہ دے تو نہ یہ مال کو سنبھال سکتا ہے' نہ کوئی چور آ سکتا ہے۔ ''او بے عقل چور تے ایویں ای پھڑیا جاندا ہیگا اے❶ ۔'' یہ اختلافات تنہا عقل کی مفاد پرستیوں نے پیدا کیے تھے۔ ہر عقل اس فرد کے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے' جس کی وہ عقل ہوتی ہے اور دنیا میں Battle of Wits (جنگِ عقول) ہوتی ہے' جس کی عقل زیادہ چالاک ہوتی ہے' وہ لے جاتا ہے۔

اختلاف تو انہوں نے یوں پیدا کیا تھا۔ پھر یہ کیسے مٹتا؟ تنہا عقلِ انسانی کی رو سے نہیں' وحی کی راہنمائی سے یہ مٹتے تھے۔ اب قرآن کی آیت یوں پڑھیے کہ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخۡتَلَفُوۡا (10:19) ایک امت تھے' کوئی اختلاف نہیں تھا' انہوں نے باہمی اختلاف کرنے شروع کیے۔ اختلاف عقلِ فریب کار کے پیدا کردہ تھے۔ تنہا عقلِ فریب کار کی رو سے یہ رفع نہیں ہو سکتے تھے کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَ مُنۡذِرِيۡنَ (2:213)۔ بات صاف ہوگئی کہ اس مقصد کے لیے خدا نے انبیا کو بھیجا۔ وہ کرتے کیا تھے؟ وہ کہتے تھے کہ اگر اسی نہج کی زندگی تم نے بسر کی مُنۡذِرِيۡنَ (2:213) تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ اگر ان مستقل اقدار کے تابع' یہی نظام کی زندگی' تم نے بسر کی' اس کا نتیجہ وہ ان کو بشارتیں دیتے تھے' سرفرازیاں' خوشگواریاں' خوش حالیاں' امن' سکون' سلامتی یہ کچھ ہوگا۔

---

❶ وہ بے عقل چور تو یونہی گرفت میں آ جاتا ہے۔

نبی کی ذات انسانی عقل کو وحی کے چراغ سے متعارف کراتی ہے

مُبَشِّرِيۡنَ وَ مُنۡذِرِيۡنَ (2:213) کہا کہ کیا وہ یونہی آ جاتے تھے اور وہ زبانی وعظ کہہ کر چلے جاتے تھے؟ انہیں بتایا کہ وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ (2:213) انہیں ضابطہ قوانین دیا جاتا تھا' جو حقیقت پر مبنی ہوتا تھا' حق پر مبنی ہوتا تھا۔ اب یہاں دیکھیے ضابطہٴ قانون تو ہر مملکت کے پاس ہوتا ہے' ڈاکوؤں کے ہاں بھی ایک ضابطہٴ قانون ہوتا ہے۔ اور جسے آپ Governement Established by Law کہتے ہیں یعنی انسانوں کا بنایا ہوا قانون' انہوں نے جو بھی ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے' اس سے پہلے اس کے لیے قانون بنا لیتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ کتاب بالحق نازل ہوئی۔ عزیزانِ من! یہ ہے فرق۔ یہ حق پہ مبنی کتاب ہوتی ہے۔ پھر کاہے کے لیے یہ کتاب آتی ہے کہا کہ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ (2:213)۔ دیکھیے! فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ (2:213) یہاں آ گیا اور یہ آیا تھا' وہ (10:19) میں۔ دونوں کو ملانے سے بات صاف ہوگئی کہ جن معاملات میں وہ اختلاف کرتے تھے' ان میں یہ فیلہ دیتا تھا۔ اب یہ بات ہے کہ وہ اس میں وعظ نہیں کہتا تھا' یہ فیصلہ کرتا تھا۔ نبی کی پوزیشن یہ تھی کہ ایک نظام قائم کرتا تھا اور نظام حکومت قائم کرتا تھا' وہ اختلافی معاملات میں فیصلہ دیتا تھا۔ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ (2:213) اس کی پوزیشن یہ ہوتی تھی۔ بات تو صاف جا رہی ہے۔ اس کے اندر ایک بڑی نقطے کی بات آئی ہے' اسے سمجھ لینا ضروری ہے۔ نبی اکرم ﷺ خاتم النبین آخری نبی خدا کے آخری رسول ہیں۔ یہ آخری کے معنی کیا ہیں؟ اگر قرآن کی حیثیت سمجھ لی جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کے متعلق خود خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا (6:116) خدا نے جو کچھ بھی کلام' جو کچھ بھی نظریات' جو کچھ قوانین' جو تعلیم دینی تھی' تمت وہ مکمل ہوگئی'

صاحب! اور اب لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللهِ (6:116) اس کے بعد اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مکمل، غیر متبدل ہے۔ اگلی چیز یہی تھی کہ یہ محفوظ رہنی چاہیے۔ کہا کہ ہم نے اس کو نازل کیا ہے، وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ اب یہ مکمل، غیر متبدل، محفوظ ضابطۂ قانون ہے۔

ہمارے ہاں نبی اور رسول میں پایا جانے والا فرق اور قرآن حکیم کا فیصلہ

اس کے بعد صاحب! کسی نبی اور رسول کی ضرورت کیا رہی؟ ختم نبوت ﷺ کی یہ دلیل ہے۔ وہ جھگڑے نہیں کہ وہ خاتم زبر سے ہے یا زیر سے ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا تو اس کے بعد تو پھر گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ نہیں صاحب! نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے۔ نبی وہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا تو ہے لیکن کتاب نہیں لاتا۔ رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب لاتا ہے لہٰذا کتاب تو وہی رہی جو پیچھے سے آ رہی ہے اور نبی آ گیا بغیر کتاب کے۔ اسے آپ چھوڑ دیجیے، اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیجیے کہ وہ آ گیا اور لایا کچھ نہیں ''تے آ کا ہدے لئی گیا؟ ❶'' وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ چٹھی رسان آئے آپ کے ہاں اور وہ چٹھی نہ لائے۔ ''او عید والے دن آوندا اوندا اے نا ایس طراں۔ بس اک دن ہوندا اے او عیدی لین اوندا اے جیس دن، اوس دن نئیں چٹھی ہوندی ❷۔'' کبھی دیکھا ہے آپ نے کہ وہ پوسٹ مین آیا ہو اور اس کے پاس چٹھی نہ ہو۔ بہر حال میں بات بڑی اہم کہہ رہا تھا کہ یہ کہا گیا۔ اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن نگاہوں سے اتنا اوجھل ہوا۔ عزیزانِ من! اس چیز کے اوپر دیکھ کے مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کہنے والے نے تو یہ کہا۔ مجھے ضرورت نہیں ہے یہ کہنے کی کہ کہنے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ نادانستہ ہی تھا یا دانستہ تھا؟ چھوڑ دیجیے۔ میں پوچھتا ہوں اس قوم سے جن کے ہاتھ میں یہ قرآن ہے کہ اس بات کے ماننے والے بھی ہزاروں جمع ہو گئے اور پچاس ساٹھ برس سے خاتم کی زبر اور زیر پہ ہی بحث اور مناظرے ہوتے رہے۔ زیادہ نہیں تو قرآن کی یہ آیت ہی اگر سامنے ہوتی وہیں، یہ دلیل ختم ہو جاتی۔ عزیزانِ من! فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) اللہ نے انبیا کو بھیجا وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213) یہاں مَعَهُمُ ہے، النبیین ہے۔ یہ فرق کہ صاحب! رسول کو کتاب ملتی ہے، نبی کو کتاب نہیں ملتی۔ یہ آ گئے، نبی یہاں ہے نبیین کے متعلق اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213)، وہاں ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ (57:25)۔ یہاں رسول آ گئے۔ ہم نے اپنے رسول بھیجے واضح دلائل کے ساتھ۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (57:25) جو الفاظ رسولوں کے لیے، وہی الفاظ نبیوں کے لیے آتے ہیں۔ اب دونوں میں اس بنا پر فرق پیدا کرنا، اب سوچیے عزیزانِ من! قرآن کی کھلی ہوئی آیات کے خلاف ہے۔ کہاں سے یہ عقیدہ نکل آئے گا؟ عزیزانِ من! یہ جو دو الفاظ (نبی اور رسول) ہیں، یہ اس ایک ہی ذات کے دو مشن ہیں، دو منصب ہیں، جن کے متعلق کہا گیا ہے۔ نبوت ہوتی ہے، خدا سے اس وحی کو حاصل کرنا، وہاں سے پانا اور جب وہ اس کو لے کر آگے دوسروں تک پہنچاتا

ہیا وراس کے مطابق نظام قائم کرتا ہے تو وہ رسالت کہلاتی ہے۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ہی فرد وہاں یہ چیز لیتا ہے اور ''اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا''۔ یہ جو آنا ہوتا ہے' پھر اس کا سوئے قوم' یہ رسالت کہلاتا ہے۔ وہ ایک ہی فرد ہوتا ہے' مشن ایک ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد ختم نبوت ﷺ اس لیے یہ بات کہی کہ خدا سے وحی کا پانا حضور ﷺ کے بعد اب ختم ہو گیا کیونکہ کتاب اب مکمل ہمارے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ یہ محفوظ اور غیر متبدل ہے۔ کسی اور پانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ کیا بلاضرورت ہی خدا دیئے چلا جاتا ہے؟ نہیں۔ یہ ہے بات کہ نبوت ختم ہوئی۔ جو رسالت ہے' وہ اس قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اس کے مطابق نظام قائم کرنا' نبی اکرم ﷺ کے بعد یہ جو فریضہ ہے یہ اس کی امت کی طرف منتقل ہو کر آ گیا۔ حضور ﷺ کا اتباع' سنت یہ ہے کہ اس کے مطابق دنیا میں رسالت کا نظام قائم کیا جائے۔ نبوت ختم ہو گئی۔ قرآن جب تک باقی ہے' قرآن نے قیامت تک باقی رہنا ہے' یہ نوعِ انسانی کے لیے ہے' محفوظ ہے اور غیر متبدل ہے' مکمل ہے۔ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ (2:213) اور لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ (2:213) یہ منصب ہے رسالت کا کہ وہ اس کے مطابق لوگوں میں فیصلے کرے۔ یہ نبوت کا آپ نے دیکھا منصب کیا ہے؟ ''تے اگر نبی اپنے مقدمے آں دے فیصلے گرد اس پوروں جا کے کراندا ہووے؟[3] '' لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ (2:213)۔

---

❶ وہ آیا کس کام کے لیے؟

❷ اس طرح وہ عید کے دن آتا ہے۔ بس ایک دن وہ عیدی لینے آتا ہے۔ اس دن اس ک پاس دینے کے لیے خط نہیں ہوتا۔

انبیائے اکرام کا مقام بلند اور ان کا فریضۂ حیات

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ محکوم اور غلام قوموں کے ذہنوں میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کتنا بڑا انقلابی پروگرام تھا اور کتنے عظیم انقلاب لانے والی یہ ہستیاں تھیں' جن کو نبی اور رسول کہا جاتا تھا۔ وہ وعظ کہنے کے لیے اور ہاتھ جوڑنے کے لیے نہیں آتا تھا' وہ باطل کے نظام کو الٹ کر اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرتا تھا۔ ہر اختلافی معاملے کے اندر لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ (2:213) انہیں حکم دیتا۔ یہ پوزیشن ہوتی ہے۔ اب آگے پھر وہی بات آ گئی۔ نبی آ گیا' خدا سے کتاب پائی' اس کی رسالت نے نظام قائم کیا' اختلافی معاملات میں اس نے فیصلے دیئے' ایک ایسا نظام قائم کیا' جس کے اندر کوئی تفرقہ نہیں تھا' کوئی اختلاف نہیں تھا' کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے قرآن میں فرقے کو شرک قرار دیا تھا۔ (30:31)۔

فرقے بنانے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد اور اس کی وجۂ جواز

قرآن کی رو سے فرقہ بنانے والوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ مشرکین ہیں۔ سوال ہی نہیں کہ اس کی اپنی جماعت کے اندر اختلاف و

تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کہا کہ پھر یہ تفرقے کیا؟ کہا کہ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (2:213) یہ اس تعلیم کا نقص نہیں تھا کہ اس کے بعد پھر اس میں فرقے پیدا ہو گئے۔ کسی سے پوچھیے کہ یہ کیا؟ صاحب جی! قرآن شریف تو ٹھیک ہے، اللہ کی کتاب ہے، بالکل واضح ہے۔ انٹرپٹیشنز اس کی ایسی ہو سکتی ہیں کہ جس میں یہ مختلف فرقے پیدا ہو جائیں یعنی کتاب ملاحظہ فرماؤ کہ یہ اس قسم کی کتاب ہے کہ میں اس میں سے کھینچوں تو اہلِ حدیث ہو جاؤں، وہ اس میں سے کھینچیں تو دیوبند بن جائیں، اسی کتاب سے۔ عزیزانِ من! چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ یونہی ایک ادنا سا مصنف ہوں، میں کہتا ہوں اگر میری کسی کتاب کے اندر یہ چیز ہو کہ جو کچھ میں لکھوں، اس کی اس قسم کی تعبیریں ایک دوسرے سے متضاد نکل سکتی ہوں کہ وہ معنی لے لے، وہ بھی کتاب وہ معنی دیدے، دوسرا وہ معنی لے کتاب، وہ بھی معنی دیدے تو میں اٹھا کر پھینک دوں صاحب! اس کتاب کو۔ کوئی شخص اس کو قبول ہی نہ کرے۔ کتاب کا سب سے بنیادی نقص یہ ہے اور قرآن جیسی کتاب جس کو وہ کہتا ہے اس کے اندر قول سدید ہے۔ اس کے اندر حق ہے، اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کی تعبیروں کے اعتبار سے اس کے ماننے والوں کے نزدیک بہتر فرقے بن جائیں؟

فرقہ بندی کی بنا پر بغداد کی گلیوں میں بہنے والا خون اور باہمی جنگ وجدل آج بھی گواہ ہے

قرآن سے پوچھیے وہ کیا کہتا ہے؟ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (2:213) ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑنے کی جو اندرونی شیطنت کی خواہش تھی، اس نے فرقے پیدا کر دیئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے؟ ہر فرقے پرست کی ذہنیت دیکھیے، دوسروں کا ذکر کر کے اس سے دیکھیے، ذکر آیا نہیں اور آستینیں چڑھی نہیں، منہ میں جھاگ، آنکھیں خشمگیں، ماتھا وہ جفر کے سے نقشے بن رہے ہیں۔ شکر ہے کہ گنجے کو ناخن نہیں ملے یعنی یہیں تک بس ہے اور جس زمانے میں قوت طاقت ہوا کرتی تھیں پھر پوچھو بغداد کی گلیوں سے کہ اتنے سے اختلاف کے اوپر کہ قرآن قدیم ہے یا حادث، کتنی صدیوں تک وہاں کس قدر روز گلیوں کی نالیوں میں خون انسانی بہا کرتا تھا۔ ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑنے کا جذبہ کر "میں وڈا ہیگاں"، ہم بڑے، ہمارے اسلاف بڑے، تمہارے اسلاف نہیں۔ "یعنی اپناں دے او کچھ نئیں لگدے ہیگے، جیہڑے او ہناں دے لگدے نیں۔ اپنے اپنے پہلوان اکھاڑے اچ کھڑے کیتے ہوئے ہیگے نیں ❶۔" کہا ہے کہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (2:213) یہ نہیں تھا کہ یہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اس تعلیم میں یہ نقص تھا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے مطلب کے مطابق ان کو Interpetition دیئے جا رہی تھی کہا کہ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (2:213) وہی جو بالحق چیز آئی ہوئی تھی جو اس سے صحیح راہنمائی لینا چاہے خدا اس کو اس کے ذریعے سے صحیح راہنمائی دیتا ہے۔

ہم نے اپنی اپنی انا کی خاطر قرآن حکیم کو...... بنا رکھا ہے

وَ اللّٰہُ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (2:213)۔اب یہاں پھر وہ آپ کو یاد ہے' جہاں من یشآء آتا ہے' تو پھر کیا معنی دیئے جاتے ہیں کہ جی ہاں! اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے یعنی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اسے کہتا ہے کہ آؤ تمہیں جہنم میں پھینکوں۔ مـن یشـآء یہ ہے کہ جو اس سے ہدایت لینا چاہتا ہے وہ اس کو اس قرآن کے ذریعے سے ہدایت دیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ بَغۡیًـا بَیۡـنَھُمۡ والی بات نہ ہو۔ مناظروں میں' مباحثوں میں' دوسروں کے اوپر غ ر بہ حاصل کرنا' دوسروں پہ چڑھ دوڑنا' اسے شکست دے دینا' آپ فاتح کی حیثیت سے آجانا۔ برادرانِ عزیز! میں اب تک نہیں بھولتا' بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مندمل ہی نہیں ہوتے۔ دلی میں ایک جلوس نکل رہا تھا۔ غازیٔ اعظم زندہ باد' محی ملت زندہ باد۔ یا اللہ! یہ دین کو زندہ کرنے والا' زندہ باد' اتنا بڑا غازی اعظم زندہ کون ہے' صاحب؟ کس کا جلوس نکل رہا ہے؟ کیا کارنامہ سرانجام دیا؟ بتایا گیا کہ فلاں مولانا صاحب ہی جی کہ جی! یہ ان کا جلوس ہے۔ جی کیا انہوں نے بہت بڑا جہاد کیا جس سے یہ غازی ہے؟ اسلام کا احیا انہوں نے کیا؟ کون سا معرکہ مارا؟ کہ جی کلکتے میں حنفیوں کے ساتھ مناظرہ ہوا تھا اور اس میں انہوں نے غیرتِ دینی کے اعتبار سے ان کے بزرگوں کی شان میں گستاخی کے کلمات کہے۔ نظام ہے انگریزوں کا باطل' انہوں نے ان کو تین مہینے کے لیے قید کر دیا۔ اب یہ قید سے رہا ہو کر آئے ہیں اور ان کا جلوس نکل رہا ہے۔ کیا بات ہے جناب یہ ہے بَغۡیًـا بَیۡـنَھُمۡ (2:213) اس اسلام کے ماننے والے اس قرآن کے داعی جس نے کہا تھا کہ ان کے بتوں کو بھی گالی نہ دینا' وہ ان اسلاف کو گالی دیتے ہیں کہ بہر حال اگر باپ نہیں ہے' چچا تو ضرور ہے لیکن نہیں صاحب! یہاں تو میں بڑا' میرا فرقہ بڑا' میرے فرقے کے اسلاف ان کے فرقوں کے اسلاف سے بڑے۔ یہ ہے بَغۡیًا بَیۡنَھُمۡ (2:213) وہ اللہ کہتا ہے کہ وَ اللّٰـہُ یَھۡدِیۡ مَـنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (2:213) سیدھے راستے کے اوپر چلنا کہ جس میں کوئی اختلاف' نہ کوئی افتراق' نہ کوئی فرقہ ہو مشکل نہیں ہے۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ مَـنۡ یَّشَآءُ جو بھی آئے لینے کے لیے قرآن موجود ہے' اس سے ملتا ہے۔ عزیزانِ من! آج بھی میں یہ عرض کروں گا۔ صرف ایک چیز کے اوپر یہ مسلمان آجائے کہ دین کے معاملے میں سند اور حجت خدا کی کتاب ہے' کوئی اختلاف و فرقہ باقی نہیں رہتا۔ جو اس کو کہے کہ کھلی اور تھدی ہے۔

---

❶ یعنی ان کے کچھ نہیں لگتے جوان کے لگتے ہیں۔ اپنے اپنے پہلوان اکھاڑے پہ کھڑے کیے ہوئے ہیں۔

انسان کا زعم باطل زندگی بھر اسے صراطِ مستقیم پر نہیں آنے دیتا

میں پھر عرض کروں گا کہ پورے انکسار کے ساتھ اس سے کہو کہ میرے پاس آئے' کوئی اختلافی مسئلہ لائے' دین کا ہو' ان کے ہاں

کی فقہ کا نہ ہو۔ دین کا مسئلہ اور اس میں وہ اختلاف ہو اور وہ آئے' میں بتاؤں کہ قرآن اس مسئلے کو کس طرح حل کرتا ہے۔ خدا کی کتاب نہ ہوئی مذاق ہو گیا؟ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (2:213) لیکن یہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کس طرح سے ملتی ہے؟ یہاں تک تو ہم بہت خوش تھے کہ خیر کوئی بات نہیں مَنۡ یَّشَآءُ اس نے کہہ دیا ہے: جو چاہتا ہے اس کو مل جاتی ہے۔ یہ جو چاہنے والے ہیں' ان کے لیے شرطِ اول قدم آں نست کہ مجنوں باشی۔ اب ذرا شرط سن لیجیے۔ بس یہ شرط وہ ہوگی جس کے بعد ہم بھی دعائے خیر کریں گے' گھر کو چلے جائیں گے۔ سنیے شرط۔ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ (2:214) کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہوئے ہو کہ صاحب! معاملہ طے ہو گیا' مسئلہ حل ہو گیا لیجیے صاحب! جنت میں داخل کا سارا سوال تھا ٹھیک ہے' قرآن دیکھا' ہم نے اختلافی بات میں اپنے مطلب کے مطابق وہاں سے ہدایت لے لی' صراطِ مستقیم مل گیا۔ صراطِ مستقیم یہاں سے چلے آنکھیں بند کر کے سیدھے جنت کے اندر۔

جنت کا حصول تو خونِ جگر کی قربانی کا طلب گار ہے

کہا کہ کیا تم یہ خیال کیے بیٹھے ہو؟ کیا اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا ہوا ہے؟ اس زعمِ باطل کے اندر تم بیٹھے ہوئے ہو کہ بس سیدھے جنت کے اندر پہنچ گئے؟ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ (2:214) در آں حالیکہ تم ابھی ان وادیوں میں سے گزرے نہیں ہو' جن میں سے وہ پہلی قومیں گزری تھیں' کہ جو جنت میں پہنچی تھیں۔ کونسی وادیاں تھیں؟ آؤ بتائیں۔ وہ ہیں کہ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا (2:214) مخالفتوں کے ہجوم نے' دوسری طرف سے جو محاذ بنا کر دشمن اٹھے ہوئے تھے' ان کے اژدھام نے اس قدر راستے میں مشکلات اور مصائب کے پہاڑ کھڑے کیے۔ زُلۡزِلُوۡا (2:214) زلزلہ آ گیا ان کے پاؤں کے نیچے۔ یہ کیفیت ان کی ہو گئی۔ کہا کہ حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ (2:214) کیفیت یہ ہو گئی کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کہ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ (2:214) یا اللہ! وہ تیری جو مدد آنی تھی' وہ مدد کب آئے گی۔ وہاں تو یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں کی کہ زلزلہ آ رہا ہے۔ ان حالات کے اندر وہ گھر گئے۔ جب یہاں تک بات پہنچی تو کہا اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ (2:214) ہاں! ہمارا جھوٹا وعدہ نہیں ہوا کرتا' نصرت اس کی آ گئی۔ یہ بھی نہیں کہا کہ آ ہی گئی' قریب' ذرا ابھی اور چلنا ہے' اسی حالت میں۔ برادرانِ عزیز! یہ کس حالت میں تھے؟ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا (2:214):

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرزہ طاری ہو جاتا ہے کیوں کہ

جانم مشکلاتِ لا الہ را

لا الہ کی مشکلات کو میں جانتا ہوں۔

عزیزانِ من! دنیا کی ہر قوت کے ساتھ ٹکراؤ۔ کیفیت دیکھیے۔ آج بڑی سے بڑی قوتیں آپ کے ہاں کی امریکہ اور روس ہیں۔ ان کی بھی یہ صورت ہے کہ وہ بھی اپنے Allies (اتحادی) ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ آئیڈیالوجی کے اختلافات کے باوجود ان کے ساتھ متحدہ محاذ بناتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ آج دنیا میں کوئی قوت تنہا زندہ نہیں رہ سکتی لیکن اس نظام وک قائم کرنے والی قوت کی کیفیت یہ ہے کسی کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتی یعنی جس میں آئیڈیالوجی کا اختلاف۔ لا الہ کے معنی یہ ہیں ہر الہ کی نفی کرنے والا۔ اتنا بڑا انقلاب جب وہ اٹھے گا تو آپ سوچیے تو سہی کون کون سی قوت اس کی مخالفت میں نبرد آزما نہیں ہو جائے گی' کہاں کہاں اس کے پاؤں کے نیچے زلزلے کی کیفیت نہیں پیدا ہو جائے گی' اور یہ ان وادیوں سے گزرنے کے بعد جب یہ کیفیت ہوگئی پھر کہیں جا کے کہا کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے۔ تلوار سے تیز اور بال سے باریک جو چلی آتی ہے۔ ایک بات وہ یونہی نہیں کہی گئی تھی۔ یہاں سے گزرنے کے بعد پھر وہ جنت کا جو راستہ ہے' وہ ملتا ہے۔ دوسری جگہ اسی کو دوسرے الفاظ میں یہ کہا کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (29:2) کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم ایمان لے آئے تو ہم نے پھر ان کو چھوڑ دیا کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ تو ایمان لے آئے؟ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے' پھر ان کو چھوڑ دیا جائے گا؟ وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (29:2) اور ان کو ان بھٹیوں میں سے نہیں گزارا جائے گا؟ کیا وہ اتنا کہہ دینے سے چھوٹ گئے؟ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ (3:142) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم یونہی جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ابھی یہ معلوم ہی نہیں کیا گیا' پتہ ہی نہیں تم میں سے کیا' تم نے خود اپنے عمل سے بتایا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ ہیں جو جہاد کے میدان میں سر بکف باہر نکل آتے ہیں اور پھر وہ ثبات و استقامت سے ہر مشکل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ابھی تو تمہارے عمل سے یہ پتہ ہی نہیں چلا۔ اس سے پہلے ہی تم نے فیصلہ کر لیا کہ جنت میں چلے جائیں گے۔

جنت کا حصول تو تلوار کے سائے میں جہاد کا بھی متقاضی ہے

عزیزانِ من! آپ وہ میزان دیکھتے ہیں جو ہم سمجھتے ہیں، مرنے کے بعد وہاں قائم کی جائے گی۔ ایک ایک سانس میں وہ میزان قائم

کی جاتی ہے، یہاں اعمال تلتے ہیں۔ کہتے ہو کہ یوں جنت میں چلے جاؤ گے؟ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰھَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَلَمۡ یَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ لَا رَسُوۡلِہٖ وَ لَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَۃً (9:16)۔ یہ اور ایک شرط آ گئی۔ جہاد کے لیے تیار ہونا اور اس کے بعد یہ کہ کوئی ایسی قوت کہ آئیڈیالوجی میں تم سے اختلاف رکھ رہی ہے، اس کی دوست داری تو نہیں قائم کر لی تم نے کہیں۔ یہ بھی جنت کی شرط ہے۔ وہ تو یہ کہنے والے ہیں کہ ''ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا ہیں''۔ نظام بڑا غیور واقع ہوا ہے۔ عزیزانِ من! جس نظام میں شرک نہ ہو، اس میں تو غیرت ہونی چاہیے یعنی وہ کسی دوسرے کے ساتھ مفاہمت کر نہیں سکتا۔ سنیے کہ خدا نقشہ کس طرح سے اس میدان کا کھینچتا ہے کہ جس میں پہنچ کر یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ہم میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جنت جیسی بلند زندگی کو بسر کر سکیں۔ کہا کہ ایک میدان جنگ کا جنگِ احزاب ہے، اس کا نقشہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جماعتِ صحابہؓ ساتھ ہیں، ان کے متعلق یہ ہے۔ عزیزانِ من! یہ جنت میں پہنچنے والے ان وادیوں سے گزر رہے تھے۔ اِذۡ جَآءُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ (33:10) نیچے سے، اوپر سے، مصیبتیں، مشقتیں، مخالفتیں، جنگ، تیر، تفنگ، تلواریں، اوپر سے، نیچے سے، بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ (33:10) نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ چکی تھیں۔ وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ (33:10) دل بلیوں اچھل اچھل کر حلقوں میں آئے ہوئے تھے۔ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوۡنَا (33:10) کیفیت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ بعض دلوں میں یہ وسوسہ اٹھ رہا تھا کہ ہم سے جو کہا گیا تھا، کیا واقعی یہ سچ کہا گیا تھا کہ حق کا غلبہ آ کر رہے گا؟ ھُنَالِکَ ابۡتُلِیَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ زُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِیۡدًا (33:11) مومن کہلانے والو! ان بھٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پاؤں کے نیچے تزلزل واقع ہو جایا کرتا ہے۔

جنت انسان کو اپنے خونِ جگر سے ہی حاصل کرنا ہو گی یہ کائنات کی طرح مفت نہیں ملتی

1965ء کی جنگ میں دیکھا نہیں، سنا ہے، عزیزانِ من! جنہوں نے وہ دھماکے تو سنے تھے یہاں کپکپی پیدا کر دی تھی۔ کہا ہے کہ ان وادیوں میں سے گزرنے کے بعد پھر یہ بات کہیں آ سکتی ہے کہ ہاں! ان کسوٹیوں پہ کسنے کے بعد جو تم سچے اور پکے نکلے ہو۔ یہ ہے وہ مقام۔ عزیزانِ من! جنت بخششیں سے نہیں ملتی، وہ تو جو وہاں زندگی بسر کرنے کا اپنے آپ کو اہل ثابت کرتا ہے۔ صرف وہ وہاں پہنچ سکتا ہے۔ جنت تو بڑی چیز ہے، یہ کام پہ جانے والے، ہم تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ صاحب! وہ بڑی موج ہے ''اوس جہاز وچ بیہہ جاندے نیں تے فُر کر کے اُڈے او نکل گئے ❶۔'' ذرا آپ کبھی اس کی تفصیل پڑھ کر دیکھیے کہ جو وہ اس کے اندر بھیجے جاتے ہیں، وہ کتنے سال سے ٹریننگ دی جاتی ہے، ہزاروں میں سے کہیں اس میں سے دو ایک نکلتے ہیں اور دو دو تین تین چار چار سال ٹریننگ ہوتی ہے، ان کی پھر وہ جو آخر میں

دو تین اس ٹیسٹ پہ پورے اترتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اگر قمر کو آپ جنت کہہ لیں تو اس میں پہنچنے کے لیے جو یہ سارا کچھ کرنے والے، وہ جو دو تین نکلیں گے، وہ قرآن کی اصطلاح میں مومن کہلائیں گے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ بڑے خوش ہو رہے ہو کہ جو چاند ہے وہ بس مسخر کیا۔ انہوں نے الاٹمنٹیں بھی کرا لی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ چیز الاٹمنٹوں سے نہیں مل جایا کرتی، وہاں پہنچنے کے لیے تو اتنے سخت فتنوں میں سے، بھٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، جو وہاں پہنچنے والا ہوتا ہے اور یہ تو ابھی آپ کے ہاں کی مادی دنیا کے اندر ہی پہنچتا ہے۔ قرآں تو کہتا ہے کہ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (55:33) سے مومن آگے نکل جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اس کے لیے کتنی ٹریننگ کی ضرورت ہوگی۔

ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 214 تک آ گئے، 215 ویں آیت سے ہم آگے لیں گے۔ یہ ان کا ذکر تھا، جو سر بکف میدان میں آ جاتے ہیں، پھر وہ آئیں گے جو اگر اس وقت جہاد کا میدان نہیں ہے تو وہ کیا کریں گے۔ یا جو اپنی بدنی قوت کے لحاظ سے وہاں جانے کے لیے فٹ نہیں ہیں، ان کے لیے کیا بیتی ہوگی۔ یہ ہیں وہ مقامات جن میں وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے پھر کہیں جا کر جنت کے لیے Candidature (امیدواری) کا Certificate (سرٹیفیکیٹ) ملتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

---

❶ وہ تو اس جہاز پہ بیٹھ جاتے ہیں تو پھر وہ پھر کر کے اڑے اور لو! وہ جا پہنچے۔

چوالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 215 تا 218)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝٢١٥ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ
وَھُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَھُوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ شَرٌّ
لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٢١٦ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ
فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ
اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ
اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢١٧ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
ھَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٢١٨

عزیزانِ من! آج مئی 1969ء کی 18 تاریخ ہے' ہم درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 214 تک سابقہ درس میں پہنچے تھے' آج آیت 215 سے درس کا آغاز ہوتا ہے۔ (2:215):

جنت کو ہمیشہ مال اور جان کے ترازو میں تولا جاتا ہے

سابقہ درس میں سابقہ آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ زبان سے تم نے کہہ دیا کہ ہم ایمان لے آئے اور اس سے یہ جنت کا ٹکٹ مل گیا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بڑی دشوار گزار گھاٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے' قدم قدم پر مخالف قوتوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے' بڑے

مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ان میں جان اور مال دو چیزیں انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ سورۃ التوبہ کی اس عظیم آیت کے مطابق یہ دونوں چیزیں پہلے بیچ دی جاتی ہیں تو پھر ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے۔ پہلی آیت 214 میں جان کی قربانی کا ذکر تھا، میدانِ جنگ کا ذکر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں مال کی قربانی کا ذکر ہے کہا گیا ہے کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (2:215)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پوچھتے یہ ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں جواب دیا ہے کہ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (2:215) جو کچھ بھی تم خرچ کرو تو وہ والدین، اقربا، یتمیٰ، مساکین اور ابنِ سبیل کے لیے ہے۔

خدا کے نام پر مملکت قائم کرنے والوں کے لیے ہر فرد کی ضروریات کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے

اصولاً یہ یاد رکھو کہ جو کچھ بھی تم بھلے کا کام کرو گے خدا کے علم میں ہوگا۔ قرآنِ کریم جو نظام قائم کرنا چاہتا ہے، اس میں ابتداًا پنی مملکت کے ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا مملکت کے ذمے ہوتا ہے۔ وہ اعلان کرتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (6:15)۔ ہم تمہارے سامانِ زیست کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ جب مملکت یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے تو پھر یہ جو انفرادی طور پہ ایک دوسرے کی کچھ مدد کرنا ہے، ایک دوسرے کی احتیاج کا پورا کرنا ہے، یہ انفرادی چیز نہیں رہ جاتی، وہ ایک اجتماعی نظام ہوتا ہے۔ اس نظام میں دو ہی آیات آگے چل کر بات واضح کر دی، جہاں کہا کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (2:215)۔ یہی الفاظ ہیں۔ یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لیے نظامِ اسلامی کی تحویل میں دے دینا ہوگا؟ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) کہا کہ جس قدر بھی تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اب اس نظام کے تحت جب اپنی ضروریات سے زائد سارا ہی اُدھر منتقل کر دیا جائے گا تو افراد کے پاس تو کچھ باقی بچے گا ہی نہیں، جسے وہ انفرادی طور پر کسی کو دیں۔ وہاں تو تمام ضروریات نظام کی طرف سے پوری ہوں گی اور ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا، کم از کم اپنی ضروریات کے لیے رکھے گا اور جتنا بھی فاضلہ ہوگا، وہ سب کس سب اس نظام کی تحویل میں دیدے گا۔ یہ ہے اسلام کا نظام۔ اب اس میں آپ دیکھیے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جسے آپ فاضلہ دولت Supplus Money کہتے ہیں وہ کسی فرد کے پاس باقی رہتی نہیں ہے۔

سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہمیشہ فاضلہ دولت پر استوار ہوتی ہے

جسے آپ نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں، اس کی بنیاد فاضلہ دولت پہ ہے۔ یہ فاضلہ دولت جس کے پاس ہوتی ہے، وہ اسے آگے انوسٹ کر کے پھر اور دولت کما تا ہے۔ میں جب معاشیات پہ آؤں گا تو وہاں ان چیزوں کی تکنیک سمجھاؤں گا۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ سرمایہ روپیہ ہے

جو اپنے جیسا روپیہ پیدا کر کے اپنے ساتھ ملاتا چلا جاتا ہے اور یہ زائد از ضرورت روپیہ ہے جسے انوسٹ کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے ساتھ جو ملاتا جاتا ہے تو یہ کہاں سے لاتا ہے؟ کیا یہ کہیں آسمان سے ٹپکتا ہے؟ زمین سے کھودتا ہے؟ وہ میری آپ کی جیبوں سے نکل کر جاتا ہے۔ روپیہ تو کہیں انفرادی طور پہ کسی کے گھر میں بنتا نہیں ہے' وہ دوسروں کی جیب کا روپیہ ہوتا ہے' جو ادھر آتا ہے اور کس طرف آتا ہے؟ وہ جو ایک مثال میں دیا کرتا ہوں کہ گاؤں کے ایک سادا لوح کسان نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اس نے بڑی محنت سے مشقت سے چار چار پیسے اکٹھے کر کے ایک روپیہ جمع کیا اور روپیہ لے کر وہ شہر میں گیا کہ اب میرا روپیہ روپے کو کھینچے گا۔ اس نے دیکھا کہ صراف کی دوکان پہ روپوں کا ڈھیر لگ رہا ہے۔ ایک طرف کھڑے ہو کر اس نے اپنا روپیہ اس ڈھیر میں پھینک دیا اور پھر انتظار کرنے لگا کہ کانٹا تو میں نے ڈال دیا' اب مچھلی آئے گی۔ وہ کھڑا رہا' وہ روپیہ لوٹا ہی نہیں۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد اس صراف نے پوچھا کہ میاں! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اب اسے بتانا پڑا کہ صاحب! میں نے یہ سن رکھا تھا اور میں نے آ کر اس طرح اپنا روپیہ پھینکا' اب اس انتظار میں ہوں کہ روپیہ روپے کو جو کھینچتا ہے تو وہ آئے گا تو مجھے تو نظر آتا ہے کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ اس نے کہا کہ بات جھوٹ نہیں ہے' یہ بالکل سچی بات ہے' روپیہ روپے کھینچتا ہے' اس روپے نے تمہارے روپے کو کھینچ لیا۔ برادرانِ عزیز! ہاں' کھینچتا ہے' بڑا روپیہ چھوٹے روپے کو کھینچتا ہے۔ چھوٹی انوسٹمنٹ والا' بڑی انوسٹمنٹ سے کچھ نہیں لے سکتا۔ یہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی ہیں۔ یہ اس میں راز ہی سارا اتنا ہے۔ کھینچتا ہے' لے جاتا ہے لیکن ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟ فاضلہ دولت سے' جو ضرورت سے زائد بچتا ہے۔ بہرحال یہ چیز تو وہاں چل کر میں ذرا وضاحت سے عرض کیا ہے' جب فاضلہ روپیہ فرد کے پاس ہوتا ہی نہیں' بچتا ہی نہیں' تو یہ سارا سوال کہ وہ خیرات دے گا اور اس انداز کی زکوٰۃ دے گا جیسی آج کل ہمارے ہاں مروج ہے' اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

نظامِ سرمایہ داری انسان کو اگر روٹی دیتا ہے تو غیرت خرید کر دیتا ہے

بات اصل میں کہنے کو یہ ہے' ہم کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! انفرادی طور پہ بھی تو ضرورت پوری کی جاسکتی ہے۔ نظام کیوں نہیں رکھا؟ محتاج کا کسی ایک فرد کے پاس آ کر مانگنا اور وہاں سے لینا' روٹی تو اسے مل جائے گی لیکن غیرت اور حمیت کی قیمت دے کر ملے گی۔ یہ اشرفِ انسانیت کی تذلیل ہے اور دین کی لم یہ ہے یاد رکھیے! اس فقرے کو لکھ رکھیے کہ دین احترامِ انسانیت کو دنیا کے اندر باقی رکھنے کے لیے آتا ہے۔ احترامِ انسانیت کو تو خدا بھی نہیں چھینتا کہ وہ انسان پہ جبر نہیں رکتا۔ وہ کہتا ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40)۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے۔ انفرادی طور پہ یہ جو نظام ہے' خیرات تو دی جاسکتی ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں' خیرات دینے والے کا اوپر کا ہاتھ ہوتا ہے اور لینے والے کا نیچے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس میں کیا فرق پڑتا ہے؟ نفسیاتی طور پر جو اوپر کا ہاتھ دینے والا ہے اس کے دل میں ایک پندارِ نفس

پیدا ہوتا ہے' لینے والے کی تحقیر انسانیت ہوتی ہے۔ کیا خدا کا دین اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لیے آئے گا؟ اور جب اجتماعی نظام میں آپ دے دیں گے تو وہاں کسی فرد کا کسی دوسرے فرد کے اوپر احسان ہی نہیں ہوگا اور یہ چیز جو یہ لیں گے تو خیرات کے طور پہ' بھیک کے طور پہ' نہیں لیں گے بلکہ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (70:24-25) وہ بطور اپنے حق کے وہاں سے لیں گے۔

قرآنی نظام کے ابتدائی خدوخال اور اس کے تکمیلی مراحل

یہ نظام تو بتدریج قائم ہوتا ہے' بڑا وقت لگتا ہے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ جیسے خاتم النبیین صحابہؓ جیسی جماعت کے ساتھ نظام کو قائم کرنے والے' یہ تئیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ حضور ﷺ کے آخری دور میں رسالت کے اس نظام کا ایک پہلا ابتدائی خاکہ سامنے آیا' اس کی تکمیل بعد میں جا کر ہوئی تھی۔ اب اگر یہ نظام انتظار کرتا رہے کہ جب تک وہ مکمل شکل میں آئے گا' اسی وقت ضروریات پوری ہوں گی تو اس دوران میں پھر کیا کیا جائے گا؟ یہ اس دوران میں جب ہنوز یہ ابھی Becoming کی حالت میں ہوتا ہے' ابھی یہ زیرِ تشکیل ہوتا ہے' اس زمانے میں یہ جو چیزیں ہیں وہ قرآن نے دیں' انفرادی طور پہ یہ تلقین کی۔ ہر قدم اس کا اسی کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن بتدریج قدم اٹھتا ہے۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم میں یہ جتنے بھی ایسے احکام ملتے ہیں' جن سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ افراد کی ضروریات افراد پوری کرتے ہیں' وہ اس عبوری دور کی چیز ہے۔ پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جب وہ ابھی انفرادی طور پر اس نظام کو قائم کرتا ہے انفرادی طور پہ احتیاجات کو پوری کرنے کے لیے تلقین و تاکید کرتا ہے' تو وہ اپنے قریبیوں سے ابتدا کرتا ہے۔ یہ اس کا ایک دوسرا انتظامی پہلو ہے اور یہ ایک بڑا صحیح پہلو ہے۔ یہ جسے آپ' فیملی یونٹ کہتے ہیں' یہ ایک گھر کی زندگی ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے لیکن یاد رکھیے! یہ تمدنی ضرورت کی چیز ہے۔ بجائے اس کے کہ تمام انسانوں کو' انسانی بچوں کو' ایسے ہی چھوڑ دیا جائے' چھوٹے چھوٹے یونٹس بنائے جاتے ہیں' جن کو آپ Families (خاندان) کہتے ہیں۔ ان Families (خاندانوں) کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے' بچے کی وہاں پرورش ہوتی ہے' تربیت ہوتی ہے۔ اس یونٹ کے اندر وہ پروان چڑھتا ہے' آپس میں کچھ تعلقات پیدا ہوتے ہیں' رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔

انسانی برادری میں مغربی اقوام نے فیملی یونٹس کو توڑ کر بے شمار نفسیاتی بیماریوں کو جنم دیا ہے

یاد رکھیے! فیملی یونٹس کو توڑ کر مغرب کی اقوام نے اس کے نتائج دیکھ لیے ہیں۔ مجھے کچھ نفسیات میں بھی درک ہے' اس قسم کے Cases میرے سامنے آتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن بچوں کو بچپن میں گھر کا مساعد ماحول نہیں ملا' ماں باپ کی محبت' بہن بھائیوں کا پیار' جن کو یہ چیزیں نہیں مل سکیں' بڑے ہونے کے بعد ان کے اندر عجیب قسم کی نفسیاتی پیچیدگیاں (Physological Complexes) پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ ایسا کیوں ہے لیکن اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے

Physhological Analysis کیا جائے تو نظر آ جائے گا کہ بچپن میں یہ ان چیزوں سے محروم رہ گیا ہے۔

بچوں کی نفسیاتی بیماریوں کا ثانی علاج قرآنی تعلیم میں ہے

زندگی کے جو بڑے نرم ونازک گوشے ہیں‘ ان میں خلا رہ جاتا ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے پھر بعد میں وہ مارا مارا پھرتا ہے‘ سمجھ میں بات آتی نہیں ہے۔ ضمناً عرض کر دوں کہ اس قسم کا نفسیاتی مریض جب آپ کے پاس آئے‘ اس کی ہر نقل وحرکت‘ اس کا Behaviour‘ اس کا Attitude ایسا ہوگا کہ جس سے آپ کو بھی غصہ آئے گا‘ کبھی اس سے آپ دور کھنچیں گے۔ کبھی ایسا نہ کیجیے گا۔ اس کا Affection کی ضرورت ہوتی ہے‘ وہ اس سے محروم رہ گیا ہوا ہوتا ہے‘ اس کا اس میں Vacum ہوتا ہے۔ غم وغصے کی بجائے‘ نفرت اور حقارت کی بجائے‘ اس کو محبت دیجیے‘ اسے پیار دیجیے‘ اسے Affection دیجیے‘ اسے ہمدردی دیجیے‘ اس کے خلا کو پر کرنا شروع کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر عجیب وغریب تبدیلی پیدا ہوگی۔

میں کہہ رہا تھا کہ گھر کا جو ماحول ہے‘ اس میں صرف بچے کی پرورش نہیں ہوتی۔ پرورش تو یتیم خانے میں بھی ہو جاتی ہے‘ پرورش تو یہ جو مغرب نے اپنا نظام بنایا تھا کہ بچوں کو وہ پرورش گاہوں کے اندر چھوڑ دیتے ہیں‘ پرورش تو وہاں بھی ہو جاتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ ہمارے گھروں کے مقابلے میں وہاں اچھی پرورش ہو اور ہوتی ہے‘ لوگ آ کر بتاتے ہیں کہ وہاں کے بچوں کی پرورش بہت اچھی ہوتی ہے لیکن یہ جو ان کا پہلو ہے‘ یہ تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے۔ گھر سے مراد گھر کی چار دیواری نہیں‘ اس سے مراد ہے وہاں کی فضا کا مساعد ہونا‘ خوشگوار ہونا۔ ایسی فضا جس میں انسان کے زندگی کے یہ نرم ونازک گوشے پروان چڑھیں۔ جس گھر کے اندر میاں بیوی میں ٹکراؤ ہوتا ہوگا‘ جس گھر میں اس قسم کی کھٹ پٹ ہوتی ہوگی یا ان کے مزاج میں تلخی ہوگی‘ تنک مزاجی ہوگی‘ آپ دیکھیں گے کہ اس گھر کے جو بچے ہیں‘ ان کی ذہنیت کچھ اور قسم کی ہوگی۔ جس گھر کی فضا مساعد ہوگی‘ خوشگواریوں کے جھولے جھولے ہوگی‘ اس گھر میں جو پرورش یافتہ بچے ہیں‘ ذہنی قلبی طور پر بڑی اعتدال پہ ہوتے ہیں‘ ان کے جوہروں کی نمود بڑی عمدگی سے ہوتی ہے۔ جو فیملی یونٹ ہے‘ گھر کی ایک وحدت ہے‘ اس اعتبار سے بھی نہایت ضروری ہے۔ اس لیے قرآن نے اس پہ زور دیا ہے۔ اب اس گھر کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی پرورش کرنے کے قابل نہیں ہوتا‘ بڑے جو پرورش کے قابل ہوتے ہیں وہ اس کی ضروریاتِ زندگی پورا کرتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو یہ جوان ہو جاتا ہے‘ وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں‘ اب وہ اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے قرآن کریم نے ان نوجوانوں کے متعلق‘ اولاد کے متعلق‘ یہ کہا کہ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (2:83)۔

لفظ احسان کا قرآنی مفہوم اور خدمت میں تحقیر کے جذبے کی ممانعت

جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہوگا' یہ احسان جو عربی زبان کا ہے' یہ وہ احسان نہیں جو ہمارے ہاں اردو میں استعمال ہوتا ہے''احسان کرو اس پہ صاحب''۔ اب جو احسان کسی پہ کیا ہے تو اب آپ کو پتہ ہے کہ وہ ساری عمر کے لیے آپ کا بے دام غلام بن کر رہے گا' آپ نے اس پہ احسان جو کر دیا۔ وَ بِـالۡـوَالِـدَیۡنِ اِحۡسَانًا (2:83) کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے اوپر پھر احسان کرو اور احسان کر کے ان و ک دباتے رہو۔ احسان کے معنی ہوتے ہیں''کسی کی کمی پورا کر کے' اس میں اعتدال پیدا کر دینا' اس کے بگڑے ہوئے حسن کو سنوار دینا' اس کا Proportion (تناسب) صحیح کر دینا یعنی جو کسی میں کمی رہ گئی ہے وہ کمی پوری کر دینا'' گویا پہلی چیز تو اس میں یہ ہوئی کہ ایسے والدین جن میں کمانے کی کوئی کمی رہ گئی ہے' وہ خود اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے قابل نہیں رہے' ان میں کمی آ گئی ہے' وہ کمی پوری کرو۔ اب کمی پوری کرنے کے اندر بھی یہاں وہ پہلو پھر آ گیا کہ اس میں کچھ تحقیر کا شائبہ آ جائے گا۔ آ نے ایسے گھر دیکھے ہوں گے اور ایسی اولاد بھی دیکھی ہوگی' ماں باپ کی کمی کو وہ پوری تو کرتے ہیں' ان کو دیتے تو ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ جو ان کے ساتھ سلوک کرتے ہیں' ماں باپ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ یہ تو بچہ نہ ہی ہمیں دیتا۔ اس لیے اس مقصد کے لیے یہ ساتھ کہا کہ فَلَا تَـقُـلۡ لَّهُـمَـآ اُفٍّ (17:23) ان کو ڈانٹو ڈپٹو نہیں' تلخی سے ان کے ساتھ پیش نہ آ ؤ' مرحمت کا پہلو ہونا چاہیے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جہاں قرآنِ کریم نے انفرادی طور پر ضروریات پوری کرنے کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے والدین کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد اقربین کا آیا یعنی جو تمہارے قریبی ہوں۔

قرآنی تعلیم کے نزدیک خونی رشتے کی نوعیت اور اطاعت کا مقام

اب ایک قدم آگے بڑھائیے' جہاں قرآن انسانوں کے خود ساختہ معیاروں سے' اصولوں سے' یوں الگ ہو جاتا ہے۔ باپ اور بیٹے کا ایک رشتہ Biological (حیاتیاتی) ہے' جسے آپ خونی رشتہ کہتے ہیں۔ بڑی اہمیت دی جاتی ہے' ہمارے ہاں خون کے رشتے کو۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رشتہ ایک طرف تو دیکھیے تو ناقابلِ شکست ہوتا ہے' اٹوٹ ہوتا ہے۔ اسی کا جو باپ ہے Biologically خونی رشتے کے طور پہ' یہ بیٹا لاکھ کہتا رہے کہ میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں' غلط ہے۔ باپ' باپ ہو گیا' اس کا یہ باپ ہونا اٹوٹ ہے' یہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ وہ باپ ہے' یہ ایک Facual Position (حقیقتِ امری) ہے لیکن قرآن اس رشتے کو وہ مقام نہیں دیتا جو انسانوں کے ذہن نے خود تراش کر دیا تھا یعنی یہ کہ ہر بات میں ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ ٹھیک ہے' جب تک بچہ' بچہ ہے' اپنے معاملات کو خود نہیں سمجھ سکتا' سنوار سکتا' اس کو Guidance (راہ نمائی) کی ضرورت ہے' اسے ماں باپ کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے' وہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں لیکن جب یہ اپنے معاملات کو آپ سنوارنے سنبھالنے کے قابل ہو جائے' اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ماں باپ تو ایک طرف رہا' یہاں تو قوانین و احکامِ خداوندی کے علاوہ کسی کی اطاعت بھی قرآن کی رو سے جائز نہیں ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں' ہر نظامِ اخلاق میں' بطور مسلمہ یہ چیز

مانی جاتی ہے کہ ''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔'' قرآن یہ نہیں کہتا۔ یہ کہتا ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک ضروری ہے' ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنی' عزت کرنی ہے' نرمی سے پیش آنا ہے۔ یہ ایک تمدنی ضرورت ہے۔

معاشرتی طور پر تمدنی زندگی کی ضروریات کے باوجود قرآنی آئیڈیالوجی کو ہمیشہ مقدم تصور کرنا ہوگا

اب رہا رشتہ' اب یہاں آیا دین' اس کے نزدیک خون کا رشتہ تو کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ دیکھیے کہ انگریزی کا جو لفظ ہے' یہ رشتہ ہی Relative ہے' اضافی ہے' بنیادی نہیں ہے لیکن لوگوں نے تو ایک لفظ لے لیا' آگے انہوں نے بات نہ سمجھی۔ بات قرآن نے سمجھائی کہ یہ رشتے تمدنی ضروریات کے لیے ضروری ہیں۔ یاد رکھیے! حقیقی رشتہ وہی ہے جو آئیڈیالوجی کی بنیادی کے اوپر قائم ہوتا ہے' جسے ہم آہنگی فکر و نظر' وحدتِ مقصدِ حایت ہے' ایمان کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ رشتہ یہ ہے۔ دونوں رشتوں میں پہلا بنیادی فرق تو یہ ہے کہ اس خون کے رشتہ میں انتخاب یا چوائس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زید جس باپ کے گھر میں پیدا ہوگیا' وہ اس کا باپ ہوگیا' اس سے کسی نے پوچھا نہیں کہ کیوں بھئی! اس کا بیٹا بننا چاہتے ہو۔

ازدواجی رشتہ جذباتی یا پستی بنیادوں کی بجائے آئیڈیالوجی کی بنا پر اور چوائس کی بنیاد پر ہی ثمر بار ہوتا ہے

سینکڑوں باپ ایسے ہوں گے جن کے متعلق اگر بیٹے کو کبھی پوچھ لیا جائے تو وہ سات سلام کرے۔ شاید ہزاروں بیٹے ایسے ہوں کہ باپ کو پوچھ لیا جائے تو وہ بھی اس کو عاق کرنے کی فکر میں پھر رہا ہو۔ اس میں چوائس نہیں ہوتی۔ جس میں چوائس نہیں ہوتی وہ انسانیت کے لیول کی چیز نہیں ہوتی Physical Level کی ہوتی ہے' طبعی لیول کی ہوتی ہے' حیوانی لیول کی ہوتی ہے یہ Biological (حیاتیاتی) رشتہ ہے۔ حقیقی رشتہ وہ ہوتا ہے جو چوائس سے' اپنے انتخاب سے' طے کیا جائے۔ اس رشتے میں پہلے مقام کے اوپر میاں اور بیوی کا رشتہ آتا ہے۔ ''آتا ہے'' میں نے کہہ دیا ہے ''تھا'' کہہ دوں تو بات شاید کبھی بن جائے۔ جسے چوائس کہا جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں اس میں چوائس کتنا ہوتا ہے لیکن قرآن نے اس رشتے کے متعلق یہ بات کہی تھی جسے عقدی رشتہ کہا ہے' نسبی نہیں ہے' یہ چوائس کا رشتہ ہے۔ یہ بڑا محکم ہوسکتا تھا اگر فی الواقعہ یہ چوائس کا اور ہم آہنگی فکر و نظر پر مبنی ہو۔ کار' محلات' کسی کی ڈپٹی کلکٹری' بیٹی کے باپ کا جج ہوجانا' رشتے کے یہ معیار نہ ہوں۔ یا وہ جنون کہ جسے اب آج کل Love Affair کہا جاتا ہے' جس میں غالب ہی ٹھیک کہہ گیا ہے کہ

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

گھریلو طور پر ذہنی ہم آہنگی ہی جنتی معاشرے کی بنیاد مہیا کرتی ہے

وہ رشتہ جو دماغی خلل کا نتیجہ ہو وہ جونہی حدت کا جوسرسام ہوتا ہے نیچے اترتا ہے رشتہ ختم ہو گیا ہوتا ہے۔ یہ پہلا رشتہ قرآن نے نسبی رشتوں کی بجائے کہ جس میں چوائس نہیں ہوتا' چوائس اور انتخاب کی بنیادوں کے اوپر ایک میاں بیوی کا رشتہ قائم کیا تھا اور جہاں قائم کیا تھا وہاں یہ چیز کہی تھی کہ ہم جو تمہیں کہتے ہیں کہ آئیڈیالوجی' ایمان' فکر و نظر کی وحدت کی بنیاد پر یہ رشتہ قائم کرو' وہاں یہ کہا تھا کہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں جنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ جو دوسرے معیاروں کے مطابق یہ رشتے قائم کرتے ہیں' وہ تمہیں جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ کتنا حسین انداز ہے بات کہنے کا! لیکن یہ تو بہت محدود ہو گیا ایک میاں ایک بیوی۔ قرآن یہ رشتہ مومنین میں پیدا کرتا ہے۔ مومن کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے طور پر کہیں کسی نے اسلام قبول کیا اور دوسرے نے یہاں قبول کیا اور آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں۔ وہ تو سارے مومنین کو کہتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49:10) کبھی آپ نے غور کیا کہ یہ اِنَّمَا اس نے کیا کہا ہے؟ اتنا محکم بنیادی رشتہ ہے جو چوائس پہ ہے۔ اس میں اتنی وسعت ہے کہ جس جس میں ہم آہنگی فکر و نظر ہوئی اور اس نے اس کو قبول کیا' وہ دونوں آپس میں بھائی بن گئے اور جسے اخوۃ کہا جاتا ہے اس کی بنیاد وہ تو آپ کو پتہ ہے کہ عربوں کے ہاں تو وہ ان کے پانچ سات چیزوں کے اوپر الفاظ وہ گھومتے تھے۔ ''سانجھی کھرلی تے جیہڑے پٹھے کھان آلے ہون او ہناں نوں اخوۃ کیندے نیں۔ وہ ایک نئی برادری بناتا ہے۔ نہ وطن کے اشتراک پہ' نہ خون کے اشتراک پہ' نہ رنگ کے اشتراک پہ' نہ زبان کے اشتراک پہ' صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پہ' فکر و نظر کی وحدت کے اشتراک پر ایک برادری جن کا آپس میں تعلق کلب کے ممبروں کا نہیں ہوتا' اخوت کا تعلق ہوتا ہے اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ کہا ہے۔ جو بھی ایک دوسرے کا اخ نہیں ہے' مومن نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے تو استثنیٰ نہیں کی تھی۔ وہ یہ رشتہ پیدا کرتا ہے۔

خالص آئیڈیالوجی کے مقابلے میں خونی رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا

یہاں پہنچنے کے بعد جہاں خونی رشتے میں اور Ideological (نظریاتی) رشتے کے اندر ٹکراؤ ہوتا ہے۔ وہ اس خونی رشتے کو توڑ دیتا ہے' اس نظریاتی رشتے کو باقی رکھتا ہے۔ سب سے پہلی نبی علیہ السلام جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ وہ حضرتِ نوح' کیا ذکر کیا ہے؟ اس کی اہمیت کس مقام پہ آئی ہے؟ جہاں یہ ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ میں تمہیں اور تمہارے اہل کو اس طوفان سے' اس سیلاب سے بچا لوں گا۔ کشتی میں سب سوار ہوئے' حضرتِ نوح علیہ السلام نے بیٹے کو آواز دی۔ بیٹا فکر و نظر میں ہم آہنگ نہیں تھا' خونی رشتے کے اعتبار سے تو بیٹا تھا۔ وہ نہیں آیا' غرق ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ الٰہ العالمین! آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ میرے اہل کو بچا لیا جائے گا' یہ کیوں ڈوب گیا؟ آپ کو معلوم ہے قرآن قصے تو نہیں سناتا' اہم بنیادی حقیقتیں ہیں جن کو تاریخی شواہد سے پیش کرتا ہے۔ کہا کہ پھر یہ میرے اہل کو بچانے کا تو

وعدہ کیا گیا تھا' یہ کیوں ڈوب گیا؟❶ کہا کہ نوح علیہ السلام! یہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا' فکر ونظر میں تجھ سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھا کہ خون کا رشتہ اہل بنا دیتا ہے۔ نہیں' وہ تمدنی ضرورت کا رشتہ ہوتا ہے' وہاں صرف حسنِ سلوک کی چیز ہے۔ رشتہ جو ہے وہ آئیڈیالوجی کا رشتہ ہے۔ اس لیے ایسی بات نہ کیا کرو' جیسے جاہل بات کیا کرتے ہیں۔ پہلے نبی علیہ السلام کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ باپ کا رشتہ بیٹے سے ٹوٹا ہے۔ اس کے بعد اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام آتے ہیں۔ بیٹا باپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے باپ! یہ کیا کر رہے ہو؟ شیطان کی روش پہ چل رہے ہو۔ اس نے کہا کہ تم بیٹے ہونے کے بعد یہ کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس میں باپ اور بیٹے کا سوال نہیں۔ حق بات جو ہے وہ تو کہی جائے گی۔ اس نے کہا کہ ابراہیم! باز آ جاؤ ورنہ یہاں سے تمہیں دیس نکالا دے دوں گا۔ اس بیٹے نے کہا کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (37:99) میں پہلے ہی جا رہا ہوں' اپنے اللہ کی طرف۔ باپ سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ میاں اور بیوی کا رشتہ بھی جو اس بنیاد پہ قائم ہونا تھا' یہاں یہ نہیں رہا' حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی پیچھے رہ جاتی ہے' رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

---

❶ حضرت نوح کا بیٹا اگر حضرت نوح کی طرف سے پیش کردہ وحی کی ایمانی کشتی (آئیڈیالوجی) کی کشتی کا ہم سفر بن جاتا وہ پر کبھی نہ ڈوبتا۔

جنگ بدر کا معرکہ قرآنی آئیڈیالوجی کے استحکام کا عملی ثبوت پیش کرنا ہے

ان رشتوں کا تفاوت پھر جہاں دین اتمام پہ اور تکمیل پہ پہنچا ہے' اس کے مشاہدات بھی آخری شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بدر کے میدان میں دو صفیں جو آمنے سامنے تھیں' باپ اس طرف کی صف میں بیٹا دوسری طرف کی صف میں' بھائی ادھر دوسرا بھائی اُدھر' ماموں ادھر بھانجا اُدھر۔ رسول اللہ ﷺ کے بیٹا تو نہیں تھا' آپ ﷺ ادھر' داماد اُدھر' خود ادھر چچا اُدھر۔ اور پھر وہ واقعہ تو یاد ہے جس کی بنا پہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو صدیق اکبر کہا گیا۔ بعد میں بیٹا بھی اسلام لے آیا' اس نے کہا کہ ابا جان! بدر کے میدان میں ایک وقت ایسا آیا تھا کہ آپ میرے تیر کی ٹھیک شست میں آ گئے' کلا چڑھایا تھا ہاتھ کانپ گیا کہ باپ سامنے تھا اور باپ نے کہا کہ بیٹا اگر ایسا مقام ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آتا تو میرا ہاتھ نہ کانپتا۔ وہاں خالی خون کا رشتہ تھا' یہاں وہ چیز جانتے تھے کہ خون کے رشتے سے اوپر ایک اور رشتہ ہوتا ہے۔ رشتہ یہ ہے جو بنتا ہے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے کہی ہیں' والدین کے لیے اقربین کے لیے یہ ساری تمدنی ضروریات کی چیزیں ہیں اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ ان کی اہمیت نہیں ہے۔ جہاں آ کے ٹکراؤ آ پڑے گا' آپ کے گھر میں آپ کا اور ان کا آئیڈیالوجی کا ٹکراؤ جہاں آ کے پڑے گا تو پھر اس کے بعد یہ صورت ہو گی کہ ''ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا' جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں۔'' یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک آئیڈیالوجی کے اختلاف کے باوجود باہمی احترام کے رشتہ کو ختم نہیں کیا جا سکتا

لیکن اس کے باوجود یاد رکھیے! حسن سلوک کا وہ جو رشتہ ہے وہ باقی رہے گا کیونکہ وہ تمدنی ضرورت کا رشتہ ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں ہے۔ اقربین میں چونکہ عام معنی تو رشتہ داروں کے ہی کیے جاتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے۔ جتنے بھی آپ کے قریبی ہیں' ان کے ساتھ حسنِ سلوک ضروری ہو جاتا ہے اور پھر جب قرآن یتمی اور مساکین کہتا ہے تو اس میں تو اس کی تخصیص نہیں کہ یتیم مسلمان کا بچہ ہو تو اسی کے ساتھ حسنِ سلوک کر' مسکین مسلمان ہو تو اسی کے ساتھ یہ کچھ کرو' یہ سوال ہی نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سارے قرآن میں یہ کہیں تخصیص نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو انسان کو اپنے سامنے مخاطب سمجھتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا خلاصہ

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآنِ کریم کے نظام کی انتہائی شکل کے اندر تو کیفیت یہ ہوگئی کہ زائد از ضرورت کسی کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں۔ افرادِ معاشرہ کی تمام ضروریاتِ زندگی' نظام کے ذمے ہوں گی' وہ پوری کرے گا' فاضلہ دولت نظام کے پاس چلی جائے گی۔ اس میں یہ خیرات اور صدقے جو انفرادی طور پہ دیئے جاتے ہیں' ان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک وہ نظام اپنی تکمیل تک' آخری شکل میں سامنے نہیں آتا' یہ انفرادی طور پ جو قرآن کی تاکیدیں ہیں' جو احکام ہیں' یہ اس وقت کے لیے ہیں' اس میں یہ کچھ کیا جائے گا۔ اس میں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان اصولوں کو اتنی اہمیت دی گئی ہے' حسنِ سلوک کیا جائے گا' ڈانٹ ڈپٹ نہیں ہوگی' تعظیم ہوگی' احترام ہوگا' محبت ہوگی' پیار ہوگا۔ آئیڈیالوجی کا جہاں آ کر تصادم ہوگا' آئیڈیالوجی کا رشتہ ان رشتوں کے اوپر فائق ہوگا لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک پھر بھی جاری رہے گا۔ اب یہاں تو یہ کہا ہے۔ عبوری دور کے متعلق جو حکم آیا کہ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہو کہ یہ جو تمہارے والدین کی اقرابین کی، یتیمی کی، مساکین کی، ابنِ سبیل کی ضروریات ہیں' یہ پوری کرو اور جیسا میں نے (2:219) میں عرض کیا ہے' ابھی ہم آگے چل کر دیکھیں گے' جہاں یہ کہا گیا' وہ آخری حکم ہے تکمیل کے وقت کہ پوچھتے یہ ہیں کہ کتنا دیدیں' ہم دوسروں کی ضرورتوں کے لیے' کہا کہ جتنا تمہاری اپنی ضرورتوں سے زائد ہے' سب کا سب۔ یاد رکھیے کہ یہ بات مومنین سے کہی جا رہی ہے' ورنہ ہمیں تو اس کے بعد یہ اعتراض کیا جاتا ہے' روز چٹھیاں آتی ہیں کہ صاحب! یہ جو ضروریات سے زائد چیز ہے تو ان میں ایک شخص اپنی ضروریات اتنی بڑھاتا چلا جاتا ہے کہ زائد رہتا ہی کچھ نہیں ہے' موٹر پہ موٹر خریدتا چلا جاتا ہے' کوٹھی پہ کوٹھی بناتا چلا جاتا ہے' وہ کہتا ہے میرے پاس ضرورت سے زائد بچا ہی نہیں۔ عزیزانِ من! یہ مومنین سے کہا جا رہا ہے' جن کی یہی صورت نہیں ہے کہ وہ اپنی ضرورت پورا کر کے فاضلہ دیتے ہیں' مومن کے متعلق کہا ہے کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) وہ دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پہ ترجیح دیتے ہیں' خود تنگی میں گزارا کر لیتے ہیں' اس کو تنگی میں نہیں رہنے دیتے۔ جن کی یہ کیفیت ہوگی کیا ان کی یہ حالت ہوگی؟ کہ ہزاروں

لاکھوں کی تعداد میں جھونپڑیوں کو ترس رہے ہوں اور وہ کوٹھیوں پہ کوٹھیاں بنواتے چلے جائیں۔ مومن سے کہا جارہا ہے' ہم سے آپ سے نہیں۔ جی ہاں! چھٹی تو یوں پائی اور اس کے بعد کہا کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12) خدا کی گرفت بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ اتنی سخت' صرف Physically (طبعی طور پہ) آپ کے ہاں یہ شکست نہیں ہوئی' آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں کی غیرت اور حمیت اور عزت اور تکریم ہر چیز جو ہے وہ بک گئی ہے: اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12) حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں' فطرت کی تعزیریں۔ مکافاتِ خداوندی' جیسا میں نے کہا ہے کہ ہڈی ڈھیٹ ہو جائے تو بات ہی اور ہے' ذرا سی بھی غیرت والی کوئی قوم ہوتی تو بات سمجھ میں آجاتی کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یہ تھا مال کے متعلق۔ دوسری چیز میں نے کہی تھی کہ یہاں مال اور جان تو اکٹھا آتا ہے۔

تیرہ سو سال سے قرآنِ حکیم کے ساتھ ہمارا روا رکھنے والا سلوک

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَ ھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (2:216)۔ میں نے سابقہ درس میں یا اس سے پیوستہ میں یہ کہا تھا کہ ہماری کیفیت یہ ہے کہ قرآن کا جو ایک حکم ہے' اس کو تو اتنی اہمیت دی جاتی ہے' انہی الفاظ میں دوسرا حکم آتا ہے' اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ''سارے قرآن تے کن عمل کیتا'' کہا ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (2:183) میں نے عرض کیا تھا کہ ''روزے فرض کیے گئے۔'' اس کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے اور کہا ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) یہ ثواب کے لیے پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں' یہ تیرہ سو سال پہلے کا حکم تھا کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (2:216) تمہیں اگر فرض قرار دے دیا گیا ہے کہ ہجوم مخالفت میں اٹھ کر حق کی حمایت کے لیے کھڑے ہونا وَ ھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (2:216) خواہ یہ تمہیں ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ جو جماعت مومنین تھی' ان پہ تو سوال ہی نہیں کہ یہ ناگوار گزرے' وہاں تو کیفیت یہ ہوتی تھی کہ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔ فوج میں انتخاب کے لیے جب کہیں چناؤ ہوتا تھا تو عمر کے اعتبار سے وہ بچے' جو چھوٹے ہوتے تھے' یہ کہنے کے لیے پنجوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے کہ قد تو ہمارا بڑا ہے' ہمیں پیچھے نہ چھوڑ جایئے۔ لذتِ شہادت کو ہم کیا جانیں! کُرْہٌ لَّکُمْ (2:216) کون تھے یہ؟ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ان اعراب سے' ان بداؤں سے' ان گروہوں سے' کہو کہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں' ان سے کہو کہ یہ اسلمنا (49:14) ہم تو اس مملکت کی شوکت سطوت کی ان چیزوں کو دیکھ کر کسی طرح سے ہم نے اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا ہے۔

قرآن تعلیم سے قبل عربوں کے ہاں جنگ و جدل کا جذبہ معرکہ اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! یہ آگئے تھے انہیں ابھی جانا تھا۔ اس میں اگلی چیز اور بڑی اہم تھی۔ یہ جو جنگ تھا' یہ تو عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' یہ تو مارشل ریس تھی' یہ تو ایک ذرا ذرا سی بات پر سو سو سال تک جنگ جاری رکھتے تھے۔ اس قوم میں یہ کیفیت کیوں ہو کہ کُرْہٌ لَّکُمْ

(2:216) انہیں جنگ ناگوار کیوں گزرے؟ یہ عجیب چیز ہے۔ اس سے پیشتر یہ جو جنگ کیا کرتے تھے تو وہ مالِ غنیمت کی خاطر کیا کرتے تھے' قیدیوں اور لونڈیوں کی خاطر کیا کرتے تھے' جوع الارض کے لیے کیا کرتے تھے' اپنے نخوت کے لیے کیا کرتے تھے' ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر بھاری ہونے کے لیے کیا کرتا تھا۔ یہ جذبات ہوتے تھے' جس کے لیے یہ جنگ کیا کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک جہاد کا جذبۂ محرکہ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اب جو جنگ آئی تو اس میں یہ تمام چیزیں' جتنی بھی تھیں' وہ ختم کر دیں' ایک ہی چیز باقی رہ گئی کہ حق کا بول بالا کرنے کے لیے جنگ کرنی ہے' نہ مالِ غنیمت آئے گا' نہ کوئی قیدی ہاتھ میں آئے گا' نہ کوئی لونڈیاں بنائی جائیں گی' کچھ نہیں' صرف حق کا بول بالا کرنے کے لیے جنگ کرنا ہوگی۔ اب آپ دیکھیے کہ اس جن گمیں سوائے ان کے کہ جن کے ایمان کا یہ تقاضا ہو' یہ جنگ تو ناگوار گزرے ہی گی۔ انہیں تو خاص طور پہ گزرے گی جو جنگ کرتے ہی اس لیے تھے کہ مالِ غنیمت ملے گا اور لونڈیاں ملیں گی۔ یہاں کے لیے ہے کہ اس قسم کی جن گ جس میں جان دینا ہے اور اس کے عوض میں تم نے اپنا خوں بہا بھی وصول نہیں کرنا' یہ جن گ واقعی انہیں ناگوار گزرے گی۔ اس لیے یہ کہا کہ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ (2:216) واہ! کیا اصول ہے؟ بظاہر یہی ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔ جو اپنا نفع نقصان نہیں سوچتا اسے پاگل کہا جاتا ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ انسان جو پاگل نہیں ہے' صاحبِ عقل و ہوش بھی ہے' کتنے فیصلے ایسے کرتا ہے' جن کے بعد وہ کہتا ہے کہ اوہو! غلط فیصلہ ہوگیا' سوچا کچھ اور تھا' ہوا کچھ اور فائدے کی سوچی تھی' نقصان ہوگیا۔ تنہا عقل کے زور پہ جو فیصلے کرنے ہیں' ان کا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے اور پھر جب معاملات ایسے ہوں کہ جن میں انفرادی طور پہ' دنیا کے معیاروں کے مطابق تو نقصان ہی نقصان ہو رہا ہو' جو فائدہ ہو رہا ہو وہ محسوسات کا نہ ہو' اس کا تعلق انسان کے ایمان سے ہو' اس میں تو فیصلہ کرنا ان لوگوں کے لیے جو ان محسوسات کے اوپر فیصلے کیا کرتے تھے' واقعی کہیں گے کہ یہ چیز ہمارے لیے اچھی نہیں ہے یعنی كُرْهٌ لَّكُمْ (2:216)۔ کہا کہ تم کیا جانو کئی فیصلے تم اپنے لیے کر لیتے ہو' جو بظاہر سمجھتے ہو کہ بڑے فائدے کے ہیں آخر میں وہ نقصان کے ہوتے ہیں۔ اگر تم ایسے مقام پر وحی سے مشورہ کر لیا کرو تو اس کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں ہوگا' جس کا نتیجہ تمہارے لیے نقصان ہوگا۔ اس لیے خود فیصلے نہ کیا کرو' ایسے مقام پر وحی کی روشنی سے پوچھا کرو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (2:216)۔ دیکھا کیا بات کہہ گیا قرآن! یہاں علم کی تنقیص نہیں کی گئی کہ علم شے ہی کچھ نہیں ہے۔ علم کی تو قرآن نے بڑی تاکید کی ہے اور بڑا اہمیت بتائی ہے۔ کہا کہ یہ مقامات جہاں ایک طرف دنیاوی نقطۂ نگاہ سے مفاد ہی مفاد نظر آ رہے ہوں اور دوسری طرف دنیاوی نقطۂ نگاہ سے بظاہر نقصانات ہی نظر آ رہے ہوں' ایسے مقام پر صحیح فیصلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہوتی۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر

عقلِ خود بیں اور عقل جہاں بیں کے فرق کو عملی طور پر واضح کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدے کا حکم

ہر عقل اپنے فائدے کی سوچتی ہے' خدا کی جو عقلِ کل ہے وہ پوری مخلوق کے فائدے کا سوچتی ہے۔ خدا تو رب العالمین ہے۔ گھر کا جو بزرگِ خاندان ہے' صحیح الفہم' اچھے کریکٹر کا' وہ پورے گھر کی بہبود کو سوچتا ہے۔ اس میں ایسے بیٹے پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں روز ہمارے سامنے ہیں' جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے فائدے کی سوچتا ہے تو گھر تہس نہس ہو جاتا ہے۔ باپ پورے گھر کا سوچتا ہے۔ افراد سوائے خاندان' اقوام اپنے اپنے فائدے کی سوچیں گے۔ رب العالمین پوری انسانیت کے فائدے کی سوچے گا۔ یہاں کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:216)۔ تمہارا علم محدود ہوتا ہے' تمہارے اپنے مفاد کے تابع چلتا ہے' خدا کا علم ایک تو بلند ہوتا ہے اور پھر اس کے سامنے پوری عالمگیر انسانیت کا مفاد ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے مقام پر اس سے پوچھا کرو' خود فیصلے نہ کرنے بیٹھ جایا کرو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جن لگنے دوران میں اگر سیز فائر ہو جائے' جنگ تھوڑے عرصے کے لیے بند ہو جائے تو وہ جو جذبات میں انتقام کی' نفرت کی' غصے کی شدت ہوتی ہے۔ وہ کم ہو جایا کرتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لیے ایک بین الاقوامی اصول دیا تھا کہ سال میں چند مہینے ایسے مقرر کر دیئے کہ جن میں خود بخود جنگ ختم ہو جائے' کم از کم ملتوی ہو جائے۔ انہیں شہر الحرام کہا جاتا ہے کہ یہ حرمت والے مہینے ہیں۔ تین مہینے تو یہ حج کے ساتھ ذیعقد' ذی الحج اور محرم ہیں اور ایک رجب ہے۔ جب سورہ التوبۃ میں آئیں گے تو میں عرض کروں گا کہ یہ مہینے اس زمانے میں کیوں رکھے گئے۔ یہ ایک انٹرنیشنل کنونشن ہے' یاد رکھیے! ایک بین الاقوامی معاہدہ ہوگا' مقابل کی دوسری قوم جو فریقِ مقابل ہے' جو دشمن ہے' وہ اس کے اوپر راضی ہوگا تو جب ہے۔ ورنہ اگر یہ ہو کہ آپ تو جنگ بند کر کے بیٹھ جائیں اور وہ جنگ کرتا ہے' اس میں تو آپ پٹ جائیں گے۔ یہ چیزیں بین الاقوامی کنونشن کہلاتی ہیں' سورۃ التوبۃ میں اس کا ذکر آئے گا' وہاں میں گزارش کروں گا۔ یہاں کہا ہے کہ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّہۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡہِ (2:217) حرمت کے مہینوں کے اندر' جنگ کے متعلق تجھ سے اے رسول! یہ پوچھتے ہیں کہ اوہ! ان میں جنگ؟ قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ (2:217) جب کنونشن ایک ہو گئی اور دوسرے فریق نے بھی اس کو مان لیا تو پھر اس میں جنگ چھیڑنا جرم عظیم ہے۔ وَ صَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ کُفۡرٌۢ بِہٖ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَ اِخۡرَاجُ اَہۡلِہٖ مِنۡہُ اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰہِ (2:217)۔ کہا کہ یہ چیز تو ٹھیک ہے لیکن فریق مقابل اگر اس پہ نہ آئے وہ بدستور خدا کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو رہا ہو' مسجدِ حرام کی حرمت بھی وہ نہ رکھے' وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالے' تو یہ جرم' اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰہِ (2:217) اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ (2:217) فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید ہے' سنگین جرم ہے۔ فتنے کی بہت سی نوعیتیں ہو سکتی ہیں لیکن

قرآنِ کریم نے نہیں ابھی، جو بنیادی فتنہ ہے، اس کا ذکر یہاں کر دیا۔

مظلوموں کے اوپر ظلم کو روکنے کی خاطر جنگ کی اجازت اور اس کا نتیجہ

میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا، جب جنگ کی بات آئی تھی کہ قرآنِ کریم نے سورۃ الحج، میں جو کہا ہے کہ تمہیں اجازت دی جاتی ہے، اب جنگ کرنے کی ان لوگوں کے خلاف کہ جنہوں نے تمہارے خلاف جنگ کی، تمہیں گھروں سے نکالا، تمہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے، خدا کے راستے میں سنگ گراں بن کے حائل ہو جاتے ہیں، مظلوموں کے اوپر ظلم و استبداد روا رکھتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہا کہ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ انسانوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں سے دوسرے بڑھنے والی جماعتوں کے استبداد کو نہ روکے، تو دنیا میں کوئی مندر، کوئی گرجا، کوئی صومعہ، کوئی راہبوں کی کوٹھڑی، باقی نہ رہے۔ مسلمان کا وہاں میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہو کر جانا ہے تاکہ غیر مسلموں کے معبدوں کی حفاظت کرے۔

مذہبی آزادی کی اہمیت دین میں جبر اور ہمارے ہاں قتل مرتد کا غیر قرآنی تصور کی نوعیت

مذہبی آزادی کی یہ اہمیت ہے، قرآن کی رو سے۔ ایمان ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس میں Conviction (یقین) ہونی چاہیے دل و دماغ کا پورا اطمینان سکون اس سے ایک چیز کو ماننا۔ اب یہ جو کہا ہے کہ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ (2:217) فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے۔ سینے کہ فتنے کی خود یہاں قرآن نے کیا تفصیل دی کہا کہ وَ لَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ (2:217) یہ لوگ جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کے خلاف تم جنگ جاری رکھو، یہ تمہارے خلاف جنگ سے رکیں گے نہیں کہا کہ حَتّٰی یَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِکُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا (2:217) تا آنکہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا کر وہیں پھر نہ لے جائیں، جہاں سے تم چلے تھے، اگر ان کے بس میں ہو۔ یعنی دین کے معاملے میں یہ جبر کریں گے۔ یہ ہے فتنہ۔ دین کے معاملے میں جبر یہ فتنہ ہے اور جبر کرنے والوں کے خلاف کہا کہ یہ جو جنگ ہے یہ شہرِ حرام سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کیا دین میں جبر ہوتا ہے؟ سینے! آپ کے ہاں ایک لفظ اسے مرتد کہتے ہیں۔ ارتداد ہے دین سے پھر جانا۔ یہ لفظ یہاں آیا ہے، میں پہلے یہ عرض کر دوں، پھر گزارش کروں گا کہ ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ پھر اس کو سن لیجیے دین میں جو جبر ہے۔ قرآن نے وَ الۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ کہاں ہے۔ وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (2:217)۔ جو دین سے پھر جاتا ہے اور اسی حالت میں کفر کی حالت میں ہی مر جاتا ہے، اس کے دنیا میں بھی اعمال غارت ہو جاتے ہیں، آخرت میں بھی اس کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے، یہ بتایا ہے کہ جو دین سے پھر جاتا ہے، اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں اور پھر وہ بایں حالت مرتا ہے کہ وہ کفر پہ ہوتا ہے وہ

جہنم میں جاتا ہے۔ یہ ہے یہاں بھی اور دیگر مقامات میں بھی اور ہر جگہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں زبردستی کسی سے کرنا' جبر کرنا' یہ ہے فتنہ ہے جو جنگ سے زیادہ سنگین جرم ہے۔

مذہبی دنیا میں مرتد کی سزا قتل کا تجزیہ

عزیزانِ من! یہ ہے قرآن کی تعلیم اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں کی تعلیم شریعت کی کیا ہے؟ یہ کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ مرتد کسے کہتے ہیں؟ جو مسلمان اسلام سے پھر جائے' اس کی سزا قتل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی آزادی رہی' یہاں دین میں یعنی غیر مسلم اگر غیر مسلم کی حیثیت سے رہتا ہے تو وہ اہل ذمہ ہے' اس کی جان' مال' عزت' عصمت کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پہ عائد ہوتی ہے۔ اس کے مندروں کی' اس کی پرستش گاہوں کی' حفاظت یہ اپنا خون دے کر کرتے ہیں اور اگر اس کی قسمت نے پلٹا لیا اور وہ مسلمان ہو گیا' اب اس کے بعد اس کی ساری آزادی سلب ہو گئی ''چل تاں بچو کتھے جاناں ایں ❶''۔ یعنی یہ ون وے ٹریفک ہے' اس میں باہر تو آ تو سکتا ہے' اس میں واپس نہیں جا سکتا۔ آپ غور فرمالیں۔ زندگی کے باقی حصے میں اب کوئی اس کے لیے راہِ فرار نہیں' کوئی چوائس باقی نہیں' کوئی انتخاب باقی نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ اعلانیہ کہہ دے کہ صاحب! میں مسلمان نہیں رہتا۔ یہاں ساری بات وہ آتی ہے۔ اعلانیہ کہہ دینا مسلمان نہیں رہتا ہندو ہو جائے' عیسائی ہو جائے' وہ تو یہ ہوا کہ اس نے چھوڑ دیا اپنا مذہب! جی نہیں۔ ان دین کے اجارہ داروں کے نزدیک اگر اس کا کوئی عقیدہ ایسا ہو گیا ہے جو ان کے معیار پہ پورا نہیں اترتا' اس پہ کفر کا فتویٰ عائد کریں گے' اسے مرتد قرار دے دیں گے۔ یہ آج تو بہر حال وہ جو (اکبر الہ آباد: 1921-1846) اپنے انداز میں کہہ گیا تھا کہ:

دل کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

---

❶ جاؤ تو بچُّو! کہاں تک بھاگتے ہو!

بغداد کی گلیوں میں مرتد کی سزا میں بہنے والا خون اپنے اندر ہماری ذہنی پستی کا ایک زندہ ثبوت ہے

اس دور میں تو غیر مسلموں کی حکومت نے یہاں آ کر اتنا کیا تھا کہ ''پھانسی نہ پاؤ'' جب تک آپ کی وہاں حکومت قائم رہی ہے' تاریخ کیا وراق سے پوچھیے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے مسلمان کا کتنا خون بہا ہے۔ پھر انہوں نے غیر مسلموں کے مقابلے میں تو جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ تلوار ہی چلانی تھی جب گھر بیٹھے ہیں ''نال گوانڈی اے تے اوتھوں کیوں نہ جائے آدمی ❶''۔ اور وہاں تو اپنی جان کا بھی خطرہ تھا' اس کے ہاتھ میں بھی تو تلوار ہوتی تھی یہاں پہلے مرتد کا تو ہاتھ باندھ دیتے تھے۔ پوچھیے بغداد کی گلیوں سے' اور ان کی نالیوں سے'

صدیوں تک اس کے اندر مسلمانوں کا خون کس طرح بہا؟ یہ کس جرم میں بہا؟ اس ارتداد میں کہ ان میں سے وہ تھے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن خدا کی طرف سے قدیم نہیں۔ آپ کہیں گے یہ بھی کیا بات ہوئی؟ ٹھیک ہے' آج تو آپ یہ کہیں گے کہ کیا بات ہوئی' ان سے پوچھیے۔ اس ایک ایشو (مسئلے) کے اوپر مرتد کا کتنا خون بہا ہوتا ہے۔ آپ سمجھے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ جسے مرتد قرار دیدیا جائے پھر تو جس کا جی چاہے' اس کو قتل کر دے' یہ جرم ہی نہیں ہوتا۔ کون مرتد قرار دے؟ جس کا جی چاہے مرتد قرار دے' مولوی صاحب جو بن گئے۔ وہ مرتد قرار دے' اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ ہے آپ کے ہاں ارتداد' یہ ہے جسے مرتد کہتے ہیں۔ اس کے متعلق جو فیصلہ یہ کر دیں کہ اس کے عقائد صحیح نہیں رہے' یہ صحیح العقیدہ نہیں رہا' اس کے بعد یہ فتویٰ ہوا' وہ ہوا کفر کا فتویٰ۔ کفر کا لازمی نتیجہ اگر یہ مسلمان ہے تو یہ مرتد ہو گیا۔ یعنی یہ پیدائشی کافر ہیں' پشتینی کافر ہیں' چلے آتے ہیں' کافر پختہ سے پختہ تر' مگر ان کے خلاف کچھ نہیں لیکن اگر کسی مسلمان کا کوئی عقیدہ ان کے معیار کے خلاف چلا گیا تو کفر ہو گیا۔ اچھا بھئی! اس کو کافروں کی لسٹ میں شمار کر لو' اپنی برادری سے نکال دو؟ نہیں صاحب! نکل کیسے سکتا ہے؟

---

❶ ساتھ ہمسایہ ہے تو وہاں آدمی ساتھ کیوں نہ جائے۔

عید قربان کے دن مرتد ہونے والے کو جانور کی جگہ انہیں قربان کیا جاتا تھا

عزیزانِ من! کھالیں کھنچوائیں گئیں' زندہ جلائے گئے' ریتیوں سے رگڑ رگڑ کر سینوں کو ان کی جان لی گئی۔ ان کو رکھ لیا جاتا تھا' عید قربان کے دن' صبح بکرے کی جگہ کی قربانی کی جاتی تھی۔ ان میں بڑے بڑے جید علما بھی تھے۔ یہ ہے آپ کی تاریخ' اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ تو وہ تھا کہ ایک ہندو تھا یا عیسائی تھا' وہ مسلمان ہوا' پھر واپس اپنے سابقہ مذہب پہ نہیں جا سکتا۔ ایک دفعہ تو اس نے یہ اپنا چوائس Exercise کیا' ناحق انتخاب کیا' اب دوبارہ اس نہیں جا سکتا۔ جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا' اس نے تو پہلی دفعہ بھی اپنا یہ حق استعمال نہیں کیا یعنی وہ اپنے اختیار سے اسلام لایا ہی نہیں۔ اس کا بھی عقیدہ اگر یہ خلاف گیا تو مرتد ہے۔ بڑا افسوس ان لوگوں کو ہے کہ شریعت کا یہ قانون آج نافذ نہیں ہے۔ بڑی حسرت سے آہ بھر کے کہتے ہیں۔ پاکستان کے خطۂ زمین میں ان کی بڑی کوشش کہ قانونِ شریعت نافذ ہو۔ قانونِ شریعت نافذ ہوا' اب یہاں تو سوائے ان چند کے جو غیر مسلم ہیں' جن کو Protection (حفاظت) دینی آپ کا ذمہ ہوگا' مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی۔ یہ باقی سارے تو مسلمان ہیں۔ اب یہ مسلمان اگر ان کے اس معیار یا عقیدے کے اوپر پورے نہ اتریں تو پھر کیا کیا جائے؟

ہم نے تو اپنے ہاں مرتد کی سزا قتل کی قانون سازی پہلے ہی تیار کر رکھی ہے

آپ دیکھیے کتنا اہم مسئلہ ہے اور جن کے دل میں دین کا درد ہے' یہاں وہ نظام قائم ہو یا نہ ہو' شریعت کا نفاذ آئے یا نہ آئے' انہوں نے فیصلے تو کر رکھنے ہیں۔ ایسے وقت میں فوراً بیٹھ کر فیصلہ کرنا ہے ''ہوروی تے کئی کم ہون گے اوس وقت کرن والے ❶ ۔'' یہ جو ہیں' یہ فیصلے پہلے کر لیے ہوئے ہیں۔ یہ ہے ''مرتد کی سزا' اسدی قانون میں'' پمفلٹ میرے پاس یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1903-1979ء) نے لکھا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ آ گیا کہ یہاں جب یہ نظامِ شریعت قائم ہو گیا تو اس وقت اس مسئلے کی پوزیشن کیا ہوگی؟ کہتے ہیں کہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو'ہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں' وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا ابقاعدہ اظہار کر کے' ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ سارے Convert (تبدیلی مذہب) ہو کر ہندو ہو جاؤ' عیسائی ہو جاؤ' ان کی یہاں Majority ہو جائے اور نظام یہ جمہوری قائم کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ کے ہاں یہ ہو کیا رہا ہے؟ فیصلے ہیں شریعت کے' ایک سال کے اندر اندر ان کو کہہ دیا جائے کہ صاحب غیر مسلم ہو گئے' بچ گئے بہر حال' اور بچ جانے کے بعد جو یہ کریں گے' آپ کو معلوم ہے جمہوریت کے تابع ہوگا۔ خیر نکل جاؤ۔ اس مدت کے دوران فیصلہ کیجیے کہ آپ نے باہر نکل جانا ہے یا یہیں رہنا ہے' پیپر آؤٹ ہونے کے بعد فیصلہ کرنے کا حق آپ کو نہیں دیا جا سکتا' پہلے فیصلہ کر لیجیے ''کہ رہنا جے کہ نکل جانا جے ❷ ۔'' اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں' مسلمان سمجھا جائے گا۔ الحمدللہ خوش ہوئے' آپ کو مسلمان تو سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین ان پر نافذ کیے جائیں گے' فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور الحمدللہ خوش ہوئے' آپ کو مسلمان تو سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین ان پر نافذ کیے جائیں گے' فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا' اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے' بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح سے نہ بچائے جا سکیں' انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔'' تے رہ کیہڑے جان گے ❸ ۔'' اکبر الہ آبادی (1846-1921ء) نے جو کہا تھا۔

---

❶ اس وقت کرنے والے اور کام بھی تو ہوں گے۔

❷ یہاں رہنا ہے کہ نکل جانا ہے۔

❸ تو پھر بچیں گے کتنے۔

سب ہو چلے ہیں اس بتِ کافر ادا کے ساتھ

رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ

''آجیہڑے باقی بچ دے نیں نااوہناں نال اسلامی نظام قائم کرن گے ❶ ۔'' عزیزانِ من! ہنس لیجیے' چار دن ہنسنے کی مہلت آپ کو مل گئی۔ قائم ہونے دیجیے ان کا نظامِ اسلامی۔ سال بھر کی مہلت ہے' اس کے بعد یہ فیصلہ موجود ہے۔ یہ چیزیں پہلے سے طے کر لی گئی ہیں۔

---

❶ یہ جو بچ جاتے ہیں' یہ ان کے ساتھ اسلامی نظام قائم کریں گے۔

مذہب کی دنیا انسان کو اس کے اختیار و ارادہ سے محروم کر دیتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ (2:256) دین میں اکراہ و جبر نہیں ہے۔ جبر ہی انسان پہ کرنا تھا تو خدا پہلے دن سے اسے مجبور ہی پیدا کیوں نہ کرتا۔ بکری مجبور ہے' اس دین پہ رہنے کے لیے جس پہ اسے پیدا کیا ہے' شیر مجبور ہے' اس دین پہ رہنے کے لیے۔ انسان مجبور نہیں ہے۔ آپ نے غور فرمایا اور یہ ہے آپ کے ہاں کا مذہب اور شریعت جو غیر مسلموں کے ہاں انہیں مسلمان بنانے کا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ آپ کے متعلق یہ کچھ لکھیں کہ یہ ظلم ہے کہ مسلمان ہو کر اگر کوئی پھر کفر کی طرف پلٹ جائے تو اس کی سزا قتل ہے اور آپ ان کی کتابوں کو بین کر دیں' یہ سارا کچھ جو ہے' یہ اپنے ہاں ان کی تعلیم دیتے چلے جائیں۔ اب آپ نے یہ دیکھا ہے کہ جتنے بھی یہ دینی مدارس کے پڑھے ہوئے علمای امولوی صاحب ہیں' ہمیں' آپ کو دیکھ کر' ان کی مالتے پر شکن کیوں پڑ جاتے ہیں۔ غصہ اس میں کم ہوتا ہے' انہیں اس وقت یہ حسرت ہوتی ہے کہ دین کا نظام نہیں ورنہ یہ چلتے پھرتے نظر نہ آتے' اس پہ ان کو غم ہوتا ہے کہ ''اے زندہ کیوں پھرن ڈیا ہیگا اے۔ اچھا بچوں چار دن کر لا موج ❶ ۔'' وہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ یوں ان کو اس چیز کے اوپر غصہ آتا ہے۔

---

❶ یہ زندہ کیوں چل پھر رہا ہے (کہتے ہیں کہ) اچھا بچو! چند دن اور گھوم پھر لو۔

مکافاتِ عمل کا ترازو کسی کا کوئی عمل نظر انداز نہیں کرتا

برادرانِ عزیز! قرآن نے تو سیدھا کہا کہ وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ھُوَ کَافِرٌ (2:217) ٹھیک ہے جو دین سے پھرتا ہے' پھرے' اس کے بعد کفر کی حالت میں مرے' بس اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے اعمال غارت ہوئے' بے نتیجہ رہ گئے۔ تو ٹھیک ہے اعمال تو اس نظام کے اندر نکلنے تھے۔ ٹھیک ہے قبل از وقت سروس چھوڑ دی' وہاں سے اس نے ریٹائرمنٹ لے لی' جتنیس روس کی ہوئی تھی اس کا بھی جو پنشن کے اوپر استحقاق تھا' ختم ہو گیا فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ (2:217) ارتداد کا

ایک اور ریفرنس لے لیجیے کہا ہے کہ یایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ (5:54) اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی اس دین کو چھوڑ کر پلٹ جائے گا' خدا کا کیا بگاڑے گا' اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کی کوئی Voting Strngth (قوتِ ووٹ) کم نہیں ہو رہی ہے کہ صاحب! یہ اپنی ووٹیں دوسرے کے ہاں جا کر اس کو دے دیں گے اور وہ پریزیڈنٹ ہو جائے گا اور وہ رہ جاؤں گا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ (47:38)۔ یہ دوسری جگہ کہا ہے وہاں بھی یہی چیز ہے کہ جو کوئی اس میں سے پھر جائے گا تو اس کے بعد ہمارا کیا بگاڑے گا۔ ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں' تم ہمارے محتاج ہو۔ یہاں کہا ہے کہ جو یہ پھر جائے گا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38) تو تمہاری جگہ ایک اور قوم پھر آ جائے گی۔ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ (5:54) یہ خدا کی طرف کشش سے کھنچے جائیں گے' خدا ان کی طرف کھنچا آئے گا۔ کیا ہوگی اس قوم کی خصوصیت جو پھر تمہاری جگہ آ جائے گی؟ اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ (5:54) آپس میں بھائیوں کی طرح' ریشم کی طرح نرم' حق کی مخالفت کرنے والے کے مقابلوں میں چٹان کی طرح سخت۔ یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (5:54) خدا کے راستے میں ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہو۔ وَ لَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ (5:54) یہ چیز نہیں ہوگی کہ صاحب! ایسا کرنے میں یہ قوم کیا کہے گی' وہ کیا کہے گی۔ حق کی مدافعت میں کوئی کسی قسم کی کوئی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوگی۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ (5:54) یہ ہے وہ خدا کا فضل جو لین اچاہتا ہے' آگے بڑھے اور لے لے وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (5:54) بڑی وسعتوں والا اور بڑے علم والا ہے۔ جو قوم جاتی ہے جائے وہ خدا کا کیا بگاڑ لے گی۔ یہ ہے وہ قوم جو یہاں کہا گیا ہے یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (5:54) برادرانِ عزیز! آگے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (2:218) جو لوگ اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر یقین رکھیں' وَ ہَاجَرُوۡا اور ہجرت کرتے ہیں' اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں کہ ایک جگہ کو' وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن کی طرف چلے جانا لیکن یہ اس کے محدود معنی ہیں۔ اس کے وسیع معنی یہ ہیں کہ اس مشن کی کامیابی کے لیے جو کچھ چھوڑنا پڑے' اسے چھوڑ دیا جائے۔ اب کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی کشش انسان کے راستے میں خاردار جھاڑیاں بن جاتی ہیں۔ ان میں خاص طور پہ مال اور اولاد کی کشش ہے۔ اسی مقام پہ قرآن نے کہا ہے کہ یاد رکھو! ایسے مقامات آئیں گے' جہاں تمہارے بیوی بچے تمہارے لیے تمہارے دشمن بن جائیں گے' فتنہ بن جائیں گے' تمہارے دامن کو یہ خاردار جھاڑیاں الجھا لیں گی۔ ایسا مقام آئے جہاں ان دونوں میں Tie (ٹکراؤ) پڑتی ہو' مومن ہر اس چیز کو چھوڑ دیتا ہے' ترک کر دیتا ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ وطن اس میں سے صرف ایک گوشہ ہے کہا ہے کہ وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (2:218) اللہ کے راستے میں ہمیشہ جدوجہد کرتے ہیں۔ میں

نے عرض کیا تھا کہ جہاد مومن کی زندگی کا اسوب ہے' اس کی ساری زندگی جہاد میں گزرتی ہے۔ جدوجہد اس کے معنی ہیں' سعی وکاوش اس کے معنی ہیں۔ حق کے غلبے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے چلے جانا یہ اس سے مراد ہے۔ اس کی آخری کڑی ہے جسے قتال کہتے ہیں یعنی میدانِ جنگ میں جانا۔ قتال جہاد کی کڑی ہے' جہاد کا ہر گوشہ قتال نہیں ہے کہا ہے کہ وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰه (2:218) یہ ہیں جو خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (2:218) اس میں یہ دونوں چیزیں ہیں: وہ سامان حفاظت بھی دیتا ہے (غفور) اور سامانِ نشوونما بھی دیتا ہے۔ (رحیم)

ہجرت کے سلسلے میں صدرِ اوّل کی ایک بے مثال اور پھر اس کا ماحصل

ہجرت' وطن چھوڑنا' مال ودولت چھوڑنا' مکانات وجائیدادیں چھوڑنا اور بہت سی اور چیزیں چھوڑنا' جن کے ساتھ دل وابستہ ہے' صدرِ اوّل میں ہجرت کی جو مثال ہمارے سامنے آئی ہے' وہ یہ ہے کہ خاوند بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلے آئے' بیویاں خاوندوں اور بچوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس طرح چھوڑ کر آنے سے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ کہا کہ اس چیز سے ڈرو نہیں۔ یہ چیز اگر تم ایک نظم (Order) کے تابع' ایک نظام کی خاطر' آج کرو گے تو خدا تمہیں سامانِ حفاظت بھی بہم پہنچائے گا اور سامانِ نشوونما بھی دے گا۔ یہ سب چیزیں حاصل ہوں۔ یہ جو قرآن نے دعویٰ کیا تھا' اس دعوے کی تصدیق اس صداقت کا ثبوت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی مدنی زندگی میں بہم پہنچا دیا۔ کس بے سروسامانی کے عالم میں وہاں سے نکلے تھے کہ راستے میں اس جماعت کا سب سے بڑا سربراہ اور آج کی اصطلاح میں Next in Command' خود نبی اکرم ﷺ تھے اور حضرتِ صدیق اکبرؓ آج کی اصطلاح میں جنہیں آپ عوام کہتے ہیں' وہ نکلے' اس کو چھوڑ دیجیے' یہ بھی جو نکلے ہیں' ان کی بھی کیفیت یہ تھی کہ اس طرح سے چھپتے چھپاتے ہوئے رات کی تاریکی میں نکلے۔ جونہی نور کا تڑکا ہوا تو ایک غار کے اندر چھپے۔ پاس دو وقت کے کھانے بھی نہیں تھا' اس کا انتظام بھی کسی طرح سے خفیہ ہوتا تا۔ ان حالات میں یہ پوری جماعت وہاں سے نکل آئی۔ سات ہی سال کے عرصے کے اندر یہ بے سروسامان جماعت' تہذیب وتمدن کی جن بلندیوں پہ پہنچی' اس کو تو چھوڑ دیجیے' محض دنیاوی نقطۂ نگاہ سے یہ جماعت دس لاکھ مربع میل سلطنت کی واحد مالک تھی۔ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (2:218) یہ سامانِ حفاظت دیا تھا۔ یہ یہ نہیں تھا کہ صرف محفوظ تھے' ان کے ایک طرف ایران جیسی سلطنت تھی' دوسری طرف رومن امپائر تھی' یہ نہیں تھا کہ یہ ان کے ہاتھوں سے محفوظ تھے' وہ اپنے ہاں بیٹھے ہوئے ان سے ڈر کر کانپا کرتے تھے۔ یہ بے سروسامان جماعت تھی۔ حق کی خاطر اٹھ کر دیکھو تو سہی کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

اس ہجرت کرنے والوں نے اپنی تقدیر کے علاوہ قیصر و کسریٰ کی تقدیر بھی بدل کر رکھ دی

انسان کو پتہ ہی نہیں کہ اس کے اندر کتنی قوتیں مضمر ہوتی ہیں اور وہ قوتیں اس وقت نمود کر کے اوپر آتی ہیں جب یہ کسی ذاتی منفعت کے بغیر صرف حق و صداقت کے لیے کہیں اٹھ کر کھڑا ہو کر آ جائے۔ وہاں تو ''نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔'' انہوں نے بدل کر بتا دیں، اپنی تقدیریں ہی نہیں بدل کر بتائیں، دنیا میں جو بڑی بڑی دو عظیم سلطنتیں تھیں، انہوں نے ان ہجرت کرنے والوں نے، ان جہاد کرنے والوں نے، ان کی تقدیریں بدل کر بتائیں۔ یہ تھی وہ قوم جو قرآن پیدا کرنا چاہتا تھا اور ان کے لیے ہی مغفرت تھی، ان کے لیے ہی مرحمت تھی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 218 تک آ گئے۔ وقت اگرچہ پانچ چھ منٹ باقی ہے، مگر آگے جو بات شروع ہوتی ہے، وہ اتنے میں ختم نہیں ہوگی۔ وہ ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ (2:219) خمر اور میسر کے متعلق تجھ سے پوچھتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے عام ترجمے میں شراب اور جوا کہا جاتا ہے۔ بات اس سے کہیں زیادہ گہری ہے، اس لیے یہ اچھا نہیں کہ بات چھیڑ دی جائے اور اسے یونہی تشنہ چھوڑ دیا جائے۔ آج ہم یہیں ختم کر دیتے ہیں۔ اسے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

پینتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3)' (آیات 219 تا 221)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ ؕ قُلۡ فِيۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا
يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى ؕ
قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ ؕ وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا
الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓـئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ
وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1969ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کے سلسلہ نو میں آج سورۃ البقرۃ کی آیت 219 سے آغازِ کلام ہوتا ہے: (2:219)۔

قرآن حکیم کرہ ارض پر ایک نئے نظام کے ساتھ ایک نئی سوسائٹی کی بنیاد مہیا کرتا ہے

بات چلی آ رہی تھی کہ قرآن ایک نئے نظام کی تشکیل چاہتا ہے' ایک نئی سوسائٹی مرتب کرتا ہے۔ اس سوسائٹی کے ممبر بننے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ممبر کو ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے ہوتے ہیں' جسے اسلام لانا کہا جاتا ہے اور وہ اقرار نامہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111) وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ جنت کے عوض بیچ دیتا ہے۔ یہ ہے وہ آج کی اصطلاح میں ممبر شپ کا فارم' جسے پُر کرنے کے بعد ایک شخص اسلامک سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے یا مسلمان ہوتا ہے۔ اب اس میں یہ چیز بتدریج انتہا تک پہنچتی ہے یعنی اس معاشرے کو جتنی ضرورت ہوتی ہے' اس کے مطابق وہ ان چیزوں کو لیتا جاتا ہے۔ مال کی جتنی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اتنا ہی لیتا ہے' جان کی جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ اس وقت لیتا ہے اور انتہا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی' اس کی ضمانت پہ معاشرہ دے دیتا ہے اور پھر اسے اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ کوئی فالتو سرمایہ یا روپیہ اپنے پاس رکھے۔ یہاں تک اس نے پہنچانا ہوتا ہے یہ اس کی ایک آخری حد ہے۔

قرآنی معاشرے کی تشکیل میں خمر اور میسر کی پیدا کردہ موانعات کی تفصیل

یہاں تک پہنچانے سے پیشتر قرآن یہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کے راستے میں کون کون سے موانعات آتے ہیں' کون سی ایسی چیزیں

ہیں جو انسان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں' اسے اِدھر آنے نہیں دیتیں۔ اس مقام پر اس نے اس میں دو باتوں کا ذکر کیا کہا ہے کہ یَسْـئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْـمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا(2:219)خمر اور میسر کے متعلق تجھ سے پوچھتے ہیں۔ خمر کا عام طور پر ترجمہ شراب کیا جاتا ہے اور میسر کا ترجمہ جوا کیا جاتا ہے۔ اس مین شراب اور جوا آ جاتے ہیں لیکن یہ صرف شراب اور جوے کی بات نہیں ہے' ان کا دائرہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ خمر ہر وہ شے ہے جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ دے۔ اسے خمار یا خمر کہا جاتا ہے۔ خمار کہتے ہی ''اوڑھنی کو'' ہیں یعنی دوپٹے کو' سر پہ اوڑھنے والی چادر کو' ڈھانپ دینے والی شے کو۔ ہر وہ شے جو عقل پر پردہ ڈال دے وہ خمر میں آ جائے گی۔ یہ تو وہ شے ہے جو طبعی طور پر استعمال کی جاتی ہے اور اس سے عقل پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔

انسانی عقل و شعور اور فہم و فراست کو سب سے زیادہ ڈھانپنے والی شے انسان کا اپنا خود ساختہ مذہب ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! اب بیسیوں چیزیں ایسی بھی تو ہیں جو کھائی پی تو نہیں جاتیں لیکن وہ عقل کو ماؤف کرتی ہیں' وہ ان نشہ آور چیزوں سے بھی زیادہ ماؤف کرتی ہیں۔ جسے مذہب کہا جاتا ہے' اس میں سب سے بڑی عقل پر پردہ ڈالنے والے کی چیز تو وہ ہے جس کی بنیاد اس پہ ہے کہ ''مذہب کے معاملے میں سمجھ' فکر' عقل اور سوچ کا کوئی دخل نہیں ہے۔'' یہ شرابی تو پھر بھی کبھی کبھی ہوش میں آ جاتا ہے' یہ مذہب پرست تو کبھی ہوش میں آ ہی نہیں سکتا۔ جس دن یہ ہوش میں آئے' اس دن فتویٰ لگ جاتا ہے کہ یہ مرتد اور ملحد ہو گیا۔ یہ چیز' جو عقل کو ماؤف کر دے' اسے خمر کہا گیا ہے۔ ہر نشہ آور شے' جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس کے اندر آ جاتی ہے۔ ان کے ہاں اس زمانے میں شراب ہی ایک ایسی نشہ آور چیز تھی' اس لیے اس لفظ کا استعمال شراب پہ بھی ہوتا ہے۔

انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے برعکس قرآنی معاشرے کی بنیادی خصوصیت عقل و شعور اور فہم و فراست اور جلا بخشنے پر ہوتی ہے

پہلی چیز تو جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ عقل کو ماؤف کر دینے والی ہے۔ لہٰذا یہ جو نیا معاشرہ متشکل ہو رہا ہے' جو نئی سوسائٹی بن رہی ہے' اس کی تو بنیادی ہی عقل' فکر' شعور اور Reason اور Rationalism پہ ہے۔ لہٰذا ہر وہ شے جو عقل و فکر کو ماؤف کرتی ہے' اس سے اجتناب ضروری ہے۔

مالی تعاون حاصل کرنے کے لیے مذہب کی تکنیک

عام طور پہ آپ نے دیکھا ہوگا جب چندے کی اپیلیں کی اجتی ہیں تو خالص جذبات کو اپیل کی جاتی ہے‘ کلائمکس پہ پہنچا کر جذبات کو ابھارا جاتا ہے‘ یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے خمر کا۔ جذبات کو جب ابھارا جاتا ہے تو سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیتیں ہیں‘ وہ ماؤف ہو جاتی ہیں۔ یہ جسے تقریر کہتے ہیں‘ وہ جادو ہوتا ہے‘ جادو کے معنی یہ ہیں کہ تقریر کے ذریعے جذبات کو اتنا ابھارا جاتا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس تھوڑے سے وقت کے لیے ماؤف ہو جاتی ہے اور جب یہ ماؤف ہوتی ہے تو ان کی جیبوں کو خالی کرا لیا جاتا ہے لیکن یہاں بالکل اُلٹ چیز ہے۔ دین میں فکر اور شعور کو اتنا بیدار کیا جاتا ہے‘ ابھارا جاتا ہے کہ وہ سمجھ کر‘ سوچ کر‘ اپنی جیبوں کو خالی کرتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ ہر نشہ عارضی ہوتا ہے۔ عقل و فکر کی صلاحیتوں کو اگر بیدار اور پختہ کیا جائے تو یہ مستقل رہتی ہیں‘ انہیں میں ثبات اور استقامت رہتی ہے۔ نشے میں شراب کا ذکر‘ جسے خمر کہتے ہیں‘ پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے جسے کہا ہے کہ عقل اور فکر کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔

حیوان کے برعکس عقل و شعور کے سلسلہ میں انسانی دماغ کا عمل دخل اور اس کا نظام

ڈاکٹر حضرات بہتر جانتے ہیں یہ انسان کے جسم کا سسٹم اس قسم کا ہے کہ دماغ میں وہ خانے ہیں جہاں کوئی چیز جب اطلاعات (Information) باہر سے پہنچتی ہیں تو وہ فیصلہ کرتی ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسے آپ عقلی فکری یا شعوری فیصلہ کہتے ہیں‘ دماغ کے اندر وہ خانہ ہوتا ہے۔ باہر سے جو چیزیں دماغ تک پہنچتی ہیں جو یہ اطلاعات پہنچاتی ہیں وہ اعصاب کہلاتی ہیں Nerves کہلاتے ہیں۔ Nerves (عصاب) باہر کی ہر شے کو Convey (پہنچاتے) کرتے ہیں اور وہ دماغ کے اس خانے کی طرف بھیجتے ہیں۔ قرآن نے جو سمع‘ بصر اور فواد تین چیزیں کہیں تو سمع اور بصر تو انفرمیشن یا باہر کی چیزوں کی خبریں پہنچانے کے ذرائع ہیں اور فواد وہ مقام ہے جسے مائنڈ (Mind) کہا جاتا ہے۔ یہ دماغ کا وہ حصہ ہے جہاں وہ اس پہ غور اور فکر سے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ یہ Process (طریق) وہ ہے جس میں دماغ کا وہ حصہ ماؤف نہیں ہوتا لیکن بعض ایکشن‘ بعض عمل‘ اس قسم کے ہیں جنہیں Reflex Action (اضطراری حرکت) کہا جاتا ہے‘ وہ عقل اور فکر کی رو سے نہیں ہوتے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ مثال کے طور پر آپ کسی گہری نیند میں سونے والے کے پاؤں کے تلوے میں ذرا سی چبھن کیجیے‘ ذرا سی یونہی سرسراہٹ کیجیے‘ تو آپ دیکھیں گے کہ وہ پاؤں کھینچ لیتا ہے‘ سمیٹ لیتا ہے‘ سکیڑ لیتا ہے۔ وہ بالکل اس وقت نیند میں مدہوش ہوتا ہے‘ یہ اس کا ایکشن شعوری طور پر‘ فکری طور پر‘ نہیں ہو رہا‘ وہ جاگے گا تو اس کو بالکل نہیں علم ہوگا کہ کسی نے اس طرح سے اس کے پاؤں میں ذرا سی سرسراہٹ کی تھی اور اس نے اپنے پاؤں کو سمٹایا یا سکڑایا تھا‘ اسے بالکل پتہ نہیں ہوگا لیکن وہ یہ چیز کرے گا۔ اس میں طبعی طور پر ہوتا یہ ہے کہ سونے میں یا ایسی حالت میں جسے آپ نے نشہ کہا ہے‘ اس میں یہ جتنے اعصاب یا

Nerves ہیں' یہ ریڑھ کی ہڈی کے اندر سے پاس کرتے ہوئے دماغ تک پہنچتے ہیں لیکن دماغ تک پہنچنے سے پہلے گردن میں ایک مقام آتا ہے جہاں سونے کی حالت میں یہ نشے کی حالت میں نیچے کے اعصاب کا تعلق یا رابطہ دماغ کے اس حصے سے کٹ آف ہوجاتا ہے' منقطع ہوجاتا ہے۔ کچھ وقت کے لیے وہ چاند پہ جانے والی ٹرالی جیسے اپنے اصل راکٹ سے الگ ہوگئی تھی' وہاں وہ کنکشن ٹوٹ جاتا ہے۔ اسے نیند کہتے ہیں' اسے نشہ کہتے ہیں۔ نشے یا جیسے نیند کی حالت میں ایکشن جیسے Reflex (اضطراری) رہ جاتا ہے' شعوری نہیں رہ جاتا' فکری نہیں رہتا بلکہ وہ آٹومیٹک ایک ری ایکشن ہوتا ہے۔ Refelx Action کے بارے میں اربابِ علم تو جانتے ہوں گے کیونکہ بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں' تماشائی بھی' اس لیے مجھے بعض اوقات اس سطح پہ بات کرنا پڑتی ہے۔ Refelx Action (اضطراری عمل) یہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کسی کام میں بالکل جذب بیٹھے ہیں' یہاں آ کر مکھی بیٹھی ہے' آپ دیکھتے ہیں' آپ یوں کر دیتے ہیں یا آپ کی آنکھ کی طرف کوئی شخص یوں کرے تو آپ دیکھتے ہیں کہ آنکھ یوں بند کر لیتے ہیں۔ یہ فہم وشعور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتا' یہ Refelx Action (اضطراری فعل) کہلاتا ہے۔ اعصاب خود بخود کچھ کر دیتے ہیں۔ یہ ایکشن' جو میں نے گردن میں کہا ہے کہ ایک جوڑا ہے' اس کو جوڑ ہی کہیے' حالانکہ جوڑ تو نہیں ہوتا' کہ وہاں سے وہ سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے تو اس کے بعد اس کا یہ جتنا باقی ایکشن ہوتا ہے' اس وقت جو کچھ یہ کرتا ہے' وہ دماغ کے فہم وفراست کی رو سے نہیں کرتا بلکہ وہ Refelx Actions (اضطراری افعال) ہوتے ہیں۔

شراب کے نشے میں سرزد ہونے والی حرکات کی نوعیت اور انسانیت کی نظر میں اس کا مقام

شراب کے نشے کے اندر جو حرکتیں سرزد ہو رہی ہوتی ہیں' وہ ایسے ہوتی ہیں جیسے سونے والا سوتے میں پاؤں کو سکیڑتا ہے' ہاتھ کو اٹھاتا ہے' پتہ کچھ نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ انسان حیوان کی سطح پر آ جاتا ہے۔ حیوان کا ہر ایکشن Refelx Action (اضطراری فعل) ہوتا ہے کیونکہ اس میں فکر اور شعور کا مادہ نہیں ہوتا۔ پہلی چیز یہ ہے نشے کے اندر کہ وہ انسانی سطح سے حیوانی سطح پہ آ جاتا ہے۔ آپ سوچیے کہ دین' جس کا مقصد انسانیت کی سطح کو اتنا بلند کرنا ہے' کہ وہ **اقطار و السموات و الارض** سے بھی آگے چلا جائے' جو شخص اپنے آپ کو انسانیت کی سطح سے پست کر کے حیوانیت کی سطح پہ لے آتا ہے' دین کا اس سے کیا تعلق رہ جاتا ہے؟ یہ شراب کے نشے میں جو حیوانیت ہوتی ہے' اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان کی جو ''میں'' ہے' وہ پتہ نہیں سو گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شراب کو آپ نے دیکھا ہوگا وہ کبھی اس کے بعد اپنے آپ کو ''میں'' نہیں کہتا وہ ہمیشہ ''ہم'' کہتا ہے ''اوئے توں ساہنوں سمجھیا کی ہیگا اے ❶''۔ کبھی نہیں کہے گا ''مینوں کی سمجھیا اے۔ اوئے اسی بڑے او ہونیں ہیگے آں ❷''۔ اس کے اندر اتنا ابھار پیدا ہوتا ہے کہ ہر مقابل کی شے نہایت پست نظر آتی ہے' اپنی ''میں'' اسے تکبر اور نخوت سے بڑی زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی ''میں'' بہت بڑی بڑھ جاتی ہے۔ وہ جو مشہور ہے کہ مہاراجہ رنجیب سنگھ

(1780-1839ء) ہاتھی پہ چڑھے ہوئے جا رہے تھے' جلوس تھا۔'' کا ہنے کا چھے دا او جٹ ❸ '' شراب کے نشے میں دھت سامنے سے گزرا۔'' او کہن لگا او کانے آ! ❹ ''

---

❶ ابے! تو نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔

❷ مجھے کیا سمجھا ہے۔ ابے! ہم بڑے ''وہ'' نہیں ہیں۔

❸ وہ کانے کا چھے کا جاٹ تھا۔

❹ وہ کہنے لگا: او ایک آنکھ کے اندھے!

پہلی بات تو یہی ہے ''او کانے آ اے ٹٹو ویچنا ای۔ ہاتھی ٹٹو نظر اوندا اے۔ او کہن لگا ہاں بھئی! ویچ دیاں گے' کل سودا کراں گے ❶۔'' سپاہی کو حکم دیا' وہ پکڑ کر اس کو لے گئے' رات بھر رکھا نشہ ہرن ہو گیا۔ دوسرے دن صبح اسے دربار میں بلایا'' کہن لگا سنا بھئی! او کل والا سودا جیہڑا اہیگا او ہن پکا کرنا این ﷺ کہن لگا جی! او سوداگر لد گئے ہیگے ❷۔'' وہ تو سوداگر اسی وقت تک تھا جب یہ اپنے آپ کو ''ہم'' کہتا تھا ''او کانا نظر اوندا ہیگا سی' تے اوہدا ہاتھی اوہنوں ٹٹو نظر اوندا اسی ❸ ''۔ شراب کے نشے میں جب انسان' حیوان کی سطح پہ پہنچتا ہے' اس کی حیوانیت اتنی زیادہ ابھر آتی ہے' کہ اسے ہر شے چھوٹی نظر آتی ہے'' میں'' سب سے بڑی نظر آتی ہے۔

نظام سرمایہ داری خود بینی کی بنیاد پر استوار ہوتی' جب کہ قرآنی معاشرہ جہاں بینی سوچ کی آبیاری کرتا ہے

برادرانِ عزیز! دین وہ ہے کہ جہاں عقل و شعور اسے اس مقام پہ پہنچا دے کہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) وہ اپنے آپ کو تنگی اور ترشی کی حالت میں رکھتا ہے اور دوسروں کو اپنے آپ پہ ترجیح دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے اندر کتنا بڑا تقابل اور Contrast ہے۔ یہ جو اپنے ہی آپ کو ''میں'' سمجھنے والی بات یا چیز ہے' یہ اس راستے میں حائل ہو جانے والی چیز ہے اور دوسری وہ ''میں'' ہے۔ جس میں انسان اپنی زندگی کا مقصد' دوسروں کی فلاح اور بہبود قرار دے دے۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ پہلی صورت میں یہ ہے کہ اس نشے کے عالم میں وہ دوسرے کو ترجیح نہیں دیتا۔ پھر تو ''میں ہی میں'' ہوتی ہے۔

تصوف کی دنیا میں پرویزؒ کو نیں کی پہچان کروانے کے لیے ایک دی گئی مثال کا ذکر

تصوف کی وادیوں کو چھوڑے تو ایک عرصہ گزر گیا لیکن اس کی تعلیم میں بعض انداز ایسے دل نشین وہتے ہیں کہ وہ یاد آ جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اسی انداز سے بات سمجھاؤں۔ وہاں بھی یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ ''میں'' نہیں بلکہ دوسرے نظر آنے چاہئیں۔ وہ جو پہلی دفعہ ان کے سامنے آئے تو اس مرید نے کہا: یا حضرت! پہلا سبق دیجیے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ کمرے میں اسے بند کیا' ایک طرف ایک

کھڑکی تھی' کھڑکی میں اس نے شیشہ لگا دیا' آئینہ نہیں۔ اسے پوچھا کہ کیا کیفیت ہے؟ اس نے کہا کہ جی' دوسرے نظر آتے ہیں' اپنا آپ نظر نہیں آتا۔ اس نے کہا کہ بیٹا! یہی چیز ہے۔ دوسرے دن اس نے اس شیشے کے پیچھے سلور لگا دی' جسے چاندی کہتے ہیں۔ اب سلور جو اس کے پیچھے لگائی تو اس سے پوچھا کہ کیوں بیٹا! کیا کیفیت ہے؟ کہا کہ جی' اب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا' اس میں ''میں ہی میں'' نظر آتا ہے۔ یہ ہے وہ شے کہ جسے نشہ کہا جاتا ہے اور شراب کا نشہ تو بہت پست درجے کا اور عارضی نشہ ہے' یہ جو حکومت کا نشہ' اقتدار کا نشہ' دولت کا نشہ' پیشوائیت کا نشہ' لیڈر شپ کا نشہ ہے' یہ تو ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے نشے ہیں۔

ہے ریاض ایک رندِ مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے

---

❶ اے ایک آنکھ کے اندھے! کیا تو نے یہ ٹٹو بیچنا ہے؟ اسے ہاتھ بھی ٹٹو نظر آ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ بھئی! ہاں بیچ دیں گے مگر سودا کل کریں گے۔

❷ کہنے لگا کہ بھئی! وہ جو کل والا سودا تھا وہ اب پکا کرنا ہے (وہ جاٹ) کہنے لگا کہ وہ سودا اگر تو اب چلے گئے۔

❸ وہ (اسے ایک آنکھ کا اندھا نظر آتا اور اس کا ہاتھ اسے ٹٹو نظر آتا تھا۔

یہ وہ ہوتے ہیں پیئے بغیر جھومتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ یہ جو نشے ہیں' یہ بڑی مشکل سے اترتے ہیں۔ یوں کہیے کہ یہ اترتے نہیں ہیں' انہیں اتارا جاتا ہے۔ اب یہاں خمر پہلے کہا کہ اس کے راستے میں خمر حائل ہو جائے گا' یاد رکھو! میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے کہ طبعی طور پر لینا ہو' تو ہر وہ شے جو نشہ آور ہو' خمر میں آ جائے گی۔ اگر اسے نفسیاتی طور پر لینا ہو تو ہر وہ تعلیم' ہر وہ جذبہ' جو انسان میں عقل اور شعور کو ماؤف کر دے' اس کی ''میں'' کو بہت بڑا بڑھا چڑھا کر بتائے تو خمر میں یہ چیز شامل ہو جائے گی۔ ہر وہ شے کہ جس میں دوسرے نظر نہ آئیں' اپنا ہی آپ نظر آئے' وہ خمر میں شامل ہو جائے گی۔ انسانیت کے اوپر پردہ پڑ جائے گا' یوں کہہ دیجیے۔ اب خمر کی یوں تعریف کر لیجیے' کہ یہ طبعی طور پر ہو' ذہنی طور پر ہو' نفسیاتی طور پر ہو' یہ وہ ہے جس میں انسانیت ڈھنپ جائے اور اسے کوئی دوسرا نظر نہ آئے' میں ہی میں نظر آئے' وہ چیز خمر میں داخل ہو جائے گی۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانی نفسیات پر شراب نوشی کے اثرات اور عیسائیت میں اس کی مقبولیت کے قصے

جہاں تک خمر کے شراب ہونے کا تعلق ہے تو یہ چیز ذہن میں رکھیے کہ دین اپنے پروگرام کو انتہا تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ اس میں تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور قرآن کی آیات اس کی شہادت دیتی ہیں کہ اس میں کس قدر انسان کی نفسیات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ شراب ایک عادت ہے' اس عادت کا جسم کے نظام پہ اتنا اثر پڑتا ہے کہ یہ عادت بیک وقت' ایکا ایکی' شبا شب' چھوٹ نہیں سکتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ نبی

اکرم ﷺ کی مکے کی زندگی ہے۔ عربوں کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی' یہ معیوب ہی نہیں تھی' جیسے مغرب میں یہ معیوب نہیں ہے اور وہ تو عیسائیت کا اثر ہے کہ یہ شے معیوب ہی نہیں رہی۔ وہ عیسائیت تو ہو ہی نہیں سکتی جو خدا کا ایک رسول ان کو دے گیا تھا۔ وہ جو اس کے بعد انسانوں نے بنائی تھی' اس عیسائیت میں تو شراب کا مقام یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انجیل میں سب سے بڑا معجزہ یہ گنایا گیا ہے کہ جب ایک شادی کی دعوت میں جتنی شراب تھی وہ پی لی گئی۔ شراب کم ہوگئی اور لوگوں کو پورا نشہ بھی نہ آیا تو حضرت مسیح علیہ السلام نے' محرف انجیل کی رو سے میں کہہ رہا ہوں' مٹکوں میں بھرے ہوئے پانی کو ایک نگاہ سے شراب میں تبدیل کر دیا اور پھر وہ ان سب نے پی اور پینے کے بعد وہ بدمست ہوئے۔ عیسائیت میں کوئی عیسائی' عیسائی نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ کم از کم سال میں ایک دفعہ وہ شراب نہ پی لے۔ یہ جو ان کے ہاں عیدِ فصا ہوتی ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پہ دیئے جانے کی جو ایسٹر میں عید ہوتی ہے' اس میں کہا جاتا ہے کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کا جو خون تھا وہ شراب بن گیا' وہ اس رسم میں تقدس ہے' Worship ہے' اس کی عبادت ہے کہ اس عید میں ایک گھونٹ شراب پینا ہوتی ہے۔

شراب کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے بیان کردہ بتدریجی طریق کا ذکر

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ عربوں کے ہاں شراب معاشرے میں ایسے ہی عام تھی جیسے آج مغربی معاشرے میں ہے۔ صدیوں سے وہ اس کے عادی چلے آ رہے تھے۔ ایک دن میں چھڑائی نہیں جا سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے متعلق احکام آئے' آہستہ آہستہ اس سے اجتناب برتا گیا تا آنکہ تاریخ کے کہنے کے مطابق' مدینے میں بھی چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں جا کر جو آخری حکم آیا تو اس وقت یہ یکسر ممنوع قرار پائی ورنہ اس سے پیشتر اجتناب اور احتراز اور احتیاط کے متعلق احکام آتے رہے' رفتہ رفتہ بتدریج اس عادت کو چھڑایا گیا۔ دین میں جو نظام قائم کیا جائے گا اس میں اس حکمت کو پیش نظر رکھا جائے گا کہ کون سی چیز کیسے چھڑائی جائے گی اور اس کی جگہ دوسری چیز کیسے لائی جائے گی۔ اسی خمر کے متعلق سورۃ النساء کی آیت 43 ہے۔ پہلے تو یہ دیکھیے سورۃ البقرۃ کی جو آیت ہمارے زیرِ نظر ہے اس میں تو جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کچھ فائدے بھی ہیں' نقصان بھی ہیں۔ بات میں وہ سناتا ہوں کہ صرف اتنی سی بات کہی گئی ہے کہ فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی ہیں اور اس کے نقصان زیادہ ہیں فائدوں کے مقابلے میں۔ بس اتنی بات ہے۔

بغیر سوچے سمجھے قرآن حکیم کی تلاوت کے متعلق الفرقان کی وضاحت اور شراب نوشی کی ممانیت کا ذکر

سورۃ النساء کی یہ آیت ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ' جب تک کہ تمہیں معلوم نہ ہو جائے کہ تم جو کچھ کہتے ہو' اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ یعنی یہ صرف یہ چیز آئی کہ نشے کی حالت میں شراب کے قریب نہ جاؤ۔ یہاں سے روک دیا تو

ایک اور پابندی عائد کی' اس سے یہ عادت اور چھوٹی۔ ضمناً عرض کر دوں کہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ نماز کے پاس اس وقت جاؤ جب تمہیں معلوم ہو کہ میں جو کہہ رہا ہوں' اس کا مطلب کیا ہے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ اب ہم جو نماز پڑھتے ہیں' اس میں کتنے فیصد وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ الفاظ کہہ رہے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں۔ بلکہ آپ تو ایک ایک رات میں قرآن ختم کر لیتے ہیں' نہ قرآن پڑھنے والے امام کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں' نہ سننے والے سامع کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا سن رہا ہوں۔ قرآن نے کہا تھا کہ **حتی تعلموا ماتقولون** (4:43) تا نکہ تمہیں علم ہو' معلوم ہو جائو' سمجھو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ضمناً بات آ گئی تھی۔ یہ اس کے متعلق دوسرا حکم آیا اور اس کے بعد سورۃ مائدہ کی آیت 91-90 میں پھر آخری حکم آ گیا کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَیۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ** (5:90) خمر اور میسر' انصاب وازلام کی بات میں پھر آ کر کروں گا' رجس ہیں۔ رجس ہر وہ عمل ہے کہ جس سے انسانیت کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ یہ عمل الشیطان ہے' شیطان کا عمل ہے' اس لیے تم اس سے اجتناب کرو۔ آگے پھر کہا کہ **فَھَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَھُوۡنَ** (5:91) کیا تم اس سے باز نہیں آ ؤ گے؟ بڑی سختی سے یہ چیز کہی گئی۔ یہ ہے آخری حکم جس میں شراب قطعاً ممنوع قرار پا گئی۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں اور پوچھنے کا جذبہ محرکہ تو آپ سمجھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے کہ جی! وہ شراب کو سؤر کی طرح حرام نہیں قرار دیا' قرآن نے اتنا ہی کہا ہے کہ اس سے اجتناب برتو۔ گنجائش نکالی اجتی ہے کہ بہر حال یہ حرام تو نہیں ہے۔ یعنی کبھی کبھی پی لینے میں کیا حرج ہے۔ حرام کا لفظ نہیں آیا' عمل الشیطان آیا ہے' رجس آیا ہے تو جو عملِ شیطان ہے گویا ان کے نزدیک یہ کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ شیطانی اعمال ان کا تو معمول ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے وہ کیا مجتنب رہیں گے۔ یہ تو زندگی ایسی بن چکی ہوئی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں حرام نہیں ہے۔ یاد رکھیے! حرام کا لفظ جو قرآنِ کریم کا ہے' جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے' اس میں کیا ہے کہ خنزیر کا گوشت' بہتا ہوا لہو' مردار اور ہر وہ شے جو خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام کی طرف منسوب کی جائے۔ حرام ہے' شراب جسے آپ خمر کہیں یا شراب کہیں' روزمرہ کی غذا کی چیزوں میں سے نہیں ہے۔ اس لیے وہ جو (طبعی) چار چیزیں بتائی گئی ہیں' ان میں اس کا ذکر آ ہی نہیں سکتا اور یہ چیز کہ صاحب حرام نہیں ہے تو کیا ہر چیز کے لیے لفظ حرام آئے گا تو پھر آپ اسے حرام سمجھیں گے؟ قرآن کہہ رہا ہے کہ **رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ** (5:90)۔ آگے کہتا ہے کہ **فَھَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَھُوۡنَ** (5:91) کیا تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ اتنا بڑا تو وہ چیلنج دے رہا ہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ صاحب! حرام کا لفظ اس کے لیے نہیں آیا۔ بہر حال آپ دیکھ لیجیے کہ یہ اس کے متعلق قرآن کا حکم ہے۔ وہ شراب کا لفظ چونکہ ہمارے استعمال ہوا ہے' اس لیے ہم بھی بول دیتے ہیں' ورنہ عربی زبان میں ہر مشروب کو شراب کہتے ہیں' ہر چیز جو پی جاتی ہے' اسے شراب کہا جاتا ہے۔ وہاں شراب کا یہ لفظ وائن کے معنوں میں' شراب کے معنوں میں نہیں آتا' وہاں تو یہ لفظ ہر پینے والی شے کے متعلق آتا ہے۔ اگر یہاں اسلامی ممالک میں خمر کے

متعلق قانون بنے گا تو اس قانون کو Define کرنا ہوگا' یہ بتانا ہوگا کہ وہ کیا شے ہے' جسے خمر کہا جائے گا اور وہ آپ کے ہاں (غیر قانونی) Unlawful قرار پائے گی۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے' ورنہ ہمارے ہاں تو وہ جو شراب ہے' وہ تو اس کو کوئی خاص قسم کی چیزیں کہا جاتا ہے لیکن یہ چیز کہ جب شراب قانون کی زد میں آئے گی' تو وہاں تو قانون کو بتانا پڑے گا کہ خمر کیا ہے۔ میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ جب یہ چیزیں قانونی حیثیتیں اختیار کریں گی تو اس وقت ان کو Define کرنا پڑے گا' متعین کرنا پڑے گا' Specifically بتانا پڑے گا کہ وہ کیا شے ہے۔ خمر پہلی چیز کہی۔

خمر کے بعد لفظ میسر کی وضاحت اور ہمارے ہاں کے تراجم نیز لفظ برج کے سہارے کی نوعیت

دوسری چیز اس نے وَ الْمَیْسِرُ (5:90) اس کا عام ترجمہ جوا (قمار بازی) کیا جاتا ہے۔ یہ جوا ہی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان مین چیزوں خمر کو صرف شراب کے لیے اور میسر کو صرف جوے کے لیے کیوں ماؤف کردے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ اور یہ میسر کا لف یسر سے ہے اور یہ یسار بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ یسر کے معنی آسانی کے ہیں۔ ہر وہ دولت جو نہایت آسانی سے ہاتھ آجائے' وہ میسر میں داخل ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں کہ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے' یہاں سے ہی یسار ہے' یہی سے یسر ہے' یہیں سے میسر ہے۔ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے اور ہر وہ مال جو بغیر محنت کے آجاتا ہے' میسر میں داخل ہے لیکن جب یہ قرآن کا مفہوم لیا جائے گا تو آپ پھر دیکھتے ہیں کہ اس نشتر کی زد کہاں کہاں جا کر پڑتی ہے۔ بجائے اس کے کہ دیانت داری سے اس چیز کو قبول کیا جاتا کہ ہاں یہ ساری چیزیں میسر میں داخل ہیں کہ جس میں محنت نہیں کی جاتی' محنت کوئی اور کرتا ہے محنت کا ماحصل کوئی اور لوٹ کے لیے جاتا ہے۔ اگر اس کو بھی میسر کی (تعریف) Definition میں لاتے تو جس طرح سے کم از کم جوئے سے مجتنب رہا جاتا ہے' اس کے متعلق بھی تو یہی ذہنیت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو فریب دیا' خدا کو کیا فریب دیا جائے گا' یہ کہہ کر کہ اس کا مفہوم ہی اس طرح محدود کر لو۔ صرف جوا جو ہے اس تک اس کو رکھو' اس سے آگے ہر وہ شے جو یونہی یسر سے' آسانی سے' بغیر محنت کیے' دوسرے کی کمائیاں آتی چلی جائیں' وہ سارا حلال وطیب ہے' صرف جوا جو ہے اس کے متعلق یہ چیز ہے کہ صاحب! یہ ناجائز ہے اور جوّے کی بھی پھر قسمیں ہیں۔ یہ جو بے چارے وہ بازار کے' وہ ماجے تے' منے جوتی سٹ کے چار چار پیسے دا جیہڑا کھیلن' اوہدے تے پولیس آجاندی اے' چھاپہ ماردی اے[1]''۔ مگر ہر جم خانے میں' ہر کلب میں' ہر شام یہی کچھ ہوتا ہے لیکن اس کا نام برج رکھ لیا جاتا ہے' اسے کوئی قانون نہیں روکتا' کوئی سوسائٹی اسے معیوب نہیں سمجھتی۔

---

[1] وہ جوا یرے غیرے سے ہیں جو جوتا پھینک چار چار پیسے کا کھیل کھیلیں' اس پہ تو پولیس آجاتی ہے' چھاپے امرتی ہے۔

اب اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جوا ریا ہے تو آپ دیکھیے اس کے متعلق ذہن میں کیا چیز آتی ہے اور یہ برج والے آپس میں فخر سے بیان کرتے ہیں۔ اب اس پہ جو پابندی نہیں لگتی تو اس میں ایک گہری بات ہے: یہ رشوت کا ایک بڑا حسین اور لطیف طریقہ ہے۔

رشوت لینے اور دینے کا ایک دوستانہ کھیل جسے قانونی طور پر جائز سمجھا جاتا ہے

جس نے صبح جا کر ٹینڈر دینا ہوتا ہے یا پرمٹ لینا ہوتا ہے وہ شام کو کلب میں جا کر اسی افسرِ متعلقہ کے ہاتھوں ہزار روپیہ ہار آتا ہے۔ وہ اسے برج میں جیتتا ہے' رشوت تو نہ ہوئی جی۔ میں کہتا ہوں کہ Exactly (ہو بہو) جو شکلیں جوئے کی ہیں' اس میں سے بھی یہ راہیں تراشی جاتی ہیں۔ یہ کیسے تراشی گئیں؟ اس کے لیے قانون بنا کہ یہ چیز ناجائز نہیں ہے۔ قانون کس نے بنایا؟ وہی جنہوں نے آ کر برج کھیلان تھا۔ اسی لیے قرآن قانون سازی کا اختیار انسانوں کو دیتا ہی نہیں۔ وہ ہزار طریقے قانون کی رو سے نکالتا ہے۔ برادرانِ عزیز! میسر ہر وہ دولت ہے جو آسانی سے ہاتھ میں آ جائے۔ محنت کوئی دوسرا کرے اور اس کا ماحصل کو دوسرا لے اُڑے۔ یہ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (53:39) کے بالکل برعکس چیز ہو گئی۔ وہاں یہ ہے کہ ''صرف جس کے لیے محنت کی جاتی ہے' وہ ہے جس کا کوئی حق دار ہوتا ہے۔'' میسر ہر وہ دولت ہر وہ مال ہے کہ جس میں محنت کوئی دوسرا کرے' ماحصل کوئی اور لے جائے۔

قرآنی اصطلاحوں کا مفہوم بدل کر حرام کو حلال ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا گیا

میں عرض کر رہا تھا کہ یہ جو قرآن کی اصطلاحات ہیں' الفاظ تو وہی رہے' ان کا مفہوم اس انداز سے بدلا گیا کہ ایک تو وہ لوگ ہیں کہ جو مثلاً اس کی پرواہ ہی نہ کریں کہ صاحب! قرآن میں کیا آیا ہے' شریعت نے کیا کہا ہے؟ لیکن بہرحال ایک وہ لوگ بھی ہوئے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم اس کے مطابق چلتے ہیں۔ یہ مطابق چلنے والوں نے دین کے ساتھ کیا کیا ہے؟ یہ کہ انہوں نے الفاظ وہی رکھے ہیں' اصطلاحیں وہی رکھی ہیں' ان کے مفہوم خود متعین کر لیے ہیں۔ میسر کا یہ مفہوم متعین کیا اور اسے گیم آف چانس یا جوئے تک لے گئے اور باقی تمام دولت جس میں محنت کوئی دوسرا کرے ماحصل کوئی اور لے جائے' وہ ساری حلال وطیب ہے۔ کیا ہوا؟ میسر کی ایک قرآنی اصطلاح کا مفہوم خود معین کیا۔ اب قرآن میں یہ لفظِ میسر یا اس قسم کے الفاظ رہا کریں' ان کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے تو لیے رکھے۔ کتاب محفوظ ہے غیر متبدل ہے ٹھیک ہے' الفاظ غیر متبدل ہیں اور اگر الفاظ کے معنی ہی بدل دیئے جائیں تو اس سے بڑی تحریف اور کیا ہو گی' عزیزانِ من! آپ کے ساتھ یہی ہوا ہے' اب اس کے لیے سندیں مانگتے ہیں کہ صاحب! یہ کیسے ہوا کہ دوسرے کی محنت کی کمائی دوسرا نہیں لے جا سکتا' اس کے لیے سند بتایئے؟ اس کے لیے سید تو موجود تھی لیکن اس سند کو تو آپ نے ایک خاص چیز کے لیے محدود کر کے رکھ دیا۔ اب اس کے بعد سندیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن وہ معاشرہ متشکل کرتا ہے' جس میں پوری محنت کی

جائے اور محنت کا ماحصل ملے اور محنت کے ماحصل میں سے بھی صرف اپنی ضرورت کے لیے رکھا جائے' زائد فاضلہ دولت (Surplus Money) دوسروں کے لیے دے دی جائے۔ یہ وہ نظام ہے اور اس کے مقابلے میں یہ نظام ہے کہ صرف جوا تو حرام یا ناجائز ہے لیکن دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر طریق سے جو لے جانا ہے' اس میں کوئی چیز ایسی ممانعت کی نہیں ہے چنانچہ زمین پہ لکیریں کھینچیں یہ میری ہوگئی۔ اس میری کے اندر بے چارہ وہ کاشتکار سال بھر محنت سے' خون پسینہ ایک کر کے' وہاں فصل پیدا کرے اور یہ جس نے لکیر ماری تھی' اس نے یا اس کے باپ دادا نے کہیں' وہ کم از کم اس کا آدھا حصہ گھر کو لے جائے۔ یہ کیا ہے جی؟ مزارعت ہے جی' یہ بالکل حلال ہے' میسر نہیں ہے۔ تجارت ایک کرے' دن رات وہ محنت کرے' یہ اس کے اندر انوسٹمنٹ کر کے Sleeping Partner بن رہے ہیں۔ نفع آ رہا ہے' اس میں سے آدھے سے بھی زیادہ ان کا ہے۔ کیا ہے جی یہ؟ مضاربت ہے صاحب! میسر نہیں ہے۔ یہ میسر کیا ہے؟ صرف جوا ہے!

قرآنی نظامِ حیات میں سب سے زیادہ مخالفت خمر' میسر اور چانس کی گئی ہے

یہ ہوتا ہے دین کے ساتھ' خمر اور میسر دو چیزیں ہیں' جو اس راستے میں حائل ہوتی ہیں اور آپ نے دیکھا کہ عقل کو ماؤف کیا جائے اور اُدھر یہ صورت ہو کہ یا تو گیم آف چانس ہو' اس کو آپ لیتے ہیں تو اس میں بھی عقل و فکر ماؤف ہوتے ہیں۔ جو چیز آپ چانس پہ چھوڑتے ہیں' اس میں عقل کو کیا دخل ہے؟ جو جوا ہے وہ پانسے پہ ہے اس پانسے کا کیا رخ سامنے آ جائے گا' آپ کی عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن جوے تک تو یہ حکم رکھا جائے گا۔ یہ قرعہ اندازیاں' یہ لاٹریاں' یہ فالیں نکالنا' یہ خوابوں میں فیصلے لینا' یہ سارے کے سارے نہ صرف جائز بلکہ شرعاً مستحب قرار دیئے جاتے ہیں صاحب! اللہ والوں سے جا کر پوچھا جاتا ہے' ان سے فالیں نکلوائی جاتی ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ انسان کو ہم نے عقل و فکر دی' اپنے معاملات کو عقل و فکر کی روشنی میں' قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے' کو دفیصلے کرو۔

عقل و فکر سے کام لینے کی بجائے فالیں نکلوائی جاتی ہے' کرے ڈالے جاتے ہیں

یہ فیصلے' عقل و فکر کا مالک انسان' جا کر کن کے ہاتھ میں دے دیتا ہے؟ مثلاً یہ دیوان امام حافظؒ ہے۔ اس میں سے فال نکالو۔ کیسے نکلتی ہے فال؟ وضو کرو' بیٹھ جاؤ' آنکھیں بند کرو' یوں وہ کھولتے ہیں کہ دائیں ہاتھ کے صفحے کی جو پہلی سطر ہے اس میں جو لکھا ہوتا ہے یہ تمہارے لیے فیصلہ ہے۔ نہ دماغ اور فکر اس کی کام کرے' نہ فکر اور دماغ اُس کے کام کریں۔ یہ فیصلے لیے جاتے ہیں' قرعے ڈالے جاتے ہیں' لاٹریاں پڑتی ہیں' استخارے کیے جاتے ہیں۔ عقل و فکر کو ماؤف کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ وہ تو ٹھیک ہے عقل و فکر کو ماؤف کیجیے ''فیر باقی روحانیت رہ جاندی ہیگی اے [1]۔'' اور اس روحانیت کی انتہا وہ ہے کہ جسے آپ مجذوب کہتے ہیں ''او جیہڑے باقی دنیا اچ پاگل خانے بھیجے جاندے نیں [2]'' آپ کے ہاں وہ ''پہنچے ہوئے'' ہوتے ہیں کہ بھئی! کیا

فرق ہے؟ کہ جی سالک تو وہ ہے جو سیڑھی کے ایک ایک ڈنڈے سے چڑھتا ہوا اوپر گیا اور اے؟'' اٹخ اے چھڑپا مار کے چلے گئے' عقل دیاں لتاں ٹوٹ گیاں ❸ ''۔عزیزانِ من! کہاں پھر رہے ہیں' آپ!!!اور یہ وہ قوم پھر رہی ہے جو ہر صبح اس قرآن کو ثواب کے لیے لے کر بیٹھتی ہے۔

---

❶ پھر باقی روحانیت رہ جاتی ہے۔

❷ وہ جو باقی دنیا میں داخل پاگل خانے کیے جاتے ہیں۔

❸ اور یہ کیا ہیں؟ کہ جی! جست (Jump) لگا کر چلے گئے۔ عقل کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔

عقلِ فریب کار کے انجام کے پیشِ نظر خود کو مجرم کی بجائے صرف سطحی طور پر گناہ گار تصور کرنے کا نتیجہ

خمر اور میسر دین کے نظام کے راستے کے اندر دو سب سے بڑے سنگِ گراں ہیں۔ قرآن کا انداز دیکھیے' کہا ہے کہ یہ تجھ سے ان کے متعلق پوچھتے ہیں۔ قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (2:219) ٹھیک ہے' اس میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ صاحب! فائدے کی بھی بات ہوتی ہے۔ شراب کے متعلق یہ ہے کہ یہ ٹانک (Tonic) ہوتی ہے' اس سے کچھ قوت بڑھتی ہے' حرکت پیدا ہوتی ہے' حرارت پیدا ہوتی ہے۔ میسر کو اگر آپ نے جوا ہی لین ا ہے تو اس میں ایک ہارتا ہے تو دوسرا جیتتا ہے۔ عقلِ فریب کار کے لیے' دلیل دینے کے لیے' تو بات ہو جاتی ہے۔ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ جو چیزیں ہیں یہ کہی جا سکتی ہیں کہ یہ ہوتا ہے لیکن اس میں اِثْمٌ (2:219) اب ہمارے ساتھ ترجمے میں ایک اور چیز ہوئی۔ قرآنِ کریم نے جتنی چیزیں خلافِ قانون' خلافِ قاعدہ کہی جاتی ہیں' ان کے نتائج کو مختلف الفاظ سے تعبیر کیا ہے یا جو کچھ انسان خلافِ قانونِ خداوندی کرتا ہے' اس کے نتائج قرآن نے ان الفاظ میں بتائے ہیں۔ **عدوان' اثیان ظن خطا' اثم**. ہمارے ہاں ان سب کا ترجمہ گناہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر جو گناہ ہے' اس کا تصور تو ثواب کی طرح ذہنی سا ہوتا ہے۔ وہ گناہ الگ شے ہوتی ہے' جرم الگ چیز ہوتی ہے چنانچہ ہمارے ہاں یہ بڑے بڑے بزرگانِ کرام جو اپنے عجز اور انکسار میں درحقیقت اپنے تکبر نفرت و نخوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لکھیں گے ''فلاں صاحب' عاصی پرُ معاصی' مذنب گناہ گار بندہ۔'' یہ وہی چیز ہے کہ جسے ہم جرم کہتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ صاحب! یہ الفاظ چھوڑ دیجیے اور لکھا کیجیے ''بندہ عنایت اللہ مجرم نمبر دس''۔ یہ پُر معاصی بھی تو عاصی کے ساتھ تھا۔ اپنے آپ کو Criminal Tribe (جرم پیشہ قبیلے) کا' عاصی اپنے آپ کو اس مجرم قبیلے کا بدمعاش کہیے۔ آپ سے یہ نہیں کہا جائے گا۔ اب آپ نے دیکھا ہے کہ جرم یا بدمعاشی' یہ جو چیزیں ہیں' یہ کچھ اور مفہوم پیدا کر رہی ہیں مگر خطا کار' گناہ گار' عاصی' معاصی' مذنب' بڑے فخر سے لکھا جاتا ہے۔ کیا یہ کسی شخص کے لیے باعثِ فکر ہے کہ وہ یہ کہتا پھرے کہ میں تو بڑا مجرم نمبر دس

ہوں۔ یہاں تو شرم آئے گی' کہنے والے کے خلاف تو ہتکِ عزت کا دعویٰ بھی کر دیا جائے گا۔ مگر اپنے قلم سے بڑے فخر سے یہ چیزیں لکھتے چلے جائیں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ ہم نے ان الفاظ کے معنی بدل دیئے' مفہوم بدل دیئے' اور قرآن نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں' ان کے معانی میں شیڈ کا بڑا عجیب فرق ہے۔ یہاں اس نے یہ لفظ اثم کبیر کہا ہے' ثم کے بارے میں سنیے کہ عربوں کے ہاں قافلہ چلتا تھا وہ اسے قطار میں لے جاتے تھے۔ اس میں کوئی اونٹ یا اونٹنی' جو وا ماندہ ہو' درماندہ ہو' جلد تھک جائے' تھکنے کی وجہ سے قطار کے ساتھ نہ چل سکے' پیچھے رہ جائے' تو اضمحل ہو جائیں' افسردگی طاری ہو جائے' واماندگی طاری ہو جائے' قوتِ عمل میں کمی آ جائے' تو وہ اسے ناقة الاثمة کہتے ہیں' اور یہ ہیں اثم کے معنی' اب قرآن کہتا ہے کہ ان کے متعلق پوچھتے ہیں' ان سے کہو کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن سے قوتِ عمل میں انسان کی حرکت میں' درماندگی' واماندگی' افسردگی آ جاتی ہے' اضمحلال آ جاتا ہے۔ منافع کی صورت تو یہ ہے کہ اسے پینے کے بعد تو اتنی بڑی قوت اور حرکت پیدا ہوتی ہے کہ پوچھو نہیں' وہ پہاڑ ڈھانے کو تیار ہوتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ وقتی طور پہ تو ایسا نظر آتا ہے لیکن نشہ جسے آپ خمار کہتے ہیں اترنے کے بعد پوچھیے نہیں کہ اس میں پھر ان کی کس طرح ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔

شرابی کو اپنی درماندگی اور اضمحلال کے علاج کے لیے واپس شراب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے

یہ عادت چھوٹتی نہیں ہے' وہ جو اس کے بعد کا اضمحلال ہوتا ہے' اس اضمحلال کو پھر اسی شراب کے اس وقتی حرارت اور حرکت کے ذریعے سے پورا کیا جاتا ہے۔ اسے عربی زبان میں اثم کہتے ہیں۔ یہ جو اس تھوڑے سے نفع کے بعد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یہ اضمحلال کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے' اسے اثم کہا جاتا ہے اور یہی چیز میسر میں کہی کہ بغیر محنت کیے ہوئے دوسرے کی محنت کی کمائی سے روپیہ لے آنا' بات تو بڑی نظر آتی ہے' بڑے بڑے بینک بیلنس ہوتے ہیں لیکن اس میں پھر کمائی کرنے کی جو سکت اور محنت کرنے کی جو عادت اور قوت ہوتی ہے' اس میں اضمحلال آ جاتا ہے اور جب یہ راستے اس پہ بند ہو جاتے ہیں تو وہ ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی قابل نہیں رہتا۔ یہاں اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ (2:219) دیکھا آپ نے اس خمر' یہ میسر میں کیا ہے؟ منافع تو نظر آتا ہے' منفعت کی چیز نظر آتی ہے لیکن اِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا (2:219)۔ ان دونوں کو جب آمنے سامنے رکھو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ہنگامی اور وقتی فائدے کے مقابلے میں وہ جو تمہارے اندر مستقل اضمحلال پیدا ہوا ہے' قوت کی کمی آ گئی ہے' تم کام کے قابل نہیں رہتے ہو۔ دیکھو کہ یہ چیز بڑی زیادہ ہو گئی ہے۔

نوعِ انسانی کی ہر قسم کی درماندگی اور پس ماندگی کا علاج خمر اور میسر کے قرآنی علاج میں ہی مضمر ہے

یاد رکھو! یہ ہے ان دونوں چیزوں کے متعلق۔ یہاں یہ کہا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ (2:219) اب یہ پوچھتے ہیں کہ کہیے' یہ دو راستے تو بند ہو گئے' ہم نے محنت سے کمائی کی' نفع اور اثم اب اس میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے

ایک طرف میسر ہے کہ دوسرے محنت کریں اور یہ لوٹ کر لے جائیں اور ادھر یہ نظام ہے کہ جس میں خود محنت کرے' محنت کی کمائی آئے اور اس میں سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم اس میں سے کتنا خود رکھیں اور کتنا دوسرے کو دے دیں۔ عزیزانِ من! اس ایک لفظ میں آپ کا سارا معاشی نظام آ جاتا ہے' جس پہ آپ دیکھتے ہیں کہ اب کتابوں کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں' صفحوں کے صفحے کالے کیے جا رہے ہیں' روز بحث مباحثہ ہوتا ہے کہ یہ خلافِ اسلام ہے' یہ عینِ اسلام ہے۔ پوچھتے پہلی چیز یہ ہیں کہ اپنی کمائی میں سے ہم خود کتنا رکھیں' دوسروں کی ضرورت کے لیے جن کی ضرورتیں' ان کی کمائی سے پوری نہیں ہو سکتیں یا وہ کمانے کے قابل نہیں رہے' کتنا دیدیں؟ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ان سے کہو جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے سب کا سب دے دو' یہ رکھنا کاہے کے لیے ہے؟

انسانی زندگی میں بچی ہوئی دولت وہ ٹکٹ ہے جو جہاں فردا کے سفر میں کام آ ہی نہیں سکتی

پیسہ تو ضرورت پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ارے بھائی! آپ نے سفر کرنے کے لیے ٹکٹ خریدا ہے' آپ نے سفر نہیں کرنا اور ٹکٹ ایسا ہو کہ جس کو بیچ کر پھر پیسے واپس نہیں ملتے' وہ Transferable ہو لیکن Cashable نہ ہو' پیسہ نہ ملے' تو اس کے بعد آپ صرف یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! میں نے تو جانا نہیں ہے' یہ آپ ٹکٹ لے لیجیے' آپ کے کام آئے گا' میرے تو کسی کام نہیں آنا۔ روپیہ جو ضرورت پورا کرنے کے بعد باقی بچ جاتا ہے وہ ٹکٹ ہے کہ جس پہ آپ نے سفر نہیں کرنا لیکن آپ اسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ غلط نظام نے یہ بتا دیا ہے کہ نہیں! یہ جو آپ کا ٹکٹ ہے' یہ زندگی بھر کے لیے آپ کے کام آتا چلا جائے گا۔ اسے کہتے ہیں کیپٹل سسٹم (نظامِ سرمایہ داری) سکہ جس کی Intrinsic Value کچھ نہیں ہے' اس کی اپنی ذاتی قیمت کچھ نہیں ہوتی' آپ کے قانون نے اس کو اتنی بڑی قیمت دیدی ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے ایک چالو ٹکٹ آپ کے پاس آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ یہ تو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذریعہ تھا' تمہاری ضروریات پوری ہو گئیں' یہ فاضلہ بچ گیا۔ بچ گیا ہے' دوسرے کے کام آئے گا' اسے دے دو۔ عزیزانِ من! انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ ایک حیوان یعنی ایک بیل ہو اور اس کے سامنے چارے کا ڈھیر ہو' اسے کھا رہا ہو۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جب تک اس کا پیٹ نہ بھرے' وہ کسی کو پاس نہیں آنے دیتا' یہ حیوانیت ہے' جب پیٹ بھر جاتا ہے تو آرام سے وہاں بیٹھ جاتا ہے' آنکھیں بند کر کے جگالی کرتا ہے' اس کے بعد اس کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ جو زائد از ضرورت ہے' اسے کون لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ کم بخت انسان پیٹ بھرنے کے بعد اس زائد از ضرورت کے اوپر پہرے بٹھا دیتا ہے پھر اپنے آپ کو اشرف المخلوق کہتا ہے۔ قرآن نے كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) کہا کہ یہ انسان نہیں' حیوان ہے پھر کہہ دیا کہ نہیں! ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ زائد از ضرورت کو تو حیوان بھی اپنے پلے باندھ کر نہیں رکھتا۔ ہزاروں اور لاکھوں وہ ہیں کہ جن کی ضروریات رکی ہوئی ہیں' ایک وقت کے لیے ان کے

بچوں کو روٹی کا ٹکرا نہیں ملتا اور ان کے گھروں کے اندر ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد خزانوں کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) اس چیز کا تعین بھی وہ نظام کرے گا۔

خمر ہو یا میسر یا فاضلہ دولت یہ تمام چیزیں عقل کو ماؤف کر دینے والی چیزیں ہیں اور حرام ہیں

ایک ضرورتیں تو بنیادی ہوتی ہیں، بنیادی ضرورتیں ہر انسان کی یکساں ہوتی ہیں۔ بھوک، بھوک کے لیے روٹی، مزدور کے لیے بھی وہی ضرورت ہے جو اس انجینئر کے لیے ضرورت ہے۔ کپڑا، مکان، بیماری میں دوائی۔ اب اس کے بعد یہ ضرورتیں رہ جاتی ہیں کہ جس نے صرف لیبر کرنی ہے، محنت کرنی ہے، اس کے لیے ہتھوڑا گینتی کی یہ چیزیں ہیں، انجینئر کے لیے اس سے متعلقہ سامان و آلات کی چیزیں ہیں۔ یہ جو ضروریات ہیں، یہ وہ نظام مہیا کرے گا اس کام کے لیے جو کام اس کے ذمے لگا دیا ہے۔ بنیادی ضرورتیں ہر ایک کی یکساں ہوں گی۔ کہیں گے کہ جی نہیں! اس کھانے پینے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے یعنی مزدور کے بیٹے کو اگر آپ توس اور بٹر (گھی مکھن) اور Honey (شہد) دیدیں گے ''تے اوہدے ٹڈ ھاچ پیڑ ہون لگ پئے گی ❶؟''۔

---

❶ تو کیا اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جائے گی؟

برادرانِ عزیز! قرآن نے اس سوال کے جواب میں الْعَفْوَ (2:219) کہا ہے۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی ہر ایک کی پورا کرنا نظام کا کام ہے۔ مخصوص ضروریات جو کسی کے کام سے متعلق ہیں، ان کو بھی پورا کرنا ہے۔ اب وہ نظام یہ چیز خود سوچ لے گا کہ اس کا طریقِ کار کیا ہوگا؟ اپنے لیے سارا آپ رکھ لے وہاں دے کر وہاں سے لے لے، کچھ بھی ہو، یہ طریق کار ہے قرآن کریم نے کہا ہے کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219)۔ عزیزانِ من! سنیے کہا تھا کہ عقل کو ماؤف کر دینے والی جو چیزیں ہیں وہ حرام ہیں۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ (2:219) یوں اللہ اپنے احکام کو واضح کر کے بیان کرتا ہے۔

قرآن حکیم کے مصنف کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس کی یہ کتاب ہر قسم کی خامیوں سے پاک ہے لیکن یہاں کے فتویٰ کچھ اور ہیں

یہ خدا، مصنف خود اپنی کتاب کے متعلق کہہ رہا ہے اور یہاں اس کتاب کے متعلق فتوے صادر ہوتے ہیں کہ یہ کتاب مجمل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مفصل ہے ''او کیندے نیں اینوں کی پتہ ہیگا۔ یعنی جیس طراں اوہنے کسے دی چرا کے کتاب دے دتی ہیگی اے۔ پتہ ساہنوں اے۔'' ناقص ہے۔ وہ کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ (6:115) سنیے آگے میں نے کہا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے

کہ تمہاری فکری قوتوں کو بلند کر کے پھر وہ نقشہ پیش کرتا ہے کہ اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟ کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (2:219) یہ جو ہم نے کہا ہے کہ خمر اور میسر اس نظام کے راستے میں سنگِ گراں بنیں گے' یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ضرورت سے زائد جو کچھ بھی ہے' اس کا رکھنا حماقت ہے' اسے دوسروں کی ضرورت کے لیے دیدو' ہم نے وضاحت سے یہ بات اس لیے بیان کردی ہے لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (2:219) تاکہ تم عقل وفکر سے سوچ سمجھ کر دیکھو کہ کس نتیجے پہ پہنچتے ہو۔ یہ تَتَفَكَّرُوْنَ ہے۔

---

❶ تو کیا اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جائے گا؟

❷ وہ کہتے ہیں کہ اسے کیا معلوم! یعنی جیسے اس نے کسی دوسرے کی کتاب چوری کر کے دے دی ہے۔ اس کا تو ہمیں ہی پتہ ہے۔

قرآن حکیم انسان کو حال اور مستقبل یعنی دنیا اور آخرت دونوں پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے

اب آیئے قرآن کی خصوصیت سنیے اور جھوم جایئے۔ عقل وفکر کا میدان یہی جو طبعی دنیا ہے' اسی کو قرار دیا جاتا ہے' انہی کے معاملات کو عقل وفکر کی رو سے سوچا سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے کو جو معاملات ہیں' ان کے متعلق کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! عقلِ انسانی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ سنیے! قرآن کہتا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ o فِي الدُّنْيَا (20-2:219) ٹھیک ہے' دنیاوی امور میں تم عقل وفکر سے کام لو۔ وہ ہر ایک یہ کہے گا۔ وہ کہتا ہے کہ تَتَفَكَّرُوْنَ o فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (20-2:219) دنیا کے معنی حال (Present)' موجودہ' عاجلہ' پیش پا افتادہ' ان مفاد کے متعلق تو ہر ایک ہی سوچتا ہے۔ کہا ہے کہ مستقبل کے متعلق بھی کچھ سوچو۔ اور یہ جو ہم نے بات کہی ہے کہ ہنگامی طور پر تو ان میں فائدے ہیں' ذرا ہنگامی فائدوں سے آگے نظر کو بڑھا کر دیکھو' تو تم دیکھو گے کہ کتنی بڑی نقصان کی چیز ہے جو تم کر رہے ہو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ o فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (20-2:219) تفکر' دنیا اور آخرت میں تفکر۔ مذہب کی دنیا میں' دنیاوی معاملات میں بھی' فکر حرام ہے۔ دین قرآن کی رو سے دنیا ہی نہیں' آخرت کے معاملات میں بھی غور وتدبر اور فکر وشعور اور عقل وبصیرت کی تاکید کرتا ہے۔ دیکھتے ہیں انسانی فکر کو کیا مقام عطا کیا جا رہا ہے۔

لفظ یتیم کا قرآنی مفہوم یعنی پر وہ فرد جو بھرے معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرے

اب آگے کہا کہ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى (2:220)۔ یتیم ہماری زبان میں تو بس اسے ہی کہتے ہیں جس کے ماں باپ مر گئے ہوں صرف وہ یتیم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ہر وہ شخص جو تنہا رہ جائے' اسے یتیم کہتے ہیں۔ جس پہ جب کوئی مصیبت پڑے تو وہ اسی کی مصیبت ہو' وہ کسی دوسرے کی مصیبت نہ بنے۔ اس میں کوئی دوسرا اپنے آپ کو شریک نہ سمجھے کہ یہ میری مصیبت ہے' اسے تنہا کہتے ہیں۔ یعنی ویسے ان کے ہاں استعمال کے طور پہ بھی' لڑکیاں شادی کے قابل ہو جائیں Marriageable Age پہ پہنچ جائیں اور اس کے بعد

ان کی شادی نہ ہوسکتی ہو، یہ نہیں کہ وہ خود نہ کرنا چاہیں، تو وہ اس لڑکی کو اس وقت بھی یتیم کہتے ہیں، بیوہ عورت کو یتیم کہتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو تنہا رہ جائے، اسے یتیم کہا جاتا ہے۔ درِ یتیم تو آپ نے اصطلاح سنی ہوگی، صدف میں جو ایک تنہا اکیلا موتی ہوتا ہے، اسے کہتے ہیں۔ یتیم کے معنی معاشرے میں تنہا رہ جانے والا کے ہیں۔ یہ جو عفو تھا، یہ کن کے لیے تھا؟ **وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی** (2:220)۔ وہ جو تنہا رہ گئے ہوں۔ تنہا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی جنگل میں، کیکر کے پیڑ کے نیچے، اکیلا بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف نگاہ دوڑانے سے کوئی انسان نظر نہیں آتا۔ یہ تو بھری بستیوں کے اندر شہروں کی لاکھوں آبادیوں کے اندر، انسانوں کی محفلوں اور انجمنوں کے اندر، جو یتیم یعنی تنہا بستے ہیں ان کا ذکر ہو رہا ہے اور اس میں آپ دیکھیں گے کہ ہم میں سے پھر کتنے یتیم نہیں ہیں۔ ان میں تو شاید کہیں جا کے وارث والے تو چار ایک ہی نکلیں۔ باقی تو سب ہمارے ہاں یتیم بستے ہیں۔ جس پہ پڑتی ہے، تو یہ تنہا اسی کی مصیبت ہوتی ہے، اسی کو یتیم کہا جاتا ہے۔ ان کا کون وارث ہوگا؟ وہ جو **العفو** کہا ہے، یہ ان کے لیے کی جائے گی۔

لفظ صلح کا قرآنی مفہوم معاشرے کی ناہمواریوں کو مٹانا ہوتا ہے اور یتیموں کو بھائی بنانا ہوتا ہے

آگے کہا ہے کہ **قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَیۡرٌ** (2:220)۔ صلح کے معنی ہوتے ہیں، ہمواری پیدا کر دینا، ناہمواریاں مٹا دینا۔ وہ جو ان کی زندگی میں معاشرے میں تنہا رہ جانے کی وجہ سے ناہمواری پیدا ہوگئی ہے۔ وہ مٹا دینا نہایت بڑا نیکی کا کام ہے، عملِ خیر ہے **وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ** (2:220) ان کو اپنی سوسائٹی میں شامل کرو۔ یہ اخلاط جو یہاں کہا یا اختلاط جو یہاں کہا ہے، عام طور پہ تو کہا جاتا ہے کہ کاروبار میں ان کی شرکت کرو لیکن یہ صرف کاروباری شرکت نہیں ہے۔ بات وہاں یتمی کی کہی تھی، وہ تنہا رہ گیا **تُخَالِطُوۡهُمۡ** (2:220) کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اپنے اندر مخلوط کرو، کیوں ان کو تنہائی کا احساس دلا رہے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا کرو؟ ہم کیوں ایسا کریں؟ کہا کہ **فَاِخۡوَانُکُمۡ** (2:220) یہ جو تنہا ہے، جس کا کوئی نہیں ہے، یہ تمہارا بھائی ہے۔

قرآنی معاشرے میں ہر وہ شخص جو تنہا رہ جائے وہ تمہارا بھائی ہے

ہم نے تو اپنے آپ کو ان رشتوں میں صرف خون تک محدود رکھا ہوا ہے۔ وہ جن کے ماں باپ بھائی بہن تقسیم کے زمانے میں کہیں گم ہوگئے تھے۔ اس کے بعد کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی اخبار میں جو آتا ہے، بیس برس کے بعد بھائی بھائی سے مل گیا۔ اس نے نشانیاں بتائیں، نشانیاں بتانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ تو اس دوران میں پتہ نہیں تھا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو معاشرے میں یتیم رہ گیا ہے، یہ اس لیے یتیم رہ گیا ہے کہ تمہیں علم نہیں تھا کہ تمہارا بھائی ہے۔ **وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ** (2:220) ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ تمہارا بھائی ہے۔ جب کسی کو علم ہو جائے کہ یہ میرا بھائی ہے، تو پھر اس کے بعد تو کسی افلاطون کی عقل

کی ضرورت نہیں' یہ سمجھانے کے لیے کہ اسے گلے لگا لو۔ دیکھتے ہیں آپ یتمی کے بعد اخوانکم کہہ کر قرآن کیا بات کہہ گیا ہے؟ ہمارے معاشرے میں حقیقی بھائی بھی بھائی نہیں رہتا' یہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ دنیا کا ہر وہ جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے' وہ تمہارا بھائی ہے۔ یہاں کہا تھا کہ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَیۡرٌ وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ (2:220) ہم جانتے ہیں ناہمواریاں پیدا کر کے ان کو تنہاؤں میں دھکیل دینے والا معاشرہ کون سا ہوتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمواریاں پیدا کر کے پھر ان کو بھائی بنانے والا معاشرہ کیا ہوتا ہے' ہم جانتے ہیں۔ یہ تمہاری ساری مصیبتیں اس لیے تھیں کہ تم جانتے نہیں تھے۔ قرآں نے کہا ہی یہ ہے کہ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ (2:220) اگر ہم بھی تمہیں یہ نہ بتاتے تو پھر تو مشکلات اور مصیبتیں تم پر پڑی رہنی تھیں۔ ٹھیک ہے' اس کے لیے تو کوئی Justification (وجہ جواز) تھی کہ صاحب! میں نے پہچانا ہی نہیں کہ میرا بھائی ہے' میں جانتا ہی نہیں تھا کہ میرا بھائی ہے۔ کہا اگر خدا یہ چاہتا کہ تم کسی طرح پریشانیوں میں مبتلا رہو تو پھر ٹھیک تھا' ہم بھی تمہیں نہ بتاتے کہ تمہارا بھائی ہے۔ کہا کہ جب ہم نے کہہ دیا کہ یہ تمہارا بھائی ہے اور اس کے بعد بھی اگر وہ پریشان رہا تو پھر لعنت ہے تم پر۔ کیا بات ہے! ہم نے بتا اس لیے دیا ہے کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ صاحب! معلوم نہیں تھا' اس لیے وہ مشکلوں میں' مشقتوں میں' تکلیفوں میں' مصیبتوں میں' مبتلا ہے' ہم جانتے نہیں تھے۔ تمہیں بتا دیا کہ تمہارا بھائی ہے' دنیا کا ہر یتیم' ہر وہ جو اپنے آپ کو مصیبت میں تنہا محسوس کرتا ہے' وہ تم سب کا بھائی ہے۔

ہر بڑے پروگرام کی ابتدا ہمیشہ چھوٹی پیمانے سے ہی شروع ہوتی ہے

ہم نے بتا دیا' اب تو کوئی ایسی وجہ نہیں کہ وہ پریشانیوں میں رہے اِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ (2:220) یاد رکھو! یہ باتیں ہم عقل و فکر کی رو سے بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ان کو ہم اس طرح سے وعظ کے طریقے پہ چھوڑ دیں گے کہ تم پھر اپنے طور پہ جی چاہے مانو یا جی چاہے نہ مانو۔ ہم وہ نظام قائم کریں گے کہ جس کے اندر پھر کوئی تنہا نہیں رہے گا اور ہر ایک دوسرے کا بھائی بن جائے گا' یہ بھی ہم جانتے ہیں۔ نظام کی رو سے جو چیزیں ہوتی ہیں' وہ خدا کے عزیز ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ جہاں وہ چیز Rationally (عقلی طور پر) سمجھانے تک ہوتی ہے' وہ اس کے حکیم ہونے سے تعبیر کی جاتی ہے۔ معاشرہ بہت بڑا بنے گا لیکن جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ قرآن فیملی یونٹ کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ جو کچھ وہ بڑے پیمانے اور وسیع پیمانے پر معاشرے میں کرنا چاہتا ہے' اس کی ابتدا چھوٹے پیمانے پر گھر کی زندگی سے کرنا چاہتا ہے' یہاں سے وہ تربیت دیتا ہے۔

دنیا کے کسی کونے میں کسی معاشرے کی اگر اصلاح کرنی مقصود ہو تو اس کی ابتدا اس کے گھر سے کرنا ہوگی

آخر معاشرہ بنتا کیسے ہے؟ آپ کے گھر کی دائیں اور بائیں جو دیواریں ہوتی ہیں اگر ان کو آپ گراتے چلے جائیں تو گھر معاشرہ

بنتا چلا جائے گا۔ وہ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں صبح کو جب آپ گھر سے نکل جاتے ہیں‘ اسے آپ معاشرہ کہتے ہیں‘ جہاں چلے جاتے ہیں‘ شام کو جب اس چاردیواری میں آجاتے ہیں تو اسے پھر گھر کہتے ہیں۔ گھر اور معاشرہ دو چیزیں نہیں ہوتیں۔ معاشرے کی سمٹی ہوئی شکل گھر ہوتا ہے‘ گھر کی پھیلی ہوئی شکل معاشرہ ہوتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح چاہتے ہو تو گھروں کی اصلاح کرو۔ یاد رکھو! جس گھر میں ہمواریاں نہیں ہیں‘ اس معاشرے میں ہمواریاں نہیں پیدا ہو سکیں۔ قرآن گھر میں ہمواریاں ہی نہیں پیدا کرتا‘ سینئے! قرآن گھر کو جنت بنانے کے لیے ایک طریقہ بتاتا ہے اور جو معاشرے کے سارے گھر جنت بن جائیں معاشرہ جنت بن گیا۔ جنت یہیں بنا رہا ہے۔ جہنم کا نقشہ بھی ساتھ دیتا ہے۔

کسی گھر کی بنیاد رکھتے وقت پہلے ہی دن مادیت کے ترازو کے استعمال کی شرط ہی پیش کی جاتی ہے

گھر کی ابتدا میاں بیوی کے ایک عہد و پیمان سے ہوتی ہے‘ جسے وہ عقد کہتا ہے۔ ایک عاقل بالغ ذمہ دار‘ اپنی مرضی سے فیصلے کرنے والا مرد اسی طرح سے عورت کے ساتھ عہد و پیمان باندھتا ہے۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم گھر کی بنیاد رکھیں گے‘ ایک چھوٹے سے معاشرے کی تشکیل کریں گے۔ اس کے لیے بنیادی شرط کیا ہے؟ ہمارے ہاں کی شرائط تو آپ کو معلوم ہیں: لڑکا کیا کرتا ہے؟ سی ایس پی ہے‘ آڈٹ اکاؤنٹ سروس میں ہے‘ اتنی تنخواہ پاتا ہے۔ اس کا باپ کیا کرتا ہے؟ کوٹھی ہے‘ کار ہے۔ لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے؟ یہ کرتا ہے‘ وہ کرتا ہے۔ ساتھ کیا دے گا جی؟ لڑکی دے گا۔ اس کے ساتھ کیا دے گا؟ قرآن نے بیوی اور میاں کے لیے یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! مرد تنہا اس عورت سے وزن میں کم ہوتا ہے‘ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد‘ اس عقد کے ساتھ اپنی طرف سے ایک تحفہ اس کو ساتھ دے تاکہ یہ تمہارے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں۔ اسے کچھ دو کیونکہ تمہارے اکیلے کا وزن اس کے مقابلے میں کم ہے۔ یہ قرآن کی رو سے عورت کا مقام تھا۔ آج اس یتیم معاشرے کے اندر جس کے گھر جوان لڑکی ہو جاتی ہے‘ راتوں کو سو نہیں سکتا۔ شام کو گھر میں آتا ہے تو اس کی طرف نگاہ دوڑاتا ہے اور وہ جب باپ کی مایوسی کے اوپر نگاہ دوڑاتی ہے‘ اپنی چارپائی پہ رات بھر نہ وہ سوتی ہے‘ نہ وہ سوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اسے اس کے ساتھ کچھ دینا ہوگا۔ بچی کی تعلیم کی‘ پرورش کی‘ تربیت کی‘ انسان بنانا‘ اب اس جنسِ کاسد کے ساتھ کچھ دینے کے لیے اس کو چاہیے۔ پھر اس کی ڈیمانڈز دیکھیے۔ لڑکا ماشاء اللہ گورنمنٹ سرونٹ ہے جی ”سٹھاں روپیاں دا کلرک کیوں نہ بھاویں ہووے [1]۔“ میٹرک ہے‘ لڑکی ایم اے ہے۔ ساتھ کیا ملے گا؟ ڈیمانڈز چلی آ رہی ہیں۔

---

[1] بھلے وہ ساٹھ روپے ماہوار پانے والا کلرک ہی کیوں نہ ہو۔

انسانی زندگی میں گھریلو زندگی کی بنیاد ہمیشہ باہمی تصورات واعتقادات اور مزاج کی رفاقت پر ہے

عزیزانِ من! اس تصور سے انسانیت کی چیخیں نکل جاتی ہیں کہ انسان کے ساتھ زندگی کی نباہ کا معاہدہ کر رہے ہو، پوچھتے یہ ہو کہ اس کے ساتھ کیا ملے گا؟ لعنت ہے تم پر۔ قرآن کہتا ہے کہ ان تمام معیاروں کے مطابق اگر تم ایک گھر بناتے ہو، ٹھیک ہے، کوٹھی بھی مل جائے گی، کار بھی مل جائے گی، یہ سب کچھ ہوگا، بس ذرا سا فرق ہوگا کہ گھر جہنم بن جائے گا، بس اتنا سا فرق ہوگا۔ کہا کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ گھر جنت کیسے بنتا ہے؟ جنت بنتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ہی چیز دیکھنے کی ہے اور وہ ہے ہم آہنگی فکر ونظر، خیالات، اعتقادات، نظریات، مزاج، ان چیزوں کے اندر ہم آہنگی، یکسانیت ایک جیسا ہونا ہے اور قرآن نے اپنے معیار کے مطابق فکر ونظر وغیرہ کو جو ایک آخری شکل دی ہے اسے آئیڈیالوجی یا ایمان کہا ہے۔ جب وہ ایمان میں اشتراک کہتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بھی مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہو، وہ بھی مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ سوال تو یہ ہے نہیں۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں کافر، مشرک اور مومن کی اصطلاحات جو استعمال کی ہیں وہ قابلِ صد غور ہیں

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ گھر میں پیدا ہونے سے کوئی بچہ، نہ مسلمان پیدا ہوتا ہے، نہ کافر پیدا ہوتا ہے، اسے یہ کچھ ہونا پڑتا ہے اور یہ جو خیالات، اعتقادات، نظریات، فکر ان ساری چیزوں کے انتہائی مجموعے کا نام ایمان ہوتا ہے۔ یہ خالص ایمان ہے، اس کے مقابلے میں اگر اس میں دوسری چیزوں کا اختلاط ہے، آمیزش ہے تو اسے شرک کہا جاتا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے، یہاں کفر نہیں کہا۔ کافر کے ساتھ تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہو ہی نہیں سکتا یعنی وہ جو آپ کا مشن جسے آپ کہتے ہیں مانتا ہی نہیں۔ مسلمان نہیں ہے، قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ ایک کیٹگری (شق) ایسی ہے کہ تمہیں نظر آتا ہے کہ ان چیزوں کو وہ بھی مانتا ہے لیکن ان کے ساتھ وہ اپنی طرف سے اور چیزوں کو بھی ملا لیتا ہے، اسے مشرک کہتے ہیں۔ قرآن نے انتہائی مثال دی ہے۔ یکسانیتِ فکر ونظر اور تضادِ فکر ونظر۔ یکسانیت کو یہ کہا ہے کہ وہ مومن ہوتے ہیں، متضاد کو کہا ہے کہ وہ مشرک ہوتے ہیں۔ کہا ہے وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ (2:221) فکر ونظر میں ہم آہنگی نہیں ہے تو ان کے ساتھ نکاح نہ کرو تا آنکہ فکر ونظر میں ہم آہنگی نہ ہو جائے۔ تمہارا معیار یہ تھا کہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ کہا کہ آؤ تمہیں ہم بتائیں وَ لَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ (2:221) یاد رکھو! ایک مومن کسی گھر کے اندر خادمہ ہی کیوں نہ ہو وہ اس زمانے میں جہاں جب لونڈی کہا کرتے تھے، قرآن نے اسے ختم کر دیا۔ آج کی اصطلاح میں یوں سمجھ لیجیے گھر میں ملازمہ کیوں نہ ہو، خادمہ کیوں نہ ہو اگر وہ فکر ونظر میں اس مشرکہ عورت سے کہ جو کوٹھیوں کی اور کاروں کی مالک ہے، ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس سے یہ ملازمہ کہیں زیادہ بہتر ہے، خواہ کوٹھویں اور کاروں والی تمہیں کتنی زیادہ اچھی کیوں نہ لگے۔ گھر جنت بن رہا ہے۔ وَ لَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ

(2:221)وہ تو کہا تھا۔

قرآن حکیم ایک دوسرے کو پسند کرنے کا حق مرد اور عورت دونوں کو برابر دیتا ہے

اب دیکھیے کہ سوال صرف یہ نہیں ہے کہ مرد کسے پسند کرتا ہے؟ قرآن کے نزدیک تو مرد عورت دونوں کی یکساں پسندیدگی لازم ہے۔اب یہ کہا ہے وَ لَا تُنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَتّٰی یُؤۡمِنُوۡا (2:221)اے مومن عورتو!تم بھی کسی ایسے مرد سے شادی نہ کر لینا جو آئیڈیالوجی میں تم سے مختلف ہو‘ جو فکر و نظر سے ہم آہنگ نہ ہو۔خواہ تمہیں اس کی ملازمت‘ اس کی کوٹھیاں‘ اس کا کاروبار‘ اس کی دولت‘ اس کا بینک بیلنس کتنا ہی کیوں اچھا لگے۔وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَکُمۡ(2:221)اس سے کہ جو فکر و نظر میں آہنگ نہیں ہے‘ یہ جو گھر میں کام کاج کرنے والا لڑکا تمہیں نظر آتا ہے‘ اگر وہ ہم آہنگ ہے‘ وہ اس سے بہتر ہے یاد رکھو! اُدھر نہ جانا اِدھر آ جانا۔ کہتا ہے یہ جو لوگ تمہیں اس قسم کی شادیوں کے لیے آمادہ کرتے ہیں اُولٰٓئِکَ یَدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ(2:221)وہ تمہیں بلا بلا کے دعوت دیتے ہیں کہ تمہارے اس گھر کو جہنم بنا دیں اور ہم جو کہتے ہیں اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ہم نے اس میں سے لے نہیں لینا کوئی ہم Match Makers نہیں ہیں۔بات صرف یہی ہے کہ وَ اللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الۡجَنَّۃِ وَ الۡمَغۡفِرَۃِ بِاِذۡنِہٖ(2:221)ہم تمہیں جن کی طرف بلاتے ہیں‘ حفاظت کے لیے قلعہ دے رہے ہیں وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ (2:221)دیکھیے تمہارے لیے ہم باتوں کو کتنا واضح طور پہ بیان کرتے ہیں لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ (2:221)تاکہ وہ ہر وقت اس بات کو سامنے رکھیں۔جب یہ فیصلے کرنے لگے تو اس بات کو سامنے رکھ کر پھر فیصلہ کریں اور اس طرح سے وہ اپنے گھر کو جنت بنا لیں۔

سورۃ البقرۃ کی آیت 221 تک ہم آئے۔برادرانِ عزیز!بات عائلی زندگی کی آگے چلتی ہے۔احکام آئیں گے۔اب قرآن کا وہ دور شروع ہو گیا ہے‘ جہاں احکام آئیں گے۔اس کے متعلق ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

چھیالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 222 تا 227)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ ؕ قُلۡ هُوَ اَذًى ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الۡمَحِيۡضِ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ۚ فَاِذَا
تَطَهَّرۡنَ فَاۡتُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَيُحِبُّ الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ
لَّـكُمۡ ۖ فَاۡتُوۡا حَرۡثَكُمۡ اَنّٰى شِئۡتُمۡ وَقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ مُّلٰقُوۡهُ ؕ وَبَشِّرِ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ
عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِىۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰـكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ
حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآٮِٕهِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ ۚ فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا
الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی یکم تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے اس سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 222 سے آغازِ کلام کرتے ہیں: (8:222)

قرآن حکیم نے عائلی زندگی کی اہمیت کے پیشِ نظر تو جذبات تک کی راہنمائی کے لیے بھی احکام دے رکھے ہیں

آپ کو یاد ہوگا کہ اب عائلی زندگی کے متعلق، خاندانی زندگی کے متعلق، بات شروع ہوگئی ہے۔ پچھلی آیت میں نکاح کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس میں اس جوڑے کے لیے بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بنیادی فکر و نظر میں ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔ آئندہ چند آیات میں اسی سلسلے میں نکاح' تعلقات' کی کشیدگی' اس کا علاج کے متعلق اب کچھ احکام آئیں گے۔ اس سے پہلے جو چیزیں آئی تھیں وہ بطور اصول قرآن نے دی تھیں۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم چونکہ ابدی طور پر ضابطہ ہدایت ہے اس لیے اس میں بیشتر صرف بنیادی اصولوں سے گفتگو کی گئی ہے لیکن بعض معاملات ایسے ہیں جن میں تفصیلی قوانین بھی دیے گئے ہیں اور جزئیات سے بھی بحث کی گئی ہے اور یہ معاملات بیشتر

کی زندگی سے' عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا قرآنِ کریم عائلی زندگی کو Home (گھر' مکان نہیں) کی Life (زندگی) کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ اسی سے معاشرہ بنتا ہے' اسی سے اُمت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس لیے جزئی اور فرعی قوانین تفصیل کے ساتھ' ان معاملات کے متعلق ملیں گے۔ دیگر معاملات کے متعلق بالعموم اصولی طور پر' اساسی طور پر' قرآن نے قوانین دیے ہیں۔ نکاح کی آیت کے بعد ہے کہ **یسئلونک عن المحیض** (2:222) تجھ سے' اے رسول! عورتوں کی ماہواری یعنی ایام کی بابت پوچھتے ہیں۔ یاد رکھے! قرآن نے یہ جو یسئلونک کہا ہے کہ تجھ سے یہ سوال کرتے ہیں' پوچھتے ہیں' یہ کوئی دس گیارہ مرتبہ سارے قرآن میں آیا ہے اور وہ بھی زندگی کے ان معمولات کے متعلق ہی سوالات ہیں' اس سے زیادہ نہیں۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ جن جن چیزوں کی ضرورت تھی' قرآن میں وحی کی رو سے از خود وہ چیزیں آتی تھیں۔ بہت کم باتیں ایسی تھیں جو ان لوگوں نے پوچھیں اور ان سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ عام طور پر اس وقت وہ عربوں کے معاشرے کی سطح کیا تھی۔ (مثلاً) قوم تہذیب و تمدن میں بھی کس مقام پر تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن کو یہ بھی بتانا پڑا کہ بھئی! دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو اجازت لیا کرتے ہیں۔ آواز دینی ہو تو گھر سے باہر کھڑے ہو کر آواز دیتے ہیں۔ کوئی دعوت پہ بلائے تو پہلے ہی جا کر نہیں بیٹھ جایا کرتے کہ ہنڈیا ابھی چولہے پر ہو اور تم جا کر بیٹھ جاؤ۔ کھانا کھا چکو تو پھر گھر آ جایا کرو' نہ جانے یا دیر سے جانے پر گھر والوں کو بڑی تکلیف ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ چیزیں بھی وحی کی رو سے بتانی پڑیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ معاشرے کی عام سطح اس دور میں یا کم از کم عرب معاشرے کی سطح کیا تھی اور اس سطح سے اس قوم کو اُٹھا کر پھر اس مقامِ بلند پہ لے کر آئے' انہوں نے ایسی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی جو آج تک یورپ کی اقوام کے لیے بھی باعث فخر چلی آتی ہے۔ اسے کہتے ہیں انقلاب لانا۔

کسی خاص بیان کو بیان کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز ہمیشہ ایمانیت کا ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن نے یہ جو چیزیں کہی ہیں ان سے یہ بتانا بھی ایک مقصود ہے کہ جو یہ اوّلیں مخاطب قوم تھی جسے ایک اُمت وسطا بنانا تھا' اس کی عام ذہنی تمدنی تہذیبی سطح کیا تھی؟ یہ سوال بھی اسی ضمن میں آتا ہے کہ ایام کے متعلق تم سے پوچھتے ہیں۔ **قل ھو اذی** (2:222) ان سے کہو کہ یہ اذًی ہے۔ اذًی کے لفظ میں یہ بیماری بھی نہیں ہوتی' تکلیف بھی نہیں ہوتی' بس واماندگی کسل مندی کی سی چیز ہوتی ہے جس میں تھوڑا سا مضرت کا پہلو ہو۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ یہ جو زناشوئی کے تعلقات ہیں ان میں قرآن بات ہمیشہ Suggesion سے کرتا ہے' ایمائیت سے کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ جو کتاب ہے' یہ مردوں نے' عورتوں نے' بچوں نے' بوڑھوں نے' ہر ایک نے' اس سے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔ ان معاملات میں وہ گفتگو ہمیشہ اشارتاً کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کہا کہ **قل ھو اذًی**

(2:222) اس میں عورت کے لیے تو کچھ داماندگی کی سی' کسل مندی کی سی' صورت ہوتی ہے' مقاربت میں مضربت کا پہلو ہوتا ہے۔ **فاعتزلوا النسآء فی المحیض ولا تقربوھن حتٰی یطھرن** (2:222) ان ایام میں اعتزال برتو' اجتناب برتو' احتراز برتو' مقاربت نہ کرو' تا آنکہ وہ اس سے پاکیزہ نہ ہو جائیں۔ **فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللّٰہ** (2:222) جب وہ ان ایام سے پاکیزہ ہو جائیں تو پھر مقاربت کے لیے آؤ۔ یاد رکھیے کہ قرآن نے یہ ایام کے دنوں میں مقاربت کے متعلق ہی اجتناب کا کہا ہے۔ وہ بات نہیں جیسے کہ عام دوسری سوسائٹیوں میں ہوتا ہے' ہندوؤں میں عام طور پہ کہ ان ایام میں عورت کو گھر سے باہر نکال دیتے ہیں وہ ایک کوٹھڑی کے ایک کونے میں بالکل بے چاری اچھوت بن کر پڑی رہتی ہے۔ وہیں کھانا پھینک دیا جاتا ہے جیسا کتے کو کھانا دیا جاتا ہے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان ایام میں اس کو اس دقر ناپاک تصور کرتے ہیں کہ وہ گھر میں چل پھر بھی نہیں سکتی۔ قرآن نے صرف مقاربت کے سلسلے میں یہ کچھ کہا ہے اور کسی بات کے لیے یہ چیز نہیں کہی۔ یہ نہیں ہے کہ ان دنوں میں یہ جنس (معاذ اللہ) ناپاک ہو جاتی ہے بلکہ یہ جو چیز ہے یہ صرف مقاربت کے لیے ہی یہ کہا ہے کہ ان میں اعتزال برتو' اجتناب برتو۔ **فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللّٰہ** (2:222) یہ چیز ذرا غور طلب ہے کہ جب وہ اس سے پاکیزہ ہو جائیں تو پھر تم مقاربت کے لیے آؤ جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ اس کے لیے قرآن میں کوئی خاص حکم نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں ایسے امور' جو عام طور پر فطری طریق پر سرانجام دیے جاتے ہیں' ان کے متعلق بھی یہ کہا گیا ہے کہ جیسا خدا نے تعلیم کیا ہے' جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے' جیسا کہ خدا نے تجویز کیا ہے۔ یہ فطرت کے امور جس طرح سے ہوتے ہیں ان کے لیے بھی یہ چیز ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جہاں یہ چیز آئے' وہاں ہم یہ دیکھنا شروع کریں کہ وحی کے ذریعے سے یہ کچھ بھی بتایا گیا ہے؟ کہاں بتایا گیا ہے؟ بتاؤ صاحب! کہاں یہ کہا گیا ہے؟ فطرت کے طریقوں کے مطابق بھی جو چیزیں کی جاتی ہیں' ان کے متعلق بھی یہی کچھ کہا گیا ہے۔ وہ بھی حقیقت میں وحی کا ہی ایک طریق ہے' اگرچہ طریق اس میں بدلا ہوا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے وہ کہا ہے کہ ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ وحی کا طریق بدلہ ہوا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ **من حیث امرکم اللّٰہ** (2:222) کے معنی یہ نہیں کہ اب اس کے بعد ہم دیکھیں کہ قرآن میں یہ طریق بھی کہاں تجویز کیا گیا ہے؟ اس کے معنی ہیں ''فطری طریق کے مطابق''۔ **ان اللّٰہ یحب التوابین ویحب المتطھرین** (2:222) غلط روش اختیار کرنے والے جو لوٹ کے صحیح روش پہ آ جاتے ہیں اور جو پاکیزگی رکھتے ہیں' انہیں خدا پسند کرتا ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ قلب ونگاہ کی تطہیر اور پاکیزگی کے ساتھ قرآن اس جسم ولباس کی پاکیزگی کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے' اس پہ بھی وہ زور دیتا ہے۔ آگے چل کر آپ مختلف مقامات پر ان چیزوں کو دیکھیں گے۔ بدن کی صفائی'

جسم کی صفائی، کپڑوں کی صفائی۔ یہ طبعی زندگی کی جو صفائی ہے، وہ صحت کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔ صحت مند ہونا تو قرآن نے کہا ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں، انقلاب برپا کرنے کے لیے بڑی بنیادی شرط ہے۔ اس لیے اس نے یہ کہا ہے کہ پاکیزگی یعنی جسم و نگاہ کی پاکیزگی، جسم واطوار کی پاکیزگی خدا پسند کرتا ہے۔

افزائش نسل کے سلسلہ میں وہ قرآنی احکام جو بلیغ اشاروں میں بیان کیے گئے ہیں

اب یہاں فاتوھن تھا ان کے قریب آؤ جس طرح سے خدا نے حکم دیا ہے اس کے معنی ہو سکتے ہیں جو میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا یا اشارہ کیا تھا۔ اگلی آیت میں ایک بات کہی ہے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے اور جیسا میں نے گزارش کیا ہے کیونکہ گفتگو ذرا نازک سے معاملات کے متعلق ہو رہی ہے اس لیے قرآن تشبیہات استعارات اشارات سے گفتگو کرتا ہے، مجازی طور پر تفصیل میں نہیں جاتا۔ کہا ہے کہ **نسآؤکم حرث لکم** (2:223)۔ یہ سوال تھا کہ مقاربت کے لیے تم آؤ جیسا کہ خدا نے اس کے لیے تجویز کیا ہے۔ اب اس آیت میں اس تجویز کرنے کی تشریح آئی ہے اور یہ بڑی بلیغ چیز ہے کہ کسان اور کھیتی کا معاملہ ہے۔ قرآن بھی اشاروں میں ہی گفتگو کرتا ہے، مجھے بھی اشاروں میں ہی گفتگو کرنا ہے۔ میں بھی اس کو زیادہ کھلے الفاظ میں نہیں کہہ سکتا، بزم میں میری بیٹیاں بھی ہیں اور بعض باتیں ایسی ہیں کہ اشارتاً کہی جا سکتی ہیں۔ کہا ہے کہ **نسآؤکم حرث لکم** (2:223) کتنا بلیغ اشارہ ہے۔ یہ زن اشوئی کا جو تعلق ہے یہ افزائش نسل انسانی کے لیے ہے اور یہی بنیادی چیز ہے۔ Preservation of Race (تحفظ نسل) جو ہے یہی فطرت کا تقاضا ہے۔

فطرت میں آپ دیکھئے حیوانی سطح تک فطرت خود Direct کرتی ہے، کنٹرول کرتی ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہاں جو نر اور مادہ کی مقاربت ہوتی ہے وہ صرف اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی طرف سے استقرارِ حمل کا تقاضا ہوتا ہے، اس کے علاوہ کبھی نہیں ہوتی۔ سال بھر گائیوں کے ایک پورے گلے میں بیل بھی وہیں ہوتے ہیں، گائیں بھی وہیں ہوتی ہیں، اس قسم کے تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن جب فطرت کا تقاضا ہوتا ہے Mating Season (جفتی رُت) آتا ہے جب اس مقاربت سے استقرارِ حمل کا وقت آتا ہے، فطرت خود ان کو یہ حکم دیتی ہے، ان کے اندر ایک Urge پیدا ہوتی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر وہ Urge کتنی شدید ہوتی ہے۔ اس وقت مقاربت ہوتی ہے اور جب یہ استقرارِ حمل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد پھر ان کے درمیان اس قسم کا کوئی جنسی تعلق باقی نہیں رہتا۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے اس کے اُوپر فطرت نے خود کنٹرول رکھا ہوا ہے۔ (1869-1797) بڑے لطیف انداز میں یہ بات کہہ گیا ہے غالب

چاک مت کر جیبؔ بے ایامِ گل

کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

اختیار وارادہ کی بنا پر انسان کو فطرت کے یہ قوانین خود ہی اپنانے ہوں گے

بن حیوانی سطح تک تو یہ چیز وہاں ہوتی ہے۔انسان کو صاحب اختیار وارادہ بنایا گیا ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں اسے اختیار دیا۔اس معاملے میں بھی فطرت نے اپنا کنٹرول اُٹھالیا۔اس کی ایک وجہ خاص ہے۔حیوانات کی زندگی میں یہ صحیح ہے کہ وہ بےایامِ گل' میں انہی لفظوں میں بات کروں گا' جب تک اُدھر سے فطرت کا اشارہ نہ ہو' مقاربت نہیں کرتے لیکن جب اشارہ ہوتا ہے تو پھر

عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

پھر بجھائے نہیں بنتی۔وہاں مقاربت' وہاں استقرارِ حمل ضروری ہوجاتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ حیوانات میں فیملی پلاننگ خود نہیں کیا جاسکتا۔وہاں فطرت یہ کچھ کرتی ہے' وہ مجبور واقع ہوتے ہیں۔انسان صاحب اختیار واقع ہوا ہے اس لیے Mating Season (جفتی رُت) نہیں آتا۔اس کے لیے کسان اور کاشت کی تشبیہ تجویز کی گئی ہے۔نسآؤ کم حرث لکم فاتوا حرثکم انّٰی شئتم (2:223) جب کھیتی بونی مقصود ہو اس وقت کاشت کاری کے لیے آؤ شئتم۔حیوانات کے سلسلے میں شئتم کا سوال نہیں تھا' حیوانات کی مشیت پہ نہیں' اس کو وہاں چھوڑا گیا مشیت اپنے ہاتھ میں اس کو رکھتی ہے۔یہاں شئتم میں انسانی مشیت پہ اس کو چھوڑا گیا لیکن جیسا کہ انسان نے ہمیشہ ہر باب میں کیا ہے' جہاں اس کو اختیار ملا ہے' اس نے اپنے اس اختیار کو ایسا Abuse کیا ہے کہ اس پہ پھر حیوانات بھی نگاہیں زمین میں گاڑ کے بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ کر کیا رہا ہے۔یہی صورت جنسی تعلقات کے بارے میں ہوئی۔

دنیائے انسانیت میں اس سب سے بڑے فتنے کا علاج خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے

دنیاوی فتنے کا سب سے بڑا موجب آپ کے ہاں یہ جنسی مسئلہ بن گیا۔جو فطرت کے تقاضے کے مطابق کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔یہ ایسا لاینحل مسئلہ ہے کہ حل ہی نہیں ہو پاتا صرف اس لیے کہ انسان نے اپنے اختیار کو Abuse کرنا شروع کر دیا' اس کا غلط استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔حیوانات کی سطح تک اس کو بھی مجبور رکھا جاتا تو یہ ٹھیک ہے کہ اس میں یہ صورت ہوتی کہ ''لگائے نہ لگے اور بجھانے نہ بنے۔'' لیکن بجھائے نہ بنے کی صورت میں جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ کنٹرول نہ رکھ سکتا پاپولیشن پہ بچوں پہ کنٹرول نہ رکھ سکتا' جتنے بچے فطرت چاہتی اتنے پیدا کرنے کے لیے مجبور ہوجاتا۔فطرت نے تو اس لیے اس کو انّٰی شئتم (2:223) کہا تھا۔اس کے اندر جو اس ایمائیت میں تھوڑی سی Sugar Coating کر دی ہوئی ہے' فطرت نے ایک لذت کا پہلو رکھ دیا ہوا ہے۔انسان نے اسی کو مقصود

بالذات سمجھ لیا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ کیسے عمدہ انداز میں قرآن یہ بات کہہ گیا ہے! کھیتی اُگانا مقصود ہوتا ہے تو اس میں پھر کاشت کاری کی صورت ہوتی ہے کہا کہ فاتوا حرثکم انیٰ شئتم (2:223)۔

ہمارے ہاں کی خودساختہ روایات نے قرآن حکیم کی واضح تعلیم کو کیا سے کیا بنا رکھا ہے؟

یہ بات تو میں نے اس دور کی تھی یا وہ کی تھی جب یہ اپنے اختیارات کو Abuse کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اسی آیت (2:223) سے آپ حیران ہوں گے، سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے کہ کیا مفہوم لیا گیا۔ کیا اس پر بحثیں چلیں۔ عریاں گفتگو ہو جائے گی اس لیے میں تفصیل میں یوں نہیں جانا چاہتا۔ انہوں نے صرف ایک لفظ کے معنی کیے کہ حرثکم انی شئتم (2:223) جہاں سے تمہارا جی چاہے اور اس کے بعد اگر آپ تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے معنی کیا لیے گئے اور اس پہ کیا بحثیں چلیں تو آپ کے ہاں میں صرف یہ کہوں گا کہ ادارہ (طلوعِ اسلام) کی طرف سے مقام حدیث ایک کتاب شائع ہوئی ہے اس میں انیٰ شئتم کا اس کے اُوپر پورا ایک باب ہے کہ اس کا مفہوم پھر کیا لیا گیا۔ جہاں سے اس کے معنی کیے اس سے آگے جانے کی حیا اجازت نہیں دیتی۔ وہاں دیکھئے کہ پھر کیا کیا معنی اس کے کیے گئے، کیا کیا بحثیں اس کے اُوپر چلیں۔ انیٰ کے معنی ہیں کہ جب تمہاری مشیت میں ہو۔

حیوانات تو قانون خداوندی کا ادراک کسی اختیار وارادہ کی بنا پر کرتے ہی نہیں

استقرارِ حمل کے لیے ایک چیز ہے اور جب تم استقرارِ حمل چاہو۔ حیوانات میں ''جب تم چاہو کی بات نہیں تھی''۔ انسان کے لیے ''جب تم چاہو کی بات آگئی''۔ کتنی بڑی بلیغ چیز تھی جو کہاں چلی گئی۔ وہاں یہ مباحث شروع ہو گئے اور ہمارے ہاں پھر یہ اس دور کے اندر جیسا کہ میں نے کہا ہے اس چوائس کو اس اختیار و ارادے کو جب ناجائز استعمال ہوا تو پھر پوچھو ہی نہیں کہ یہ مسئلہ ایسا بن گیا جس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ بہرحال میں اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں۔ بات جنسی مقاربت کی ہو رہی ہے۔ بات اولاد پیدا کرنے کی ہو رہی ہے۔ قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ تمہاری ساری توجہ اسی چیز کے اُوپر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے اور اصل مقصد حیات فراموش کر جاؤ، یہاں تک بات کرتے ہوئے آیت ختم نہیں کی بلکہ کہا کہ وقدموا لانفسکم (2:223) یاد رکھو! مقصد حیات یہی اولاد پیدا کرنا ہی نہ کہیں سمجھ لینا، دیکھنا یہ کہ تم اپنی ذات کے لیے آگے کیا بھیج رہے ہو اس لیے کہ اصل مقصود اپنی ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ مادی تصورِ زندگی میں تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ

کیا کہیں احباب کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی، بچے پیدا کیے اور مر گئے

حیوانی سطح زندگی کی انتہا اور پھر اس مقصودِ حیات کا ماحصل

اللہ کا شکر ہے جی! زندگی بڑی باعزت گزری۔ نوکری کی' بڑی باعزت نوکری کی۔ اولاد دی اللہ تعالیٰ نے' بیٹیاں بیاہی گئیں' بیٹے کاروبار پہ ہوگئے' پنشن ملتی ہے۔ زندگی کے آخری دن ہیں اللہ کی یاد میں گزر جاتی ہے' بڑی کامیاب زنگی گزاری صاحب!'' کہیے صاحب! اگر کامیاب زندگی یہی ہے کہ آپ کو کھانے پینے کو ملتا رہا' جیتے رہے' بچے پیدا کیے' وہ بھی کھانے پینے کے قابل ہوگئے تو پھر آپ میں اور ایک جنابِ بیل میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ اپنے اس چارے کے لیے آپ کو ہزار پریشانیاں اُٹھانی پڑیں جو اسے نہیں اُٹھانا پڑیں اور انجام کار مقصود دونوں کا ایک کہ وہ' بچے پیدا کیے' وہ چرنے چگنے کے قابل ہوگئے' تمہارے بچے ہوئے وہ کاروبار کے قابل ہوگئے' وہ بھی مرگئے تم بھی مرگئے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ دیکھیے سوال جنسی مقاربت کا ہو رہا ہے' سوال اولاد پیدا کرنے کا ہو رہا ہے۔ یہ خالص مادیت کی چیز۔ درمیان میں یہ چیز کہتا ہے کہ **وقدموا لانفسکم** (2:223) اس میں کہیں اسی میں جذب ہوکر نہ رہ جانا۔ زندگی آگے بڑھنے والی ہے' انسانی نفس نے آگے چلنا ہے یہ دیکھو کہ اس کے لیے تم آگے کیا بھیج رہے ہو۔ تم نے زندگی یہی اولاد پیدا کرنا ہی مقصود بالذات نہ سمجھ لیا۔ کہا کہ **واتقوا اللہ واعلموا انکم ملقوہ** (2:223) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور ہر وقت اس بات کو سامنے رکھو کہ تم نے اس کے اعمال کے حساب کے لیے اس کے سامنے جانا ہے۔ مقصد حیات یہی نہ سمجھ لینا کہ نکاح کیا بیوی آئی' بچے پیدا کیے' ان کی پرورش کی۔ ہر حیوان یہ پرورش کرتا ہے۔ چڑیا اور چڑے کو دیکھئے کہ بچے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں کس طرح وہ جان مار دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہر حیوان یہ کچھ کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا نہیں کرتا؟ یہ کہ **قدموا لانفسکم** (2:223) اس کے تصور میں نہیں ہوتا۔ انسان کے ذہن میں بھی یہ بات نہ رہے اور باقی وہ سب کچھ ہو تو یہ حیوانی سطح زندگی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے **بل ھم اضل** (7:179) اس سے بھی بدتر حالت گزر گئی۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے وہ تو پھر بھی فطرت کے اشارے کے مطابق چلتے ہیں' تم اس کو Abuse کرتے ہو' حیوانات سے بھی بدتر حالت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے **قدموا لانفسکم واتقوا اللہ واعلموا انکم ملقوہ** (2:223) اور آگے کہا ہے کہ **وبشر المؤمنین** (2:223)۔ اب مومنین کا ایک تو وہ درجہ انسانی ہے' انہوں نے بھی اولاد پیدا کرنی ہے' گھر بسانا ہے' کھانا ہے' پینا ہے' یہ سب کچھ ہے لیکن اس کے آگے جو چیز ہے' وہ ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی ہے جسے کہا ہے کہ اپنی ذات کے لیے **قَدِّمُوْا** کچھ آگے بھیجو۔ یاد رکھو کہ تم نے وہاں اس کے سامنے جا کے کھڑے ہونا ہے۔ جو یہ چیز اپنے سامنے رکھتے ہیں' کہا کہ انہیں زندگی کی خوشخبری دو۔ محض بچے پیدا کر کے مرجانے والے کے لیے خوشخبری نہیں ہے۔ درمیان میں ضمناً یہ چیز کہتا ہوا' پھر قرآن

اسی موضوع کو لے آتا ہے۔ دیکھا! کس طرح اصل مقصد کو وہ نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا' ساتھ ساتھ لیے چلا آ رہا ہے۔

جہالت میں یا غصے کے عالم میں کھائی ہوئی قسم کا انجام اور اس کا حل

گھر میں زندگی شروع ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی ناراضگی کا پہلو بھی آ جائے' کسی چیز میں تھوڑی سی کشمکش بھی ہو جائے اور پھر اگر صحیح تادیب نہیں ہوئی' ترتیب نہیں ہوئی' ذرا ذرا سی بات کے اُوپر پارہ بھی چڑھ جاتا ہے۔ جہالت ہوتی ہے' قسمیں کھا لیتے ہیں' تم سے بولوں گا نہیں' تمہیں وہاں گھر نہیں جانے دوں گا' سسرال کے ہاں سے یہاں کوئی آ نہیں سکے گا۔ ایسا ہو تو میں پھر وہ ہوں۔ روز جہالت کی یہ باتیں ہوتی ہیں۔ قرآن اس قوم کو اس سطح سے اُٹھا رہا ہے۔ آپ دیکھئے گا یہ وہ قوم ہے جو اوّلیں مخاطب ہے کہا کہ **ولا تجعلوا اللّٰہ عرضۃً لایمانکم ان تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس واللہ سمیع علیم** (2:224) یونہی جہالت میں' غصے میں آ کر قسم کھا بیٹھیں۔ اب اس کے بعد کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ ٹھیک ہے بات تو آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں تو قسم کھا چکا ہوں صاحب! کیا قسم کھا چکا ہوں؟ کہ صاحب! اس کے بعد میں کسی شخص کو ایک پائی بھی قرضہ نہیں دیا کروں گا۔ ٹھیک ہے تمہیں زندگی کا کوئی ایک تلخ تجربہ ہوا ہے لیکن اس کے بعد کیا یہ اصول بنا لیا کہ کسی ضرورت مند کی تم مدد نہیں کرو گے۔ کہہ رہا ہے کہ صاحب! مدد کرنے کو تو جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں میں قسم کھا چکا ہوں۔ یعنی اپنے اختیار کو خود سلب کر لیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو اور خاص طور پہ یہ کہا کہ اس قسم کی لغو قسموں کو نوعِ انسانی کی ہمدردی کے لیے' حسن سلوک کے لیے' سپر نہ بنا لیا کرو۔ یہ کرنے کو جی چاہتا نہیں اور بجائے اس کے کہ یہ کہے کہ نہیں صاحب! میں نہیں کرنا چاہتا ایک سپر بنا لی کہ صاحب! میں نے تو قسم کھا لی ہوئی ہے۔ قرآن اس باب میں انسان کو کتنی بلندیوں پہ لے جاتا ہے' کتنی Broad Mindedness (وسعت قلب) پیدا کرنا چاہتا ہے! عزیزانِ من! سورۃ النور میں ایک بات آئی ہے' اس نے ایک واقع بیان کیا ہے۔ کسی محترمہ خاتون کے خلاف بہتان لگا حماقت سے' جہالت سے اس کا عام چرچا کیا گیا' معاشرے میں ایک فتنہ پھیل گیا۔ بہرحال بات فرو ہوگئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس خاتون کے جو عزیز یا رشتے دار تھے' آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔

قرآن حکیم کی تعلیم انسان کی انسانیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی نشو ونما کرتی ہے

کسی عفت مآب بیٹی کے اوپر اس قسم کی تہمت لگ جانا' پھر اس کا اتنا بڑا چرچا ہو جانا۔ تو جو لوگ اس جرم کے مرتکب تھے' وہ سامنے تھے' ایسا نظر آتا ہے کہ انہوں نے اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ جو عام حالات میں ان سے حسن سلوک کیا کرتے تھے' ان کی کچھ مدد کیا کرتے تھے' اس سے ہاتھ روک لیا۔ عام حالات میں یہی کچھ ہوگا بلکہ ہم تو اس انتقام میں اس سے بھی آگے بڑھیں گے۔ پتہ نہیں کتنا کچھ کر

گزریں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اتنا کرلیا کہ نہیں صاحب! ان لوگوں کے ساتھ ہم حسن سلوک نہیں کرسکتے دیکھئے معاملہ کتنا نازک ہے؟ ایک عفت مآب بیٹی کے خلاف اتنا بڑا بہتان لگا ہے' اس کے خلاف افترا ہے اور وہ اتنا کرتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہم ان کی مدد نہیں کیا کریں گے۔

جب معاملہ صاف ہوگیا' معافی مانگی گئی' عفو ہوگیا' درگزر ہوگیا۔ دیکھئے! قرآن کتنی وسعت نگاہ اور ظرف میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ کہا کہ **ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربیٰ والمسٰکین والمھٰجرین فی سبیل اللّٰہ** (24:22) دیکھئے! یہ جو ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ اس سے کہیں یہ بات نہ ہوجائے کہ جو عام حالات میں جن مستحقین کی تم مدد کیا کرتے تھے' اس بنا پر کہ تمہیں ان سے یہ دکھ پہنچا ہے' تم ان کی مدد سے ہاتھ رکھ لو۔ قرآن کیا تربیت کرتا ہے کیا قوم پیدا کی ہوئی تھی۔ اُدھر یہ حکم ہے کہ **لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا** (5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر کہیں آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے انصاف کرو' عدل نہ کرو۔ عدل کی یہ تاکید ہے کہ وہ دشمن ہیں' دشمنی کررہے ہیں لیکن اس پہ بھی تم ان کے ساتھ عدل کرو۔

قرآن حکیم نے کھائی ہوئی قسموں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے

احسان کی یہ کیفیت ہے کہ جن کے ہاتھوں تمہیں اس قدر دکھ دینے والی بات پہنچی ہے' حسن سلوک کا جہاں مقام آتا ہے کہ ان سے بھی ہاتھ نہ کھینچو۔ جاہل تھے' جہالت میں یہ کرگئے۔ وَیَعۡفُوۡا عَنِ السَّیِّاٰتِ (42:25) معاملہ رفع دفع ہوگیا' تم بھی رفع دفع کرو' اس بات کو دل سے نکال دو' درگزر کرو' آگے بڑھ جاؤ' ہمواری پیدا کردو۔ یہ تھوڑی سی ناہمواری پیدا ہوئی تھی' تم حسن سلوک سے ہمواری پیدا کردو' اپنا ہاتھ نہ روکو۔ یہی چیز یہاں کہی ہے کہ اس قسم کی قسمیں کھا لینے سے یہ نہ کرو کہ حسن سلوک سے ہی تم ہاتھ روک دو کہتا ہے کہ **لا یؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم واللّٰہ غفور حلیم** (2:225) وہ قسمیں بھی دو قسم کی ہوجاتی ہیں۔ اوّل تو یہ جہالت کی بات لیکن وہ کہتا ہے کہ ایک تو وہ ہوتا ہے کہ غصے میں آ کر بغیر سوچے سمجھے ہوئے' یونہی کچھ دبک دیا' اسے وہ کہتا ہے کہ یہ لغو کی قسم ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کوئی بات ہی نہیں ہے' اس کا کوئی مواخذہ ہی نہیں ہے یعنی اس پہ کوئی جرمانہ یا سزا نہیں لیکن ہے بڑی جہالت کی بات' یہ نہ ہو کہ اس قسم کی باتیں تم ہر وقت کرتے رہا کرو اور یہی کچھ کرنا شروع کرو۔

جذباتی کیفیت سے ہٹ کر قسم کھانے پر بطور تحدید کچھ کفارہ ادا کرنا ہوگا

دوسری چیز یہ ہے کہ واقعی ارادے سے' دل کے فیصلے سے' تم نے کوئی قسم کھالی لیکن یہ نہیں کہ اس قسم کھانے سے ابدی طور پر اب تمہاری آزادی سلب ہوگئی۔ اس کے بعد جب تمہیں یہ احساس ہوا کہ یہ غلطی ہوگئی ہے' ندامت ہوئی' تم اس سے لوٹنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے

بطور تحدید کے اس کا کچھ تھوڑا سا کفارہ دو۔ یہ سورۃ المائدہ کی 89 آیت میں اس کفارے کا ذکر ہے' وہاں یہی الفاظ ہیں کہ **لا یؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان** (5:89) اس کے لیے کفارہ ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ' یا اس زمانے میں غلام ہوتے تھے' غلام آزاد کرو۔ جو یہ بھی نہ پا سکے تو تین دن کے روزے رکھے۔ **ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم** (5:89) اتنا سا کفارہ دے دو تا دیبی طور پر یہ چیزیں کہہ دیں اور ٹھیک ہے پھر تم اس اپنی قسم کو چھوڑ سکتے ہو۔ یہاں بھی وہی چیز کہی۔ اب ان قسموں کے ذکر میں آگے بات آتی ہے کہ کس قسم کی یہ جہالت میں قسمیں کھا لیا کرتے۔

بیوی سے 4 ماہ تک تعلقات منقطع کرنے کی صورت میں عقدِ نکاح کو ختم کرنا ہوگا

اب بھی ہمارے ہاں جہالت میں یہ چیزیں ہوتی ہیں کہا کہ **للذین یؤلون من نسآئم تربص اربعة اشھر فان فآؤ فان اللہ غفور رحیم** (2:226) بیوی سے تعلقات منقطع کرنے کی قسم کھا لی یا یہ کہہ دیا کہ میاں بیوی کے تعلقات بالکل نہیں رہیں گے۔ جسے Saperation کہتے ہیں' یہ کچھ کر لیا۔ اب یہ کرنے کے بعد نہ تو وہ بے چاری منکوحہ ہے' نہ مطلقہ ہے' تم مر جاؤ تو بیوہ ہو جائے بے چاری' پھر بھی پیچھا چھوٹے۔ اب یہ ایک Situation (صورتِ حال) ہی عجیب کھڑی کر لی۔ وہ تمہارے عقد نکاح میں بھی ہے اور یہ جو میاں بیوی کے تعلقات ہیں اس میں تم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے علیحدگی اختیار کر لی۔ تو اب کیا یہ جناب کی مرضی پہ چھوڑ دیا گیا کہ جب تک جی چاہے وہ ادھر لٹکی رہ جائے؟ کہا کہ یہ غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی تمہیں مہلت دی جاتی ہے' اس میں فیصلہ کرو اگر نکاح برقرار رکھنا ہے میاں بیوی کی طرح رہو اور اگر ایسی صورت نہیں ہے: **وان عزموا الطلاق فان اللہ سمیع علیم** (2:227) اور نکاح سے آزاد کرنے کی صورت ہے تو باقاعدہ جیسے طریقہ بتایا گیا ہے' نکاح سے آزاد کرو۔ معاملے کو یکسو کرو۔ یہ سسپنس (suspence) میں رکھنے کے کیا معنی ہیں؟ یہ جو یہاں آیت ہے اس کو ایلاء کہتے ہیں یعنی میاں بیوی میں تعلقات زناشوئی کا عارضی طور پر منقطع کر لینا' جسے عارضی Saperation کہتے ہیں۔

جہالت میں بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی

دوسرے مقام پہ سورۃ الاحزاب میں ایک دوسرا لفظ آیا ہے اسے ظِھــــر کہتے ہیں' وہ بھی وہاں ایامِ جاہلیت میں ایک قسم کی قسم کھا لیا کرتے تھے۔ میں نے جہلا میں یہاں بھی یہ چیز دیکھی ہے' غصے میں آ کر بیوی سے کہا کہ ''توں تے میری ماں لگنی ایں[1]''۔

---

[1] تم تو میری ماں لگتی ہو

اب اس کے بعد پھر جب ندامت ہوتی ہے تو پھر بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا کیا جائے۔ ندامت کے حل کے لیے بھی جہالت ہو تو

وہ بات یاد آ گئی۔ وہ یونہی ہماری طرف یہ باتیں منسوب کر دیتے ہیں۔ ذرا سی حماقت کی سی ہوتی ہیں وہ گاؤں میں جولاہوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ کچھ اس قسم کے ہی ہوتے ہیں۔ (مثلاً) وہ غصے میں آ کر بیوی سے کہہ بیٹھا کہ ''توں تے ماں لگنی ایں۔ اوہدے بعد جیس ویلھے غصہ رفع ہویا'' ❶۔

---

❶ تم تو ماں لگتی ہو۔ جس وقت غصہ رفع ہوا۔

تو اس وقت سوچا کہ اب کیا کیا جائے' یہ تو بڑی مصیبت کی بات ہوئی۔ مولوی صاحب کے ہاں چلے گئے' جا کر پوچھا اس نے کچھ کفارے کی بات بتائی۔ اب غریبی گھر میں ہے' وہ پانچ سات روپے کا بھی اگر خرچہ تھا تو وہ بھی کسی کا سوت' کسی کی اٹی' وہ کچھ بیچا بچایا کر یہ سب کچھ کیا' وہ جا کے تاوان بھر سب کچھ کیا۔ شام ہوگئی' یہاں آ کر وہ بیٹھ گئے' اب وہ افسوس زدہ تو دونوں ہی تھے۔ بیوی چولہے کے پاس بیٹھ گئی' یہ میاں چارپائی پہ حقہ لے کر بیٹھ گئے۔ اب اس افسوس کے عالم میں بیوی نے یہ کہا کہ ''ویکھنا اللہ دے آ بندے آ' جے ایہو جئے ویلھے غصے نوں روک لیا کرے' ایہو جیا کلمہ منہ اچوں نہ کڈیا کرے۔ سارے پنڈ اچ بدنامی وی ہوئی' اپنے پیسے وی لگے' اے کچھ کرنا وی پیا۔ کاہنوں تو ایس طراں نال کرنا ہونا ایں' غصے نوں روک لیا کر۔ کہن لگا فیر لگی ایں پیونوں چھیڑن'' ❶۔ اب دیکھو کہ گاؤں میں بدنامی ہوئی اتنے پیسے بھی خرچ ہوئے۔ یہ کچھ بھی کرنا پڑا۔ تم ایسا کچھ کیوں کرتے ہو؟ غصے کو روک لیا کرو۔ وہ کہنے لگا ''لگی ہو پھر باپ کو چھیڑنے) تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی! یہ اس قسم کی جو جہالت کی باتیں ہیں' قرآن کہتا ہے کہ یہ بڑی نیچی سطح کی چیزیں ہیں' اس قسم کی باتیں نہ کیا کرو۔ وہاں یہ چیز قرآن نے کہی ہے بالکل یہی جو میں نے ابھی مثال کے طور پہ کہا ہے۔ اس میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس قسم سے' یوں کہہ دینے سے' وہ بیوی ماں نہیں بن جایا کرتی۔

---

❶ اے اللہ کے بندے! ذرا دیکھنا۔ اگر تو اس طرح کے غصے کو ایسے حالات میں روک لیا کرے' اسے کلمات زبان سے نہ نکالا کرے (تو اسی مصیبت میں تو نہ پڑیں۔

بیوی کو ماں کہنے پر قرآن حکیم کی وارننگ اور کفارے کا حکم

اس قسم کی جہالت کی یہ چیزیں عام بھی تمہارے معاشرے میں نہیں ہوتی رہنی چاہئیں۔ اس کے لیے بھی قرآن نے وہاں سورۃ الاحزاب میں یہ چیز کہی ہے اور یہی چیز دوسرے مقام پہ (58:3) ہے۔ وہاں بھی یہ ظھر کا لفظ آیا ہے' وہاں اس کے لیے یہ بتایا ہے کہ پھر کیا کرنا ہے' تم نے اس کا کیا کفارہ دینا ہے اور کفارہ دینے کے بعد پھر محتاط رہنا' پھر وہی بات نہ کر دینا کہیں' پھر کفارہ دینا پڑے گا۔ اسے اصطلاح میں ظھر کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ چیز کہا کرتے تھے۔ ظھر پیٹھ کو کہتے ہیں وہ یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے کہ تم ایسی ہو جیسی

میری ماں کی پیٹھ ہے۔ یونہی ایک چیز اصطلاحی ہے' مقصد اس سے یہی ہے کہ اس قسم کی لغو باتیں غصے میں آ کر یوں نہ کیا کرو۔ تادیب' تربیت آپ دیکھئے اس قوم کی کس طرح سے کی جا رہی ہے۔ اس قوم کو اس سطح سے اس کو اُٹھایا جا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کی یوں تربیت کی جا رہی ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک طلاق کا مفہوم اس نوعیت اور معاشرتی طور پر اس کی کیفیت:

قرآن ہے یہ۔ کہیں تو وہ جو افلاک سے ورا باتیں ہیں' وہ بھی حقائق کی بیان ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ معاشرتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے متعلق بھی تربیت ساتھ کے ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہا ہے کہ یہ کچھ نہ کیا کرو۔ ناچاکی کی صورت میں تمہیں چار مہینے میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہ جو میاں بیوی کی زندگی ہے اسے برقرار رکھنا ہے یا ختم کر دینا ہے۔ ختم کرنا ہے تو اس کے لیے لفظ طلاق ہوتا ہے۔ ایسا لفظ جو ہمارے ہاں کان میں پڑتے ہی ایسے ہوتا ہے جیسے کوئی گولہ چل گیا اور پھر اس کے بعد جو مطلقہ ہمارے معاشرے میں بے چاری ہوتی ہے' پوچھو نہیں کتنا بڑا ظلم ہو گیا اور پھر طلاق کے سلسلے میں ہمارے ہاں جو مروّجہ قوانین چلے آ رہے ہیں' ان میں تو قصہ ہی الگ ہے۔ یہ میاں اور بیوی' بالغ' عاقل' جوان لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی سے نکاح ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس میں ہاں نہ کرے تو اس میں نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ ساری دنیا ایک طرف ہو اور وہ اس میں نہ کر دے' دنیا کی کوئی طاقت اس کا نکاح نہیں کر سکتی۔ ان کے قوانین بھی اس کو نکاح نہیں مان سکتے۔

نکاح جسے عقد اور میثاق کہا ہے اس کو ختم کرنے کا یا توڑنے کا حق ہر دو فریقین کو حاصل ہے:

یہ ہوا باہمی Agreement (معاہدہ)۔ فریقین کی باہمی رضامندی سے معاہدہ ہوا اور جب یہ معاہدہ ہو گیا تو اس کے توڑنے کی صورت یہ ہے کہ ایک فریق جسے آپ خاوند یا مرد کہتے ہیں' اس کو تو کلی اختیار ہیں' جب جی چاہے' جس وقت جی چاہے' اس نے ایک دو تین کیا اور نیلام والے کی طرح معاملہ ختم ہوا اور یہ جو فریق ثانی ہے' یہ بے چاری اس طرح سے اس کے اندر جکڑی گئی زندگی عذاب میں' جہنم میں گزر رہی ہے' مصیبت ہو رہی ہے' اس نے اس سے طلاق حاصل کرنا ہے۔ اس خاوند سے اس نے طلاق حاصل کرنی ہے۔ اب معاہدے کا توڑنا کلیتاً اس کے اختیار اور مرضی کے اُوپر رہ گیا۔ یہ جو دوسرا فریق ہے' بے بس ہو گیا' وہاں یہ کہنے کے بعد ہاتھ کٹوا بیٹھی۔ قرآن نے اس کو معاہدہ کہا ہے' عقد کہا ہے' میثاق کہا ہے' میثاقِ غلیظ کہا ہے' بڑا پختہ معاہدہ کہا ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی معاہدہ اس قسم کا بھی ہوتا ہے! لیکن ہمارے ہاں اس معاہدے کی یہ صورت ہو گئی ہوئی ہے کہ اس فریق کو کسی قسم کی کوئی Explanation (وضاحت) دینے کی ضرورت نہیں' وجہ جواز بتانے کی ضرورت نہیں' کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں کہ میں نے یہ کیوں کیا۔ اچھے بھلے بس رس رہے ہیں' بیوی

بھی چالیس پچاس سال کی عمر میں جا پہنچی ہے' بال سفید ہو رہے ہیں اور پانچ سات بال بچے بھی ساتھ ہیں۔ ایک دن میاں کو غصہ آتا ہے کہ صاحب! ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑ گیا' پارہ چڑھ گیا اور اس کے بعد اس نے کہا: طلاق طلاق طلاق۔ وہ بے چاری اس کے بعد روتی دھوتی ہوئی ہمارے اس معاشرے کے اندر کیا کرے' کہاں جائے بجز اس کے کہ اگر ماں باپ کا گھر ہے تو اس پوری ذمہ داری کے بوجھ کو اُنگلی سے لگائے ہوئے' وہاں چلی جائے۔ وہاں جا کر بھی کون اس کا استقبال کرے گا؟ انہوں نے تو جس دن اس کی ڈولی گھر سے وداع کی تھی تو یہی کہا تھا کہ آج یہاں سے تم گئی ہو' اس گھر میں لاش تو تمہاری آ سکتی ہے' زندگی میں پھر تم قدم نہیں رکھ سکتی۔ وہاں سسرال میں جب ڈولی گئی ہے تو وہاں یہی دہرایا گیا کہ ڈولی اندر آئی ہے' جنازہ باہر جائے گا۔ اس غریب کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

بچوں کی کفالت کا غم' طلاق کے حصول کے لیے عدالتوں کے چکر اور خاوند کی طرف سے اذیت ناک حربے:

میں کیا عرض کروں اس معاملے میں؟ اپنی سوختہ بختی کہیے یا خوش بختی' کسی کو تو کسی اپنی ایک بیٹی کی کوئی پریشانی ہوگی' دو بیٹیوں کی پریشانی ہوگی۔ آپ حیران ہوں گے شاید ہی کوئی ہفتہ یا مہینہ گزرتا ہوگا کہ اس قسم کی بیٹیاں میرے پاس نہ آتی ہوں گی یا ان کے Cases نہ آتے ہوں گے۔ مظلوم' معصوم' بے بس' بے کس' دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ خاوند نے یہ کیا اور چلتے بنے یا دوسری طرف یہ کیفیت ہے کہ سخت اذیت پہنچائی جا رہی ہے' ظلم پہ ظلم ہو رہے ہیں' زندگی اجیرن اور عذاب ہو رہی ہے۔ چھٹکارے کی صورت نظر نہیں آتی' کیا کیا جائے؟ عدالت میں جانا پڑے گا اور عدالت میں جا کر تو پھر آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ شخص جو یوں نہیں چھوڑنا چاہتا' انتقاماً اس کو جکڑ کر رکھنا چاہتا ہے۔ پھر عدالتوں میں جا کر جو خواری ہوتی ہے' ایک شریف خاتون بے چاری جس نے گھر سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا' وہ کچہریوں میں جائے گی اور پھر کچہری جانا بھی تو آپ کے معاشرے میں' آپ کے ہاں' تو یہ محاورہ ہے ''او فلاں نی کچہری جا چڑھی ہے''۔ یعنی پتہ نہیں یہ کتنا بڑا جرم کر بیٹھی ہے۔ عزیزانِ من! مبالغہ نہیں تو آپ کے معاشرے کے ستر اسی فیصد گھر تو اس طرح سے جہنم بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے ذاتی علم میں یہ چیزیں آتی ہیں' ان بیٹیوں کے یہ قصے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لیے تو اُمت کی ہر بیٹی میری اپنی بیٹی ہوتی ہے' مجھے ان کا دکھ اسی طرح سے ستاتا ہے' جتنا اپنی بیٹی کا ستاتا ہے لیکن

''ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے''

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے عائلی قوانین کی مخالفت کی وجہ

ایک نام شریعت کے قانون کا دیا ہوا ہے' سارا اختیار اس مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ قانون بھی آپ کے ہاں کے اسی قسم کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ بڑی ہی مدت کی کوشش کے بعد' محنت کے بعد اس میں کچھ ذرا سی صورت قرآن کے مطابق نکالی گئی تھی جسے عائلی

قوانین کہا جاتا ہے مگر

''شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی''

ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے پھر رہے ہیں: منسوخ کروان قوانین کو منسوخ کروان قوانین کو۔ ان قوانین میں بھی طلاق کا جو حق ہے وہ مرد ہی کو دیا ہوا ہے۔ اتنی سی شق اس میں رکھ دی گئی ہے کہ نکاح نامے میں یہ چیز درج کر دی جاسکتی ہے کہ مرد نے طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے عورت کو۔ یہ نیا قانون نہیں ہے' ہماری فقہ میں یہ پہلے سے موجود تھا لیکن اس کو چھپایا ہوا تھا۔ بس اس میں اتنا ہوا ہے کہ اس میں یہ چیز لکھ دی گئی ہے اور طریق وہ تجویز کر دیا ہے جو قرآن نے تجویز کیا تھا کہ جب کبھی آپس میں کشمکش ہو' کوئی ثالث مقرر کر دو' وہ تم میں مصالحت کی کوشش کریں۔ مصالحت نہ ہو سکے تو پھر یہ جو عقد ہے' یہ ٹوٹ جائے گا۔ بس اس میں اتنی سی بات ہے۔ اس چیز کے متعلق 1962ء سے آج تک دہائی مچ رہی ہے کہ تختہ اُلٹ کے رکھ دیا جائے گا حکومتوں کا اگر یہ عائلی قوانین باقی رہے۔

قرآن حکیم نے مرد کو عورت پر داروغہ مقرر نہیں کیا بلکہ اس کا کفیل بنایا ہے

بظاہر ایسا نظر آتا ہے جنہوں نے یہ قوانین وغیرہ نہیں دیکھے کہ پتہ نہیں' اس میں کتنی چیزیں خلافِ شریعت ہوں گے اور خلافِ قرآن ہوں گے۔ یہ ہے جی اتنی سی چیز کہ مرد کو بھی طلاق دے کر چیئرمین کو ایک نوٹس دینا پڑتا ہے کہ میں نے یہ کر دیا۔ اتنا سا اس میں جرم یہ ہے کہ وہ کوشش کرے کہ ان میں مصالحت ہو جائے۔ یہ جو مصالحت کی کوشش ہے اس کو حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ ہیں! مرد کے حق کے اُوپر اتنی بڑی اس میں دخل اندازی کہ کوئی مصالحت کی کوشش کر دے!! اور یہی چیز عورت کے ضمن میں بھی ہے لیکن عورت تو اس ضمن میں ہے جب اس کو یہ حق تفویض کیا گیا ہو۔ یہ عین شریعت کے مطابق تھا لیکن نہیں صاحب! یہاں تو **الرجال قوامون علی النسآء** (4:34) کا جو ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ ''مرد داروغہ واقع ہوئے ہیں عورتوں کے اُوپر'' اندازہ لگایئے۔ اس عورت کے اُوپر جو ابھی ابھی نکاح کے وقت میں یہ میاں صاحب 'چگھو بن' کے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب تک وہ وہاں دستخط نہ کر دیتی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کی ہاں کے بعد یہ بنی' بیوی بننے کے بعد یہ ان کے اوپر داروغہ ہو گئے۔ اب نکل تو کیسے نکلتی ہے اس پنگے سے' ہاں تو کر بیٹھی۔ عزیزانِ من! یہ ہیں مصیبتیں جو ہم نے خود اپنے گلے ڈالی ہوئی ہیں۔ یہ اپنی چیزیں وضع کردہ ہیں اور دنیا میں ہم کسی کے سامنے نگاہ اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں جب دنیا پوچھتی ہے کہ یہ ہیں تمہارے ہاں کے قوانین۔

عائلی قوانین میں بلوغت کی شرط خلافِ شریعت ہے؟

عائلی قوانین میں دوسری چیز جو سب سے بڑی قابل گرفت کہی جاتی ہے' خلافِ شریعت کہی جاتی ہے' اس میں یہ لکھا ہے کہ صاحب!

بالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے۔طوفان مچ گیا کہ لیجیے صاحب! نکاح کے لیے بلوغت کی شرط ہے۔

بلوغت کی شرط پر تمام فرقوں کے علمائے اکرام کا بھرپور احتجاج اور اس کی رُئداد کی تفصیل:

آپ احباب میں سے جن کی ذرا عمر زیادہ ہے'ان کو پتہ ہوگا کہ ایک ساردابل انڈیا میں Introduce ہوا تھا۔ایک ہندو کی طرف سے یہ بل آیا تھا کہ نکاح کے لیے بلوغت شرط قرار دی جائے' بالغ ہونا شرط قرار دیا جائے۔ پارلیمنٹ میں یہ بل آیا تھا۔آپ حیران ہوں گے کہ ہر مذہب کے جتنے بھی پارلیمنٹ میں لوگ تھے'انہوں نے اس کی تائید کی۔Common Sence کے مطابق تھا۔طبیعاتی قانون کے مطابق تھا' فطرت کے تقاضے کے مطابق تھا۔عزیزانِ من! بلوغت سے پہلے نکاح کی چیز تو کبھی حیوانات میں آپ نے نہیں دیکھی ہوگی۔ان کی تائید کی اور اس کی جو مخالفت ہوئی تو خیر سے ان لوگوں کی طرف سے ہوئی جو خدا اور رسول کے نام پر ایمان لانے والی اُمت مسلمہ ہے اور عجیب چیز ہے ہمارے ہاں کہ ہر معاملہ میں فرقوں میں باہمی اختلاف ہوتا ہے' روز ان کے ہاں سر پھٹول ہوتے رہتے ہیں' گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے' آپ تاریخ میں دیکھیے ان کا جب بھی کبھی اتحاد ہوتا ہے تو باطل پہ ہوتا ہے۔اس میں سارے فرقے متفق ہوجاتے ہیں۔میں وہاں تھا مجھے وہ سین یاد ہے' دلی میں فیروز باغ ایک بستی ہوتی تھی' وہاں یہ اجتماع ہوتے تھے۔وہاں سے ان لوگوں نے وائسرائے کو یادداشت نامہ (Memorandum) بھیجا تھا کہ یہ قانون پاس کرنا ہے' کر دیجیے' ہمیں اعتراض نہیں مگر مسلمانوں کو اس میں مستثنٰی قرار دے دیا جائے۔ اللہ اکبر!!! تمام فرقوں کے علماء حضرات وائسرائے کے حضور یادداشت نامہ (Memorandom) لے گئے تھے اور جب یہ قانون پاس ہوگیا تو اس کے بعد انہوں نے کہا کہ شریعت کا معاملہ ہے اس میں ہم یونہی نہیں چپ کر کے بیٹھ جانے والے۔وہاں اس مسئلے میں Civil Iobedience (سول نافرمانی) شروع ہوئی۔آپ سوچیں گے کہ اس میں یہ جو Civil Isobedience (سول نافرمانی) ہے' وہ کیا چیز ہوگی؟ اس فیروز باغ بستی میں مرکز بنا گیا' وہاں چھ چھ مہینے کے بچے بچیوں کی شادی ہوتی تھی۔گود میں اُٹھائے ہوئے' اللہ اللہ کا کہتے ہوئے یہ مائی بھی آ رہی ہے'' باپ وی منڈے نوں چکی اون ڈیا ہیگا اے۔ بھائی! چھیتی کر' منڈا روندا پیا ہیگا' کا کی نوں بوکھ لگی اے' نکاح پڑھا چھیتی نال [1]'' اندازہ لگایئے۔ چلے آ رہے ہیں اور یہ وہاں جہادِ عظیم تھا۔وائسرائے نے کہا کہ صاحب! یہ جو آپ ہماری Civil Disobedience (سول نافرمانی) کرتے ہیں کہ پیدائش کے بعد' پیدائش سے پہلے نکاح کرا دیجیے تو اس میں ہمارا کیا بگڑتا ہے اور ہمارے ہاں تو پیدائش سے پہلے کے نکاح موجود ہیں۔شاید اس دور میں تو یہ چیزیں ذرا کم ہوگئی ہیں۔استقرارِ حمل کے دوران یہ ہے کہ ''نی بھیناں اللہ نے فضل کتا ہیگا۔تے میں تینوں پہلاں دس دینی ہیگی آں اے میری منگ ہیگی اُوْ''۔ پیدا ہونے سے پہلے نکاح ہوئے ہوتے ہیں۔ٹھیک ہے جہالت میں جو کچھ جی چاہے' کیجیے [2]۔

---

❶ باپ بھی نوخیز لڑکے کو اُٹھائے آ رہا ہے۔(کہتے ہیں کہ) بھائی! جلدی کرو لڑکا رو رہا ہے لڑکی کو بھوک لگی ہے۔جلدی سے ان کا نکاح پڑھا دو۔

❷ اے بہن! اللہ نے فضل کیا ہے تو میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں کہ یہ میری ''منگ'' ہے۔

بلوغت کے سلسلہ میں حضرت عائشہ کے متعلق ایک وضع کردہ افسانہ اور اس کی حقیقت:

عزیزانِ من! خون کے آنسو اس وقت رونے پڑتے ہیں جب اسے اس ذاتِ گرامی ﷺ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جو دنیا میں انسانیت کو ان زنجیروں سے رہا کرنے کے لیے آیا تھا اور قیامت در قیامت یہ کہ جس اس ایک چیز کے لیے کہتے ہوئے پھر سینہ شق ہو جاتا ہے کہ نابالغ کا نکاح ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ وضع کیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کیا' جب ان کی عمر چھ برس کی تھی۔ بطورِ تحدیث نعمت عرض کروں گا بات ''میں'' کی آ جاتی ہے' اللہ کا احسان ہے کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئی۔ انہی کی تاریخوں سے' انہی کی روایات سے' تحقیق کے بعد' میں نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت عائشہ کی عمر نکاح کے وقت سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی اور مجھ پہ جو کفر کا فتویٰ لگا ہے' اس میں ایک شق یہ بھی تھی۔ اب بجائے اس کے کہ یہ قوم شکر گزار ہوتی کہ ہزار برس سے جو ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف یہ سارے جو مانع دین ہیں' وہ اس طرح سے دریدہ دہنی سے اس واقع کو پیش کرتے ہیں اور اس کا آپ کے پاس کوئی جواب کا' دلیل کا' کوئی مدافعت کا' سامان نہیں تھا۔ تاریخ سے میں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ آپ کی عمر اتنی اس زمانے میں تھی لیکن چونکہ اس سے اس پہ زد پڑتی تھی کہ صاحب! نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی' اس لیے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پہ طعن پڑتا ہے تو پڑے' حضرت عائشہؓ کو وہ گڑیا کھیلنے والی بچی بنایا جاتا ہے تو بنے' مانع دین اس قدر طعن آمیز باتیں کرتے ہیں تو کریں لیکن ہمارا یہ مسئلہ نہ ٹوٹنے پائے کہ نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی۔

طلاق کے معاملات کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں:

برادرانِ عزیز! بات طلاق کی آ گئی۔ میں یہ عرض کروں گا کہ ان معاملات میں اگر آپ نے یہ دیکھنا ہو کہ خالص قرآن کے قوانین کیا ہیں؟ یہ کچھ پیچیدہ نہیں ہیں' صاف صاف ہیں۔ وہ اتنی سی چیز ہے کہ قرآن کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ ایک موضوع کے متعلق جو قرآن کے احکام بکھرے ہوئے ہیں' ان کو یکجا کر دیا گیا ہے اور ان میں ایک ربط پیدا کر دیا ہے۔ آپ ان چیزوں کو اُٹھا کر خود دیکھ لیجیے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ نکاح کی عمر کے متعلق میں نے یہ کیا' نکاح کے متعلق میں نے قوانین جمع کر دیئے' طلاق کے متعلق میں نے قوانین جمع کر دیے۔ میری ایک بڑی چھوٹی سی کتاب ہے ''قرآنی قوانین'' اس میں اس طرح سے مختلف معاملات کے متعلق جو قرآن نے احکام دیے ہیں ان کو قرآن کے حوالوں سے ان آیتوں کا حوالہ دے کر ایک ربط کے ساتھ' بیان کر دیا ہے۔ اب بات طلاق کے متعلق آ گئی ہے۔ اس کے لیے بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ آج کی اس نشست میں میں اس میں سے یہ جو

احکام ہیں حوالہ دیتے ہوئے چلا جاؤں گا۔اس کے حوالے آپ لکھتے چلے جایئے۔یا اگر نہ لکھے جاتے ہوں تو میں نے عرض کیا ہے' یہ کتاب موجود ہے' اس میں سے دیکھ کر حوالے لے لیجیے گا۔قرآن سے خود آیتیں نکال لیجیے گا نکالنے کے بعد خود دیکھ لیجیے گا کہ اس کے اندر یہ جو چیز میں کہہ رہا ہوں' اسی طرح سے ہے یا نہیں؟ نکاح کے متعلق کہا گیا ہے کہ باہمی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔اس کے باوجود باہمی شکررنجی کا امکان ہوسکتا ہے۔آپ دیکھیے کہ عائلی زندگی کو کتنی قرآن اہمیت دیتا ہے۔معاشرے سے کہا گیا ہے' میاں بیوی سے نہیں کہ اگر کسی میاں بیوی میں تم ذرا دیکھو کہ کچھ تھوڑی سی کشمکش ہو رہی ہے' باہمی تعلقات کشیدہ ہو رہے ہیں تو یہ جن دو کے تعلقات کشیدہ ہوں' وہ آپس میں مصالحت نہیں کر سکتے' انہیں دور کرنے کے لیے کسی تیسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔آپ دیکھتے ہیں قرآن کہاں پہنچتا ہے۔معاشرے سے کہا ہے کہ جہاں کہیں یہ صورت پیدا ہوتی ہو' تم فوراً اس میں دخل انداز ہو۔ایک حکم میاں کے گھر کا' ایک بیوی کے گھر کا لو۔ان دونوں کے نمائندوں کو اکٹھا کرو' کوشش کرو کہ ان میں مصالحت ہو جائے' ان کو سمجھاؤ بجھاؤ۔کہا کہ اگر ان کی نیت مصالحت کرنے کی ہوگی تو ایسا راستہ نکل آئے گا۔عام طور پہ نکل سکتا ہے' پھر ایسا کیا کرو۔سیدھی سی بات ہے کہ شکررنجی کی صورت میں میاں کی طرف سے بات آئے تو بیوی کی طرف سے بات آئے تو۔کرنا تو یہ ہے اور قرآنِ کریم نے تو اسی سورۃ النساء کی آیت 128 میں خاص طور پر عورت کے متعلق بھی کہا ہے کہ اگر عورت کو میاں کی طرف سے اس قسم کی سرکشی کا' کشیدگی کا بھی ڈر ہو' وہ بھی اصلاح کے لیے اس طرح سے اقدام کرے۔میاں کی طرف سے ہو' بیوی کی طرف سے ہو' دونوں میں کشمکش ہو رہی ہے۔معاشرے سے کہا گیا ہے کہ تم فوراً Interfere (مداخلت) کرو معاملے کو اپنے ہاتھ میں لو۔اگر زیادہ وقت گزر گیا تو یاد رکھیے! یہ کشیدگی بڑھ جائے گی' ایک گھر تباہ ہو جائے گا۔اس لیے تم فوراً اس میں مصالحت کی کوشش کرو۔

میاں بیوی کے اُلجھے ہوئے معاملے کو حل کرنے کے سلسلہ میں سربراہِ مملکت کی ذمہ داری:

اس مصالحت کے معاملے میں تو قرآن کریم نے خود کسی عورت کا ایک واقع دے دیا ہے جو رسول اللہؐ کے پاس آ کر اپنی شکایت کر رہی ہے اور اس سے یہ نظر آتا ہے کہ کتنی آزادی دی ہوئی ہے شریعت نے اور نبی اکرمؐ نے عورت کو۔کہا ہے کہ **قد سمع اللّٰہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللّٰہ** (58:1) وہ عورت اپنے خاوند کے معاملے میں تم سے آ کر جھگڑ رہی تھی' خدا اس کی باتیں سن رہا تھا۔**تجادلک** رسول سے تجادل تھی۔مجادلہ اس سورۃ کا نام اسی لیے ہے کہ تجھ سے آ کر وہ اپنے خاوند کے معاملہ میں جھگڑ رہی تھی۔اس کی باتیں یا تمہاری باتیں تھیں۔**تحاور کما** تمہاری گفتگو جو آپس میں ہو رہی تھی۔خدا کہتا ہے کہ ہم اسے سن رہے تھے۔کتنا بڑا جج اُوپر بیٹھا ہوا ہے۔ہم کیوں سن رہے تھے؟ اس لیے کہ **تشتکی الی اللہ** (58:1) اس نے اپنی یہ شکایت خدا کے حضور کی ہوئی تھی'

ہمارا فرض تھا کہ ہم اس کی بات سنتے۔ کیا بات ہے صاحب! اس سے بڑا بھی کوئی حامی و ناصر بے کسوں کا' بے بسوں کا کوئی ہوسکتا تھا؟ جیسا کہ اس دن' عید میلاد کی تقریب کے سلسلہ میں' میری ایک طاہرہ بیٹی نے یہ کہا تھا' وہ بڑا عمدہ نقطہ تھا کہ قرآن نے جب یہ کہا تھا کہ **ما کان محمد ابا احد من رجالهم** کہ محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں تو اس نے یہ کہا تھا کہ مردوں کو باپ کی ضرورت نہیں تھی اس لیے محمدؐ مردوں کے باپ نہیں تھے' محمدؐ بیٹیوں کے باپ تھے اور یہاں خدا نے یہ بات کہہ دی ہے کہ وہ اپنی شکایت ہمارے حضور لے کر آئی تھی اس لیے ہم تمہاری گفتگو سن رہے تھے کہ تم کیا بات کر رہے تھے۔ رسول کے حضور ایک عام عورت کو مجادلے کی اجازت مل رہی ہے اور خدا سن رہا ہے کہ یہ کیا بات ہو رہی ہے۔ ایک وہ عدل کا مقام تھا۔ ایک یہ ہے کہ اس کو اجازت نہیں کہ زبان کے اُوپر ایک لفظ تک لا سکے' حرفِ شکایت لا سکے۔ برادرانِ عزیز! قرآن نے یہ چیز دونوں جگہ کہی ہے کہ جب بھی آپس میں کشیدگی کی کوئی صورت تم دیکھو' معاشرے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ فوراً معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ قرآن تفصیل میں گیا ہے۔ ایک نمائندہ اس کے ہاں کا' ایک نمائندہ اس کے ہاں کا' دونوں بیٹھو۔ اب ظاہر ہے کہ دو نمائندے ہوں گے تو Conviner بھی تو اس کے اندر ہوگا' وہ معاشرے کا نمائندہ ہوگا۔ آپس میں یہ بات طے کرو' مصالحت کی کوشش کرو۔ عزیزانِ من! یہ ایک شق عائلی قوانین میں رکھی ہوئی ہے کہ جب بھی تم یہ صورت پیدا کرنا چاہو تو جو حکومت کا نمائندہ ہے چیئرمین یونین کونسل کا' اس کو نوٹس دیا کرو وہ ایک نمائندہ خاوند کی طرف سے' ایک بیوی کی طرف سے بلایا کرے۔ کوشش کیا کرو کہ مصالحت ہو جائے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ خلافِ شریعت ہے قرآن کی آیات آپ کے سامنے ہیں۔ انہوں نے کوشش کی' مصالحت نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نباہ نہیں ہو سکتا اس لیے وہ ٹھیک ہے جو معاہدہ زوجین یا فریقین یا طرفین کی باہمی رضامندی سے ہوا' جب وہ معاہدہ آگے نہیں چل سکتا تو وہ معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔

دیگر مذہب میں میاں بیوی کے ہاں نکاح اور طلاق کی نوعیت:

قرآن نے اس باب میں کیا چیزیں دی ہیں اس کے لیے دیگر مذاہب کا پس منظر دیکھیے۔ ہندوؤں کے ہاں نکاح ابدی بندھن کا نام ہے' ان کے دھرم میں نکاح کا یہ معاہدہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ خاوند کے مرنے کے بعد وہ عورت کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی اور بلند ترین کردار کی عورت وہ ہے جو خاوند کے ساتھ چتا میں جل کر مر جائے۔ اگر جل کر مرنے کی ہمت نہیں ہے تو باقی زندگی بیوگی میں گزارا کرنا ہوگا۔ یعنی نکاح یہی نہیں کہ خاوند کی زندگی تک ہی وہ نہیں ٹوٹ سکتا' اس کی موت کے بعد بھی نہیں ٹوٹ سکتا' لیکن وہاں بھی یہی صورت ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد بیوہ تو شادی نہیں کر سکتی' بیوی کے مرنے کے بعد میاں کو اجازت ہے۔ عیسائیوں میں' انجیل میں' قوانین نہیں ہیں' انجیل میں مواعظ ہیں صرف وعظ ہے۔ یہ ایک قانون ہے اور قانون یہ ہے کہ زنا کے ارتکاب کے بجز کسی اور شکل میں بھی

اگر کسی نے بیوی کو طلاق دے دی اور اس کے بعد وہ مطلقہ اگر کسی دوسری جگہ شادی کرتی ہے تو اس میں یہ لکھا ہے کہ یہ بھی زنا کر رہی ہے اور مرد شادی کر رہا ہے وہ بھی زنا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ کے اندر کیسز ہوئے ہیں اور وہ سب سے بڑا کیس تو اس بادشاہ کا تھا جس نے تخت چھوڑ دیا تھا۔ وہ مطلقہ عورت تھی جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ عیسائیت اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، تجھ پہ قابو نہیں، دل پہ تو ہے قابو اپنا' اس نے کہا کہ یہ رہا تمہارا تخت اور تاج۔ بادشاہ کے لیے شرط لگا رہے ہو لیکن انہوں نے تو عیسائیت کے لیے لگائی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے تم یہ کہتے رہو کہ یہ ناجائز ہے ہم بھگت لیں گے۔ یہ بھگتنا تو قیامت میں جا کے ہوگا' یہاں کا تمہارا تخت و تاج تمہارے حوالے ہے۔ عیسائیت میں یہ چیز تھی۔

قرآنی تعلیم کے پیش نظر کوئی شخص کسی عورت کا زبردستی مالک نہیں بن سکتا:

اسلام میں آپ دیکھیے کہ جب معاہدہ کہا ہے پھر وہ معاہدہ ہے۔ طرفین میں جب بھی کراہ کی کوئی ایسی چیز صورت پیدا ہو جائے تو قرآن کہتا ہے کہ **لا یحل لکم ان ترثوا نکاح کرہ** یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی طرح سے کسی عورت کے مالک بنے رہو جب کہ اس کو اس سے کراہت ہو۔ **لا یحل لکم** وہ حلال ہی نہیں ہے صاحب! قرآن نے وہاں لفظ حلال Use کیا ہے۔ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ جب بھی کہیں عورت کی طرف سے جبر کا پہلو آ جائے' کراہت کا لفظ وہاں آ جائے' تو پھر یہ تعلق جائز ہی نہیں رہتا' حلال ہی نہیں رہتا۔ یہاں یہ صورت ہے کہ تو جا کہاں سکتی ہے۔ سوچ رہے ہیں آپ۔ یہ معاملہ ہو گیا' نکاح فسق ہو گیا۔ اس کے بعد ایک چیز ہے جسے عدت کہتے ہیں' ایک تھوڑی سی مدت ہے جس میں یہ عورت مطلقہ ہو یا بیوہ' وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ میں بڑی خاص مصلحت اس میں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اس پہلے خاوند سے استقرارِ حمل تو نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا اثر اس اولاد پر جا کر پڑنا ہے۔ اگر بچہ ہونے والا ہے تو متعین ہونا چاہیے کہ اس کا باپ کون ہے۔ زندگی میں پہلی چیز تو اس بچے کے لیے بھی یہ ہوگی کہ معلوم ہو کہ میرا باپ کون ہے۔ پھر آگے قانونی طور پر اس بات کی وراثت میں' ان معاملات میں بھی یہ طے ہونا چاہیے۔ اس لیے قرآن اتنی سی مدت دے دیتا ہے جس میں یہ متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ تو نہیں ہے اور اگر حمل ہے تو وضع حمل تک کے لے ہے۔ عدت کی بات بعد میں آئے گی۔

باہمی نااتفاقی کی صورت میں حالات کے مطابق فیصلوں کی نوعیت:

میں نے کہا ہے کہ وہ عدت کی صورت شروع ہو گی لیکن طلاق کے معاملے میں یہ ہو سکتا ہے کہ کشیدگی میں عدالت یہ دیکھے کہ عورت تو نباہ کرنا چاہتی ہے' یہ مرد ہے جو نباہ نہیں کرنا چاہتا' یہ طلاق دینا چاہتا ہے۔ اس صورت میں وہ عورت کے حق میں فیصلہ دے کر طلاق کا فیصلہ دے دے گا لیکن اگر ایسی صورت ہو' عورت نہیں بسنا چاہتی' وہ کشیدگی اختیار کر رہی ہے' مرد بسانا چاہتا ہے' اب اس میں ایک پہلو اور

قانون آ گیا۔ یہ جو ابھی ابھی نکاح ہوا تھا اس میں آپ کو پتہ ہے کہ مرد کو نکاح کے وقت کچھ تحفتاً دینا پڑتا ہے' جسے مہر کہتے ہیں۔ اب یہ Situation Arise ہو سکتی تھی کہ اس کو Abuse کیا جائے۔ آج نکاح کیا ہے' بیس ہزار روپیہ مہر ہے' مہر وصول کیا' اگلے ہفتے درخواست دے دی کہ میں اس کے ہاں نہیں بسنا چاہتی۔ معاہدہ تو ٹوٹے گا لیکن آپ دیکھئے کہ اس میں یہ Abuse کرنے سے اس نے کیا کیا ہے؟ یہاں یہ کیا عدت کی مدت گزری' اس کے بعد پھر نکاح کیا' بیس ہزار کا اور مہر باندھ لیا' مہینے بھر کے بعد اس کے لیے طلاق دے دی۔ یہ ایک امکانی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ دیکھئے اس قانون ساز کی خدائے تعالیٰ کی نگاہ کہاں جا رہی ہے؟ کہا کہ اگر یہ صورت پیدا ہو اور یہ متعین ہو جائے کہ یہی یہ چاہتی ہے تو اس صورت میں پھر عدالت دیکھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ جو ہو وہ بڑی معقول ہو' عورت کی طرف سے' پھر بھی ٹھیک ہے' وہ کہے گا کہ ہاں طلاق ہونی چاہیے لیکن اگر عدالت یہ کہے کہ نہیں! یہ اس Power کو Abuse کر رہی ہے' اس صورت میں کہا کہ عورت کو کہے کہ تم اتنا اس میں اس کو ادا کر دو اور اس کے بعد طلاق ہو جائے گی۔ یعنی طلاق تو بہر حال وہ ہو جائے گی جب بھی فریقین میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میاں بیوی ہم نہیں رہنا چاہتے۔ عزیزانِ من! پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں میاں بیوی نہیں رکھ سکتی۔ یہ کسی خارجی قوت کے بس کی بات نہیں ہے کہ کسی کو جکڑ کر میاں بیوی رکھ سکے لیکن اس صورت کو اس سے بچانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ اس صورت میں عدالت یہ دیکھ لے کہ وہ عورت سے کہے کہ تم کچھ یہ دے کر اور طلاق حاصل کرو۔ اس کے لیے (4:20) میں یہ ہے کہ مرد اگر نباہ نہیں کرنا چاہتا تو عورت سے بغیر کچھ لیے ہوئے اور اگر یہ دیکھے کہ عورت کی طرف سے اس کا Abuse ہو رہا ہے' ایسی شکل ہے تو پھر وہ یہ کہہ دے کہ عورت اتنا فدیہ دے' پھر طلاق ہو یا اگر ایسی صورت ہے کہ عورت کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہوئی ہے تو اس صورت میں بھی قرآن نے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اسے کچھ دے کر طلاق ہو گی۔ یہ تینوں حکم (4:20, 4:19, 2:229) میں ہیں۔ عدت شروع ہو گئی۔

عدت کے دنوں کے دوران قرآن حکیم کی راہنمائی:

عدت کے دوران اس کی Maintenance نان نفقہ کا خرچ خاوند کے ذمے ہوگا۔ ابھی دوسری جگہ یہ شادی نہیں کر سکتی۔ بے سہارا رہ گئی ہے۔ تعلقات میاں بیوی کے نہیں رہے لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن یہاں بھی اس کے حقوق کا تحفظ کر رہا ہے کہ اتنے وقت تک Maintenance اس کے ذمے ہوتی ہے۔ چلیے یہ Maintenance کے متعلق (65:1-6) اور (2:241) ہے۔

علیحدگی کے بعد از سر نو ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے کی وضاحت

عدت کے دوران میں پھر کوئی شکل پیدا ہو جاتی ہے مصالحت کی' پھر یہ دونوں میاں بیوی چاہتے ہیں کہ ہم از سر نو میاں بیوی بن جائیں۔ قرآن نے کہا کہ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں' کوئی بات نہیں' ذرا دیر میں بات سمجھ میں آئی ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بھی اگر

آپس میں یہ بات ہو گئی ہے تو وہ کہتا ہے ٹھیک ہے پھر تم کر سکتے ہو۔ اگر فیصلہ کرنا ہے کہ نہیں ہم نے میاں بیوی نہیں بننا تو اس نے کہا کہ اس فیصلے کے لیے دو گواہ ہونے چاہئیں تا کہ معاشرے کو معلوم ہو جائے کہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔ برادرانِ عزیز! گواہوں کی ضرورت صرف اس لیے ہوتی ہے نکاح کے وقت بھی ورنہ یہ کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے۔ معاشرے کو معلوم ہونا چاہیے کہ فلاں فلاں عورت اور مرد اب میاں بیوی کی زندگی بسر کریں گے اور جب یوں طلاق ہو تو پھر یہ معلوم ہو کہ اب یہ میاں بیوی نہیں رہے۔ دیکھا قرآن کتنا صاف کرتا چلا جاتا ہے معاملے کو۔ عدت کے دوران میں، عدت کے بعد بھی، ان کو اجازت ہے کہ یہ پھر آپس میں میاں بیوی بن سکتے ہیں۔

موجودہ شریعت میں حلالہ کا غیر قرانی تصور:

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ پڑ گئی یعنی اس نے اگر تین دفعہ یہ لفظ کہہ دیا ہے طلاق طلاق طلاق تو پھر یہ آپس میں میاں بیوی نہیں بن سکتے اور اس کی ایک شکل ایسی ہے جس کو زبان پر لاتے ہوئے حیا کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اسے حلالہ کہتے ہیں کہ یہ عورت خواہ ایک شب کے لیے ہی ہو کسی دوسرے مرد کے نکاں میں جائے، Actually (حقیقت میں) ہم بستری ہو۔ پھر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر اس طلاق کے بعد وہ پہلے خاوند کے ساتھ شادی کر سکتی ہے اور پروفیشنل حلالہ کرنے والے آپ کے ہاں ہوتے ہیں جیسے یہ کچہریوں میں وہ پروفیشنل بنے ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے اس چیز کی زبان زیب نہیں دیتی۔ وہ آپ کے ہاں کی مروجہ شریعت میں یہ چیزیں رکھی ہوئی ہیں اسے حلالہ کہتے ہیں۔ تین دفعہ کہہ دیا یعنی دو دفعہ کہہ دیا تو کوئی بات نہیں، اسی لفظ کو تین دفعہ دہرا دیا تو تین طلاق پڑ گئی، وہ جسے کہتے ہیں تین طلاق۔ وہ کیا چیز ہے؟

تین طلاق کے موجودہ تصور کے برعکس قران حکیم کی پیش کردہ وضاحت:

عزیزانِ من! طلاق تو جب یہ معاہدہ فسخ ہو گیا تو طلاق کے معنی ہیں آزاد ہو جانا۔ اپنے اس معاہدے کی گرہ سے آزاد ہو گیا، طلاق ہو گئی۔ یہ ایک طلاق ہے۔ اس کے بعد اجازت ہے کہ اگر آپس میں یہ چاہیں تو پھر سے میاں بیوی بن سکتے ہیں، پھر سے میاں بیوی بن گئے۔ پھر سے کشیدگی پیدا ہو گئی، پھر سے نوبت طلاق کی آ گئی، پھر سے معاہدہ ٹوٹ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک دفعہ اور بھی اجازت ہے، یہ بن سکتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی میں دوسرا موقع یہ آ گیا ہے۔ دیکھئے یہ دو دفعہ کی طلاق ہو گئی اور اس کے بعد یہ دیکھئے! یہ بچوں کا گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے کہ روز تم یہ تماشا ہی کرتے رہو۔ اگر تم نے اس کو اب کے دہرایا تو پھر اس کے بعد تم میاں بیوی نہیں بن سکو گے۔ یہ ہے تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد جو کہتے ہیں کہ نہیں بن سکتی۔ یہ تین دفعہ طلاق طلاق کہنا نہیں ہے۔ تیسری مرتبہ یہ چیز ہو تو پھر یہ میاں بیوی کا رشتہ نہیں ہو سکتا۔ کہا کہ کیا پھر یہ ابدی طور پہ نہیں ہو سکتا؟ کہنے لگے کہ نہیں! وہ کہیں دوسری جگہ شادی کرتی ہے فرض کرو کہ وہاں سے اس کو طلاق ہو جاتی ہے یا بیوہ ہو جاتی ہے، ایسی صورت ہو جاتی ہے اس صورت میں تم دوبارہ کرنا چاہو تو کر سکو۔ یہ بات نہیں ہے کہ ادھر سے تم نے طلاق لی اُدھر سے پھر عدت میں، درمیان میں پھر نکاح کیا، پھر طلاق دی، پھر نکاح کیا، پھر طلاق دی اور چلتا جائے اسی

طرح سے سلسلہ۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کی توبہ' اس قسم کی ندامت قبول نہیں کہ

جامِ مے توبہ شکن' توبہ مری جامِ شکن

سامنے اِک ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

نکاح کے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا ڈھیر نہ لگاتے چلے جاؤ۔ ایک دفعہ ٹوٹا ہے' ندامت ہوئی ہے' چلیے صاحب! معافی ہے۔ تم نے دو دفعہ توڑ دیا خیر اب کے بھی بھول چوک ہوگئی۔ اگر اس کے بعد تم نے یہ ایسی بات کہی تو یہ بات استوار نہیں ہو سکے گی' سوچ سمجھ کے قدم اُٹھانا۔ برادرانِ عزیز! یہ تھا تین طلاق جسے کہا جاتا ہے۔ جسے یہ کہا گیا ہے کہ **الطلاق مرتٰن** (2:229) جسے یہ دو دفعہ کی طلاق کہا جاتا ہے۔ دو دفعہ کی طلاق میں یہ نہیں ہے کہ لفظ طلاق دو دفعہ کہہ دینے میں کہ ہوسکتا ہے تین دفعہ کہہ دیا۔ یہ تو بات ہی نہیں ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ تو قانون بن رہا ہے۔ سو دفعہ ایک لفظ کو دہرا دیجیے تو کیا وہ سو مرتبہ ہو جائے گا آپ کے ہاں۔ ازدواجی زندگی میں یہ مواقع ہیں۔ عقد نکاح سے آزادگی کے بعد کی پھر بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے' دوبارہ آپس میں سلسلے کے استوار کرنے کی دوسری دفعہ بھی۔ تیسری مرتبہ یہ صورت نہیں ہوسکتی یاد رکھو! دو دفعہ کی طلاق میں تو یہ چیز ہے **فامساک بمعروف او تسریح باحسان** (2:229) قاعدے کے مطابق تم اس کو پھر میاں بنا بھی سکتے ہو یعنی میاں بیوی تم بن سکتے ہو۔ یاد رکھو! یہ نہیں ہے کہ تمہارا جی چاہے' طلاق دی' تمہارا جی چاہے پھر اس کو بنا دیا۔ وہ تو میاں بیوی کی دونوں کی رضامندی سے نکاح ہوگا۔ طلاق کے بعد بھی دونوں کی رضامندی سے یہ صورت ہوگی۔ البتہ اگر میاں نے کشیدگی کی بنا پر خود طلاق دے دی ہے تو یہ ٹھیک ہے اگر اس کو بعد میں ندامت ہوئی ہے تو اس کو زیادہ حق پہنچتا ہے اگر بیوی رضامند ہو جائے دوبارہ آنے کے لیے۔ ہر ''وقت میں'' یاد رکھیے! کہ پہلے نکاح کے وقت میں ہو یا طلاق کے بعد دوبارہ نکاح کے وقت میں ہو' دونوں کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ اس میں اگر کراہ کی شکل پیدا ہوگئی تو وہ نکاح' نکاح نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھئے! لیکن تیسری مرتبہ تم نے یہ کچھ کیا تو کہا کہ اب گنجائش نہیں رہے گی۔ دیکھا کتنی بڑی پابندی عائد کر دی ہے کہ سوچ سمجھ کر اب قدم اُٹھانا۔ مذاق تم نے کر لیا ہے' تم نے کھیل بچوں کا بنا لیا ہے' ایسا نہیں ہو سکے گا لیکن وہ گنجائش ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ کہیں اس بے چاری نے اور شادی کی' شادی ہونے کے بعد پھر وہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے بیوہ ہوگئی' اس کو مل وہاں سے طلاق گئی۔ تو اس کے بعد پھر اتنے واقعات کے بعد' ہوسکتا ہے بچے ہوں' بچوں کی وجہ سے ایسی صورت پیدا ہو سکے' اگر کوئی ایسی امکانی شکل ہو تو یہ ہے اس کی گنجائش ورنہ اس سے پہلے یہ جو چیز ہے' یہ نہیں ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے ان احکام کو کیسے Abuse کیا گیا ہے؟ یہ کہ تین طلاق کے معنی تین دفعہ طلاق: طلاق طلاق طلاق کہنے سے۔ اس کے بعد وہ جو چیز تھی کہ اگر کہیں اس نے شادی کر لی ہے پھر کبھی اس کو طلاق ہوگئی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

سنتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 228 تا 233)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ
يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ
اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى
الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ
ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا
سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 8 تاریخ ہے اور ہم قرآنِ کریم کے درس کے سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی پچھلی آیت 227 تک پہنچ گئے تھے' 228 سے آج آغازِ کلام ہوگا۔ (2:228)

نوعِ انسانی کے لیے اصول و اقدار کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی نوعیت اور اُن کی خصوصیت:

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا قرآنِ کریم میں عام طور پر زندگی کے اصول اور اصولی قوانین دیے ہیں۔ اس لیے کہ جس کتاب کو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا رہنا تھا یعنی قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ حیات بننا تھا' اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ ابدی اصول اور اقدار اپنے ہاں واضح طور پر دے دیتی کہ اصول اور اقدار میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی اور ان کی روشنی میں جزوی احکام کا تعین اس ملت کی صوابدید پر چھوڑتی کہ وہ اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات بھی وضع کرے اور ان پر عمل

پیرا ہونے کا طریق کار بھی متعین کرے۔ جزوی قوانین قرآن کریم نے بہت تھوڑے سے معاملات میں دیے ہیں اور وہ بھی بیشتر انسان کی عائلی زندگی Family Life کے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ عائلی زندگی مثلاً ماں باپ کے رشتے' بہن بھائیوں کے تعلقات اور بالخصوص میاں بیوی کے تعلقات' اولاد کے ساتھ تعلقات وہ چیزیں ہیں جن میں کہ یہ تعلقات مستقل ہوتے ہیں' ان میں تبدیلی نہیں آتی۔ قرآنِ کریم میں بیشتر احکام انہی رشتوں کے متعلق دیے ہیں۔ عائلی زندگی کے متعلق دیے ہیں۔

ازدواجی تعلقات کی اہمیت اور اس کے لیے دیے گئے احکام:

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے میاں بیوی کے تعلقات کو لیا ہے کہ ان کے تعلقات کی خوشگواری پر گھر کی فضا کا خوشگوار ہونا موقوف ہے۔ گھر کی فضا خوشگوار ہوتی ہے تو اولاد کی تربیت صحیح ہوتی ہے اور جب یہ ایک یونٹ اپنے ہاں قرآن کے الفاظ میں جنت کی سی زندگی کا ایک نقشہ مرتب کر لیتا ہے تو پھر گھروں کی دیواریں جب گراتے چلے جایئے تو معاشرہ خود بخود جنت کی فضاؤں جھولے جھولتا ہے۔ اس لیے اس نے میاں بیوی کی زندگی کے متعلق قوانین بڑی ہی تفصیل سے عطا کیے ہیں۔ پہلے چیز آئی تھی کہ نکاح کے لیے بنیادی شرط ہم آہنگی فکر ونظر ہے اور اس کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک بندھن ہے جو ایک دفعہ باندھ دیا گیا تو خواہ اس کے بعد حالات کیسے ہی کیوں نہ پیدا ہو جائیں اس سے آزادی نہیں ہو سکتی۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں اور نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو یہ جو تم نے باہمی نباہ کا معاہدہ کیا تھا یہ ٹوٹ بھی سکتا ہے لیکن وہ توڑتا بھی بڑے ہی حسین کارانہ انداز سے ہے اور یہی چیز ہے جس کے لیے اس نے جزوی قوانین دیے۔ پچھلی آیت میں یہ تھا کہ پہلے کوشش کرو کہ نباہ کی صورت ہو اور اگر تم نے طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر اس کے لیے ہم نے قاعدہ مقرر کیا ہے' اس کے مطابق پھر طلاق ہو جائے گی۔ طلاق کے بارے میں' میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے لفظی معنی آزاد ہو جانے کے ہیں اور اس سے مفہوم ہے کہ یہ جو ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا تھا اس معاہدہ کی تنسیخ کا نام طلاق ہے یعنی اس کے ٹوٹ جانے کا' علیحدہ ہو جانے کا' کالعدم ہو جانے کا نام ہے۔ اسے غور سے سن رکھیے کہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ اہم چیز کیا ہے؟ ٹھیک ہے طلاق کے معنی ہیں ''آزاد ہو جانا'' تو پھر اس میں بات کون سی ہوئی؟ ابھی بات سامنے آ جاتی ہے کہ میں کیوں زور دے رہا ہوں۔ اس کے معنی ہیں ''اس معاہدے کا ختم ہو جانا''۔ طلاق اس وقت کہیں گے جب یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے معنی ہی ''آزاد ہو جانا'' ہیں۔ جس طرح عقد کے معنی ہیں ''معاہدے کا طے پا جانا'' معاہدے کے الفاظ دہرا دینے سے یہ عقد نہیں ہو گا بلکہ یہ معاہدہ طے پائے گا تو اس وقت اسے آپ عقد کہیں گے۔ اسی طرح اس عقد کے کھل جانے کا نام' آزاد ہو جانا' کالعدم قرار پا جانا' منسوخ ہو جانا' جب یہ واقع ہو جائے گا تو پھر اس کو طلاق کہا جائے گا۔ آپ ذہن میں یہ رکھیے گا۔ طلاق یافتہ عورت کے بارے میں

کہا ہے کہ والمطلقٰت یتربصن بانفسهن ثلٰثة قروء ولا یحل لهن ان یکتمن ما خلق اللّٰه فی ارحامهن ان کن یؤمن باللّٰه والیوم الاٰخر (2:228) طلاق کے بعد عورت ایک متعین مدت تک دوسری جگہ نکاح نہیں کرسکتی۔

طلاق کی صورت میں دیئے گئے متعین اصول واقدار

اس کے اندر بہت بڑی مصلحت ہے اور مصلحت خود بتادی کہ انہیں چاہیے کہ اگر وہ حمل سے ہیں تو اس کا اعلان کردیں۔اس کی مدت تین قروء ہے۔قرءحیض کی مدت کو کہتے ہیں یعنی ایک مہینہ عام طور پر‘ ایک ماہواری ایام کے بعد دوسرے ماہواری ایام کا جو درمیانی عرصہ ہے‘ اسے کہتے ہیں اس کو تین حیض کہہ لیجیے اور یہ اس لیے ہے کہ یقینی طور پہ معلوم ہو جائے کہ سابقہ خاوند کا حمل اس عورت سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جو ہونے والا بچہ ہے اس کے حقوق کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔یہ متعین ہو جائے کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔اسی لیے یہ کہا کہ وہ اتنا انتظار بھی کرے اور اگر استقرارِ حمل ہے تو اسے چاہیے کہ اسے چھپائے نہیں بلکہ بات واضح طور پر کہہ دے۔یہاں یہ کہا کہ تین مہینے کے لیے اسے انتظار کرنا ہوگا۔اس کو عدت کی مدت کہتے ہیں۔جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ طلاق کی بات آئی تھی تو قرآنِ کریم کی طلاق کی تمام آیات آپ کو حوالوں سے لکھا دی تھیں کیونکہ قرآن ایک بات کو ایک جگہ بیان نہیں کرتا‘ متعدد مقامات میں پھیر پھیر کر لاتا ہے۔وہ سارے مقامات بیک وقت سامنے آجائیں تو وہ مسئلہ بالکل واضح صاف بین ہو جاتا ہے۔عدت کے لیے بھی یہ آیات دیکھ لیجیے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ میری چھوٹی سی کتاب ہے ’’قرآنی قوانین‘‘ اس میں وہ قرآنِ کریم کے جو تمام قوانین ہیں‘ وہ دیے ہوئے ہیں۔میں وہیں سے یہ چیز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ (2:228) میں کہا گیا ہے کہ اس کے لیے یہ عدت تین قروء ہے اور اسی لیے مسئلہ یہی ہے کہ جب وہ حیض سے فارغ ہو تو اس وقت جو طلاق ہے وہ متعین کی جائے تاکہ عدت کے دن گننے میں آسانی رہے۔اگر عورت ایسے مقام پہ پہنچ چکی ہے‘ سن رسیدہ ہو چکی ہے کہ وہ حیض سے نا اُمید ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آسکا‘ ایسی بھی تو صورتیں ہوتی ہیں کہ وہ سن رسیدہ بھی نہیں ہوتیں لیکن حیض کی بندش ہو جاتی ہے۔اگر ایسی صورت ہو تو ان کی عدت تین مہینے کی ہے (65:4) حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے‘ تین مہینے نہیں ہے۔بچے کی پیدائش تک ہے (65:4)۔ نکاح کے بعد اگر جس عورت کو ہاتھ نہ لگایا جائے اور اس سے پہلے ہی طلاق واقع ہو جائے تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے (33:49)۔ بیوہ عورت کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے (2:234)۔قرآن نے بیوہ کے متعلق تشریح نہیں کی کہ اگر وہ حاملہ ہو تو کتنی عدت ہے لیکن مطلقہ کے متعلق جو قرآن نے وضع حمل تک کہا ہے تو وہاں سے یہ مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ بیوہ حاملہ ہو تو اس کی عدت بھی وضع حمل تک ہونی چاہیے۔عدت کے دوران مطلقہ عورت کے رہنے سہنے کا‘ خورد ونوش کی ذمہ داری‘ سابقہ خاوند کے اُوپر ہوگی اور اس کا معیار وہی ہوگا جو اس

سے پہلے ان کی ازدواجی زندگی میں تھا (2:241)(65:1)(65:6-7)۔ اسے اس گھر سے نہیں نکالنا چاہیے۔ عورت کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اسے وہیں رہنا چاہیے لیکن اگر حالات سازگار نہ رہیں' باہمی مناقشت ہو جائے' تنازع ہو جائے تو پھر کوئی بندش نہیں ہے' وہ دوسری جگہ بھی جا سکتی ہے۔ عورت کی طرف سے اختلاف' شقاق یا تنازع کی صورت میں وہی شکل قرآن نے تجویز کی ہے جو مرد کی صورت میں تجویز کی ہوئی ہے۔ بیوہ کے لیے ایک سال کی خورد و نوش رہائش وغیرہ کا انتظام مرد کے ذمے ہے۔ اگر وہ اس سے پہلے کہیں دوسری جگہ چلی جاتی ہے تو پھر وہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے (2:240)۔

قرآن حکیم نے بیوہ ہونے کی صورت میں اسے اسی گھر میں رہنے کو سہولت کے طور پر بیان کیا ہے:

یہ جو کہتے ہیں کہ خاوند کے مرنے کے بعد یہ بیوہ' جس گھر میں' جس کوٹھڑی میں' جس مکان میں ہے' وہ چار مہینے دس دن تک وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی یہ غلط ہے۔ سوال پابند مسکن ہونے کا نہیں ہے۔ یہ تو قرآن نے سزا کے طور پر تجویز کیا ہوا ہے' سورۃ النسآء میں ہم دیکھیں گے تو اس بیچاری کو سزا نہیں ملتی۔ کہا تو یہ تھا کہ اس کو اس گھر سے نکالا نہ جائے' وہ بھی اس گھر سے نہ نکلے' وہیں رہے۔ اس کے ساتھ بچے ہیں' وہ خود ہے تو اس صورت میں وہاں وہ جہاں رہ رہی ہے بشرطیکہ وہاں کی فضا سازگار ہو' فضا سازگار نہ ہونے کی صورت میں اور بات ہے لیکن وہ یہ چیز نہیں ہے کہ اس کو یہ سزا ملی ہوئی ہے کہ وہ اتنے دن گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج ہے کہ وہ کسی ضرورت کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی' جس گھر میں بھی اس کے خاوند کا انتقال ہوا ہے۔ قرآنِ کریم کا یہ منشا نہیں ہے۔ یہ عدت کے متعلق قرآن نے کہا وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا (2:228) اس دوران میں' ابھی بات آئے گی کہ کون سا عدت کا یہ وقت تھا' یہ جو وقت ہے' جس میں اس نے ابھی دوسری جگہ نکاح نہیں کیا' اگر خاوند نے اس کو چھوڑا تھا' طلاق دی تھی تو اس کے لیے یہ چیز کوئی ممانعت کی نہیں ہے کہ وہ دوبارہ بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں اس کا حق فائق ہے۔ اگر یہ چاہے اور بڑی شرط یہ ہے کہ عورت کی بھی رضامندی ہو۔

کوئی مرد کسی عورت کا زبردستی مالک نہیں بن سکتا:

یاد رکھیے! عورت کی رضامندی کے بغیر کسی صورت میں نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت کے وارث بن جاؤ کہ اسے کراہت ہو اور تم اس کے مالک بن جاؤ۔ باہمی رضامندی سے ہی یہ معاہدہ قرار پاتا ہے اور دیکھیے درمیان میں قرآن چار لفظ لایا ہے۔

عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام نے عورت کو حقوق دیے۔ حقوق کے بعد جب ہم ان مسائل پہ جاتے ہیں جو زندگی میں بڑھتے جاتے ہیں تو وہاں نظر آتا ہے تو پہلی چیز یہ ہے کہ مردوں کو حاکم بنایا ہے عورتوں کے اُوپر۔ تو اب بتائیے کہ اس کے بعد محکوم کے حقوق کیا ہوتے ہیں؟ پھر حقوق کی فہرست مرتب کی جائے۔ قرآنِ کریم کے چار الفاظ ہیں' برادرانِ عزیز! اور جہاں تک میری نگاہ گئی ہے' کہیں اس قسم کے الفاظ نہ مجھے دیگر مذاہب کی مبینہ مذہبی کتابوں میں ملے ہیں' نہ کسی اور جگہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف** (2:228) چار الفاظ میں کتنی جامعیت سے بات کہہ گیا ہے کہ یاد رکھو! جو ذمہ داری عورت پہ عائد ہوگی ایک ذمہ داری کے مقابلے میں اس کا ایک حق ثبت (Establish) ہو جائے گا۔ ہر Responsibiliy کے مقابلے میں' ہر Liability کے مقابلے میں' ایک Acrue Right ہو جائے گا۔ کیا بات ہے صاحب! یہ ہے عائلی زندگی میں خدا عدل کا ترازو لیے ہوئے بیٹھا ہوا۔ جتنی ذمہ داریاں عائد کرو' اس کو اتنے حقوق دینے ہوں گے۔ یہ ہے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق یہاں ذمہ داریاں ساری کی ساری عورت کی ہیں' حقوق سارے کے سارے مرد کے ہیں' یہ حاکم واقع ہوئے ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہیں تو روایات آتی ہیں کہ اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا کہ عورت مرد کو سجدہ کرے۔ پھر مرد یعنی خاوند عورت کا مجازی خدا تو ہے ہی۔ پھر یہ میاں ہے یعنی اس کے بعد اللہ میاں ہے اور یہ میاں ہے۔ تو اس کے بعد حقوق تصور نہیں ہو سکتا۔

چار چار شادیوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی شرط کا تذکرہ:

عزیزانِ من! حقوق کا تصور تو ان چار لفظوں میں ہوگا صاحب! ہر ذمہ داری کے مقابلے میں ایک حق ہے۔ کیجیے فہرستیں مرتب لیکن ہمارے ہاں تو ہوتا یہ ہے' عجیب چیز ہے' قرآن کے ساتھ جو کیا جاتا ہے' قرآن کی آیت کے ایک ٹکڑے کو الگ کر لیا جاتا ہے۔ وہ جو آپ کو ایک آیت تین تین چار چار بیویاں کرنے کے سلسلے میں سنایا کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آیت بھی یہاں سے پڑھی جاتی ہے' نکاح نامے کے جو فارم چھپے ہوئے ہوتے ہیں' ان پہ میں نے دیکھا ہے کہ آیت یہاں سے لکھی جاتی ہے۔ کہاں سے لکھی جاتی ہے؟ یہاں سے کہ **فانکحوا ما تاب لکم من النسآء مثنی و ثلثۃ و ربٰعا** (4:3) عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہیں دو دو تین تین چار چار شادی کر لو۔ نکاح کے وقت یہاں سے یہ آیت پڑھی جاتی ہے' نکاح نامے کے اُوپر یہاں سے یہ آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ تھوڑی سی عربی جاننے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ جو **فانکحوا** میں ف ہے اس کے معنی ''تو'' ہے تو اس سے پہلے اگر ہوگا یعنی شرط پہلے ہوگی تو اس کے بعد جزا ہوگی **فانکحوا** کے معنی ہیں تو تم ایسا کرو۔ کیا کبھی کوئی فقرہ ایسا شروع ہوتا ہے جو ''تو'' سے شروع ہو اور پہلے اس کے اگر نہ ہو؟ لیکن یہ یہاں سے یہ آیت شروع کرتے ہیں یہ ابتدا نہیں ہے یہ آیت کا درمیان ہے' یہ اس سے پہلے شرط موجود ہے کہ **و ان خفتم** (4:3) اور اگر'

یہ دیکھئے پہلے اگر آیا۔ جملہ سوچیے تو بنتا ہی اس طرح سے ہے کہ شرط پہلے ہوتی ہے' جزا اس کے بعد ہوتا ہے۔ **وان خفتم** (4:3) یہ کبھی نہیں پڑھیں گے' یہ کبھی نہیں لکھیں گے۔ قرآن کی آیت کے متعلق یہ کچھ آپ کے ہاں ہوتا ہے' دھڑلے سے ہوتا ہے' ۃ محفلوں میں ہوتا ہے' لکھا ہوا ہوتا ہے۔ **وان خفتم الا تقسفوا فی الیتٰمٰی فانکحوا ما تاب لکم** (4:3) اگر تمہیں اس چیز کا ڈر ہو کہ وہ جو عورتیں خاوند کے بغیر رہ گئی ہیں' حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ بیوائیں اتنی رہ گئی ہیں یا ان کے بچے ہیں کہ جن کا معاملہ تم کسی طرح سے بھی حل نہیں کر سکتے اور انصاف سے طے نہیں کر سکتے تو پھر اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے ان کو نکاح میں لا کر ان کی حفاظت کا سامان کر دو اور پھر آگے اگلی شرط یہ چیز ہے کہ **وان خفتم الا تعدلوا فواجدۃ** (4:3) اور اس پہ اگر تم دیکھو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر وہ وہی ایک والا قانون رہے گا۔

دوسری شادی کے سلسلہ میں حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا:

قرآن ہے عزیزانِ من! اس عمدگی سے کہہ گیا کہ قانون تو ایک ہی کا ہے لیکن اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو گئے ہنگامی معاشرے میں جیسے کہ جنگ کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر اسلامی سوسائٹی کے اندر یہ صورت واقعی خطرناک شکل اختیار کر جاتی ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی ہی نہیں کر سکتی' نہ کافر سے' نہ مشرک سے' نہ اہل کتاب سے۔ مختصر سی ایک جماعت مدینے میں ہے' جنگ شروع ہو جائے' جنگ میں جو نوجوان ہیں وہ کام آتے ہیں۔ وہ جنگ میں کام آنے شروع ہو گئے' مرد کم ہو گئے' عورتیں زیادہ ہو گئیں۔ مکے سے مسلمان عورتیں اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ کر بھاگ کر مدینے آ گئیں۔ یہ Situation (صورت حال) پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے میں یہ کمیونٹی کیا کرے؟ یہ عورتیں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتیں۔ مسلم کمیونٹی کے مردوں کی تعداد کم ہو رہی ہے' عورتوں کی تعداد اتنی بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے ایک ہنگامی صورت پیدا کی تھی کہ اگر تمہیں یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ ان کے مسئلہ کا کوئی معقول اور مناسب حل نہ ملے تو ایک سے زیادہ چار تک شادیاں کر سکتے ہیں لیکن اگر You will not be able to do justice to them (تم ان سے عدل نہیں کر سکو گے) تو پھر صرف ایک شادی کا ہی قانون ہوگا۔ یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ کتنا عجیب جامع لفظ ہے۔ عورت کے ساتھ Justice (انصاف) میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ شامل ہے۔ اس صورت میں اگر معاشرہ چاہے تو اس مشکل کا یہ ایک حل ہے لیکن اس میں بھی یہ دیکھ لو کہ گھر کو جہنم نہ بنا لو **تعدلوا** (4:3) کے معنی یہی نہیں ہیں کہ آنے والی بیوی سے تم عدل نہیں کر سکو۔ جو پہلے رہنے والی ہے اس سے عدل نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گی صاحب؟ اس سے تو عدل اسی صورت میں ہوگا کہ اس کی رضامندی سے ایسا ہو ورنہ پہلے دن سے ہی غیر عدل کی شکل پیدا ہو جائے گی لیکن میں جب سورۃ نسآء پہ آؤں گا۔ وہاں عرض کروں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے کرتے یہ

ہیں کہ قرآن کی آیتوں کے اندر سے چار لفظ ٹکڑے لے کر کہ دیکھیے صاحب! قرآن نے یہ کہہ دیا ہے۔

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے مقابلے کی وضاحت اور اس کی نوعیت

اسی طرح سے یہاں ہوتا ہے کہ واہ صاحب! آپ نے کہہ دیا کہ یہاں مساوات ہے' حقوق اور ذمہ داریاں برابر ہیں!! یعنی آپ نے کہہ دیا گویا یہ جو چار الفاظ تھے یہ تو قرآن میں' میں نے داخل کیے تھے اور اگلے چار لفظ ان کے قرآن میں تھے' وہاں سے بات آ گئی۔ **الرجال علیھن درجۃ**(2:228) دیکھو صاحب! قرآن کہتا ہے مردوں کو ان کے اُوپر فضیلت حاصل ہے' افضلیت حاصل ہے' درجات حاصل ہیں۔ ساری آیت پڑھو تو بات ثابت ہو جائے۔ وہ کہتا ہے طلاق کی صورت میں فریقین اس معاہدے سے آزاد ہو گئے۔ عورت پر ایک پابندی عائد کی جا رہی ہے کہ وہ چار مہینے تک نکاح نہیں کر سکتی۔ اس پابندی کی مصلحت بتائی جاتی ہے۔ مرد کے لیے تو یہ چیز ضروری نہیں ہے جس کے لیے یہ چار مہینے لگائے ہیں عورت کے لیے ہے۔ وہ تو اس لیے تھا کہ اس کا یقین ہو جائے کہ حمل نہیں ہے۔ مرد کی صورت میں تو ضرورت نہیں تھی اس لیے مرد پر یہ عدت کی پابندی لگائی نہیں گئی۔ کہا یہ کہ عورت کے اُوپر یہ پابندی ہے ان کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں ہیں۔ بس یہ ایک معاملہ ہے جس میں مرد کو یہ Advantageous Position (سودمند حیثیت) حاصل ہے۔ **درجۃ** ایک معاملہ ورنہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اگر یہ صورت ہے تو پھر اس پہ بھی عدت لگائیے۔ یہاں آیت آئی ہے کہ **والرجال علیھن درجۃ** (2:228) اس معاملے ایک ایسی چیز ہے جسے تم کہہ سکتے ہو کہ مرد کو کچھ Advantageous Poisiton (سودمن حیثیت) حاصل ہو گئی عورت کے معاملے میں۔ جہاں یہ ہو رہی ہے وہاں بھی قرآن بتا رہا ہے کہ **درجۃ** یہ ایک درجہ' ایک چیز ہے' جس کے اندر قرآن نے اس کو یہ فضیلت دی ہے Advantageous Position (سودمند حیثیت) دی ہے۔ ورنہ اصول یہی ہے **ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف**(2:228) قرآن کی رو سے قاعدے قانون حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔ بس ایک ایسی چیز ہے کیونکہ عدت کا بیان آ رہا تھا نا' مرد کے لیے عدت بھی نہیں ہے' خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اللہ میاں رعی کر گیا۔ کیونکہ ''اللہ میاں دے متعلق وی تے تصور کچھ ایسا ای اوندا اے کہ یعنی اے عورت تے نئیں ذہن اچ اوندا مرد ای ذہن اچ اوندا ہیگا'' ❶۔ حالانکہ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ کہیں ہماری بیٹیوں کے ذہن میں یہ نہ آ جائے کہ **لم یلد ولم یولد** (112:3) کہہ دیا تھا کہ تم اس قسم کی کوئی چیز ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ تذکیر و تانیث کا سوال ہی وہاں پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں مردوں کا دیا ہوا جو تصور ہے آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی خدا کا ذکر آتا ہے اس کے لیے مذکر کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ تو اس نے وہیں یہ چیز کہہ دی کہ ایسی بات نہیں ہے بس یہ ایک معاملہ ہے کہ اس کے لیے عدت نہیں ہے۔ وہ تم سمجھتے ہو کہ تمہیں اس کے لیے ہم نے نہیں رکھا'' کچھ رعی کرن والی گل نئ ہیگی'' ❷ بس

وہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہے **الرجال علیهن درجة والله عزيز حكيم** (2:228) پابندیاں عائد کرنے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ حکمت پر پابندیاں ہیں جو عائد کررہا ہے۔

---

❶ اللہ میاں کے متعلق بھی تو تصور ایسا ہی ہے یعنی یہ کہ عورت ذہن میں نہیں آتا ہے۔ مرد ہی ذہن میں آتا ہے۔

❷ کچھ رعایت دینے والی بات نہیں ہے

قرآن حکیم کی روشنی میں طلاق کا طریق کار:

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ طلاق کے متعلق جو حوالے اور قوانین ہیں میں نے عرض کر دیے تھے۔ اب وہی آیتیں آتی ہیں کہ **الطلاق مرتٰن فامساک بمعروف او تسریح باحسان** (2:229) یہ ترجمہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق ایسی ہے کہ جس کے بعد قاعدوں کے مطابق روکا جاسکتا ہے' نکاح میں رکھا جاسکتا ہے' حسن سلوک سے آزاد کیا جاسکتا ہے۔ بات آسان ہے۔ الطلاق: طلاق کے معنی آپ نے سمجھ لیے کہ یہ جو عقد نکاح ہے' اس سے آزادی حاصل ہو جانا' اس کا فسق ہو جانا' اس کا کالعدم ہو جانا' عورت و مرد کا اس عقد سے آزاد ہو جانا۔ میں نے پچھلی دفعہ تفصیل سے یہ سمجھایا تھا کہ بات کیا تھی؟ طلاق کے لیے ایک قاعدہ مقرر ہے' پروسیس مقرر ہے۔ میاں اور بیوی کے ہاں سے حکم مقرر ہوں گے۔ وہ آپس میں بیٹھیں گے ایک ثالث ہوگا' مصالحت کی کوشش کریں گے' ناکامی کی صورت میں فیصلہ دیں گے۔ اس وقت یہ عقد کا رشتہ' جو معاہدہ ہے' یہ کالعدم قرار پائے گا۔ اس وقت جب یہ کالعدم قرار پائے گا تو اسے طلاق کہا جائے گا۔ ایک دفعہ زندگی میں میاں بیوی کی یہ صورت ہوئی قرآن نے کہا پھر بھی گنجائش ہے' دوبارہ بھی میاں بیوی بن سکتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ ایک دفعہ پھر دوبارہ ایسی صورت واقع ہوگئی' یعنی دوبارہ یہی پروسیس دہرایا گیا' دوبارہ پھر یہ جو عقد ہے' فسخ ہوا' دوبارہ پھر یہ اس معاہدہ سے آزاد ہو گئے۔ یہ دو مرتبہ ہو گیا۔ کہا کہ دوسری مرتبہ بھی اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ میاں بیوی ہو سکتے ہو اور اس کے ساتھ کہا کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ تم روز بار بار یہ دہراتے چلے جاؤ اور بار بار پھر یہ بنتے چلے جاؤ۔ دو مرتبہ کی گنجائش بھی کوئی کم گنجائش نہیں' اتنی ہم نے دے دی' اس کے بعد اگر تم نے اس کو دہرایا تو پھر کوئی گنجائش نہیں تمہارے لیے۔ بات صاف ہوگئی کہ دو مرتبہ کی الطلاق میں یہ گنجائش ہے۔

ہمارے ہاں طلاق پر عمل پیرائی کا طریق نیز ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہ ہے قرمان۔ ہمارے ہاں کیا چیز ہے؟ کہ صاحب! اگر ایک بار یا دو بار لفظ طلاق کہہ دیا: طلاق طلاق' اس میں تو گنجائش ہے اور اگر تین دفعہ یا بار یہ لفظ کہہ دیا تو بس پھر گنجائش نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قانون کی بات ہو رہی ہے۔ کیا یہ چیز ہے کہ قانون کا جو ایک لفظ ہے

اگر دو دفعہ کہا جائے تو کوئی بات نہیں ہے' تین دفعہ اس لفظ کو کہہ دیا جائے' کیا یہ قانون ہوگا خدا کا بنایا ہوا قانون؟ کہ پھر گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہیں ہمارے وہ قوانین جن کو غیر مسلم دیکھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہیں قوانین جنہیں آپ کہتے ہو کہ خدا نے ہمارے ہاں ابدی قوانین دیے ہوئے ہیں اور ساری دنیا کے قوانین سے وہ اعلیٰ اور افضل اور بلند مرتبہ ہیں۔ یہ ہے وہ چیز کہ دو مرتبہ ایک لفظ دہرایا جائے تو خیر کوئی بات نہیں ہے اور تین مرتبہ اگر وہی لفظ کہہ دیا جائے تو پھر وہ معاملہ ختم ہوا۔ نیلام کرنے والے کی طرح ون ٹو جاتا ہے تین دفعہ۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے اور عجیب چیز ہے' قرآن ہے' عزیزانِ من! خدا کا کلام ہے' اسے معلوم تھا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ دو ہی آیتیں بعد قرآن نے یہ کہا ہے کہ **ولا تتخذوا ایٰت اللّٰہ ھزوا** (2:231) دیکھنا خدا کی ان آیات اور قوانین کو کہیں مذاق نہ بنا لینا۔ یہیں کہا ہے یہ ہیں قرآن کے الفاظ۔ دو مرتبہ کی یہ صورت ہے' اس دوران میں **ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیئًا الا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ** (2:229) یہ ہونے لگا ہے تم لگے ہو طلاق دینے' تو یہ غلط بات ہے کہ تم اسے کچھ دے چکے ہو' اس سے پیشتر مہر کی صورت میں اور عطیے کچھ زیورات کی صورت میں تو وہ اس سے چھیننا شروع کردو' واپس لینا شروع کردو' یہ بات نہیں ہے لیکن اب یہ معاشرے کے لیے ہے' وہ جو ایک ثالث کمیٹی اس کے لیے بیٹھی تھی' اگر تم دیکھو کہ یہی چیز اس معاملے میں روک بن رہی ہے تم دیکھ سکتے ہو کہ میاں بیوی رہ کے جو اللہ نے حدود مقرر کیے ہیں ان پہ وہ قائم نہیں رہ سکتے اور یہ کچھ لینے دینے کا معاملہ اس کے درمیان میں آڑے آرہا ہے تو یہ چیز ایسی نہ ہو جائے کہ اس معاملے کو حل کرنے کے راستے میں سنگ گراں بن جاؤ' نہیں۔ **فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ** (2:229) عورت کو یہ کچھ دیا تھا تو کہا ہے کہ اگر ایسی صورت ہو' معاشرہ یہ دیکھے کہ عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو رہا ہے' بغیر دیے ہوئے یہ معاملہ طے نہیں ہو رہا تھا تو ٹھیک ہے تم اسے کہہ سکتے ہو کہ جو کچھ دیا تھا اس میں سے کچھ وہ واپس دے دے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ اس میں کتنی بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ نکاح کے وقت خاوند مہر کی شکل میں' مہر بھی تحفہ ہوتا ہے' گفٹ کی شکل میں اس عورت کو دیتا ہے۔ اب اس قانون کو Abuse کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو Abuse کرنے والی ہو' آج اس نے ایک نکاح کیا' پچاس ہزار روپیہ مہر تھا' اسے وصول کیا' نہ بھی کیا تو ہفتے بھر کے بعد طلاق مل جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری جگہ نکاح کیا۔ میں یہ Abuse کرنے والیوں کا کہہ رہا ہوں۔ تو قانون دینے والا جو خدا ہے' وہ ان راستوں کو بھی بند کرتا ہے۔ کہا کہ یہ صورت نہ ہو کہ کوئی یہ اس قسم کا قصہ شروع کردے۔ ایسی صورت میں یہ مجاز ہے: ثالث' یہ حاکم' یہ عدالت' یہ فیملی کورٹ' وہ یہ طے کرے کہ نہیں کوئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی ہے اور تم تو اس غرض کے لیے یہ کچھ کر رہی ہو اس لیے ٹھیک ہے وہ تمہیں واپس دینا ہوگا۔ یہی مشکل ہے جس کے لیے کہا کہ اگر تم دیکھو کہ وہ حدود اللہ کی پابندی نہیں کرسکیں گے تو اس صورت میں تم عورت سے یہ کہہ سکتے ہو کہ کچھ تم واپس دے دو' پھر معاہدہ فسخ کردو۔

عورت کو ناکردہ گناہ کی سزا کس لیے؟

اب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جس وقت جب جی چاہے بغیر کسی قسم کا کوئی Reason دیے ہوئے' کوئی وجہ بتائے' کوئی سبب بتائے' طلاق طلاق اور طلاق تین مرتبہ کہا اور معاملہ ختم ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ ان کا نکاح' وہ جو میں نے عرض کیا تھا بار بار دہرانا اچھا نہیں لگتا' بزم میں میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں' وہ جسے آپ حلالہ کہتے ہیں' ہوگا۔ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ جب جس وقت جی چاہے' ذرا سا غصہ تاؤ میں آیا کہ ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑا' طلاق طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد یہ بے گناہ بیچاری رو رہی ہے۔ عورت کے اُوپر ظلم پہ ظلم ہو رہے ہیں' اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو معاہدہ اس کی مرضی سے' اس طرح سے طے ہوا تھا' وہ اپنی مرضی سے توڑ دے' یہ جائے عدالتوں میں۔ یعنی مرد کے لیے اگر یہ رکھا جاتا تو پھر بھی یہ بات تھی کہ روز عدالتوں میں یہ جاتے ہی ہیں۔ یہ بیچاری پردہ نشین گھر میں بیٹھنے والی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کی تو حالت یہ ہے کہ یہ بیچاری اپنا Cause بھی اچھی طرح سے وہاں Plead نہیں کر سکتی۔ اسے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جاؤ کچہری' میاں صاحب گھر میں کھڑے کھڑے طلاق طلاق طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا اور جب پھر وہ کچہری والا معاملہ ہوتا ہے تو اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ کو اور مجھے سب کو معلوم ہے۔ کیا خدا یہ اس قسم کے قوانین دے گا؟ جس کے متعلق خود اس نے یہ کہا ہے کہ اس کو تو مرد نے اس حالت میں رکھا ہوا ہے کہ یہ بیچاری دوسرے مرد کے سامنے اپنا قصہ بیان نہیں کر سکتی۔ بات بھی یہ ٹھیک ہے **تلک حدود الله فلا تعتدوھا** (2:229) یاد رکھو! یہ ہم نے حدیں باندھ دی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو۔ سنیے! **ومن یتعد حدود الله فاولئک ھم الظٰلمون** (2:229) جو ان حدود سے تجاوز کریں گے' ظلم کریں گے۔ دیکھا آپ نے آج معاشرے میں عورت کے اُوپر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ یہ سب کا سب حدود اللہ سے تجاوز ہوا ہوا ہے۔

دو مرتبہ طلاق ہونے کے بعد کا سوال؟

فان طلقھا (2:230) دو دفعہ معاہدے کے فسخ ہو جانے کے بعد گنجائش باقی ہے اور اگر دو کے بعد آگے پھر نوبت آ گئی ہے' اگر یہ صورت پیدا ہوئی ہے تو **فلا تحل له من بعد حتٰی تنکح زوجًا غیره فان طلقھا فلا جناح علیھما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما حدود الله وتلک حدود الله یبینھا لقوم یعلمون** (2:230) ہاں! اس نے کہیں کسی اور مرد سے پھر شادی کر لی' زمانہ گزر گیا' بیوی ہو گئی یا وہاں سے بھی اس کی طلاق کی نوبت آ پہنچی۔ اس دوران میں آپس کے تجربے نے بتایا کہ نہیں! یہ نکاح بہتر تھا۔ کہا کہ اب پھر اس کی گنجائش نکلی۔ ابدی طور پر وہ بالکل نہیں دھتکارتا' قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ اصلاح کی شکل نکلتی آئے۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے کہا کہ تین دفعہ یہ طلاق کہہ دیا اور اس کے بعد پھر' (معاذ اللہ) چھوڑ دیے قصہ' آپ کو پتہ ہے' میں نہیں دہرانا چاہتا۔ **واذا**

طلقتم النسآء فبلغن اجلھن فاسکوھن بمعروف او سرحوھن بمعروف (2:31) وہی دو دفعہ کی طلاق کا قصہ جس میں واپسی کی گنجائش ہے۔ اگر وہ اپنی عدت کی مدت پہ پہنچا نا چاہتی ہیں تو اس کے بعد پھر یہ چیز فیصلے کر دینے کی ہے۔ رکھنا چاہتے ہو' قانون کے مطابق میاں بیوی رہنا چاہتے ہو' اس صورت میں میاں بیوی رہ سکو۔ حسن سلوک سے چھوڑنا چاہتے ہو تو اس کو حسن سلوک سے چھوڑ دو۔ یہاں چھوڑتے وقت بھی حسن سلوک ہے۔

باہمی تعلقات کے منقطع ہونے پر بھی حسن کارانہ تعلقات کو نظر انداز نہیں کرنا ہوگا:

یہ تو میاں بیوی کا آپس میں چھوڑنا ہے' عزیزانِ من! وہ تو کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی' مکے کے قریش رسول اللہ ﷺ اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ وقت آ رہا ہے جب ان سے قطع علائق کیا جائے گا' قطع تعلق کیا جائے گا' وہاں بھی کہا گیا ہے کہ **واھجرھم ھجرًا جمیلا** (73:10) تعلقات حسن کارانہ رکھنے تو ایک طرف' کہا ہے تعلقات منقطع کرو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے منقطع کرو ورنہ تعلقات کے منقطع ہونے میں وہ تو آپ کو معلوم ہے وہ تو ایسا پنجاب ہے ''میری لگدی کسی نے نہ دیکھی تے ٹٹڈ دنوں جگ ویکھدا'' یہ ٹوٹنا ہمارے ہاں کا تو پھر ایسا تماشہ Create کرتا ہے۔ قرآن ہے عزیزانِ من! وہ تعلقات منقطع کرنے میں بھی کہتا ہے کہ **جمیلاً** شریف انسان کا کام یہ ہے' نہیں نبھا ہوا' تعلقات منقطع ہو رہے ہیں' شرافت کو چھوڑ کے حیوانی درجے پہ کیوں آتے ہو' حسن کارانہ انداز سے تعلقات کا انقطاع کرو۔ تو میاں بیوی کے تعلقات جو ہیں وہ حسن کارانہ انداز سے کیوں نہیں ہوں گے۔ **او سرحوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارًا لتعتدوا** (2:231) دیکھیے! یہ دوبارہ تم نے نکاح میں لانا ہے' میاں بیوی کی حیثیت اختیار کرنی ہے' تو اس نیت سے نہ کرو کہ اچھا ایک دفعہ تو نکل آ واں اب کے آ! ''فیر تینوں سٹ لاں گا'' کہتا ہے اس نیت سے نہیں!

لفظ زوج کا قرآنی مفہوم:

میاں بیوی اور ان کے تعلقات کی بنیاد اس کے اُوپر ہو۔ کہتا ہے تم سمجھ کیا رہے ہو یہ تو تعلقات ہی ''زوج'' کا ہے اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ زوج کہتے ہی ان دو چیزوں کو ہیں کہ وہ دونوں کے ملنے سے ایک اکٹھی چیز بنے۔ ان میں سے اگر ایک رہ جائے یا ایک ناقص ہو جائے کہ بات چلی ہی نہ آگے' گاڑی کے جو دو پہیے (گڈے کے دو پہیے) ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ اتنا ان کا صحیح' برابر کا ہونا ضروری ہے' ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ ایک پہیہ' دوسرے پہیے سے ذرا سا چھوٹا کر دیجیے اور چلایئے گاڑی کو!! تو چھوٹا تو ایک طرف رہا یہاں تو بنیاد ہی آپ تعلقات کی رکھتے ہیں یعنی عورت کو آپ نے ہمیشہ عورت کو چھوٹا پہیہ قرار دیا۔ پھر جو گاڑیاں چلتی ہیں آپ نے تو دیکھ لیا کہ چھوٹا تو ایک طرف رہا اگر صورت یہ ہو جائے کہ ایک پہیہ گول ہو' دوسرا چوسرا ہو' تے دیکھو چورا ہے تے اوس گڈی دا

حال جو کچھ ہو یا ہونداا ے [1] ''چوراہے میں دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ عزیزانِ من! ہر گھر میں وہ گاڑی دیکھئے کہ کیا ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ توان بیچاریوں کا صبر ہے کہ ہم نے ان کو اس پوزیشن میں باندھ کر رکھا ہوا ہے کہ

---

[1] اب کے ایک دفعہ تو نکل آؤں پھر تجھے گھر الوں گا۔

[2] تو پھر چوراہے پہ دیکھو کہ اس گڈے کا کیا خیال ہوا ہوتا ہے۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے دم مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

گھریلو زندگی کو جنتی ماحول عطا کرنے کا طریق

وہ اُف نہیں کر سکتی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ان پہ ظلم کر کے ان کا کچھ بگاڑا ہے' کم بختو! آدھی آبادی انسانیت کی جن کو آپ اس حالت میں رکھتے ہیں پھر انسانیت آگے قدم بڑھا کیسے سکے گی؟ تو جو عذاب ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں' ان میں بیشتر وجہ یہ ہے! گھر میں مساوات کی زندگی' تعظیم کی زندگی' احترام کی زندگی' ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کی زندگی' بسر کیجیے۔ دیکھئے! اس میں آپ کے گھر کا نقشہ کیا ہوتا ہے' آپ کو کتنا سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے' بچوں کی تربیت کیسے ہوتی ہے' باہر کے معاشرے میں آپ کی Balanced Personality (متوازن شخصیت) کیا چیزیں پیدا کرتی ہیں۔ یہاں تو مصیبت یہ ہوتی ہے کہ صبح بیوی سے لڑ کر جاتا ہے' بدقسمتی سے اگر مجسٹریٹ واقع ہوتا ہے'' تاں پھانسی دے دینداا ے بے گناہ نوں جا کے' غصہ کتھوں دا کڈھ ااے کتھے جا کے [1] '' آپ دیکھئے گا! باہر کے معاملے میں جو لوگ چڑ چڑے ہو جاتے ہیں' ان کا Balance (توازن) ہوتا ان کے گھر کی زندگی کا مشاہدہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اذیت نا کی کا سرچشمہ کہاں تھا اور بات نکلی کہاں جا کر؟ قرآن یہ کرتا ہے عزیزانِ من! کہ Balanced Personality (ایک اعتدال پہ قائم ذات' متوازن ذات) گھر کے اندر بنتا ہے اور وہ اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ یہ جو دو زوج ہیں' گاڑی کو چلانے کے لیے ان کے اندر یکسانیت ہو' ہم آہنگی ہو' رفاقت ہو' احترام ہو' ایک دوسرے کے لیے تعظیم ہو۔ پھر دیکھئے! کہ آپ کے معاشرے کا نقشہ کیا بنتا ہے؟ **ولا تمسکوھن ضرارًا لتعتدوا ومن یفعل ذٰلک** (2:231) آہاہا قرآن ہے' عزیزانِ من! جو ایسا کرتا ہے اس نیت سے اس کو بیوی کو باندھ کے رکھتا ہے' بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ اس پہ ظلم کر رہا ہے۔ غور سے سنیے عزیزانِ من! قرآن ہے کہتا ہے کہ **ومن یفعل ذٰلک فقد ظلم نفسہ** (2:231) جو ایسا کرتا ہے بظاہر دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں اس پہ ظلم کر رہا ہوں۔ کم بخت! اپنے آپ پہ ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ واہ واہ واہ واہ کیا ہی خوب کہا!

---

❶ تو بیگناہ کو پھانسی دے دیتا ہے۔ کہاں کا غصہ کہاں نکالتا ہے۔

قرآنی قوانین نوعِ انسانی کے لیے باعث سکون قلب ہیں:

دیکھا عزیزانِ من! قرآن کی عظمت کتنی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ **فقد ظلم نفسه** (2:231) اپنے آپ پر ہی ظلم کر رہا ہے اور یہاں کہا ہے **ولا تتخذوا اٰیت الله هزوًا** (2:231) دیکھنا! خدا کے قوانین کو مذاق نہ بنالیا۔ یہ قوانین کیا ہیں؟ کہا کہ **واذکروا نعمت الله علیکم** (2:231) یہ جو تمہیں قوانین دے رہا ہے یہ خدا کی نعمت ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا یہ مانگتے ہیں کہ راستہ ہم کو دکھا **صراط الذین انعمت علیهم** (1:7) ان کا راستہ دکھا جن پہ تو نے اپنا انعام کیا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ منعم علیہ ہمارے ہاں تو پھر اس کے بعد ذہن میں وہی نقشے آتے ہیں کہ تقویٰ پرہیزگاری جو ہم نے اپنے ہاں تصور بنا رکھا ہے۔ کہتا ہوں قرآن سے آپ اگر نعمت خداوندی کی آیات اکٹھی کریں گے تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ کن کا راستہ دیکھنے کی آپ اُمیدیں اور آرزوئیں لے کر خدا کے حضور جاتے ہیں لیکن ہم تو نہ کوئی اُمید لے کر جاتے ہیں، نہ کوئی آرزو، بس چند الفاظ ہیں جو ہم نے زبانی یاد کر رکھے ہیں، وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگر وہ امام صاحب پڑھ رہے ہوں ''تے اسی اوتھوں وی کھر کن ڈے ہونے آں ❶'' اور اگر پڑھ رہے ہوتے ہیں تو طوطے کی طرح دہرا رہے ہوتے ہیں ورنہ آپ سوچیے! کہ خدا کے حضور اتنی مرتبہ دن میں آرزو کر جاتے ہیں، روبہ قبلہ ہو کر اس سے کہتے ہیں، ان کا راستہ دکھا جو منعم علیہ تھے اور یہاں کہا ہے کہ یہ جو عائلی زندگی کے متعلق ہم نے تمہیں قوانین دیے ہیں جن سے یہ زندگی خوشگوار بنے گی، یہ خدا کی نعمت تھی۔ ہم آرزو کرتے ہیں دل میں کھڑے ہو کر کہ یا اللہ! ان لوگوں کا راستہ دکھا جن کے گھر کی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ دیکھا! آپ کے ہاں آرزوئیں کہاں آتی ہیں؟ کیا آرزو آپ لے کے جاتے ہیں؟ ان کی زندگی، ان کا راستہ دکھا جن کے گھروں کی جو زندگی ہے اس قسم کی جنت بدآماں فضاؤں کی زندگی ہے، جسے تو نے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔

---

❶ تو ہم وہاں بھی خارش کر رہے ہوتے ہیں۔

گھریلو زندگی میں زوجہ کی حیثیت کی بجائے داروغے کا تصور حکمرانی کی ذہنیت پر مبنی ہے:

عزیزانِ من! گھر میں خدا کی نعمت اس طرح سے آتی ہے اور جونہی آپ نے گھر کے اندر اس سے کہا کہ مرد داروغہ عورتوں کے اُوپر تو آپ سمجھ سکتے ہیں ''فیر تے اوتھانیدار تے حوالات دے قیدی دی زندگی ہے ❶'' بڑی نعمت خداوندی ہے صاحب! **نعمت الله علیکم من الکتٰب والحکمة یعظکم به** (2:231) خدا نے قانون نافذ کیے۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کا ایک اعجاز اور بھی ہے۔

ایک قانون ڈکٹیٹر دیتا ہے' ملوکیت کے قوانین کہ ایسا کرنا ہوگا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ کیوں کرنا ہوگا۔ ایسا کرنا ہوگا بس حکم حاکم مرگِ مفاجات' ہمارا حکم ہے ایسا کرنا ہوگا۔ اس کے اندر پوری محکومیت ہوتی ہے۔ ایک قانون ہوتا ہے جس قانون بننے سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے' کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں اس میں اصلاح کا تقاضا یہ ہے اس تقاضے کے لیے ہم نے کچھ پابندیاں تجویز کی ہیں۔ یہ پابندیاں دی جاتی ہیں اگر ان کے اُوپر عمل پیرا ہو گئے تو اس کے نتائج ایسے خوشگوار نکلیں گے۔ یہ جو ہوتا ہے کہ قانون سے پہلے اس قانون کا Objective دینا' یہ بتانا کہ یہ قانون کیوں نافذ کیا جا رہا ہے' The why of it (اس کی مصلحت کیا ہے' تقاضا کیا تھا) اس کے نتائج کیا نکلیں گے' اسے حکمت کہتے ہیں۔ اب یہ چیز ہو سکتی ہے کہ وہ صرف قانون دے' حکمت اس کی ہم خود وضع کر لیں۔ اس نے کہا کہ نہیں! اس میں دھوکا کھا جاؤ گے۔ ہم نے جب کہا ہے کہ اس قسم کی زندگی پیدا کرو تمہارے نتائج اچھے خوشگوار نکلیں گے' اب خوشگوار نتائج تو آپ خود اپنے ذہن میں بھی متعین کر سکتے ہیں کہ گھر میں صاحب! یہ روز آپ کے ہاں ہوتا ہے کہ صاحب! گھر چل ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ گھر کے اندر ایک بادشاہ' ایک حاکم ہونا چاہیے۔ اب اگر آپ نے وہاں یہ ہنٹر کی جو زندگی ہے بسر کی' وہاں آپ نے ایک بادشاہ بنا لیا' ایک حاکم بنا لیا' ایک داروغہ بنا لیا اور اس کے بعد اپنے احکام کو آپ ڈنڈے کے زور سے منواتے چلے گئے' ٹھیک ہے بیوی بھی بڑی دبکی بیٹھی ہے' بچے بھی سہمے ہوئے ہیں یہ سب کچھ ہو رہے ہیں۔ اپنے ذہن میں آپ سمجھ رہے ہیں اور باہر بھی کہہ رہے ہیں کہ صاحب! جیسا ڈسپلن میرے ہاں ہے' میں نے کہیں کم دیکھا ہوگا' کسی کو جرأت نہیں ہے کہ سامنے سے چوں کر سکے۔ آپ نے خود متعین کر لیا کہ نتائج بڑے خوشگوار نکل رہے ہیں اور یہ اپنے ذہن سے نتائج کا متعین کرنا ہی تو ہے جہاں یہ آپ کے مذاہب مختلف اور اس کی شریعتیں مختلف اور اتنے قوانین مختلف ہیں۔ ہر شخص مطمئن ہوتا ہے کہ **کل حزب بما لدیھم فرحون** (30:32) ہر گروہ مگن ہوتا ہے کہ ہم جس طریق پہ چل رہے ہیں بالکل صحیح ہے۔

---

❶ پھر تو وہ تھانیدار اور حوالات کی زندگی ہے۔

قران حکیم کی انڈیالوجی اپنے ہاں مشہود نتائج کی حامل ہوتی ہے:

قرآن کہتا ہے کہ صرف قانون کا دینا ہی ضروری نہیں ہوتا' یہ بتانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ وہ نتیجے کو بھی متعین کر دیتا ہے۔ کیوں متعین کرتا ہے؟ تاکہ انسان فریب میں نہ رہے۔ اگر وہ نتیجہ نکلتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس قانون پہ عمل ہو رہا ہے اور اگر وہ نتیجہ نہیں نکل رہا تو پھر سمجھئے کہ ہم کہیں غلطی کر رہے ہیں۔ آپ کو کھڑے ہو کر دوبارہ سوچنا پڑے گا۔ ٹریفک سگنل کے مطابق چلو گے تو Accidents (حادثات) نہیں ہوں گے۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ ٹریفک کے سگنل کے مطابق چلو یہ۔ کتاب ہے' Accidents

نہیں ہوئے۔ یہ حکمت ہے۔ اگر اس کے باوجود Accidents (حادثات) ہوتے ہیں تو یہ قانون بنانے والے کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ کہیں کوئی Defect چیز رہ گئی ہے پھر اس میں وہ Improvement کرتے ہیں۔

ہم نے صدیوں سے صلوٰۃ کے اجتماعی نظام کو عملی طور پر نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے:

خدا نے جو قوانین دیے ہیں ان قوانین پہ عمل پیرا ہونے سے جو نتیجہ مرتب ہونا ہے اس نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ایسا ہو گا تا کہ اپنے آپ کو فریب میں نہ رکھتے جاؤ۔ یہ کہا ہے کہ جو صلوٰۃ ہے یہ تنھٰی عن الفحشآء عن المنکر (29:45) صلوٰۃ، فحشا اور منکر سے روکے گی۔ صلوٰۃ، کتاب ہے۔ حکم، قانون ہے۔ حکمت، فحشا اور منکر سے روکے گی۔ ہر ایسی چیز جو معاشرہ کے اندر نامعقول ہو، Reason کو اپیل نہ کرے، بیہودگیاں پھیلائے، بخل پھیلائے، صلوٰۃ بس کو روکتی ہے۔ یاد رکھیے! منکر کے معنی عقل فریب کار کی حیلہ کاریاں ہوتی ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی۔ اب کچھ بھی آپ نام رکھ لیجیے، کوئی بھی چیز آپ کر لیجیے اگر وہ یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے تو وہ اُمت خدا کے مقرر کیے ہوئے صلوٰۃ کے اُوپر عمل پیرا ہے اور اگر آپ مطمئن ہیں کہ نماز بالکل صحیح ہو گئی اور یہ نتیجہ پیدا نہیں ہو رہا تو پھر تو دو میں سے ایک شکل ضرور ہو گی: یا تو یہ کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی صاحب! یہ صلوٰۃ اس کے ارکان کے ساتھ بالکل تادیباً پڑھی جا رہی ہے، پاؤں میں اتنا فاصلہ، ہاتھ وہاں تک اُٹھیں، رکوع میں یوں جاؤ تو یہ زاویہ بنے، سجدہ اس طرح سے ہو رہا ہے، یہ ساری اس کی جزئیات ٹھیک ٹھیک طے ہو رہی ہیں لیکن معاشرے کے اندر فحشا اور منکر سے نہیں روکا جاتا۔ تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا کہ یہ نتیجہ تو مرتب نہیں ہو رہا، کہیں غلطی ہو رہی ہے صاحب! اس کے بعد اس کو Continue تو کوئی نہیں کرے گا کھڑا ہو کر سوچے گا اور اگر ہم نے اس کا نتیجہ خود ہی ذہن میں مرتب کر لیا کہ اس سے انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے، ثواب ملتا ہے، آخرت میں نجات مل جائے گی تو معاملہ ختم ہے۔ ٹھیک ہے آپ نے دیکھا کہ کتاب کے ساتھ حکمت جو خود ہی قرآن نے دی ہے کتنی بڑی چیز ہے! یہ Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) ہے۔ اس کے جو نتائج ہیں، وہ ثابت کریں کہ حکم کے اوپر صحیح عمل ہو رہا ہے۔ اگر وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو حکم پہ عمل نہیں ہو رہا کیونکہ (معاذ اللہ) ہم یہ تو پھر نہیں کہیں گے کہ خدا نے یہ بات یونہی کہہ دی، ہم تو ٹھیک طریقے کے اُوپر صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، نتائج یہ نہیں نکلتے تو پھر یہاں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے یونہی کہہ دیا ہے، ہمارا تو ایمان ہے: صلوٰۃ کتاب ہے، حکم ہے۔

صلوٰۃ کے نظام کو صرف نماز کی جذبات تک محدود کرنے کا نتیجہ

قرآن نے صلوٰۃ کی حکمت یہ بتائی ہے اتنا ہی نہیں کہ اس نے یہ چیز کہی بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مصلین وہ بھی ہیں جو تکذیب

دین کرتے ہیں۔ وہ جو یکذب بالدین(107:1) ہے اس میں فویل للمصلین. الذین هم عن صلاتهم ساهون (107:4-5) ہے کہ مصلین یعنی وہ جو ہمارے ہاں کے فارم' طریقے مقرر ہیں ان کے مطابق صلوٰۃ ادا کرے گا' ورنہ وہ تو امام صاحب وہاں اس طرح صلوٰۃ نہیں ادا کرنے دیں گے۔ نماز پڑھ رہا ہے' اس نے کہا ہے کہ مصلین کے لیے تباہی ہے۔ ارءیت الذی یکذب بالدین (107:1) کبھی کبھی تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے' کفر نہیں کرتا' انکار نہیں کرتا' عملاً جھٹلا رہا ہے۔ عملاً جھٹلانے کے کیا معنی ہیں؟ اللہ اکبر! کہہ رہا ہے کہ صلوٰۃ صحیح ادا کر رہا ہوں۔ خدا نے کہا تھا کہ یہ تنہا اور فحشا اور منکر سے روکے گی' یہ نہیں روک رہی۔ یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ خدا کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ اللہ اکبر! اُف اُف اُف!! ارءیت الذی یکذب بالدین فذٰلک الذی یدع الیتیم و لا یحض علیٰ طعام المسکین (107:1-3) دعویٰ کرے دین کا' اسلام کا۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ کہ دین کو جھٹلا رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے؟ یہ کہ جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے' یہ اس کے ساتھ کھڑا ہونے کی اس کو بجائے دھکا دیتا ہے' جو بھوکا سوتا ہے اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ فویل للمصلین الذین (107:4-5) نمازیں پڑھتا ہے' مطمئن ہو جاتا ہے کہ فریضہ خداوندی ادا ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تکذیب کرتا ہے۔ کرتا کیا ہے؟ یہ کہ هم عن صلاتهم ساهون. الذین هم یرآؤن (107:5-6) وہ تو یہ کرتا ہے جو لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے جی! نماز ہوگئی۔ ویمنعون الماعون(107:7) جو کچھ نظر آتا ہے وہ کچھ تو ٹھیک ٹھیک کر کے چلا آتا ہے اور رزق کے ان وسیلوں کو جو چشموں کی طرح بہتے ہوئے ہر گھر کے سامنے سے گزرتے چلے جانے چاہئیں تھے' یہ ان کو بند لگا کر روک کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مصلین ہیں۔ یرآؤن(107:6) والی چیز تو ان کی ساری صحیح ہے۔ کیا؟ تکذیب دین کرتا ہے میں پھر دہرا دوں کہ خدا نے جو کہا تھا کہ صلوٰۃ یہ نتائج پیدا کرے گی' صلوٰۃ یہ نتائج نہیں پیدا کر رہی' اس کا خدا کو کیا جاتا ہے (معاذ اللہ) جھوٹا ثابت کرتا ہے کہ یونہی کہہ دیا تھا کہ کرے گی۔ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے کہ میں ہی صلوٰۃ پہ قایم نہیں ہوں' وہ کہتا ہے کہ میری صلوٰۃ بالکل ٹھیک ہے' مولوی صاحب فتویٰ دے دیتے ہیں کہ نماز ہوگئی۔ نماز ٹھیک ہوگئی' نتیجہ یہ نہیں نکلتا۔ کبھی کہنے کے لیے یہ تو جرأت نہیں کرتا کہ میں ہی غلطی پہ تھا۔ برادرانِ عزیز! اس کا Logical Concluion (منطقی نتیجہ) یہ ہے کہ یہی چیز غلط ہے کہ وہ یکذب بالدین (107:1) دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعظم بہ (2:131) کتاب اور حکمت۔ و اتقوا اللہ و اعلموا ان اللہ بکل شی علیم (2:231) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اچھی طرح سے سمجھ رکھو۔ یہی نہیں ہے کہ تم نے محسوس طور پر' مرئی طور پر' جو اس کی فارم' اس کی شکل' یہ اس کی جو چیزیں ہیں' وہ ادا کر دیں اور سمجھ لیا کہ وہ چیز ہوگئی۔ بکل شیءٍ علیم(2:23) ہر شے کا علم رکھتا ہے' وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ صلوٰۃ یہ نتائج پیدا کرتی ہے یا نہیں۔

خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی ڈکٹیٹر شپ میں بنیادی فرق:

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کتاب کے ساتھ حکمت کو منزل من اللہ کیوں کہا ہے؟ اور یہ چیز ہے کہ جو اسے قادرِ مطلق ہونے کے باوجود ڈکٹیٹر نہیں بنا رہی۔ ڈکٹیٹر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ میں یہ حکم کیوں دے رہا ہوں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا ہر حکم اس کے فادے کے لیے ہوتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے دیتا ہے۔ یہ جو حکم دیتا ہے یہ تمہارے فائدے کے لیے دیتا ہے اس لیے ساتھ بتاتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ڈاکٹر جو دوائی تجویز کرتا ہے اس کے بعد آپ کو بتاتا ہے کہ بھئی! اگر تین مرتبہ یہ پیو گے اور یہ پڑا ساتھ کھاؤ گے تو اس کے بعد شام تک بخار اُتر جائے گا یا ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ یہ اس کی حکمت ہے۔ شام کو اگر آپ دیکھتے ہیں ٹمپریچر لیتے ہیں بخار نہیں ٹوٹا ہلکا بھی نہیں ہوا تو آپ کو کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے خود ڈاکٹر کو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا تشخیص غلط ہوگئی تھی نسخہ غلط ہو گیا تھا دوائی غلط ملی ہے استعمال غلط ہوا ہے۔ وہ کیوں اس چیز پہ زور دیے چلا جا رہا ہے کہ کہیں غلط ہے؟ اس لیے کہ اس نے وہ نتیجہ پیدا نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے امراض کی تشخیص اس حاذق نے کی ہے جس سے بڑا کوئی طبیب نہیں ہو سکتا۔ نسخہ اس حکیم مطلق نے تجویز کیا ہے جس سے بہتر **شفآء لما فی صدور** (10:57) کوئی نہیں ہے۔ یہ اس کا اعلان ہے یہ اس نے کیا ہوا ہے **شفآء للناس** (16:29) کہا ہے قرآن کو۔ نسخہ۔ اس نے تجویز کیا ہوا ہے لیکن

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کی بنیادی وجہ غور و فکر کے عمل کو نظر انداز کرنا ہے:

بس یہ خبط دوا ہی ہے۔ بخار نہیں ٹوٹ رہا نہیں اُتر رہا تو نہ سہی۔ صاحب! یہ کیا ہے؟ یہ کہ یہ تقدیر میں ہی ایسا لکھا تھا۔ چل بھئی! معاملہ ختم ہوا۔ تقدیر صحیح ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں بھئی! تدبیر بھی تو خدا کی بتائی ہوئی تھی کہ جی تقدیر بھی تو خدا کی مقرر کی ہوئی ہے۔ ہمیں وہ تدبیر بتاتا ہے کہ بخار ٹوٹے گا اُدھر تقدیر لکھتا ہے خود بخار سے کہتا ہے کہ مت ٹوٹنا۔ عزیزانِ من! کیا کر رہے ہیں ہم؟ کیا کر رہے ہیں؟ نہیں سوچو یہ کہ کیا نہیں کر رہے۔ کرنے کے لیے تو اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ **انما اعظکم بواحدۃ** (34:46) میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ **ان تقوموا اللہ مثنٰی وفرادٰی** (34:46) ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ میری بات سن لو یہ کرنے کا کام ہے۔ پوچھا کہ کیا کہتے ہیں؟ ایک کام ہے لمبا چوڑا پروگرام ہی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ **ان تتفکروا** (34:46) کھڑے ہو کر سوچا کرو کہ یہ نتیجہ کیوں نہیں نکلا۔ یہ ہے حکم۔ کیا ہے کہ **بکل شئٍ علیم** (2:231) وہ جانتا ہے کہ

آ گے کہا کہ **واذا طلقتم النسآء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف ذالک یوعظ بہ من کان منکم یؤمن باللہ والیوم الاٰخر ذالکم ازکٰی لکم واطھر واللہ یعلم وانتم لا تعلمون** (2:232). طلاق یافتہ عورت جب عدت کی مدت کو پہنچ جائے تو پھر اسے اس بات سے نہ روکو کہ وہ جہاں کہیں نکاح کرنا چاہے اس کے راستے میں آپ روک بنیں۔

ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی حالت زار اور بیوہ کی اذیت ناکی کا پس منظر:

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں دو نکاحوں کے نکاح کے اُوپر کتنی شدت سے پابندیاں ہیں۔ کل تک کی یہ بات ہے مطلقہ کے متعلق تو نکاح ثانی کا سوال ہی نہیں تھا یعنی کسی کے متعلق کہنا کہ وہ مطلق ہے تو وہ بیچاری جیسے منہ چھپائے پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں اس سے کیا جرم عائد ہو گیا ہے۔ یہ تصور کیوں پیدا کیا؟ یہ تو وہی مرد کی حاکمیت ہے' داروغیت ہے جس نے یہ تصور پیدا کیا جیسے ایک دفعہ کا بے گناہ قیدی بھی اگر قید سے چھوٹ کر آ جاتا ہے تو پھر معاشرہ اس کو وہ عزت کا مقام نہیں دیتا۔ بے گناہ قیدی بھی قید کاٹ کر آیا ہے' بس۔ یہ چونکہ اس نے عورت کو قیدی' مجرم بنا کے اس داروغے اور حاکم نے رکھا تھا' اس نے کسی طرح سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیا ہے تو مرد نے یہ تصور قایم کیا ہے کہ یہ اب معاشرہ کے اندر عزت کی مستحق رہی نہیں ہے۔ باقی ساری عمر **مذموم مدکورًا** (17:18) دھتکاری ہوئی بیچاری ہے۔ طلاق ہوئی ہوئی ہے آپ کو معلوم ہے یہ بات کس طرح سے کہی جاتی ہے؟ یہ کیا چیز؟ کہ اور ہر طرح سے بھی اگر اس کو یہ آسانی ہے کہ حاصل کر لے تو یہ بات کہ اس کے بعد معاشرے میں منہ کیا دکھاؤں گی' اس سے رُکی رہی۔ پتہ نہیں کہاں کہاں ہم چلے گئے۔ کہا کہ دیکھئے! یہ بات نہ کہیں کہ پھر اگر یہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس راستے میں روڑے اٹکانے شروع کر دو۔ مطلقہ ہے' اجازت ہی نہیں اس کو دی جاتی اور بیوگان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے' کل اس چیز کے لیے جہاد کرنا پڑا تھا کہ بیوہ عورتوں کی شادی ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ تو یہاں کا ہمارے ہاں کا' یہ سارا معاشرہ ہندوانہ ہے۔ ہندوانہ معاشرہ میں مطلقہ تو ہوتی نہیں تھی' وہاں طلاق تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بیوہ ہو جاتی تھی' بیوہ کی شادی وہاں نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے ہاں نہیں ہو سکتی تھی' ہمارے ہاں بھی کیوں ہو صاحب؟ بیوگان کی شادی کے خلاف بہت بڑا جہاد کرنا پڑا تھا' پھر کہیں آپ کے ہاں جا کر یہ بند ٹوٹا تھا اور بڑے بڑے ہمارے ہاں کے جو ارباب شریعت تھے' ان کے گھروں میں بھی یہ صورت تھی کہ وہ بیوگان کی شادی نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس چیز کو نہ روکنا۔

قران حکیم کی طرف سے ملنے والے عائلی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ اور تزکیہ نفس کا مفہوم:

بات تو یہ دیکھئے کہ بظاہر چھوٹے چھوٹے عائلی زندگی کے متعلق قوانین ہیں جن کے متعلق گفتگو کی جا رہی ہے۔ کہا کہ اس شخص کو ہم یہ

نصیحت کر رہے ہیں جو خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتا ہے۔ واہ! کتنی اہمیت حاصل ہوگئی ان قوانین کو! جو خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ قوانین ہیں اور پھر جوان قوانین کو مذاق بناتا ہے' اس کے بعد یہ دعویٰ کہ ہم خدا اور آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اس کے لیے کہا جا رہا ہے۔ **ازکٰی لکم و اطھر** (2:232) ہمارے ہاں تو ازکٰی کے معنی بھی پاکیزہ کیے جاتے ہیں اور اطہر کے معنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ قرآن یہاں دو الفاظ لے آیا۔ ازکٰی کے معنی ہیں ''نشوونما''۔ عائلی زندگی کے متعلق قوانین دے رہا ہے اور کہا ہے کہ جو ان کے مطابق یہ کچھ کرے گا اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی' زندگی بڑی پاکیزہ گزرے گی۔ اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے' وہ تو یہ ہے جسے تزکیہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو تزکیہ نفس بات ہی اور ہوتی ہے۔ یہ چیز ہے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ باہر کے معاشرے کے اندر زندگی بڑی پاکیزہ گزر رہی ہے اور آپ جانتے ہیں پاکیزگی صرف یہی نہیں ہے کہ کپڑے اُجلے ہوتے ہیں' دھلے ہوئے ہوتے ہیں' نہایا دھویا ہوا ہوتا ہے۔ اگر یہ معیار ہو تو اس صورت میں تو ہمارے ہاں کا یہ سب سے بڑا طبقہ جس کی زندگی میں پاکیزگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا' سب سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ جسے آپ Good Personality کہتے ہیں کا حامل شخص۔

لفظ Personality کا اور مظہر کا یقینی مفہوم

آپ کو پتہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں Personality (شخصیت) کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ سجیلا نوجوان' سجا دھجا' Well Dressed شیو اچھا کیا ہوا' ویزلین کے ساتھ بال جمائے ہوئے' پالش بھی وہ جس میں چمک پیدا ہو رہی ہے' کریز بھی انتہائی اعلیٰ' ٹائی میچ کر رہی ہے۔ یہ جو ساری چیزیں ہیں' یہ ہیں جو آج سمجھی جاتی ہیں۔ یہ قرآن ہے **ازکٰی و اظھر** کہا ہے اور پھر آگے کہا کہ **و اللہ یعلم و انتم لا تعلمون** (2:232) یہ جو بظاہر میں نے باتیں کہی ہیں' یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس سے آگے ایک اور معاملہ ہے' اسے تم نہیں جانتے' اسے ہم جانتے ہیں کہ ان چیزوں کی پابندی سے جو ایک انسان کے اندر صحیح انقلاب پیدا ہوتا ہے اسی کے مظاہرے کا نام پاکیزہ زندگی ہے پاکیزہ سیرت ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ قرآن کے لیے کہا ہے کہ **لا یمسہ الا المطھرین**(56:797) یہ مس نہیں کر سکتے اس کو بجز ان کے جو مطہر ہوں۔ ہمارے ہاں تو وہ اتنی سی بات ہوئی کہ وہ پاک صاف ہو کر' غسل کر کے وضو کر کے قرآن کو چھونا چاہیے یہ یوں معنی ہوئے یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ کہا کہ جس کے قلب و نگاہ کے اندر پاکیزگی نہیں ہے تو اس کو قرآن سے کچھ مس ہی نہیں ہو سکتا۔ اطہر

عورت کے لیے رضاعت کا مسئلہ:

برادرانِ عزیز! یہاں تک بات ہوگئی مطلقہ کے نکاح کی۔ اولاد ہے' چھوٹے بچے ہیں' ان کے دودھ پلانے کا مسلہ ہے' جسے رضاعت کہتے ہیں۔ کہا کہ **والوالدٰت یرضعن اولادھم حولین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ**(2:233) دودھ پلانے کے لیے جسے آپ رضاعت کہتے ہیں' وہ قرآنِ کریم نے یہ کہیں حکم نہیں دیا کہ ہر ماں اپنے بچے کو کتنے عرصے تک دودھ پلائے۔ یہ تو بس ایک ہی چیز ہے کہ کتنی ضرورت ہے' کتنا پلا سکتی ہے' ایسی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ ماں کے دودھ ہی اتنا نہیں ہے' فیڈنگ اتنی ہو نہیں سکتی یا بچہ ہضم نہیں کر سکتا۔ قرآن نے یہ متعین نہیں کیا۔ اگر چہ قرآن نے دو جگہ یہ بات کہی ہے عام طور پہ بچے کے متعلق کہا ہے کہ اس کے حمل کا اور دودھ پلانے کا وقفہ قریباً اڑھائی سال ہوتا ہے (46:15) یہ قرآن نے عام طور پہ ایک بات کہی ہے' یہ حکم نہیں ہے۔ دوسری جگہ دو سال کا بھی کہا ہے (31:14) یہ بھی حکم نہیں ہے لیکن یہاں قانونی بات آ گئی۔ طلاق ہوگئی' دودھ پینے والا بچہ ہے۔ دیکھئے قرآن ہے۔ اس بچے کے حقوق کی حفاظت کا بھی اس کو خیال ہے۔ کہا ہے کہ والدہ اس بچے کو دو سال کے لیے دودھ پلائے اگر اس زمانے کو پورا کرنا ہے' اس کا ارادہ ہو تو۔ یہ چیز اب مجبوراً نہیں ہے' یہ ضروری نہیں ہے کہ اس عورت کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ تو ضرور اس بچے کو دودھ پلا۔ ہو سکتا ہے اس کے حالات اس کی اجازت نہ دیں' ہو سکتا ہے اس نے جہاں شادی کرنی ہے' وہاں یہ شرط عائد ہو جائے' اس کے راستے میں یہ چیز حائل ہو جائے اور قرآن میں جسے بچوں کی Guardianship (سرپرستی) کہتے ہیں' اس کے لیے بھی خود کوئی قانون نہیں دیا۔ وہ ایک فقرہ دیا ہے' میں آگے عرض کروں گا' جامع ہے کہ دو سال کے لیے کہاں بچے رہنے چاہئیں۔ **المونودلہ رزقھن کسوتھن بالمعروف** (2:233) جس کا یہ بچہ ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مدت میں جب تک یہ دودھ پلانے کا معاملہ اس سے طے ہوا ہے' اس کے نان نفقے کی ذمہ داری اس کے اُوپر ہوگی یعنی کھانے پینے کی بھی اور پہننے کی بھی۔ **لا تکلف نفس الا وسعھا** (2:233)۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کتنا لینا چاہیے۔ خود نہیں مقرر کیا۔ قاعدہ کیا مضمر کیا؟ یہ کہ ایسی صورت جس میں اس کے اُوپر یہ چیز بوجھ نہ ہو' جیسے گھر کی زندگی کے اندر یہ اپنے بچوں کو پالتا تھا' اس بیوی کی ضروریات پوری کرتا تھا' بس اسی معیار کے مطابق یہ کچھ ہوگا۔

ازدواجی زندگی کے دوران قرآنِ حکیم کی وسعتوں کا معیار:

خدا یہ چاہتا ہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے مقرر کر کے خواہ مخواہ تمہیں تکلف میں ڈال دے۔ شریعت کے اندر خدا کی مقرر کی ہوئی بڑی وسعتیں ہیں' عزیزانِ من! اصولی حدود کو تو وہ اتنا سختی سے رکھتا ہے کہ یہاں سے تم نے تجاوز کیا تو گئے جہنم میں۔ ان کے اندر بڑی وسعتیں رکھتا ہے تمہیں بڑی آزادیاں دیتا ہے۔ **لاتضآر والدۃ بولدھا ولا مولودلہ بولدہ** (2:233) یہ ہے جو وہ فقرہ۔ اصول یہ یاد رکھو! اگر تمہارے ہاں یہ انقطاعِ تعلقات کا ہوا ہے تو اب یہ نہ ہو کہ یہ بچے کی موجودگی یا ماں کو مصیبت میں ڈال دے یا باپ کو ایک مصیبت میں ڈال دے۔ بات بیٹھ کے طے کرو کہ کیا قانون ہونے چاہئیں صاحب! اصول یہ ہونا چاہیے کہ اس بچے کی موجودگی کی وجہ سے' نہ ماں کسی

مصیبت میں پھنس جائے' نہ باپ کے گلے کے اندر یہ ایک مصیبت بن جائے۔ یہ طے کرو تم خود طے کرو۔

بچے کے باپ کی نوتیدگی کی صورت میں ورثا کی ذمہ داریاں:

اور اگر وعلی الوارث مثل ذٰلک (2:233) بچے کا باپ فوت ہو گیا ہے تو ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ لاوارث رہ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں وہ جو مرنے والے کے ورثا ہیں یہ ساری ذمہ داریاں ان پر منتقل ہو جائیں گی' وہ یہ کریں گے۔ تو کہا کہ فان ارادا فصالاً عن تراضٍ منھما وتشاور فلا جناح علیھما (2:233) دو سال سے پہلے ہی' باہمی رضامندی سے اور مشاورت سے دیکھ لیجیے۔ طلاق شدہ یہ جوڑا ہے تعلقات ازدواجی منقطع ہو رہے ہیں' ایک معاملے کا فیصلہ کرنا ہے اس کو یہ کہتا ہے باہمی رضامندی سے باہمی مشاورت سے یہ چیز کی جائے۔ ہمارے ہاں تو مشاورت ان میں بھی نہیں ہوتی جن میں تعلقات چولی دامن کے ہوتے ہیں۔ یہاں ان میں مشاورت کرا رہا ہے جن میں اب تعلقات ہی باقی نہیں رہے ہوئے۔ کہا ہے کہ جو تعلقات تو معاہدے کے تھے' وہ فسخ ہوئے' تمہارے ہاں انسانیت کے تعلقات تو باقی ہیں' ان کو تو نہ چھوڑو۔ وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم (2:233) اور اگر یہ صورت ہو کہ یہ دودھ پلانا نہیں چاہتی اس کے ہاں دودھ نہیں ہے۔ کسی اور جگہ سے دودھ پلانے کا کوئی اور انتظام کرنا چاہتے ہو فلا جناح علیکم (2:233) تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اذا سلمتم ما اتیتم بالمعروف (2:233) بس اتنی سی بات ہے جو اس سے طے ہوا تھا' اس کو پورے کا پورا چکا دو' دوسری جگہ انتظام کر لو۔ کتنے صاف احکام ہیں' کتنے سہل احکام ہیں' جو دیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ واتقوا اللہ (2:233) بات یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنی ہے۔ یہاں فارم کا تعلق نہیں ہے' طریق کا سوال نہیں ہے۔ طریق جو بھی ایسا ہو' جس میں یہ مقصد پورا ہوتا ہو بس یہ کر دو۔ مقصد قانونِ خداوندی کی نگہداشت ہے۔

قانون کی پابندی کا تمام تر دارومدار اس بنیاد پر ہے کہ اسے خدا کا قانون دیکھ رہا ہے:

اور بات آخر میں وہی ہے برادرانِ عزیز! جس بنیاد پر یہ قانون کی پابندی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر (2:233) ہر وقت خیال یہ رہے' یہ نہیں کہ پولیس مین دیکھ رہا ہے یا نہیں' اس سے قانون کا احترام نہیں پیدا ہوتا۔

پاکستان کا وفد چین میں۔ یہاں چوری نہیں ہوتی لہٰذا تالا ہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! ایمان یہ ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ بس یہ ہے عزیزانِ من! مومن اور کافر کے اندر حدِ امتیاز یہ ہے۔ ورنہ پولیس مین (Policeman) کے ماتحت تو قانون کی پابندی کافروں کی قومیں ایسی کر رہی ہیں کہ اس پر ہم رشک کر رہے ہیں۔ ہمارے ہی ہاں کا وفد چین میں گیا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلنے لگا تو ان سے کہا کہ صاحب! تالا لگائیے۔ انہوں نے کہا کاہے کے لیے؟ کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں' اپنے کمرے میں تالا لگاؤں گا۔ کہنے لگے کاہے کے لیے؟ اب یہ بیچارے 'کاہے کے لیے' کیا سمجھیں۔ یہاں بھی کسی سے کسی نے پوچھا ہے کہ تالا کاہے کے لیے؟ اس نے کہا کہ صاحب! اندر میری چیزیں ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے پھر کیا ہوا۔ کہنے لگے: جی! وہ کہیں چوری نہ

ہو جائے۔ کہنے لگے: آپ کہاں کی باتیں کر رہے ہیں' کس ملک میں آپ آئے ہوئے ہیں؟ ہمارے ملک میں تالا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں چوری نہیں ہے۔ یہ نہیں تھا کہ ہوٹل کے ہر دروازے کے اُوپر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ پولیس والا بھی نا کام رہ گیا تھا فوجی کھڑا تھا' آج کل تو فوجی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ سارے ملک میں سوائے مملکت کے امور کے جو بغاوت' سازشیں وغیرہ انتظام کے ہوتے ہیں پولیس ہی نہیں ہے۔ معاشرے کے انتظام کے لیے پولیس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔ وہ کہتا ہے کہ چوری نہیں ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے پوچھا کہ چوری کیوں نہیں ہوتی ہے؟

چوری کا عمل تو میری اور تیری کی تفریق سے پیدا کردہ ہوتا ہے گھریلو زندگی میں چارپائی کی چوری کا کبھی تصور پیدا ہی نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! میں کیا باتیں بتاؤں کہ وہاں چوری ہوتی کیوں نہیں ہے؟ فلاسفر نہیں ہے' یونہی ترجمان ہے وہ زبان جانتا ہے' کہتا ہے کہ وہ چوری ہوتی ہے کہ تمہاری جو چیز ہے وہ میں لے جاؤں' جہاں چیز کے متعلق یہ ہے ہی نہیں کہ وہ تیری ہے یا میری ہے تو چوری کیا۔ میرے اللہ! میں نے کہا تھا عزیزانِ من! کہ سپاہی کے کھڑے ہوتے ہوئے چوری نہ کرنا تو ایک طرف رہا سپاہی کی عدم موجودگی میں بھی چوری نہ کرنا۔ یہ چیزیں تو ان ملکوں نے بھی اپنے ہاں پیدا کر لی ہیں' جو خدا پہ بھی ایمان نہیں رکھتے آخرت پہ بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ہمارے ہاں کیا چیز اس نے بتائی تھی؟ وہاں بھی اگر آپ کرید کر دیکھیں گے تو وہاں ان کے دل کے اندر بھی ایک آئیڈیالوجی ہوگی باطل ہی کی سہی۔ وہ بھی اپنے نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ صاحب! چوری تو وہاں ہوتی ہے کہ جو تمہاری چیز ہو' میں لے جاؤں۔ دیکھا آپ نے یہ اصول ہے۔ یہاں کیا اصول ہے جس کے لیے کسی پولیس مین کی ضرورت نہیں پڑتی' تالے کی ضرورت نہیں پڑتی؟ بڑی بات آسان ہے کہ **واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر** (2:233) اس چیز کا یقین رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ دیکھ رہا ہے۔ جو کر رہے ہو وہی نہیں دیکھ رہا' کہا کہ وہ تمہاری نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔ کہاں چلا گیا قرآن! وہاں تو پھر بھی جب نیت یا ارادہ عمل میں آئے تو اس کی گرفت ہوتی ہے۔ کتنی ہی Effeceint آپ کے ہاں جرم کی Detection کیوں نہ ہو۔ جرم کا جب محسوس طور پر ارتکاب ہو جائے اس صورت میں یہ ہے یا ایسا شبہ پڑ جائے کہ یہ کرے گا۔ دل میں اگر خیالات گزر رہے ہیں دن رات گزرتے چلے جائیں کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جس سے شبہ پڑے یا آپ ارتکابِ جرم نہ کریں گرفت نہیں ہوتی۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور جو کچھ میرے دل میں گزر رہا ہے' وہ بھی Undetected نہیں رہ سکتا۔ کون پیش کرے گا؟ کہاں پیش کیا جائے گا؟ یہ تو جب آیات آئیں گی تو وہاں سورۃ بنی اسرائیل میں بتاؤں گا' بات صاف سی کہہ دی ہے۔ پیش کیا مقدمہ' پہلے ہی دن ملزم نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! پولیس کی رپورٹ ہے' مجھے اس پہ اعتماد نہیں ہے۔ شہادت میں دوسرا آیا' نہیں صاحب! یہ جو گواہ ہے' یہ پھر گیا ہے' دوسروں سے مل گیا ہے۔ ہزار چیزیں ایسی نکلتی ہیں۔ وہ تو اس قسم کی ایک گنجائش ہے جو وہ چیخ ❶ اُٹھا تھا کہ

---

❶ یہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797) کی طرف اشارہ ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

انسان کا اپنا نفس اپنی گواہی آپ ہوگا:

قرآن کہتا ہے کہ تمہارا آدمی نہیں' یہاں تو **کفٰی بنفسک الیوم علیک حسیبا** (17:14) اس عدالت میں تو خود اپنے خلاف گواہی دے گا۔ کہا جائے گا **اقرا کتبٰک** (17:14) یہ ہے تیرا اعمال نامہ' پولیس کا کانسٹیبل یا ڈی ایس پی پراسیکیوشن نہیں کرے گا **اقرآء کتبٰک** (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ **علیک حسیبا** (17:14) تیری خلاف گواہی دینے والا تیرا اپنا نفس ہے۔ خود اپنے خلاف گواہی دے' اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ عزیزانِ من! پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب ایمان کا کیا تعلق ہے؟ انسان اگر نیک عمل ہے ایمان پھر کہاں آتا ہے؟ وہ ٹھیک ہے ہمارا جو ایمان ہے وہ تو کہیں آتا نہیں ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایمان کہاں آتا ہے؟ اس کا ایمان' ایمان ہے۔ یہ یقین کامل کہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی وہ واقف ہے اور یہ جو چیز سامنے آئی ہے' میں نے خود اپنے خلاف شہادت دے کر بیڑیاں پہن لینی ہیں۔ ایمان اسے کہتے ہیں اور یہی بنیاد ہے۔

انسانی معاشرے میں امن کا تصور ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا:

عزیزانِ من! آج یا آج سے دس ہزار سال بعد انسانی معاشرے میں امن اس دن قائم ہونا ہے جس دن یہ ایمان آجانا ہے کہ **واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر** (2:233) عزیزانِ من! وقت ہوگیا' آیات یہی آگے چل رہی ہیں۔ آج ہم سورۃ بقرۃ کی آیت 233 تک آ گئے' 234 ویں آیت پھر آئندہ لیں گے۔

رَبَّـنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

اڑتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ(3)(آیات234 تا245)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٢٣٤ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ
النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝٢٣٥ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ښ
وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ ۝٢٣٦ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ
وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٢٣٧ حٰفِظُوْا عَلَي الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ
الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝٢٣٨ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْلَمُوْنَ ۝٢٣٩ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ښ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٢٤٠ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي
الْمُتَّقِيْنَ ۝٢٤١ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢٤٢ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ
الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَشْكُرُوْنَ ۝٢٤٣ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٢٤٤ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ
اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢٤٥

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 15 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے درس کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 234 سے آج آغازِ کلام ہوگا۔ (2:234)

بیوہ کی زندگی اور قرآن حکیم کے احکام:

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں عائلی زندگی کے متعلق قرآنی احکام وہدایات بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ (مثلاً) نکاح کے

متعلق، معاہدۂ نکاح فسخ کرنے کے متعلق، جسے طلاق کہا جاتا ہے، عدت کے متعلق، رضاعت کے متعلق (بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق)۔ یہی احکام ابھی مسلسل آگے چلے جائیں گے۔ 234ویں آیت ہمارے سامنے ہے۔ کہا ہے کہ **والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرًا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف واللہ بما تعملون خبیر** (2:234)۔ پہلے تو بات مطلقہ عورتوں کی تھی، اب بیوہ کی بات ہوئی۔ کہا ہے کہ جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور بیوی چھوڑ جائے تو بیوہ کے لیے عدت کی مدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ مطلقہ کی صورت میں قرآنِ کریم نے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ حمل سے ہو تو یہی عدت وضع حمل تک کے لیے ہوگی۔ بیوہ کے لیے یہ الگ بات نہیں کہی گئی لیکن جو چیز مطلقہ کے متعلق کہی تھی، اس پر استنباط کرنے سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ بیوہ کی عدت حاملہ ہونے کی صورت میں بھی یہی ہو سکے گی۔ یعنی جب وہ اپنی عدت کو ختم کر لیں۔ اب دیکھیے، میں نے عرض کیا تھا، قرآنِ کریم جیسا مرد کو نکاح اور طلاق کے معاملے میں قانون کے مطابق صاحب اختیار قرار دیتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی وہ خود فیصلہ کرنے کا مجاز قرار دیتا ہے۔ ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ بیوہ کی صورت میں بھی یہ کہا کہ جب وہ عدت پوری کر لے تو اس کے بعد اپنے متعلق جو کچھ وہ فیصلہ کریں تم اس میں خواہ مخواہ کی رکاوٹ نہ ڈالو۔ اس کی ذمہ داری تمہارے اُوپر نہیں ہے، وہ خود اپنے متعلق کچھ فیصلہ کریں گی۔ فیصلہ انہیں بالمعروف کرنا ہوگا یعنی قرآنی قاعدے کے مطابق کرنا ہوگا۔ اس طرح جو فیصلہ وہ اپنے لیے کریں اس میں تم خوامخواہ کے لیے رکاوٹ نہ بنو۔ تم سے اس کی کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ وہ اپنے معاملات میں آپ مختار ہیں اور جو کچھ بھی تم لوگ کہتے ہو، خدا اس سے واقف ہے۔ ان احکام کی اطاعت میں بنیاد یہ ہے۔

قرآن حکیم ہمیشہ انسانی عمل کو پیش نظر رکھتا ہے جس کی بنیاد انسانی ارادے پر ہوتی ہے:

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ سوال صرف یہی نہیں کہ تم نظر بظاہر کرتے ہو، قرآن کی نگاہ تو عمل کے سرچشمے پہ ہے یعنی اس پر جسے قلب کہا جاتا ہے جسے نیت کہا جاتا ہے، جسے ارادہ کہا جاتا ہے۔ یہ بہت دور جا کر انسانی کردار کو کنٹرول میں لاتا ہے اور انسانی کردار کو کنٹرول میں لانے کا سرچشمہ جذبہ محرکہ اعمالِ انسانی کا ہے۔ وہ اس سرچشمے پہ نگاہ رکھتا ہے اور اصل میں تبدیلی وہاں کرتا ہے وہاں کی تبدیلی سے انسان کے اعمال میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے، کہ آیات تو خالص قوانین کی ہیں۔

حسن عمل کو اپنی عادت بنا لینے کا احسن طریق مکافات عمل کی حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہے:

برادرانِ عزیز! قوانین کا اتباع تو Machanically (میکانکی طور پر) بھی ہوتا ہے اور عام طور پر ہوتا ہی Mechanically (مکانکی طور پر) ہے لیکن قرآن تو قانون کا اتباع بھی Mechanically (میکانکی طور پر) نہیں چاہتا، رسمی طور پہ نہیں چاہتا، غیر شعوری

طور پہ نہیں چاہتا' کسی جور اور استبداد سے نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ چاہتا یہ ہے کہ تم ان احکام وقوانین کی حکمت کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کرو' پھر ان کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھو۔ صرف قانونِ مکافاتِ عمل کو ہر وقت نگاہ میں رکھو اور اس میں یہ چیز بھی شامل کرو کہ مکافاتِ عمل میں دل کے خیالات' نیت اور ارادے بھی شامل ہیں اور جب یہ تمہارا ایمان ہو جائے گا تو اس کے بعد ایک تو ان قوانین کی تم اطاعت دیکھو گے کہ کس طرح وہ تمہارے اپنے قلب کا' دل کا' ارادہ بن جاتا ہے' تمہارا اپنا تقاضا بن جاتا ہے جیسے پانی پینا تمہاری پیاس کا تقاضا ہوتا ہے۔ وہ نہ کوئی جبر ہوتا ہے' نہ استبداد ہونا ہے' نہ تم Mechanically (میکانکی طور پر) کرتے ہو۔ تمہارے اندر ایک تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ مجھے ایسا کرنا چاہیے اور اس کے مطابق تم کرتے ہو تو وہ تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ قرآن اپنے قوانین و احکام کی اطاعت اس طرح سے چاہتا ہے کہ وہ تمہارے اپنے اندر کا تقاضا بن جائے اور تم ان کی اطاعت کرلو جیسے تم پانی پینے کی صورت میں اپنے تقاضے کی اطاعت کرتے ہو۔ لفظ اطاعت کے معنی ہوتا ہے ''بطیّب خاطر جھکنا' جس طرح پکی ہوئی کھجور کا درخت سے گر پڑنا جس میں جھانپل مارنے کی ضرورت نہ پڑے۔'' اس طرح عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ اس زبان کے عجیب وغریب الفاظ ہیں۔

Mechanical قوانین پر عمل پیرائی انسان کو جنتی ماحول سے آشنا کرا ہی نہیں سکتی:

یہ جو تم پیاس میں پانی پیتے ہو' وہ تم اپنے تقاضے کی اطاعت کرتے ہو۔ وہ کہتا یہ ہے' چاہتا یہ ہے کہ تم ان قوانین و احکام کی اطاعت اپنے اندر کے تقاضے کی رو سے کرو۔ یہ Mechanical (میکانکی طور پر) قانون کی اطاعت نہیں ہے۔ یہ دنیا جو آپ کے ہاں جہنم بن رہی ہے اس میں صورت ہی یہ ہے یہاں قانون کی ۔Mechanical اطاعت ہوتی ہے اور جہاں نظر آتا ہے کہ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ہے' وہیں وہ اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔Mechanical (میکانکی) اطاعت سے ہوتا ہی یہ ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ تمہارے اندر کا تقاضا پانی پینے کا ہو اور اس صورت میں پھر تمہاری یہ صورت پیدا ہو جائے کہ تم دیکھو کہ کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں۔ قرآن اپنے احکام کی اطاعت اس طرح سے کرانا چاہتا ہے۔

بیوہ کے ساتھ نکاح کا معاملہ اور اس کی وضاحت:

کہا کہ ولا جناح علیکم فیما عرضتم به من خطبة النسآء او اکننتم فی انفسکم (2:235) قرآن انسانی تقاضوں پہ کیسی عمدہ نگاہ رکھتا ہے! اور کیوں نہ نگاہ رکھے' یہ تو اس کا کلام ہے جس نے انسان اور اس کے تقاضوں کو پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دوران میں اس بیوہ کے ساتھ نکاح کے خیالات دل میں اُبھریں گے۔ جو بھی سمجھے کہ مجھے نکاح کرنا چاہیے' اس کو بیوی بنانا چاہیے یا اُس کے دل میں بھی یہ بات پیدا ہو گی' تو کہا کہ اس میں عدت کے دوران میں' ایسی بات آگے آتی ہے کہ کوئی یقینی چیز تو تم نہیں کر سکتے

لیکن اگر تم اس تک پیغام پہنچا دو کنایتاً اگر اس چیز کا اظہار کر دو کہ میرا ارادہ یہ ہے اگر تم مناسب سمجھو تو تمہاری عدت کے بعد ایسا ہو سکے گا تو کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ خوامخواہ اپنے دل میں چور نہ لیے بیٹھو کہ خیال تو یہ اُبھرے اور تم یہ کہو کہ نہیں صاحب! عدت کے دوران میں تو یہ چیز مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں مضائقے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دل میں رکھو' پیغام وہاں تک پہنچا دو' یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پہ تم سے کوئی باز پرس ہو۔ **علم اللہ انکم ستذکرونھن ولکن لا تواعدوھن سرًا الا ان تقولوا قولاً معروفاً** (2:235) کیسی عجیب چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ اس لیے کہا ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوں گے۔ اگر خیالات کے پیدا ہونے پہ بندش لگا دی جائے اور ان کے لیے Out let نہ کوئی چھوڑا جائے' اس سے Perversion (بدنہادی) پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے کہ اس کے لیے ہمارے ہاں ابھی کوئی جامع لفظ نہیں ہے۔ میں نے بدنہادی اس کا ترجمہ کیا تھا وہ پھر ایک مشکل لفظ ہے۔ Perversion ہوتا ہے کہ جو چیز فطرت کے قاعدے کے مطابق کسی طرح کرنی ہو' وہ اس طریق سے نہ کی جائے' کیا تو اسے جائے لیکن وہ کسی دوسرے طریق سے کیا جائے۔ قرآن کی رو سے ان خیالات کے پیدا ہونے پہ دل میں مضائقے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ خیالات پیدا ہوئے ہیں' پیغام پہنچا سکتے ہو' اشارتاً کنایتاً اس کا اظہار کر سکتے ہو' اس میں کوئی مضائقے کی بات نہیں ہے' اس کا اظہار کر سکتے ہو لیکن اس دوران تم خفیہ خفیہ آپس میں کوئی معاہدہ نہیں کر سکتے۔ اب یہ نظر آیا کہ یہ نکاح جو بظاہر کیا جاتا ہے' وہ تو اس کی فارم کی چیز ہے' اصل شے تو دل کے اندر ایک فیصلہ ہے' وہ یہ فیصلہ کر لینے کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔ عدت کے دوران میں یہ نامہ پیام تک کا تو ٹھیک ہے لیکن یہ چیز فیصلہ کن حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ پورا وقت اسی لیے دیا گیا ہے کہ اس میں جذبات سے الگ ہٹ کر عورت کے لیے ایک موقع مل جائے کہ وہ اپنے معاملے کا خود فیصلہ کرے۔

قرآن حکیم عورت کی بے بسی کے عالم میں اس کے جذبات Exploit کرنے کی اجازت نہیں دیتا:

طلاق کی صورت میں' خاوند کے فوت ہو جانے کی شکل میں عورت کے دل میں عجیب قسم کا ہجومِ جذبات ہوتا ہے۔ وہ اتنی جلدی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی اس لیے یہ کہا گیا کہ اس دوران میں اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری' ہر قسم کی Security اور Protection کی یہ جو تمام چیزیں ہیں' وہ اس کے لیے Provide (مہیا) کرو۔ وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں نہ ہو' اپنے آپ کو بے سہارا نہ سمجھے' اس کے جذبات کو اعتدال پہ آنے دو۔ اس کے بعد اس سے کہو کہ اپنے متعلق کچھ فیصلہ کرے۔ اس کی اس بے کسی اور بے بسی کے احساس کو Expoite (استحصال) کر کے تم اس کے ساتھ اس وقت وعدہ کر لو گے تو یہ نکاح کی کوئی صحیح بات نہیں ہوگی۔ دیکھئے کہاں جاتا ہے قرآن! خدا اس کے حقوق کی Protection (حفاظت) اپنے ذمہ لے رہا ہے کہ اس وقت میں جب اس نے اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کیا تو

اسے جہاں بھی سہارے کی ذراسی کرن نظر آئے گی وہ جواور مصالح اور تقاضے ہیں ان کونظر انداز کردے گی فوراً لپک کر آ جائے گی۔ یہ صحیح فیصلہ بعض اوقات نہیں ہوسکتا اس لیے اس دوران ایسا نہ کرو' وقت پورا ہونے دو' پھر کوئی پختہ بات ہے اسے کہواور کہا کہ **ولا تعزموا عقدة النكاح حتٰى يبلغ الكتٰب اجله** (2:235) اس عدت کے دوران میں نکاح کی گرہ کو پختہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' یہ تو قطعاً نہ کرو۔ **واعلموا ان الله يعلم ما فى انفسكم فاحذروه** (2:235) یادرکھو! پھر وہی بات آئی کہ خدا کی نگاہ تمہارے اس سرچشمہ قلب پر ہے جہاں سے نیتیں اور ارادے اُبھرتے ہیں۔ اس لیے اس کی احتیاط برتو محض Mechanically (میکانکی طور پر) قانون کا اتباع نہ کرو

لفظ حلیم کا قرآنی مفہوم:

واعلموا ان الله غفور حليم (2:235) یادرکھو! خدا سامانِ حفاظت باہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یادرکھو کہ وہ حلیم ہے۔ یہ حلیم عجیب چیز ہے جو عربی زبان کا لفظ آتا ہے۔ ہمارے ہاں تو حلیم ہے جیسے حلیم الطبع کہتے ہیں کہ بڑا منکسر المزاج ہے وہ ہر وقت جھکا رہا: ''ہوجا ککھ مسیت دا' جنوں کیندے ہیگے نیں [1] '' یہ چیز اسلامی کردار کی نہیں ہے۔ حلم اور انکساری یقیناً بڑی چیز ہے لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں ظالم کی کلائی مروڑ دینا بھی نہایت ضروری ہوجاتا ہے۔ اب یہ کہ اگر اس چیز کو آپ مستقل اپنی سیرت بنالیں کہ آپ نے ہر ایک کے سامنے جھکنا ہی ہے۔ تو یہ چیز اسلامی زندگی کا ایک شعار نہیں ہوسکتا۔ **رحمآء بينهم** (48:29) تو ہوگا **اشدآء على الكفار** (48:29) کی بھی نوبت آئے گی۔ اس لیے اس کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا' اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس قدر برخود اپنے مقام کے اوپر مستحکم' پختہ ہونا اس قدر محکم طریق پر ہونا کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے اس کو اشتعال نہ آئے۔ ایک تو یہ ہمارے ہاں چیز ہوتی ہے کہ اگر ذراسی بات مزاج کے خلاف ہوئی اور یہ صاحب بھڑک اُٹھے اور ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ بھاری بھرکم ہو' سنجیدہ ہو؟؟ خوش مزاج کا آدمی ہو' وہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر بھڑکنے والا نہ ہو لیکن جہاں کوئی چیز اصول کی آئے' وہاں پہ وہ محکم گرفت کرنے والا ہو۔ طبیعت پر ایسا ضبط رکھنے والا ہو کہ غیظ وغضب کے موقع پر بھڑک نہ اُٹھے۔ اسے حلیم کہتے ہیں۔ قرآن نے بھی بتایا ہے کہ **ان بطش ربک لشديد** (85:12) عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے کہ اس قسم کا اُونٹ ہو' توانا' تندرست' اقامت والا ہو' مزاج ہو اعتدال پہ' بیٹھا ہوا ہے اور اطمینان سے جگالی کررہا ہے۔ بچے آرہے ہیں' کوئی اوپر چڑھ رہا ہے' کوئی کان مروڑ رہا ہے' کوئی گردن میں لٹک رہا ہے اور وہ نہایت اطمینان سے اسی طرح ہے' خندہ پیشانی سے' بیٹھا ہوا' جگالی کرتا چلا جاتا ہے۔ اتنی اتنی سی باتوں سے بھڑک نہیں اُٹھتا' مارنے نہیں دوڑتا' کاٹنے نہیں دوڑتا۔ بچے ہیں جو یونہی آ کر اپنا کچھ کھیل کررہے ہیں۔ یہ جو مزاج

ہوتا ہے اس کو حلم کہا جاتا ہے یعنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ چھچھورے پن پہ نہ اُتر آئے۔قوت اور توانائی کا مظہر ہو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہو اور بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور کوئی بے سمجھی کی بات نہ کرے۔کہتا ہے کہ جو چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں ان کی بنا پر بھی وہ مشتعل نہ ہو اب ہم یہ جو کہتے ہیں کہ دل ونگاہ ہے ہم وہاں سے فیصلہ کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ وہاں سے نیت کیسے اُوپر اُبھر رہی ہے۔

---

❶ جسے کہتے ہیں کہ مسجد کے تلکے کی طرح بے قدرومنزلت ہو جا۔

نکاح کے بعد باہمی رابطے سے پہلے فسق نکاح کی صورت میں قرانی راہنمائی:

کہا کہ **لا جناح علیکم ان طلقتم النسآء مالم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضةً** (2:236) طلاق کی صورت میں پہلے یہ کہا جا چکا ہے مہر کی ادائیگی کیسے ہوگی کیا کیا صورتیں ہیں وہ احکام پہلے آ چکے ہیں۔کہا کہ اگر نکاح ہوا ہے عورت کو چھوا نہیں ہے فسق نکاح کی نوبت آ گئی مہر بھی ابھی مقرر نہیں ہوا تھا۔قرآن کی رو سے تو مہر کا مقرر کرنا نہایت ضروری ہے اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے لیکن اگر کوئی Exceptional (استثنائی) ایسا واقعہ ہو جائے کہ وہ نہ مقرر کیا جا سکا ہو تو اس صورت میں کا کیا جائے؟ کہا کہ **ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ** (2:236) پھر بھی یعنی کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا محض معاہدہ نکاح پہ دستخط ہوئے ہیں اس کے بعد شوئی کا بھی تعلق نہیں ہوا اور ایسی کوئی صورت نہیں ہوئی ہے۔کہا کہ اس کے باوجود کچھ تھوڑی سی چیز تو ایسی عورت کے اُوپر آ جائے گی۔لہٰذا یہ چھوڑتے وقت بھی آپ کو یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ چھوڑتے وقت بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑ یئے۔تعلقات استوار کرنا ہی نہیں تعلقات منقطع کرنے میں بھی کشادہ ظرفی سے کام لیجیے۔کچھ سامانِ زیست اس کو دیدو اچھی حالت ہے تمہاری تو اچھے طور پہ دو تنگ دستی ہے تو تھوڑا سا ہی سہی دے ضرور دو۔آپ دیکھتے ہیں کہ چھوڑتے وقت بھی قرآنِ کریم کس قدر یہ تاکید کرتا ہے کہ تعلقات کے انقطاع کے وقت بھی ان چیزوں کا خیال رکھو۔معاشرہ میں یہ چیزیں بڑی خوشگواریاں پیدا کرتی ہیں کہ تعلقات کے انقطاع میں بھی آپ **واھجرھم ھجرًا جمیلاً** (73:10) کی کیفیت پیدا کرلو اور **متاعًا بالمعروف** (2:236) بھی قاعدے قانون کے مطابق دو۔

قران حکیم نے جن جن جزیات کو متعین نہیں کیا اس کی وجہ جواز:

خود قرآن ان چیزوں کو متعین نہیں کرتا اور یہ متعین کی بھی نہیں جاسکتیں۔قرآن قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ ہدایت ہے۔ان چیزوں کا تعین زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتا رہے گا۔اس لیے وہ اصول توڑ دیتا ہے اصولوں کی جزئیات خود متعین

نہیں کرتا۔ ایک ابدی ضابطہ قوانین کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کہا ہے کہ ''متاعاً'' (2:236) معروف قاعدے قانون کے مطابق دو۔ یہ **حقًا علی المحسنین** (2:236) ریہاں ایسا کرنے والوں کو محسنین کہا ہے۔ مومن وہ ہیں جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے ہیں' ان پر یہ چیز فریضہ ہو جاتی ہے کہ وہ ایسا کریں۔

نکاح کے فوری بعد طلاق کی صورت میں حق مہر کی ادائیگی کا معاملہ:

آگے کہا کہ **وان طلقتموھن من قبل ان تمسوھن وقد فرضتم لھن فریضۃً** (2:237) وہ جو صورت ایسی تھی کہ معاہدہ نکاح کے بعد مس نہیں ہوا طلاق کی نوبت آ گئی اور مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اس صورت میں یہ ہے کہ کچھ سامانِ زیست دے دو۔ اگر مہر مقرر ہو چکا تھا تو کہا کہ پھر اس کا جو آدھا مہر ہے' وہ تمہیں دینا ہوگا۔ **الا ان یعفون** (2:237) یہ اور بات ہے کہ وہ عورت خود اس کو معاف کر دے' پورا چھوڑ دے' اس کا کچھ حصہ چھوڑ دے۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم وہ آدھا حصہ تو کم از کم اسے دے دو۔ یہ تم تو پیش کردہ اگر وہ چھوڑ دے یہ اور بات ہے۔ آگے کہا کہ **اویعفوا الذی بیدہ عقدۃ النکاح** (2:237) آیت کا یہ ایسا ٹکڑا ہے جس کا غلط مفہوم ہمارے ہاں ایک ایسی بنیاد بن گیا کہ جس پہ بہت بڑی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ عمارت یہ ہے' جیسا میں پچھلے دو تین برسوں میں درسوں میں بتا چکا ہوں کہ تصور ہمارے ہاں یہ ہے کہ نکاح کا معاہدہ تو اس مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے ہوگا' اس میں عورت پہ کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا' قرآن نے کہا ہے کہ یہ حلال ہی نہیں ہے کہ کسی قسم کی کراہت کی صورت میں تم اس عورت کے مالک بن جاؤ' یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک تو سب مانتے ہیں کہ یہ کچھ زبردستی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی رضامندی نہایت ضروری ہے۔ طرفین میں یہ معاہدہ تو دونوں کی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس معاہدے کے توڑنے کے سارے حقوق مرد کو تو دے دیے جاتے ہیں کہ جب جی چاہے' تین دفعہ اس نے طلاق طلاق طلاق کہا معاملہ ختم ہوا۔ نہ کوئی اپیل' نہ کوئی وکیل' نہ کوئی Justification نہ اس کے لیے کوئی Explanation (وضاحت) کچھ نہیں' حاکم جو ہوا داروغہ جو ہوا۔ ابھی ابھی حاکم صاحب معاہدہ کر رہے ہیں اگر وہ چلے گئے ''ہاں'' نہیں کہتی ہے تو یہ معاہدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جونہی اس نے ''ہاں'' کی تو اس کے بعد سارے ہی حقوق' اس کے پاس' اس معاہدہ کو فسخ کرنے کے چلے گئے اور اگر بیچاری عورت اس ظالم سے تنگ آ کر یہ صورت اختیار کرنی ہو تو وہ ہزار طریقے اختیار کرے' وہ عدالت میں پہنچے' وہ مقدمے کرے' تو اس کے لیے اس چنگل سے نکلنا محال ہے اور پھر وہاں عدالتوں میں جو کچھ ہوتا ہے آپ کو معلوم ہی ہے۔ وہ ساری چیزیں میں پہلے بتا چکا ہوں' وہ ساری قرآن کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب! اب دیکھئے قرآن میں ہے کہ **اویعفوا بیدہ عقدۃ النکاح** (2:237) یا تو عورت معاف کرے یا وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! نکاح کی گرہ تو مرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے'

دیکھا قرآن نے کہہ دیا۔ یہ وہی ہے جو کچھ دیا جاتا ہے کہ لا تقربوا الصلوٰۃ (4:43) قرآن نے کہا ہوا ہے کہ نماز کے قریب نہ جاؤ اور وانتم سکاریٰ (4:43) جو بات ہے، وہ نہیں پڑھی جاتی۔ وہ جو میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ کہا تھا کہ فانحکوا ما تاب لکم من النسآء واثنہ وثلثہ رباع (4:3) عورتوں سے شادی کرلیا کرو، دو دو، تین تین، چار۔ یہ جو پہلا ٹکڑا ہے وہ ختم۔ قرآن کے قوانین کو قرآن سے لینا چاہیے۔ عزیزانِ من! یہ کیا چیز ہے؟ عورت خود معاف کرے یا یہ دوسرا کون ہے جو معاف کرتا ہے۔

طلاق کی شکل میں ہر دو فریقین کے حقوق کے متعلق عدالتی فیصلہ ضروری ہے:

آپ کو معلوم ہے، میں نے شروع میں بتایا تھا کہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس معاہدہ کو فسخ کرنے کے لیے آزادانہ طور پر، نہ وہ مرد کو چھوڑتا ہے، نہ وہ عورت کو چھوڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جونہی آپس میں تعلقات میں کچھ تھوڑی سی کشیدگی واقع ہو تو معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ دونوں جذبات میں اُلجھ گئے ہیں آپس میں یہ بات نہیں طے کرسکیں گے۔ بات بڑھتی چلی جائے گی، کسی تیسرے کا آنا ضروری ہوجائے گا۔ ایک حکم، خانم کے گھر سے، ایک حکم عورت کی طرف سے ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ تیسری پارٹی ہے جو حکم مقرر کر رہی ہے۔ ایک ثالث اس کے اندر بیٹھے گا۔ معاشرے کی طرف سے ہوگا۔ معاشرے سے مراد آپ کا پنچائتی سسٹم بھی ہوسکتا ہے، عدالتی سسٹم بھی ہوسکتا ہے۔ جو بھی آپ کے ہاں ہو لیکن بہرحال ایک تیسرا شخص اس میں آئے گا جو پہلے مصالحت کی کوشش کرے گا اور اگر مصالحت نہیں ہوسکے گی تو وہ پھر اس نتیجے پہ پہنچے گا کہ ہاں! یہ معاہدہ فسخ ہونا چاہیے۔ یہ ہے وہ مجاز شخص جس کے ہاتھ میں اس نکاح کی گرہ ہے۔ نکاح کی گرہ نہ مرد کے ہاتھ میں ہے، نہ عورت کے ہاتھ میں ہے۔ یہ قرآن کے بتایا ہے۔ سورۃ النسآء کے اندر یہ پوری تفصیل دی گئی ہے کہ معاشرے کو یہ کرنا ہوگا۔ وہ شخص ہے جو فیصلہ دیتے وقت پھر یہ سوچے گا کہ کس کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے، کون بے قصور ہے، اس کو اس کے لیے کچھ معاوضہ دلایا جائے گا، بچوں کا کیا بنے گا، دودھ پلانے کی صورت کیا ہوگی۔ یہ تمام چیزیں اس سے متعلق تھیں۔ نکاح کرتے وقت تو یہ چیزیں نہیں ہوتیں، وہ تو ان دونوں کے مابین جو شرائط طے ہوں گی، نکاح نامے میں درج ہوجائیں گی۔ معاشرہ نہیں آئے گا، اس میں صرف یہ ہوگا کہ اس میں کوئی شرط قرآن کے خلاف نہ آئے لیکن اس کے انقطاع کی صورت میں یہ دو ہی نہیں بلکہ ساتھ اور بھی اس کے متعلق ہیں جن کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے بعد کے حقوق کے تحفظ ضروری ہوگا۔ یہ کوئی تیسرا اش صخ کرے گا یہ قرآن ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ ہے کہ جس نے یہ فیصلہ دینا ہے کہ ہم نے باہمی مصالحت کی کوشش کر دیکھی، مصالحت نہیں ہوسکتی، یہ معاہدہ کالعدم ہوگا لیکن اس میں ہمیں اب یہ یہ چیزیں نظر آئیں۔ لہٰذا اس کی رو سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کرنا ہوگا۔ یہ جو ہے کہ اگر عورت کی طرف سے یہ چیز آئی ہے تو وہ دیکھے کہ وہ کہیں اس چیز کو Abuse نہ کرے کہ آج اس نے مہر کا دو ہزار یا مثلاً یا دس

ہزار روپیہ وصول کیا' اگلے ہی دن اس نے یہ کہہ دیا کہ مجھے وہ منظور نہیں ہے اور اب وہ دوسرے دن بیس ہزار روپیہ لے کے چلتی بنی۔ Abuse تو ہوتا قانون کا۔ وہ یہ دیکھے گا اگر مرد زیادتی کر رہا ہے اور اسے اس طرح سے طلاق دے رہا ہے کہ جو کچھ دیا تھا' وہ سارے کا سارا ضبط کر کے بیٹھ گیا ہے' اس کو پیسہ نہیں دیتا وہ فیصلہ کرے گا کہ بچوں کے حقوق کس طرح سے ہوں گے' پیدہ ہونے والے بچے کے حقوق کی کیا کیفیت ہوگی۔قرآن یہاں تک جاتا ہے۔ یہ کوئی تیسرا شخص کرے گا' اس ثالث کو کہیے' اس کو عدالت کہیے' اس کو سوپنچ کہیے' یہ وہ ہے جس کے ہاتھ نکاح کا عقدہ میں ہے تو عورت خود معاف کر دے یا یہ شخص حالات کو دیکھنے کے بعد کسی نتیجے پہ پہنچے کہ نہیں! اس میں سے اتنا اور کم ہونا چاہیے' وہ کر دے یا یہ کہ خود یہ مرد کشادہ نگہی سے کام لے۔ یہاں یہ **وان تعفوا اقرب للتقوٰی** (2:237) مرد کے متعلق آیا ہے۔ اس آیت میں یہ ہے کہ اگر تم مرد خود کشادہ ظرفی سے کام لو کہو کہ آدھا کیوں' میں سارا دیتا ہوں صاحب! تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ یہ فریضہ نہیں ہے' فریضہ نصف کا تھا۔ اب اس کے اندر عورت کم سکتی کر ہے' عدالت مجاز کم کر سکت ہے۔ مردوں سے کہا کہ پورا ہی دے دے یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ **ولا تنسوا الفضل بینکم** (2:237) دیکھو! باہمی معاملات میں یہ جو تم کہتے ہو کہ صاحب! اتنا بنتا ہے' میں اس سے زیادہ کیوں دو؟ اس نے کہا کہ اس بات کو مت بھلا کرو کہ ٹھیک ہے' بنتا اتنا ہی ہے' کچھ تھوڑا سا کشادہ ظرفی سے کام لو گے' تو دیکھو گے کہ معاملات کس قدر زیادہ خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ باہمی معاملات طے کرتے وقت یہ جو کچھ زیادہ دے دینا ہوتا ہے اس کو نہ بھولا کرو۔ وہ عجیب خطوط پہ معاشرے کو متشکل کیے چلا جاتا ہے۔

اپنے باہمی معاملات کو انعامات کی حد تک رکھنے کی بجائے جذباتی انتقام کے شعلوں کو ہوا نہ دو:

کہا کہ **ان اللہ بما تعملون بصیر** (2:237)۔ یہ پھر وہی بات کہ ٹھیک ہے یوں Formally تو عدالت بھی ہوگی' ثالث بھی ہوگا' دو فریقین بھی ہوں گے' قانون بھی ہوگا' قانون کے تقاضے بھی' یہ سب برحق ہیں۔ بات تو ساری یہ ہے کہ اندر سے وہ جذبہ کیا اُبھرتا ہے؟ باہمی تعلقات میں جذبہ وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ اپنے انگبیں میں' شہد میں' سرکہ نہ ڈال دو' تلخی نہ پیدا ہونے دو' دل کے اندر آپس میں کدورت کے اور انتقام کے جذبات نہ اُبھرنے دو۔

عائلی قوانین کی اس قدر وضاحت کے دوران صلوٰۃ کی حفاظت کے ذکر کا مفہوم اور مقصد

کشادگی کے جذبات ہونے چاہئیں' اتنا بنتا ہے اور لے لو کچھ تھوڑا سا۔ میں کہتا ہوں اتنا کر کے تو دیکھو' پھر دیکھو دنیا میں تعلقات کی کیا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک آیت آتی ہے یہ بڑی اہم آیت ہے۔ یہ یہاں آئی ہے اور عام طور پہ بڑی مشکلات پیدا کر رہے ہیں حالانکہ کوئی مشکل نہیں تھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نکاح' طلاق' عدت' بیوگی وغیرہ کے قوانین کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بھی آگے

پھر یہی ذکر ہے۔ کہا ہے کہ و الذین یتوفون منکم (2:239)۔ درمیان میں ایک آیت آ گئی۔ قرآنِ کریم آپ کے سامنے ہے تو دیکھ لیجیے گا۔ آیت آ گئی یعنی یہاں تک تو یہ ہے کہ یاد رکھو! اگر یہ جو مہر ہے' دنیا ہو تو یوں دو۔ آ گے ہے کہ **حافظوا علی الصلٰوت والصلٰوۃ الوسطٰی وقومو لله قٰنتین** (2:238)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نمازوں کی حفاظت کرو اور صلٰوۃِ وسطٰی کی اور اللہ کے لیے اطاعت گزار بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ سوالیہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں سے عائلی زندگی کے' نکاح کے' طلاق کے' عدت کے' مہر کے' بیوگی کے یہ سارے احکام آ رہے ہیں۔ اس کے بعد کی آیت پھر یہی کچھ کرتی چلی جاتی ہے۔ درمیان میں بھی یہی چیز آتی ہے کہ اپنی نمازوں کی بالخصوص درمیانی نماز کی حفاظت کی۔ پھر آ گے صلوۃ الوسطٰی کے متعلق ہمارے ہاں تفسیر چلی کہ یہ جو درمیانی صلٰوۃ ہے یہ کون سی ہے؟ اس کے متعلق بہت سی تفسیریں ہیں۔ کہیں تو اس کو عصر کی نماز کہا جاتا ہے کہ وہ پانچ میں سے دو پہلے' دو بعد میں اور یہ درمیان والی آتی ہے۔ کوئی جمعہ کی نماز کو کہتے ہیں۔ یہ بہت سی تفسیریں آتی ہیں۔

تصریف آیات کی افادیت کے تحت لفظ صلٰوۃ کا مفہوم متعین کرنے کا طریق اور اس کی اہمیت:

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احکام تو یہ چلے آ رہے ہیں' اس کے بعد بھی احکام آ گے چل کے پھر یہی آ رہے ہیں' درمیان میں ایک آیت آ رہی ہے کہ اپنی صلٰوت کی حفاظت کرو۔ یعنی **والصلٰوۃ الوسطٰی** (2:238) درمیانی صلٰوۃ کی۔ **قوموا الله قٰنتین** (2:238) ان اس کے اندر یہ نمازوں کا ذکر کیسے آ گیا؟ پھر یہ اتنی بڑی چیز اصلوٰۃ و السطٰی درمیان میں کہا ہے اور جو دوسری جگہ کہیں نہیں ہے۔ پھر یہاں صلٰوت کہا ہے۔ حالانکہ جہاں جہاں بھی نماز کا ذکر آیا ہے وہاں **اقیموا الصلوٰۃ اقیموا الصلوٰۃ** یہی ہے۔ یہاں یہ صلٰوت بھی آیا ہے۔ ایک دشواری پیدا ہوتی ہے' کچھ وقت نظر نہیں آتا۔ یونہی چلتے چلتے درمیان میں نماز کا ذکر آ گیا' پھر آ گے آ گیا ہے کہ بے زبان کی صورت میں یہ کیا کرو۔ یہ کیا بات ہے؟ بات ساری یہ ہے' عزیزانِ من! کہ ہم قرآن کے ایک لفظ کا ترجمہ ایک ہی کر لیتے ہیں اور ہر مقام پہ وہی ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے' صلٰوۃ سے مفہوم' یہ اجتماعات میں جو کچھ مسجد میں کیا جاتا ہے عرفِ عام میں نماز کہتے ہیں' یہ بھی اس کے معنی ہیں لیکن یہ اس کے ایک معنی ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا عربی زبان کے الفاظ یعنی قرآنِ کریم کے الفاظ کے مادوں کے اعتبار سے معنی متعین کیے جاتے ہیں۔ پھر قرآنِ کریم میں جہاں جہاں وہ چیزیں آتی ہیں' وہاں دیکھا جاتا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ یہ طریقہ ہے' یہ عربی مبین کی کتاب ہے اور ہم تصریف آیات سے اس کے معنی خود متعین کرتے ہیں۔ عربی مبین کے معنی یہ ہوئے کہ عربی زبان کے الفاظ کا مفہوم جس طریقے سے سمجھا جاتا ہے ایک تو وہ طریقہ استعمال کرو اور پھر یہ دیکھو کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کہاں کہاں آیا ہے' کن معنوں میں آیا ہے' بات سمجھ میں آ

جائے گی۔ بنیادی طور پہ صلوٰۃ کے معنی یہ جو مادہ ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا' علی التواتر انتظام کے ساتھ اس طرح چلنا کہ اس کے اور تمہارے درمیان کوئی تیسری چیز نہ آنے پائے' کسی کا اتباع کرتے چلے جانا' کسی کا نقش قدم پہ چلے جانا' علی التواتر کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا۔ یہ ہیں اس کے بنیادی معنی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' ان کے ہاں ریس کورس میں گھڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پہ جو گھوڑا ہے بشرطیکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کی کنوتیاں اس کی پشت کے ساتھ ساتھ لگتی ہوئی' برابر چلی جائیں اور اسی طرح سے التزاماً وہ گھوڑا چلا جائے' اس گھوڑے کو عربی زبان میں مصلی کہتے ہیں۔ آپ دعائیں مانگتے ہیں کہ **اھدنا الصراط المستقیم** (1:6) ہمیں صراطِ مستقیم کے اُوپر چلنے کی ہدایت دے اور وہ دوسرے مقام پہ کہتا ہے کہ **ان ربی علٰی صراط المستقیم** (11:56) یاد رکھو! میرا رب بھی صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔ اب مومن کی کیفیت کیا ہے؟ اسی صراطِ مستقیم کے اُوپر رب جا رہا ہے' اسی صراطِ مستقیم کے اُوپر یہ چلنے کی دعا کر رہا ہے۔ رب سے نہ یہ آگے بڑھ سکتا ہے' نہ اس کے دوش بدوش ہو سکتا ہے' اس کو اُس کے پیچھے رہنا ہو گا' اس کا اتباع کرنا ہو گا۔ لیکن اتباع بھی اس قسم کا کہ زندگی کے کسی ایک سانس میں بھی ان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ ہو جائے اسے مصلی کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! ایسا کرنے کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یہ تو Graphical شامل ہو گئی۔ ہوا کیا؟ وہ تمام فرائض منصبی جو اس نے تمہارے لیے مقرر کیے ہیں وہ تمام وظائف حیات کہ جو تمہارا مقصد ہے' تمہارے نصب العین کے حصول کے جتنے بھی طور طریقے ہیں' جو اس نے مقرر کیے ہوئے ہیں' ان سب کا اتباع کرتے چلے جاؤ' التزاماً اتباع کرتے چلے جاؤ۔ ایسے نہیں ہے کہ کبھی Flash آیا تو اتباع کیا اور اس کے بعد پھر **کلما اضاء لھم مشوا فیه و اذا اَظْلَمَ علیھم قاموا** (2:20) زندگی کی چمک ہے ذرا سی روشنی ہوئی' دو قدم چل لیا' اندھیرا ہو گیا پھر کھڑے ہیں' کہتا ہے یہ بات نہیں ہے۔ یوں چلو جیسے مصلی گھوڑا چلتا ہے۔ صلوٰۃ کے یہ معنی ہیں۔ زندگی کے لیے جو کچھ بھی اس نے وظائف حیات' فرائض منصبی مقرر کیے ہوئے ہیں' التزاماً ان کے پیچھے چلتے جانا ہے۔

انسان کے علاوہ خارجی کائنات میں صلوٰۃ پر متواتر عمل پیرانی کی کیفیت:

انسان تو یوں نہیں چلتا۔ کائنات کی دوسری جتنی بھی چیزیں ہیں' وہ ساری اسی سے چلتی ہیں۔ وہ اپنا فریضہ منصبی' وظیفہ زندگی کس جنون کے ساتھ پورا کرتے ہیں' آپ کو بھی اس کا تجربہ ہو گا۔ مجھے تو گزشتہ تین مہینے سے تجربہ ہو رہا ہے۔ میرے کمرے کے اندر ایک تصویر ہے۔ یہ جو چڑیاں ہیں' آج کل ان کے گھونسلے بنانے کا وقت آیا ہوا ہوتا ہے' یہ مارچ اپریل سے شروع ہو جاتا ہے۔ عین اس زمانے میں کوئی ایک چڑیا' کوئی ایک چڑا' وہ آپس میں معاہدہ کر لیتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنا گھونسلہ بناتے ہیں تا کہ اس میں وہ انڈے دے کر اس میں بچے پیدا کریں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی دیوانگی اور جنون کا عالم کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل انہوں نے کھانا'

پینا سب بھلایا ہوا ہوتا ہے۔ کہاں کہاں سے ایک ایک تنکا اُٹھا کر لا کر وہاں رکھتے ہیں' پھر تنکا آتا ہے وہاں رکھتے ہیں' دن بھر ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اب آپ اسے کچھ بھی کہیے۔ میرے کمرے کے اندر یہ چیز ہوئی' ایک دفعہ انہوں نے بچے دیے اور بچوں کو آخر تک پہنچنے میں تو آپ کو پتہ ہے' وہ ان کی کتنی چوں چوں ہوتی ہے۔ اس سے Disturbance ہوتی ہے۔ میں اپنے کمرے کے اندر قرآن کا سکون سے کام کرتا ہوں' اس میں یہ جو چیز ہے اس نے یہ ذرا خلل پیدا کیا تھا۔ تو میں نے اس دفعہ کہا کہ یہ دوسرے کمرے موجود ہیں کہ بھئی! جاؤ بھئی! وہاں جاؤ' گھر کے اندر جاؤ' یہ گھر والوں کا معاملہ ہے' یہ تو میرا باہر کا کمرہ ہے' تم مجھ میں کیوں دخل اندازی کرتے ہو۔ کیفیت یہ ہے صاحب! کہ ان کی وہ ڈیوٹی تو کم ہے' میری ڈیوٹی زیادہ لگ گئی' دن میں تین چار مرتبہ ان کے یہ جو تنکے ہیں' ان کو اکٹھا کر کے نکالنا پڑتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ دو گھنٹے کے اندر اتنے اتنے تنکے پھر جمع ہیں۔ جو جی میں آئے آپ کر کے دیکھئے' انہوں نے اپنے اس فریضہ منصبی کی اطاعت میں کسی قسم کا کوئی تساہل اور تغافل نہیں برتنا۔ فطرت کا ج اندر سے تقاضا ہو رہا ہے کہ گھونسلہ بنانا ہے' انڈے دینے ہیں' بچے پیدا کرنے ہیں۔ کوئی قانون نہیں' کوئی سپاہی نہیں' کوئی مارشل لا نہیں لگا ہوا جو ان کو ڈنڈے مار مار کر اس کے اُوپر آمادہ کر رہا ہو۔ دل کے اندر خدا کی وہ نگاہیں ہیں' ان کے اندر سے یہ ایک چیز اُبھر رہی ہے اور اتنی بڑی طاقت والا انسان یہاں بیٹھا ہوا ہے' ان کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے' تین مہینے ہو گئے ہیں' کئی دفعہ ذہن میں یہ آتا ہے کہ شاید مجھے ہی شکست ماننی پڑے گی۔ اس لیے کہ اگر ذرا سی بھی وہاں دیر ہو گئی اور چڑیا نے وہاں انڈے دے دیے پھر تو میں اس کو نہیں اُٹھا سکوں گا۔ یہ کیا چیز ہو رہی ہے؟ کیا تقاضا ہو رہا ہے؟ وہ جو صراط متقیم کے اوپر جا رہا ہے اس کے پیچھے پیچھے یہ اس مصلی کی طرح اپنے فرائض منصبی کی سرانجام دہی میں چلے جا رہے ہیں اور چلے کیسے جا رہے ہیں؟ جنون کے ساتھ' سرگرداں ہیں' گردش میں ہیں' بس چلے ہوئے ہیں۔

تسبیح کا لغوی مفہوم اور اس پر پوری کائنات کا عملی مظاہرہ:

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تسبیح کے معنی یہ بتائے تھے۔ عربی زبان میں سبح کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی کام کے کرنے میں جتنی توانائی ہے' ساری کی ساری شدت کے ساتھ سرف کر دینا۔ وہ اس گھوڑے کو جو سرپٹ دوڑ رہا ہوتا ہے' اسے سبح کہتے ہیں۔ وہ تیراک جو پورا ہاتھ اس طرح سے مار کر تیر رہا ہوتا ہے' اسے سبح کہتے ہیں۔ تسبیح کے معنی ایک تو یہ ہے ہوتے ہیں کہ فریضے کی سرانجام دہی کے اندر منہمک رہنا اور انہماک اس قسم کا کہ جنون کی حد تک وہ پہنچا ہوا ہو' ساری توانائیاں سرف کر رہا ہے۔ جیسے یہ چڑا اور چڑیا کر رہی ہے۔ عزیزانِ من! میں یہ نہیں کہہ رہا' سینئے! کہاں یہ چیز آئی ہے؟ **الم تر ان اللہ یسبح لہ من السمٰوٰت و الارض و الطیر صٰفّٰتٍ** (24:41) کیا تم نے اس چیز پہ کبھی غور نہیں کیا کہ کائنات کی ہر شے خدا کی حمد و ستائش' اس کے پروگرام کو باعث حمد و ستائش بنانے کے لیے سبح لہ ہیں۔ ترجمے

میں تو آپ کو ملے گا کہ تسبیح کررہی ہیں۔ جونہی تسبیح کا لفظ آیا وہ سودانوں کی تسبیح آپ کے ہاتھ میں آ گئی کہ ہر شے تسبیح کررہی ہے' تسبیح پھیر رہی ہے لیکن اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا جو میں نے بتائے ہیں کہ عربی زبان میں تسبیح کے معنی کیا ہیں' سبح کے معنی کیا ہیں: کائنات کی ہر شے' خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے پوری توانائیوں کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ عظیم الشان کرے جو اس کے اندر ہیں' ارض کے اندر ننھے کیڑے' یہ چڑیاں اور چڑے یہ بھی' جو پروگرام اس نے متعین کیا ہوا ہے' اس کی تکمیل کے لیے ایک والہانہ جنون کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں اور یہ پرندے بھی تم دیکھو کس طرح سے یہ اُڑتے ہوئے جاتے ہیں' پر پھیلائے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ سنیے! آگے جو بات آئی کہا کہ **کل قد علم صلاته و تسبيحه** (24:41) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور اپنی اپنی تسبیح کو جانتا ہے۔ عزیزانِ من! نہ تو یہ وہ صلوٰۃ کرتے ہیں' جسے ہم صرف نماز کہتے ہیں' ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس طرح سے نماز پڑھ رہے ہیں' نہ یہ تسبیح پھیرتے ہیں جس کو ہم تسبیح کہتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ ان میں سے ہر ایک اپنی صلوٰۃ اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے۔ **والله عليم بما يفعلون** (24:41) تم تو بعض اوقات ہنستے ہو کہ یہ کیا کررہے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ کیا کررہے ہیں؟ کہ ان میں سے ہر ایک اپنی **صلاته و تسبيحه** کو جانتا ہے' اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔

قرآن حکیم کے الفاظ ہر جگہ ایک ہی مفہوم ادا نہیں کرتے:

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کے ان الفاظ کے معنی جو ایک جگہ آپ متعین کرتے ہیں' وہ لفظ ہر جگہ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ جب آپ جنگل میں شیر کہیں گے' شیر کے معنی اور ہو جائیں گے۔ جب کسی بہادر کے لیے آپ کہیں گے کہ وہ تو شیر ہے صاحب! اس کے معنی کچھ اور ہو جائیں گے۔ انقلابی دعوے کی گرج کے اور معنی ہوتے ہیں' آسمان کے بادل کی گرج کے اور معنی ہوتے ہیں۔ یوں معنی متعین کرنے چاہئیں۔ قرآن تو جیسا میں نے عرض کیا تھا ہم پہ چھوڑتا نہیں ہے' وہ تو خود یہ چیزیں بتا رہا ہے اور دیکھئے یہیں اتفاق سے (2-23:1) میں سے ہے کہ **قد افلاح المؤمنون. الذين هم فی صلاتهم خاشعون** (2-23:1) وہ اپنی صلوٰۃ میں جھکے ہوئے ہیں' جھکاؤ کے ساتھ اپنی صلوٰۃ پوری کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہ اپنی صلوٰۃ میں خاشعین کی چیز ہے۔ یہیں آگے 9 ویں آیت ہے' درمیان میں یہ ہے کہ وہ یہ کرتے ہیں' یہ کرتے ہیں' ان کی صفات یہ ہیں ان کے کیریکٹر یہ ہیں' ان کی ادائیں یہ ہیں۔ اور آخر میں کہا کہ **والذين هم علٰى صلوٰتهم يحافظون** (23:9) یہ صلوٰت یہاں آیا ہے کہ وہ اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں لفظ صلوٰۃ کا کیا جانے والا ترجمہ ہر جگہ نماز ہی کیا جاتا ہے:

ہمارے ہاں ترجمہ یہی ہوتا ہے کہ اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں' اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک ہی سورۃ میں چار پانچ

آیتوں کے ساتھ یہ جو چیز ہے' یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ صلٰوۃ تو وہی ہے جو میں نے کہا ہے جس کو ہم اجتماعِ صلٰوۃ کہتے ہیں' یہ صلٰوت ہے یہاں۔ درمیان میں ان کی Duties گنائی ہیں' ان کے فرائض گنائے ہیں اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ اپنے ان فرائض منصبی کی محافظت کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ صلٰوۃ کے ہر جگہ معنی نماز نہیں کیے جاسکتے۔ یہ فرائض منصبی ہیں۔

لفظ صلوات کا بنیادی اور مرکزی فریضہ فرائض کی محافظت کے لیے اطاعت گزار ہونا ہے:

یہ ساری چیزیں قرآن عائلی زندگی کے اندر گنا تا چلا آ رہا ہے کہ یہ تمہارے فرائض ہیں یاد رکھو۔ ہم کہتے چلے آ رہے ہیں' ان چیزوں کو بیان کرتے چلے آ رہے ہیں کہ انہیں رسمی طور پہ نہیں کرنا۔ **حافظوا علی الصلٰوت** (2:238) اپنے فرائض منصبی کی محافظت کرو لیکن اس میں ایک بنیادی نقطہ ہے کہ جو مرکزی فریضہ ہے' وہ کیا ہے؟ یہ فرائض کہا ہے صلٰوت کو یہاں کہا ہے کہ **والصلوٰۃ الوسطٰی** (2:238) ایک مرکزی فریضے کو سامنے رکھو گے تو ان تمام فرائض کی پھر محافظت کرلو گے اور مرکزی فریضہ یہ ہے کہ **قوموا للہ قٰنتین** (2:238) یعنی خدا کے ان فرائض کی تکمیل کے لیے ہر وقت اپنے آپ کو اطاعت گزار بنا کر رکھو۔ یہ ہے ایک مرکزی چیز۔ یہ مرکز ہے' یہ اس مرکز کا Circumference (محیط) ہے جو ہم نے تمہیں بتایا ہے۔ وہ مرکز ہے' یہ دائرہ کا محیط ہے۔

لفظ 'قٰنتین' کے حقیقی مفہوم کی اہمیت اور افادیت:

مرکز یہ ہے: **قوموا للہ قٰنتین** (2:238) خدا کے لیے کھڑے رہو۔ قٰنتین عجیب الفاظ ہیں۔ ترجمہ یونہی ہم کر جاتے ہیں اس لیے کہ ہماری زبان میں تو اتنے مرادفات ہی نہیں مل سکتے۔ عربی زبان کے مرادفات کو آپ پوچھتے کیا ہیں جتنی یہ وسیع زبان ہے۔ اُونٹ کی ایک ایک ادا کے لیے ان کے ہاں ہزاروں الفاظ ہیں۔ **قٰنتین** اطاعت گزار نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں پانی کی کمی ہوتی تھی۔ وہ مشکیزے میں پانی کو ڈالتے تھے' مشکیزے کو سیتے تھے' اس کا منہ بند کرتے تھے۔ اب اگر وہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے تو اس پانی کا فائدہ کیا ہے؟ اور اگر وہ راستے میں ہی ٹپکنا شروع ہو جائے تو منزل تک پہنچتے ہوئے پانی ختم ہو جائے گا۔ وہ ایسا ہونا چاہیے کہ راستے میں تو کہیں ٹپکے نہیں اور جہاں ضروری ہے وہاں اپنا منہ کھول دے۔ اس قسم کا جو مشکیزہ ہوتا تھا وہ اسے **قانت** کہا کرتے تھے کہ اپنی توانائیوں کو ہر وقت محفوظ رکھنے والا کہ بے جا ایک قطرہ سرف نہ ہو اور جہاں ضرورت ہے اس کا منہ کھول دے۔ یہ ہے صلٰوۃِ وسطٰی' یہ ہے مرکزی فریضہ۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو' اپنی تمام توانائیوں کو' اپنی استعدادوں کو' استطاعتوں کو' قابلیتوں کو محفوظ رکھو۔ یہ تمہاری بڑی قیمتی متاع ہے ایک قطرہ بھی بے جا جگہ پہ نہ ٹپکنے پائے اور پھر بخیل بھی نہ بنو کہ اس کو اپنی ذات کے لیے رکھو کہ منہ بند کا بند ہی رہے' یہ چیز بھی تمہارے ہاں پیدا نہ ہو بلکہ یہاں کہا ہے کہ جہاں ان چیزوں کو لانے کی اب ضرورت ہے وہاں آ ؤ' مال ہے تو وہ سارا دے دو' جان ہے تو ہتھیلی پہ لے کر آ

جاؤ۔اس لیے کہ تم تو ایک قانت کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے' یہ سب کچھ تم نے کسی مقام پر سرف کرنے کے لیے ریزرو رکھا تھا' محفوظ رکھا تھا۔مقام آ گیا ہے سرف کرلو۔اگر وہاں یہ جو مشکیزہ ہے' یہ وہاں اگر انکار کردے' منہ کھول کے پانی دینے سے توقف ہے اس مشکیزے کے اُوپر۔یہ تو وبالِ جان ہوگیا' وبالِ دوش ہوگیا' بوجھ بنا رہا۔یہ ہے وہ مال' برادرانِ عزیز! جو جہنم میں لے جاتا ہے۔پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جمع مالہ وعدد (104:2) مال جمع کرتا ہے۔دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ تھیلی میں ڈالتا ہے اور پھر اس کو اُوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے۔کس کر باندھنے کے معنی یہ ہیں کہ جہاں ضرورت ہوتی ہے کھولنے کی وہاں بھی نہیں کھولتا۔کس کے باندھو کہ بے جا مقام کے اُوپر ایک قطرہ نہ گرنے پائے یہ وہاں پہنچے جہاں اس کی ضرورت ہو۔یہ اسراف نہیں ہوگا۔پھر لفظ آتا ہے تو جی نہیں چاہتا آگے بڑھنے کو۔عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں تو کشش اتنی ہے۔وہ اسراف' مسرفین کہتا ہے یہ بڑی چیز ہے۔اسراف کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ کھیت کو کنویں سے پانی دیا جاتا ہے اس لیے ایک نالی بنائی جاتی ہے ''اوہنوں آڈ کیندے نیں ساڈے پنجابی اچ''[1] پانی اس میں سے جاتا ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسان ہر وقت ''کہی موہڈے تے رکھ کے اوآڈاں دے مُڈھ پھردا رہندا اے[2]'' وہ کیا کرتا ہے؟ وہ دیکھتا ہے کہ اگر اس میں سے درمیان میں سے' ذرا سا بھی پانی نکل گیا ہے تو فوراً اس کو وہاں سے باندھ دیتا ہے۔پانی تو اس نے کنویں سے نکالا تھا زمین میں دینے کے لیے' یہ کیا کر رہا ہے کہ وہ زمین میں جا رہا ہے' یہ باندھ رہا ہے کہ یہاں نہ جائے' آج یہاں دینے کا مقصد نہیں تھا' آج وہاں پہنچانے کا مقصد تھا۔یہ جو راستے میں پانی ''ایس آڈ و چوں دوسرے پاسے ترجاندا اے[3]'' اسے عربی زبان میں اسراف کہتے ہیں۔پانی بھی رہے' زمین بھی ہے' کام بھی اس کا یہی ہے لیکن یہاں ضرورت نہیں ہے۔جہاں ضرورت ہے وہاں پورے کا پورا چلا جا رہا ہے' وہ اسراف نہیں ہے۔اس کے مقابل میں قانت ہے' قٰنتین ہے' وہ پانی جمع رکھا ہوا ہے' جہاں اس کی ضرورت ہو' مشکیزہ منہ کھول دیتا ہے۔کہا ہے کہ وقوموا للہ قٰنتین (2:238) اب بات سمجھ میں آ گئی۔درمیان میں یہ ٹکڑا کیا آیا ہے۔احکام اور قوانین کی تفصیل دی جا رہی ہے تاکید کی جا رہی ہے درمیان میں آیا ہے کہ حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطٰی (2:238) اور دیکھنا! فرائضِ منصبی کی محافظت کرو اور اس مرکزی فریضے کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دو اور وہ ہے وقوموا للہ قٰنتین (2:238) فان خفتم فرجالاً او رکبانًا (2:239) کیسی بھی کیفیت' حالت کیوں نہ ہو' امن کی حالت ہو' خوف کی حالت ہو' پیدل چل رہے ہو' سواری پہ چلے جا رہے ہو۔زندگی کے کسی مقام میں' کسی طریق میں' کسی پروگرام میں بھی تم ہو وقوموا للہ قٰنتین (2:238)۔

---

[1] اسے ہمارے ہاں پنجابی میں ''آڈ'' (نالی) کہتے ہیں۔

[2] وہ کسی کندھے پہ رکھے ان ''آڈوں'' (نالیوں) کے پاس پھرتا رہتا ہے۔

[3] اس ''آڈ'' (نالی) میں سے دوسری طرف بہہ نکلتا ہے۔

مومن کا فریضہ تخلیق ارض وسما اور اختلافِ لیل ونہار پر غور وفکر کرنا ہے:

یہ ہے قرآن نے جو مومنین کے متعلق کہا۔ دیکھئے مومنین کی صفات آ رہی ہیں کہ **ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنھار لاٰیٰت لاولی الالباب** (2:190) یادرکھو! تخلیق ارض وسما میں اختلافِ لیل ونہار میں، صاحب عقل وبصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ کون ہیں صاحبانِ عقل وبصیرت جن کے لیے ان چیزوں میں حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں؟ کہا کہ **الذین** یہ وہ لوگ ہیں جو **یذکرون اللہ قیامًا وقعودًا وعلٰی جنوبھم ویتفکرون** (3:191) کھڑے، بیٹھے، لیٹے کروٹوں پر، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ یعنی **یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض** (3:191) کائنات کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایک چیز کا تجزیہ کر کے Scientifically (سائنسی طور پر) اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ **ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً** (3:191) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بھی باطل پیدا نہیں کیا۔

یہ ہے لفظ ذکر کا قرآنی مفہوم اور ذکر کرنے والوں کی کیفیت:

برادرانِ عزیز! یہ ہے جو ذکر کرتے ہیں **یذکرون اللہ** (8:191) آپ کو پتہ ہے کہ اب ہمارے ہاں ذکر کے معنی کچھ اور ہی ہو گئے۔ کہا ہے کہ خدا کا ذکر کرتے ہیں، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، چلتے پھرتے، ہر وقت ان کے سامنے یہ حقیقت رہتی ہے۔ ذکر کے معنی ہوتا ہے کسی حقیقت کو اپنے سامنے رکھنا۔ یہ ہے وہ چیز جو کہا کہ **قوموا للہ قنتین**. **فان خفتم فرجالاً** اور **کبانً** (2:238-39) کوئی بھی ایسا شعبہ، کوئی بھی ایسا مقام نہیں کہ جس میں تم اس چیز کو نظر انداز کر دو کہ تم **قٰنتین** نہیں رہے۔ خوف ہے تو خوف کی حالت کے اندر **قٰنتین** رہو۔ **فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم تکونوا تعلمون** (2:239) جب سکون کا عالم ہو جائے تو اس طرح سے قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، ان کو سامنے لاؤ، جیسا کہ تمہیں بتایا گیا ہے لیکن زندگی یہ ہے کہ **فلا تموتن الا وانتم مسلمون** (2:132) زندگی کے آخری سانس تک ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے رہو۔ یہ کہا اور پھر کہا کہ **والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا** (2:240) بات پھر وہی آ گئی کہ یاد رکھو! جو تم میں سے مر جائیں اور پھر اپنے پیچھے بیواؤں کو چھوڑ جائیں۔ دیکھا آپ نے! اب ربط سمجھ میں آیا قرآن کا؟

ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی اس تصنیف کا مقام کیا ہے؟ اور خدا کیا کہتا ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو ایک تصنیف میں جتنی بھی برائیاں، معائب، نقاص ہو سکتے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ) وہ سارے خدا کی اس کتاب میں بتائے جاتے ہیں کہ یہ مجمل ہے، مبہم ہے، بات سمجھ میں نہیں آتی، ایک آیت کو سمجھنے کے لیے اٹھارہ علوم

چاہئیں۔اس کے اندر ربط نہیں ہے۔اندازہ لگائیے کہ ان کے ہاں یوں ہے کہ یہ ہر ایک کو اپنی اپنی Interpretition دے سکتی ہے' جس کو جو معنی چاہئیں اس میں سے نکال سکتا ہے۔سوچیے' عزیزانِ من! ویسے تو میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا کہ اگر میری کسی کتاب کے متعلق آ کر کوئی یہ کہے کہ تمہاری کتاب تو ایسی ہے۔صاحب! اس کے بعد میں اسے اُٹھا کے باہر پھینک دوں اور کبھی بھی اس کے بعد قلم ہاتھ میں نہ لوں کہ یہ کتاب ہے جس کی کیفیت یہ ہے اور جس کتاب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خالق کائنات' ہزار ہا لاکھوں سال کے سلسلہ رشد و ہدایت کے بعد ایک کتابِ عظیم دیتا ہے اور جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ ہم نے اپنی آخری تصنیف ہے جو تمہیں دے دی وہ جو کہا کرتے ہیں کہ

تو را کشید واو دست از قلم کشید

کہ یہ لکھا اور اس کے بعد قلم رکھ دیا کہ اب اس کے بعد اور کچھ نہیں دے سکتا۔اس کتاب کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ربط ہی نہیں ہے۔ہاں یہ صحیح کہا تھا کہ

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

یہ کہتے ہیں کہ اس میں ربط نہیں ہے یاللعجب!!

قران حکیم کا تو ایک ایک لفظ کائنات کے ایک ایک ذرے کی طرح ایک مالا کی شکل میں پیش کیا گیا ہے:

عزیزانِ من! جنہوں نے ربط دیکھے ہیں' انہوں نے تو کائنات کے اندر یہ کیفیت دیکھی ہے کہ وہ امریکا کے نیویارک میں بیٹھے ہوئے چاند پر اُترنے والوں سے وہ ربط قائم کرتے ہیں کہ باتیں بھی آپس میں ہو رہی ہیں' تصویریں بھی منتقل ہو رہی ہیں ربط کا تو یہ عالم ہے:

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

کائنات تو ربط کے اُوپر قائم ہے صاحب! یہ تو ربط کے سلسلے میں اگر ایک سیکنڈ کے ہزارویں کروڑویں حصے کے ٹائم میں' ایک ذرے کے کروڑویں حصے کے Space (جگہ) میں اگر کہیں بے ربطی ہو جائے تو سارا سلسلہ کائنات تہس نہس ہو جائے۔عزیزانِ من! یہ تو ربط سے سب کچھ چلتا ہے لیکن چونکہ ہماری اپنی بھی زندگی بے ربط ہے اسی لیے ہمیں ہر جگہ بے ربطی نظر آتی ہے۔یہ ہمارے ذہن کی بے ربطی ہے جس سے ہمیں اس میں ربط نہیں نظر آتا ورنہ

مرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے درد و صاف

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا

دراصل انسان کی اپنی مشرکانہ زندگی قرانی تعلیم کو بے ربط بنادیتی ہے:

کم بخت! رنگین پیمانہ لے کر کہتا ہے کہ شراب رنگین ہے۔ یہ تیرے پیمانے کی رنگت ہے جو اس میں چھلک گئی ہے۔ یہی پیمانہ مصفا لو' تم دیکھو' پھر اس کے اندر بے رنگی نظر آئے گی۔ اپنے اندر ربط پیدا کرو۔ ربط کیا ہے؟ یہ کہ توحید پر ایمان' ربط ہے۔ عزیزانِ من! شرک' بے ربطی پیدا کرتا ہے۔ ہزار بت کدہ دماغ میں رکھے ہوئے ہیں اور اس کے بعد ربط تلاش کر رہے ہیں۔ دو آقاؤں کے نوکر کی زندگی میں ربط نہیں رہتا۔ برادرانِ عزیز! میاں بیوی مزاج کے مختلف ہوں' نوکر بیچ میں اُلجھ کر پھنس جائے پھر اس غریب کی حالت دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔ سوچو! دن بھر اس کی زندگی کے ربط کو تلاش کرو۔ بے ربطی ہمارے اندر ہے۔ انجام ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اب یہاں اگر کوئی مجھے آ کر کہے' کسی مصنف سے کہے اور وہ ہوذرا کڑے دماغ کا' تو وہ تو بتھاڑ سجادے گا۔ وہ اللہ میاں ہے ''غریب کی جورو سب کی نوکر''۔

قرانِ حکیم کو بے ربط کہنے والوں نے ملت اسلامیہ کی زندگی کو صدیوں سے بے ربط بنا رکھا ہے:

جو جی میں آئے اس کتاب کو کہہ لیجیے لیکن عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے کہ جو جی میں آئے کہہ لیجیے۔ بات یہی ہے میرا تھپڑ' اس کا درد یوں محسوس ہوگا اس کی سوجن دکھائی دے گی۔ اُس کا پڑا ہوا جو تھپڑ ہے پھر قوموں کی قوموں کا وہ حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ عزیزانِ من! اس کی کتاب کو بے ربط کہنے والوں کی اپنی ساری زندگی بے ربط ہے۔ آپ کی ساری تاریخ بے ربطگی کا مجموعہ ہے۔

عزیزانِ من! بجز اس تھوڑے سے عرصے کے جس میں آپ کی زندگی میں توحید نے ربط پیدا کیا ہوا ہے۔

فرد قائم ربط باہم سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

انہیں خدا کی کتاب میں ربط نہیں نظر آتا۔ دیکھیے! آپ کو معلوم ہو گیا کہ ربط کہ ربط کیا تھا؟ یہ تو درمیان میں آیا ہوا ہے۔

پھر آ گیا کہ ہاں! وہ لوگ جو تم میں سے مر جائیں اور بیویوں کو چھوڑ جائیں۔ وہی بات جو پیچھے تھی پھر دہرائی جا رہی ہے۔ اب ربط سمجھ میں آ گیا کہ درمیان میں یہ کیوں اس چیز کو لایا ہے کہ Mechanically (میکانکی طور پر) ان قوانین کا اتباع نہ کرتے چلے جانا۔ **قوموا للہ قٰنتین** (2:238) تمہیں یہ توانائیاں ایک خاص مقصد کے لیے دی ہوئی ہیں' اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں سرف کرو ورنہ اسراف ہو جائے گا۔

انسان کو اس کی یہ صلاحیتیں اور توانائیاں اسے معراج کمال تک پہنچنے کے لیے عطا کیں ہیں:

وصیةً لازواجھم متاعًا الی الحول غیر اخراج (2:240) یہ تو یہ ہے کہ ورثے میں ان بیوہ کا حصہ ہوتا ہے۔ عہ کہا تھا

کہ باہمی حسنِ سلوک کو نہ بھلاؤ۔ وہ تو جب اس کو ملے گا' ملے گا' کہا کہ سال بھر کے لیے بیوہ کے لیے سامانِ زندگی کا انتظام کر کے جاؤ' علاوہ اس حصے کے جو اس کو ملنا ہے۔ اب یہ اپنا انتظام کہاں کرے گی' پتہ نہیں کہ وہ زمین تم نے ٹھیکے پہ دے رکھی ہوئی ہے' اگلے سال جا کر دانے آئیں گے۔ یہ کل ہی بے سہارا ہو جائے گی' بے آسرا ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! ایک ہی چیز یاد رکھئے! کہ قرآن کسی انسان کو زندگی میں بے سہارا نہیں ہونے دینا چاہتا کہ جونہی کوئی بے سہارا ہوا' اس کا شرفِ انسانیت گرا۔ وہ بیوہ کو محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا کہ کچھ بگڑا ہے۔

خدائے رحیم کسی انسان کو بھی بے سہارا ہوتے نہیں دیکھ سکتا

جس انداز سے یہ گھر میں آج جی رہی ہے' کہا کہ وصیت کر کے جاؤ کہ سال بھر تک کم از کم اسی شکل کے اندر رہے گی۔ خود نہ رہنا چاہے اور بات ہے۔ **فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف** (2:240) خود چلی جانا چاہتی ہے' ٹھیک ہے' تم پہ اس کا کوئی الزام نہیں ہے اس کا کوئی حرج نہیں ہے اور پھر اپنے متعلق جو کچھ وہ سوچتی ہیں' ٹھیک ہیں' وہ مختار ہیں' تم ان کے حاکم اور داروغہ نہیں ہو۔ **واللہ عزیز حکیم** (2:240) عزیز تو یہ ہے کہ اتنا قانون دیا ہے کہ فرض ہے کہ وہ وصیت کے اندر یہ لکھ کر جائے۔ باندھ نہیں دیا ہے کہ مجبوری ہے کہ سال بھر تک کے لیے وہ اسی کوٹھڑی کے اندر بندھی ہے۔ حکیم ہے' قانون حکمت پہ مبنی ہے۔

عدل کے اور فضل کا حکم اطاعت کی شکل میں تسلیم کرنا ہوگا

اگر وہ چاہتی ہے' چھوڑ کے چلی جائے۔ دیکھا! یہاں عزیز اور حکیم کیسے آئے ہیں۔ **وللمطلقٰت متاع بالمعروف حقًا علی المتقین** (2:241) اور اسی طرح سے یاد رکھو! مطلقہ کے لیے قاعدے کے مطابق سامانِ زندگی مہیا کرو۔ **حقاً علی المتقین** (2:241) یہ خدا کی طرف سے متقی کے لیے فریضہ ہے۔ دیکھا! قرآن کی رو سے تعلقات کا منقطع کس شکل میں ہو رہا ہے۔ جو مہر ہے وہ تو دینا ہی تھا' وہ دیا۔ جو کچھ تم نے اس کو دیا تھا' کہا کہ اس میں سے کچھ نہیں لینا اور پھر آگے بات آ گئی۔ یہ تو ہو گیا عدل Justice (عدل) کا تقاضا جو Due تھا' وہ دے دیا۔ کہا کہ نہیں! فضل بھی اس کے ساتھ کرو۔ یہ فضل کرنا بھی **حقًا علی المتقین** (2:241) ہے قانون کی اطاعت کا اگلا درجہ آتا ہے کہ صرف Formality (رسم) نہیں ہوتی' قانون تو اتنے میں ہی پورا ہو جاتا ہے۔ متقین کے اُوپر فریضہ ہے **کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیٰتہ لعلکم تعقلون** (2:242)۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب مبہم ہے' اپنا دعویٰ واضح نہیں کرتی۔ خدا کہتا ہے کہ اس طرح سے ہم تمہارے لیے اپنے احکام کو واضح کرتے ہیں تا کہ تم عقل و فکر سے کام لے کر سمجھ جاؤ کہ یہ بات کیا ہوئی؟

جنت کا حصول اور اس کے نظارے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے بغیر دکھائی نہیں دے سکتے:

عزیزانِ من! بات کہاں سے شروع ہوئی تھی؟ یہ جو قوانین تھے پیچھے سے ازدواجی زندگی کے بات چلی آ رہی تھی کہا کہ **ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم** (2:241) کیا سمجھتے ہو تم! کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے' یہ کہنے سے کہ ہم اس کے محبوب کی اُمت ہیں اور تم ان لغزشوں میں سے نہیں گزرو گے' ان دشوار گزار گھاٹیوں میں سے نہیں گزرو گے کہ جنہوں نے کیفیت یہ پیدا کر دی تھی کہ تزلزل آ گیا تھا رسولوں کی اور ان کی جماعتوں کے اندر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کے بغیر ہی گزر جاؤ گے اور پھر اس کے بعد اس نے یہ چیز کہی کہ **کتب علیکم القتال** (2:215) یہ ان تسبیح پھیرنے والوں کی اور نفل پڑھنے والوں کی جماعت نہیں ہے' یہ وہ جماعت ہے کہ ان میں سے ہر شخص کو جنگ کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آگے یہ آیا تھا یاد رکھو! یہ چیز وہ قوم کر سکے گی جن کے گھر کی زندگی کے اندر سکون ہوگا۔ ورنہ وہی جنگ کے لیے جتنی تمہاری قوت ہے ''اوگھر ای صرف ہو جائے گی نہر دے پار جا کے کی کرو گے ❶؟'' وہ تو لڑائی کرنے کی جو قوت وصلاحیت ہے جسے اس نے **قنتین** کہا ہے کہ اسے اس مشکیزے کے اندر محفوظ رکھو۔ ''او جے روز ای مشکیزہ گھر اچ ڈلدا رہوے ❷'' وہ 1965ء کی جنگ میں وہاں جا کر کیا کھلے گا۔ یہاں یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! یہ چیز وہ قوم کر سکے گی جس کی روزمرہ کی زندگی اور روزمرہ کی زندگی میں گھر کی زندگی میں سکون ہوگا' وہ قوم ہے جن کے اندر اعتدال ہوگا (متوازن شخصیتیں) Balanced Personalities ہوں گی۔ یہ وہ قوم ہے جو اپنے معاملات حکمت سے طے کرے گی' سمجھ بوجھ سے طے کرے گی اور جب میدانِ جنگ کا وقت آ جائے گا تو پورے سکونِ قلب سے وہاں جائے گی۔ وہاں جا کر بھی اپنا دماغ نہیں کھودے گی' ہوش وحواس نہیں کھودے گی۔ پتہ ہے آپ کو قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو قریش کو شکست ہوئی ہے تو اس کے بعد یہ اپنے گھر میں جا کر بیٹھیں گے' کمیٹیاں بٹھائیں گے' یہ انکوائری کمیٹی کے بعد سوچیں گے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ کہتا ہے کہ کوئی کچھ کہے گا' کوئی کچھ کہے گا لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ یہ وہ قوم تھی **انھم قومًا لا یفقھون** (59:13) جنہوں نے میدانِ جنگ میں غور وفکر سے کام نہیں لیا تھا۔

---

❶ وہ گھر میں ہی خرچ ہو جائے گی' نہر کے اس پار جا کر کیا کرو گے۔

❷ اگر قوت وصلاحیب کا وہ مشکیزہ روز ہی گھر میں ڈالا جاتا رہے تو۔

قرآنی تعلیم کے مطابق گھریلو زندگی کا سکون ہی جنگ میں فتح کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ جنگ کا حصول تو جہاد سے مشروط ہے:

میدانِ جنگ میں، جہاں خالصتاً کہتے ہیں کہ جذبات ہی کھیلتے ہیں لیکن ایک اچھے جرنیل سے پوچھئے تو وہ کہتا ہے کہ اگر وہاں بھی کسی وقت جو جذبات ہیں، غالب آ جائیں تو شکست ہو جاتی ہے۔ہم نے کہا تھا کہ میدانِ جنگ میں جو تفقہ سے کام لینے والے ہیں، وہ کامیاب ہوتے ہیں۔تفقہ سے کون کام لے گا؟ وہ جس کا ماغ متوازن ہوگا۔جس کے گھر میں سکون نہیں، جس کے معاشرے میں سکون نہیں اس کا دماغ متوازن نہیں رہے گا۔ وہ تو سال بھر آپس میں لڑتا رہتا ہے اور جتنا زیادہ یہ عبادت گزار بنتا ہے، اتنا ہی زیادہ لڑنے والا ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ جن کو اپنی ان Formal (رسمی) عبادتوں کا زعم ہوتا ہے، ہر وقت ان کے ماتھے کے اُوپر جفر کے نقشے بنے ہوئے ہیں اور روزوں میں تو جیسا اور بھی کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔جیسا میں نے عرض کیا تھا گرمی کے زمانے کے روزے صاحب! عصر کے وقت یہ فقرہ تو آپ اکثر سنتے ہوں گے کہ ''مینوں ایس ویلھے کچھ نہ کہیں، میں روزے نال ہیگاں [1] '' جن کی عبادتیں ان کو یہ کچھ کر دیتی ہوں کہ جو قریب سے جائے وہ اس کو شاک مارے۔عزیزانِ من! ان سب چیزوں کو قرآن نے جتنی کہی تھی، ان سب کا مقصد یہ ایک متوازن شخصیت Balanced Personality کا تھا اور وہ شخصیت وہیں پیدا ہو سکتی ہے جہاں گھروں کے اندر سکون کی زندگی ہو۔یہی وجہ تھی اور ہے کہ قرآن نے جنت میں داخلے کے متعلق قتال کو جہاد کو شرط قرار دیا اور جہاد میں کامیابی کے لیے معاشرے میں عائلی زندگی کے اندر سکون کو، پہلی شرط قرار دیا۔

---

[1] مجھے اس وقت کچھ نہیں کہنا، میں تو روزے سے ہوں۔

موت سے ڈرنے والی قوم جہاد کے سلسلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی:

جب یہ کچھ کہہ دیا تو کہا کہ آؤ! اب تمہیں بتاؤں اور تم ایک واقعہ کے اوپر غور کرو کہ ایک تھی قوم۔وہ قوم کون سی تھی؟ سوچیے! صورت بگیں عالم نہ پرس۔کہا کہ کیفیت یہ تھی کہ **خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت** (2:243) قرآن عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کو وہاں سے ملایئے گا جہاں اس نے کہا تھا کہ جنت میں جانے کا طریق میدانِ جنگ میں ہے، میدانِ جنگ میں کامیابی گھروں کا سکون ہے۔کہا کہ اس کے مقابلے میں آؤ، تمہیں بتائیں کہ ایک قوم تھی، ہزاروں کی تعداد میں تھی۔ دوسرے اُٹھے اور انہوں نے مار مار کر ان کو گھروں سے نکال دیا۔ یہ بھاگ نکلے۔کیا بات تھی؟ انہی جیسے وہ تھے، یہ بھی انہی جیسے تعداد میں بھی کچھ کم نہیں تھے، ہزاروں کی تعداد تھی ان کی، پھر یہ کیا ہوا؟ کہ وہ جو اُٹھے ہیں تو یہ ان کے سامنے بھیڑ بکریوں کی طرح ''میں میں'' کرتے ہوئے، بھاگ ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ میں تنقیص اور تنقید نہیں کرتا، برادرانِ عزیز! تقسیم کے زمانے میں ہمارے ہاں بھی یہی ہوا تھا کہ بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ وہاں جم کر کیوں نہ کھڑے ہوئے؟ کیا بات تھی؟ دو الفاظ ہیں عزیزانِ من! کہا کہ **حذر الموت** (2:243)

موت سے ڈر کر بھاگ رہے تھے' موت سامنے سے آ رہی تھی۔

موت تو آتی ہی اسے ہے جو موت سے ڈرتا ہے:

موت تو انسان کا سایہ ہوتی ہے' جو اس سے بھاگتا ہے اس کے پیچھے تو یہ چلتی ہے۔ جو اس کو پکڑنے کے لیے بھاگتا ہے' یہ اس کے آگے آگے دوڑتی ہے۔ جو موت کو پکڑنے کے لیے آتا ہے' اس کو تو موت آتی نہیں ہے۔ **ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات** (2:159) تمہارے معیاروں کے مطابق مرا ہوا نظر بھی آئے تو مرا ہوا نہیں کہو' تم مرے ہوئے ہو' وہ زندہ ہے۔ **حذر الموت** (2:243) موت کے ڈر سے بھاگ اُٹھے۔ ہزاروں کی تعداد کے اندر' موت سے ڈرے تو **فقال لھم اللہ موتوا** (2:243) خدا کے قانون نے کہا کہ مر جاؤ۔ موت سے ڈرنے والے کو موت آ جاتی ہے۔ بڑا عظیم راز' عزیزانِ من! بیان ہو رہا ہے۔ زندگی اور موت اس کا نام ہے۔ جو موت سے ڈرتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی ائیڈیالوجی یہ ہے کہ موت جسم کو آتی زندگی کو نہیں:

قرآن نے جو آپ کو نصب العین حیات دیا' قرآن نے جو آپ کو آئیڈیالوجی دی' وہ آئیڈیالوجی یہ ہے کہ یاد رکھو! انسان طبعی موت سے بھی نہیں مرتا' اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے' موت آتی ہی نہیں ہے۔ زندگی جوئے رواں است رواں خواہد بود۔ یہ تو طبعی جسم ہے جو دیکھنے والوں کے نزدیک مرا ہوا ہوتا ہے۔ جس کا وہ جسم ہوتا ہے وہ زندہ ہوتا ہے۔ وہ تو شاید ہنس رہا ہو ہمیں دیکھ کے کہ ''اینہاں پاگلاں دی مت کی ماری گئی اے' اے رون کیوں ڈئے ہوئے نیں❶؟'' اسے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہوگی کہ یہ رو کیوں رہے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ آؤ' تمہیں بتاؤں کہ مرتا کون ہے؟ وہ جو بظاہر تمہارے نزدیک زندہ ہوتا ہے' وہ موت سے ڈر کر بھاگ رہا ہوتا ہے۔ یہ ہے مرنے والا' یہ ہے وہ مردہ۔ **فقال لھم اللہ موتوا** (2:243) ان سے جب یہ کہا' قسمت نیک تھی' بات سمجھ میں آ گئی' موت سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے موت کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جونہی کھڑے ہوئے تو **ثم احیاھم** (2:243) ہم نے زندگی عطا کر دی۔ دیکھا! آپ نے کہ موت و حیات کا راز کہاں ہے کہ انہیں زندگی عطا ہو گئی **ان اللہ لذو فضل علی الناس** (2:243) او بھئی! ہم تو انسانوں کو نہیں مارنا چاہتے۔ ہم نے تو جان دی تھی۔ کیا بات کہہ گیا ہے اقبال (1877-1938)

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند ❷

خدا تعالیٰ کی ذات بڑی بلند ظرف ہوتی ہے:

خدا کم ظرف نہیں ہے کہ تمہیں اس نے جان جیسی چیز دی تو دینے کے بعد کہ ''سٹو میرے پیسے❸'' وہ یہ نہیں کہے گا۔ پھر وہ دوبارہ

نہیں لے گا۔ جانے کہ بخشند ایک دفعہ چیز دے دی' دیگر نگیرند پھر وہ اسے واپس نہیں لیتا۔

آدم بمیرد از بے یقینی ❷

(زبورِ عجم 1948 ص 164)

---

❶ ان پاگلوں کی ''مت'' (عقل' سمجھ بوجھ) کیوں ماری گئی ہے' یہ رو کیوں رہے ہیں؟

❷ جو زندگی کہ آدمی کو عطا کر دیتے ہیں' واپس نہیں لینے۔ آدمی اگر مرتا ہے تو بے یقینی کی وجہ سے مرتا ہے۔

❸ پھینکو میرے پیسے۔

انسان تو اپنی بے یقینی سے مرجاتا ہے' وہ تو جان واپس نہیں لیتا۔

ان اللہ لذو فضل علی الناس (2:243) ہم تو نوعِ انسانی کے اُوپر بڑے صاحب فضل و کرم واقع ہوئے ہیں۔ یہ جان دینے کے بعد واپس لے لینا تو کہا ہے کہ کسی سخی کا کام نہیں ہے' ہم واپس نہیں لیتے۔ **ولکن اکثر الناس لا یشکرون** (2:243) مصیبت یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو اس بات کی قدردانی نہیں کرتے سپاس گزاری نہیں کرتے بات نہیں سمجھتے ہیں کہ انسان مرتا کس طرح سے ہے۔

جہاد کا فلسفہ دوسروں پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ عالم گیر سطح پر ظلم کو مٹانا ہے:

یاد رکھو! آؤ تمہیں زندگی کا راز بتائیں یہ ہے کہ **وقاتلوا فی سبیل اللہ** (2:244) جنگ کے لیے لیکن ہر جنگ کے لیے نہیں' مظلوموں' کمزوروں اور ناتوانوں کی غصب اور Exploite (سلب و نہب) کرنے کے لیے نہیں' محکوم قوموں کے جسم سے خون کے قطرے نچوڑنے کے لیے نہیں بلکہ **قاتلوا فی سبیل اللہ** (2:244) اب تو آپ کو معلوم ہوگا' برادرانِ عزیز! کہ قرآن جب ''سبیل اللہ'' کہتا ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ یعنی خدا کی راہ میں اگر کسی فرد کے فائدے کے لیے' کسی خاندان' قوم' گروہ' نسل کے فائدے کے لیے آپ کچھ کرتے ہیں تو وہ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ ان کے لیے ہے۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم:

جب آپ کوئی چیز نوعِ انسانی کی عالمگیر منفعت کے لیے کرتے ہیں تو خدا کہتا ہے کہ یہ تم نے ہمارے لیے کیا ہے۔ کہا ہے کہ **قاتلوا فی سبیل اللہ** (2:244) خدا کی راہ میں' نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے جنگ کے لیے اُٹھو' یہ میرا ترجمہ نہیں' میرا مفہوم نہیں' قرآن نے یہاں سورۃ حج کے اندر (22:39)۔ میں سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہاں! اب تمہیں بھی اجازت ہے

کہ تم میدانِ جنگ میں نکل آؤ۔ (22:39) کا ہے کے لیے نکل آؤ؟ کہا کہ اگر ہم یہ کچھ نہ کرتے رہیں تو سرکش جماعتیں اتنی چڑھ دوڑیں کہ عیسائیوں کے یہ گرجے' یہودیوں کے سومعنے' راہبوں کی کوٹھڑیاں' تمہاری مسجدیں' یہ عبادت گاہیں' یہ پرستش گاہیں' کوئی بھی محفوظ نہ رہیں۔ (22:40) وہ مظلوم بستی کے رہنے والے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے خدا! ان ظالم بستی والوں کے ہاتھوں سے نجات کی کوئی شکل پیدا کر' اپنے ہاں سے کوئی ہمارا مددگار بھیج۔ (4:75) یہ پکار رہے ہیں' فریاد کر رہے ہیں۔ قرآن نے وہاں کہا ہے کہ تم سنتے نہیں ہو' یہ ہمیں پکار رہے ہیں اور تم چپکے سے بیٹھے ہوئے ہو۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے جی! کہ پکار تو آپ کو رہے ہیں۔ کہا کہ جو مظلوم ہمیں پکارتا ہے اس کی پکار کو ہمارا لشکر سنتا ہے۔ تم حزب اللہ ہو۔ عزیزانِ من! یہاں بھی جب مملکت کے اوپر خطرہ آتا ہے اور کوئی خطرے کے لیے پکارتا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ اس خطرے کی پکار کا جواب کون دیتا ہے؟ وہ جو آپ کا حزب دیتا ہے' آپ کے ساتھی ہوتے ہیں' آپ کے جیوش ہوتے ہیں' وہی اُٹھتے ہیں' وہ نہر [1] پہ کھڑے ہو کر جواب دیتے ہیں۔ تو کہا ہے کہ کیا سنتے نہیں ہو وہ ہمیں پکار رہے ہیں' تم بیٹھے ہوئے ہو۔ یہاں کہا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ! تم اتنی قوتوں کے مالک ہو تم چاہو تو تمہارے ایک اشارے سے وہ پورے کا پورا ملک بھسم ہو کر رہ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یوں نہیں اُڑا کرتا۔ ہر مملکت نے فوج رکھی ہوتی ہے۔ ہماری مملکت میں بھی فوج ہے' جماعت مومنین! تم ہماری فوج ہو۔ تمہارے ساتھ ہمارا وعدہ ہے وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:138) جس فوج کے ساتھ ہم اور ہمارے پیغامبر ہوں گے وہ فوج یقیناً غالب آئے گی' یہ ہمارا وعدہ ہے مگر کرنا تم نے ہے وہاں جا کر۔ اس لیے کہا کہ **قاتلوا فی سبیل الله** (2:44) اور یہ بھی کہ **واعلموا ان الله سمیع علیم** (2:244) وہ فریادوں کو سننے والا' دلوں کی حالتوں کو جاننے والا ہے اور جان ہی کی نہیں اس کے علاوہ اور بھی ضرورت پڑا کرتی ہے۔ **من ذا الذی یقرض الله قرضًا حسنًا فیضٰعفه له ضعافاً کثیرةً** (2:244) اس کے لیے بطور قرض خدا کو مال دو' کیا بات ہے!! ٹیکس نہیں مانگتا' زبردستی وصول نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ قرض دو' قرض حسنہ دو۔ دیکھئے بھئی! ہم سے معاملہ کر کے دیکھو' ہم تو ایک پائی بھی اپنی اصل پہ لے لیں گے تو حرام ہے اور قرضِ حسنہ جو دیا جائے گا اس کے لیے کہا کہ ہم تمہیں کتنا ہی زیادہ گنا بڑھا کر واپس دیں گے۔ ربوا کے لیے وہاں (3:129) میں **اضعافاً مضٰعفة** آیا ہے اور شدت سے حرام قرار دیا ہے۔ انسان' قرض کے طور پر انسان کی مدد کرتا ہے۔ اس سے اگر اصل سے زائد ایک پائی بھی لیتا ہے تو قرآن نے جرمِ عظیم کہا ہے' یہ خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ کہتا ہے کہ قرض دو' ہمیں قرض دو' دیکھو! ہم کتنا بڑھا چڑھا کر تمہیں دیتے ہیں۔ وہ کیسے بڑھا کر دیتا ہے' یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کے لیے سنیے! جگالی کرنے والے جانوروں کو آپ نے دیکھا ہے۔ خوراک کی ان کو ضرورت ہوتی ہے' چلتے چلتے' بھاگتے بھاگتے' ادھر منہ مارا' اُدھر منہ مارا' ادھر منہ مارا۔ اگر ان کی کیفیت یہ ہو کہ منہ مارا اور اس کو ہماری طرح سے نوالا چبایا' چبا کے نگلا اور نگلنے کے بعد پھر دوسرا نوالا منہ میں لیا تو وہ تو بیچارے بھوکے مر جائیں۔ پیچھے وہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی تو صورت یہ

ہوتی ہے کہ یہاں سے وہاں سے لے کر وہ منہ میں ڈالتے جاتے ہیں لیکن یہ جو اس طرح سے اندر ڈالتے ہیں' وہ جزوِ بدن نہیں بن سکتا' وہ اسٹور میں صرف جاتا ہے۔ پھر وہ بیٹھ جاتے ہیں' اس اسٹور میں سے پھر اندر سے آ وو کر کے' ایک بڑا سا گولہ لیتے ہیں' منہ میں رکھتے ہیں' پھر اس کو وہ چباتے ہیں' پیستے ہیں اور اس پسنے کے بعد' وہ جو اتنا سا گولا' بظاہر جس میں سے کچھ ذرا سا نکلنا تھا' یہ جو اس کے ساتھ زبان کا لعاب بھی ملتا ہے' پِستا ہے' یہ سارے کا سارا جزوِ بدن بنتا ہوا چلا جاتا ہے۔

---

❶ یہ 1965ء کی پاک و ہند جنگ میں اس نہر (بی آر بی) کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے قریب بہہ رہی ہے۔

خدا کو قرض دینے کا مفہوم اور پھر اس کا ماحصل

یہ جو عمل ہے اس قسم کے خام چارے کو اس طرح جگالی سے پیس کر جزوِ بدن بنانا' اسے عربی زبان میں قرض کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ہمیں دو یہ تمہارا خام مال ہے' پڑا ہوا ہے' کسی کام ہی نہیں آ رہا تھا' یہ تو وہ گھاس ہے' جو لے کر تم نے جمع کر لیا' ہمیں دو۔ ہم جگالی کرنے کے بعد اس کو اس شکل میں تمہیں واپس دیں گے۔ دیکھیں وہ اسی معدے میں واپس جاتا ہے لیکن اب وہ جو گیا ہے' پہلے جانے میں اور اس جانے میں آپ نے دیکھا ہے کہ کتنا فرق پیدا ہو گیا۔ وہ وبال جان تھا بوجھ تھا۔ اگر وہ ویسے کا ویسا ہی رہتا جانور بیمار ہو جاتا۔ یہ جو دوبارہ واپس اس کو دیا ہے' اس میں وہ اس کا ذرہ ذرہ جزوِ بدن بن گیا۔ کہا کہ قرض ہمیں دے کر تو دیکھو' پھر دیکھو کہ ہم جو تمہیں واپس دیتے ہیں تو پھر کس شکل میں واپس دیتے ہیں۔ یہ خام بوجھ تھا' واپس ملے گا تو یہ سارے کا سارا معاشرہ کے پیکر کے اندر خون کی طرح رواں دواں چلتا جائے گا۔ ہمیں دے کر تو دیکھو۔ اسے کہتے ہیں عزیزانِ من! قرضِ حسنہ۔

ہمارے ہاں قرض حسنہ کی نوعیت واپسی کے تصور سے لاتعلقی ہے:

جیسا کہ میں نے شاید پہلے بھی ایک دفعہ بتایا تھا' ہمارے ہاں بھی قرضِ حسنہ دیا جاتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس قرضِ حسنہ کی Definition (تعریف) کیا ہے؟ کہ جس نے قرض دیا ہے ''او واپس منگے تے اگوں ہنس دتا جاوے' اینوں کیندے نیں قرضِ ہنسا' او بھئی او دے! ہیں ہیں ہیں' کی کرنا پیا ایں؟ قرضِ ہنسا ہے ❶ جی''' یعنی لے کر دینے کی نیت ہی نہیں ہے' پھر اس کے بعد بینک سے لیا ہوا ہے' تو پتہ ہے کہ مہینے کے بعد چھ پرسنٹ دس پرسنٹ پڑ جائے گا۔ مہاجن سے لیا ہے' اس کا پتہ ہے' پٹھان کا لیا ہوا تو آپ کو پتہ ہی ہے پھر لیکن ایک یہ قرضِ حسنہ ہوتا ہے جس بیچارے نے اس کے اوپر ایک پائی نہیں لینی تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ صاحب! مانگے تو قرض ہنسا ہوتا ہے وہ۔ خدا کا قرضِ حسنہ اس طرح سے واپس ہوگا۔ عزیزانِ من! دو الفاظ آئے ہیں **واللہ یقبض** (2:245) لوگ بھی لیتے ہیں

استبداد والا بھی لیتا ہے' قبضہ کرتا ہے' لیتا ہے۔ خدا بھی لیتا ہے واللہ یقبض (2:245) لیتا ہے۔ یہاں تک تو یہ ٹھیک ہے ویبصط (2:245) اور بڑھا کر لوٹا تا ہے۔ لیتا وہ بھی ہے۔ واللہ یقبض ویبصط (2:245) لیتا ہے' بڑھا کر لوٹا تا ہے۔ والیہ ترجعون (2:245) اور بات یہ ہے کہ تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھتا ہوا چلا جاتا ہے۔

وہ قوم جو خدا کو قرض حسنہ نہیں دیتی وہ آخر کار وہ تباہ ہو جاتی ہے

یاد رکھو! زندگی چاہتے ہو' اپنے آپ کو ہر وقت میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تیار رکھو اور اس سے پیشتر امن کی صورت میں اپنا مال اس مقصد کے لیے صرف کرتے چلے جاؤ۔ جو دیتے چلے جاؤ گے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ضائع کر لیا گیا۔ کیونکہ ایسی اسامی کو قرض دے رہے ہو جو بہت کچھ بڑھا کر لوٹائے گا۔ زندگی کا راز اسی کے اندر ہے۔ یہ مال جو اس وقت یا کاغذوں کی شکل میں یا دھات کے ٹکڑوں کی شکل میں تمہارے پاس ہے' معاشرے کے لیے جزوِ حیات بن کر تمہاری طرف لوٹ آئے گا۔ ایسا کرو تو زندگی مل جائے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو کیا ہوگا؟ کہا کہ آؤ تمہیں تاریخ میں سے ایک واقعہ سنائیں کہ جنہوں نے ایسا نہیں کیا تھا ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے پاس 246 ویں آیت سے شروع ہوگا اور آگے جائے گا۔ یہ بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے' اسے ہم آئندہ لیں گے۔ آج درس کا وقت ختم ہو گیا۔

---

❶ وہ واپس مانگے تو سامنے سے ہنس دیا جائے۔ اسے کہتے ہیں۔ قرض ہنسنا۔ ارے بھئی! اس کی ادائیگی کرو۔ ہیں ہیں ہیں ارے بھئی! کیا کر رہے ہو؟ جی! یہ قرض ہنسنا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

انچاسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3) (آیات 246 تا 247)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا
تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا
وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى
يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 22 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے درس کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 245 آیت میں پہنچ چکے ہیں۔ آج البقرۃ کی آیت 246 سے آغازِ کلام ہوگا۔ (2:246)

جنت حاصل کرنے والوں کی عملی زندگی کی کیفیت اور ان کی تگ و تاز کی نوعیت:

سابقہ آیات کے سلسلہ کلام میں بات اس سے شروع ہوئی کہ ام حسبتم ان تدخلل الجنة و لما یاتیکم مثل الذین خلوا من

من قبلکم مشتهم الباسآء بعثه وضرآء و والضراء وزلزلوا حتٰی یقولوا الرسول والذین امنوا معه متاع نصر الله الآ ان نصر الله قریب (2:214) کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یہ کہہ دینے سے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ؐ تم جنت میں جا پہنچو گے؟ حالانکہ تم ابھی ان دشوار گزار وادیوں میں سے گزرے ہی نہیں جہاں اس سے پہلے انبیاء کرام اور ان کے متبعین کی جماعتوں کے ساتھ یہ کیفیت گزری کہ مصائب و آلام کے ہجوم نے ان کو جو آ کر گھیرا ہے تو زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ زلزلہ انگیز مصائب میں گھرے اور اتنی شدت اختیار کر گئے کہ بے ساختہ زبانوں پہ آ گیا کہ اے اللہ! جس مدد کا وعدہ ہم سے کیا جا رہا تھا' وہ کب آئے گی۔ شدتِ آرزو سے یہ چیز دعا بن کر لبوں پہ آئی اور اُدھر سے آواز آئی کہ اطمینان رکھو۔ تمہارے استقامت' تمہارے صبر کی وجہ سے ابھی ابھی وہ مدد آیا چاہتی ہے۔ ایک جماعت تو یہ تھی جنت میں جانے والوں کی۔

مرتا وہ ہے جسے جہانِ فردا کی زندگی پہ یقین نہیں ہوتا:

اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت کا ذکر ہوا ہے کہ **الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت** (2:243) تو تم نے اس قوم کی' اس گروہ کی' اس جماعت کی' حالت پہ بھی غور کیا کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب ذرا سا خطرہ سامنے آیا تو ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ بھیڑ بکریوں کی طرح گھروں سے نکل کر بھاگ گئے۔ بھاگے موت کے ڈر سے۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی' جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں کہا تھا کہ موت تو سایہ ہے' اس سے ڈر کر بھاگیے تو یہ تمہارے پیچھے پیچھے آتی ہے اور اگر آپ اس کا تعاقب کے لیے پیچھا کرو تو آگے آگے بھاگتی ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ موت کے ڈر سے وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اُٹھے' گھروں سے ہی نکل کر بھاگ اُٹھے۔ **فقال لھم الله موتوا** (2:243) کہا کہ موت سے ڈر کر بھاگتے ہو تو لو! موت آ کر تمہیں چپک گئی۔ زندہ وہ رہتا ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی ہنسی اُڑاتا ہے۔

آدم بمیرد از بے یقینی ❶

مرتا وہ ہے جسے اپنی زندگی پہ یقین نہیں ہوتا۔ پھر جب وہ میدان میں کھڑے ہو گئے ثم احیاھم (2:243) تو پھر انہیں حیاتِ تازہ مل گئی۔

---

❶ آدمی اگر مرتا ہے تو بے یقینی کی وجہ سے مرتا ہے۔

مکافاتِ عمل کے نزدیک معاشرتی طور پر مترفین کا انجامِ کار:

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کرتا ہے۔ اس اصول کی صداقت کے ثبوت میں تاریخ سے کوئی شہادت پیش کرتا

ہے۔ بات یہاں یہ پیش کی اور اس کی شہادت میں کہا کہ **الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسٰی** (2:246) موسٰیؑ کے بعد قوم بنی اسرائیل کی کیفیت یہ ہوگئی تھی اور یہ کیفیت بھی ان کے عوام کی نہیں تھی بلکہ **الی الملاء من بنی اسرائیل** (2:246) سردارانِ قوم کی کیفیت تھی اگر اور گہرائی میں جایئے تو بات سردارانِ قوم کی ہی نہیں ہے۔ قرآن بڑی گہری بات کہہ گیا ہے وہ مترفین، جو دوسروں کی کمائی پہ عیش بسر کیا کرتے تھے ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی۔ تن آسانیاں اور جہاد کی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے قرآن نے یہاں ایک ''ملا'' کا لفظ لاکر توجہ کا رُخ اس طرف موڑ دیا کہ یہ مجاہدین کی جماعت نہیں تھی، یہ مترفین کی جماعت تھی۔ انہی کی کیفیت یہ ہوتی ہے جو آگے بیان کیا گیا ہے کہ **اذ قالوا النبی لھم ابعث لنا ملکًا نقاتل فی سبیل اللہ** (2:246) انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ٹھیک ہے، ہم خدا کی راہ میں جنگ کریں گے۔ عام ترجمہ یہاں ''ملک'' کا کیا جاتا ہے کہ ہم پہ ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے۔ یہ بادشاہ مقرر کرنے کی بات نہیں ہے۔ بات تو اس نے صاف کر دی کہ ہم جنگ میں جانا چاہتے ہیں، جنگ میں جانے والی فوج کے لیے بادشاہ کی ضرورت نہیں ہوتی، کمانڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''ملک'' کے معنی صاحب قوت اور صاحب اقتدار ہوگا۔ حکومت میں صاحب اقتدار ہوگا تو وہ مثلاً کوئی سیکرٹری یا کوئی منسٹر ہوگا۔ آرمی کا ذکر ہوگا تو وہاں صاحب اقتدار، کمانڈر ہوگا۔ اس لیے انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم جائیں گے، میدانِ جنگ میں لڑیں گے، ہمارے لیے کوئی کماندار مقرر کر دیجیے۔ **قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا** (2:246) کہا کہ ہمیں معلوم ہے جس قسم کی تمہاری ذہنیت ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس وقت تو تم آگے بڑھ بڑھ کر یہ کہتے ہو کہ ہم جنگ کے لیے جائیں گے ہمارے لیے کماندار مقرر کیجیے۔ نظر آتا ہے کہ جب تک پہ جنگ فرض قرار دی تو اس کے بعد تم میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ کر چلے آؤ گے۔ اوّل تو جاؤ گے ہی نہیں اور اگر جانا پڑا تو تمہاری کیفیت یہ ہوگی کہ اس مقام پہ پہنچ جاؤ گے۔ عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے اس سے پیشتر بھی دو تین خطبوں میں بتایا تھا کہ **افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض** (2:85) پھر تمہاری کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم، ضابطہ قوانین خداوندی، کے کسی ایک حصے پہ ایمان لاتے ہو دوسرے حصے سے انکار کر دیتے ہو۔

روضوں کی طرح قرآن حکیم نے پوری امت پر جہاد کو بھی فرض کیا ہے

اس کی کیفیت یہ تھی کہ قرآن میں بعینہٖ ایک ہی الفاظ میں **کتب علیکم القتال** (2:216) بھی ہے کہ تمہارے اُوپر جنگ فرض کر دی گئی ہے، لازم کر دی گئی ہے، پوری کی پوری جماعت کے متعلق یہ چیز ہے اور انہی الفاظ میں **کتب علیکم الصیام** (2:183) ہے کہ تم پہ روزے فرض کر دیے گئے ہیں۔ اب اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ احکام کی شدت کا تو یہ عالم ہے، اتنی پابندی سے اس کے اُوپر عمل ہو رہا

ہے اور **کتب علیکم القتال** (2:216) کے لیے انہوں نے ایک الگ فوج مقرر کر دی ہے' وہ ہمارے لیے نہیں ہے **افتؤمنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض** (2:85) اس کے ایک حصے کے اُوپر تم ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ **فما جزآء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیوٰۃ الدنیا** (2:85) یاد رکھو! جو بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری ہوگی **ویوم القیٰمۃ اشد عذاب** (2:85) اور قیامت کے دن تو پھر پوچھو نہیں کہ کس قسم کا عذاب ہوگا۔ جس کی یہاں کی زندگی ذلت وخواری کی زندگی ہے' کیا قیامت میں اسے سرفرازی کی زندگی نصیب ہو جائے گی؟ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ ہے' ہم جانتے ہیں کہ اس وقت تو تم یہ مانگتے ہو' جب یہ فرض قرار دیا گیا تو اس وقت پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ جاؤ گے۔ **قالوا وما لنا الا نقاتل فی سبیل اللہ** (2:246) کہا کہ کیا کہا آپ نے سرکار؟ کیا ہو گیا ہے' ہمیں کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہیں کریں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ فی سبیل اللہ جنگ سے مراد قرآن کیا لیتا ہے؟ یہ کہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے' مظلوم کی مدد کرنے کے لیے' جہاں بھی تلوار اُٹھے گی وہ فی سبیل اللہ ہوگی۔ یہاں قرآن نے ان کے اس قول کو کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ **وما لنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا دیارنا وابنائنا** (2:246) آپ دیکھتے نہیں ہو کہ ہمیں کس طرح سے ہمارے گھروں سے نکالا گیا' ہمارے بال بچوں سے ہم کو جدا کر دیا گیا کیا' اس کے بعد بھی ہم خدا کی راہ میں لڑیں گے نہیں؟ دیکھا آپ نے خدا کی راہ کہاں آئی ہے؟ مظلوم ہو گئے' استبداد سے' گھر بار سے نکالے گئے بال بچوں سے الگ کر دیے گئے۔

قرآن حکیم نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے والوں کو ظالمین کہہ کر پکارا ہے:

مظلوم کی جنگ خود اس کی اپنی جنگ ہو یا اس کی حفاظت یا مدافعت کے اندر کوئی دوسرا تلوار اُٹھائے' وہ ہے فی سبیل اللہ جنگ۔ مظلوم کو کچلنے کے لیے اور زیادہ ضعیف تر کرنے کے لیے' جب قوت کا استعمال ہوگا تو وہ جنگ ہوگی فی سبیل الطاغوت۔ کہا کہ کیا ہو گیا ہے ہم کو' کیا ہم بالکل ہی ایسے گئے گزرے ہو گئے کہ ان حالات میں بھی ہم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نہیں نکلیں گے؟ کہا کہ **فلما کتب علیھم القتال تولوا الا قلیلاً منھم** (2:246) اور جب پھر ان کے اُوپر جنگ فرض قرار دے دی گئی' اعلانِ جنگ کر دیا گیا' انہیں میدانِ جنگ میں کہہ دیا' تو ہوا یہی جو ان کے نبی کو ان کے متعلق اندیشہ گزرا تھا۔ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے بجز ان کے اندر تھوڑے لوگوں کے۔ **واللہ علیم بالظالمین** (2:246) یہاں یہ ظالمین کا لفظ عجیب چیز آئی ہے۔ آپ دیکھئے ظلم کا لفظ قرآن میں کہاں کہاں پہ آتا؟ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ آنے والے' ظالمین کی شق کے اندر قرار دیے گئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ظلم کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ اس کے بنیادی معنی ہووتے ہیں ''جس مقام پہ ٹھیک کسی چیز کو ہونا چاہیئے' وہ وہاں نہ رہے'' تو ظلم ہو جاتا ہے۔ سپاہی کا

مقام یہ ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

قرآن حکیم میں فوج کے کمانڈر کو مخاطب کرتے ہوئے علیکم کی بجائے لکم کا لفظ استعمال کیا ہے

اسے دشمن کے مقابلے کے لیے جم کر کھڑے ہونا ہے۔قرآن نے صرف استثنا کی ہے تو سورۃ توبہ میں کہ وہ پینترہ بدلنے کے لیے یا اپنی جماعت سے ملنے کے لیے میدانِ جنگ سے ادھر اُدھر ہو۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔دشمن کو پیٹھ دکھا کر اگر بھاگ جاتا ہے' اس کا نام بھی ظلم ہے کہ جس مقام پہ اس کو رہنا چاہیے تھا یہ اس مقام پہ نہیں رہا۔میدانِ جنگ میں سپاہی اس مقام پہ نہیں رہا' وہ بھی ظالم ہے۔ CIvil Administraion میں انصاف کرنے والا اپنی کرسی پہ نہیں رہا تو وہ بھی ظلم ہے۔جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اگر وہ وہاں نہیں رہی ہے' یہ ظلم ہے۔**واللّٰہ علیم بالظالمین** (2:246) کہاں آیا ہے یہ حصہ؟ میدانِ جنگ سے سپاہی پیٹھ دکھا کر بھاگتا ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ ظلم ہے۔جس مقام پہ اسے کھڑا رہنا چاہیے تھا' وہاں نہیں رہا۔یہ تو قرآن نے آخری بات کہی کہ یہ انجام ہوا۔درمیان کی بات پھر آ گئی۔انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے لیے ایک کمانڈر مقرر کر دیجیے۔**وقال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا** (2:247) ان کے نبی نے کہا کہ قانونِ خداوندی کے مطابق تمہارے لیے طالوت کو کمانڈر مقرر کیا جاتا ہے۔کمانڈر خود ہی مانگا تھا۔آپ نے دیکھا کہ یہ کون تھے؟ یہ **ملا من بنی اسرائیل** (2:246) تھے۔اب بات یہاں سے واضح ہوگی۔**قالوا انٰی یکون له الملک علینا**(2:247) کیا بات ہے قرآن کی بات سامنے آتی ہے تو آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔**ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکًا** (2:247) عربی جاننے والے احباب جانتے ہیں لکم کا ''ل'' ہے' یہاں یہ کیا کر رہا ہے۔کمانڈر ہمیشہ کسی کے اوپر مقرر کیا جاتا ہے' حاکم ہوتا ہے' کماندار ہوتا ہے۔اس کے لیے عربی زبان میں ''علیکم'' آنا چاہیے تھا۔تمہارے اوپر اس کی ہم نے مقرر کر دیا ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں ''ل'' اس وقت آتا ہے جب کوئی چیز کسی کے فائدے کے لیے کی جائے۔اسے تمہارے فائدے کے لیے کماندار مقرر کیا جاتا ہے۔یہاں علیکم نہیں کہا قرآن نے یہاں ''لکم'' کہا۔وہ اگر کماندار مقرر کرتا ہے تو وہ فوج کے فائدے کے لیے ہوتا ہے' فوج پہ حکومت کرنے کے لیے نہیں ہوتا لیکن ان کی نگاہ ادھر نہیں گئی۔انہوں نے کہا کہ **قالوا انٰی یکون له الملک علینا** (2:247) یہ وہیں کھڑے ہیں' ذہنیت نہیں بدلی ہوئی ہے۔انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ جو کماندار آتا ہے' وہ ایک حاکم بن کر آتا ہے۔علینا ہمارے اوپر ایک مقرر کیا ہے۔کیا بات ہے قرآن کی' ''لکم'' او ''علینا'' کے فرق نے یہاں عجیب چیز پیدا کر دی ہے۔اعتراض یہ کیا کہ صاحب! اسے کس طرح سے کماندار مقرر کر دیا؟ کیوں بھئی! کیا نقص ہے میں؟ کہا کہ **ونحن احق بالملک منه**(2:247)

اس کے مقابلے میں، اس کمان لینے کے لیے ہم زیادہ مستحق ہیں، حقدار ہیں یہ اقتدار لینے کے لئے، یہ اختیار لینے کے لئے، یہ منصب لینے کے لئے، یہ بلند مقام لینے کے لیے۔ اچھا جی! آپ اپنے آپ کو زیادہ حق دار سمجھتے ہیں تو ذرا بتایئے تو سہی وہ خصوصیت جس سے آپ کا یہ استحقاق فائز ولازم آ گیا۔ کیا ہے یہاں، **الی الملا من بنی اسرائیل** (2:246) آیا ہے دیکھیے ان کا ما نتخاب کا معیار کیا ہے؟ کہا کہ **ولم یؤت سعةً من المال**(2:247) یہ تو غریب آدمی ہے، دولت مند نہیں ہے دولت مند کا بیٹا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ معیار آج ہی کا نہیں ہے، یہ شروع سے بات چلی آتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

قران حکیم میں بیان کردہ ابلیس وآدم کی داستاں انسانی نفسیات کی ہے ترجمان ہے:

یہ آج ہی کی بات نہیں ہے کہ دولت وجہ عزت، شرف، منصب اور اقتدار واختیار ہے، یہ کم بخت معیار تو شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے کہ آدم اور ابلیس کی بعثت تو ایک ہی دن ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی یہ آ گیا تھا۔ کہا کہ یہ مالدار نہیں ہے، بڑے زمین دار کا بیٹا نہیں ہے، دولت مند نہیں ہے۔ ایک ہی معیار ہے۔ یہی معیار نہیں ہے کہ یہاں منسٹر مقرر کیا جائے گا، نہیں! فوج کا کماندار بھی مقرر کیا جائے گا، اسے بھی صاحب مال ہونا چاہیے۔ ایک ہی معیار ہے جو قرار دیا جا رہا ہے۔ ذہنیت میں آپ دیکھتے ہیں کہ کتنا فرق ہے۔ خود **الی الملا من بنی اسرائیل** (2:246) اپنی خصوصیت بھی یہی ہے۔ اس لیے اپنے ہی طبقے سے چاہتے ہیں کہ فوج کا نظم ونسق بھی جس کے ہاتھ میں ہے، وہ انہی میں سے ہو، وہ بھی دولت مند طبقے میں سے ہونا چاہیے۔ کہا کہ اسے آپ نے کیسے کمانڈر مقرر کر دیا؟ یہ دولت مند نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پہلے دن سے، جب سے یہ ابلیس وآدم کی داستان شروع ہوئی ہے اس دن سے ذہن انسانی نے یہی معیار مقرر کیا کہ جو دولت میں بڑھ کر ہے، اسی کو حق پہنچتا ہے کہ ہر بلند سے بلند منصب اس کے حصے میں آئے۔

درشت میں ملنے والی مفت کی دولت سے انسان کی زندگی کا رُخ تباہی کی طرف مڑ جاتا ہے:

وراثت میں پا لینا یعنی وہ (2:246) تو پیدائش کے ساتھ ہی اس کے حصے میں لکھی جاتی ہے۔ تو یہیں سے تو قومیں پھر تباہ ہوتی ہیں۔ معیار یہ مقرر کیا کہ وہ **سعةً من المال** (2:246) ہو کسی اور Qualification کی ضرورت نہیں، کسی اور خصوصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ ''تے گل تے سیدھی جئی ہے جیہڑی اج وی کہی جاندی ہیگی اے، مشکل ہے فیر کہی جاندی اے ساڈی زبان اچ۔ معیار اے ہیگا پئی جیہدی کوٹھی وچ دانے اہدے کملے وی سیانے'' امیر آدمی کا جو کوئی بیٹا ہے اس کو کوئی بیوقوف نہیں کہہ سکتا: سبحان اللہ! کیا فرمایا آپ

نے صاحب' کیا بات کر دی ہے صاحب! یہ معیار **سعۃً من المال** ہے کہ دولت کتنی ہے صاحب؟ انجام آپ نے دیکھ لیا پھر جو کچھ ایسی قوموں کا ہوتا ہے۔

انسانی معیار کے مقابلے میں وحی کا عطا کردہ معیار لفظ بسطۃً کی صفات کا حامل ہوتا ہے:

اب اس کے برعکس معیارِ خداوندی ملاحظہ فرمایئے **قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم** (2:247) خدا نے اسے تم پر جو فضیلت دی ہے' اس کا تمہارے مقابلے میں انتخاب کیا ہے' تو اس کے لیے معیار کچھ اور تھا۔ وہ معیار یہ ہے کہ **وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم** (2:247)۔ فوج کا کمانڈر مقرر کیا جا رہا ہے۔ کہا کہ مقرر کیا جا رہا ہے کہ Physique (جسم) میں بھی Health (صحت) میں بھی' توانائی میں بھی' تنومندی میں بھی' یہ تم سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ یہ ہے کہ علم میں تم سے زیادہ بڑا ہوا ہے۔ دیکھا سپاہی کے لیے دو ہی خصوصیتوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ Physical سٹینڈرڈ (جسمانی معیار) ہے کہ یہ اس کے ساتھ وحشی نہیں ہے درندہ نہیں ہے کہ قوت ہی قوت ہے' اس کے ساتھ علم بھی موجود ہے: علم اور جسم یعنی A Sound mind in a sound body کہا کہ یہ ہے معیار۔ بہت زیادہ دیا ہے اس کو ہم نے اور پھر یہ عربی زبان ہے' عزیزانِ من! **بسطۃً** کے عام معنی تو یہی ہوتے ہیں کہ زیادہ فراوانی سے کسی چیز کو دینا عرب اس لفظ کو وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں کسی کی کوئی قوت' خصوصیت صرف اس کی اپنی ذات کے لیے نہ ہو' جب اس کا فائدہ دوسروں کو پہنچے تو وہاں وہ **بسطۃً** کہتے ہیں۔ آہاہا! یہ ہے معیار۔ کہا کہ یہ بڑا صاحب قوت ہے' صاحب علم ہے۔ ٹھیک ہے مخلص افراد ہو سکتے ہیں' علم بھی ہو سکتا ہے' توانائی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ ہے کہ جس کا علم اور اس کی توانائی صرف اس کی اپنی ذات کے کام آتی ہے' اپنوں کے کام آتی ہے' اپنے خاندان کے کام آتی ہے' اپنے گروہ کے' اپنے جتھے کے کام آتی ہے' میں کہتا ہوں قوم کے کام آتی ہے۔ **بسطۃً** کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز عالمگیر انسانیت کے لیے کام آتی ہو' اسے **بسطۃً** کہتے ہیں۔ اب جو خصوصیت ہے وہ یہ ہو گئی ہے۔ صرف زیادتی' علم و جسم کی نہیں' یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ وہ فراوانیاں ہوں جو اپنے سے بڑھ کر دوسروں کے کام بھی آئیں' اس کی یہ کیفیت ہے کہ **ومما رزقنٰھم ینفقون** (2:3) جو کچھ انہیں عطا کیا جاتا ہے یہ اسے دوسروں کے فائدے کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ یہ چیز **بسطۃً** کے ایک لفظ کے اندر آ گئی۔

لفظ میں یشآء کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں کے تراجم میں صدیوں سے رائج ہے:

کہا کہ **واللہ یؤتی ملکہ من یشآء** (2:247) یہاں یہ ٹکڑا ایسا آ گیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ شاید آج درس کا موضوع ہی یہ بن جائے اور اگر ایک درس میں بھی بات سمجھ میں آ جائے' صاف ہو جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ بڑا بنیادی' بڑا اہم مسئلہ ہے۔

قرآن کریم میں جہاں بھی من یشآء کے الفاظ آتے ہیں ترجمہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے' جسے اللہ چاہتا ہے' کر دیتا ہے' (مثلاً) جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے فقیر بنا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے پکڑ لیتا ہے' جسے چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے' جسے چاہتا ہے جہنم میں بھیج دیتا ہے' جسے چاہتا ہے جنت میں بھیج دیتا ہے۔ اس من یشآء کے چاہنے کے لفظ کے ترجمے نے پوچھو ہی نہیں کہ کیا قیامت برپا کی ہوئی ہے!

اوتھے کی پروا اے راکب اوتھے بے پروایاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہارنوں

وہ تو جی! بادشاہ ہے صاحب! قادر مطلق ہے' اوہنوں کی' ۔ اللہ الصمد کا ترجمہ ہی ''بے پرواہ'' کیا جاتا ہے۔ ذرا یہ تصور میں لائیے نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی قانون' نہ کوئی معیار' نہ کوئی خصوصیت کا دیکھنا ''جنوں چاہے لکھوں لکھ کر دے' جنوں چاہے ککھوں لکھ کر دے' مالک بے نیاز جو ہویا جی [1]'' وہ مالک یہ چاہتا ہے کہ جو اس کی صفات ہیں وہ یہاں اس کے بندوں کے اندر پیدا ہوں تو بہترین وہ ہوتے ہیں۔ کسی حاکم میں یہ صفات گنا دیجیے جو آپ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ''فیر تسی دیکھو پئی تسی جوتی لے کے دوالے ہو جاؤ گے کہ نہیں اوہدے [2]؟'' کہ صاحب! نہ یہاں کوئی قاعدہ' نہ قانون' نہ کوئی معیار' نہ کوئی انتخاب۔ جسے چاہے وہ کر دیا جسے چاہے وہ کر دیا۔ دھاندلی' لوٹ' استبداد' یہ کچھ آپ کہتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہے صاحب! یہ تو خدا کی صفات کا عکس ہے جو میرے اندر ہے اور پھر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ **السلطان ظل اللہ علی الارض** بادشاہ تو زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ جب آپ خدا اس قسم کا بناتے ہیں تو اس کا سایہ اسی قسم کا بننا چاہیے جو آپ دیکھ رہے ہیں تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ بات یوں نہیں ہوئی تھی' بات یہ ہوئی تھی کہ ہم یہاں اس قسم کا بادشاہ چاہتے تھے یا بادشاہ اپنے آپ کو اس قسم کا چاہتا تھا۔ جس قسم کا وہ خود یہاں بننا چاہتا تھا اس قسم کا اس نے ایک خدا عرش پہ بٹھا دیا۔ وہ اصل اور نسل' کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں' یہ اس کا سایہ' یہ بھی کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں لیکن آپ غور کیجیے کہ پھر اس کے بعد اس کے متعلق آپ کا ردِ عمل Reaction کیا ہوتا ہے۔

---

[1] جسے چاہے کروڑ پتی سے کنگال کر دے' جسے چاہے کنگال سے کروڑ پتی بنا دے۔ وہ مالک بے نیاز جو ہوا جی!

[2] پھر تم دیکھو کہ کیا جوتا لے کر آپ اس پر برس پڑیں گے یا نہیں؟

انسانی اختیار وارادے کی صفات کے برعکس عقیدہ جبر مجوسیت کا رہن منت اور ملوکیت کا بانی ہے:

عزیزانِ من! مجوسی تصورات کے جو اثرات اسلام پہ غالب آئے سب سے پہلا اثر جو غالب آیا تھا' عقیدۂ جبر تھا۔ یہ تقدیر کا مسئلہ

خالص مجوسیت کا تھا۔سب سے پہلے اسلامی بنیادی تصورِزندگی جس چیز سے متاثر ہوا ہے وہ غیر قرآنی تصورات میں سے جبر کے عقیدے کی بات تھی۔کبھی میں تاریخ میں آؤں گا تو عرض کروں گا کہ سب سے پہلے آپ کے ہاں جو چیز اسلام کی گاڑی کو اس کی پٹڑی سے دوسری طرف ڈالنے والی چیز تھی وہ یہ پہلا تھا عقیدۂ جبر یعنی وہ جو جی میں آئے کرے۔اسی سے یہاں آپ کی ملوکیت قائم ہوئی۔وہ سارے اختیارات بادشاہ کو دے دیے جو آپ نے خدا کو سونپے تھے۔یہ اس کا نمائندہ بن گیا' یہ اس کی نیابت کر رہا ہے اور یہ کیا کس طرح سے گیا؟ اسی سے کہ جہاں **من یشآء** آیا اس کا ترجمہ مفہوم یہ لے لیا ''جیسے جی میں آئے وہ کرے' جیسے چاہے کرے'' اس میں بات سمجھنے کے لیے عزیزانِ من! آگے بڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔کرنے کی ضرورت وہ ہے قرآن میں حضورؐ کی زبان مبارک نے فرمایا تھا کہ **قوموا** (34:46) آگے بڑھنے سے پہلے ذرا کھڑے ہو جاؤ' ذرا ایک سیکنڈ کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔کھڑے ہو گئے۔پھر کیا کریں جی؟ کہا کہ **تتفکروا** (34:46) ذرا سوچ لو' غور و خوض کرو یہاں آیا ہے جی **یؤتی ملکہ من یشآء** (2:247) اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے۔کھڑے ہو جایئے یہ جو الفاظ پہلے آپ نے پڑھے ہیں' کھڑے ہو کر ان پہ غور کیجیے۔

قران حکیم تو اپنے ہر حکم کے ساتھ اس کی حکمت بھی بیان کرتا ہے:

انہوں نے پوچھا یہ تھا کہ صاحب! ہم پہ یہ کماندار؟ کیسے مقرر کر دیا کیا بات ہے! کہا کہ یہ اس لیے کہا ہے کہ **زادہ بسطۃً فی العلم والجسم** (2:247) یہ ساری خصوصیات اس کے اندر موجود ہیں جو ایک کمانڈر کے اندر ہونی چاہئیں۔خدا نے وجہ بتائی ہے کہ کیوں اس کا انتخاب کیا گیا ہے' یہ بتایا ہے ایک قاعدے کے مطابق کہا ہے' ایک قانون کے مطابق کہا ہے کہ ہم نے اسے بنایا ہے۔یہ نہیں کہا ہے کہ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔ہمیں یہ حق حاصل ہے' ہمیں اختیار حاصل ہے' جسے چاہیں ہم کمانڈر بنائیں ہم نے بنایا ہے جسے چاہا ہے بنایا ہے ''تسی چاچے لگدے ہیگے او'' نہیں کہا انہوں نے پوچھا ہے کہ کیوں بنایا ہے؟ کیا بات ہے اس خدا کی یہ ٹھیک ہے کہ وا تنا قادرِ مطلق ہے کہ وہ یہ بھی کہہ دے تو اس کے شایانِ شان ہے لیکن وہ تو اس قسم کا مستبد حاکم نہیں بننا چاہتا۔یہ پوچھتے ہیں کہ کیوں بنایا ہے۔بتایا جا رہا ہے کہ اس لیے بنایا ہے کہ کماندار کے اندر یہ خصوصیات ہونی چاہئیں' اس کے اندر یہ خصوصیات موجود ہیں' اس لیے بنایا ہے۔بتا دیا ایک معیار' ایک قانون۔یہ کہنے کے بعد آگے آیا کہ **واللہ یؤتی ملکہ من یشآء** (2:247) ترجمہ یہ کیجیے کہ اس لیے بنایا ہے کہ اس میں یہ خصوصیات ہیں اور اس کے بعد یہ ترجمہ کیجیے کہ اللہ جسے چاہے دے دے۔آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کوئی تک نہیں ہے۔جب وہ یہ بتاتا ہے کہ ہم نے کیوں بنایا ہے؟ یہ اس کے انتخاب کی وجہ ہے۔اس کے بعد یہ ترجمہ پچ ہی نہیں سکتا' ربط ہی نہیں قائم ہو سکتا کہ جسے چاہیں ہم بنا دیں تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔یہ کہنا ہوتا تو درمیان کا ٹکڑا نہ کہا جاتا۔یہ نہ کہا جاتا تو اس قاعدے قانون' اس معیار کے

مطابق' یہ انتخاب عمل میں آیا ہے' یہ نہ کہا جاتا' جواب دیا جاتا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ نہیں' کہا پہلے یہ ہے کہ اس لیے بنایا ہے کہ اس میں یہ خصوصیات ہیں اور یہ معیار ہونا چاہیے کسی کو کمانڈر بنانے کا۔ اب جو اگلا ٹکڑا ہے' اس کو اس کے ساتھ ملا یئے بات صاف ہو جائے گی۔

من یشآء کا قرانی مفہوم جس میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں:

عزیزانِ من! من یشآء کے متعلق میں کئی دفعہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس کا صاف ترجمہ جو ادھر کرنا ہے تو عربی زبان کے مطابق بھی یہ ہوتا ہے کہ جو بھی اس معیار کے مطابق کمانڈر بننا چاہتا ہے وہ بن سکتا ہے۔ من یشآء میں جو ایسا چاہتا ہے اس کو یہ مل سکتا ہے۔ یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ وہ اس مقام پہ پہنچ جائے' وہ یہ خصوصیات پیدا کرلے' وہ ہو جائے گا کسے باشد۔ من یشآء جو شخص یہ چاہے کہ میں ایسا ہوں' ایسی خصوصیات اپنے اندر پیدا کر لے تو وہ بن جائے گا۔ قرآن میں ہر جگہ من یشآء کے ترجمے یوں کیجیے آپ دیکھیے گا بات کتنی صاف ہوتی ہے لیکن اگر اس پہ بھی آپ کا جی نہ ٹھکے اور بعض مقامات ایسے ہیں جہاں یشآء کی جگہ کہیں مشو آیا ہے' کہیں تشو آیا ہے۔ خدا کے متعلق تھے کہ اے خدا! جسے تو چاہتا ہے۔ مثلاً سورۃ ال عمران کی آیت 25 ہے جسے عام طور پہ اس سند میں پیش کیا جاتا ہے کہ نہیں جی! وہاں تو جیسا وہ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ **قل اللھم ملک الملک تؤتی المالک من تشآء وتنزع الملک ممن تشآء وتعز من تشآء وتذل من تشآء بیدک الخیر انک علی کل شئٍ قدیر** (3:25) کہ ہاں! ہمارا اللہ! اے ہمارے مالک! اے ہمارے خدا! تو جس کو چاہے ملک دے دے' جس سے چاہے حکومت چھین لے' جسے چاہے عزت دے دے' جسے چاہے ذلت دے دے' تیرے ہاتھ میں خیر بھلائی ہے' تو ہر شے پہ قادر ہے۔ یہ ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیکھیے صاحب! یہاں تو اب وہ من تشآء والی بات نہیں ہے' یہاں تو یہ بات صاف ہے کہ یہ کہا گیا ہے تو جسے چاہے۔ اب یہاں سے بات صاف ہوگی۔ آیئے قرآن سے ہم پوچھیں کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ آگے بڑھنا تو ایک طرف رہا ذرا اسی آیت کے چار الفاظ پہلے تو دیکھ لیجیے۔ یہ ہے کہ جسے چاہے وہ یہ دے دے یعنی اس کے اپنے عمل میں کسی انسان کی اپنی خصوصیت' کسب اور ہنر کا کوئی دخل نہیں ہے' جسے چاہے وہ پکڑ کر اُوپر بٹھا دے۔ اس آیت کے چار الفاظ پہلے ہیں کہ **ووفیت کل نفس ما کسبت** (3:24) ہم تو ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلا دیتے ہیں۔ **وھم لا یظلمون** (3:24) کسی میں ذرا بھر کمی نہیں ہوتی' کسی پہ ذرا ظلم نہیں ہوتا اور یہ کہنے کے بعد اگلی بات یہ کہی ہے کہ **قل اللھم ملک الملک** (3:25). بات اگر یہ ہو جائے کہ جسے چاہتا ہے وہ یونہی اُٹھا کر کر دیتا ہے' اس میں نہ کسی خصوصیت کا دخل ہے' نہ کسی قسم کا کوئی معیار قائم ہے۔ اگر یہ چیز اس کی ہو تو یہ جو پہلے کہا ہے کہ ہم ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلا دیتا ہیں' کسی پہ ذرا زیادتی نہیں ہوتی'

کسی کے عمل کے بدلے میں ذرا کمی نہیں ہوتی' جب یہ چیز ہے تو اس کے بعد اگر یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب! پھر جسے جی چاہے بغیر کسی قسم کے خیالات کے عمل کیسے ہیں' جو ہر کیسے ہیں' خصوصیات کیسی ہیں' جسے چاہے یہ کچھ کر دیا جائے' بے تکی بات ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہاں کہہ لیجیے کہ یہاں کہا گیا ہے کہ جسے چاہے وہ یہ کچھ کر دیتا ہے' جسے چاہے حکومت دے دیتا ہے یعنی اس کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں ہے۔ قرآن سے پوچھیے کہ کیا یہی بات ہے؟

قران حکیم اپنے ہر حکم کی تشریح خود اپنے آئینہ میں پیش کر دیتا ہے:

عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا طریقہ میں بار بار بتا چکا ہوں' یہ محاورہ عرب کے مطابق ہے کہ یہ دیکھیے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں ان عربی الفاظ کے معنی کیا تھے اور قرآن کریم نے اپنے مطالب کو خود کس طرح واضح کیا ہے۔ یہ دوسری بڑی بنیادی چیز ہے اور کوئی ایک گوشہ بھی قرآن کا ایسا نہیں جس کی تشریح اس نے خود دوسرے مقام پہ نہیں کر دی۔ قرآن کی ہر آیت کی تفسیر قرآن کے دوسرے مقام سے مل جاتی ہے۔ یہاں ہم نے کہہ دیا کہ صاحب! اس نے کہہ دیا ہے کہ جس کو چاہے' ہم یہ دے دیتے ہیں' اس میں کوئی کسی قسم کا معیار نہیں' کوئی قاعدہ مقرر نہیں' کچھ نہیں۔ سورۃ انبیاء کی آیت 105 ہے کہ **ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر** (21:105) ہم نے زبور میں تمام بنیای حقائق وقوانین دینے کے بعد ایک چیز اساسی طور پر بیان کر دی تھی اور وہ یہ تھی کہ **ان الارض یـــوثهـــا عبـــادی الصٰلحون** (21:105) یادرکھو! حکومت' زمین میں اقتدار کس کو ملتا ہے؟ ان لوگوں کو ملتا ہے جن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ٹھہرا خدا کا قانون اور اسی کی تشریح آگے چل کر سورۃ النور میں کی کہ **وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت** (24:55) ان میں سے جو لوگ ان بنیادی اصولوں پر یقین محکم رکھیں اور اس کے بعد ان کے صلاحیت بخش کام ہوں۔ وہی جو وہاں صالحون کہا ہے یہاں **عـمـلـوا الصٰلحٰت** کہا ہے جس منصب کے لیے کوئی چیز ملنی ہے اس کے لیے صلاحیتیں ان کے اندر ہوں۔ بنیادی اقدار خداوندی ہو مستقل اقدار خداوندی کی صداقت پر یقین محکم ہو اور جو منصب پیش نظر ہے اس کے لیے صلاحیت ہو۔

خدا کے وعدے سے مراد خدا کا وہ قانون ہے جس کو اس نے قران حکیم میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے

کہا کہ جس قوم میں یہ چیز ہوگی' اس کے لیے ہم نے وعدہ کر رکھا ہے۔ خدا وعدہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جسے ہم قانونِ خداوندی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ **لا یـخـلـف الـمـیـعـاد** (3:31) ہم اپنی وعدہ خلافی کبھی نہیں کیا کرتے۔ اسے کہتے ہیں کہ اٹل قانون بدلا نہیں کرتا۔ کیا وعدہ کر رکھا ہے؟ یہ کہ **لیستـخلفنهم فی الارض** (24:55) ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کر دیں گے۔ مشروط ہوگئی حکومت کا عطا ہونا ایمان اور اعمالِ صالح کے ساتھ۔ تو جب یہ مشروط ہو گیا اور وہاں کہا تھا کہ ہم **عبـادی الـصٰـلحون** (21:105) کو

دیتے ہیں تو یہ خدا کا قانون ہو گیا۔ اب جہاں خدا یہ کہتا ہے کہ ہم جسے (آپ کے ترجمے کے مطابق) چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ہم تو دیتے ہی اسے ہیں جس میں یہ خصوصیتیں ہوں۔ لہٰذا عزیزانِ من! جو چاہتے ہیں والی بات ہے یہ ترجمہ نہ کیجیے۔ ترجمہ کیجیے' جہاں بھی یہ چیزیں آئیں' کہ یہ چیز ملتی ہے خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق جو اس نے قرآن میں واضح کر دیا ہے تو بات صاف ہو جائے گی۔ اب کوئی چیز قرآن میں ایسی نہیں جہاں خدا نے من یشآء یا مشوا کہا ہو اور اس کے لیے دوسرے مقام میں قانون نہ دے دیا ہو کہ اس کے لیے قانون کیا ہے۔ ہر شے کے لیے جو قرآن نے کہی ہے کہ یوں ملتی ہے' کے لیے دوسری جگہ بتا دیا ہے کہ اس میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں جس کی وجہ سے ملتی ہے۔ ان خصوصیات کو ساتھ اکٹھا کر لیجیے' بات صاف ہو جائے گی۔

قرانِ حکیم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ہو ہی نہیں سکتا:

ترجمہ کرنا ہے تو قانونِ مشیت کیوں نہ کرو۔ یہ اُردو میں قرآن کیوں لے آئے ہو آپ۔ عربی کا قرآن عربی میں رکھیے۔ یہ **یشآء** سے مشیت ہے۔ کہیے قانون مشیت پھر قرآن سے پوچھئے کہ فلاں چیز کے لیے قانونِ مشیت کیا ہے؟ قرآن بتائے گا۔ یہ آپ نے دیکھ لیا کہ حکومت کے لیے' اختیارات کے لیے' اقتدارات کے لیے قانونِ مشیت کیا ہے؟ صلاحیتوں کا ہونا۔ جیسے طالوت کی کمانداری کے لیے بتا دیا تھا کہ شرط یہ ہے کہ اسے علم اور جسم کے اندر فراوانیاں ملی ہوئی ہوں۔ مملکت' حکومت کے لیے کہا ہے کہ وہ **عبادی الصالحون** (21:105) ہوں۔ حکومت خداوندی کے لیے ایمان اور اعمالِ صالح ہوں۔ یہ چیزیں ہو گئیں جسے آپ قانونِ مشیت کہیں گے۔ ایک ہی چیز کے متعلق نہیں' بنیادی قانونِ مشیت یہ بتایا یاد رکھیے! ذہن میں یہ رکھیے گا کہ اگر ہم کہیں کہ جسے چاہے وہ یہ کرے اور جسے چاہے وہ یہ کر دے' اس کے مقابلے میں یہ آیتیں دیکھیے اور قرآن کے اس دعوے کو بھی پیش نظر رکھیے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی بات اختلافی نہیں ہے' متضاد بات قرآن میں نہیں آئی' تو ایک دوسرے کی نقیض' ایک دوسرے کی ضد' ایک دوسرے کو کاٹنے والی چیز تو یہاں نہیں آئے گی۔ سنیے کہ جو آپ نے کہا تھا کہ صاحب! جسے چاہے دے' جسے چاہے ذلیل کرے' جسے چاہے عزت دے' جسے چاہے حکومت دے' کہا ہے کہ یاد رکھو! **ذلک بان اللّٰہ** (8:53) اُوپر چلا آ رہا ہے کہ فلاں کے ساتھ یہ کیوں ہوا؟ فلاں قوم کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا؟ اوپر یہ چیزیں چلی آ رہی ہیں اور اس کے بعد یہ **ذالک** آیا ہے یہ اس لیے ہوا کہ **بان اللہ لم یک مغیرًا نعمۃً انعمھا علٰی قوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم** (8:53) جب تک کہ وہ خود اپنے اندر ایسی تبدیلی نہ پیدا کر دے کہ وہ اس نعمت کی مستحق رہے' نہیں **لم یک** ہم کبھی ایسا کرتے ہی نہیں ہیں۔ **لم یک مغیرًا** (8:53) ہم کبھی یہ ایسا نہیں کرتے۔ کسی قوم کو ان کے استحقاق کی بنا پر' ان کی صلاحیتوں کی بنا پر' ان کو اختیارات' آسائشیں' نعمتیں' یہ ساری چیزیں ملی ہوں۔ ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ ان

سے یونہی چھین لیں، یہ کبھی نہیں چھینی جاتیں۔ تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر خود ایسی تبدیلی نہ پیدا کر دے کہ وہ ان کی اہل ہی نہ رہے تو' عزیزانِ من! بات صاف ہوگئی۔

ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کی ایک صفت المفصل کا ترجمہ گمراہ کرنے والا کیا جاتا ہے

اب جہاں بھی آپ کو قرآن میں یشاء اور مشوا اور تشاء کے یہ الفاظ ملیں' کہیے کہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور قانونِ مشیت یہ ہے کہ جس قسم کی قوم بنتی ہے' اسی قسم کی اس کی کیفیت اور حالت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں روز یہ چیز ہوتی ہے **یضل من یشآء ویهدی من یشآء** جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت پہ لے آتا ہے اور اس کے بعد المضل کے معنی لیے جاتے ہیں گمراہ کرنے والا اور یہ خدا کی صفت بتا دی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس پہ تو کسی اضافے کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ سوچیے تو سہی یہ کہاں ہے۔ **ولو شآء اللہ لجعلکم امۃً واحدۃً** (16:93) خدا اگر چاہتا (میں وہی چاہتا کہتا ہوں جو ترجمہ کیا جاتا ہے) تو تم سب انسانوں کو ایک ہی جیسی نوع (Space) بنا دیتا' جیسے حیوانات میں ہیں کہ سب بکریاں گھاس کھاتی ہیں' سب شیر گوشت کھاتے ہیں۔ ہم چاہتے تو تمہیں بھی ایسا ہی بنا دیتے' سب نیک ہی نیک بن جاتے۔ ہوسکتا تھا کہ ہم ایسا بھی کر دیتے **ولکن یضل من یشآء ویهدی من یشآء** (16:93) (ترجمہ انہی کا) لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ہدایت پہ لے آتا ہے۔ ٹھیک ہے اگر یہ قانون ہو تو پھر تو راوی عیش لکھتا ہے۔ میں اگر گناہ کرتا ہوں' جرم کرتا ہوں' کفر کرتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے' وہی کرتا ہے۔ یہ معنی اگر لیے جائیں تو بات صاف ہے۔ ٹھیک ہے اگر میں نیک راستے پہ چلتا ہوں تو کہہ لیجیے کہ اس کا کریڈٹ بھی تو تمہیں نہیں جاتا۔ تو میں نے اس میں کریڈٹ لے کر کیا کرنا ہے صاحب! وہ جو بات ہے جرم کی' جس کی سزا ملنی ہے' اس کے لیے تو میرے لیے گنجائش موجود ہے کہ صاحب! تو ہی کرتا ہے **یضل من یشآء** جسے چاہتا ہے وہ گمراہ کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے لیکن آیت یہاں ختم نہیں ہوتی اور یہاں موج ہونے لگی تھی ''ایہد اتراہ نکل گیا'' ترجمہ کیا آپ نے کہ جسے چاہتا ہے تو گمراہ کرتا ہے' جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور آگے یہ ہے **ولتسئلن عما کنتم تعملون** (16:93) اور ہم تم میں سے ایک ایک سے پوچھیں گے کہ تم نے یہ کیوں کیا تھا؟ ''اوائے کی کرن ڈیا اے ❶ ''خود ہی کہہ رہا ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں'' پہلے اوہنوں کوئی راہ پا دیندا اے مگروں جوتی پھڑ لیندا اے کہ ایدھر کیوں ترپاسیں ❷ '' اب ایسے مقام پہ بجز اس کے کہ وہ اس قسم کا فریب دے لیں کہ

گناہ گرچہ نہ بود از خطائے ما حافظ
تو در طریقے ادب گو باشے گو گناہ من است

---

❶ ارے! یہ کیا کر رہا ہے!!

❷ پہلے اسے کسی راستے پہ ڈال دیتا ہے' پھر جوتا پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ یہاں کیوں چلے تھے۔

اگر خدا ہی انسان کو گمراہ کرتا ہے تو پھر اسے سزا کس جرم کی

یہ ٹھیک ہے کہ یہ گناہ' اس کی ذمہ داری مجھ پہ تو نہیں ہے لیکن ''جنوں ڈاہڈے نال واہ پے جائے'' کہا کہ اس کے بعد عدل کا تقاضا یہی ہے کہ کہہ دو کہ اچھا جی! میری غلطی ہے' مار لو جوتیاں۔ سوچیے' عزیزانِ من! یہ ایک یشاء کے غلط ترجمے سے کیا ہو رہا ہے لیکن وہ اس چیز پہ مطمئن نہیں' کہ اس نے یونہی کہہ دیا ورنہ وہ وہاں جا کر کھڑا ہو کے کہتا ہے کہ

درمیانے کارے دریا تختہ بندھن کردا ای
باز می گوئی کہ دامن تر؟؟ ہشیار باش

خود مجھے باندھ کے تو نے غفلت کے سمندر میں پھینک دیا اور پھر مجھ سے کہتا ہے کہ دیکھنا! تمہارا دامن تر نہ ہو۔ یہ کس طرح سے؟ قرآن کی آیت پہ آ جائیے کیجیے ترجمہ اس کا کہ جسے چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں' جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ **ولتسئلن عما کنتم تعملون** (16:93) اور پھر ہم پوچھیں گے تم سے کہ کیوں تم نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا؟ کیوں غلط چلے؟

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو چیتاں بنانے کا نتیجہ عالم اسلام کی ذلت وخواری اور انسانیت کی تباہی ایک زندہ ثبوت ہے:

عزیزانِ من! یہ تو خدا کی کتاب ہے ''اے تے سائیں بھلے شاہ دا کتابچہ ہووے تاں نہ منے آدمی'' یہ اس قسم کے ٹکڑے ہیں اگر سوچیے تو یہ جو اتنی عظیم کتاب ہے' مسلمان نے اس کتاب کے ساتھ کیا کیا؟ جی نہیں صاحب! کیا کیا اس قوم نے اپنے ساتھ؟ اس کتاب کے ساتھ کوئی کیا کرے گا۔ سورج کے ساتھ کوئی انسان کیا کر لے گا' اپنے ہی ساتھ کر لے گا۔ اگر آنکھیں بند کر لیتا ہے' خود اندھیرے میں رہتا ہے تو اس سے سورج تاریک نہیں ہو جاتا۔ اس کتاب کے یہ معنی کیے جا رہے ہیں۔ کوئی ترجمہ اُٹھا کر دیکھیے' وہاں یہ لکھا ہو گا کہ جسے ہم چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور آگے لکھا ہوا ہو گا کہ ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم نے یہ ایسا کیوں کیا تھا؟ کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں کہ صاحب! کیا بات ہو رہی ہے۔ یہ کہا کہ ٹھیک ہے ہمارا قانونِ مشیت حیوانوں کی زندگی میں بھی تو تھا کہ سب ایک ہی روش پہ چلتے ہیں' وہ تو گناہ نہیں کرتے' وہ تو معصیت نہیں کرتے۔ ان میں اس چیز کی استطاعت ہی نہیں ہے کہ جس راستے پہ چلنے کے لیے ان کو متعین و مامور کیا ہے' وہ وہاں سے ہٹ جائیں۔ ایسی اطاعت کا کوئی کریڈٹ نہیں ہوتا' ان میں کوئی نہ ولی اللہ پیدا ہوتا

ہے' نہ کوئی مومن ہوتا ہے' نہ کوئی نبی ہوتا ہے اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ نہ جبر کی اطاعت' اطاعت ہے' نہ جبر کی معصیت' معصیت ہے۔ کہا کہ ہم چاہتے تو انسانوں کو ایسا بنا سکتے تھے کہ ان میں بھی ہم اختیار و ارادے کی قوت سلب کر لیتے' یہ بھیڑوں کی طرح میں میں کرتے' ایک راستے پہ چلتے رہتے لیکن ہم نے انسان کی صورت میں ایسی روش اختیار نہیں کی۔

انسان کے پاس اختیار و ارادہ ہی تھا جس کا اس نے غلط استعمال کیا:

ہم نے اسے صاحب اختیار و ارادہ بنایا۔ اس لیے ہم نے اس کو یہ بنایا ہے کہ **یضل من یشآء ویھدی من یشآء** (16:8) جو صحیح راستے پہ چلنا چاہتا ہے صحیح راستے پہ چلے' جو غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے غلط راستے کو اختیار کرے۔ **قل الحق مِن رَبکم** (8:29) کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا **فمن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر** (18:29) جس کا جی چاہتا ہے پھر اس کو تسلیم کر لے' جس کا جی چاہتا ہے انکار کر دے۔ اب اتنا کہنے کے بعد تو چھٹی مل جاتی تھی کہ صاحب! جی چاہتا ہے اس نے کہہ دیا کہ جس کا جی چاہتا ہے اس کو اختیار کرے' جس کا جی چاہتا ہے اسے چھوڑ دے کہا کہ اتنا یاد رکھنا' پھر یہ تو تمہارے اختیار کی بات ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرو لیکن یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے کہ راستہ غلط اختیار کرو اور صحیح منزل کے اُوپر پہنچ جاؤ۔ جون سا راستہ اختیار کرو گے' اس کے نتائج تمہیں بھگتنے پڑیں گے۔ ٹھیک ہے' آج کل کالج سے Preparation Leave ملی ہوئی ہے' ابھی ابھی یہ صورت ہے' انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ جن بچوں کا جی چاہے کلاس میں آ جائیں' جن کا جی چاہے' کلاس میں نہ آئیں لیکن آگے بات یہ کر دی کہ یاد رکھو! کہ جو ان دنوں میں Study نہیں کرے گا' وہ پھر فیل ہو جائے گا۔

---

❶ یہ اگر سائیں بھلے شاہ کا کتابچہ ہو تو پھر آدمی نہ مانے۔

کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جس میں خدا کے قانون کے مطابق نتائج نہ نکلتے ہوں:

یہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ اپنے اختیار و ارادے سے تم جون سا راستہ جی چاہے اختیار کرو لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ تم نے جو راستہ اختیار کر لیا اس کے نتائج بھی تم اپنی مرضی کے مطابق مرتب کر لو گے یہ بات نہیں ہے۔ نتائج ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق مرتب ہوں گے۔ **مــن یشــآء** کے معنی آپ نے سمجھ لیا کہ پھر قرآن کیا کہتا ہے۔ یہ ہدایت کے متعلق ہے۔ میں اس قسم کی دو تین مثالیں دیتا ہوں' عزیزانِ من! یہاں روز ہم سے کہا جاتا ہے' امیری غریبی بھی اس کے ہاتھ میں ہے صاحب! جس کو چاہے وہ امیر کر دے' جس کو چاہے وہ غریب بنا دے اور پھر اس کے لیے تو پچھلے دور میں تو قدم قدم پہ مثالیں آتی تھیں کہ ''جی کل اینے چھابڑی لائی ہوئی ہوندی سی' آج رولز رائس سے چڑھیا جاندا ہے گا۔ ٹھیک ہے جی' اوہنوں کہو جی' چار دن تکو' ہن پوچھو کاہدے تے تریا جاندا ہیگا❶ ''یعنی خالص طاغوتی اور ابلیسی نظام

کے اندر جو کچھ ہوتا ہے‘ اسے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر اس طرح سے رزق حاصل کرنے والا‘ بڑے جلی حروف میں اپنے قصر ایوان کے اُوپر لکھتا ہے: ’’ہٰذا من فضل ربی‘‘ یہ اس کا نتیجہ ہے قرآن نے کہا ہے کہ **اللہ یبسط الرزق لمن یشآء ویقدر** (30:33) پھر وہی ترجمہ اللہ جس کا چاہتا رزق تنگ کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے آ گئی سند اس کی ان کے ہاتھ میں۔ پڑھ دیا آیت کا آدھا ٹکڑا: **لا تقربوا الصلوٰۃ** (4:43) آ گیا کہ نماز کے قریب نہ جاؤ۔ کہا کہ یہ ہے ترجمہ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ جس کا رزق چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اب کیجیے قرآن کا ترجمہ قرآن کے مفہوم کے مطابق کہ رزق کی تنگی اور کشاد خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔ پوچھو قرآن سے کہ اس باب میں خدا کا قانونِ مشیت کیا ہے؟ پھر سن لیجیے! رزق کا بسط و کشاد خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ پوچھیں گے ہم خدا سے کہ آپ کا وہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ کہا کہ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ **ومن اعرض عن ذکری فان له معیشةً ضنکًا** (20:124) جو ہمارے ان قوانین سے‘ جن کے مطابق رزق کی پیدائش‘ بہتات ہوتی ہے‘ سے پہلو تہی کرے گا‘ اعراض برتے گا‘ اس کی روٹی تنگ ہو جائے گی۔ دیکھ لیا اپنا یہ کیسے قانونِ مشیت بتاتا ہے اور اگلا ٹکڑا بھی سن لیجیے! جو ہمارے ان قوانین سے اعراض برتتا ہے جس کے مطابق رزق کی بہتات ہوتی ہے‘ اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے **ونحشرہ یوم القیٰمة اعمٰی** (20:124) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو جاتی ہے‘ وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اُٹھتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ من یشآء کا ترجمہ وہ کیجیے تو پھر بتائیے ان آیتوں کے کیا معنی ہوں گے۔ یہ ترجمہ کیجیے کہ یہ چیز خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کے بعد ان تمام آیات کو لیتے چلے آئیے بات صاف ہوتی چلی جائے گی۔ دو چیزیں اکٹھی کرنی پڑیں گی۔ رزق کی بسط و کشاد خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتی ہے اور خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو بھی ان طبعی قوانین سے اعراض برتتا ہے‘ جن کے مطابق زمین اپنے خزانے اُگلتی ہے‘ اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ من یشآء کا ترجمہ ہو گیا صاحب!

---

❶ کل اس نے چھابڑی لگائی ہوئی تھی اور آج رولز رائس پہ بیٹھتا ہے۔ ٹھیک ہے جی! اسے کہو کہ چار دن انتظار کرے۔ اب پوچھو کہ کس پہ بیٹھ کر جاتا ہے‘ پیدل ہی تو جاتا ہے۔

قرانی فکر کو سب سے زیادہ نقصان عقیدۂ تقدیر یعنی جبر کے تصور نے پہنچایا ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ سب سے پہلی سازش جو اسلام کے خلاف ہوئی اور سب سے پہلی چیز‘ جس نے قرآن کے بنیادی نظریات کو متاثر کیا‘ وہ مجوس کا یہ جبر کا عقیدہ تھا کہ جسے وہ چاہتا ہے یہ کچھ کرتا ہے۔ آج‘ عزیزانِ من! ہم میں سے ایک ایک کی زبان پہ یہ چیز ہے خدا کی مرضی ہوتی ہے‘ اس کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے‘ اگر وہ چاہتا تو یہ ایسے کرتے ہی کیوں؟ اگر اس کی مرضی ہوتی تو ایسا ہوتا کیوں؟

مرضی مولا برہما اولیٰ اور پھر جسے آج رضائے خداوندی کہا جا رہا ہے' وہ جتنا کوئی اس کے اُوپر زیادہ متوکل ہو کر بیٹھ جاتا ہے اتنا ہی زیادہ خدا رسیدہ ہو جاتا ہے۔یعنی ہر معاملے میں یہ کہنے والا کہ صاحب! یہ چیز خدا کے حکم کے مطابق' اس کی مرضی کے مطابق ہو رہی ہے' ہمیں اس میں کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔ وہ بڑا مقربِ بارگاہِ الٰہی ہم میں بڑا بزرگ گنا جاتا ہے۔ وہی جس کے متعلق حسرت موہانی (1875-1951) نے کہا تھا کہ

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

یہاں تک بھی نہ کریں کہ کہیں خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔

ہمارے ہاں اپنے اعمال کے نتائج کو خدا کی مرضی کے پردوں میں ڈھاب دیا جاتا ہے جو کہ شرک ہے

بزرگوں کی باتیں ہیں یہ کہ اگر اللہ یہ چاہتا تو کیوں نہ ایسا ہو جاتا' خدا نے چاہا ہی نہیں۔ سنیئے عزیزانِ من! قرآن کیا کہتا ہے **سیقول الذین اشرکوا** (6:149) تمہارے جواب میں یہ مشرک کہیں گے۔عزیزانِ من! دل کے کانوں سے سن رہے ہیں آپ؟ مشرک تم سے یہ کہیں گے جب تم یہ بات ان سے کہو گے کہ تم کیوں شرک کرتے ہو؟ تم کیوں گمراہی میں پڑے ہوئے ہو؟ تو یہ جواب دیں گے کہ **لو شآء اللہ ما اشرکنا** (6:149) اگر خدا کی مرضی یہ ہوتی تو ہم شرک کرتے ہی نہیں۔ یہ مشرکین کا قول ہے۔یا اللہ! آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا اسلام کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے۔جس نظریہ' جس تصور کو' جس زاویہ نگاہ کو' قرآن مشرکین کی ذہنیت کہہ رہا ہے اسے آج ہم سب سے زیادہ مقربین کی ذہنیت قرار دے رہے ہیں۔اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو نہ ہم شرک کرتے **ولو اٰباؤنا ولا حرمنا من شیءٍ** (6:149) نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ یہ تو سارا وہ کرتا ہے صاحب! ہم کون ہیں بندہ بشر یہ کرنے والے! کہا ہے کہ یہ چیز مشرکین جواب دیں گے **کذالک کذب الذین من قبلھم**(6:149) اسی طرح سے ان سے پہلی قوموں نے بھی حکایت کو جھٹلایا تھا۔دیکھتے ہیں **کذب الذین** تکذیب کی تھی اس سے پیشتر بھی اسی قسم کی قوموں نے۔پھر کیا ہوا تھا؟ **حتٰی ذاقوا باسنا** (6:149) تا آنکہ ہمارا عذاب ان پر آ کر لپٹ گیا۔اس کا نتیجہ عذابِ خداوندی ہے۔

کسی انسان کے پاس ان باطل نظریات کی کوئی دلیل نہیں ہے:

عزیزانِ من! ہزار سال سے یہ قوم ذلت و خواریوں کے عذاب کے اندر محبوس چلی آ رہی ہے۔آخر کس وجہ سے؟ بنیادی طور پر اس ایک عقیدے کے بدلنے سے کہ جو کچھ تقدیر کا لکھا ہے' ہو کر رہتا ہے' انسان کچھ نہیں کر سکتا [1] ۔قرآن کہتا ہے کہ **قل ھل عندکم من**

علم (6:149) اوایسا کہنے والوں سے کہو کہ ایسا کہنے کی کوئی علمی دلیل تمہارے پاس ہے۔**فتخرجوہ لنا** -(6:149) ایسا کہنے میں لاؤ ہمارے سامنے کوئی علم کی دلیل لاؤ۔**ان تتبعون الا الظن** (6:149) محض اپنی قیاس آرائیاں ہیں جن کی یہ پیرائی کرتے ہیں **وان انتم الا تخرصون** (6:149) کیا کوئی اسناد اور دلائل ہیں جن کے اندر یہ پھر رہے ہیں اور اسے ہماری طرف منسوب کررہے ہیں۔ ان سے کہو کہ انتظار کرو' اس باطل نظریہ زندگی کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ ذلت اور خواریاں تمہارے پاس آ جائیں گی۔ یہ تو عزیزانِ من! ہدایت کے متعلق ہے کہا ہے کہ **واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ** (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے تمہیں رزق دیا ہے' سامانِ زیست دیا ہے' اسے دوسروں کی بہبود کے لیے بھی کھلا رکھو' ان کے فائدے کے لیے بھی کھلا رکھو۔**توقال الذین کفروا للذین اٰمنوا** (36:47) یہ کافر' مومنوں سے یہ کہتے ہیں (وہاں مشرکین کا قول کہا تھا' یہاں یہ کافروں کا قول کہا ہے کہ **انطعممن لو یشآء اللہ اطعمہ** (36:47) ارے کیا ہم ان کی روٹی کا انتظام کریں جن کو خدا چاہتا تو براہِ راست امیر بنا دیتا' ضرورت ہی نہ پیش ہوتی۔ جو غریب ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا ان کو غریب رکھنا چاہتا ہے۔ خدا غریب رکھنا چاہتا ہے ہم ان کو امیر بنائیں صاحب! یہ تو خدا سے جنگ ہوگئی اور خدا سے جنگ تو عزیزانِ من! اس تقدیر کے عقیدے میں قدم قدم پہ ہوتی ہے۔

---

❶ اس میں ہمارے ہاں کی شاعری بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی:

چاہے تم پاؤں گھسوؤ یا کہ رکو سر بسجود   بات پیشانی کی جو ہے سو پیش آنی ہے

خدا کی طرف سے لکھی گئی کسی بات سے بچنے کی کوشش کا عمل خدا کے ساتھ جنگ کرنا ہوگا:

خدا کی تقدیر میں ان کے عقیدے کے مطابق لکھ دیا کہ اسے بخار ہوا ہے' تین دن تک بخار رہے گا' ہٹ نہیں سکتا اور ہم ہیں کہ جونہی بخار ہوا' بھاگ دوڑ ہو رہی ہے' ڈاکٹر کو بلاؤ' حکیم کو بلاؤ' یہ دوائی دو۔ ارے! جب یہ تقدیر میں ہے' خدا نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ یہ بخار آ گیا تین دن تک ضرور رہے گا تو یہ درمیان میں آپ کیا کر رہے ہیں' کیا تین دن سے پہلے آپ اسے ہٹا دیں؟ اور اگر آپ کچھ بھی نہیں کریں گے تو تین دن کے بعد تو اس نے ہٹ جانا ہے۔ کیا یہ جنگ نہیں ہے خدا کی تقدیر کے ساتھ؟ بھئی! یہ کیوں کرتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ ذرا ان کی باتیں سنا کر دلیلیں جو دیتے ہیں کہ ''جی تقدیر برحق ہے یہ آ تدبیر وی فرض ہیگی اے اخ ❶'' قرآن بتاتا ہے کہ **اسمآء سمیتموھا انتم واٰبآؤکم** (7:71) چند الفاظ چند اصطلاحیں' چند نام تم نے رکھ لیے' تمہارے بڑوں نے رکھ لیے دہرائے چلے جا رہے' تم اس کو دہرائے چلے جا رہے ہو۔ کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ کہہ کیا رہے ہیں؟ کہا کہ یہ آگے سے کہتے ہیں کہ یہ جو غریب ہیں' یہ تو خدا کے بنائے ہوئے غریب ہیں۔ غریبوں کی حالت کو بہتر ہے تو یہ خدا کے ساتھ جنگ ہو جائے گی' تم کیا کہتے ہو۔ کہا کہ کافر یہ

جواب دیں گے۔ان سے ہو کہ ان انتم الا فی ضلٰل مبین(36:47) کھلی ہوئی گمراہی کے اندر ہو یہ جو تم اس قسم کی بات کرتے ہو۔

---

❶ جی! تقدیر تو برحق ہے مگر یہ تدبیر بھی تو فرض ہے۔

انسانی بدعملیوں سے بچنے کا ایک ہی طریق اپنے غلط تصورات سے نجات پانے میں ہی ہے:

جیسا کہ میں نے کہا تھا' عزیزانِ من! بات تو اس میں قول فیصل' وہی ابلیس اور آدم کا قصہ ہے۔قرآن ایسے حسین انداز میں بات کر گیا ہے۔آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی تھی۔جیسا کہ عام روایت ہے' کچھ بھی ہو' قرآن نے کہا ہے کہ ایک ہم نے حکم دیا تھا' اس کی معصیت ہوئی۔ابلیس کو بھی حکم دیا تھا' اس سے بھی معصیت ہوئی تھی۔دونوں کا جرم یکساں ہے۔آدم سے کہا گیا کہ آدم! یہ تم نے کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ ربنا ظلمنا انفسنا (7:23) میرے نشوونما دینے والے! میری غلطی تھی' یہ میری ذمہ دار ہوں مجھ سے لغزش ہوگئی۔ کہا کہ ٹھیک ہے تم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا' کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی' تمہارے لیے امکان ہے کہ تم غلطی کی اصلاح کر لو گے۔فان یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدایا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (2:38) مت گھبراؤ' غلطی ہو جایا کرتی ہے لیکن غلطی کے احساس کے بعد اگر اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیتے ہو' اس سے اصلاح ہوگی' تمہاری اصلاح ہو سکے گی۔ابلیس سے کہا کہ کیوں بھئی! تم نے سرکشی کیوں اختیار کی؟ اس نے کہا کہ صاحب! میں کون ہوں سرکشی اختیار کرنے والا؟ تو نے مجھے گمراہ کیا اور میں نے یہ کہہ دیا۔کہا کہ جاؤ! تم ابدی طور پہ دھتکارے گئے' تمہاری اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔جو اپنی ذمہ داری کو دوسرے کو اُوپر لوٹاتا ہے' اس کی اصلاح کیا ہوگی؟ یہ جو کہتے ہیں کہ ابلیس قیامت تک کے لیے دھتکارا گیا ہے۔

قصہ ابلیس وآدم کی حقیقت اور اس سے سبق اموزی کی کیفیت:

وہ ابلیس اور آدم کوئی افراد نہیں ہیں' یہ تو ذہنیتیں ہیں۔جہاں آپ نے یہ ذہنیت رکھی کہ ہاں! اپنی غلطی کا میں ذمہ دار ہوں' آپ کی اصلاح کا امکان ہو گیا۔جہاں آپ نے اپنی غلطی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا کہ اسے کس کے سر منڈھوں اور جو ادھر ادھر کوئی انسان سامنے نظر نہ آیا اور اگر نظر بھی آیا تو اس کے ذمے آپ نے یہ غلط اسے منڈھ دیا تو وہ تو تھوپڑ مارے گا۔تو ایک تو آپ کے ہاں جو غریب کی جورو ہے یہ سب کی بھابھی ہوتی ہے' اللہ میاں کے ذمے لگا دیا کہ صاحب! تو ہی کرنے والا ہے' میں کون ہوں یہ کچھ کرنے والا۔کہا کہ یہ وہ ہے جس کی اصلاح قیامت تک نہیں ہو سکتی۔یہ ابلیسیت ہے۔ابلیس وآدم کا تو قصہ ہی اتنا ہے' برادرانِ عزیز! اگر آپ نے اپنے آپ کو صاحب اختیار قرار دیا' اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا' ندامت سے نگاہ جھک گئی آپ کی اصلاح ہوگئی۔یہ صحیح ذہنیت ہے' چھنے ہوئے فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لیے راستے مل گئے اور اگر آپ نے اپنی لغزش' اپنی خطا کوشی کے لیے ذمہ داریاں' دوسروں پہ ڈالنا

شروع کر دیں اور آپ ذمہ دار نہ بنے حتیٰ کہ خدا تک بھی پہنچ گئے' ابدیت تک آپ ابلیسیت کے اندر شمار رہیں گے اور ابلیس کے تو معنی ہی محروم ہوتے ہیں' مایوس ہوتے ہیں' اصلاح کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ مسئلہ تقدیر تو سارا اتنا سا ہی ہے۔

آپ ملوکیت میں کسی بادشاہ سے اس کا حکم کی حکمت نہیں پوچھ سکتے:

عزیزانِ من! یہی چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے اور آپ کو یاد ہوگا کہ کسی ایک کنونشن کے ایک خطاب میں جس کا عنوان تھا غالباً ''خدا کی مرضی'' تھا' میں نے یہ چیز اس میں آخر میں کہی تھی کہ اس کی ساری وجہ یہ ہے کہ ہزار سال سے ہماری قوم مستبد حکام' بادشاہوں اور شہنشاہوں کے پنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ جن کا اسلوب حکومت ہی یہ تھا کہ جسے چاہے' جو چاہے کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے حکم دیا جاتا ہے۔ عام طور پہ حکم کے معنی ہوتے ہیں جس میں حکمت نہ بتائی جائے' کیوں تم ایسا کرو' سوال نہیں ہے۔ بادشاہ کی مرضی ہے جیسے وہ حکم دے دے' کرنا ہوگا' تاویل کرنی ہوگی' اطاعت کرنی ہوگی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اگر

اگر شبہ' روز را گوید شب است ایں

کہ اگر وہ بادشاہ دن کو کہہ دے کہ رات ہے۔

بباید گفت' اینک ماہ و پرویں

تو تم فوراً کہہ دو کہ سبحان اللہ صاحب! چاند نکلا ہوا ہے' اوپر کہکشاں تارے ہیں۔ پھر یہ ذہنیت ہو جاتی ہے۔

کسی سے قانون کی اطاعت کروانے کا ملکہ کیسے حاصل ہوتا ہے

لہٰذا جو قوم اطاعت اور تعمیل کو سمجھ ہی نہ سکتی ہو تو پھر اس قوم سے قانون کی اطاعت کیسے کرائی جائے اور یہ کہ اس سے قانون کی اطاعت کون کرا سکتا ہے؟ بڑی اہم چیز ہے۔ عزیزانِ من! کہ یہ کسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اس سے قانون کی اطاعت کرائے؟ خدا قادرِ مطلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اتنی لامنتہا قوتوں کے باوجود اس نے یہ کہا کہ **کتب علٰی نفسه** (6:21) ہم نے اپنے اُوپر جو فرض قرار دے لیا ہے کہ ہم ایسا کریں گے اور ایسا نہیں کریں گے' ہم نے اپنے اُوپر ایک پابندی عائد کی' اپنے لامحدود اختیارات کو ایک پابندی کے اندر خود جکڑ لیا اور اس کے بعد کہا کہ **لن تجد لسنة الله تبديلاً** (33:62) ہم اس میں کبھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ اتنی بڑی قوتوں کا مالک جس کے ایک کن سے کائنات وجود میں آ جاتی ہے' وہ کہتا ہے کہ ہم نے خود اپنے اُوپر ایک پابندی عائد کی اور پھر وہ ایسی عائد کی کہ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسے خدا بننے کا حق ہے۔ لامنتہا قوتوں کے باوجود اتنی بڑی پابندی کہ جس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! دنیا میں اطاعت لینے کا حق اس کو ہے کہ جتنے اختیارات وسیع ہوتے جائیں اتنی پابندیاں اپنے اُوپر عائد کرتا چلا

جائے اور خود کبھی اس پابندی کی خلاف ورزی نہ کرے۔

قانون کی اطاعت کرنے والے کے دل و دماغ کی کیفیت:

یہ ہے خدا کی صفت میں رنگا ہوا حاکم۔ یہ قانون کی اطاعت ہوگی اور قانون کی اطاعت وہ ہوتی ہے کہ جس کے بعد پھر **ثــــم لا یـجـدوا فـی انفسهم حرجًا مما قضیت** (4:65) اس کی اطاعت میں دل کے اندر بھی آدمی گرانی محسوس نہیں کرتا۔ پیاس لگتی ہے اندر کا' ایک حکم ہوتا ہے نہیں' یہ حکم نہیں ہوتا بلکہ اندر کا ایک تقاضا ہے۔ یہ قانون ہے کہ پیاس لگے تو پانی سے پیاس بجھتی ہے۔ کس طرح آپ اس کی اطاعت کرتے ہیں؟ کیا کبھی اس اطاعت پہ آپ نے گرانی محسوس کی ہے کہ کیا مصیبت ہے صاحب! پانی پینا پڑتا ہے؟ نہیں بلکہ شکر کرتے ہیں کہ پانی مل گیا ہے۔ قانون کی اطاعت انسان کے اندرونی قلب کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کرتا ہے تو اس قلب کو اطمینان حاصل کرتا ہے۔

حکم کی اطاعت اور قانون کے تقاضے پر عمل میں ایک بنیادی فرق ہے:

حکم کی اطاعت' استبداد کی اطاعت ہوتی ہے' جو اُوپر سے اس کے اُوپر نافذ کی جاتی ہے۔ جبراً مجبوراً طوعاً و کرہاً اطاعت تو کرتا ہے مگر دل کے اندر سرکشی کے جذبات بیدار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ حکم کی اطاعت کرائی جائے گی' اس کا ردِعمل کسی دن سرکشی میں نکلے گا۔ قانون کی اطاعت کرتے چلے جائیں گے' ہر فرد کے اپنے اندرونی تقاضے پورے ہوتے چلے جائیں گے اور پھر عرض کر دوں کہ جس طرح سے خدا نے ایک ماڈل ہمارے سامنے پیش کر دیا کہ اپنی ذات کی لامنتہا قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود اپنے اوپر عائد کردہ قانون کا اتنا پابند کہ کبھی ان کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اسی طرح سے انسانوں کا یہ نظام بھی اسی صورت میں قائم رہ سکے گا کہ جتنے زیادہ اختیارات و اقتدارات ہوں اتنی ہی سخت پابندیاں اپنے اُوپر عائد کی ہوئی ہوں۔ یہ چیز ہوگی کہ جس طرح سے سلسلہ کائنات نہایت حسن و نظم سے چل رہا ہوگا انسانی زندگی' تمدنی زندگی بھی اسی طرح سے حسن اور نظم کے ساتھ چلے گی۔ بات یہاں سے چلی تھی۔ کہا کیا جائے گا' پھر سن لیجیے۔ خدا ہر قانون کو بدل سکتا ہے لیکن خدا اپنے متعین کردہ قوانین کو بدلتا نہیں ہے۔ پھر سن لیجیے' وہ بدل سکتا ہے مگر بدلتا نہیں ہے اور اس کے اس قانون کو نہ بدلنے کا جو اس نے اپنا عہد لے رکھا ہے' یہ نوعِ انسانی کے لیے سنیے' قرآن کے الفاظ میں' کہ کیا ہے؟

کسی انسان کی بجائے قران حکیم کی طرف سے قانون کی حکمرانی نوع انسانی کے لیے ایک آیہ رحمت ہے

عزیزانِ من! قرآن کیا باتیں کہہ جاتا ہے ایک مستبد حاکم کی اطاعت اور حکومت کو پہلے سامنے رکھیے یعنی سکھا شاہی کے بعد اگر آپ کے ہاں قانون کی حکومت آ جائے' اسے کس طرح سے آپ آیہ رحمت سمجھتے ہیں۔ سجاب کرم سمجھتے ہیں۔ ہے ہی یہ بات۔ ایک ایسی

حکومت میں جس میں کوئی قانون نہ ہو' کوئی قاعدہ نہ ہو' کوئی آئین نہ ہو' اگر اس کے بعد ایک اس قسم کا نظام مل جائے کہ جس میں بڑے سے بڑا صاحب اقتدار بھی کبھی قانون کے خلاف نہ خود کرے' نہ دوسروں سے کرائے' یہ کتنی بڑی رحمت ہوگی۔ خدا نے قانون دیا کہ یاد رکھو! یہ بات نہیں ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں' حکومت دے دیتے ہیں۔ نہیں' بلکہ کہا کہ **ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یوثھا عبادی الصلحون** (21:105) یاد رکھو! دھاندلی نہیں ہے' لاقانونیت نہیں ہے' زمین کی حکومت کا حق دار وہ ہے جو اپنے اندر قانون کی اطاعت کرنے' قانون کی اطاعت کرانے کی صلاحیتیں پیدا کرلے جو قوم یہ کرلے اس قوم کے لیے یہ چیز ملتی ہے کہا ہے کہ **ان فی ھٰذا لبلٰغًا لقوم عٰبدین** (21:106) اے وہ قوم! تم نے سرکشی کی زندگی تو اختیار کرنا نہیں ہے بہرحال کسی نہ کسی قاعدے قانون کے مطابق' کسی محکومیت کے مطابق' زندہ ہونا ہے۔ کہا کہ اس اصول میں جو ہم نے بیان کیا ہے' اس قوم کے لیے' جس نے محکومیت کی زندگی بسر کرنی ہے' بہت بڑے اصول کا اعلان ہے' دل میں اترنے والی بات ہم نے کہہ دی ہے۔ **لبلٰغًا لقوم عٰبدین** (21:106) تمدنی زندگی بسر کرنے والی قوم کے لیے' وہ جو انفرادی زندگی تھی' اس کے دور سے تو انسان نکل گیا۔ اب تمدنی زندگی میں آیا۔

انسانی زندگی کا ہر آنے والا دن اُن غیر متبدل اصولوں کی طرف گامزن ہے جو قدرت نے قرآن حکیم میں دے رکھے ہیں

یہاں عابدین کا لفظ بڑا عجیب ہے کہ جب بھی کسی قوم نے تمدنی زندگی کے آئین وضوابط کے مطابق اپنا نہج' اپنا نظام قائم کرنا ہے اس کے لیے **لبلٰغًا** (21:106) دل میں اترنے والی بات ہے جو ہم نے کہہ دی۔ سنیئے' عزیزانِ من! آگے کیا کہا ہے؟ کہا کہ **وما ارسلنک الا رحمۃً للعٰلمین** (21:107) دھاندلیوں کا در گزر گیا' سکھا شاہی کا دور گزر گیا' قانون کا آئین کا نظام آ گیا۔ اے رسول! اس معنوں میں تو عالم انسانیت کے لیے رحمت بن کر آ گیا۔ دیکھا کہاں آیا ہے یہ؟ یہ پیغام خدا کا عالمین کے لیے کس طرح رحمت بنتا ہے اور وہ جو اس پیغام کا لانے والا تھا' جس نے سب سے کہا کہ **وانا اول المسلمین** (6:163) سب سے پہلے میں اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں اور اس کے بعد ہر شخص سے قانون کی اطاعت کرائی۔ اختیارات میں خدا یقیناً آسمانوں کے اوپر بہت بڑا ہے' زمین کے اوپر ایک رسول کے اختیارات ہی اپنی اُمت کے لیے کچھ کم نہیں ہوتے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے رسول کا مقام کہ **فلا وربک لا یؤمنون حتٰی یحکموک فیما شجر بینھم** (4:65) تیرے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر معاملے میں تمہیں ثالث اور حکم نہ مقرر کریں۔ دیکھتے ہیں اختیارات اور پھر مقرر کرنے کے بعد کہا کہ **ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیمًا** (4:65) پھر تمہارے فیصلوں کے خلاف اپنے دل کے اندر بھی گرانی محسوس نہ کریں۔ دیکھتے ہی کتنا بڑا

اختیار ہے یہ۔ اتنے بڑے اختیارات کا حاکم' وہ کہتا ہے کہ انا اوّل المسلمین (6:163) میں تم پر حکومت نہیں کر رہا صرف تم سے نہیں اطاعت کرا رہا' میں سب سے پہلے خود اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں اور اس کی عملی مثالیں پھر اپنی عدیم النظیر سیرت سے تعلیم کے ساتھ' اپنے عمل سے حضوؐر نے کر کے دکھا دیں۔ عجیب دور تھا مثلاً مدینے کی ایک لونڈی (اس زمانے میں ابھی وہ پہلے باقی کی تھیں) جس کی Individuality تشخص' انفرادیت اپنا ہوتا ہی نہیں تھا' حیوان کی طرح بکی ہوئی فروخت شدہ شے ہوتی تھی' مقبوضہ مملوکہ یہ حیثیت تھی' اس رحمت للعالمینؐ نے ان کی پہلی حیثیت تو یہ دی کہ وہ ''بریرہ'' اپنے مالک سے اور اس زمانے میں لونڈیوں کو گھر میں بیویوں کی حیثیت نہیں تھی' یہ جو زناشوئی کے تعلقات تھے' ان کے لیے تھیں وہ لونڈی ان کو چھوڑ کر چلی آئی۔ اس نے آپؐ سے کہا' حضوؐر سے کہا کہ بریرہ رُوٹھ کر چلی آئی ہے آپ سفارش کر دیجیے۔

قرانِ حکیم کی تعلیم کا خلاصہ پیغامِ موت سے ہر نوح غلامی کے لیے:

دیکھا یہ جو غلاموں کے آقا اور مالک تھے غلام ابھی گھروں میں موجود ہیں' ذہنیت میں کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے' آخر میں تو پہنچنا ہے کہ جب کوئی غلام نہ رہے آئندہ کے لیے قطعاً غلامی کا دروازہ بند ہو جائے۔ یہ جو درمیانی پیریڈ (عرصہ) ہے اس میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے ورنہ کوئی آقا کسی غلام کے متعلق یہ کہے کہ صاحب! اس کو ذرا سمجھا دیجیے۔ بریرہ کے اس مالک نے کہا کہ حضوؐر اس کو ذرا سمجھا دیجیے۔ راستہ چلتے ہوئے وہ کہیں کھڑی ہو کر آپ سے مل گئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ بریرہ کیا بات ہے' تم اپنے آقا سے رُوٹھ کر چلی آئی۔ کہنے لگی: جی ہاں آپؐ نے کہا کہ نہیں بریرہ اچھی بات ہے' واپس چلی جاؤ۔ اب دیکھیے کہ مدینے کی ایک لونڈی ہے' میں صرف نسبتوں کے اعتبار سے لونڈی کہہ رہا ہوں۔ کہنے والا خدا کا رسولؐ ہے جس کے نام کے ساتھ نسبت سے یہ مسلمان ہوئی ہے' محسن اتنا بڑا ہے کہ لونڈی کے مقام سے اس کو برابری کا مقام دیا جا رہا ہے۔ سربراہِ مملکت' کیپٹل سٹی کے اندر' حاکم اسے یہ کہہ رہا ہے کہ بریرہ واپس چلی جاؤ۔ تعلیم نبویؐ ہے عزیزانِ من! قانون کی اطاعت پہ عمل کر کے دکھانے والا ہے' رسول اس سے وہ لونڈی پوچھتی ہے کہ حضوؐر! یہ آپ خدا کے قانون کے مطابق حکم دے رہے ہیں یا صرف مشورتاً کہہ رہے ہیں۔ جراتیں' یہ تھیں ترتیب نبوی سے عزیزانِ من! ذہنیتیں بدل دیں۔ جراتیں بیدار ہو رہی ہیں کہ کون کس کو کہہ رہا ہے۔ قانوناً حکم دیتے ہیں تو سر تسلیم خم ہے' دل میں بھی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ کہنے والے کی بھی یہ کیفیت ہے۔ کون سی بات تھی یہ کہا جاتا کہ تم کون ہو پوچھنے والی' میں نے کہا کہ جاؤ تو چلی جاؤ۔ آپؐ سے فرمایا کہ نہیں بریرہ! یہ قانون کا حکم نہیں' میرا مشورہ ہے اور بریرہ کہتی ہے کہ حضوؐر پھر میں اپنے حالات کو آپ سے بہتر جانتی ہوں۔ وہ بھی ہنس کر چلی دی' آپ بھی ادھر ہنس کر چلے گئے۔ اللہ اکبر! یہ قانون کی اطاعت ہے حکم کی اطاعت نہیں ہے۔ یہ سکھائی تھی قانون کی

اطاعت۔ یہ تھا وہ کہنے والا کہ تم تو ایک طرف رہے، میں بھی اگر اس کے قانون سے سرتابی کروں تو یاد رکھیے! میں بھی عذاب یومِ عظیم سے تمہاری طرح ڈرتا ہوں۔ یہ ہے قانون کی اطاعت۔

نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اور آزادی رائے کا احترام:

آپ نے غور فرمایا کہ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (21:107) اب سوال یہ ہے کہ آنے والا رحمت کیسے بنتا ہے؟ یہ اس طرح سے بنتا ہے کہ دھاندلیوں والے، لاقانونیت والے، لاآئینیت والے نظام کو بدل کر خالص قانون کا نظام نافذ کرتا ہے۔ ان فی ھٰذا لبلٰغًا لقوم عابدین (21:106) وہ قومیں کہ جنہوں نے بہرحال کسی Constitution (آئین) کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے، ان کے لیے اس کے اندر بڑی عظیم حقیقت پوشیدہ ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اے رسول تو عالمین کے لیے، اقوامِ عالم کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ جو جو قوم بھی یہ روش اختیار کرے گی، خدا کے دیے ہوئے ابدی اٹل قوانین اور اطاعت صرف ان قوانین کی ہوگی کسی فرد کے حکم کی نہیں، وہی قوم ہے جس کے لیے یہ رسول رحمت بن جائے گا اور جہاں پھر لاقانونیت آجائے گی پھر وہ اسی اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں چلے جائیں گے اور پھر یہ اس کی رحمتیں کسی اور جگہ پہ جا کر ابر کرم برسائیں گی۔ پھر ان کی کھیتیاں تو کبھی پروان نہیں چڑھیں گی۔ عزیزانِ من! وقت ہو گیا، آج ہم سورۃ البقرہ کی 247 آیت تک آئے۔ خدا کرے کہ جو نکتہ میرے سامنے تھا، تھوڑے سے وقت میں اس کی وضاحت کر گیا ہوں۔ کوئی بات اگر تشنہ رہ جائے تو میں کہا کرتا ہوں کہ آپ جس وقت جی چاہے، پہلے وقت مقرر کر کے میرے پاس آیئے میں پھر اور زیادہ وضاحت کی کوشش کروں گا۔ معاملہ بڑا اہم ہے۔ اطاعت خدا کے اٹل قوانین کی ہے کسی کے حکم کی نہیں ہے اور اطاعت کرانے والا سب سے پہلے خود قانون کی اطاعت کرے گا پھر اس کو حق پہنچے گا کہ وہ دوسروں سے اطاعت کرائے ورنہ وہ یہ کر نہیں سکتا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀……❀……❀

پچاسواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 248 تا 252)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى
وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ
قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ
غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا
الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ڐ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ
فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْھَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 29 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے درس کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 248 سے آغازِ کلام ہوگا۔ (2:248)

حضرت طالوت اور جالوس کے مابین جنگ کے دوران قوم کا اعتراض اور وحی کا معیار:

بات چلی آ رہی تھی کہ جنت میں داخلہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جواب یہ تھا کہ اس کے لیے میدانِ جنگ میں جا کر ٹکٹ حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد میں نے عرض کیا تھا جیسا کہ قرآنِ کریم کا یہ انداز ہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کرتا ہے اور اس کی شہادت تاریخ کے واقعات سے پیش کرتا ہے کہ محسوس شہادات سے مجرد حقیقتیں اچھی طرح سے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ سابقہ اقوام میں بنی اسرائیل کی داستان بڑی نمایاں طور پر قرآن کریم میں مذکور ہے اور انہی کا ایک واقعہ اس سلسلے میں قرآن نے درج کیا ہے اور وہ ہے حضرتِ طالوت کا مقابلہ جالوس کے ساتھ۔ پہلی چیز تو اس میں یہ ہمارے سامنے آئی تھی کہ قوم نے خود یہ کہا تھا کہ جب میدانِ جنگ میں ہم نے جانا ہے تو ہمارے لیے ایک کمانڈار مقرر کر دیجیے اور جب وہ مقرر کیا تو اس پہ اعتراض کیا کہ یہ تو کسی بڑے امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہے۔ یہ وہی فطرتِ شیطان کہ

جوامیر ہے وہی کماندار ہوگا' پہلے دن سے چلی آ رہی ہے' ہر عزت کا مستحق امیر یا امیر کا بیٹا ہے۔ کہا کہ فوج کی کمانداری کے لیے تمہارے لیے انتخاب کیا جارہا ہے' اس کے لیے تم امارت کو وجہ انتخاب بتاتے ہو۔ ہم نے جسے منتخب کیا ہے' وہ ہے کہ جس میں کمان کی صلاحیتیں موجود ہیں زادہ بسطۃ فی العلم والجسم (2:247) میں نے عرض کیا تھا کہ Physique (جسم) میں جسمانی قوت میں اور علم میں' دونوں میں' اس کو فراوانی حاصل ہوئی ہے اور بسطۃ کے معنی میں نے گزاری کیا تھا کہ صرف فراوانی نہیں' یہ اس فراوانی کو کہتے ہیں کہ جسے کوئی شخص صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھے بلکہ انسانیت کو عام فائدہ پہنچے یہ بسطۃ وہ فراوانی ہوتی ہے تو کہا کہ ایک تو ذاتی طور پہ اس میں یہ کیفیت ہے کہ اسے علم بھی حاصل ہے جس فن یا جس منصب کے لیے اسے منتخب کیا جارہا ہے' اس کا پورا پورا اسے علم حاصل ہے Physique بھی حاصل ہے کہ فوج کا کماندار بنانا ہے اور پھر اگلی چیز جو اسے مومن سپاہی بنارہی ہے' وہ اس کا یہ فن ہے' اس کی صلاحیتیں ہیں' اس کا علم ہے' اس کی قوتیں توانائیاں اپنی ذات کے لیے نہیں ہیں' نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے ہیں۔ کہا کہ اس سے کہو کہ یہ معیارِ انتخاب ہے یا وہ معیارِ انتخاب ہے کہ جس نے جس طرح دولت سمیٹ لی اس کو وہ کچھ بنادیا اور پھر میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وجہ بتانے کے بعد یہ کہا تھا کہ یؤتی ملکہ من یشآء (2:247) اور جس کا ترجمہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے کہ پھر صاحب! ہم تو یہ قوت' استحکام' مملکت' اقتدار جسے چاہتے ہیں' دے دیتے ہیں۔ یہ جسے چاہتے ہیں والی بات نہیں تھی۔ خود ہی اس نے بتایا ہے کہ کیوں دیا ہے اور جب کیوں بتا دیا جائے تو پھر اگلی چیز کہ صاحب! جسے چاہتے ہیں دے دیتے ہیں کی کچھ اس سے تک ملتی نہیں۔ کہا یہ ہے کہ ہمارا قانونِ مشیت ہے جس کے مطابق انتخابات عمل میں آتے ہیں۔ جو جس کا اہل ہوتا ہے جس میں جس کی صلاحیتیں ہوتی ہیں' اس کو وہی کچھ دیا جاتا ہے۔ جب انہوں نے کہا تھا کہ ہم لڑنے کے لیے جائیں گے'' تے کر جنے دے تے دند کسے ویکھے نئیں ہوندے [1] '' انہیں معلوم تھا کہ یہ Stuff ہے کیا۔ وہیں شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ اس وقت تو تمہیں بڑا چاؤ نظر آتا ہے لیکن جب میدانِ جنگ میں جاؤ گے اور دشمن سامنے آئے گا تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہاں تم پیٹھ دکھا کر بھاگ جاؤ گے۔ ہمت ہے اس قسم کی؟ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمت کیوں نہ ہو؟ کیوں نہ ہم لڑیں گے؟ ہمیں اپنے گھر سے نکال دیا ہے' بیوی بچوں سے الگ کر دیا گیا ہے تو ہم کیا اس کے بعد بھی نہیں لڑیں گے۔ یعنی کچھ غیرت کا تقاضا بھی بتا دیا گیا لیکن ٹیسٹ تو کہیں آگے چل کر ہوتا ہے اور وہ یہاں بات ہوئی۔ انتخاب ہوگیا وقال لھم نبیھم ان اٰیۃ ملکہ ان یاتیکم التابوت فیہ سکینۃ من ربکم وبقیۃ مما ترک اٰل موسٰی ھٰرون تحملہ الملٰئکۃ (2:248) ان کے نبی نے ان سے کہا کہ جسے خدا نے اس منصب کے لیے منتخب کیا ہے اس کی پہلی نشانی توباتِ سکینہ ہوگی۔

---

[1] کھر چنے کے دندانے تو کسی نے دیکھے نہیں ہوتے۔

تابوت سکینہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم اور تورات کا بیان:

اب یہاں ایک چیز آئی ہے کہ وہ تابوتِ سکینہ (عام ترجمہ جو کیا جاتا ہے) واپس لے کر آئے گا جس میں موسیٰ اور ہارون کے باقیات ہیں اور اسے فرشتے اُٹھائے ہوتے ہیں۔ یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ دراصل تورات کے بیان پر مبنی ہے۔اس میں یہ ہے کہ ان کا سونے سے منڈا ہوا ایک صندق ہوتا تھا اس میں تبرکات ہوتے تھے' وہ محفوظ رکھا تھا' کچھ عرصے کے بعد دشمن اس کو چھین کر لے گیا اور یہ اس کی واپسی کے لیے بہت متردد اور پریشان تھے اور کہا یہ گیا کہ اس کی پہلی نشانی یہ ہے کہ یہ وہ تابوت واپس لے آئے گا۔ پھر اس تابوت کو فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے' وہ پھر واپس چھوڑ گئے۔ تورات کا یہ بیان ہے۔اب وہ تو ان باریکیوں میں جاتے نہیں تھے کہ اگر فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے' انہی کا تابوت تھا' تو پھر وہ یہ انتظار کیوں کرتے رہے کہ یہ طالوت آئے' کماندار بنے' فوج آئے' وہ آگے بڑھے' پھر وہ فرشتے لے کر آئیں۔ یہاں تابوت ہے جس میں سکینت ہے۔

مجر جی زبان کی وسعت اور اس کی خصوصیت اور پھر اسے سمجھنے کا طریق:

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں بھی یہ بنیادی نقص ہو گیا کہ ایک لفظ کا ایک معنی لیا گیا اور ہر جگہ وہی معنی چسپاں کیے گئے۔ حالانکہ اہل زبان جانتے ہیں' ہر زبان میں یہ کیفیت ہے کہ ایک لفظ کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور عربی زبان میں تو پھر یہ خصوصیت بڑی وسیع ہے' خود زبان بڑی وسیع ہے۔ ایک اس کے مادے کے اعتبار سے' بنیادی معنی ہوتے ہیں پھر استعمال کے اعتبار سے مختلف مقامات پر اس کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور یہ نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کو وہ معنی پہنا دے۔ اہل زبان نے وہ معنی متعین کیے ہوتے ہیں اور اسے ہمیں کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قرآنِ کریم کلام تو خدا کا ہے' اترا ہے عربی مبین میں' ان لوگوں کی زبان میں جو صاف واضح زبان ہے۔ لہٰذا اس کے الفاظ کے معنی سمجھنے کے لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ اہل زبان اسے کس معنی میں لیتے تھے اور جب وہ چیز سامنے آ جائے معنی متعین ہو جائیں اور پھر قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں اسے دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کا اندازہ یہ ہے کہ وہ تصریف آیات سے اپنے مطالب کو واضح کرتا ہے۔ ایک بات ایک جگہ کہتا ہے' دوسرے مقامات اس کی تشریح کرتا ہے' تفصیل دیتا ہے' استثنا کرتا ہے' اضافہ کرتا ہے اور اگر وہ سارے کے سارے مقامات سامنے آ جائیں تو قرآن کی کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جو تشنہ تفصیل رہ جائے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ وہ کیا لائے گا؟ کہا کہ تابوت لائے گا۔

تابوت کو صندوق کے علاوہ قلب کو بھی کہا جاتا ہے اور سکینت کو تسکین بھی:

ٹھیک ہے تابوت صندوق کو بھی کہتے ہیں' تابوت قلب کو بھی کہتے ہیں دل کو بھی کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ہزاروں کی تعداد

میں، موت کے ڈر سے، گھر بار چھوڑ کر، بھاگ نکلے ہوئے تھے۔ تشتر اور اضطراب کا یہ عالم تھا کہ پھر کہیں ایک مرکز پہ جمع نہیں ہو سکتے۔ دل ہے کہ وہ اضطرابِ پیہم اور اضطرار کی آماجگاہ بن رہا ہے، سکون نصیب نہیں ہے۔ پہلی چیز یہ کہی کہ ٹھیک ہے، فتح تو ہوگی اور سب سے بڑی جو اس قسم کے کماندار کی زیرکمان حاصل ہوگی وہ یہ ہوگی کہ تمہیں ایک قلب ملے گا جس میں سکینت ہوگی، تسکین قلب حاصل ہو جائے گی۔ سب سے بڑی دولت تو یہ ہے لیکن یہ سکونِ قلب وہ نہیں ہے جو افیونیوں کو حاصل ہوا کرتا ہے، یہ وہ نہیں ہے جو زاریوں میں اور تکیوں میں حاصل ہوا کرتا ہے، کونوں میں اور حجروں میں حاصل ہوا کرتا ہے۔

انسانی ذات کے لیے سب سے بڑی دولت تو اس کا سکونِ قلب ہے:

برادرانِ عزیز! میدانِ جنگ میں فتح کے بعد جو سکون حاصل ہوتا ہے، یہ وہ سکون ہے جو بتایا گیا ہے۔ Positive (مثبت) سکون تو یہ ہوتا ہے کہ آپ شر کی قوتوں کے اُوپر غالب آ جایئے اور اس کے بعد جو آپ کو توازن نصیب ہوتا ہے، آپ کی Personality میں اسے سکینیت کہتے ہیں۔ ایک اطمینان ہوتا ہے ایک فریب نفس ہوتا ہے اور ایک اطمینان بذکر اللہ ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے برعکس ایک اطمینان افیون کا ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن Positive (مثبت) سکون، تسکین عطا کرتا ہے اور اس کے لیے ہم نے دیکھ لیا کہ کہاں جا کر یہ ہوتا ہے۔ فوج مرتب ہو رہی ہے، میدانِ جنگ میں جایا جا رہا ہے، وہاں کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے بعد کہا گیا ہے کہ اس میں پھر تمہارے قلب کو ایک سکون حاصل ہوگا اور حضرتِ موسیٰؑ اور ہارون ان کی جو صحیح صحیح تعلیم تھی اور جو تم سے کھوئی گئی، جس کے تم پابند نہ رہے، وہ اس تعلیم سے واپس لے آئے گا۔ یہ جو تحملہ الملئکة (2:248) ہے کہ یہ ملائکہ اسے اُٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ اُٹھائے ہوئے والی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ حفاظت میں رکھے ہوئے کائناتی قوتیں اس تعلیم کی حفاظت کر رہی ہیں۔ تم سے تو چھن گئی ہے، وہ موجود ہیں، کائناتی قوتیں ان کی حفاظت کر رہی ہیں۔ اب یہ جو چیز تمہیں میسر آئے گی تو اس کے بعد ایک سکون آمیز قلب ہوگا، وہ صحیح تعلیم ہوگی جو موسیٰؑ اور ہارونؑ چھوڑ گئے تھے اور جو اب تمہارے پاس نہیں رہی، اور اس کی محافظت کائناتی قوتیں کر رہی ہیں۔ یہ سارا کچھ تمہیں نصیب ہو جائے گا، اس ایک کماندار کی زیرکمان میدانِ جنگ میں جا کر اگر تم نے ثبات اور استقامت سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ ان فی ذالک لایةً لکم ان کنتم مؤمنین (2:248) جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، اگر اس پہ تم یقین رکھتے ہو، تو اس میں تمہارے لیے بات کے سمجھنے کی بہت بڑی نشانی ہے۔ سوچو

آیت تو ایک حقیقت کو سامنے لانے کا ذریعہ ہوتی ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ہم عام طور پہ آیت کہتے ہیں وہ ایک محسوس Symbol (نشان) ہوتا ہے کسی ایسی حقیقت کا جو، اس وقت

سامنے نہیں ہوتی۔ آگ آیت ہوتی ہے' وہ دھواں جو دور سے نظر آتا ہے۔ جب خود آگ سامنے آ جائے تو پھر اس کے لیے وہ آیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ آیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ حقیقت سامنے نہ ہو لیکن کوئی علامت اس قسم کی ہو جس سے یقینی طور پہ معلوم ہو جائے کہ اس کے نیچے وہ حقیقت موجود ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ابتدا میں قرآن نے یہ کہا تھا کہ **یؤمنون بالغیب** (2:3) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غیب جسے ہم اپنے ذہن میں کہتے ہیں کہ جی وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں' یہ وہ صداقتیں ہیں جو ابھی مشہود بن کر سامنے نہیں آئی ہوتیں لیکن انہوں نے آنا ہوتا ہے ان پہ وہ یقین رکھتے ہیں۔ یقین کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟ یہ علامات کہ جن کی وجہ سے پہچانا' جانا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے وہ حقیقت موجود ہے۔

ایمان کی پہلی سٹیج وہ علامات ہیں جو اوجھل حقائق کی ترجمان ہوتی ہیں:

ایمان کی پہلی سٹیج یہ ہے کہ ان علامات سے حقائق کے متعلق یقین ہو اور اس کے بعد عین الیقین ہوتا ہے جب وہ خود حقائق سامنے آ جاتے ہیں۔ کہا کہ اس وقت جو ہم اس کی علامت اور نشانی کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں کہ یہ چیزیں تمہیں میسر آ جائیں گی۔ آگے کہا کہ **فلما فصل طالوت بالجنود** (2:249) پھر وہ میدانِ جنگ کی طرف چل پڑے۔ **قال ان الله مبتليكم بنهر** (2:249) نبی نے پہلی ہی چیز وہ کہی تھی کہ تمہارے انداز' تمہارے لچھن' ایسے ہیں کہ جن سے یہ نظر آتا ہے کہ اب تو تم کہتے ہو کہ ہم میدان میں جائیں گے لیکن میدانِ جنگ میں جب دشمن کا سامنا ہوگا' ایسا نظر آتا ہے کہ تم وہاں کھڑے نہیں رہ سکو گے۔ اب چلے ہیں تو پہلی بات یہ آ گئی۔ فوج کے لیے اور فوج ہی کیا' ہر انسان کے لیے Discipline مقدس چیز ہے' جسے Self Control یا ضبط خویش کہا جاتا ہے' اپنے آپ کو کنٹرول رکھنا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی تربیت تو سپاہی کو دی جاتی ہے کہ وہ خارج سے جو حکم آتا ہے' وہ اس کے ماتحت کنٹرول میں رہتا ہے۔ یا اس تربیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتی ہے اصل میں مقصد اس کے لیے ہوتا ہے کہ پھر یہ انتظار نہ رہے کہ باہر سے کوئی حکم دینے والا اپنے حکم کو اس کے اُوپر Impose (عائد) کرے اور پھر یہ اس کے ڈسپلن اور کنٹرول میں رہے۔ آخر میں چل کر تربیت ایسی ہو کہ اپنے آپ پہ خود کنٹرول رکھنا شروع کر دے۔ فوج میں کنٹرول کی یا ڈسپلن کی کتنی اہمیت ہوتی ہے؟ پہلے ہی قدم کے اُوپر یہ کہا گیا۔ کوچ کرتے' چلے آ رہے ہیں غالباً گرمی کا موسم ہوگا' ویسے بھی پیاس کی شدت ہوگی' کوئی ندی آئی۔ اب سیدھی سی بات ہے پیاس لگ رہی ہو' پانی سامنے ہو تو ایک چیز تو وہ ہوتی ہے جو بھیڑ بکریوں کی ہے' پیاس بھیڑیں اور بکریاں ایسے وقت میں کچھ انتظار نہیں کرتیں' پانی کی طرف Indisciplined بھاگتی ہیں۔ وہاں خارج سے چرواہے کی ایک آواز آتی ہے وہ ان کو روکتا ہے۔ انسانوں کے لیے یہ صورت ہے کہ ایسے وقت میں انہیں جو قاعدہ اور قانون بتایا جائے' وہ اس کے مطابق اپنے آپ کو خود روکتے ہیں اور فوج میں یہ

ڈسپلن تو قدم قدم پر سامنے آتا ہے۔ پہلے سے کہہ دیا گیا کہ اس انداز سے تم نے چلتے جانا ہے۔ یہ نہیں کہ راستے میں ندی آئے اور تمہیں پیاس لگے اور تم خود ہی بھاگ بھاگ کر اس ندی کی طرف چلے جاؤ اور پانی پینا شروع کر دو۔ پیاس لگ رہی ہے پانی موجود ہے' کہا گیا ہے کہ نہیں پینا۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو فوج میں ضرورت پڑتی ہے اور وہاں بیسیوں مقامات ایسے آتے ہیں کہ جہاں پیاس بھی لگ رہی ہے' پانی بھی سامنے بہہ رہا ہے لیکن فوج کی Strategy (حکمت عملی) کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت پانی کی طرف نہ جایا جائے' پیاس کو روک لیا جائے۔ بیسیوں تقاضے ہوتے ہیں جسے اس ڈسپلن کے ماتحت روکنا پڑتا ہے۔ اس کی تربیت کہاں ہوتی ہے؟

ڈسپلن کا عادی بنانے کے لیے روزے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں:

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ **کتب علیکم الصیام** (2:183) اور **کتب علیکم القتال** (2:216) قرآنِ کریم میں دونوں کے الفاظ وہی ہیں کہ تم پہ روزے رکھنے فرض قرار دیے گئے۔ تم پہ جنگ کرنا فرض قرار دیا گیا اس کے اندر کیا ربط ہے؟ ربط تو سامنے آ گیا ہے۔ میدانِ جنگ میں جا رہے ہیں' پیاس کی شدت ہے' پانی موجود ہے مگر پینا نہیں ہے۔ میدانِ جنگ کے علاوہ کہاں یہ بات آتی ہے؟ مئی جون کا مہینہ ہے' صبح تین چار بجے سے روزہ رکھا ہے' دوپہر کی شدت کی گرمی ہے' پیاس ایسی شدید ہے کہ حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں' خالی کمرہ' تنہا بیٹھا ہے' سامنے ٹھنڈے پانی کی صراحی بھری رکھی ہے' کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ کیا حرج ہے اُٹھ کے اگر ایک گلاس پانی پی لیا جائے تو؟ لیکن وہ جو میدانِ جنگ میں جا کر جو کچھ کرنا ہے' اس کا ڈسپلن یہاں سکھایا جا رہا ہے۔ موسم کی شدت' پیاس کی شدت' پانی کی موجودگی' یہاں سر پہ کوئی کمانڈر موجود نہیں ہے۔ یہ Self Imposed Discipline (خود عائد کردہ ضبط) ہے' اپنے آپ پر یہ ڈسپلن Impose (عائد) کیا ہے کہ شام سے پہلے پانی نہیں پینا صاحب! یہ ہے تربیت گاہ اس چیز کی کہ **کتب علیکم الصیام** (2:183) کہنے کے بعد پھر کہا کہ **کتب علیکم القتال** 2:216) یہ صیام حقیقت میں وہ تربیت ہے کہ جس زمانے میں امن ہوتا ہے' کہیں لڑائی اور جنگ نہیں ہوتی' سپاہی اس زمانے میں بھی سو نہیں رہا ہوتا وہ اس زمانے میں اس جنگ کی تربیت حاصل کر رہا ہوتا ہے۔

ایک چمکتی ہوئی حدیث جو مومن کی زندگی کی ترجمان ہے:

آج تو چونکہ ہمارے سامنے فوج ایک الگ گروہ کا نام ہو گیا ہے' اس لیے عام مسلمانوں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن کی رو سے تو ہر مومن مجاہد ہے اور اس کی زندگی ہے وہ جو اکثر نبی اکرم کی وہ چمکتی ہوئی حدیث میں دہرایا کرتا ہوں۔ پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ فرمایا کہ مومن کی زندگی بڑی آسان بات ہے' جب جنگ ہو رہی ہو' جہاد ہو رہا ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہوں اور جب نہ ہو رہی

ہوتو اس کی تیاریوں میں مصروف ہو۔ یہ ہے مومن کی زندگی۔ جب جنگ نہ ہورہی ہوتو اس وقت یہ ہے جسے صیام کہا گیا ہے جس کے معنی ہی ہیں روکنا' لگام دے کر رکھنا۔ یہ وجہ ہے کہ وہ جو صیام اور قتال ہے یکساں طور پہ فریضہ قرار دیا گیا لیکن جو ہمارے ہاں پھر مذہب میں ثنویت آئی ہے اور دنیاوی امور میں یا دین میں اور دنیا میں تو روزے گرمی کی اس شدت سے ہیں اور قتال جو حکم ہے' وہ انہیں ہی ہے جو چھاؤنی میں رہتے ہیں۔ یہ فرائض جو تھے وہ بانٹ دیے۔ اب یہ جو روزے کا ڈسپلن ہے کہ دوپہر بھر گرمی کی اتنی شدت میں' اتنی سخت پیاس میں' اپنے آپ پہ ضبط رکھا ہے۔ مظاہرہ تو اس کا وہاں ہونا تھا وہ وہاں تو کبھی جاتے نہیں ہیں' اس کا مظاہرہ عصر کے وقت ہوا کرتا ہے' جو میں نے کئی دفعہ کہا ہے۔ گرمی کے زمانے میں عصر کے وقت روزے دار' دوسرے کو کہنے کی ضرورت نہیں' وہ خود کہا کرتا ہے ''او مینوں ایس ویلھے کچھ نہ کئیں میں روزے نال ہیگا ایں [1]'' ٹھیک کہہ رہا ہے' اس نے تو اتنا ہی سیکھا تھا کہ پانی نہیں پینا' اگلی بات نہیں سیکھی تھی کہ سوال پانی کا نہیں تھا' سوال تو ضبط خویش کا تھا۔

---

[1] ابھے! مجھے اس وقت کچھ نہ کہنا' میں روزے سے ہوں۔

روزے کی حالت میں اصل سوال پانی کا نہ پینا نہیں بلکہ ضبط نفس کا ہے۔ ڈسپلن کا ہے خود کو زمانے کا ہے

عزیزانِ من! اس ڈسپلن کے لیے پہلی چیز وہ آتی ہے کہ اب راستے میں نہر آئی' پیاس کی شدت ہے' کہا یہ گیا کہ پانی نہیں پینا۔ الفاظ یہ آئے ہیں کہ **قال ان اللہ متلیکم بنھر** (2:249) پھر وہی ترجمہ ہمارے ہاں کا ہے جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں: ''اللہ تمہیں آزماتا ہے'' ایک لفظ ہمارے ہاں یہ ''آزماش'' آیا ہوا ہے کوئی آزماتا ہے۔ آزمانا اُردو زبان میں ہمارے ہاں آتا ہی وہاں ہے' جہاں کسی کے متعلق پہلے یقین نہ ہو اور دیکھا جائے کہ پھر یہ اس مقام میں کیسے اُترتا ہے۔ دوست سے یہ کہنا کہ صاحب! مجھے دس ہزار روپیہ چاہیے اور جو اس کے بعد وہ روپیہ ہونے کے باوجود نہ کرے تو کہا کرتے ہیں کہ نہیں بھئی! میں تو آزما رہا تھا' دیکھ رہا تھا کہ تمہارا دعوائے صداقت' جو محبت کا ہے' میرے ساتھ تعلقات کا ہے' وہ ہے کتنا۔ آزمایا جا رہا تھا' آزمایش کی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادت ہے' دلوں کے رازوں کو جانتا ہے' نگاہوں کی خیانتوں کو جانتا ہے' ان معنی کے اندر آزمانے کا تو لفظ اس کی طرف منسوب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آزماتا وہ ہے جسے دوسرے کے متعلق کبھی علم نہیں ہوتا۔ پہلے پہل جو کوئی چیز لیتے ہیں' اس کو پھر پہلے کہتے ہیں کہ صاحب! اس کو ذرا ٹیسٹ کر کے دیکھ لیجیے گا' کہیں وقت پہ دغا نہ دے جائے اور جب آپ دیکھ لیتے ہیں کہ نہیں! یقینی طور پہ یہ ایسی ہے تو پھر اس کو آزمانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ آزمانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''آزمانا'' نہیں ہے۔

لفظ ابتلا کا قرآنی مفہوم مواقع بہم پہنچانا ہوتے ہیں:

عربی زبان کا یہ ابتلا کا جو ہمارے ہاں لفظ آتا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں پہلو بدلنا' مواقع بہم پہنچانا۔ کس چیز کے؟ کہ ایک موقع بہم پہنچایا ہے اس چیز کا کہ تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کر کے دیکھو تم کتنے پانی میں ہو۔ خود اپنے آپ کو آزمانا' خدا تمہیں نہیں آزماتا وہ مواقع بہم پہنچاتا ہے اس امر کے لیے کہ تم خود اپنے آپ کو ٹیسٹ کر کے دیکھو کہ تمہارے اندر کتنی صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور یہ اس قسم کے مواقع نہایت ضروری چیزیں ہیں ورنہ آدمی فریب خویش میں رہتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ بھی ہو جائے گا' یہ بھی کر لیں گے' مجھ میں یہ بھی ہے' وہ بھی ہے لیکن موقع آنے پہ پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے اندر کتنی تبدیلی پیدا کر چکا ہے' اس کی کتنی صلاحیتیں بیدار ہو چکی ہیں۔ یہ جوان چیزوں کے لیے مواقع سامنے آنا ہیں' یہ ہے جسے ابتلا کہیں گے' یہ ہے پہلو بدلنا' مواقع بہم پہنچانا۔ لیجیے میدانِ جنگ میں جا رہے ہو وہاں بڑی بڑی سختیاں صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔ پہلے یہ ایک موقع بہم پہنچایا گیا ہے یہ ٹیسٹ کرنے کے لیے کہ تم اپنے آپ پہ کتنا ضبط رکھتے ہو؟ پیاس کی شدت' پانی کی موجودگی اس کے باوجود پانی نہیں پینا' اسے ابتلا کہتے ہیں۔ خدا نہیں آزماتا۔ مواقع بہم پہنچاتا ہے' ہمیں اس امر کے کہ ہم اپنے آپ کو آزما کر دیکھ لیں۔ فمن شرب منه فليس منى (2:249) یہ کتنی بڑی چیز ہے۔

ہمارے ہاں ہمیشہ عقائد پر بحث تو ہوتی ہے عمل پر نہیں ہوتی:

بات یوں تو چھوٹی سی ہے کہ جس نے پانی پی لیا (اور آپ کو معلوم ہے اس کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے وہ کتنا سخت ہے) وہ میرا سپاہی نہیں ہے' ہم میں سے نہیں ہے۔ روز ہمارے ہاں عقائد کی بحثیں ہوتی ہیں کہ کس کے عقائد صحیح اُترتے ہیں؟ ہمارے ہاں کبھی عمل کی بحث نہیں ہوتی۔ کس کے اعمال اس ترازو' پہ اس معیار پہ صحیح اُترتے ہیں یہ کبھی بحث نہیں ہوتی۔ جتنے کفر کے فتوے آپ کے ہاں لگتے ہیں' وہ سارے یہ ہیں کہ عقائد درست نہیں ہیں۔ یہاں بحث ہی عمل کی ہو رہی ہے۔ نہر آئی ہے' پیاس ہے' پانی پینا نہیں' جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ بھئی! چھوٹی سی بات تھی۔ بات چھوٹی سی نہیں ہوتی اس کے اندر ایک بہت بڑی حقیقت کا مظاہرہ ہوتا ہے جو اپنے آپ پہ ضبط نہیں رکھ سکتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے وہ میرا نہیں ہے۔ بڑی عجیب چیز یہاں کہی گئی ہے ''وہ میرا نہیں ہے'' آج بھی میں سمجھتا ہوں عزیزانِ من! یہ جو حصے ہیں قرآنِ کریم کے' انہیں سمجھنا ہو تو کسی فوج کے کمانڈر' کسی جرنیل کمانڈر' کرنل' بریگیڈیر سے سمجھو' وہ سمجھائے گا کہ یہ کیا بات کہہ دی ہے کہ جس نے پانی پی لیا وہ میرا سپاہی نہیں ہے۔

نبی اکرمؐ کا اُمتی ہونے کے لیے اُمتی کی شرائط کو بھی پورا کرنا ہوگا:

ومن لم يطعمه فانه منى (2:249) جو پانی نہیں پیے گا وہ میرا ہے۔ اس کا ہونے کے لیے آپ نے دیکھا پہلی شرط کیا ہے۔

بات تو ساری یہی ہے کہ اس کا ہونا ہے۔ یہ کرنے والا تو اس کا ہوسکتا ہے' جو اس امتحان پہ پورا نہیں اُترتا وہ اس کا نہیں رہتا۔ ٹھیک ہے محمدؐ کا ہونا بڑی باعث فخر وسعادت چیز ہے لیکن اس کا تو وہ ہوسکتا ہے جو شدتِ پیاس کے باوجود' افراطِ آب کے باوجود' سب کچھ ہونے کے باوجود' زر کا سیلاب آ رہا ہو' تقاضے بھی اپنے ہوں' لیکن جہاں سے اس نے روکا ہوا ہے' وہاں سے قدم آگے نہ بڑھائے۔ وہ اس کا ہوسکتا ہے۔ جس کا قدم اس کے خلاف اُٹھ گیا وہ کہے گا **فلیس منی** وہ خدا کے ہاں اس دن حشر کے میدان میں کھڑا ہو کے کہہ دے گا چھانٹ چھانٹ کر انہ منی اور لیس منی رکھ دے گا۔ یہ ہے عزیزانِ من! وہ میزان جو قدم قدم پر یہاں لگی ہوئی ہے' یہ تولنے کے لیے کہ کون اس کا ہے اور کون اس کا نہیں ہے' کون اللہ کا ہے اور کون اللہ کا نہیں ہے۔ **الا من اغترف غرفةً بیده** (2:249) ہاں! یہ الگ بات ہے' اتنی سی اجازت ہے' چلتے ہوئے یونہی ایک چلو بھر پانی لیا' دو چھینٹے اس کے دے دیے پیاس بجھانے کے لیے پینا نہیں ہے' اتنی سی صرف اجازت ہے۔ کہا تھا کہ تمہارے لچھن یہ بتا رہے ہیں کہ نہیں پورے اُتر سکو گے۔ پہلا ہی مرحلہ' پہلا ہی موقعہ ٹیسٹ خویش کا کہا کہ **فشربوا منه الا قلیلاً منهم** (2:249) سب نے پی لیا' یونہی کوئی چند سپاہی تھے جنہوں نے نہیں پیا۔

بنی اسرائیل ذلت وسکت کیوں؟

آپ نے اب سوچ لیا جو بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی۔ **فلما جاوزه هو والذین اٰمنوا معه** (2:249) ندی سے پار چلے گئے' میدانِ جنگ میں پہنچ گئے' سامنے دشمن کی فوج آئی' تعداد میں بڑی زیادہ تھی۔ یہاں دیکھا کہ بات چھوٹی سی تھی' پانی کے پینے سے منع کیا تھا' وہ منع نہیں ہوئے تھے۔ بات پانی پینے کی نہیں تھی **قالوا لا طاقة لنا الیوم بجالوت وجنوده** (2:249) لشکر سامنے آیا تو کہا کہ صاحب! ہم میں تو ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے نہیں۔ دیکھا آپ نے ابتلا وہ کیا تھا؟ وہ ٹیسٹ کیا تھا؟ وہ یہ تھا۔ وہ فوراً پکار اُٹھے' ہم میں طاقت نہیں ہے۔ یہ وہی قوم ہے (یہ تو حضرتِ موسیٰ کے بعد کا واقع بتا رہے ہیں) جنہوں نے خود حضرتِ عیسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ **فاذهب انت وربک فقاتلا** (5:24) کہ جا موسیٰ تو اور تیرا رب' دونوں جا کر ان سے لڑائی کرو **انا ههنا قاعدون** (5:24) ہم کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں' یہاں بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ جب فتح ہو جائے گی پھر آواز دے لینا' مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے آ جائیں گے۔ لڑو تم اور تمہارا رب۔ یہ وہی قوم ہے جو میدانِ جنگ میں جا رہی ہے۔ کہا ہے کہ نہیں صاحب! ہمارے بس کی تو بات نہیں ہے۔

تمام قسم کی معاشرتی' معاشی' اخلاقی اور تمدنی برائیوں کی وجہ خدا کے حضور پیش سے انکار ہے

اس کے بعد کچھ استثنا ہے کہ کچھ وہ بھی تھے جنہوں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ یہ وہی تھے جنہوں نے وہاں پانی نہیں پیا تھا۔ یہ کون

تھے؟ ان کی کیا خصوصیت تھی؟ یہاں وہ خصوصیت آتی ہے۔ قال الذین یظنون انھم ملقوا اللہ (2:249) یہ وہ تھے کہ جنہیں اس کا یقین تھا کہ ایک دن رب سے ملنا ہے۔ یہ ہے سارا معیار' یہ ہے جہاں قوموں کی صحیح تربیت ہوتی ہے۔ یہ سارا بگڑا ہوا معاشرہ اس لیے ہے کہ کسی کو اس کا ایمان نہیں' اس کا یقین نہیں ہے کہ جو کچھ کر رہے ہیں' اس کی کہیں باز پرس ہونے والی ہے۔ یہ ہے وہ چیز جسے خدا سے ملنا کہا گیا ہے۔ ورنہ خدا تو یہ کہتا ہے کہ ھو معکم این ما کنتم (57:4) تم جہاں بھی ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تو کہیں الگ جا کر یہ اس سے ملاقات کرنے کی بات نہیں ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ' اسی محاورے میں ہیں' جہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ بھئی! کسی دن آمنا سامنا ہوگا' میں اس کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ جنہیں اس کا یقین تھا کہ جو کچھ یہاں کیا جا رہا ہے اس کے لیے ہم مسئول ہیں Responsible to such & Such (فلاں اور فلاں کے آگے ذمہ دار ہے) جسے آج یہ کہتے ہیں کہ اس کو Responsible (ذمہ دار) کرنا ہوگا۔ سپاہی ہیں تو یہ چیز کہ صاحب! ٹھیک ہے اکیلے جا رہے ہیں' پھر یہ ہے کہ واپس جانا ہے تو وہاں کیپٹن نے ہم سے پوچھنا ہے کہ تم نے وہاں کیا کیا تھا۔ ان معنوں میں یہ بات ہے۔ جنہیں یہ معلوم تھا' جنہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا' انہوں نے یہ بات کہی کہ اگر یہ کثرت ہے ان کی زیادہ ہے' تعداد زیادہ ہے' تو ہوا کیا؟ کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ (2:249) تم دیکھو تو سہی کتنی ایسی چھوٹی چھوٹی مختصر سی جماعتیں تھیں' کتنے بڑے بڑے لشکروں کے اُوپر وہ کامیاب ہو گئیں فاتح ہو گئیں منصور ہو گئیں۔ تم صرف تعداد کو دیکھتے ہو۔ حقیقت میں جو معیار پہ پورے اُترنے والے ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد تو ہمیشہ کم ہی رہی ہے لیکن وہ بڑی بڑی تعداد پہ غالب آتے ہیں۔

قران حکیم کے حقائق کو عملی طور پر سچ کر دکھانے والے میدان بدر کے شہداء:

پہلا مظاہرہ ہمارے ہاں تاریخ کے اندر بدر کے میدان کے اندر آپ دیکھیے اور یہ وہ وعدہ تھا' جو قرآن نے یہ کہا تھا: ایک ایک ان میں سے سو سو پہ غالب آنے والا۔ ٹھیک ہے تعداد ایک شے ہوتی ہے لیکن مقابلہ کرنے کے اندر تعداد ہی Determining Factor (قولِ فیصل) نہیں ہوتا' قول فیصل یہ چیز نہیں ہوتی۔ وہ تو اندر ایک قلب مطمئن ہوتا ہے' وہ تو جوہر اور ہوتے ہیں جن کی بنا پر یہ سپاہ دوسروں پہ غالب آتی ہے۔ یہ کتی بڑی چیز ہے! کہا کہ کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃ (2:249) تاریخ اس کی شہادت دے گی کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے بڑی بڑی جماعتوں کے اُوپر کامیابی حاصل کر لی۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم نے قرانی تعلیم کو چیتاں بنا دینے کی بنیادی وجہ من یشاء کے متعلق غلط سوچ ہے:

غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ (2:249) ہمارے ہاں کا پھر وہی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے حکم سے چھوٹی جماعتیں بڑی

جماعتوں پہ غالب آ ئیں۔اب سیدھی سی بات ہوگئی کہ اب اس میں چھوٹی جماعت ہے‘اس کو تو اپنی کوئی کاریگری رہی‘ نہ ہی یہ چیز اس کے لیے ہر وقت یقینی رہی کہ ہم غالب آ ئیں گے کیونکہ اس کے لیے تو خدا کا حکم شرط قرار دے دی۔خدا کا حکم ہوگا تو یہ غالب آ ئیں گے اور نہیں حکم ہوگا تو نہیں غالب آ ئیں گے۔ وہاں جائیں گے جس طرح سے جی چاہے وہاں مقابلہ کریں گے‘ بھاگ آ ئیں گے‘ پوچھا جائے گا‘ کہا جائے گا کہ صاحب! خدا کا حکم ہی نہیں ہوا تھا‘ ہم کیا کریں۔پچھلے درس میں من یشاء کی اصطلاح ہمارے سامنے آئی تھی اور وہاں میں نے بتایا تھا کہ اس کے لیے ہمارے ہاں کے اُردو محاورے کے مطابق جسے چاہتا ہے یہ کرتا ہے اس نے کتنی تباہیاں ہمارے لیے پیدا کردیں۔اس ضمن میں یہ چیز ہے باذن اللہ یہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ ہر بات جو نہ ہو اس کے لیے آپ ذمہ دار ہی نہیں ہیں‘ اس کی مرضی ایسی تھی اس کا حکم ہی ایسا تھا۔اس کا حکم ہوتا ہم بھی کامیاب ہو جاتے‘ ناکام رہ گئے اس کا حکم ہی نہیں تھا۔ہم وہیں آ گئے جہاں پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے اس ترجمے سے تباہ کر کے رکھ دیا۔رکھ دیا کیا؟ تباہ ہو گئے ہم‘ ہمیں تباہ کر دیا گیا ایک سازش کے ماتحت کہ جس کے ماتحت اس قسم کے عقائد ہمارے ہاں داخت کر دیے گئے۔تقدیر میں ہوگا تو ہو جائے گا‘ نہیں ہوا ہے ہم کیا کریں صاحب! خدا کی مرضی ایسی تھی اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جہاں کہیں ناکامی ہوتی ہے‘ وہاں خدا کی مرضی آتی ہے۔کامیابی کا سارا کریڈٹ آپ خود لے جاتے ہیں‘ ناکامی ہوتی ہے’’اللہ دی مرضی ایہوئی سی‘‘ جیسا میں نے کہا تھا‘ لڑکی پیدا ہونے پہ کہتے ہیں’’جی اللہ دی مرضی‘‘ مرجانے پہ‘ بیمار پہ‘ کہتے ہیں اللہ کی مرضی اور اچھا ہو گیا تو فلاں ڈاکٹر فلاں حکیم کی یہ تدبیر تھی اور اس ساتھ ہی یہ وہ دوائی لی‘ بہت بھاگ دوڑ کی‘ مر گیا تو خدا کی مرضی ہے۔

غلط تصورات کو بدلے بغیر قران حکیم کی عظمت سامنے نہیں آ سکتی اس مسئلہ میں خدا کے حکم کا سمجھنا از بس ضروری ہے:

میں نے گزارش کی تھی کہ قرآن کے ان مقامات کے متعلق آپ کو ان تصورات کو‘ ان Concepts کو Reconstruct کرنا پڑے گا۔آپ کو قرآن کی رو سے ان کا مفہوم متعین کرنا پڑے گا۔ان کا صحیح مفہوم متعین کیے بغیر آپ کبھی قرآن کی صحیح تعلیم کے اُوپر نہیں آ سکتے۔اب دیکھیے یہ باذن اللہ آیا۔ان کے بنیادی معنی کان کے ہوتے ہیں۔ یہاں سے عرب جیسا ان کا قاعدہ ہے وہ آگے چلاتا ہے۔ ٹھیک ہے‘ کہیں اس کے معنی کسی کے کان میں کوئی بات کہہ دینا‘ کہیں اس کے معنی کسی کی بات سن لینا‘ اس میں اجازت بھی آتی ہے‘ اس میں علم بھی آتا ہے‘ اس میں مشیت بھی آتا ہے‘ علم جو ارادے کے ساتھ ہو۔ یہ وہی بات ہے جسے میں نے مشیت کہی تھی۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس کا ترجمہ حکم خداوندی نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یوں تو حکم بھی وہی چیز ہوتی ہے لیکن اگر حکم کوئی ایسا ہو کہ ہمیشہ وہی ہو‘ اسے

قانون کہتے ہیں۔خدا نے حکم دیا کہ آگ حرارت پہنچائے گی۔اب اس کے بعد اس حکم کو اس نے بدلا نہیں ہے۔**لن تجد لسنة الله تبدیلاً** (33:62) ایک دفعہ آگ جو حکم دے دیا کہ تم نے حرارت بہم پہنچانی ہے' پھر اس کے بعد بدلا نہیں ہے۔جب کوئی حکم غیر متبدل ہو جائے تو اسے قانون کہتے ہیں۔وہی Definition (تعریف) جو میں دہرایا کرتا ہوں IF (اگر) یہ ہوگا Then (تو نتیجہ اس کا یہ) نکلے گا Always (ہمیشہ) یہ ہوگا۔Law (قانون) کی Definition (تعریف) یہ ہے:

If, Then, Always

If اور Then کی بات تو یہ ہے۔اسے خدا کا حکم کہیے' ارادہ کہیے' مشیت کہیے' قدرت کہیے۔اس میں وہ کسی دوسرے کا پابند نہیں ہے۔خود اس نے یہ فیصلہ کیا ہے' کوئی فیصلہ کیا ہے کہ آگ حرارت پہنچائے گی' کسی سے اس نے پوچھا نہیں ہے' وہ کسی سے مشورہ کرنے کا محتاج نہیں ہے۔کہلا ہے کہ **یفعل ما یرید** (253) اس کا ایک پلان ہے' اس کے مطابق اس نے یہ فیصلہ کیا' آگ کو یہ حکم دیا کہ حرارت پہنچائے۔پھر اس کے بعد اس حکم میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی (Always) اور جو حکم' غیر متبدل' ہمیشہ کے لیے' ویسا ہی ہوا اسے قانون کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں انسانی تجربات کی ایک جھلک:

اذن کے بھی یہی معنی ہوتے ہیں: قانونِ خداوندی کے مطابق۔دیکھیے! قرآن کس طرح سے تصریف آیات سے بات واضح کرتا ہے۔ہم نے یہ تجربہ کر کے دیکھا' ہمارے ہاں پہلے ایک کھیت تو زیادہ سے زیادہ دس من' پندرہ من' بیس من' بہت بڑی کسی نے محنت کی پچیس من گیہوں' وہ بھی شاذ کہیں ہوتے ہیں۔پھر اس کے بعد ہم نے خدا کے قانون کا مزید مطالعہ کیا کہ پیداوار ہوتی کیسے ہے؟ بڑھتی کیسے ہے؟ پھولتی پھلتی کیسے ہے؟ ہر چیز قاعدے قانون کے مطابق ہے۔ہمیں اس قانون کا علم نہیں تھا' بعض قوموں نے اس میں علم حاصل کیا۔ہم نے وہاں سے بات سیکھی' وہاں سے ہم نے اچھا بیج منگایا' وہاں سے ہم نے Fertilizer (کھاد) منگائے۔اس کے قاعدے کے مطابق جو پیداوار کو بڑھانے کے لیے خدا نے مقرر کیا ہوا تھا' اس قاعدے قانون کا علم حاصل کیا' سو سو من ڈیڑھ ڈیڑھ سو من ایک ایک ایکڑ سے وہ پیدا ہو رہی ہے۔یہ چیز ہے ہمارے ہاں۔اب سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟

قانون کے محکم ہونے کے سلسلے میں قرآن حکیم کا دلکش طرزِ بیان:

کہا کہ **وھو الذی یرسل الریٰح بشرًا بین یدی رحمته حتیٰ اذا اقلت سحاباً ثقالاً سقنٰه لبلد میت فانزلنا به المآء فاخرجنا من کل الثمرٰت کذٰلک نخرج الموتٰی لعلکم تذکرو** (7:57) یہ خدا وہ ہے جو پہلے ٹھنڈی ہواؤں کو

بھیجتا ہے۔زمین سے نباتات کی نمود ہوتی ہے' کھیتی اُگتی ہے' قسم قسم کی فصلیں ہوتی ہیں۔اس کے بعد کہا کہ **والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ** (7:58) وہ زمین جس کو تم نے ایسا بنا دیا ہو کہ اس میں کھیتی پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور بڑی صلاحیت ہو'اس میں سے **باذن ربہ** بڑی کھیتی اُگتی ہے۔یہ ''اذن'' کا لفظ یہاں آ گیا۔**والذی خبث لا یخرج الا نکدًا** (7:58) اور جو زمین بنجر رہ جاتی ہے' جس کو تم تیار نہیں کرتے' اس کے لیے اس میں سے اوّل تو اُگتی نہیں' اگر اُگتی ہے تو یونہی ذراسی چار پانچ کونپلیں اُگ آتی ہے۔یہ **باذن ربہ** (7:58) کیا ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں یہ اذن کہاں آ رہا ہے؟ اگر یہ چیز ہو کہ صاحب! جس وقت وہ حکم دے دیتا ہے اگ آتی ہے جب نہیں دیتا' نہیں اگتی۔تو پھر یہ جو آپ زمین کی تیاری اور اچھے بیج کی تلاش کے لیے کرتے ہیں' اس کی کیا ضرورت ہے۔کیا فائدہ ہے کہ آپ وہ اچھی زمین بھی تیار کیجیے' اچھا بیج اس میں ڈالیے Fertilizer (کھاد) ڈالیے' قاعدے قانون کے مطابق پانی دیجیے' ہر چیز اس کے مطابق کیجیے۔یہ اُگنے کا طریقہ ہے' یہ ایک قانون اور قاعدہ کے مطابق ہے۔اور اگر اس میں سے پھر ملے وہی پانچ من تو یہ کیا بات ہوئی؟ یا کچھ نہ کیجیے' بنجر چھوڑ دیجیے' اس میں کچھ ہل نہ چلائیے نہ کسی قسم کا Fertilizer (کھاد) ڈالیے اور یونہی ایک چھینٹا دے کر گھر چلے آیئے تو کیا پھر اس کا حکم ہو جائے اور سوا سو من فی ایکڑ آگ آئے گی' نہیں یہ ہوتا۔اذن کے یہ معنی نہیں ہیں۔اس نے خود **بلد الطیب** اور خبیث کہا ہے تو یہ تو بنیادی شرط ہوئی۔کہا ہمارے ہاں سے بارش آتی ہے وہ تو طیب اور خبیث دونوں پہ یکساں برستی ہے۔سوال یہ ہے کہ تم نے نیچے زمین کس قسم کی تیار کر رکھی تھی۔طیب وہ ہوتا ہے جو بہت پھل دینے والی ہو۔خبیث اسے کہتے ہیں جو بالکل پھٹ ہو۔نیچے زمین کس قسم کی ہے؟ یہ ہے جہاں ''**اذنِ ربہ**'' (7:58) آتا ہے۔جس زمین میں تم نے یہ سارا کچھ یوں تیار کر کے رکھ دیا اس کے لیے اذنِ خداوندی یہ ہے کہ یہ پیداوار سوا سو من فی ایکڑ دے گی۔جسے تم نے ویرانہ کر کے چھوڑ دیا' اس کے لیے اذنِ خداوندی یہ ہے کہ کچھ نہ دے۔

Chance کی نوعیت اور کائنات میں Cause of effect کے عمل دخل کی اہمیت:

یاد رکھیے! جب تک ہمیں خدا کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کا علم نہیں ہوتا' اس کے لیے ہمارے ہاں ایک لفظ اتفاق ہے جسے Chance کہتے ہیں کہ صاحب! یہ اتفاقیہ بات ہو جاتی ہے۔وہ اب کے دیکھئے صاحب! ساون کا مہینہ یونہی گزر گیا' بارش ہی نہیں ہے' ہوئی ہے تو یوں جا کے ہوئی ہے۔گویا ہم یوں کہہ رہے ہیں کہ اس کے مطابق نہ کوئی قاعدہ ہے' نہ کوئی قانون ہے' بس یونہی اتفاقیہ چیز یہ چل رہی ہے۔عزیزانِ من! یاد رکھیے یہ اس وقت تک کے لیے ہے جب تک ہمیں خدا کے قوانین فطرت کا علم نہیں ہے۔یہاں جو ہر چیز ہے' وہ Cause & Effect (علت و معلول) قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔یہ بات قرآن کہتا ہے۔جس قاعدے اور قانون کا

ہمیں علم نہیں ہوتا' جہالت کے زمانے تک ہم اسے چانس یا اتفاق کہتے ہیں۔ جب علم ہو جاتا ہے' وہ قانون بن جاتا ہے۔ ہماری جہالت اور علم کی نسبت یہ قانون اور اتفاق یا چانس ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! یہاں کوئی چیز By Chance (اتفاقیہ) نہیں ہوتی۔ By Chance (اتفاقیہ) ہونے لگ جائے تو قرآن کہتا ہے کہ یہ ساری کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ یہاں تو اگر وہ جو چانس تھا کو لے کر چاند کے قریب جا رہے تھے تو کہہ رہے تھے کہ اگر اس Calculation میں سیکنڈ میں سویں حصے کا بھی کہیں فرق پڑ گیا تو نہ انجن بماند نہ انجینئر ی' پتہ نہیں کیا جائے۔ یہی چانس پر نہیں ہے۔ اس کے قانون کا انہوں نے علم حاصل کیا' اس کے مطابق عمل کیا تو چاند کو مسخر کر لیا۔ بارش کے متعلق بھی ہمارے ہاں ابھی تک یہی چیز تھی کہ بھئی اتفاق سے ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ جو قوم علم حاصل نہیں کرتی وہ بڑی بے بس ہوتی ہے۔

کائنات کی تمام قوتیں انسان کے سامنے سر تسلیم خم ہیں صرف ضرورت ان کا علم حاصل کرنے کی ہے:

آدم جب علم اشیا حاصل کرتا ہے تو ملائکہ اس کو سجدے کرتے ہیں۔ یہ قرآن کہتا ہے' عزیزانِ من! میں نہیں کہتا۔ یہاں ملائکہ یہی قوتیں تو ہیں جو ہمارے ہاں کارفرما ہیں۔ **علم اٰدم الاسمآء کلھا** (2:31) جب اس نے اشیا کا علم حاصل کیا ہے ورنہ اس سے پیشتر تو وہ ملائکہ مذاق کر رہے تھے کہ ہیں ہیں! یہ کیا بنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ابھی بتاتے ہیں کہ یہ کیا بنا دیا۔ **علم اٰدم الاسمآء کلھا** (2:31) کیا بات ہے **کلھا** کی! کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے قانون کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر نہیں دے دی گئی۔ اب یہ اس کی اپنی قوت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ وہ کس کس چیز کا علم حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ علم موجود نہیں ہے تو چیچک نکلتی ہے تو ماتا دیوی ہوتی ہے' علم موجود ہے نکلنے سے پہلے ایک Injection (ٹیکہ) ان ساری ماتاؤں کو روک کر رکھ دیتا ہے۔ کروڑ در کروڑ وہ جراثیم ہوتے ہیں جن سے یہ چیز پیدا ہوتی ہے' اسے ایک Injection (ٹیکہ) تلف کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ **باذن اللّٰہ** یعنی اللہ کے قانون کے مطابق ہے۔ بارش کے متعلق بھی یہی چیز تھی۔

ہمارا ملک ہر معاملے میں لنڈا بازار اس لیے ہے کہ ہم نے کائناتی قوتوں کو سرنگوں کرنے کا علم حاصل نہیں کیا

اب جو علم آگے بڑھ رہا ہے' تو ہمارے ہاں تو یہی چیز ہے کہ اب بھی ہم آسمان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ یا اللہ! کوئی اتنی سی بدلی کہیں سے بھیج دے۔ جنہوں نے یہ علم حاصل کر لیا ہے' آپ کو معلوم ہے اب کینیڈا وغیرہ میں ضرورت کے مطابق On Demand آپ اس کے لیے آرڈر Place کر دیتے ہیں کہ میرے ہاں فلاں دن اتنی بارش چاہیے جی۔ یعنی ہمارے ہاں

یہ ٹینکی میرے سر پہ ہے' یہ نلکا آپ کے ہاں اس کے پاؤں میں ہے لیکن ''روز ہاتھ جوڑے ہوئے صبح سارا ٹبر کھلوتا ہویا ہوندا ہیگا چار قطرے دے دو❶ ۔'' یہی ہے یہاں۔ ہمارے ہاں اذن نہیں ہے۔ وہاں اب یہ کیفیت یہ ہے کہ آن ڈیمانڈ کھیتوں پہ بارش کے لیے آرڈر Place کر دیا جاتا ہے تو بارش برستی ہے۔ بادل بے وقت آ جاتا ہے' اس کو موڑ دیا جاتا ہے کہ صاحب! آج ضرورت نہیں ہے' کہیں اور ضرورت ہے' وہاں برسا دیجیے۔ اس وقت تو بات اچھنبے کی لگے گی' بعض گوشوں سے کفر کے فتوے بھی لگیں گے کہ اللہ میاں کے کاروبار میں صاحب! یہ انسان کے ہاتھ میں کنٹرول ہے۔ کل ہی یہ وہاں سے ہوتا ہوا علم وہاں پرانا ہو جائے گا' ہمارے ہاں جب پھر یہ نیا آ جائے گا تو ہو ہی یہ رہا ہے ''یعنی سارا ملک ای لنڈا بازار اے ساڈا❷'' کوئی تصور' قاعدہ' قانون' نظریہ' عقیدہ جو وہاں پرانا ہو جاتا ہے ''تے لا کے سٹ دیندے ہیگے نیں کوٹ وانگوں❸'' وہ ہمارے ہاں آ جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد پہن کر جس طرح اکڑ کر چلتا ہے وہ قابل مذمت ہے۔ اسی طرح سر سے پاؤں تک مستعار نظریات کی ہماری شخصیات بنی ہوئی ہیں۔ ''عزیزانِ من! اور ایہدے بعد پھنے خاں ایہڈے بنے ہوئے آں' فٹے منہ تہاڈا❹'' یہ مستعار لی ہوئی چیزیں ہیں' جب وہ مال وہاں سے پرانا ہو کر یہاں آ جائے گا' پھر اس کے بعد آپ بھی یہ کچھ کرنے لگ جائیں گے کہ ہاں صاحب! اتنی بارش کی ضرورت ہے۔ آپ نے غور فرما لیا' قرآن اس کے لیے کیا کہتا ہے؟ کہا کہ **الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض والفلک تجری فی البحر**(22:65) کبھی اس پہ بھی غور کیا تم نے' اپنے آپ کو بے کس اور بے بس انسان سمجھنے والے! کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ اس نے تو تمہارے لیے جو بھی ارض و سماوات میں ہے' سارا قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر باندھ کر رکھ دیا ہے **سخر لکم** مسخر کر دیا ہے۔ **ویمسک السمآء ان تقع علی الارض**(22:65) اور یہ چیز یہ جو بادل ہیں ان کو وہاں تھام کر رکھا ہوا ہے کہ یونہی نہ زمین کے اوپر ٹپک پڑیں۔ یہ کیسے ہو؟ اس کے لیے کہا کہ **الا باذنہ** (22:65) دیکھتے ہیں کہاں اذن آتا ہے؟

---

❶ روزانہ ہاتھ باندھے ہوئے سارا خاندان کھڑا ہوتا ہے کہ چار قطرے (پانی) دے دو۔

❷ ہمارا تو سارا ملک ہی لنڈا بازار ہے

❸ تو (پرانے) کوٹ کی طرح آباد پھینکتے ہیں۔

❹ وہ اس کے بعد اتنے تکڑم باز بنے ہوئے ہیں کہ تف' لعنت تم پر۔

❺ رکاوٹیں لگی ہوئی ہیں۔

موسمیات کو مسخر کرنے والی قوموں نے بادلوں کو اپنے تابع تسخر کر رکھا ہے

جب تک ہمیں ان موسمیات کے قانون معلوم نہیں تھے' اس وقت تک ہم بھی ''اذن'' کے معنی یہی لیتے تھے کہ صاحب! جب اس کا

حکم ہوتا ہے تو بارش برس جاتی ہے۔ جنہوں نے **سخر لکم** کے اُوپر غور کیا الم تر دیکھوں غور سے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ یہاں میرے حصے کا تو ثواب ہی ثواب ہے۔ وہ جانتے ہیں **الم تر** کے معنی کیا ہیں؟ کیا تم نے بات پر غور کیا؟ انہوں نے غور کیا کہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ یہ تھام کر رکھا ہوا ہے' پھر یہ کس طرح سے نیچے آتا ہے کیونکہ اس نے **سخر لکم** کہا ہے۔ یہ سرکش تو ہے نہیں' یہ تو انتظار کر رہا ہے۔ کس چیز کا انتظار کر رہا ہے؟ تمہارے حکم کا۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ پھر یہ زمین پہ برستا کس طرح سے ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ **الا باذنہ** کیا ہے۔ **ان اللہ للناس لرؤف رحیم** (22:65) ان کا علم نہ ہو تو تمہارے لیے جو سختیاں ہی سختیاں ہیں موانعات لگیں پیاں ہیگیاں واں' دو دو تین سال بارش نہیں ہو رہی' قحط پڑ رہے ہیں' مصیبتیں آ رہی ہیں اور کبھی یہ صورت ہے کہ کھیتیاں پکی ہوئی ہیں' ابھی دس دن کے بعد اس میں سے پوچھو نہیں ہزاروں من اناج آ جانا ہے۔ اتنے زور سے ایک بارش آ کر پڑتی ہے صاحب! تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں دونوں صورتوں میں تباہیاں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ **ان اللہ للناس لرؤف رحیم** (22:65) ہم نے تمہیں بتا دیا کہ یہ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے علم حاصل کرنے کی صلاحیت دے دی' اس علم کو حاصل کرو' اسے مسخر کرو' اپنے قبضے میں کرو' دیکھو کہ خدا روف ورحیم ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ عزیزانِ من! پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا یہاں یہ چیز نبی اکرمؐ کے متعلق آئی تھی کہ **وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین** (21:107) ورد کی طرح ہم اس آیہ کو پڑھتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضورؐ کی رحمۃ العالمینی ہے جس کے صدقے میں یہ کائنات چل رہی ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ یہ کہاں آیا تھا؟ وہیں آیا تھا جہاں یہ کہا تھا کہ ہم نے ان تمام چیزوں کے لیے ایک قانون بنا دیا کہ جس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور یہ تھا وہ قانون کا نظام لے کے آنے والا جسے ہم رحمۃ للعالمینؐ کہہ کر پکار رہے ہیں۔ اگر یہ قانون نہ ہو تو تمام ارض وسما الل ٹپ ہونے لگ جائیں' برادرانِ عزیز! محض اتفاقیہ By Chance ہونے لگ جائیں تو تباہی آ جاتی ہے۔ اس کی رحمت یہ ہے کہ یہاں ہر شے تمہارے لیے مسخر ہے اور اس تسخیر کا جو علم ہے اس کے حاصل کرنے کی تمہارے اندر صلاحیت رکھ دی ہے۔ سب سے پہلے اس ذاتِ اقدس واعظمؐ نے کر کے دکھایا جو رحمۃ للعالمینؐ بن گیا۔ یہاں یہی کہا ہے کہ **ان اللہ لرؤف رحیم** (22:65) ان پہلے لایا پھر اس کے بعد ہے کہ یہ کتنی یقینی چیز ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے نزدیک تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' خدا کی قدرت' اس کا قادرِ مطلق ہونا' ہمیشہ اس وقت آتا ہے جہاں کوئی تباہی آتی ہے' جہاں ہمارے بس میں کوئی بات نہیں رہتی ہے۔ ہمارے سامنے خدا کا صرف یہ تصور ہے' وہ کہتا ہے یقیناً یاد رکھو! یہ یقینی چیز ہے وہ تو بڑا ہی روف ورحیم ہے سامانِ نشو ونما دینے والا رافت کے ساتھ' محبت کے ساتھ' تنگی کے ساتھ نہیں۔ یہ کن کو دیتا ہے؟ ان کو جو جانتے ہیں کہ اذنِ ربی کیا ہوتا ہے۔ جو جانتے ہیں کہ قانونِ خداوندی کسے کہتے ہیں۔ دیکھا عزیزانِ من! اذن کے معنی کہاں آتے ہیں۔ اذنِ خداوندی یہ بڑے اہم مقامات ہیں۔

اذنِ خداوندی ایک اہم موضوع ہے جس پر دورِ حاضر کی موجودہ علمی سطح پر غور وفکر کرنا ہوگا:

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ آپ کو ان تصورات کی تشکیل جدید چاہیے۔ Concept کو Re-Construct کیجئے پھر قرآن کی بات سمجھ میں آئے گی۔ اسی لیے ایسے مقامات کے اوپر میں ذرا زیادہ وقت دے دیتا ہوں کہ بات تو سمجھانے کی ہے ''او ختم کرن والی گلی تے نئیں نا ہیگی کہ تبرک لیے تے گھر جایے [1]'' کہا ہے کہ **ولو شآء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعًا** (10:99) **ولو شاء** کا وہی ترجمہ ہے جو آپ کے ہاں ہے: ''اگر اللہ چاہتا'' اگر خدا کی مشیت کے پروگرام میں ہوتا تو ہم انسانوں کو پیدا ایسا کرتے ہیں کہ سارے ایک روش کے اوپر چلتے۔ کیا ہے پیدا ہم نے بکریوں کو، بھیڑیوں کو پیدا کیا ہے، حیوانات کو پیدا کیا ہے، پوری کی پوری نوع ایک روش کے اُوپر ہے۔ کہیں آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ کچھ بکریاں گوشت کھا رہی ہیں، کچھ گھاس کھا رہی ہیں۔ وہ سب ایمان لاتی ہیں انہیں پتہ ہے کہ ہمارے لیے حلال کیا ہے حرام کیا ہے، کوئی بکری حرام خور نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! اگر خدا کی مشیت میں یہ ہوتا تو ہم انسانوں کو بھی ایسا ہی پیدا کر دیتے۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ **افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین** (10:99) تو کیا تو ان کو مجبور کرے گا کہ وہ ضرور ایمان لے آئیں۔ مجبوراً ایمان لانا ہوتا تو ہم ان کو پیدا ہی ایسا کرتے۔ یہ بات نہیں تھی۔ ہم چاہتے کچھ اور تھے۔ وہ یہ تھا کہ **وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ** (10:100) ہم چاہتے یہ تھے کہ جو ایمان لائے، وہ خدا کے قانون کے مطابق ایمان لائے، اکراہاً نہیں لائے، مجبوراً نہ لائے یہ کچھ نہ ہو۔ صاحب! وہ کیا قانون ہے جس کے مطابق یہ چیز کہی گئی ہے کہ ہم نے جبر نہیں کیا، جبر حیوانات تک ہے، انسان کو صاحب اختیار بنایا ہے۔ ایمان لایا جاتا ہے اس کے قانون کے مطابق۔ آیت ختم نہیں ہوئی، ابھی (Commaa) وقفہ ہے۔ کہا کہ **ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون** (10:100) قانون یہ ہے کہ جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا، اس پہ معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔ لہٰذا **قل الحق من ربکم فن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر** (18:29) ہماری طرف سے حقائق آ گئے، اب تم میں سے جس کا جی چاہے ان کو قبول کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

---

[1] وہ ختم کرنے والی بات تو ہے نہیں کہ تبرک لیے اور گھر چلے گئے۔

باذن اللہ یہ ہے کہ عقل وفکر سے کام نہ لینے والے ہمیشہ مشتبہ حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں:

آپ نے یہ دیکھا تھا کہ **ما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ** (10:100) خدا کا قانونِ مشیت یہ تھا کہ انسان کو مجبوراً کسی راستے پہ نہ چلایا جائے، اس کے اختیار وارادے پہ چھوڑا جائے کہ اپنی عقل وفکر سے کام لے کر اپنا راستہ خود اختیار کرے۔ یہ ہے اذن اللہ، جس کے مطابق انسان ایمان لا سکتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے عزیزانِ من! اذن اللہ کے کیا معنی ہیں؟ ایک اور بڑی اہم چیز جو ہم روز زندگی

میں کہتے ہیں یہ ہے کہ **ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ** (64:11) چل بھئی! بات ہی ختم ہوئی۔ کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی سوائے اللہ کے حکم کے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب مصیبت آتی ہے تو اسی وقت ہم کہتے ہیں اللہ کی مرضی۔ وہ کہتے ہیں دیکھیے قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آسکتی سوائے اللہ کے حکم کے۔ اوّل تو بات یہیں واضح کر دی لیکن اس کو سمجھنے کے لیے ذرا ایک اور طرف آجائیے کہا ہے کہ **ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ** (64:11) آپ نے دیکھ لیا یہاں عام طور پر ترجمہ یہ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی اور یہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ **وما اصابکم من مصیبۃ** (42:30) وہی الفاظ ہیں کہ کوئی مصیبت تم پہ نہیں آتی۔ کوئی مصیبت تم پہ نہیں آتی کے آگے کیا ہے؟ کہا کہ **فبما کسبت ایدیکم** (42:30) وہ تو تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ الفاظ وہی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا طریق یہ تصریف آیات ہے۔ سمجھ لیا باذن اللہ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے تم اپنے لیے مصیبتیں لے آؤ تو لے آؤ۔

خدا کا قانون تو انسان کو اس کے نقصان و نفع سے واضح کر دیتا ہے:

اب آیئے میں نے کہا تھا کہ وہ جو پہلی آیت ہے (64:11) ہے وہ آدھی تھی۔ یہ **ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ** (64:11) اس کے قانون کے مطابق ہے۔ کیسے ہوتا ہے؟ کہا کہ **ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ** (64:11) جو خدا کے ان قوانین کی صداقتوں پہ ایمان لے آتا ہے اس کے دل کو ایک راہنمائی مل جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیکھ لیتا ہے کہ مجھے نقصان والی بات ہے یا فائدے والی بات ہے یہ چھوڑ دوں گا' یہ اختیار کروں گا۔ **یھد قلبہ** (64:11) جو بھی اس کے قانون کا علم حاصل کر کے اس کی صداقت پر یقین رکھ لیتا ہے اسے ایک راہنمائی مل جاتی ہے۔ ہر واقع جو سامنے آتا ہے' اس کو راہنمائی مل جاتی ہے کہ اس کی روشنی میں کہ کون سا پہلو مجھے اختیار کرنا چاہیے' اور کون سا پہلو چھوڑ دینا چاہیے۔ جو ایسا نہیں کرتا' تو وہ غلط راستہ اختیار کر کے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی تمہاری مصیبت ہوتی ہے۔ یہ ہے مصیبت جو آتی ہے۔ یہ ہے **باذن اللہ** (10:100) آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ یہ جو میں نے کہا تھا کہ قرآن کی ان اصطلاحات اور ان تصورات کی ضرورت ہے کہ قرآنِ کریم سے پھر ان کے معنی اور مفاہیم کو متعین کیا جائے۔

جنگ اُحد کا واقعہ خدا کے باذن اللہ کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

آپ کو معلوم ہے کہ جنگ احد میں کیا ہوا تھا؟ میدان مار لیا' جماعت مومنین کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ پہاڑ کے ایک درے میں کمانڈر نے ایک دستے کو تیر اندازوں کے کھڑا کیا ہوا تھا کہ تم نے یہاں سے نہیں ہلنا خطرناک مقام یہی ہے' یہیں سے خطرہ نظر آتا ہے' کچھ بھی ہو یہاں سے تم نے نہیں ہلنا۔ کامیابی ہوئی دشمن میدان سے بھاگا۔ اس زمانے میں مالِ غنیمت پہ یہ ٹوٹ کر پڑا کرتے تھے۔ باقی جو غنیمت کا

مال سنبھالنے کے لیے آئے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ صاحب! ہم تو کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے اور یہ لے جائیں گے۔ یہ بھی وہاں سے بھاگ کر نیچے آئے۔ درہ خالی آیا' پیچھے سے فوراً ولید نے حملہ کیا' فتح سخت شکست میں بدل گئی' ایسی شکست کہ جس میں خود نبی اکرمؐ سخت زخمی ہوئے' بمشکل جان بچی۔ قرآن نے اس کا ذکر کیا' یہ بتایا ہے کہ کیوں شکست ہوئی۔ کہا ہے کہ جب تم سے کہا گیا تھا کہ تم نے وہاں سے نہیں ہلنا' تم نے دیکھا کہ اپنے اس کماندار کی معصیت کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ کہ فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ایسا نہ بھی کرنا اور اس کے متعلق کہا کہ **وما اصابکم یوم التقی الجمعٰن** (3:165) خود بتایا تھا کہ یہ ہوا تھا جو تم نے کیا تھا **اذن اللہ** یہ ہے کہ پہاڑ کے درے کے اوپر جہاں کہا تھا' جم کے کھڑے رہو' ٹھیک ہے کامیابی تمہاری ہوئی' وہاں تم نے درہ چھوڑ دیا' شکست ہوگئی۔ یہ ہے **اذن اللہ**

صدیوں سے اُلجھے ہوئے غلط تصورات کو مٹانا کوئی آسان نہیں ہوتا:

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے یہ مقامات ایسے ہیں کہ جنہیں نہایت اچھی طرح سے' وضاحت سے' دل کی گہرائیوں سے' سننے کی ضرورت ہے۔ پھر بات صاف ہوجاتی ہے۔ اب آیئے درس کی آیت پہ کہا کہ **کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً** (2:249) کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں کہ جن کو بڑی بڑی جماعتوں کے اوپر کامیابی حاصل ہوئی۔ باذن اللہ(2:249) بات سمجھ گئے مجھے اتنی آیات میں اتنا پھرنا پڑا کہ صدیوں کے غلط تصورات کی بنا پہ بات جلدی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہیں بات سمجھا کر آگے گزر جاؤں کہ ان مقامات کو سامنے لا کر کہا جاتا ہے کہ صاحب! بتایئے پھر اس کے معنی کیا ہوئے؟ وہ جانا وہیں ہے جہاں پہلے سے آپ کھڑے ہوئے ہیں ورنہ بات تو کہیں جانے کی تھی نہیں' یہ تو یہیں بات صاف ہوگئی تھی۔ سنیے عزیزانِ من! پوری آیت یوں ہے کہ **کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ** (2:249) کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جن کو بڑی بڑی جماعتوں کے اوپر اذنِ خداوندی کے مطابق غلبہ حاصل ہوا اور آگے ہے **واللہ مع الصابرین** (2:249) جو استقامت دکھاتا ہے اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بات تو یہیں صاف ہوگئی تھی مگر

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

صبر کے سلسلہ میں پھر ایک اور الجھن اور پھر اس کا صحیح مفہوم

واللہ مع الصٰبرین (2:249) یہاں پھر وہ دشواری ہے۔ صبر کے معنی ہیں وہی کہ ''میرا صبر''۔ اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سنا ہے وہ بیچاری بڑھی مائی تھی' جس کا کوئی نہیں ہوتا تھا ''اچھا بہن میرا صبر'' انتہائی بے بسی کا عالم' جہاں کوئی تدبیر نہ چل سکے' جہاں کچھ نہ سوجھ سکے۔ ہمارے ہاں صبر کے یہ معنی ہیں۔ یہ چھوٹی جماعتیں ہیں جن کی یہ کیفیت ہو' اس قسم کا صبر جو ہمارا

ہے' اس قسم کے صبر والوں کی کیفیت تو پھر۔ یہ ہے کہ سارے عرب کی جتنی بھی قومیں اور ممالک تھے' اس اسرائیل کی 1967ء کی جنگ میں' چھ گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے (اردگرد کی عرب ریاستوں کو) تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہ اس قوم نے کیا جس کے متعلق اب تک ہم کہتے ہیں کہ ان کو خدا نے ذلت اور رُسوائی کی مار ماری ہوئی ہے۔ دنیا کی ذلیل ترین قوم کے ہاتھوں متحدہ اتنے جیوش و عساکر' اتنی بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوگئیں۔ یہ کیا تھا؟ ان کے ہاں صبر کے یہ معنی تھے۔ وہاں کہتا ہے کہ **واللہ مع الصابرین** (2:249) استقامت سے جم کر کھڑے ہو جانے والے۔ اس قسم کی استقامت کہ بھاگنا تو ایک طرف رہا' جسے کہتے ہیں ڈولے بھی نہیں۔ اور کیا آپ کو پتہ ہے کہ عرب یہ لفظ کہاں استعمال کرتے تھے؟ چپوؤں سے' بادبانوں سے کشتیاں چلتی تھیں۔ بادبان کی جو کشتی ہے' اگر کہیں ہوا تیز ہو جاتی ہے' جھکڑ آتا ہے تو وہ ڈولتی ہے۔ ویسے بھی سواریاں بٹھاتے وقت بھی یہ کچھ ہوتا ہے۔ پھر اس میں وہ کیا کرتے ہیں؟ ایک بڑا سا پتھر ساتھ رکھ لیتے تھے کہ جہاں کشتی کی اس قسم کی کیفیت پیدا ہو تو انہیں معلوم ہوتا تھا تو وہ بڑا سا پتھر دوسری سائیڈ پہ رکھ دیتے تھے تاکہ اس کا توازن قائم رہے اور پھر وہ ڈولے نہیں۔ یہ پتھر جس سے توازن قائم رہتا تھا' اسے صابورہ کہتے تھے یعنی کشتی کو صبر دے دینے والا۔ بھاگ جانا تو میدان سے ایک طرف رہا' عزیزانِ من! لغزش بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تو لغزش بھی نہیں۔ جسے میں نے کہا ہے ذرا سا ڈول جانا' ان کے یہ بھی بالکل نہیں تھا۔ ایک متوازن شخصیت ہے۔ یہ ہے Balanced Personality ہے' سامنے سے بڑی سے بڑی مصیبت بھی آتی ہے تو بھی اس میں بھاگنا نہیں ہے' لغزش نہیں ہے' ڈولنا تک نہیں ہے۔ یہ ہے **واللہ مع الصابرین** (2:249) یہ ہے بان اللہ جس سے یہ چیز ملتی ہے اور وہیں بات صاف ہوگئی کہا کہ **ولما برزو الجالوت وجنودہٖ** (2:250) ہاں! جب وہ لشکر ان کا سامنے آ گیا تو یہ جو اس قسم کے تھے جنہیں معلوم تھا کہ **ان اللہ مع الصابرین** (2:249) خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

خدا کا ساتھ ہونے کا عملی مفہوم فارس کے گورنر کی زبانی:

عزیزانِ من! یہ خدا ساتھ ہوتے والی بات بھی اب ہماری سمجھ میں نہیں آتی صاحب! یہ کیسے ہوتا ہے؟ سنیے! وہ فارس (ایران) کا گورنر (ہرمزان) شکست کھا کر قیدی کی حیثیت سے مدینے میں آیا ہے۔ ایران کی سلطنت کی کیفیت یہ تھی کہ عربوں کے ساتھ جنگ نہیں کیا کرتے تھے کہ اس ذلیل قوم کے ساتھ ہم جنگ کریں۔ یعنی ان سے صلح کرنا تو ایک طرف رہا' ان کے ساتھ وہ دشمنی بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ بڑی ذلیل قوم ہے۔ ایران کی سلطنت' ہزار ہا سال کی تہذیب کی مالک' اتنی بڑی سلطنت تھی۔ روما اور ایران ایسے ہی تھے جیسے آج رشیا اور امریکہ کہیے یا چائنا (چین) کہیے۔ یہ دو بلاک تھے۔ اتنی بڑی سلطنت کی کیفیت یہ ہے کہ پہلی ہی دفعہ یہ جو یورش ہے اور اتنی سی جماعتوں نے یورش کی ہے صاحب! ساری کی ساری مملکت ہی ختم نہیں کی' بلکہ ان کی تہذیب بھی ختم ہوگئی۔ وہاں کا گورنر' جو مدینے میں قید

ہو کر آیا ہے تو حضرت عمرؓ (581-644/45) نے اس سے پوچھا کہ تمہاری کیفیت تو یہ تھی کہ تم کبھی عربوں کے ساتھ جنگ تک کرنے کے لیے نہیں اُترتے تھے' اسے اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ اور یہ سوال ہی نہیں تھا کہ تم کبھی شکست کھا جاؤ' یہ اب کیا ہوا ہے کہ کسی جگہ تم کھڑے ہی نہیں رہ سکے' ساری مملکت شکست کھا گئی۔ کیوں؟ وہ لوگ دیدہ ور تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہوا کیا ہے۔ اس کا ذکر تاریخ نے محفوظ رکھ لیا' عزیزانِ من! اور ہمارے لیے ان اللہ مع الصابرین کی تفسیر بن گیا۔ اس (ہرمزان) نے کہا یہ تھا کہ اس سے پیشتر ایرانی اور عرب دونوں آمنے سامنے ہوتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس لیے عرب کی مجال ہی نہیں تھی کہ ایران کا مقابلہ کرے مگر اب جو ہم آئے ہیں تو ہم نے دیکھا کہ ایک طرف ایرانی ہیں' دوسری طرف عرب اور ان کا خدا ہے۔ عربوں کا مقابلہ تو ہم کر لیتے' خدا کا مقابلہ کیسے کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کیسے ساتھ ہوتا ہے۔

میدان جنگ میں استقامت کے لیے دعا کے الفاظ آرزو بن کر زبان پر آجاتے ہیں:

یہ ہے ان **اللہ مع الصابرین** (2:249) یہاں یہ جب میدانِ جنگ میں گئے ہیں تو **قالوا** (2:250) لب پہ آئی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ آرزوئیں بے ساختہ لب پہ آ گئیں کہا کہ **ربنا افرغ علینا صبرًا** (2:250) تو نے ابھی یہ کہا ہے کہ ہم ساتھ دیتے ہیں تو ایسے مواقع پہ اس کا جواب صبر کا ثبوت دیتا ہے۔ شدتِ آرزو زبان پہ دعا بن کر آ گئی کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے **افرغ علینا صبرًا** (2:250) فروغ دے ہماری استقامت کو۔ یہ بات ہم پہ ہی نہیں چھوڑی کہ یہ قرآن آ جائے گا۔ ان کے بس میں جو ہے یہ کریں گے۔ یہ معنی ہیں صبر کے۔ کیا ہے صبر جو وہ مانگتے ہیں؟ یہ ہے کہ **ثبت اقدامنا** (2:250) ہمیں ثابت قدمی عطا کر دے۔ دیکھا کس طرح سے معنی کر رہا ہے! اور یہ وہ چیز ہے جو ابھی تم نے کہی ہے کہ ہم اس کے ساتھ ہوتے ہیں جواب کیفیت یہ ہو جائے اور **وانصرنا علی القوم الکافرین** (2:250) یہ قوم جو ان قوانین سے انکار کر رہی ہے' اس طرح اس کے اوپر ہمیں غلبہ عطا کر دے۔ وہ ڈسپلن کہ شدتِ پیاس کے باوجود پانی کا گھونٹ تک نہیں پینا' یہ استقامت کہ دشمن کی کثرت سے گھبرانا نہیں ہے' ڈرنا نہیں ہے' جم کے کھڑے ہو جانا ہے' اور یہ چیزیں دل سے اُبھریں۔ اب یہاں بات ہو گئی کہ محض باہر کا ایک حکم سن کر اس کے مطابق (Mechanical) (میکانکی) اثر نہیں کرتا۔ خود تمہارے دل کے اندر سے یہ آرزوئیں بیدار ہوں کہ ہمیں استقامت مل جائے' ہم ثابت قدم رہیں گے' ہم میدان نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہے **وانصرنا علی القوم الکافرین** (2:250) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **فھزموھم** (2:251) انہوں نے ان کو بھگا دیا اور اس کے آگے ہے کہ **باذن اللہ** (2:251) قرآن ہے' عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ اس کی کتاب ہے جس سے بڑا مصنف نہیں ہے اور کتاب وہ کہ تورا کشید او دست از قلم کشید ❶ یہ اس کی آخری تصنیف۔ ''جنوں کیندے نیں قلم توڑ کے رکھ دتا اے ❷'' **باذن اللہ وقتل**

داود جالوت (2:251) داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔ ہر فاتح مفتوح کو یہ کیا ہی کرتا ہے۔ کیا یہ چنگیزیت تھی (معاذ اللہ) **واتٰہ اللہ الملک** (2:251) ٹھیک ہے مملکت ملی۔ یہ تو ہلاکو کو بھی مل جاتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ **الملک و الحکمۃ** (2:251) نہایت دانائی کی چیز ہے' ملک وحکمت کی چیز ملی۔ **وعلمہ مما یشآء** (2:251) اور اس کو وہ علم دیا جو اس کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ داؤد کو وحی بھی ملی حکمت بھی ملی اور حکمت کا تو قرآن نے بتایا ہے کہ یہ کیا کیا چیزیں تھیں۔ یہ زرہ بکتریں تیار کرنا' اس قسم کے اوزار اور ہتھیار تیار کرنا' قرآن نے کہا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں آ کر لوہا موم بن جایا کرتا تھا۔ ''تے ساڈے تے ہر چیز معجزہ فیر ہو جاندی اے❸ نا'' یہ سب کچھ سکھایا۔ فتح حاصل ہوئی' دشمن کو ہزیمت ہوئی' مملکت ملی۔

---

❶ تیری تصویر کھینچی تو اس مصور نے قلم رکھ دیا کہ اس کے بعد میں کوئی اور تصویر نہیں کھینچوں گا۔

❷ جسے کہتے ہیں کہ قلم توڑ کر رکھ دیا۔

❸ ہمارے ہاں تو ہر چیز پھر معجزہ بن جاتی ہے۔

اگر خدا انسانوں کی حفاظت انسانوں کے ذریعے کرانے کا انتظام نہ کرتا تو دنیا میں کسی کی عبادت گاہ محفوظ نہ رہتی۔

برادرانِ عزیز! بات ایسے ذہن میں آ رہی تھی جیسے قرآن پچھلی تاریخ کی کوئی کہانی بیان کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے واقع تو وہ بیان کر رہا ہے' درمیان میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا کیا کچھ کہتا چلا جا رہا ہے۔ وہ تو درمیان کی بات تھی۔ کہانی آخر ہوگئی' مقطع کا بند آ گیا صاحب! یہ کیا آ گیا؟ کہ یہ جنگیں کاہے کے لیے ہوتی تھیں؟ یہ کیوں اتنی بڑی فوج ہم نے بھیجی؟ کیوں ایک نبی کو کہا؟ کیوں نبی نے ایک کمانڈر مقرر کیا؟ کیوں اتنے بڑے یہ جو مجاہد' یہ سپاہی تھے' وہ آئے؟ انہوں نے جانیں بھی دیں؟ کاہے کے لیے یہ سب کچھ ہوا؟ کہا کہ **ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض** (2:251) اگر سرکشوں کے مقابلے میں خدا اس قوم کی فوجیں' اس قسم کی جماعتیں' تیار کر کے ان کی مدافعت نہ کرے تو اس دنیا کی تباہیاں آ جائے۔ **دفع اللہ الناس بعضھم بعض** (2:251) ہمارے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ جو بھی ذرا ظلم کرنے کے لیے اٹھے' اسے ہم پتھر کا بنا دیں کہ اس کا ہاتھ ہی نہ اُٹھ سکے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر ہم یہ کچھ نہیں کیا کرتے۔ **دفع اللہ الناس بعضھم ببعض** (2:251) ان میں سے جو سرکش اُٹھتے ہیں' ان کی سرکشی کی سرکوبی کے لیے انہی انسانوں میں سے دوسری جماعت آتی ہے کہا کہ **لفسدت الارض** (2:251) فساد برپا ہو جاتا ہے دنیا سے فساد کو مٹانے کے لیے یہ جماعت اُٹھتی ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اس کی فوج کشی کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ یہاں تو صرف یہی کہا ہے

کہ لفسدت الارض (2:251) آپ کومعلوم ہے سورۃ الحج میں یہ آیتیں پہلے بھی آ چکی ہیں' وہاں ہے کہ **ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض** (22:41) اگر خدا یہ انتظام نہ کرے تو پھر کیا ہو؟ **لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرًا** (22:40) اگر خدا ایسا نہ کرے تو یہودیوں کے صومعے عیسائیوں کے گرجے' ہندوؤں کے مندر' راہبوں کی کوٹھڑیاں' تمھاری مسجدیں' یہ سب کچھ باقی نہ رہیں۔ یہ مجاہدین کی جماعت کا ہے کے لیے تیار ہو رہی ہے؟ کہ اگر کوئی ایسا ظالم سرکش کسی کے گرجے کو ڈھانے کے لیے آئے تو یہ اپنی جان دے کر اس کی حفاظت کریں۔ میرے اللہ! مسجد کا ذکر آخر میں کیا ہے' پہلے ان کے گھروں کو محفوظ کیا ہے۔ گرجوں کو' صومعوں کو' راہبوں کو کوٹھڑیوں کو' مندروں کو' ان کو محفوظ کر کے آخر میں اس کا بھی نام دے دیا ہے کہ اس کی بھی یہ کیفیت حاصل ہو جائے **ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین**(2:251) تمام اقوامِ عالم کے اُوپر ہم صاحب فضل رہنا چاہتے تھے' اس لیے ہم نے یہ انتظام کیا ہے۔ کہیں کوئی ظالم اٹھے' جہاں کبھی خدا کے اس لشکر کے پاس قوت ہوگی' اس کے لیے فرض ہو جائے گا کہ اس کی آواز کے اوپر جا کر اپنی جانیں دے کر اس کی حفاظت کرے **واللہ ذو فضل علی العالمین** (2:251) ایسی جماعت کا دنیا کے اندر موجود رہنا عزیزانِ من! فضل خداوندی کی علامت ہوتی ہے اور جب یہ ایسی جماعت دنیا میں نہ رہے تو دنیا فضل خداوندی سے محروم ہو جاتی ہے جیسے آج محروم ہو چکی ہوئی ہے۔ اب آخری چیز آ گئی کہ **تلک ایٰت اللہ نتلوھا علیک بالحق** (2:252) دیکھتے ہو' یہ ہیں وہ آیاتِ خداوندی جو پیش کی ہیں تمہارے سامنے حق کے ساتھ' ایک حقیقت کے طور پر اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **نتلوھا علیک بالحق** (2:252) سے یہ ذہن میں آ سکتا تھا کہ یہ ایک مخصوص چیز ہے' یہ کسی ایک رسول کے لیے مختص کیا گیا ہے یہ کوئی Exceptional (استثنائی) سی چیز ہے' کسی کے لیے جو کی گئی ہے۔ کہا کہ یہ بات نہ تم لوگوں نے سمجھ لینا۔ **وانک لمن المرسلین**(2:252) تو مرسلین میں سے ایک مرسل ہے۔ **وتلک الرسل فضلنا بعضھم علٰی بعض**(2:253) سلسلہ رُسل چلا آ رہا ہے' تو بھی ان میں سے ایک ہے یا یہ وہ ہیں کہ جن سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ عزیزانِ من! وقت بھی ہو گیا' للہ الحمد دوسرا پارہ بھی آج ختم ہو گیا' تبرکاً تیسرے پارے کی پہلی آیت کے دو الفاظ بھی میں نے تلاوت کر دیے۔ ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 252 تک آ گئے' دوسرا پارہ ہم نے ختم کیا' آئندہ ہم 253 سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

اکیاونواں باب: سورۃ البقرۃ (3)(253)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ
اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا
فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا
يُرِيْدُ ۝۲۵۳ۧ

آج جولائی 1969ء کی 6 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 253 سے شروع کر رہے ہیں۔ (2:253)۔

پچھلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ **تلک ایٰت اللہ نتلوھا علیک بالحق** (2:252) یہ آیاتِ خداوندی ہیں' جو اے رسول! تیرے سامنے پیش کی جارہی ہیں اور یہ مبنی برحقیقت ہیں اور اس کے بعد تھا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تم سے کہی جارہی ہے' نہ ہی تو کوئی نیا رسول ہے۔ **وانک لمن المرسلین** (2:252) اور انہی رسولوں کے زمرے میں ایک تم بھی ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

رسولوں کے مابین باہمی منصب سے ہٹ کر ان کے دائرہ تعلیم دائرہ نفوس اور ان کی انقلابی جدوجہد میں فرق کی نوعیت:

رسولوں کا ذکر آیا تو بات کہی کہ **تلک الرسل فضلنا بعضھم علٰی بعض** (2:253) اس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ رسول ہیں' ان میں سے بعض کو دوسروں کو فضیلت دی ہم نے۔ اسی سورۃ البقرۃ کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم رسولوں پہ ایمان لاتے ہیں اور **لا نفرق بین**

بین احد من رسله (2:285) ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔ وہاں فرق کرنا کہا ہے اور یہاں کہا ہے کہ **فضلنا بعضهم علٰی بعض** (2:253) ہم نے بعض کو دوسروں پر فضیلت دی اور اسی کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ **ورفع بعضهم درجٰت** (2:253) اب ایک چیز ایک دفعہ ایک جگہ یہ کہا گیا کہ ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے' دوسرے مقام پہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ ان دونوں مقامات میں تطبیق کیا ہے؟ ایک چیز تو ہے خدا کی طرف سے رسول بن کر آنا' منصب رسالت پانا۔ اس منصب رسالت کی حیثیت سے کسی رسول میں بھی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جتنے رسول تھے' خدا کے پیغامبر تھے' خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے' اس وحی کو آگے پہنچاتے تھے۔ یہ جو منصب رسالت ہے' اس میں کسی کو ان میں سے ہم الگ نہیں کرتے' یہ سب خدا کے رسول تھے لیکن یہ ظاہر ہے کہ مختلف رسولوں کا دائرۂ اثر ونفوذ جو ہے' ان کی تعلیم کا دائرہ' ان کی انقلابی جدوجہد کا احاطہ' یہ مختلف ہے۔ بعض رسول ہیں جو ایک بستی کی طرف آئے' ایک بستی میں ایک خرابی بڑی نمایاں تھی' اسی کی انہوں نے اصلاح کی۔ ایک رسول ہے مثلاً حضرتِ موسیٰ' وہ ایک بڑی عظیم الشان قوم کی طرف آئے اور ان کے انقلابی جدوجہد کا ٹکراؤ فرعون جیسی قوتِ قاہرہ کے ساتھ ہوا' جس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے نمائندے بھی یکساں طور پہ شامل تھے۔ یہ بہت بڑا ٹکراؤ ہے اور پھر آخر میں نبی اکرمؐ ہیں' نبوت کے اعتبار سے خاتم النبیین ہیں۔ قیامت تک آپ کی رسالت پھیلی ہوئی ہے۔ خود آپؐ کے اپنے ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا ہے' وہ بھی عدیم النظیر ہے۔ تو یہ جو ان رسولوں کا یہ دائرہ اثر ونفوذ ہے' یہ احاطہ انقلاب و تعلیم و تربیت ہے' یہ مختلف ہے اور اس کے اس اختلاف کی بنا پہ کہا ہے کہ ایک کو دوسرے پر کچھ مدارج حاصل تھے۔ **وفضلنا بعضهم علٰی بعض** (2:253) میں بھی یہی کیفیت ہے جو قرآن نے کہی ہے۔

تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے شرط اوّل ہے:

یہ یاد رکھیے! قرآن کریم کی رو سے نبی اکرمؐ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے سے پہلے یہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ خدا نے شروع سے ہر ملک میں ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے۔ ان تمام رسولوں پر مجمل طور پر ایمان لانا کہ خدا نے یہ بھیجے تھے' یہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہ پہلی شرط ہے۔ آخری نبی جو نبی اکرمؐ سے پہلے تک ہوئے ہیں' ان پر ایمان لانے کے بعد نبی اکرمؐ کی رسالت پر ایمان لایا جاتا ہے پھر آدمی مسلمان ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ جسے رواداری یا Tolerence کہتے ہیں وہ تو صرف Tolerence ہے۔ وہ تو Tolerate کرنے کی بات ہے۔ دنیا اسی کو بڑی خوبی کی بات کہتی ہے کہ کسی کی کسی خوبی کو محض Tolerate کر لیا جائے' برداشت کر لیا جائے۔ یہاں برداشت کا سوال نہیں ہے' یہاں ہمیں دنیا کی ہر قوم کے متعلق یہ ایمان لانا ہے کہ ان کی طرف خدا کا رسول آیا تھا اور ہم اس رسول پر ایمان لانے کے بعد مسلمان ہوتے ہیں۔ جو قوم بھی اپنے مذہب کے کسی بانی کے متعلق بھی کوئی بات آپ سے کرے اور اس کا

ذکر کرے' نہ بھی کرے تو پھر بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی طرف خدا کا رسول آیا تھا اور رسول ہونے کی جہت سے **لا نفرق بین احد من رسولہ** (2:285) ہم اس کے رسول ہونے کی جہت سے اپنے رسول میں اور ان کی طرف آئے ہوئے رسول میں تفریق ہی نہیں کرتے۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ بات Tolerate کرنے کی نہیں' یہ تو انتہائی احترام کی بات ہے' ان کی عظمت کو تسلیم کرنے کی بات ہے' یہ تسلیم کرنا ہی نہیں اس پہ ایمان لانے کی بات ہے۔ ہ ہم تو اس چیز کے اوپر مکلّف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم' مختلف اقوام' مختلف مذاہب' اپنے جن بزرگوں کے متعلق یہ کہیں کہ وہ ہمارے مذہب کے بانی تھے وہاں' وہ اونچا مقام رکھتے تھے' بشرطیکہ وہ نبی اکرمؐ سے پہلے کے ہوں کیونکہ ان کے بعد تو ہم پھر ایمان رکھتے ہیں کہ کوئی نبی نہیں آ سکتا' اگر ان سے پہلے کے ہوں تو کسی کا وہ نام لے دیں' ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کے رسول ہوں کیونکہ قرآن نے ان رسولوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان میں سے بعض کا تو اس قرآن کے اندر ہم نے ذکر کر دیا ہے اور باقی وہ ہیں کہ جن کا ہم نے نام نہیں لیا۔ جس طرح سے ان رسولوں کی طرف بھیجی ہوئی کتابوں کے متعلق کہا' وہ صرف چار کتابیں ہیں جن کا نام قرآن نے لیا ہے' باقیوں کا نام نہیں لیا۔ اسی طرح سے جن انبیا یا رسولوں کا نام لیا ہے' وہ کوئی پینتیس چھتیس اڑتیس کے قریب سمجھ لیجیے اور کہا یہ ہے کہ کوئی اُمت' کوئی قوم' کوئی بستی ایسی نہیں تھی جس میں ہم نے رسول نہیں بھیجا۔ تو وہ تو آپ سوچ لیجیے کہ تعداد کہاں تک پہنچی ہے۔ ان سب پر ہمیں مجملاً ایمان لانا پڑے گا اور مسلمان ہونے کے لیے ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس قوم کے پاس اس کی وحی' اس کے رسالات لے کر آئے تھے۔ ہمارے نزدیک وہ باقی رسولوں کی طرح واجب التعظیم ہیں' ہم ان کا احترام کریں گے' ان میں کسی کے خلاف کوئی کسی قسم کا گستاخی کا لفظ ہم زبان پہ نہیں لا سکتے: **لانفرق بین احد من رسلہ** (2:285) آپ سوچیے عزیزانِ من! دنیا کی کوئی قوم اپنی مذہبی کتاب میں سے اس قسم کی کشادہ ظرفی کا ثبوت نہیں دے سکتی ہے۔ ہم اسے کشادہ ظرفی کہہ کر بھی کچھ اس میں اپنے لیے Virtue کا پوائنٹ (نکتہ) پیدا کرنا چاہتے ہیں' سوال یہ نہیں ہے۔ ہم تو ایمان لانے کے لیے مکلّف ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو کہ ہم ان میں سے کسی پہ ایمان نہ لائیں تو ہم مسلمان ہو نہیں سکتے۔ دنیا بھر کے جتنے اہل مذاہب' جتنی اقوام عالم' جتنی دنیا کی اُمتیں اور قومیں ہیں ان کے متعلق یہ ایمان ہے کہ ان کی طرف خدا کے رسول آئے تھے اور ہم ان میں کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

قرانی تعلیم کے برعکس ہماری حالت اور کفر گری کے فتویٰ:

ہمارا ایمان تو یہ تھا تعلیم ہمیں یہ دی گئی تھی کہ دنیا بھر کی اقوام کے جو بزرگ ہیں' ان میں بھی تفریق نہ کرو۔ اور ہماری اپنی یہ کیفیت ہے کہ ہم روز اپنی اُمت کے بزرگوں کے متعلق آپس میں لٹھم لٹھا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے روز ایک دوسرے کے اُوپر کفر کا فتویٰ لگاتا ہے۔ روز ان میں تفریق کرنے کے معاملات کے اوپر بحثیں ہوتی ہیں' مناظرے ہوتے ہیں' مباحثے ہوتے ہیں۔ اے گرفتارِ ابوبکرؓ و

علیؑ ہوشیار باش! کیا یہ قرآن نے کہا ہے؟ ذرا سوچو تو ہم تو مثلاً ہندوؤں کے کسی بزرگ کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ رسالت کے اعتبار سے اس میں اور نبی اکرمؐ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قوم کو تعلیم یہ دی گئی تھی اور قوم کی عملی کیفیت یہ ہے کہ خود اپنی اُمت کے جو اسلاف ہیں بزرگ گزر گئے ہیں، ان میں تفریق کرنے کے لیے ہزار برس سے آپس میں جنگ وجدل ہو رہی ہے۔ صاحب! جبکہ قرآن کہتا ہے کہ **لا نفرق بین احد من رسلہ** (2:285) کتنی بڑی کشادہ نگہی ہے، کتنا بڑا وسعت ظرف ہے۔ یہ برداشت کرنا نہیں ہے، یہ Tolerate کرنا ہے، یہ تو احترام کرنا ہے، ایمان لانا ہے ان کی رسالت پر۔

نبوت اور رسالت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں:

برادرانِ عزیز! عرض کر دوں کہ میں کبھی نبی کہتا ہوں، کبھی رسول کہتا ہوں، کبھی نبوت کہتا ہوں، کبھی رسالت کہتا ہوں۔ یہ کوئی الگ الگ چیز نہیں ہے، یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ نبوت ہوتی ہے ''خدا کی طرف سے وحی کا پانا'' اور رسالت ہوتی ہے ''اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا'' یہ ایک ہی فرد ہوتا ہے جس کے یہ دو منصب ہوتے ہیں۔ وہ ادھر سے اس چیز کو لیتا ہے اِدھر اسے پہنچاتا ہے۔ نبوت یہ منصب ہے، اس کے معنی ہیں اس مقامِ بلند پہ کھڑا ہوا انسان جیسے پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑا ہوا اور وہ اُدھر کی چیزوں کو بھی دیکھ رہا ہو اور اِدھر کی چیزوں کو بھی دیکھ رہا ہو۔'' نبی اس مقام بلند پہ فائز ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف اس کی نگاہ جو مابعد الطبیعاتی مسائل ہیں جو حقائق ہیں، اس محسوس عالم (Physical World) سے ماورا جتنا ہے جسے ہم سرچشمہ علم الٰہی کہتے ہیں۔ ایک طرف وہ وحی کی بنا پہ ان حقائق کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اور پھر وہ اس دنیا سے کٹ کر الگ نہیں ہو جاتا، وہ جو کچھ وہاں دیکھتا ہے، وحی کی رو سے پاتا ہے، پھر وہ اتر کر حرا سے سوئے قوم آتا ہے اور اپنی وحی کو ان تک پہنچاتا نہیں ہے، اس وحی کے مطابق انسانیت کے اندر، عالم انسانیت کے اندر، ایک انقلاب برپا کر کے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ یہ اس کی رسالت ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں ایک بات چلی کہ صاحب! نبی وہ ہوتا ہے جو صاحب شریعت نہیں ہوتا، رسول وہ ہوتا ہے جو صاحب شریعت ہوتا ہے۔ یہ قطعاً غیر قرآنی تصور ہے۔ برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم نے ان رسولوں کو جن کو رسول کہا ہے، انہی کو نبی کہا ہے، جن کو نبی کہا ہے انہی کو رسول کہا ہے۔ جسے آپ شریعت کہتے ہیں، وہ ہے کیا؟ یہ خدا کی طرف سے وحی پانا، کچھ احکام، کچھ قوانین، کوئی تعلیم پانا ہے۔ اسی کا نام شریعت ہوتا ہے اور اگر کسی نبی کو یہی نہیں ملتا تو پھر وہ انسانوں کی طرف لے کر کیا آتا ہے۔ یعنی مجھے اس سے کام کیا ہے کہ جو میرے لیے کوئی چیز خدا سے نہیں لا رہا۔ میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ یہ جو غیر قرآنی تصور ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی علم ملتا ہے اور وہ اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، دوسروں کے لیے نہیں ہوتا، یہ تصوف نے پیدا کیا جو پھر اقبالؒ کے الفاظ میں ''اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے'' مستعار لیا ہوا ہے، غیر قرآنی تصور

ہے‘ یاد رکھیے۔

عزیزانِ من! میں یہاں صرف اتنا عرض کر رہا تھا کہ نبی اور رسول ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں‘ ایک ہی فرد کے دو منصب ہیں۔ صرف اتنی سی چیز ہے وہ خدا سے وحی کا پانا ہے‘ یہ اس وحی کو آگے پہنچانا ہے۔ وہ مجرد حقائق آتے ہیں‘ یہ ان کو ایک نظام کی شکل میں عملاً متشکل کرتا ہے‘ ایک ہی فرد ہے۔ کوئی نبی بغیر رسالت کے نہیں ہوسکتا‘ کوئی رسول بغیر نبوت کے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انہی کو کبھی نبی کہا جاتا ہے‘ کبھی رسول کہا جاتا ہے‘ کبھی منصب کے فرق کے اعتبار سے ان دو اصطلاحوں میں فرق کیا جاتا ہے لیکن یہ نبی ہے کہ نبی صرف نبی ہی ہوتا ہے‘ رسول ہوتا ہی نہیں ہے اور رسول‘ رسول ہوتا ہے‘ نبی ہوتا نہیں ہے۔ نبی اور رسول ایک ہی فرد کے دو مناصب کا نام ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ **لا نفرق بین احد من رسلہ** (2:285) کسی رسول کو قطعاً تفریق نہیں کرتے‘ دنیا کی کسی قوم کی طرف وہ آیا ہو‘ خواہ اس کا قرآن نے تصریحاً نام لیا ہو یا محض مجملاً اس کا ذکر کیا ہو۔ مجملاً ذکر بھی اس طرح سے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کوئی ایسی بستی یا اُمت نہیں جس کی طرف ہم نے رسول نہ بھجا ہو۔ یہ اجمالی ذکر ہو گیا کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف خدا کا رسول آیا ہے اور اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اتنی بڑی کشادہ نگاہ والی قوم دنیا میں پیدا ہو رہی ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کا وہ کتنا ہی اس وقت باطل مذہب کیوں نہ ہو‘ اس کے متعلق یہ ایمان رکھنا کہ خدا کی طرف سے ابتداً وحی کے ذریعے سے چیز آئی تھی‘ انہوں نے نفی کر دیا ہے‘ اپنی چیز کو۔ وہ لانے والا جو تھا اس کا احترام ہمارے دل میں ہے‘ اس پر ایمان لانے سے ہم مسلمان ہوتے ہیں۔ یہاں سے ایک مسلمان آگے چلتا ہے۔ **منھم من کلم اللہ** (2:253) یہ ایک چیز یہاں آئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کا درس شاید اسی نکتہ کے لیے وقف ہو جائے گا۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کے لیے ایک درس بھی کافی نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان میں سے وہ بھی ہیں جن سے خدا نے کلام کیا۔ بات یہ کیا ہوئی؟ انبیائے کرام کی طرف‘ خدا کی طرف سے‘ وحی آتی تھی۔ وحی کا بڑا اہم موضوع ہے۔

وحی کی حقیقت اور عمل انسانی میں فرق:

یہ وحی کیا ہے؟ کیا چیز آتی تھی؟ انسانی علم اکتسابی (Acquired) ہوتا ہے۔ اکتسابی کے معنی یہ ہیں جسے محنت کر کے کسب و ہنر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ انسان کے بچے کی کیفیت تو یہ ہے کہ جتنا کچھ علم حیوان کے بچے کو فطرت نے از خود دیا ہوا ہوتا ہے انسان کے بچے کو اتنا علم بھی نہیں ہوتا۔ حیوان کو بچہ‘ ہر وہ خصوصیت جو اس کے ماں باپ میں ہوتی ہے‘ پیدائش سے‘ پہلے دن سے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ ربط (Duck) کے بچے میں پانی میں تیرنا ہے کہ وہ مرغی کے نیچے سے سیے ہوئے انڈے میں سے کیوں نہ نکلے۔ انڈے سے باہر آنے کے ساتھ ہی‘ وہ اُڑ کر پانی میں پہنچے گا اور اسی کے ساتھ دوسرے انڈے میں سے نکلا ہوا مرغی کا بچہ بھاگ کر خشکی کی طرف آ جائے گا۔ یہ ان

کے اندر پیدائش سے رکھی ہوئی چیز ہے۔ یہ علم انہیں وراثت میں ملتا ہے اور انسانی بچہ یہ ہے کہ باپ ایم اے ہو باپ جاہل ان پڑھ ہو ان دونوں کے بچوں کو یکساں طور پہ الف ب سکھانی پڑتی ہے۔ اتنا بڑا تعلیم یافتہ باپ کا بچہ پیدائش میں اس باپ کے علم میں سے الف ب بھی ساتھ لے کر نہیں آتا۔ یہ سارا علم اکتسابی کہلاتا ہے یہ سیکھنا پڑتا ہے یہ سکھانا پڑتا ہے یہ حاصل کرنا پڑتا ہے تجربے سے مشاہدے سے مطالعہ سے درس و تدریس سے زندگی کے تجارب سے۔ بہرحال یہ علم حاصل کرنا پڑتا ہے اس میں کسی قسم کی استثنا نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن نے علم کا ایک اور ذریعہ بتایا جو ہر انسان کو حاصل نہیں ہوتا وہ کسب و ہنر سے حاصل کیا نہیں جا سکتا۔ اصطلاح میں اس کا نام وحی ہے یہ خدا کی طرف سے براہِ راست کسی انسان کو کوئی علم عطا ہونا ہے۔ اس میں اس شخص کے اپنے کسب اور ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ کسی طرح سے محنت کر کے پڑھ پڑھا کے کوئی ریاضتیں کر کے کوئی چلے کر کے کسی طرح سے اس علم کو حاصل کر لے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست یہ علم ملتا ہے اسے اصطلاح میں وحی کہا جاتا ہے۔ یہ جو ان حیوانات کے اندر یا کائنات کی اشیاء کے اندر علم داخل کیا ہوا ہوتا ہے جو انہوں نے از خود کہیں سے حاصل نہیں کیا ہوا ہوتا قرآن نے اسے بھی وحی کہا ہے۔ **واوحی ربک الی النحل** (16:68) شہد کی مکھی کی طرف ہم نے وحی کی **او حی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ امرھا** (19:11) یہ اجرامِ فلکی کی طرف وحی کی ہوئی ہے ارض کی طرف وحی کی ہوئی ہے۔ وحی کیا ہے؟ انہوں نے کسب و ہنر سے یہ چیزیں نہیں سیکھیں شہد کی مکھی نے کہیں کسی Institution میں جا کر ٹریننگ حاصل نہیں کی کہ اس طریق سے چھتہ بنائے اور ایسے وہ شہد کو اکٹھا کرے۔ شہد کی مکھی کا ہر بچہ پیدائش کے ساتھ یہ سارا علم اپنے اندر لاتا ہے قرآن نے اسے بھی وحی کہا ہے۔ اب یہیں سے وحی کی Definaition (تعریف) ہمارے سامنے آ گئی۔ وہ علم جو کسب و ہنر سے حاصل نہ ہو براہِ راست خدا کی طرف سے ملے۔ اشیائے کائنات میں ہر نوع کو یہ از خود ملتا ہے اس میں استثناء نہیں ہوتی۔ ہر بکری کے بچے کو ہر مرغی کے چوزے کو ہر شہد کی مکھی کے بچے کو یہ علم ملا ہوا ہوتا ہے ان میں سے کوئی اس سے محروم نہیں ہوتا۔

قدرت وحی عطا کرنے کے لیے انسانوں میں سے ایک شخصیت کا چناؤ کرتی ہے:

انسانوں میں سے ہر ایک کو وحی کا علم نہیں ملا ہوا ہوتا ان میں سے کسی شخصیت کو اس کے لیے چنا جاتا تھا۔ اسے یہ علم اسی طرح سے دیا جاتا تھا جس طرح سے ان چیزوں کو یہ علم ملتا ہے۔ جسے دیا جاتا تھا ابھی میں وہ آیات پیش کروں گا قرآن کہتا ہے کہ اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی کہا ہے کہ اس وحی ملنے سے ایک منٹ پہلے تجھے اس کا علم نہیں تھا کہ تجھے یہ وحی ملنے والی ہے ورنہ اگر کوئی چیز آپ نے کسب و ہنر سے حاصل کرنی ہو تو آپ کو ہر روز معلوم ہوتا ہے کہ اب میں یہاں تک پہنچ گیا اب میں یہاں تک پہنچ گیا اب میں یہاں تک پہنچ گیا اور اس کے بعد میں نے یہ حاصل کر لیا۔ پہلی جماعت سے ایم اے تک آپ پہنچتے ہیں علم حاصل کرتے ہیں آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میں

نے اتنا علم حاصل کرلیا' اتنا باقی ہے۔قرآن رسول اللہؐ کے متعلق کہتا ہے کہ تجھے اس سے پہلے علم ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں؟ ایمان کیا ہوتا ہے؟ یہ علم یوں ملتا ہے۔کوئی نبی تدریجاً نبی نہیں بنتا کہ آہستہ آہستہ پہلے کہیں وہ ولی بنا ہو' پھر وہ مجدد بنا ہو' پھر وہ محدث بنا ہو' پھر وہ ذرا اور آگے بنا ہو' قطب ہو' ابدال ہو' غوث ہو اور آگے ذرا بڑھے تو پھر نبی بن جائے۔وہ کہتا ہے کہ تمہیں نبی بننے سے پہلے پتہ ہی نہیں تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے اور کتاب کسے کہتے ہیں۔یہ ایک اختصاص ہے۔میں نے ہر فقرے میں یہ کہا ہے کہ ملتا تھا' ہوتا تھا۔اس لیے کہ یہ سلسلہ بھی نہیں اکرمؐ کی ذاتِ اقدسؐ پہ ختم ہو گیا۔اب اس کے بعد یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کیسے ملتا ہے؟ اب 'ملتا ہے' یہ صیغہ ہی باطل ہو گیا ہمارے ہاں۔ملتا تھا' صرف یہ رہا۔

نبی کے علاوہ کوئی انسان بھی وحی کی ماہیت کو جان ہی سکتا:

اب جو چیز خصوصیت سے کسی ایک فرد کو ملے' دوسرے انسان اس میں شریک ہی نہ ہوں' وہ اس کے متعلق کیا کر سکتے ہیں کہ یہ کیسے ملتا تھا؟ اس کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ اس کی ماہیت کیا ہوتی تھی؟ ہم وحی کی کیفیت و ماہیت کے متعلق کچھ جان ہی نہیں سکتے۔ارتقا کے سلسلے میں نیچے کی سطح کے اُوپر جو زندگی ہوتی ہے' وہ اس سے اُوپر کی سطح کی زندگی کے کوائف کے متعلق کچھ اندازہ ہی نہیں لگا سکتی۔

مقام نبوت انسانیت کے سلسلہ ارتقا کی اُونچی سطح ہوتی ہے:

نیچے کی سطح اور اُوپر کی سطح کا تو ہم کہہ نہیں سکتے۔میں کہتا ہوں کہ ایک بچہ ہے' اسے لاکھ سمجھایئے' جوانی کی جو مخصوص کیفیات ہیں' وہ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا' اس کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا' اس کی کیفیت کو جان ہی نہیں سکتا۔نبی انسانیت کے سلسلہ ارتقا میں عام انسانوں سے اُونچی سطح کے اُوپر' اُونچی کڑی ہوتا ہے' ارتقا کی اگلی منزل ہوتا ہے۔اس لیے جو پچھلی منزل والا ہے اس کو اس کی کیفیت و ماہیت کا پتہ ہی نہیں چل سکتا۔البتہ جو کچھ اسے وحی کے ذریعے ملتا ہے' وہ ہوتا ہے عام انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے۔اس لیے یہ ان کی سمجھ میں آ سکتا ہے' یہ اس کو Follow (اتباع) کر سکتے ہیں' اس کا اتباع کر سکتے ہیں' اس کی اطاعت کر سکتے ہیں' اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھال سکتے ہیں۔لہٰذا دو تعلق ہو گئے نبی کا تعلق کہ وہ وحی کو پاتا ہے' ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کیسے پاتا ہے؟ وحی کے Receive کرنے کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔وحی' جو کچھ وہ لاتا ہے' وہ ہمارے لیے ہوتی ہے۔جب وہ لاتا ہے اور وحی کو ہم تک پہنچا دیتا ہے تو ہم سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔اب وحی کے ہونے کی حیثیت سے ہم اور وہ ایک مقام پہ آ جاتے ہیں اور اسی لیے وہ وحی لانے کے بعد کہتا ہے کہ انا اول المسلمین (6:163) میں خود سب سے پہلے اپنی اس وحی کے احکام کے سامنے جھکتا ہوں اور پھر وہ انسانوں کو' دوسروں کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ' تم بھی ایسے ہو جاؤ۔لہٰذا یہ چیز کہ وحی کیا ہوتی تھی؟ کیسے ملتی تھی؟ کیا انداز تھا؟ کیا طریق تھا؟ قرآن نے اس کے متعلق چند

الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، ہم ان پہ صرف ایمان لا سکتے ہیں، ہم یہ جان، پہچان، محسوس تک بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کیسے ہوتا تھا۔ پھر عرض کر دوں کہ وحی کی تعلیم یا وحی کا متن یا اس کا Text جو آگے ہمارے سامنے آتا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے ہوتا ہے۔ صرف میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ نبی کو کیسے ملتا ہے، یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ قرآنِ کریم نے اس کے متعلق بتایا ہے۔ بات یہاں سے چلی ہے کہ **منھم من کلم اللہ** (2:253) خدا نے کلام کیا۔ وحی کے لفظی معنی تو ہوتے ہیں، مادی معنی ہوتے ہیں ''بہت تیز سا اشارہ کرنا'' یہ صرف بنیادی معنی ہیں۔ اصطلاحی معنی اس کے جیسا میں نے عرض کیا ہے، خدا کی طرف سے کسی کا براہِ راست وہ علم حاصل کرنا جو وہ خود کسب و ہنر سے حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس سے آگے استعمال کی رو سے سمجھ لیجیے کہ وحی کے معنی کسی تک کسی حکم کا پہنچا دینا بھی ہوتا ہے۔ ایک تو وہ ہے کہ نبی براہِ راست خدا سے یہ وحی حاصل کرتا ہے اور جب یہ نبی ان احکام کو انسانوں تک آگے پہنچاتا ہے تو اس کو بھی قرآن نے **اوحینا** کہا ہے کہ اس قوم کی طرف ہم نے ان احکام کو پہنچایا۔ یہ معنی نہیں کہ اس قوم کے ہر فرد کی طرف ہم نے اسی طرح سے وحی کی جیسے رسول پہ وحی کی جاتی تھی۔

نبی کے علاوہ خدا کی ذات کی انسان کی طرف وحی نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے ہم کلام ہوتی ہے:

یہ بات بڑی اہم ہے۔ عزیزانِ من! وہ جو ہمارے ہاں باطل عقائد جاری ہوئے اور ان میں یہ بھی ہوا کہ صاحب! نبی کے علاوہ اوروں کو بھی وحی مل سکتی ہے۔ اچھا جی!! دلیل کیا ہے؟ اب قرآن کی کھینچا تانی ہوئی کہ دیکھیے صاحب! قرآن نے کہا کہ ہم نے اُمِ موسیٰ کی طرف وحی کی: **اوحینا الی ام موسٰی** (28:7) موسیٰ کی ماں کی طرف یہ وحی کی کہ تم اپنے بچے کو صندق میں بند کر کے اور اس طرح سے دریا میں بہا دو۔ حواریوں کی طرف ایک جگہ ہے کہ وحی کی (5:111) یہ اتنا ہی نہیں سمجھتے، عربی قاعدے کی رو سے ہی یہاں جو وحی کرنا ہے، اس کے دوسرے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ ہیں احکام پہنچا دینا۔ بات صاف ہوگئی۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف اپنا یہ حکم پہنچایا، وہ خدا کا نبی اس حکم کو لے کر اس کی طرف آیا اور اس کو پہنچا دیا۔ حواریوں کی طرف وحی (5:111) کے معنی یہ ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ نے ہمارے یہ احکام ان تک پہنچا دیے۔ **اوحینا الی بنی اسرائیل** حضرتِ موسیٰ کو وحی دی اور وہ وحی کے احکام انہوں نے بنی اسرائیل کو پہنچا دیے۔ بات یہاں ہو رہی ہے خدا کی طرف سے براہِ راست اس وحی کا کسی فرد کو ملنا جسے یہ ملتا ہے اسے نبی کہا جاتا ہے۔ کوئی جو غیر از نبی ہے، وہ اسے نہیں پا سکتا تھا اور پھر اب تو پا سکنے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ وحی پہنچانے کے جو طریقے ہیں میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے اس کے متعلق اشارتاً بات کہی ہے جس کی حقیقت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کہا ہے کہ **قل من کان عدوًا لجبریل فانہ نزلہ علٰی قلبک باذن اللہ** (2:297) ان سے کہو کہ جبریل کا دشمن کون ہو سکتا ہے (یہ آیت پہلے آچکی ہے)۔

جبریل اور روح القدس کا مفہوم:

میں صرف اس وقت اتنا ہی کہتا ہوں۔ جبریل کہ جس نے خدا کے قانون کے مطابق اسے اے نبی! تیرے قلب پر نازل کیا۔ جبریل کیا ہے؟ خدا کی طرف سے وہ کیسے حکم لاتا ہے؟ قلب نبوی پر کیسے اس کا نزول ہوتا ہے؟ یہ ہم نہیں جان سکتے۔قرآن نے تو صرف جبریل کہا ہے یعنی خدا کی ایک قوت' جبر کے معنی توانائی' قول اور یل کے معنی خدا۔ جبریل ایک الوہیاتی توانائی ہے ہم نہیں جان سکتے کہ یہ کیا ہے۔ وہ اس کو قلب نبوی پہ نازل کرتا ہے۔ یہاں جبریل ہے۔**قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق** (16:102) ان سے کہہ دو کہ یہ روح القدس نے خدا کی طرف سے مبنی برحقیقت ایک علم نازل کیا ہے۔ یہاں (16:102) میں روح القدس کہا ہے' وہاں (2:97) میں جبریل کہا ہے۔اور (26:193) میں اسی کو روح الامین [1] کہا ہے۔عربی زبان میں روح کے معنی بھی توانائی ہوتا ہے۔ روح القدس کے معنی بہت دور تک پہنچنے والی توانائی اور منزہ وہ جس میں کچھ آمیزش بھی نہ ہو سکے۔

---

[1] نزل بہ الروح الامین (26:193)

روحی کے لفظ کے ساتھ نزول کے لفظ کی ایک خاص خصوصیت:

بہرحال یہ اصطلاحات ہیں جو قرآن نے استعمال کی ہیں۔ پھر جہاں بھی وحی کا ذکر ہے' اس کے لیے لفظ نزول آیا ہے نازل ہونا آیا ہے۔ ویسے تو اس کے عام معنی کسی شے کے اُوپر سے نیچے آنے کے ہوتے ہیں لیکن اس میں ایک بڑی اہم حقیقت ہے۔ انسان کا سارا علم' اس کے حقائق' اس کے احساسات' اس کے جذبات' اندر سے باہر کو آتے ہیں' وہ اس کے اندر ہوتے ہیں۔ یہ جو اندر ہونا ہے' اسے Subjective کہتے ہیں یعنی کسی کے اندر ہونا۔ انسان کی ساری کیفیتیں' اس کا علم' اس کے احساسات Subjective ہوتے ہیں' اس کے اندر ہوتے ہیں' داخلی ہوتے ہیں لیکن ایک چیز ہے جسے کہا گیا ہے کہ وہ باہر سے آتی ہے' یہ جو علم ہے' اسے Objective کہتے ہیں' اسے خارجیت کہتے ہیں۔ وحی کی خصوصیت Objectivity ہے' یعنی باہر سے کسی چیز کا اس کے اندر آنا۔ علم انسانی Subjective (داخلی) ہوتا ہے یعنی اس کے اندر سے باہر آتا ہے۔ اس لیے قرآن نے لفظ ''نازل ہونا'' استعمال کیا ہے۔ یہ علم خدا کی طرف سے اس انسان کو باہر آ کر ملتا ہے' اس کو Objectively ملتا ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ **لا ینطق عن الھوٰی** (53:3) یہ اپنے خیالات و جذبات سے کوئی بات نہیں کہتا ہے۔**اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحیٌ یُّوحٰی** (53:4) یہ تو وحی ہے جو خدا کی طرف سے اس کو ملتی ہے' گویا اپنے خیالات' اپنے جذبات کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا' اس میں داخلیت (Subjectivity) نہیں ہوتی' یہ Objectively (خارج سے) ملتا ہے اور پھر یہ انسانوں تک پہنچاتا ہے۔

وحی کے تین طریق پہلا طریق وحی قلب نبوی پر نازل ہوئی:

وحی کے لیے قرآن نے تین طریقے بتائے ہیں اور وہی چیز ہے جو یہاں میرے سامنے تھی جس کے لیے میں نے یہ بات چھیڑی ہے۔ (42:51) اور یہیں اس ایک آیت کے متعلق Confusion (اُلجھن) کھڑی کرنے سے وہ ساری عمارت پہلے تصوف کی' پھر اس کے بعد نبوت کی' اور نبوت کے جاری رہنے کی کھڑی کی جاتی ہے۔ بات بڑی صاف ہے کہا ہے کہ **ما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیاً او من ورآی حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنه ما یشآء انه علیٌّ حکیم** (242:51) کہا ہے کہ کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ خدا اس سے کلام کرے بجز ان طریقوں کے۔ یہی تین طریقے ہیں ان کے علاوہ کوئی اور طریقہ اور ذریعہ نہیں ہے۔ یہاں لبشر میں صرف نبی نہیں کہا انسانوں سے خدا کے کلام کرنے کا طریق بتایا ہے۔ خدا انسان سے ان تین طریقوں سے کلام کرتا ہے ایک تو کہا کہ **وحیًا** (42:51) ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے میں نے اشارۂ خفی کہا ہے' جبریل کی وساطت سے جسے روح الامین کہا جسے روح القدس کہا' وہ قلب نبوی کے اوپر القا کرتا ہے۔ یہ ایک طریق ہو گیا (42:51) ہے۔

دوسرا طریق موسیٰ سے ہم کلامی کے سلسلہ میں آواز آنے کا

دوسرا طریقہ **او من ورآی حجاب** (42:51) کہا ہے یا پس پردہ' آنکھوں سے نظر تو نہ آئے' وہ بولنے والا خدا ہو صرف اس کی بات سنائی دے۔ یہ ایک چیز ہے جو قرآنِ کریم نے کہی ہے کہ موسیٰ سے ہم نے ایسا کیا تھا اور اس کے لیے قرآن میں لفظ ''کلام'' ہے۔ **و کلم الله موسیٰ تکلیمًا** (4:164) حضرتِ موسیٰ کے متعلق یہ بات آئی ہے اور پھر اس کی تفصیل بھی ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ طور کا واقع ہے جہاں وہ آگ لینے کو گئے تھے' وہاں اندر آئی' آواز آئی' موسیٰ نے سنی' خدا نے کچھ باتیں کیں۔ حضرتِ موسیٰ کا قصہ قرآن کریم کے اندر موجود ہے' تفصیل اس کی موجود ہے۔ اس کی تفصیل کہ یہ کیا باتیں ہوئی تھیں' مختلف مقامات پہ موجود ہے۔ ان میں سے ایک حوالہ لکھ لیجیے (7:143) یہ وہی طور کا واقع ہے۔ خصوصیت سے یہ **ورآی حجاب** کی بات ہے قرآن نے خود وہاں اس کی تشریح کر دی' جہاں حضرتِ موسیٰ نے یہ کہا تھا کہ بات تو آپ کر رہے ہیں' ذرا بے نقاب سامنے آئیے کیسا پردہ ہے کہ چلمن ❶ میں چھپے بیٹھے ہیں اور کہا گیا تھا کہ موسیٰ! تم دیکھ نہیں سکتے۔ تو خود خدا نے اس کی تشریح کی کہ **من ورآی حجاب** (42:51) کے معنی کیا ہیں۔ میں پھر یہ عرض کر دوں کہ یہ آواز کیسے آئی تھی' کیسے باتیں ہوئی تھیں؟ غیر از نبی اس کو جان ہی نہیں سکتا لیکن قرآن نے خود یہ کہا ہے کہ ایک طریق یہ بھی تھا اور وہ مختص تھا حضرتِ موسیٰ کے لیے جو کہا ہے کہ پس پردہ بات ہوئی تھی۔ یہ جو پس پردہ بات ہوئی تھی قرآنِ کریم نے اس کو بھی وحی کہا ہے' یاد رکھیے یعنی یہ کوئی الگ شے نہیں ہے' اس کو بھی وحی کہا ہے' اگرچہ اس کو کلام کہا ہے **و انا اخترتک فاستمع لما یوحٰی** (20:13) پس پردہ

باتیں ہورہی ہیں لیکن کہا یہی گیا ہے کہ جو وحی تیری طرف کی جارہی ہے' اس کو سنو۔ کہنے کا میرا مطلب یہ تھا کہ قرآن نے اس چیز کو بھی وحی کہا ہے۔ یہ کوئی الگ اور شے نہیں' صرف ایک طریق بتایا ہے کہ ایک تو وہ تھا کہ اس کیق لب کے اوپر اس کا نزول ہوتا تھا۔ ایک دوسرا طریق یہ **من ورآی حجاب** (42:51) ہے۔ عزیزانِ من! یہ دو طریقے انبیا کے ساتھ مخصوص تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ** (42:51) بشر کے ساتھ خدا کا کلام کرنا' وہ صرف ان طریقوں میں سے ایک طریق سے ہوسکتا ہے یا تو وہ وحی ہے جو کسی نبی کی طرف بھیجی گئی۔ نبی کے قلب پہ القا ہوئی یا ایک چیز وہ ہے جسے حضرت موسیٰ کے ساتھ **من ورآی حجاب** کلام کہا گیا ہے۔

---

❶ خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں

وحی کا ملنے کا تیسرا طریق قرآن حکیم نے جسے کلام اللہ کہا گیا ہے:

اب ہم آپ رہ گئے' تو ہم آپ بھی ہیں۔ پھر ہمارے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا کیا طریقہ ہوا۔ کہا کہ غیر از نبی کے لیے طریقہ یہ ہے کہ **یرسل رسولاً فیوحی باذنہ ما یشآء** (42:51) ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے اور ان کے ساتھ خدا' ان رسولوں کی وساطت سے بات کرتا ہے۔ یہ کتنی صاف چیز ہے۔ اس میں پہلے تو یہ سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم میں ہر جگہ یہ لکھا ہے کہ خدا کلام کرتا ہے' کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ کوئی انسان خدا سے بھی کلام کرسکتا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ خدا انسانوں سے کلام کرتا ہے۔ عزیزانِ من! نبی اکرمؐ کے ساتھ خدا نے کلام کیا' جسے وحی کہا۔ خدا کا یہ کلام رسول اللہؐ نے ہم تک پہنچا دیا' یہ ہے کلام خدا' خدا نے قرآن کو کلام اللہ کہا ہے اور اب جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے کلام کررہا ہوتا ہے۔ یہی کلام تھا جو خدا نے رسول اللہؐ سے کیا تھا۔ فرق اتنا ہے کہ ان سے یہ کلام براہِ راست کیا تھا' ہم سے یہ کلام رسول کی وساطت سے کیا جارہا ہے یا یوں کہیے کہ ان کے معاملے میں رسول' جبریل تھے' ہمارے معاملے میں رسول محمدؐ ہیں۔ یہ تو ذریعے کا ہی فرق ہے۔ حضورؐ کو جو وحی ملی تھی' وہ اس کے سوا اور کیا تھی اور یہ ساری وحی ہمارے پاس ہے۔ عزیزانِ من! جب بھی کوئی مومن اس قرآن کو پڑھتا ہے تو خدا اس سے ہم کلام ہورہا ہوتا ہے۔ خدا کی جو کلامیت ہے' وہ قیامت تک کے لیے جاری ہے۔ اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب! ختم نبوتؐ کے عقیدے کے بعد کیا خدا پھر گونگا ہوگیا' بولتا ہی نہیں ہے؟ وہ ہر شخص سے بولتا ہے۔ پہلے تو صرف ایک رسول سے بولتا تھا' اب تو وہ ہر انسان سے بولتا ہے۔ جو بھی قرآن اُٹھا کر پڑھتا ہے' خدا اس سے کلام کررہا ہوتا ہے۔ قیامت تک کے لیے کلام کررہا ہے صاحب! اس کلام کو محفوظ رکھنے کے معنی یہ تھے' اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ خدا نے انسانوں کے ساتھ قیامت تک کلام کرتا تھا۔

قران حکیم کی بنیادی خصوصیات:

یہ ہے وہ کلام اللہ، خدا کا کلام جو وہ انسانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ بولتا ہے، قیامت تک کے لیے بولے گا، کتاب محفوظ ہے۔ اس طرح سے نبی اکرمؐ پر جو نبوت ختم ہوئی ہے، اس کے بعد وحی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اس لیے کہ اس وحی کے متعلق یہ کہہ دیا کہ **تمت کلمت ربک صدقًا وعدلاً** (6:115) جو کچھ خدا نے کہنا تھا وہ صدق وعدل سے مکمل ہو گیا۔ مکمل تو ہو گیا لیکن ہو سکتا تھا کہ صاحب! تیرہ سو سال پہلے کی ضرورتوں کے مطابق مکمل کر دیا ہو، بعد میں آنے والی ضروریات کے لیے اس میں کوئی تبدیلی کی ضرورت ہو تو کہا **لا مبدل لکلمت اللہ** (6:115) اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا جی! مکمل بھی ہو گیا، غیر متبدل بھی ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ زمانے کے حوادث سے اس میں کچھ تحریف ہو جاتی جیسا کہ پہلی کتابوں کے ساتھ ہوا۔ خود یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے نازل کیا **وان لہ لحفظون** (15:9) ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ یہ قرآن مجموعہ کلامِ خداوندی، مکمل، غیر متبدل اور قیامت تک محفوظ ہے۔ نبوت کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے؟ اور پھر کاہے کے لیے ہے؟ کہتے ہیں کہ جی! قرآن کو سمجھانے کے لیے ایک نبی کی ضرورت ہے۔ وہ ایک بازاری مثال چلی آتی تھی، وہ بڑے اُونچے پیمانے پہ جا کر سچ ہو رہی ہے لکھے موسیٰ پڑھے خدا۔ یعنی اس قسم کا جو کہا کرتے تھے، خط لکھنے والا جو تھا، خط کے ساتھ خود جایا کرتا تھا کہ جا کر پڑھ کر بھی سنا دے کہ کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ خدا نے ایسی کتاب تمام انسانوں کی طرف بھیجی جو مبین کتاب ہے واضح کتاب اور تمام انسانوں کے لیے ہے اور کتاب کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک اس کی طرف سے ایک نبی نہ آئے، بات ہی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نے نبی کی وساطت سے کتاب پہلے بھیجی پھر اس کتاب کو سمجھانے کے لیے نبی بھیجنے شروع کیے۔ عزیزانِ من! ایک خشت اوّل ذرا سی ٹیڑھی رکھ دی جائے تو ''تا ثریا می رود دیوار کج'' ہوتا ہے اس کا سوال نہیں ہے۔ یہ واضح عربی مبین کے اندر کتاب ہے، مکمل ہے، غیر متبدل ہے، تمام نوعِ انسانی کے لیے محفوظ ہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے کچھ براہ راست علم پانے کا جو سلسلہ تھا وہ ختم ہوا۔ خدا کی طرف سے پایا ہوا یہ علم ہمارے پاس، محفوظ، مکمل، غیر متبدل شکل میں موجود ہے۔ جب بھی کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے، خدا اس سے کلام کر رہا ہوتا ہے لیکن عزیزانِ من! انسانی ذہن کا کیا علاج ہے؟

قرآنی تعلیم کے برعکس وحی کی دو قسموں کے عقیدے کی وضاحت:

اس قدر واضح تعلیم کے بعد بھی عجیب عجیب قسم کی چیزیں سامنے آنی شروع ہوئیں۔ پہلی بات یہ آنی شروع ہوئی کہ صاحب! وحی کی بھی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ یہ یہودیوں کے ہاں کا عقیدہ تھا۔ انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا تھا کہ ایک تو وہ وحی ہوتی ہے جو کتاب میں لکھی جاتی ہے اور پڑھی جاتی ہے۔ دوسری وہ وحی ہوتی ہے جو لکھی نہیں جاتی، زبانی آتی ہے۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ حضرتِ موسیٰ پہ جو وحی ہوئی تھی وہ تو تورات میں آ گئی۔ آلِ ہارونؑ کے اوپر جو وحی ہوتی تھی، وہ زبانی روایات کی شکل میں ہوتی تھی اور اس لیے انہوں نے وحی کی

دو قسمیں بنا رکھی تھی۔ وحی کی اس قسم کی کوئی دو قسمیں نہیں ہیں۔ ایک ہی چیز ہے کہ وحی بالفاظہ خدا کی طرف سے وحی ہے' الفاظ بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ دوسری یہ چیز کہ وحی خدا کی طرف سے لیکن اس کے الفاظ خدا کے نہیں الفاظ نبی کے۔ ہیں' یہ غلط ہے اس عقیدے کے وضع کرنے والوں کو اتنا بنیادی علم بھی نہیں تھا کہ کسی کے ذہن کے اندر کوئی خیال بغیر الفاظ کے آ ہی نہیں سکتا لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے۔ جس طرح سے کہ جو Imagination ہے' جو تصور ہے وہ محسوسات کے علاوہ آ نہیں سکتا خواہ کوئی شے محسوس بھی کیوں نہ ہو' اس کا تصور بھی محسوس شکل میں آئے گا۔ آپ دیکھیے کہ آپ جب خدا بھی ذہن میں کہتے ہیں' یا اگر ذہن میں یہ تصور کرنا چاہیں گے تو کوئی نہ کوئی محسوس تصور ہوگا۔ اسی طرح سے انسان کے ذہن میں کوئی خیال بغیر الفاظ یا لفظ کے آ ہی نہیں سکتا۔ وحی خیالات کا القا نہیں ہوتی' وحی کے الفاظ بھی خدا کے الفاظ ہوتے ہیں کیونکہ خیال تو بغیر الفاظ کے آ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا وحی کی یہ دو قسمیں کرنا کہ ایک تو خیال اور لفظ دونوں خدا کی طرف سے ہوں اور دوسرا یہ کہ خیال خدا کی طرف سے مگر لفظ نبی کا ہو تو فلاسفی کا یہ بنیادی اصول بھی ان کو پتہ نہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا' یہی عقیدہ پہلے ہمارے ہاں آیا تو وحی کی دو قسمیں ہوئیں کہ ایک وحی متلو قرآن کے اندر جس کی تلاوت ہوتی ہے دوسری وحی غیر متلو جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ یہاں تک تو روایات کا قصہ تھا۔

نبوت کی مہر کو توڑنے کے لیے تصوف کا عقیدۂ کشف والہام کی وضاحت:

اب ذرا سی کھڑکی کھلے تو اس کے بعد دیکھیے پھاٹک کیسے کھلتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ بابِ نبوت کو توڑنے کے لیے کیا چیز ہوئی؟ ایک عقیدہ اور آگے آیا اور وہ ایسا ہے کہ جب میں یہ عرض کروں گا تو شاید پہلی دفعہ آپ یہ سنیں کہ وہ چیز بھی ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کے لیے وجود میں لائی گئی۔ یہ چیز ایک عجمی سازش تھی جس کے لیے آئی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ چیز تصوف کا یہ عقیدہ تھا کہ علم کا ایک ذریعہ کشف اور الہام بھی ہے۔ یہ کشف والہام کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ علم کسب و ہنر سے نہ حاصل کیا جائے بلکہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملے۔ عزیزانِ من! وحی کی تو یہی تو Definition (تعریف) تھی' اسی کو وحی کہا گیا تھا کہ انسان کے اپنے کسب و ہنر کے بغیر خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملے۔ نبوت کو تو انہوں نے ختم کیا' اس پہ رسمی عقیدہ رکھا اور اس کے بعد عقیدہ یہ وضع کیا کہ اولیائے کرام پر خدا کی طرف سے کشف اور الہام کے ذریعے اسی طرح سے علم نازل ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! صرف وحی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا' محض اشتعال سے بچنے کے لیے ورنہ بعینہٖ یہ وہی چیز ہے جو وحی کی ہوتی ہے۔ وحی کے دروازے کو بند کیا اور قیامت تک کے لیے پھاٹک کھول دیا اور آپ ان حضرات کے اقوال پڑھیں کہ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ انہیں کشف اور الہام سے خدا کی طرف سے علم ملتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مہر نبوت کس طرح ٹوٹی۔ محی الدین عربی شیخ اکبر جنہیں سب سے پہلے تصوف کے اس فلسفہ کا بانی کہا جاتا ہے۔ آپ کبھی ان کی فصوص الحکم اُٹھا کر دیکھیے' وہ

کہتے ہیں کہ ولی خدا کے ہاں سے علم پانے میں بعینہٖ اس مقام پہ ہوتا ہے جہاں نبی ہوتا ہے۔

ایک غور طلب مسئلہ جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہا ہے:

بات صاف ہے صاحب! ختم نبوتؐ کے عقیدے کے اُوپر تو ہم اس قدر سیخ پا ہوتے ہیں' اتنی لڑائیاں لڑتے ہیں' اتنے جھگڑے کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اجرائے نبوت کا عقیدہ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس تک پہنچنے کے لیے وہ جو اتنی بڑی بڑی سیڑھیاں رکھی ہوئی ہیں' وہ ساری کی ساری ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ کشف اور الہام ہر شخص مانتا ہے۔ اس سے کبھی کسی کے ذہن میں نہ شک پیدا ہوتا ہے' نہ کوئی اشتعال پیدا ہوتا ہے' نہ کوئی لڑائی جھگڑا پیدا ہوتا ہے' نہ کوئی مناظرہ ہوتا ہے بلکہ جو اتنے دعویٰ کرنے والے ہیں' ان کے سامنے سرِ تسلیم خم ہوتے ہیں۔ زندہ تو ایک طرف ان کی ہڈیوں کے سامنے بھی سجدے کیے جاتے ہیں۔ یہ کشف اور الہام کیا ہے؟ قرآن میں تو وحی کے علاوہ بڑے سے بڑے مومن کے لیے کشف اور الہام کی کہیں بھی یہ بات نہیں ہے۔ علم کا ذریعہ وحی تھا جو نبی کو براہِ راست ملتا تھا' نبی کا دیا ہوا جو علم ہے وہ کتاب کے اندر ہے اور اس کے علاوہ انسانی عقل' بصیرت' فراست' تفکر' تدبر' مشاہدہ' مطالعہ وہی جو عام طریقے ہیں۔ ان سے علم حاصل ہوتا ہے۔ خود خدا نے مومنین کو قرآن کے متعلق تدبر فی القران اور تفکر فی القران کہا ہے۔ کہیں یہ نہیں کہا کہ تمہیں قرآن کے حقائق براہِ راست کشف کے ذریعے معلوم ہوا کریں گے۔

عیسائیوں کے ہاں کے پیدا کردہ خانقاہی تصور کی آبیاری کا نتیجہ

قرآن میں تو کشف کا لفظ ہی نہیں ہے نہ الہام لفظ اس معنی میں ہے۔ ایک جگہ **الھمھا** آیا ہے' اس کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ اصطلاحیں غیر اسلامی ہیں' ساری دوسروں کے ہاں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ یہ ساری چیز یونان کے فلسفے میں تھی' پلیٹو نے اس کی Origin دی۔ نیو پلیٹو ازم ہمارے ہاں ایک فلسفہ ہے اس میں یہ پروان چڑھی۔ یہ فیلو یہودی تھا جس نے اس چیز کو آگے بڑھایا۔ عیسائیوں میں کہ ان کی یہ خانقاہیں ہوئیں اور دوسری صدی ہی کے آخر میں آ کر جب آپ کا یہ اسلام گاڑی کی دوسری پٹڑی پہ پڑا تو جہاں اور چیزیں غیر اسلامی آئیں ان میں یہ عقیدہ بھی آپ کے ہاں در آیا اور اس کے بعد جگہ جگہ یہ خانقاہیت کے مراکز آپ کے ہاں قائم ہو گئے۔ اب ان مراکز کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آپ اُمت کے لیے بہ نسبت اس قرآنِ کریم کے زیادہ جاذبِ توجہ ہیں ❶۔ کشف اور الہام کی دنیا کی ایک نئی بسی ہوئی ہے صاحب! عزیزانِ من! پھر عرض کر دوں کہ ان طریقوں سے جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمیں یہ خدا کی طرف سے علم ملا ہے' آپ کشف نام رکھیے' الہام نام رکھیے' بروزی نبی کہہ لیجئے' ظلی کہہ لیجئے' ان سب کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں تدریجاً ہم وہاں تک پہنچتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! خدا کی طرف سے جو علم براہِ راست حاصل ہوتا ہے وہی (42:51) اُمت آپ نے دیکھی تھی اب اگلی

آیت (42:52) دیکھیے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہا یہ تھا کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے ہم کلام ہونے کے تین طریقے تھے۔ براہِ راست جبریل کی وساطت سے قلب نبوی کے اُوپر کسی علم کا القا ہونا' من ورآئے حجاب خدا کا کسی سے بات کرنا جیسے کہ **وکلم اللہ موسٰی تکلیمًا** ایک چیز ہے۔ اسے بھی وحی کہا ہے' الہام و کشف نہیں کہا اور تیسری چیز یہ عام انسانوں سے بات کرنا وہ اس طرح کہ وہ رسول جو اس وحی کو دوسرے انسانوں کی طرف پہنچاتا ہے دوسرے انسان اسے پڑھتے ہیں تو خدا دوسرے انسانوں سے یوں باتیں کرتا ہے۔ نبی کے متعلق کہا کہ **وکذالک اوحینا الیک روحًا من امرنا** (42:52) اس طرح سے ہم نے اپنے امر کی روح بخشی۔

---

❶ آج پاکستان کا قریہ قریہ اس چیز کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کسی فارمولے سے آگنا ہی کا حصول ہمیشہ انسانی قوت میں اضافے کا باعث بنتا ہے:

یہ عجیب الفاظ ہیں' جب یہ آئیں گے تو اپنے مقام پہ میں عرض کروں گا کہ کسی حقیقت کا معلوم ہو جانا' کسی فارمولے کا علم حاصل ہو جانا' یہ کتنی بڑی توانائی اور قوت ہوتی ہے۔ قرآن نے اس وحی کو روح کیوں کہا ہے؟ بڑی عظیم چیز ہے۔ یہ اٹامک انرجی (ایٹمی توانائی) کے متعلق جن قوموں کے پاس اس کا سیکرٹ ہے (راز) ہے آپ دیکھتے ہیں باقی قومیں ان سے کیسے کانپ رہی ہیں۔ یہ ہے وہ توانائی اور یہ تو طبعی دنیا کے متعلق ہے۔ دنیائے انسانیت کے متعلق جو اسی قسم کے قوانین اور فارمولے ہیں' ان کا راز وحی کے ذریعے سے نبی کو دیا جاتا تھا' جسے پھر وہ عام کرتا تھا۔ جن کے پاس یہ راز Secrets ہوں' کتنی توانائیوں کی مالک وہ قوم ہو جائے گی۔ پوچھیے عرب کی مٹھی بھر جماعت سے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے محلات کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ یہ ہوتا ہے الروح۔ **ما کنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان** (42:52) اس سے پہلے تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کیا ہوتا ہے۔ اندازہ لگایئے اس میں کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو فوراً ایک انکشاف سامنے ہوتا ہے اور حضرتِ موسیٰ کے معاملے میں تو بات اتنی تفصیل سے بتا دی ہے وہ کہہ کر جاتے ہیں کہ وہاں مجھے کچھ آگ دکھائی دیتی ہے' جاتا ہوں' وہاں سے کچھ یا تو تمہارے لیے تھوڑی بہت آگ لاؤں گا' تم تاپ لینا یا وہاں سے راستہ پوچھوں گا کیونکہ آگ کے معنی ہیں کہ کہیں انسان ہے۔ یاد رکھیے! جہاں آگ ہوگی' وہاں انسان ضرور ہوگا۔ یہ غنیمت ہے کہ حیوانات میں سے کوئی ابھی تک آگ جلانا نہیں جانتا۔ وہ تو یہ کرنے گئے تھے' وہاں جاتے ہی آواز آتی ہے۔ کسب و ہنر سے ہوتا تو بڑے مراقبے کیے ہوئے ہوتے' بڑی منازل طے کی ہوتیں' یہ معلوم ہوتا کہ اب میں یہ بن گیا' اب میں یہ بن گیا' اب میں لگا پہنچنے' وہ آیا' وہ پہنچا آ دیکھیے صاحب! اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن تو رسول اللہؐ کے متعلق کہتا ہے کہ **ما کنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان ولکن جعلنٰہ نورًا نھدی بہ من نشآء من عبادنا** (42:52) ہم نے اس کو ایک روشنی بنا کے تمہارے پاس بھیج دیا۔

اپنے بندوں میں سے جس کی طرف ہم چاہتے ہیں، یہ روشنی دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! آگے ہے کہ ہم یہ روشنی **نھدی بہ من نشآء من عبادنا و انک لتھدی الیٰ صراط مستقیم** (42:52) اور تو اس روشنی کے ذریعے سے صراطِ مستقیم کی طرف ان لوگوں کی ہدایت کرتا ہے کیا بات ہے قرآن کی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے ان انسانی ذرائع کے بغیر براہِ راست ملتا ہے قرآن نے اسے وحی کہا ہے۔

نبوت کے بعد ذاتِ خداوندی سے براہِ راست عمل حاصل کرنے کا دعویٰ فریب کے سوا کچھ اور نہیں:

یہ طریق انبیائے کرام کے ساتھ مختص تھا۔ وہ ذاتِ رسالت مآب پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ تصور کہ خدا کی طرف سے براہِ راست ان ذرائع انسانی کے علاوہ بھی علم مل سکتا ہے صرف نام کی تبدیلی ہے ورنہ یہ دعوائے نبوت ہے۔ نام کی تبدیلی سے ایک فریب دیا گیا ہے۔ ختم نبوت کی بڑی عظیم حقیقت تھی۔ ختم نبوتؐ کے معنی یہ تھے کہ خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے جو ہدایت براہِ راست ملنی تھی یہ دے دی گئی ہے ہر شخص کو پتہ ہے کہ یہ ہے۔ اب اس کے بعد کوئی انسان یہ معلوم کرنے کے لیے کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں رہا کہ خدا مجھے کیا کہتا ہے۔ اس قوم کو دنیا کی سب سے بڑی آزاد قوم ہونا چاہیے تھا۔

وحی کی عطا کردہ راہنمائی کے باعث نوعِ انسانی ہر قسم کی بوجھل سلوں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے:

سوچیے تو سہی کہ کوئی قوم اس کی محتاج ہی نہ ہو کہ کسی انسان سے جا کر پوچھے کہ صاحب! بتائیے میرے لیے سیدھا راستہ کون سا ہے۔ جو خدا نے بتایا ہے۔ یہ دنیا میں کتنی بڑی آزاد قوم ہوگی۔ کس طرح سے ختم نبوتؐ نے ان زنجیروں کو توڑ دیا، جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ قرآن کے الفاظ میں کہ کس طرح ان بوجھل سلوں کو ان کے سر سے اُتار کر پھینک دیا جن کے نیچے یہ کچلی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہر بات کے لیے انسانوں کی طرف جانا کہ مجھے بتائیے میرا خدا کیا کہتا ہے۔ تیرا خدا تجھ سے کیوں کچھ نہیں کہتا۔ میرا خدا میرے متعلق کیا کہتا ہے، تم بتاؤ؟ کیوں کہ جی یہ خدا کے مقرب ہیں۔ پھر وہ بھی یہ چیزیں کہتے ہیں کہ ''اچھا جی اج رات نوں جا کے پوچھ کے آواں گے تے فیر تہانوں دساں گے [1]'' شاعری میں آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی محبوب سے ملتا ہے یہ چور رات کو ملتا ہے۔ یہ شاعری ہے شیخ علی حزیں نے ٹھیک کہا تھا کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خواب است'' یہ شاعری ہے۔ ملیں گے جی وہاں جا کر پھر بتائیں گے جی! وہاں سے آ کر پھر یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ خدا تمہیں کیا کہتا ہے۔ ان کی وساطت سے اب خدا نے کہنا شروع کیا۔ یعنی جو بات اس سے پیشتر انبیائے کرام کے ذریعے ہوتی تھی کہ خدا ان کی وساطت سے انسانوں تک اپنی بات پہنچاتا تھا، بعینہ وہیں ہم اس مقام پہ ہیں۔ وہ تو پھر بھی ایک ہستی ہوتی تھی۔ یہاں قدم قدم کے اُوپر، پھر وہ زندہ کے ذریعے ہی نہیں پہنچاتا ہے، مرنے کے بعد تو یہ وہیکل اور تیز ہو جاتا

ہے۔

---

❶ آج رات جا کر معلوم کر کے آئیں گے تو پھر آپ کو بتائیں گے۔

شخصیت پرست قوم آزادی کی نعمت سے کبھی ہم کنار نہیں ہو سکتی:

عزیزانِ من! اس قوم کو جیسا میں نے عرض کیا ہے' جس کو دنیا میں شخصیت پرستیوں کی ہر قسم کی زنجیروں سے آزاد کر دیا تھا' کس طرح اس قوم نے ان توڑی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑوں کو اپنے مژگانِ عقیدت سے' پھر سے اکٹھا کیا' پھر سے جوڑا اور کس طرح اپنے آپ کو پابند سلاسل کر لیا ہوا ہے اور جو قوم دنیا میں شخصیتوں کی غلامی کے اندر جکڑی ہوئی ہوتی ہے' اسے دنیا میں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ ہم اب بھی جب مایوس ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی انسان کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ بات کبھی ذہن میں نہیں آتی کہ ہم خود اُٹھ کر یہ کچھ کیوں نہیں کر سکتے۔ ختم نبوت کی اہمیت کو سمجھا ہوا ہوتا تو کبھی کسی انسان کی طرف رُخ کر کے ہم انتظار میں نہ بیٹھتے۔ کسی انسان کا انتظار کرنا یہودیوں نے اس وقت سکھایا تھا جب انتہائی مایوسی ان پر طاری ہو چکی تھی۔ اپنی فلاح و بہبود کی کوئی شکل ان کو نظر نہیں آتی تھی۔ انہوں نے ایک آنے والے مسیح کا عقیدہ وضع کیا۔ ایران میں اس زمانے میں زرتشتیوں نے مترا کا عقیدہ وضع کیا کہ جب ان کو وہاں سے مار مار کر نکالا جاتا تھا اور کوئی انسان تھا جو ان کو اس سے منع کر سکے قومیں جب اپنے قوتِ بازو سے محروم ہو جاتی ہیں تو پھر اس کے بعد اس قسم کے تصورات کے کچے تاگوں کے ساتھ اپنی اُمیدیں باندھ کر اپنے آپ کو فریب دے کر دنیا میں زندہ رہنا سیکھتی ہیں۔

عیسائیت کے زوال کی بنیادی وجہ اور مختلف قوموں میں ایک آنے والے کے تصور کی نوعیت اور اس کا انجام:

عیسائیوں پر جب یہ اس قسم کا دور آیا تو انہوں نے ایک آنے والے مسیح کا انتظار اپنے ذہن میں رکھا۔ بدھوں کو جب یہاں سے نکالا گیا ہے تو انہوں نے ایک متیا کا انتظار کیا۔ ہندوؤں کے اُوپر جب آ کر باہر کی قوموں نے یہی کچھ کیا تو انہوں نے آخری دور میں ایک کلنکی اوتار کا عقیدہ اپنے ذہن کے اندر رکھا۔ ہر قوم نے اپنی مایوسی کے زمانے میں' انحطاط کے زمانے میں' بجائے اس کے کہ یہ ہو کہ ہمیں اٹھ کر یہ کچھ کرنا چاہیے' انہوں نے کہا کہ نہیں! ایک آنے والا آئے گا اور وہ آ کر یہ کچھ کرے گا۔ ختم نبوتؐ نے اس باطل عقیدے کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ آنے والا آخر آ گیا' اب کوئی اور آنے والا نہیں آئے گا۔ اب تم نے خود اپنا آنے والا بننا ہے۔ ختم نبوتؐ بڑی عظیم حقیقت تھی۔ اس قوم نے کہاں کہاں ناسپاس گزاری کی ہے' کہاں کہاں کفرانِ نعمت کیا ہے! اس قسم کی کتاب پاس ہے کہ جس کا جی چاہے

اس کے ساتھ خدا کلام کرنے لگ جائے۔ اس کو بند کیا ہوا ہے' خدا سے کلام کرنے کے لیے مٹی کے ڈھیروں کے اُوپر جا رہی ہے۔ ذلت کی انتہا ہونی چاہیے۔ ختم نبوتؐ کے ساتھ اس نے یہ کہہ دیا کہ اب شخصیتوں کی طرف انتظار نہ کرو۔ یہ خدا کا کلام تمہارا قوتِ بازو ہے' اس سے اُٹھو اور ساری دنیا میں انقلاب برپا کر دو۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ زندوں کی طرف انتظار کے لیے نہیں' مردوں کے لیے بھی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کیا چیز تھی؟ ایک باطل عقیدہ کشف اور الہام کا عقیدہ تھا۔ یہیں سے ابتدا ہوتی ہے' پھر وہ آگے بڑھتے بڑھتے بڑھتے وہ کہتے ہیں کہ پھر اس کے لیے تو آخری ایک مقام ہے' جو آخری مقام ہے وہ نبوت کا مقام ہو جاتا ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ بھی انتہائی مایوسی کے زمانے کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں کی نبوت ہو یا ایران کی بہائیت ہو' یہ خالص مایوسی کے زمانے کا پیدا کردہ تصور ہے۔

وحی کی تلوار اور تنہا عقل انسانی کی تلوار میں بنیادی فرق آزادی اور محرومی کا فرق ہے:

جب قومیں اپنے قوتِ بازو سے دنیا کے اندر انقلاب پیدا کرتی ہیں' وہ کبھی کسی شخصیت کی طرف نہ تکتی ہیں' نہ کسی کا انتظار کرتی ہیں۔ شخصیتوں کی طرف تکنا تو ایک طرف رہا تاریخ کے اندر وہ بات مشہور ہے کہ نپولین جیسا اولوالعزم فاتح ہے۔ جب اس نے روس فتح کیا ہے تو روس کے ایک بادشاہ کی بہت زرنگار تلوار اس کے سامنے لائے کہ یہ لیجیے' تحفتاً آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ اس شہنشاہ کی یہ عظیم نادر تلوار ہے۔ کہنے لگے کہ اچھی بات ہے ہوا کرے۔ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے کہ بڑی جوہر دار ہے۔ ٹھیک ہے اور کیا چیز ہے؟ اس کا دستہ دیکھیے کس قدر زرنگار ہے۔ ٹھیک ہے انہوں نے کہا کہ اسے لے لیجیے۔ پتہ ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ میرے پاس اپنی تلوار موجود ہے۔ جس قوم کے پاس یہ اپنی تلوار موجود تھی' وہ قوم دنیا کے اندر دوسروں کے مستعار' مانگنے کے لیے ان کے ہاں سے یہ معمولی سے چھکڑے لے رہی ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ اس کے پاس کیا چیز موجود ہے؟ عزیزانِ من! ختم نبوتؐ کی تلوار جس قوم کے پاس ہو' وہ لوگوں سے مستعار' مانگے گا تلواریں؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ میرے پاس اپنی موجود ہے۔ **منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجت** (2:253) اس نقطے کو میں پھر واضح کر دوں یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم خدا سے کلام کرتے ہیں۔ میں نے گزارش کیا ہے کہ سارے قرآن میں جہاں بھی خدا کلام کرتا ہے تو بات یوں آپ کہیں گے کہ صاحب! جب وہ کلام کرتا ہے تو پھر تو ہم کلامی ہو گئی ادھر سے کوئی جواب بھی دیتا ہے۔ اس میں انسان Initiative نہیں کر سکتا کہ جب جی چاہے خدا کو بلا لے اور وہ اس کے لیے آ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان سے ہم کلامی کا اختیار صرف اپنے پاس ہی رکھا ہے اور یہ کسی انسان کو عطا نہیں کیا:

آپ نے فرق سمجھا کہ وہ کلام کرتا ہے کے کیا معنی ہیں؟ یہاں بھی ہم کہتے ہیں کہ ''جا او میں تیرے نال نئیں بولدا[1]''، یعنی وہ اس

کے بعد جتنا جی چاہے بلاتا رہے' یہ اگر نہیں بولتا تو نہیں بولتا Initiative اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انسان سے کلام کرنے کا Initiative خدا کے پاس ہے' انسان کے پاس نہیں ہے' یہ ایسا صاحب اختیار نہیں ہے کہ جب جی چاہے اللہ میاں کو آواز دے اور وہ کہے کہ جی حاضر ہیں جناب! کیا حضور کا حکم ہے۔ اللہ اکبر! وہ جب کوئی بات کرنا چاہتا تھا تو کسی سے بات کرتا تھا کلمہ اللہ موسیٰ سے بھی یہ چیز کہی ہے۔ وحی کی یہ چیز بھی اسی لیے تھی۔ انسان کا کسب و ہنر کے معنی یہ ہیں کہ جب جی چاہے' وہاں سے وحی لے لے۔ یہ کشف والہام والے یہ باتیں کرنے والے' خدا سے تو یہ سارے کا سارا اختیار اپنے ہاتھ رکھتے ہیں۔ ہم خدا سے جا کر یہ پوچھ آئیں گے یا پوچھ دیتے ہیں خدا سے ہم بات کریں گے۔ نہیں' عزیزانِ من! خدا کا کلام انبیائے کرام کی وساطت سے آتا تھا۔ آخری مرتبہ' آخری کلام' محفوظ شکل میں ہمارے پاس آ گیا۔ اب خدا ہم سے کلام کرتا ہے جب ہم قرآن پڑھتے ہیں' اس کے علاوہ اب خدا سے کلام کرنے کا کوئی اور ذریعہ' قرآن کی رو سے' ثابت نہیں ہے۔

---

❶ ابے! جاؤ میں تمہارے ساتھ نہیں بات کرتا۔

ہمارے ہاں کے خود ساختہ مذہبی تصورات نے ہمیں محکومیت کی اندھیری رات میں دھکیل دیا ہے:

عزیزانِ من! یہ سارے تصورات غیر قرآنی ہیں اور قوم کو انتہائی محکومیوں کی زنجیروں میں جکڑنے کے ذرائع ہیں۔ قدم قدم پہ آپ دوسرے انسانوں کے محتاج ہو گئے کہ وہ تم سے خدا کی بات کیا کریں اور ختم نبوت کا عقیدہ بھی رکھ رہے ہیں کہا کہ **واٰتینا عیسی ابن مریم البینٰت** (2:253) عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے واضح دلائل دیے۔ یہ حضرت عیسیٰ کیونکہ نبی اکرمؐ سے Immediately Before (فوراً ہی پہلے) یہی عظیم خدا کے رسول ہیں عیسائی اس زمانے میں' چھٹی صدی عیسوی کے اندر' بڑے چھائے ہوئے تھے' ان کے باطل عقائد بھی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰ کی والدہ محترم کے متعلق بھی' خود حضرتِ عیسیٰ کے متعلق بھی جو غلط باتیں منسوب تھیں' ان کی تردید بڑی ہی تفصیل سے کی' اس لیے ان کا ذکر خاص طور پہ آتا ہے۔ یہودی دوسری قوم تھی جس کے دنیا کے اندر بہت زیادہ خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ اس لیے بنی اسرائیل اور حضرتِ موسیٰ کا ذکر آتا ہے اور اس کے علاوہ باقی جو تصورات ہیں' وہ ایران کے مجوسیوں کے ہیں۔ یہی اس زمانے میں فکری طور پر یا مذہب کی دنیا میں' زیادہ اثر رکھنے والے مذاہب یا اسکولز آف تھاٹ تھے۔ قرآن میں اسی لیے ان کے خیالات' افکار اور عقائد اور باطل نظریات کی تردید ہر جگہ موجود ہے اور ان کی جگہ ان انبیائے کرام کی صحیح تعلیم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عیسیٰ کا ذکر ہے کہ **واٰتینا عیسی ابن مریم البینٰت** (2:253) عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے واضح دلائل دیے تھے۔ **وایدنٰہ بروح القدس** (2:253) عیسائیوں کے ہاں باطل عقیدہ باپ بیٹا اور روح القدس Father, Son and the Holy Ghost کا ہے۔ میں یہاں آؤں گا تو عرض کروں گا کہ روح کا ترجمہ Spirit کے لیے عیسائیوں نے یہ Ghost کہاں سے لیا تھا؟ ان میں سے ان کے ہاں کی یہ کوئی اپنی چیز ہے ہی نہیں وہ یونان کا فلسفہ اس طرح سے اعصاب کے اوپر چھایا ہے اقوامِ عالم کی قومیں اس میں سے نکل ہی نہیں سکی ہیں۔ وہ تو قرآن تھا جس نے آ کر اتنی صدیوں سے چھائے ہوئے ان غلط تصورات

کے بادل چھٹ دیے۔ صرف قرآن یہ کرسکتا تھا۔ یہ عقائد وہاں سے آئے ہوئے تھے۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کیا لیکن ابھی آپ سے یہ عرض کیا تھا کہ (16:102) میں تو جبریل کو روح القدس کہا ہے کہ رسول اللہ کی طرف وہ وحی لاتا ہے' ہر نبی کی طرف وہ وحی لاتا تھا۔ اس لیے ہر نبی کی جو وحی ہے اس کا واسطہ روح القدس ہے۔ اس میں خصوصیت یا اختصاص یا استثنیٰ حضرتِ عیسیٰ کی نہیں کہ Exclusively ان کو یہ کوئی ہو کسی دوسرے کو یہ چیز نہ ہو۔ عیسائیوں کے ہاں تو یہ قنومِ ثلاثہ میں سے تیسرا رُکن Holy Ghost یا sipirit ہے وہ صرف حضرتِ عیسیٰ کے لیے ہے۔

قرآن حکیم نے روح القدس جبریل کے بھی استعمال کیا ہے؟

قرآن نے تو روح القدس جبریل کو کہا ہے یعنی بڑی دور تک پہنچنے والی توانائی اور یہ چیز صرف جبریل کے لیے نہیں ہے۔ جب ملائکہ نے کہا کہ **ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک** (2:30) تو وہی قدس تو ہے یہ۔ تو کیا معنی تھے ملائکہ نے کہے؟ کہ ایک نئی مخلوق کی ضرورت کیا ہے' ہم تیرے پروگرام کی تکمیل میں سرگرداں رہتے ہیں اور جتنی دور تک جانا پڑے اس کے لیے جاتے ہیں۔ یہیں سے یہ روح القدس ہے۔ جبریل ہی ہے' وہی ہے' اس کے علاوہ وہ تثلیث کا تیسرا جو عنصر ہے' وہ نہیں ہے یاد رکھیے! اس کی طرف قرآن کہتا ہے' وہی وحی بھیجی تھی جو دوسرے نبیوں کی طرف بھیجتے تھے' وہی جبریل آتا تھا جو جبریل تمہاری طرف بھی آیا' جبریل تمام انبیا کی طرف آتا تھا۔ وہی جبریل ان کی طرف آیا' وہی بینات ان کو دیے۔ اب دیکھا کہ ان کو وصف انبیاء میں کھڑا کیا ہے الوہیت اور وہ جو تخصیصی مقام ہے ایک لفظ سے اس کو ختم کر دیا ہے۔

قرانی احکام کے باوجود مسلمانوں کے مابین قتل وغارت کی نوعیت:

اب اس کے بعد وہ دور تھا جب عیسائیوں کے فرقے ایک دوسرے کے خلاف مناظرے اور مباحثے ہی نہیں کرتے تھے' وہ ان متشابہات سے نکل کر محکمات تک آ گئے تھے یعنی میدانِ جنگ میں جنگ ہوتی تھی ان کی آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں' قتل وغارت گری ان کے ہاں ہوتی تھی۔ ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے باقی قومیں کیا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ اپنی تاریخ کی طرف ہم نے کبھی نگاہ ہی نہیں اُٹھائی۔ جتنی قتل وغارت گری آپس میں مسلمانوں نے خود کی ہے' دوسری قوموں نے کیا کی ہو گی لیکن اس وقت تو قرآن ان کی بات کر رہا ہے۔ ان سے متعلق تو یہ کہہ دیا تھا کہ جس نے کسی ایک مومن کو بھی عمداً قتل کر دیا تو **فجزآؤ جھنم** (4:93) ایک مومن کا بالارادہ قتل' جہنم ہے اور یہاں ایک ایک جنگ میں آپ دیکھتے ہیں کہ صاحب! ہزاروں کی تعداد کے اندر دونوں طرف سے قتل ہو رہے ہیں۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ **ولو شآء اللہ ما اقتتل الذین من بعدھم من بعد ما جآء تھم البینٰت ولکن اختلفوا فمنھم من اٰمن ومنھم من کفر** (2:253) جب بینات آ جائیں۔ بینات وہ چیزیں ہیں جن کو Rationally آپ Accept (قبول) کر لیتے ہیں عقل وفکر کی رو سے علیم وبصیرت کی رو سے ان کسوٹیوں پہ کس کے دیکھ کے ٹھیک اُترتے ہیں Convice ہو جاتے ہیں۔ کہتا ہے عام طور پہ انسانوں کو تم دیکھو کہ جب وہ اس طرح سے ان چیزوں پہ آ جاتے ہیں تو پھر تو بعد میں ایک دوسرے کے سینے میں نہ خنجر گھونپتے ہیں' نہ کوئی اختلاف کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا میں آ کر ان کو کیا ہو جاتا ہے۔ کہا کہ اگر ہماری یہ مشیت ہوتی کہ

انسان اختلاف ہی نہ کریں تو ہم انہیں جامد پتھروں کی طرح پیدا کر دیتے۔ پتھر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف نہیں کرتے۔ کہتا ہے کہ پھر یہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتے۔ کسی برے سے برے انسان سے بھی آپ کہیے کہ کیا وہ پتھر بننا چاہتا ہے؟ وہ کبھی نہیں بننا چاہتا۔ آزادی بڑی چیز ہے جسے یہ Retain کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ بیچتا بھی اس کو یہ بڑے سستے داموں ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ جاہل بھی ہے ظالم بھی ہے لیکن بہرحال آزادی کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اختیار وارادے کی بنا پر بینات کے ذریعے حق کو تسلیم کرنا ہی شرفِ انسانیت ہے:

آپ کو معلوم ہے کہ فالج میں حالانکہ نہ درد ہوتا ہے' نہ کوئی Pain ہوتی ہے' لیکن سب سے زیادہ کرب انگیز جو بیماری ہے' وہ یہ ہوتی ہے کہ میں تو جی اپنے ارادے سے ہل نہیں سکتا۔ دیکھا یہ اپنا ارادہ کتنی بڑی چیز ہے! قرآن کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے ہم چاہتے تو یہ کر سکتے تھے کہ ان کو پتھر بنا دیتے کہ یہ اختلاف نہ کرتے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے اختیار اور ارادے سے خود بینات کے ذریعے سے' باہم دگر اور صلح اور ص فائی سے رہنا سیکھیں' Rationally (بصیرت سے) ایک معاملے کو طے کر لیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انسانوں میں ہوتا کیا ہے؟ اصل معاملہ تو بہت دور میں جا کر آتا ہے۔ جونہی کسی کے ساتھ آپ نے اختلافی معاملے۔ یہ بات کی' دوسرے کی بات کے بعد فوراً آپ کو ایک اشتعال آتا ہے' ایک غصہ آتا ہے اور فوراً آپ Unbalance (غیر متوازن) ہو جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے جتنے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ابتدا ان کی اس سے ہوتی ہے دوسرے نے بات کی اور اس نے اپنا بیلنس (توازن) کھویا۔

معاشرتی سطح پر زندگی کو سنوارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ایک قرآنی اصول:

عزیزانِ من! بات میں سے بات نکل آئی ہے' بڑی اہم بات ہے۔ یہی بات ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کہیں یہ چیز ہو جائے کہ دوسرا جو کچھ کہتا ہے' اس پہ آپ Unbalance (غیر متوازن) نہ ہوں اپنا توازن نہ کھوئیں آپ نے دیکھا کہ دنیا میں کتنے جھگڑے یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ عزیزانِ من! اس کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹا رکھیے اور اس قوم کو تو اس کی بڑی ہی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں تو پوچھیے ہی نہیں کہ بات شروع ہونے سے پہلے ایک لفظ کے اُوپر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ پتہ ہے وہ کیا چیز ہے جو میں نے کہی کہ تین لفظ ہیں؟ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ **فاصبر علی ما یقولون** (20:130) جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے اپنا بیلنس (توازن) نہ رکھو۔ کیا بات ہے صاحب! **علٰی ما یقولون** کہہ کر قرآن نے جھگڑے کی جڑ پکڑ لی۔ سارے جھگڑے یہاں ہوتے ہیں۔ جونہی **یقولون** ہوئی' سامنے سے کسی نے کہا اور اس نے اپنا توازن کھویا۔ توازن کھویا اس نے یہاں کھویا اس نے اس سے زیادہ کھویا' پھر اس کے بعد یوں ہوا' متشابہات سے محکمات تک پہنچے' معاملہ دار و رسن تک چلا گیا۔ کہاں سے بات شروع ہوئی تھی؟ ''کہ جی گل تے کچھ وی نئیں سی ہیگی' اے منڈیاں تے گل ہوئی' تے آپس اچ ایویں باہر جا کے جھگڑن لگ پئے [1]'' کیا ہوا؟ قرآن کی اتنی سی نگاہ سے بات اوجھل ہوگئی کہ **واصبر علٰی ما یقولون** (20:130) یاد رکھ! سامنے سے بات کہنے والا ایسی بڑی باتیں کرے گا کہ جس سے اشتعال آئے گا لیکن تیرا کام یہ ہے کہ اپنا توازن نہ رکھا۔ عزیزانِ من! **واصبر** کے یہ معنی ہیں اور میں پچھلی دفعہ بتا چکا ہوں۔ تیری کشتی نہ ڈولے یہ ہے عربی کے اس صبر کا ترجمہ ''ایویں ای اگلے دے پتھر مارن نال کشتی نہ ڈولن لگ پئے **واصبر علٰی ما یقولون** (20:130) عظیم

حقیقتیں ہیں، چار چار لفظوں میں بیان کر گیا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ پھر یہ اختلافات ہوتے کس طرح سے ہیں؟ بینات موجود ہوتے ہیں، اگر آپ Balance Loose (توازن ضائع) نہ کریں Rationally (عقل وحکمت سے) اس معاملہ پہ دونوں فریق غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ لڑائی جھگڑے والی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ کہتا ہے کہ ہم چاہتے تھے کہ **ما جآء تھم البینٰت** (2:253) جب ایک چیز Reason (عقل) سے Rationally (بصیرت سے) یہ دلائل وبراہین کی رو سے، سمجھ میں آ جائے تو پھر اس کے بعد یہ اس قسم کے اختلافات کیوں پیدا ہوں، پھر جھگڑے کیوں ہوں۔ **ولو شآء اللہ ما اقتتل الذین** (2:253) جھگڑا اختلاف ہی نہیں ہے، قتل وغارت گری تک چلا جاتا ہے۔ **من بعدھم من بعد جاء تھم البینت** (2:253) **ولٰکن اختلفوا فمنھم** (2:253) لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ذراسی بات ہوئی اور انہوں نے خنجر ہاتھ میں لیا۔ **ومنھم من اٰمن ومنھم من کفر** (2:253) لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ ذراسی بات ہوئی اور انہوں نے خنجر ہاتھ میں لیا۔ **ومنھم من اٰمن ومنھم من کفر** (2:253) پھر کچھ ان میں سے اس حقیقت پہ ایمان لے آئے، کچھ نے انکار کیا۔

---

❶ جی! بات تو کوئی بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض لڑکوں پہ بات ہوئی تو ایسے ہی باہر جا کر آپس میں لٹھم لٹھ ہو گئے۔

❷ ایسے ہی اگلے کے پتھر مارنے سے کشتی نہ ڈولنے لگ جائے۔

اس پوری کائنات میں صرف انسان کو ہی اختیار وارادہ دینا چہ معنی:

یہاں کہا ہے کہ **ولو شآء اللہ ما اقتتل** (2:253) یاد رکھو! ہم تمہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ اگر ہمارا مشیت کا پروگرام یہی ہوتا تو ہم انسانوں کو ایسا پیدا کرتے کہ یہ اختلاف ہی نہ کر سکتے، صاحب اختیار وارادہ ہوتے ہی نہیں۔ اب یہ سوال ہوا پیدا کہ صاحب! پھر خدا نے ایسا بنا کیوں نہ دیا "اے لڑائی جھگڑا تے مکدا روز دا سیاپا❶" کیوں بنا دیا ایسا؟ کیوں یہ مشیت ہوئی؟ کہا اس مقام پہ یاد رکھو یہ کہ **ولٰکن اللہ یفعل ما یرید** (2:253) ہمارا اور یجنل پروگرام ایسا کیوں ہوا کہ ہم نے باقیوں کو صاحب اختیار وارادہ نہیں بنایا، انسان کو ایسا بنایا، ہم نے یہ کیوں کیا ہے؟ یہ ہمارے ایک پروگرام کی بات ہے، تم اس پہ سوال نہیں کر سکتے۔ عزیزانِ من! یہ ہیں قرآن کی آیتیں جہاں سے یہ Quote (نقل) کر دیتے ہیں۔ اتنا سا ٹکڑا لیا کہ **ولٰکن اللہ یفعل ما یرید** (2:253) صاحب! خدا کہتا ہے جو ہمارے ارادے میں آتا ہے ہم کرتے ہیں "مہاراج رنجیت سنگھ وانگوں" نہیں❷۔

---

❶ یہ لڑائی جھگڑا، یہ لٹھم لٹھ ہونا تو ختم ہوتا۔

❷ یہ مہاراج رنجیت سنگھ کی طرح نہیں ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں کائنات کی ہر شے اپنے اندر ایک پروگرام لیے ہوئے ہے:

عزیزانِ من! کہاں کہتا ہے، یہ سوچیے کہ جب آپ یہ کہیں گے کہ صاحب آگ جلاتی کیوں ہے؟ خدا نے ہر ہلاکت انگیز بنایا؟

وہاں خدا یہ کہتا ہے کہ یہ جو Originally مقام ہے کہ ہم نے ان اشیاء کو ایسا کیوں بنایا ہے؟ یہ بہت بڑا وسیع پلان ہے' اس پلان کے اندر یہ چیز فٹ ان کرتی ہے' ہم جانتے ہیں اور یہ جو پلان ہے ہم نے کسی کے ساتھ مشورہ کر کے نہیں بنایا۔ اس لیے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں **یفعل ما یرید** (2:253) ہم نے اپنے فیصلے سے' اپنے ارادے سے' ایک پلان بنایا ہے' اس میں یہ چیزیں ہیں۔ اس کو تو تم Question نہیں کر سکتے لیکن یہ چیز کہ تم صاحب اختیار و ارادہ ہو' یہ تو تم جانتے بھی ہو اور اس کے بعد یہ کہ تم کسی قیمت پہ بھی اپنا ارادہ خود نہیں دینا چاہتے یہ تو بات ہے تمہارے ہاں۔ خدا نے یہ کیوں نہیں روک دیا؟

انسان کی عظمت انسان کے اختیار و ارادے سے ہی وابستہ ہے:

روز یہ ہوتا ہے کہ جی! اتنا ظلم کرنے والے جو ہیں' خدا اگر ہے' اگر موجود' تو کیوں نہیں ان کو روک دیتا؟ دوسرے لفظوں میں یہی کہنا کہ انسان کا اختیار و ارادہ کیوں نہیں چھین لیتا۔ تیسرے لفظوں میں یہی کہنا ہے کہ اس نے صاحب اختیار و ارادہ بنایا کیوں ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ''کیوں'' نہیں' تم پوچھ سکتے۔ ہمارا Over all plan ہے' اس کے مطابق ہم نے یہ کیا ہوا ہے' یہ پوزیشن ہے' یہ ہم نے تم پہ واضح کر دی ہے۔ سانپ سے ہم کبھی نہیں پوچھیں گے کہ تم نے ڈسا کیوں ہے؟ شیر کو کبھی ہم پھانسی نہیں دیں گے کہ تم نے فلاں انسان کو کیوں چیر پھاڑ کھایا؟ ہم انسان سے باز پرس کریں گے کہ تم نے اپنے اختیار کیوں غلط استعمال کیا؟ کیوں صاحب اختیار بنایا یہ تم ہم سے نہیں پوچھ سکتے **ولٰکن اللہ یفعل ما یرید** (2:253) برادرانِ عزیز! سورۃ البقرۃ کی آیت 253 ہم نے لی۔ آج ایک ہی آیت ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ جو بات میں کہنا چاہتا تھا' وہ صاف ہوگئی ہو۔ اگلی دفعہ ہم آیت 254 سے لیں گے۔ بڑی اہم چیزیں آتی ہیں۔ اس میں تو شفاعت کا مسئلہ آ رہا ہے' اسے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

باونواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 254 تا 255)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿254﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْـحَيُّ الْقَيُّوْمُ ڬ لَا تَاْخُذُهٗ سِـنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِـيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿255﴾

عزیزانِ من! آج جون 1969ء کی 13 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 254 سے آغازِ کلام کرتے ہیں: (2:254)۔

جنت کے حصول کا طریق کار

بات چلی آ رہی تھی کہ جنت میں داخلہ کس طرح سے مل سکتا ہے؟ اور بتایا یہ گیا تھا کہ یہ چیز جان اور مال کو خدا کے ہاں بیچنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جان کے متعلق پچھلی آیت میں یہ ذکر آ رہا تھا' مجاہدین کا ذکر تھا' میدانِ جنگ کا ذکر تھا۔ بنی اسرائیل کی اس قوم کا ذکر تھا جو قدم قدم پر بہانہ سازیاں کرتی تھی' موت کے ڈر سے بھاگ اُٹھتی تھی۔ پھر اس میں عزم و ثبات پیدا کرنے کا جو طریق اختیار کیا گیا تھا' اس کی تفصیل تھی۔ یہ حصہ تو تھا ان لوگوں کا جو میدانِ جنگ میں جاتے ہیں یا یہ کہیے کہ یہ وہ مرحلہ تھا جس میں میدانِ جنگ میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اسلامی نظام کی رو سے فوج کوئی الگ تو ہوتی نہیں ہے وہاں تو ہر مردِ مومن سپاہی ہوتی ہے لیکن یہ ٹھیک

کہ میدانِ جنگ میں جانے کے لیے (مثلاً) بچے نہیں جاسکتے' بوڑھے نہیں جاسکتے' کمزور نہیں جاسکتے' بیمار نہیں جاسکتے اور ویسے بھی جنگ نہ ہو رہی ہو تو اس کی تیاری کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں جو پہلی چیز ہے' وہ انفاق ہے یعنی دولت کو اس راستے میں کھلا رکھنا۔ اسی لیے یہ جو مومن ہونے کی شرط لگائی تھی اس میں کہا تھا کہ **ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم بن لھم الجنۃ** (9:111) یعنی جنت کی قیمت جان اور مال دونوں بتائے گئے ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' جان دینے کا وقت تو کبھی کبھی آتا ہے' آخری مرحلہ ہوتا ہے اور دولت صرف کرنا تو التزاماً ہوتا ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھیے اس پہ بڑا زور دیا گیا ہے اور خاص طور پہ اس کے لیے **علیٰ حبہ** (2:177) کہا گیا ہے کہ اس کی کوشش کے باوجود تمہیں اس مقصد عظیم کے حصول کے لیے اس کو کھلا رکھنا ہوگا۔ گویا اس کی بڑی کشش ہوتی ہے اور اس کشش کے اُوپر قابو پانا یہی ایمان کی دلیل ہے۔ اسی لیے اب اس آیت میں جو ہمارے سامنے آ رہی ہے' میدانِ جنگ کے بعد کہا کہ **یا ایھا الذین اٰمنوا انفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ و لا خلۃ و لا شفاعۃ والکافرون ھم الظالمان** (2:254) یہ بڑی عظیم آیت ہے کہا ہے کہ اے ایمان والو! **مما رزقنکم** جو کچھ بھی سامانِ زیست تمہیں دیا گیا ہے' اس میں صرف روپیہ نقدی کی شکل میں ہی نہیں ہے قرآن کی اور عربی زبان کی رزق تو بڑی جامع اصطلاح ہے۔ ہر وہ شے جس پہ زندگی کا مدار ہے رزق میں آ جاتی ہے۔ جس سے انسان نشو و نما پاتا ہے جسے ہم سامانِ زیست کہتے ہیں وہ سب رزق کے اندر آ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسانی صلاحیتیں' اس کی توانائیاں' اس کی قابلیتیں' اس کے جوہر' یہ بھی رزق کے اندر آتے ہیں۔ جو کچھ انسان کو انسان بننے کے لیے دیا گیا ہے وہ رزق کے اندر آ جاتا ہے۔ لہٰذا مال و دولت سے لے کر انسان کی اپنی صلاحیتوں' قابلیتوں' اس کی خصوصیات تک' ہر شے اس میں آ جائے گی۔ **مما رزقنکم** اسی لیے کہا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں سامانِ زیست میں سے عطا کیا اس سب کو کھلا رکھو۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں قرآن کریم ہمیشہ لفظ ''انفاق'' استعمال کرتا ہے۔ ہم اس کا ترجمہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ خرچ وہی عربی زبان کے خرج سے ہے جس کے معنی باہر نکلنا ہے' کسی شے کا یا باہر نکالنا لیکن یہ انفاق کا لفظ اس سے زیادہ گہرا ہے' معنویت کے اعتبار سے زیادہ جامع ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ نفاق ہوتا ہے' منفق ہوتی ہے وہ میانی جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ اب تو وہ ہوتی نہیں ہے' روپیہ رکھنے کے لیے ضرورت ہی نہیں پڑتی ورنہ وہ میانی ہوتی تھی۔

قرآن حکیم کے ہاں لفظ رزق کے علاوہ لفظ دولت کے مفہوم کو بھی بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے

ایک طرف سے روپیہ ڈالیے دوسری طرف سے گرہ لگا کر بند کی ہوئی ہوتی تھی تو اس میں تو صرف ڈالا جاتا تھا' دوسری طرف سے وہ نکلتا نہیں تھا لیکن اس قسم کی میانی' اس قسم کا راستہ' اس قسم کی سرنگ' کوئی شے جس کے دونوں راستے کھلے ہوں' دونوں دروازے کھلے ہوں'

اسے نفاق سے تعبیر کیا جائے گا۔ لہٰذا ہمارا معاشی نظام یہ ہے کہ دولت کسی مقام کے اُوپر رُکتی نہیں ہے' اس میں آتی جاتی ہے اور نکلتی چلی جاتی ہے۔ لفظ دولت میں' دولت اس وقت کہلائے گی جب یہ دولت گردش کرتی چلی جائے گی۔ اگر یہ گردش میں نہ رہے' کسی جگہ بھی اس کا ارتکاز ہو جائے' کسی جگہ جامد ہو جائے' کسی جگہ رُک جائے لفظی اعتبار سے بھی یہ دولت نہیں کہلائے گی۔ یہ تو گردش میں رہنی چاہیے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ کہیں رُکنی نہیں چاہیے' گردش میں رہنی چاہیے اور گردش کے لیے قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہہ دیا کہ **کی لایکون دولۃ بین الغنیآء منکم** (59:7) یہ گردش نہیں ہے کہ اُوپر کے طبقے میں ہی یہ صرف گردش کرتی رہے' اسے تو دورانِ خون کی طرح گردش کرنا چاہیے۔ جسم کے ہر حصے میں ہر رگ و پے میں یہ دوڑتی چلی جائے' خون جہاں نہیں پہنچتا جسم کا وہ حصہ مفلوج ہو جاتا ہے' سن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی نظامِ تمدن میں جہاں دولت گردش کرتی ہوئی نہیں پہنچتی' وہ حصہ سوسائٹی کا معاشرے کا مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے' بوجھل ہو جاتا ہے' سن ہو جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ سن ہونے والا پاؤں کتنا بوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک تو دولت' دولت ہے جب وہ گردش کرتی ہے اور قرآن کی رو سے اس کی گردش یہ ہے کہ اُوپر کے طبقے میں ہی گردش نہ کرتی رہے' سوسائٹی کے پورے طبقے میں گردش کرتی رہے اور یہی اس کا جو گردش کرنا ہے' اس نے نفاق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسے کہ ایک طرف سے آتی جائے' دوسری طرف سے یہ نکلتی چلی جائے۔ یہی اس کا مقصد ہے۔ اسے روک کر رکھنا' اس کا ارتکاز کرنا' یہ چیز اسلامی معاشی نظام کی بالکل ضد ہے۔ جب میں اس نظام پہ آگے چل کر آؤں گا تو وہاں عرض کروں گا کہ اس نے کس طرح سے ایک ایسا نظام بنایا ہے جس میں اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ کسی مقام پر دولت کو روک کر بھی رکھا جائے لیکن یاد رکھیے یہ تو اس نظام کی بات ہے۔ اس نظام کے اندر یہ کہا کہ **انفقوا مما رزقنکم** (2:254)

دولت خرچ کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ کھلا رکھنے کے لیے ہوتی ہے:

اور آگے بڑی عجیب چیز ہے کہ ابھی تو تمہیں یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اختیار اور ارادے سے اس دولت کو تم صرف کر دو' اس راستے میں صرف کرنے کے لیے کھلا رکھو۔ ترجمہ ہی اس کا کھلا رکھو ہونا چاہیے' خرچ کرنا نہیں۔ خرچ کرنا تو وہ ہوگا کہ اس میں سے خرچ کیا جائے جو دولت جمع ہے اس میں سے خرچ کیا جائے رکھی بھی جائے اور اس میں سے کچھ خرچ بھی کیا جائے۔ وہ جو بعد میں آ کے آپ کا نظام بنا کہ اس میں سے اگر اڑھائی پرسنٹ دے دیا جائے' باقی جمع رکھ لیا جائے تو یہ چیز تو کیا یہ دولت اس مقصد کو پورا کر دے گی' اس تصور کو پورا کر دے گی۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ ہے خرچ کرنا جسے آپ کہتے ہیں جبکہ یہاں خرچ کرنے کا سوال نہیں ہے' یہاں تو انفاق ہے۔ اسے تو رُکنا ہی نہیں ہے' اسے تو چلتے رہنا ہے۔ اکتساب اتنا کرنا ہے کہ حاصل کرتے چلے جانا ہے۔ اس تھیلی میں کچھ ڈلے گا تو باہر سے

نکلے گا' ڈالا ہی نہیں جائے گا تو نکلے گا کہاں سے۔ اس لیے جو محنت اور جو اکتساب ہے وہ تو مسلسل ہے لیکن اس میں جو دولت آتی ہے' وہ دولت رواں دواں رہے گی کسی مقام پر' کھڑی نہیں ہوگی' چلتی جائے گی۔ یہ ہے انفاق۔ کہا کہ اس وقت تو تمہیں اس کا یہ اختیار حاصل ہے کہ تم انفاق کی شکل میں اس کو ایسے رکھو کہ ان ضروریات کے لیے یہ آگے بہتی چلی جائے۔ **من قبل** (2:254) قبل اس کے کہ وہ دور آ جائے' وہ وقت آ جائے' وہ زمانہ آ جائے' حالات ایسے پیدا ہو جائیں۔

مکافاتِ عمل کا بنیادی مفہوم اور قوموں کی زندگی پر اس کا اثر:

اس دور کے متعلق قرآن نے کہا ہے **لا بیع فیه و لا خلة و لا شفاعة** (2:254) یہ قرآن کی بڑی جامع چیز ہے۔ قبل اس کے کہ تمہارے غلط نظام کے محسوس نتائج تمہارے سامنے آ جائیں اور پھر کوئی شے تمہیں اس ہلاکت سے بچا نہ سکے۔ ابھی یہ تمہیں اختیار حاصل ہے کہ جو پیچھے سے غلط نظام چلا آ رہا تھا' اس کے تباہ کن نتائج سے تم بچ سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا یہ مکافاتِ عمل کا جو اصول ہے' یہی ہے بنیاد دین کی۔ خود دین کے معنی بھی مکافاتِ عمل کے ہیں۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس میں نیت' ارادہ اور خیال بھی شامل ہے وہ متعین نتیجہ مرتب کرتا رہتا ہے۔ یہ بنیاد ہے دین کی' دین کے معنی ہیں ''نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے'' اب ان نتائج میں یہ شکل ہوتی ہے کہ فرد کے' معاشرے کے' اجتماعی انفرادی غلط اعمال سب اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ انفرادی غلطیوں اور لغزشوں کا تو پھر بھی کفارہ ہو جاتا ہے لیکن فطرت اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں قوموں کو کبھی بخشا نہیں کرتی۔ اجتماعی طور پہ جو لغزشیں ہوتی ہیں' ان کا نتیجہ بڑا ہی سخت ہلاکت انگیز ہوتا ہے۔ ابتدا میں غلط نظام اس وقت بھی اپنے تباہ کن نتائج پیدا کر رہا ہوتا ہے لیکن ہنوز اس نظام کی جو اچھی سائیڈ ہوتی ہے' تعمیری سائیڈ ہوتی ہے' جسے حق کہتے ہیں' وہ پلڑا غالب ہوتا ہے' بھاری ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لیے جو نظام بتایا ہے' وہ پلڑے کا جھکنا اور پلڑے کا اُٹھنا ہے۔ یہ بڑی اصولی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غلط نظام' غلط نظام کی قوم' مملکت' وہ بھی اپنی آخری تباہی تک پہنچنے کے لیے کافی عرصہ لے لیتی ہے' وہ آہستہ آہستہ اس طرف بڑھتی ہے۔ اسی طرح سے ایک فرد حفظانِ صحت کے اصولوں سے اگر اعراض برتتا ہے تو وہ اسی دن نہیں مر جاتا' Gradually (آہستہ آہستہ) اس کی صحت بگڑتی رہتی ہے۔ یعنی اس کی توانائی کا پلڑا ابھی غالب ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پھر ایسا وقت آ جاتا ہے' جب یہ توانائی کا پلڑا ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کی ہلاکت کا پلڑا جھک جاتا ہے۔

کسی نقصان کے خطرے سے پہلے اس کے بچاؤ کی خاطر کچھ اسباب کے مہیا کرنے کو کفارہ کہتے ہیں:

انسانی دنیا میں یہ اصول کارفرما ہے کہ قانون مکافاتِ عمل کے تحت ایک ایسا وقت بھی ہے کہ جس میں ہنوز بازیابی کا امکان ہے لیکن

جب وہ وقت آ جاتا ہے جس وقت بالیں پہ کھڑا ڈاکٹر یہ کہہ کر سر پھیر کر چل دیتا ہے کہ اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی' اس وقت پھر کوئی تدارک بھی کارفرما نہیں ہو سکتی اور اس سے پہلے یہ کہا کرتا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد تم آئے جب تمہارا سارا جسم بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اتنا مضمحل کر دیا مرض نے تم نے اتنا لمبا عرصہ دے دیا تم پہلے کیوں نہیں آ گئے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ابھی وہ تباہی کا پلڑا اتنا زیادہ جھکا ہوا نہیں ہوتا جسے آپ کہتے ہیں کفارہ ادا ہو جاتا ہے' فدیہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی منت ماننے والی بات نہیں ہے' یہ کوئی یوں کالا بکرا دینے والی بات نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ابھی جسم کے اندر مدافعت کا اتنا سامان باقی ہے کہ وہ تباہیوں کے سامان کا مقابلہ کر سکے یا مدافعت کا سامان اتنا بہم پہنچایا جا سکتا ہے کہ وہ تباہیوں کے تخریبی سلسلے کو روک سکے۔ یہ ہوتا ہے جسے آپ کفارہ یا فدیہ کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یاد رکھو! حسنات' سیات کو روک دیتی ہیں' دور کر دیتی ہیں۔ حسنات کرتی ہیں۔ تعمیری قوتیں' تخریبی قوتوں کی مدافعت کر نہ سکے۔ یہ جو وقت آ جاتا ہے اسے ہلاکت یا تباہی کہا جاتا ہے۔ ویسے اس وقت بھی کچھ نہ کچھ توانائی تو ابھی باقی ہوتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے کہ مدافعت کی قوت اتنی کمزور ہو چکتی ہے کہ وہ تباہیوں کی یورش کا مقابلہ کر نہیں سکتی۔ یہی وقت ہے جب معاشرے میں قوموں کی تباہی ہوتی ہے' جب ایک نظام فیل ہوتا ہے' جب ایک فرد کی موت آتی ہے۔ کہا کہ **مـن قبـل** (2:254) قبل اس کے کہ وہ وقت آ جائے۔ قرآن کیا بات کہتا ہے یہ چیزیں اس وقت بھی تمہارے پاس ہوں گی' یہ سامانِ زیست' یہ دولت تو ہوگی لیکن وقت وہ آ چکا ہوگا کہ پھر یہ سامانِ مدافعت تمہاری تباہی کو روک نہیں سکے گا۔ بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ **مـن قبل** قبل اس کے کہ وہ وقت آ جائے کہ پھر **لا بيـع فيـه** (2:254) یہ روپیہ جو کچھ تم نے رکھا تھا یہی تھا کہ اس سے تم سامانِ زیست خرید سکتے تھے لیکن وہ وقت آ جائے کہ پھر خرید و فروخت کا بھی امکان باقی نہ رہے۔ خرید کر نہیں' دوستوں سے مانگ کر کوئی چیز استعمال میں لائی جا سکتی تھی۔ **ولا خـلـة** (2:254) دوستی بھی کسی کام نہ آ سکے۔ مرنے والے کے سرہانے تو اس وقت حادثہ ہی نہ ہو جائے کہیں لڑائی نہ ہو جائے ورنہ جو موت بھی گھروں میں آتی ہے اس کے سرہانے تو اس وقت بڑے ہمدرد ہوتے ہیں' ہر ایک آنکھ نمناک ہوتی ہے' آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں' بھاگ دوڑ ہو رہی ہوتی ہے' کسی نہ کسی طرح کچھ کیا جائے اس کے لیے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی ہمدردی کسی کام نہیں آ سکتی۔ ایک چیز' میں مثال میں' ایک فرد کو پیش کیے جا رہا ہوں کہ بات ہماری سمجھ میں یونہی آ سکتی ہے۔ ہم نے کبھی اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل پہ تو غور ہی نہیں کیا کہ قومیں کس طرح سے جیتی رہتی ہیں اور قومیں کس طرح سے مرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم تو آج تک قوم بنے ہی نہیں' ہمیں معلوم ہی نہیں کہ قومی زندگی ہوتی کیا ہے؟ ہم تو انفرادی زندگی جی رہے ہیں' انفرادی ہمارے مفاد ہوتے ہیں۔ قومیں بھی اسی طرح مرتی ہیں۔ پھر ان کا کوئی Sympathizer (ہمدرد) بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

شفاعت کے مسئلہ کی حقیقت اور درس کا مفہوم:

لا خلة و لا شفاعة (2:254) میں یہ اہم چیز آئی ہے۔ یہ شفاعت کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس سے پہلے بھی (2:48) میں یہ بات آ چکی ہے' میں پھر اس آیت کو بھی پڑھ دوں' وہاں بھی یہ بات آئی تھی لیکن دوبارہ آئی ہے تو میں اسے پھر دوبارہ دہرا دینا چاہتا ہوں کہ درس میں بہت سے احباب وہ آتے ہیں جو اس وقت نہیں موجود ہوتے' پہلی دفعہ تشریف لاتے ہیں اس لیے اگر نہ دہراؤں تو ان کے لیے بات تشنہ رہ جاتی ہے اور جنہوں نے پہلے سنی ہوتی ہے ان کے لیے یہ مکرر ہو جاتی ہے۔ یہ تو درس ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ درس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ شہر والوں کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ آپ کے ہاں وہ گیہوں بن کے کیسے آتا ہے۔ اس کا آخری مرحلہ ہوتا ہے' اسے گاہنہ کہتے ہیں۔ پکی ہوئی فصل کو زمین پہ ڈال دیا جاتا ہے' پرانے طریق کے مطابق سارا دن اس کے اُوپر بیل چلتے رہتے ہیں۔ سارا دن بار بار تا آنکہ چھلکوں میں سے اناج نکل کر الگ ہو جاتا ہے۔ اسے درس کہتے ہیں۔ یہ ایک ہی دفعہ کا تھریشر نہیں ہے جواب آ گئے ہیں۔ بار بار بار بار اس کو دہرایا جاتا ہے۔ تو میرا مطلب یہ تھا کہ جن احباب کے سامنے یہ چیز پہلے آ گئی ہیں' ان کے لیے یہ تدریس ہو جائے گی' جو نو وارد ہیں وہ بات سمجھ لیں گے۔ کہا ہے کہ **و اتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً و لا یقبل منها شفاعة و لا یؤخذ منها عدل و لا هم ینصرون** (2:48) قرآن کی یہ آیت' قانونِ مکافاتِ عمل کے لیے' شمشیر برہنہ کا حکم رکھتی ہیں۔ یہاں بھی یہی سوال آیا تھا۔ میں شفاعت کے لفظ پہ آ رہا ہوں' بڑی اہم چیز ہے اس لیے کہ اس کے غلط تصور نے پوری قوم کو تباہ کر رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے اسلام کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے اور اسے پھر میری اسی مثال سے سن لیجیے' سمجھ لیجیے' جو میں اکثر دیا کرتا ہوں۔ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ آگ میں اُنگلی ڈالی اور اُنگلی جل گئی' اس جلی ہوئی اُنگلی میں درد ہو رہا ہے۔ کہیے کہ کسی شخص سے کہ صاحب! اس درد سے آ کر کہے کہ ہزار روپیہ رشوت کا لے لیجیے اور یہ درد موقوف ہو جائے۔ وہاں رشوت قبول نہیں ہوتی' درد کم نہیں ہوتا ہزار روپیہ رشوت دینے سے بھی نہیں۔ کہیے کسی عزیز تریں دوست سے کہ اس کا درد خود بانٹ لے۔ وہ نہیں بانٹا جا سکتا۔ اسے اپنے کیے کی سزا یوں کہیے کہ خود بھگتنی پڑے گی اور اگلی چیز یہ ہے کہ آپ گورنر جنرل صاحب کی کہیں سے چھٹی لے آیئے اس درد کے نام کہ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آپ اسے معاف کر دیجیے۔ وہ پھٹک کر رکھ دے گی اس سفارش کی چٹھی کو' قبول نہیں ہو سکتی۔ نہ رشوت' نہ کسی دوست کی ہمدردی' نہ کسی بڑے سے بڑے سفارش کرنے والے کی سفارش۔ اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ آگ میں اُنگلی رکھنے سے جلتی ہے' اس میں درد ہوتا ہے' اس نے اپنی رحمت سے یہ قانون بنایا تھا کہ فلاں دوائی اس کو اس پہ لگا دیجیے' درد کو بھی آرام ہو جائے گا' زخم بھی مندمل ہو جائے گا۔ اس قانون سے جو تمہیں ضرر پہنچا ہے اس کی مدافعت کے لیے' اس کے برعکس دوسرا اسی کا قانون جو دیا ہوا ہے' اس کی طرف

آ ؤ۔ اسے توبہ کہتے ہیں۔

خدا کی رحمت خدا کے بنا ہوئے قانون کی بنیاد پر ہی ہر شخص کے لیے ظہور پذیر ہوتی ہے:

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا کی رحمت سے ہوتا ہے' اس کی رحمت انفرادی نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ ہوتی ہے' آپ کے ساتھ نہیں ہوتی۔ رحمت اس کی یہ تھی کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے اگر جلتا تھا اور درد ہوتا تھا تو اس کی رحمت تھا کہ اس نے وہاں ایک اور پودا لگا دیا کہ جس کے پتوں سے اس درد کو آرام ہو جاتا ہے۔ رشوت سے نہیں ہوتا' سفارش سے نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! جو رشوت اور سفارش ہے ذرا سوچیے اگر آج کسی سے پوچھا جائے کہ یہ قوم تباہ کیوں ہوئی ہے؟ آپ کے پاس اس کے لیے ایک ہی لفظ ہے ''کرپشن'' یہ کرپشن ہوتا کیا ہے؟ یہ ہے رشوت' سفارش۔ سفارش کے متعلق آپ تصور میں لائیے کسی ایسے افسر کو جو کسی معاملے کا فیصلہ میرٹ پہ نہ کرتا ہو' سفارش پہ کرتا ہو' دیکھیے آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے اس کے متعلق؟ آپ کیا کہتے ہیں اس کے متعلق؟ کہ صاحب اس کے ہاں تو سفارش چلتی ہے' وہاں نہ کوئی قاعدہ ہے' نہ کوئی قانون ہے' نہ انصاف ہے' نہ عدل ہے۔ جو جی میں آئے کیجیے' سفارش پہنچا دیجیے' بس کام ہو جائے گا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پھر ہوتا یہ ہے اب غلط معاشرے کے اندر جو ہمارے ہاں روزمرہ کی بات ہوگئی کہ جونہی کوئی معاملہ کہیں پہنچا اور آپ نے یا تو اس ذریعہ کو تلاش کرنا شروع کیا' جس کے واسطے سے وہ رشوت جاتی ہے اور یا کوئی سفارش تلاش کرنا شروع کیا۔ ہر جگہ یہ چیز ہے اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ انفرادی افسر ہو ہر شخص اس کو گالی دے گا معاشرہ چیخ اُٹھے گا۔ معاشرے میں عام یہ چیز ہو جائے تو معاشرے کی تباہی ہو جائے گی۔ آپ سوچیے کہ اگر خدا کے ہاں بھی ہم یہ تصور لیں کہ وہاں سفارش چلتی ہے' غور کیجیے بات کہاں جا پہنچتی ہے؟ انسانوں کی محدود دنیا کے اندر ہم اس تصور کو کسی صورت میں نہیں اپنا سکتے ہیں ایک نفرت کا' تباہی کا' بربادی کا' ردعمل ہوتا ہے اس کے خلاف نہایت ہر شخص برا کہتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہاں سفارش چلتی ہے اور اس کے بعد یہ تصور کہ اس تک سفارش پہنچانے والے سفارش لے کر جاتے ہیں۔ یہ بات کسی طرح بھی اس نظامِ مکافاتِ عمل میں فٹ بیٹھتی ہے؟

ہماری خودساختہ شریعت و ملوکیت کو قانون راس ہی نہیں آتا:

یہ تصورات اس زمانے کے پیدا کردہ ہیں جب ہم میں ماقدر اللہ حق قدرہ (6:91) خدا کو پہچانا نہیں' پہچاننے کے بعد اس کو چھوڑ دیا کہ اس قسم کا خدا ہماری شریعت کو راس نہیں آتا تھا کہ جہاں فیصلہ عدل اور قانون کے مطابق ہو۔ ہمارے ہاں ملوکیت آئی' سارا کام سفارش پہ چلتا ہے۔ مقربین بادشاہ' بادشاہ کے دربار میں پہلے دربان سے لے کر آخری وزیر تک راستے میں ہر قدم قدم پہ یا رشوت چلتی ہے یا سفارش چلتی ہے۔ مقرب کے معنی ہی یہ تھے جو آپ کی درخواست وہاں تک پہنچا دے۔ پھر آن میرٹ اس کا فیصلہ نہیں ہوتا تھا'

سفارش پہنچانے والے کے منصب کے مقام پہ ہوتا تھا کہ وہ کتنا مقرب ہے۔ملوکیت کا یہ تصور تھا۔ہم نے اپنے اس کہنے کو تو یہ کہا کہ **السلطان ظل الله علی الارض** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے لیکن درحقیقت ہم نے خدا کو اس زمین کے بادشاہ کا ایک سایہ بنا دیا۔جس انداز کا ہمارے ہاں کا بادشاہ اسی انداز کا خدا بڑے پیمانے پر۔نہ کسی قاعدے قانون کا پابند'نہ اس کے ہاں کوئی طریق کار' جسے چاہے جو جی میں آئے کر دے۔پہلی چیز یہ ہے کہ وہ بالکل مستبد حاکم بادشاہ کی طرح ہے۔بادشاہ کے اختیار کے اُوپر تو کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی تھی۔

خدا تک براہِ راست رسائی کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد:

عزیزانِ من!اگلی چیز یہ ہے کہ ہم نے اس کا دربار بچھایا وہاں تک کوئی شخص براہِ راست نہیں پہنچ سکتا۔آپ دیکھ رہے ہیں' آپ کے ہاں کیا معتقدات ہیں کہ جی وہ ہماری تو نہیں سنتا' حضرت صاحب کے ہاں جایئے حضور ذرا اللہ کے ہاں دعا کر دیجیے۔میری دعا آپ اللہ کے ہاں کر دیجیے۔اللہ اکبر!وہ کہتا ہے میں تیری شہ رگ سے بھی قریب ہوں ''ہیں ایویں مخول کرنا ایں پیا[1]'' میری بات اس تک پہنچا دیجیے اور حضرت صاحب بھی کس تمکنت سے کہتے ہیں کہ ہاں صاحب!ٹھیک ہے جی رات کو عرضی لے جائیں' وہاں سے دستخط کرا لائیں گے۔مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔جتنا جتنا زیادہ مقرب' اتنا ہی زیادہ سفارش کرنے والا ہے اور اس کے بعد اسی سفارش کے لیے عربی زبان کا جو لفظ شفاعت ہم نے رکھا ہے اسے ہم نے یہاں تک پہنچایا ہے؟

---

[1] ارے!تم تو ایسے ہی مذاق کر رہے ہو۔

نبی اکرمؐ کی زبان سے قرآن حکیم کا ارشادِ عظیم:

اس ذاتِ اقدس واعظمؐ کی طرف کہ قرآنِ کریم میں خدا نے جس کی زبان سے کہلا دیا کہ اے رسول!اعلان کر دے کہ اگر میں بھی اس کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو مجھے بھی اس کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ ہم سب کو اس کے عذاب سے بچا لے گا۔جو اپنے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکتا' میں اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔کبھی کسی سفارشی کو آپ نے یوں بھی دیکھا ہے کہ وہ اپنے معاملے میں بھی بالکل بے کار ہو کر رہ جائے؟ کتنا عظیم اعلان تھا اور اسی لیے قرآن نے کرایا کہ باطل عقیدے ہی یہ آتے تھے کہ مذہب کی دنیا میں جتنا کوئی مقدس ہوتا چلا جاتا تھا' اتنا ہی زیادہ خدا کے ہاں کا وہ شفیع ہوتا چلا جاتا تھا' سفارش کرنے والا بنتا چلا جاتا تھا۔قرآن نے اس ذاتؐ سے یہ اعلان کرا دیا کہ جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔تقدس اور عظمتوں کے اعتبار سے اس سے بلند تصور ہمارا بھی نہیں جا سکتا۔اس ذاتِ اقدسؐ کی زبان سے خود قرآن نے کہلوا دیا کہ اگر میں بھی اس کے قانون کی خلاف

ورزی کروں گا تو اس کے یومِ عظیم کے عذاب سے میں بھی ڈرتا ہوں' کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اب سوچیے کہ اس اعلان کے بعد یہ تصور کہ میدانِ حشر میں معاملے آن میرٹ طے ہو جائیں گے' اعمال نامے تلیں گے' ترازو بتائیں گے' کون سا پلڑا جھکا ہوا ہے' کون سا اُٹھا ہوا ہے۔ جنت والوں کو آن میرٹ جنت میں بھیج دیا جائے' جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا' معاملے طے ہو جائیں گے۔

شفاعت کے سلسلہ میں ہمارے ہاں پائے جانے والے غیر قرآنی تصورات کی نوعیت:

اس کے بعد ہمارے ہاں کے پھر یہ عقائد دیکھیے۔ ہر کتاب میں آپ کو یہ چیزیں ملیں گی کہ پھر رسول اللہؐ نے وہاں حشر کے میدان میں سجدے میں سر ڈالا ہوا ہوگا۔ عدالت برخواست ہو رہی ہے' اللہ میاں تشریف لے جا رہے ہیں' ایسے میں مڑ کر دیکھتے ہیں تو وہاں ایک فرد ابھی باقی ہے۔ پوچھا جاتا ہے آپ بڑی تفصیلیں روایات کی کتابوں میں دیکھیں گے۔ پوچھیں گے کہ یہ کون ہیں؟ معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ یعنی اللہ کے حبیب ہیں۔ اس دوستی کی وجہ سے پھر اللہ تعالیٰ بیٹھیں گے' آپؐ سے پوچھا جائے گا تو آپ فرمائیں گے کہ جب میری اُمت جہنم میں ہے تو میں جنت میں کیسے جا سکتا ہوں۔ اب سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایسا محبوب جنت میں نہ جائے تو اللہ میاں اُٹھ کر گھر کیسے جا سکتے ہیں۔ تو وہاں کہا جائے گا کہ ہاں صاحب! نکال دیجیے اس میں سے اتنے اور انہیں جنت میں بھیج دیجیے۔ نکالے گئے کہ نہیں صاحب! اب بھی راضی نہیں ہوتے۔ پھر اور نکالے گئے پھر اور نکالے گئے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا نقشہ بن رہا ہے۔ تا آنکہ یہ سب کے سب وہاں جہنم سے نکال دیے جائیں گے اور اس کے بعد پھر حضورؐ جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ جس قوم کے دل میں یہ چیز ایمان کی حیثیت اختیار کر جائے اتنا گہرا عقیدہ شفاعت کا ''او ہناں دی مت ماری ہوئی ہیگی اے پئی ایویں ای چنگے کم کر دے پھرن ❶'' سیدھی سی بات ہے جس شخص کا بھی اتنا بڑا کوئی سفارشی ہو' اتنا یقین ہو کہ اس کی بات کو حکم ٹالے ہی نہیں' تو وہ قانون شکنی کیوں نہ کرے۔ اگر اس نے قانون شکنی کرنی نہیں تھی تو اس کو تو کسی سفارشی کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اتنا بڑا سفارشی ہونے کے بعد بھی وہ اگر اس سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھاتا تو وہ بڑا ہی احمق ہے۔ اس کو تو جی بھر کے قانون شکنی کرنی چاہیے۔

---

❶ پھر کیا ان کی عقل پہ پتھر پڑ گئے ہیں جو وہ اچھے کام کریں۔

ہمارے ہاں پائی جانے والی قانون شکنی کی وجہ جواز:

آپ کو پتہ ہے کہ اس قوم کو یہ جراتیں' قانون شکنی کی جو اتنی ہوئی یہ کیوں ہوئی ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں کہ اعتقادات کے Unconsciouselly (غیر شعوری) نتائج کیا ہوتے ہیں قوموں کی زندگی کے اُوپر؟ غیر شعوری طور پر قوم مجرم ہو جاتی ہے۔ اگر خدا جیسے ذی اقتدار کے ہاں بھی ایک شخص کی جو سفارش ہے جہنم میں پہنچے ہوئے کو بغیر کسی اور میرٹ کے نکال کے جنت میں پہنچا سکتی ہے تو

یہاں کے حاکم شے کیا ہیں؟ ان تک تو بڑی آسانی سے سفارشی پہنچانے والے لیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں شفاعت کے عقیدے کی اہمیت:

اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کچھ ہو کر عدالت فیصلہ بھی دے دے، جیل میں بھی بھجوا دے، تو بھی وہاں سے نکلوا دیں گے۔ یہ ہے سفارش۔ عزیزانِ من! یہ عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ اگر کسی کو آج بدترین گالی دینی ہوتی ہے تو اسے یہ کہا جاتا ہے یا وہ اپنے متعلق اگر اپنے آپ پہ لعنت برسانا چاہتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو قیامت میں، میں رسول اللہ کی شفاعت سے محروم ہو جاؤں۔ یعنی آپ دیکھیے کہ اس کی عقیدے کی گہرائی کتنی ہے۔ ہمارے ہاں حضورؐ کا ایک لقب شفیع المذنبی ہے اور پھر وہ ایسا کچھ پیار محبت کا ہے۔ ہر مجرم کے نزدیک جو سفارش کرنے والا ہے اس سے زیادہ عزیز اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ چھڑا کر لے آنے والا ہے اور اس پہ پھر جو شاعری چلتی ہے، یہ تو پوچھو نہیں۔ شاعروں کو تو اللہ دے، ہمارے ہاں اس قسم کی چیزیں شاعری میں موجود ہیں۔ ہر وہ چیز جو قانون سے دوسری طرف لے جانے والی ہے وہ شاعری ہوتی ہے۔ یاد رکھیے! شاعری یا Poetry وہ نہیں ہے جس میں الفاظ کو منظوم کر دیا جاتا ہے۔ کولرج نے یہ چیز کہی ہے وہ شخص بڑی عجیب کہہ گیا ہے وہ کہتا ہے کہ Poetry is Anti thesis of Science۔ کیا بات ہے صاحب!

قرآن حکیم نے زندگی کے اصول دیے ہیں اس نے شاعری نہیں کی:

قرآن نے تو یہ کہا تھا کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں ہوتی، ہم اسے شاعری نہیں سکھا رہے۔ کیا مطلب اس کا یہ کہ ہم اسے قانون دے رہے ہیں۔ شاعری جذبات کے پیچھے چلتی ہے۔ فی کل وادی یھیمون (26:225) ہر وادی کی طرف منہ اُٹھائے چلا جا رہا ہے۔ عربی زبان میں ھام اس اُونٹ کو کہتے ہیں جس کو جھوٹی پیاس ستائے، جگہ جگہ پھرتا رہے اس کی پیاس بجھے ہی نہیں۔ جھوٹی جو ہوئی۔ ''او سارا عشق و عاشقی اچ ساریاں جنیاں او ہناں دیاں گلاں ہوندیاں فرضی ہوندیاں نیں [1]'' جھوٹی پیاس اتنا اسے ستائے کہ ہر وادی پہ نکلے۔ نہ کوئی نصب العین متعین نہ سچی پیاس کہ پانی ملے تو بجھ جائے۔ جھوٹی پیاس زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے فی کل وادی یھیمون (26:225) شاعری، جذبات، قانون کے خلاف ہر چیز کا آنا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب بات ہمارے ہاں شاعری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو پھر وہ کھیل کھیلتے ہیں کہ تو بہ بھلی:

---

[1] عشق و مستی میں ان کی ساری باتیں فرضی ہوتی ہیں۔

کرے کوئی کیا کہ دیکھ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت
رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے، ترے غضب سے چھپا چھپا کر

اور آگے شعر ہے پہلے دو الفاظ بھولتا ہوں:

یہ جنس اثیاں عجیب شے ہے
کوئی اسے ڈھونڈتا پھرے ہے زرِ شفاعت دکھا دکھا کر

''اے لے اے سودا کون ڈیا ہو یا اے [1] '' کوئی اسے ڈھونڈتا پھرے ہے' زرِ شفاعت دکھا دکھا کر۔ پھر یہ سارا قصہ چلتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان معتقدات کی حامل جو قوم بنتی ہے' پھر ہم روتے ہیں کہ ساری قوم قانون شکن ہوگئی۔ یہ عقائد جس قوم کی گھٹی میں ڈال دیے جائیں وہ قانون شکن نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔

---

[1] یہ لو! یہ سودا کر رہا ہے۔

لفظ شفاعت کا قرآنی مفہوم بطورِ شہادت کے استعمال ہوا ہے:

شفاعت کا لفظ موجود ہے یہ قرآن میں آتا ہے تو بات کیا ہے؟ بنیادی طور پہ اس لفظ کے معنی ہوتے ہیں وہ جو دو ساتھی ہوتے ہیں ان کا ایک کے ساتھ دوسرے کا کھڑے ہو جانا' وتر کے مقابلے میں شفع کا لفظ قرآن کے اندر خود آیا۔ وترOdd کو کہتے ہیں شفع Even کو کہتے ہیں۔ مثلاً دو چار چھ آٹھ اور Odd ایک تین پانچ سات۔ یہ حقِ شفع جو ہم کہتے ہیں یہ ہمارے ہاں وہ جو ساتھ لگتا ہے جس کی زمین جس کا مکان' اس کا ایک حق ہوتا ہے وہ جسے ہم شفع کہتے ہیں' یہ وہی لفظ ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا' کسی کی حمایت کرنا' کسی کا ساتھی بن جانا۔ اسی کو تعاون کہتے ہیں یعنی کسی کی مدد کرنا۔ مدد کرنے والا اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ محاورتاً ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ برے وقت میں کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا۔ ساتھ کھڑے ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس Cause میں اس کا ہم نوا ہونا' اس سے متفق ہونا اور جہاں تک ہو سکے اس سے معاونت کرنا۔ یہ جو چیز تعاون ہے وہ تو قرآنِ کریم نے فرض قرار دیا ہے کہا ہے کہ **تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان** (5:2) تعاون کا صیغہ ہے ''ایک دوسرے کی مدد کرنا'' مدد کرو ایک دوسرے کی نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں۔ بالکل مدد نہ کرو کسی ایک دوسرے کی گناہ اور معصیت کے کاموں میں۔ یہ کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا' کسی کے ساتھ تعاون کرنا' اس کی مدد کرنا ہے اور یہی وہ چیز ہے کہ تعاون کرو بر اور تقویٰ میں' مت تعاون کرو اثم و عداون میں۔ اس کے لیے دیکھیے شفاعت کا لفظ آیا ہے۔ **من یشفع شفاعۃً حسنۃً یکن لہ نصیب منھا و من شفع شفاعۃً سیئۃً یکن لہ کفل منھا** (4:85) جو اچھے کاموں میں کسی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے' اس کے اچھے کام کا کچھ اجر اس کو بھی مل جاتا ہے۔ جو برے کام میں کسی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے' اس کے برے کام کا جو انجام ہے' اس میں یہ بھی شریک ہو جاتا ہے۔ یہاں جو **شفاعت**

حسنة اور شفاعت سیئة ہے وہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔ وہاں بر وتقویٰ اور اثم عدوان آیا تھا' بعینہ وہی چیز ہے جو یہاں کہی ہے اور ٹھیک ہے اچھے کام میں جو کسی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے' اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ قانون شکنی میں جو کسی کا ساتھ دے دیتا ہے اس کے برے نتائج میں وہ بھی آ جاتا ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں جن معنوں میں ہم سفارش کرنا کہتے ہیں' یہ ان معنوں کی بات نہیں ہے۔ یہ کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا' کسی کی مدد کرنا ہے۔

قرآن حکیم اپنے ہاں میدان حشر کے منظر کو سمجھانے کے انداز میں پیش کرتا ہے:

ان معنوں میں اگر آپ دیکھیے تو قرآنِ کریم قیامت کا نقشہ بھی سمجھانے کے لیے ایسا ہی کچھ سامنے لاتا ہے جیسے ہمارے ہاں عدالت ہوتی ہے۔ کیونکہ بات تو اس نے عدل کی کرنی ہے تو اسے سمجھانے کے لیے بجائے اس کے کہ وہ Abstract (غیر محسوس) طریقوں کے اُوپر بات سمجھائے' وہ Concrete (محسوس) بات سمجھاتا ہے محسوسات سے بات سمجھاتا ہے۔ عدالت ہے' حاکم بیٹھا ہے' اس کے بعد یہ کہا ہے کہ مجرم کو لایا جائے گا' بعض اوقات تو گھسیٹ کے ایک اس کو آگے سے پکڑ کے کھینچنے والا ہوگا' ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا۔ وہاں لا کر کھڑا کیا جائے گا' پھر یہ ہوگا کہ شہادت دینے والے آئیں گے۔ فردِ جرم قائم کی جائے گی' اس سے صفائی پوچھی جائے گی' شہادت دینے والے شہادت دیں گے' صفائی کا موقع دیا جائے۔ یہ تمام چیزیں سمجھانے کے لیے ہیں' یہ کہنے کے لیے کہ وہاں دھاندلی سے بات نہیں ہو رہی کہ

اوتھے کی پرواہ اے راکب اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہار نوں

یہ بتانے کے لیے کہ وہاں یہ نہیں ہو رہا' یہ صحیح عدالت کا ایک نقشہ ہے۔ مجرم کو صفائی کا موقع دیا جا رہا ہے' وہاں شاہد گواہ ساتھ بلائے جا رہے ہیں' فرد جرم قائم ہو رہی ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے کہ ہر چیز عدل کے تقاضے کے مطابق ہوگی۔ بات سمجھانے کی ہے ورنہ وہ تو دوسری جگہ خود واضح کر دیتا ہے کہ تمہارا جج تمہارا اپنا نفس ہوگا تمہارے خلاف شہادت تمہارے ہاتھ پاؤں دے رہے ہوں گے۔ تم سے تو وہاں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی' تمہارا اعمال نامہ آج گردن میں لپٹا ہوا ہے' اس وقت کھول دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ **اقراء کتٰبک** (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ۔ **کفٰی بنفسک یومئذ حسیب** (17:14) آج تو آپ خود اپنا آڈیٹر مقرر ہو گیا ہوا ہے' اپنا آڈٹ (Audit) آپ کر۔ یعنی بات سمجھانے کے لیے اس نے ایک نقشہ قائم کیا ہے۔ یہ جو اس نقشے میں کسی کی طرف سے کسی گواہ کا کھڑے ہونا ہے' اسے شفاعت کہا جاتا ہے۔ کسی کے حق میں سچی گواہی دینا' وہاں ساتھ کھڑے ہونے کے معنی ہوتا ہے۔ وہاں

مجرم کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے گواہی دینے والا۔

قران کریم کی پیش کردہ تعلیم کے اندر اپنی سوچ کا دخل شرک عظیم ہے:

عزیزانِ من! یہ چیز میں خود نہیں کہہ رہا قرآن ہاتھ میں لے کر خود کچھ کہنا تو سب سے بڑا شرک ہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ جن چیزوں کی بظاہر میں آپ کے سامنے حوالے پیش نہیں کرتا' اس کے لیے بھی قرآنِ کریم کا حوالہ میرے پاس ہوتا ہے۔ میرے Explanations میری تشریحات اپنی نہیں ہوتیں۔ وہ مثالیں استعارے تو اپنے ہو سکتے ہیں' سندیں اس کے لیے قرآن ہی کی ہوتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ یہ (13:86) بڑی اہم آیت ہے اس کا حوالہ اچھی طرح سے نوٹ کیجیے۔ کہا ہے کہ **ولا یملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ** (43:86) یہ لوگ خدا کے علاوہ جن کو اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں تو ان میں سے کسی کی مدد ان کے کام نہیں آئے گی۔ آگے سنیے کہتا ہے کہ **الا من شھد بالحق** (43:86) بجز اس کے کہ جو سچی شہادت دے۔ یہ قرآن خود واضح کر رہا ہے کہ شفاعت کے معنی کیا ہیں۔ **وھم یعلمون** (43:86) بات جانتا ہو۔ ایک تو وہ گواہ ہوتے ہیں جو ہمارے ہاں عدالتوں میں دو روپے' چار روپے' چھ روپے میں ملتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **وھم یعلمون** بات کو جانتا ہو **شھد بالحق** (43:86) اس کے لیے سچی گواہی دے۔ یہ ہے جسے شفاعت کہا جاتا ہے اور یہ بڑی مدد ہوتی ہے۔ یہ سچی گواہی دینا ہے جب کہ اس کے خلاف جرم بنایا گیا ہو الزام دھرا گیا ہو' سچی گواہی دینے والا بڑا امدادگار ہوتا ہے' وہ اس کے ساتھ وہاں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ لفظ شفاعت کے کیا معنی ہو گئے۔ وہ اس کے ساتھ آ کے کھڑا ہو **شھد بالحق** بات جانتا ہو اور آگے پھر سچی گواہی دے۔ کہا کہ یہ ہے وہ چیز جو کسی کو فائدے دے دے گی ورنہ **ولا یملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ** (43:86) یہ شہادت کے معنی میں ہے۔

روزِ قیامت ہر رسول سے اس کی قوم کے متعلق شہادت طلب کی جائے گی:

عزیزانِ من! یہ چیز ہے کہ قرآنِ کریم میں نبی کریمؐ کے متعلق شفیع المذنبین کا لفظ کہیں نہیں آیا' آ ہی نہیں سکتا۔ قرآن عجیب بات کرتا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس معنی کے اندر اس کو لیتے لیکن اس میں چونکہ اشتباہ کی گنجائش تھی اس لیے قرآن نے یہ لفظ بھی استعمال نہیں کیا' حضورؐ کے متعلق گواہ کا لفظ استعمال کیا ہے کہا ہے کہ **ویوم نبعث فی کل اُمۃٍ شھیدًا من انفسھم** (16:89) ہر قوم میں اس دن انہی میں سے ان کے خلاف ایک گواہ کھڑا کیا جائے گا۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اس دن ہر رسول سے پوچھا جائے گا کہ تم نے بات پہنچائی تھی؟ وہ کہیں گے کہ ہاں پہنچائی تھی۔ کہا جائے گا کہ پھر انہوں نے کس قسم کا جواب دیا تھا؟ یہ ہے جسے رسول کی شہادت کہا گیا ہے۔

جس دن ہر اُمت میں سے ان کے خلاف یہ کہنے کے لیے ایک گواہ کھڑا کیا جائے گا کہ ہم نے یہ باتیں ان تک پہنچا دی تھیں اور انہوں نے اس کے باوجود اس کے خلاف کیا۔ ہر اُمت میں سے یہ شہید ہوگا۔ **وجئنابک شھیدًا علیٰ ھؤلآء** (16:89) اور اے رسول! تمہیں ان سب کے اُوپر سب سے بڑا شہید بنا کر گواہ بنا کر کھڑا کیا جائے گا۔ اس لیے کہ حضورؐ ان سب سے آخر میں تشریف لائے' پوری نوعِ انسانی کے لیے آپ کی رسالت' قیامت تک کے لیے حضورؐ کی پیامبری ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہاں تمام اقوام ہوں گی ہر قوم میں سے ایک رسول ہوگا۔ اس زمانے میں ابھی رسالت قومی ہوا کرتی تھی Means of Communications (ذرائع مواصلات) عام نہیں ہوتے تھے۔ وہاں تو کہا ہے کہ ہر قوم' ہر بستی یا ہر گروہ کے خلاف ان میں سے ایک شہید (گواہ) اور رسول اللہؐ ان سب پر گواہ ہوں گے۔ شہید کا لفظ کئی مقامات میں آیا ہے۔ **وکذٰلک جعلنکم امۃً وسطاً لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدًا** (2:143) تمہیں ہم نے اس لیے ایسی قوم بنایا کہ جو ہر قوم سے Equal Distance (مساوی فاصلے) پر تا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے خلاف گواہی دے سکو۔

نبی اکرمؐ کی اُمت کا فریضہ جو اسے ادا کرنا تھا:

بڑا عظیم منصب تھا قرآن کا حامل اس قوم کا۔ اس کا کام تھا کہ ختم نبوتؐ کے بعد اس پیغام کو تمام اقوامِ عالم کو پہنچاتی اور پھر ان کے خلاف یہ گواہی دینے کے لیے کھڑی ہوتی کہ ہم نے یہ پیغام پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے اس کے باوجود باوجود اس کی معصیت کی ہے۔ رسالت کا یہ فریضہ اس قوم نے ادا کرنا تھا لیکن اس قوم کو بھی ویسے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کہا ہے کہ **ویکون الرسول علیکم شھیدًا** (2:143) تمہارا رسول تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ سمجھ لیا' جب وہ کہے گا کہ اے رب! یہ وہ قوم ہے جس نے **یتخذون القرآن مھجورًا** (25:30) اس نے اس قرآن کو باندھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ نبی کو شہید' شاہد بھی کہا ہے **شاھدًا ومبشرًا ونذیرًا** (25:30) اس کے معنی یہ شہادت دینے والا کے ہیں۔ شہادت دینے والا قرآن نے کہا ہے' شفیع المذنبین کہیں نہیں کہا۔ ٹھیک ہے رسول ہمارے خلاف شہادت دے گا۔ ہم جو ایمان لائے ہیں حضورؐ کی رسالت پہ' اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تک وہ رسالت پہنچی ہے۔ قیامت تک کے لیے یہ جو رسالت محمدؐ ہے' اس طرح سے جن تک پہنچتی ہے۔ اس کے معنی گواہی کے ہیں' اس کے معنی شہادت کے ہیں۔

قرآن نے ہر جگہ شفاعت کو سفارش کے معنی میں پیش کرنے کی تردید کی ہے:

میں نے گزارش کیا ہے کہ قرآن نے وہ عدالت کا نقشہ لا کر اس فریفرنس (حوالے) میں' اس Context میں یہ چیزیں کہی ہیں کہ شہادت بالحق ہو' جو ابھی میں نے عرض کیا ہے یہاں تک تو جو ساتھ کھڑے ہونا ہے' یہ قرآن میں ہے اور شفاعت کے معنی یہی ہیں۔

جہاں شفاعت کے معنی سفارش کے آئے تو سنیے! برادرانِ عزیز! قرآن میں ہر جگہ اس کی تردید کی ہے‘ اسے قرآن نے کفار کا مسلک بتایا ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ سفارش کر کے ان کو چھڑا لیں گے اور قرآن ہر جگہ اس کی تردید کرتا ہے اور ہم اپنے ہاں نہ صرف وہی عقیدہ رکھتے ہیں‘ بلکہ ان سے زیادہ شدید طور پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے یہ عقیدہ اتنا جاگزیں ہو گیا ہے کہ اس عقیدے کے خلاف اگر کوئی بات کہی جائے تو شفاعت محمدؐ سے محروم‘ اس کو انتہائی بدبخت کہا جاتا ہے‘ اس کے خلاف فتوے لگتے ہیں کہ شفاعت کا منکر ہے۔ میں نے حالانکہ بڑی کوشش کی ہے کہ قرآن کی آیات سے بات واضح کروں‘ اس کے باوجود میں ڈرتا ہوں کئی پیشانیاں مجھے نظر آ رہی ہیں کہ اس وقت ان کے چہروں پر جفر کے نقشے بن رہے ہیں کہ دیکھیے اس شخص کو کہ یہ شفاعت کا منکر ہے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں میں نے جیسا عرض کیا ہے مجرم قوم میں یہ چیزیں بڑی اہم ہوتی ہیں۔ جرم کرنے والوں کو کہہ دیجیے کہ تمہارا کوئی سفارشی نہیں ہو گا‘ اب دیکھیے اس کے خلاف وہ کہتے کیا ہیں؟

قرآن حکیم انسانی جذبات کے تابع زندگی کے اصول پیش نہیں کرتا:

لیکن عزیزانِ من! یہ قرآن ہے‘ وہ نہ میرے جذبات کا پابند ہے‘ نہ آپ کے جذبات کے تابع چلتا ہے۔ یہ حق ہے‘ حق تو کسی کے جذبات کے تابع نہیں چلتا۔ لاکھ عقیدہ بنا لیجیے‘ ہزار نظریہ قائم کر لیجیے کہ وہاں سارے گناہ گار جہنم میں سے حضورؐ کی شفاعت کی بنا پہ جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ آپ کے اس عقیدے کی بنا پر قرآن کا قانونِ مکافاتِ عمل تو نہیں بدل جاتا۔ جہاں جہاں قرآن میں یہ آیا ہے کہ خدا کے ہاں **الذی یشفع عندہ الا باذنہ** (2:225) یاد رکھیے! وہاں معنی سفارش کرنا نہیں ہے‘ شہادت دینا ہے‘ مدد کرنا ہے‘ ساتھ کھڑے ہونا ہے۔ سفارش کرنا اس کا ترجمہ قطعاً نہ کیجیے۔ دین کی بنیادوں سے عمارت گر جائے گی اگر اس میں سفارش کا یا رشوت کا تصور آ گیا۔ رشوت میں ہر مزار پہ نذرانے ہیں‘ خدا کے ہاں کہ اس کے ساتھ کہ یہ ہو جائے گا ''چار دیگاں پکا کے دئیں گا'' ''اینیں دی تھیلی تے حاکم دے بھیج دا گا‘ تے چار دیگاں تینوں دیاں [1] گا'' عزیزانِ من! قانون کا تصور ذہن میں لے آیئے سارا نقشہ صاف ہو جاتا ہے۔ وہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں چلتی‘ یہ ساری جذباتی چیزیں ہیں‘ اس سے ہمارے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ یعنی خدا کے ہاں یہ جو دے رہے ہیں‘ آپ پہنچتی نہیں ہیں‘ ہم اپنے ذہن میں اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں اور مجرم یا ملزم جب تک یہ ہوتا ہے اس قسم کی کیا کیا چیزیں نہیں کرتا اور ان چیزوں سے کیا کیا تسلیاں اپنے آپ کو نہیں دیتا ''اوہدے کولوں وی کھا لیا ہو یا ہیگا پیسے وی پہنچا دتے ہوئے ہیگے نیں۔ اوا گلا کیندا اے‘ اوئے! اے وی کر لینا‘ ٹھیک گل ہیگی اے ہجے وقت ہیگا و غ‘ کر لیندے ہیں جی [2]!'' تسلیاں دیے جاتا ہے اپنے آپ کو۔

---

❶ یہ چار دیگیں پکا کر دیں گے۔ اتنے کی تھیلی حاکم کے ہاں بھیج دوں گا اور چار دیگیں تمہیں دیں گے۔
اس سے بھی کہلوا لیا ہے' ابھی پہنچا دیئے ہیں۔ وہ اگلا کہتا ہے کہ ارے بھئی! یہ بھی کر لینا۔ بات صحیح ہے' ابھی وقت بھی ہے۔ (کتنا ہے کہ ہاں بھی) کر لیں گے۔

جس نظام میں قانون خدا و نبی کا اتباع نہ ہو تو وہاں پھر ہر چیز ممکن ہوتی ہے:

باطل کے نظام میں یہ چیزیں کارگر بھی ہوتی ہیں یعنی جس نظام میں خدا نہیں ہوتا' وہاں یہ چیزیں کارگر ہوتی ہیں۔ جس میں خدا آ جاتا ہے' وہاں یہ کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی۔ ان عقائد کے بعد کہا کہ **والکافرون هم الظٰلمون**(2:254) ان عقائد کے رکھنے والے کافر ہیں۔ ظالم کہا کیا بات کہہ دی! کہ جس چیز کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے وہاں نہ رکھنا' اسے ہی تو ظلم کہتے ہیں۔ دیکھا! عدل کو اپنے مقام پہ رکھیے' قانون کو اپنے مقام پہ رکھیے' مجرم کو اس کے مقام پہ رکھیے' اس کے بعد پھر شریف اپنے مقام پہ رہ جاتا ہے۔ جب آپ مجرموں کو شرفا کے مقام پہ رکھتے ہیں' شریف کا ٹھکانہ اس معاشرے میں صحیح نہیں رہتا۔ یہی ظلم ہے کہ اس معاشرے میں مجرم دندناتا پھرے' شریف سہا ہو رہے۔ **والکافرون هم الظالمون**_(2:254) وہاں کوئی چیز اپنے ٹھکانے پہ نہیں رہتی۔ یہ عقاید رکھ لیجیے۔ دیکھا! قرآن کہاں کیا بات لاتا ہے! اسے کافر کہا ہے' اسے ظالم کہا ہے۔ خدا جب درمیان میں آتا ہے تو کہتا ہے کہ **وامتازوا الیوم ایها المجرمون**(36:59) اس معاشرے کے اندر مجرم الگ کر کے رکھ دیے جائیں گے۔ **یعرف المجرمون بسیماهم**(55:41) اس طرح الگ کر دیے جائیں گے (36:59) پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے' مجرم ہے شریفوں کی محفل میں اس کا کوئی کام نہیں ہے' اس محلے میں اس کو ہی نہیں رہنے دیا جائے گا۔ سوچیے تو سہی جس معاشرے سے مجرموں کو اس طرح سے چن کر الگ نکال کر ان کی اصلاح کی جائے تو باقی معاشرہ کس طرح امن کی نیند سوئے گا اور ظلم یہ ہے کہ انہیں کسی قسم کا ڈر اور خوف نہ ہو اور یہ شریف سہمے ہوئے پھریں' یہی ظلم ہے نا جس چیز کو جس مقام پہ رہنا چاہیے تھا' وہ نہ رہے **والکافرون هم الظالمون**(2:254) میں نے بھی کہا ہے کہ جب معاشرے میں خدا آ جاتا ہے پھر یہ نقشہ نہیں رہتا۔ قرآن کا اعجاز ہے' یہاں کہا اور کہا خدا بھی کس قسم کا ہے؟ یہ تمہارے اپنے ذہنوں کا تراشیدہ خدا نہیں ہے۔ جسے **اللہ لا الٰه الا هو** (2:225) یہ عام طور پہ آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔

خدا کے حقیقی تصور کے سلسلہ میں ایت الکرسی کی اہمیت اور ہمارے ہاں اس کا مقام:

عزیزانِ من! کچھ چیزیں واقعتاً مجھے کہنی پڑتی ہیں' دنیا کے تمام مذاہب کی ساری مقدس کتابیں نظر سے گزری ہیں' چین اور جاپان تک کی بھی یعنی جن کے ترجمے ہو چکے تھے۔ خدا کے متعلق یہ تصور جو ان چار آیتوں کے اندر اس نے دیا ہے' بڑی سے بڑی ان کے ہاں کی ضخیم کتاب میں بھی نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں بھی جو آیت الکرسی ہے' بڑی اہم گنی جاتی ہے لیکن اب تو اس کی اہمیت اتنی ہی ہے کہ اس کا تعویذ

لکھا جاتا ہے' اس کا وظیفہ کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی اس کا چلہ کیا ہے اور بنسیے اس میرے مقام پہ۔ اللہ کا شکر ہے کہ عہد جاہلیت سے آگے نکل آیا ہوا ہوں یہ صرف اس کا فضل ہے۔ آیت الکرسی بڑی ہے لیکن اسی کام کے لیے رہ گئی ہوئی ہے۔ یا آگے چل کر تفسیروں میں جائیے تو پھر کرسی کی پیمائش کی جاتی ہے' یہ خدا کی کرسی ہے۔ عزیزانِ من! اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بڑی اہم آیت ہے اس لیے کہ اس میں خدا کا تصور جس قدر پاکیزہ نکھرا ہوا پایا جاتا ہے' کہیں اور آپ کو نہیں ملے گا۔ کہا ہے کہ **الله لا اله الا هو** (2:255) اللہ ہے تو یہ بھی الا الہ ہی ہے لیکن اس نے تو اس کے اندر ایک شخصیت پیدا کی۔ **لا الـٰــه الا هـــو** (2:253) کوئی الہ نہیں اس کائنات کے اندر سوائے اس کے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے۔ الہ کے معنی ہیں: صاحب اقتدار' صاحب اختیار' قانون کا مالک۔ کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں اس کائنات کے اندر سوائے اس کے۔ اب اگر اتنی سی بات ہو کہ کوئی نہیں تو یہ تو انکار ہے' یہ تو لا ہے' یہ تو تخریب ہے۔ اگر کسی مقام پہ کوئی صاحب اختیار نہ ہو تو پھر جو اس کے اندر انارکی پھیلتی ہے وہ تو ہمیں پتہ ہے اور اگر ساری کائنات کے اندر الہ ہی کوئی نہ ہو تو کیا ہوگا؟ آپ نے دیکھا کہ وہ جو Materialistic Concept of life (مادی نظریہ زندگی) ہے کہ جس میں پیچھے کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں مانی جاتی کتنی بڑی انارکی پھیلتی ہے۔ لا الہ الا ھو۔ اب الا ھو نے' آپ نے دیکھا' کس طرح سے اس سارے تصور کو باطل کر کے' ایک صاحب اقتدار کو تسلیم کیا اور ایک صاحب اقتدار کے تصور نے کس طرح ہر دوسرے صاحب اقتدار کی نفی کر دی۔ عزیزانِ من! قرآنی نظامِ سیاست کی رو سے بھی اسلامی مملکت کے اندر صاحب اقتدار کوئی نہیں ہوتا۔ یہ نظام ہوتا ہے جس میں حکومت قرآن کے قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے' اس کا اپنا اقتدار کوئی نہیں ہوتا اور جو نافذ کرنے والا ہے' وہ سب سے پہلے کہتا ہے کہ **انا اول المسلمین**' میں سب سے پہلے اس کے سامنے جھکتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا' پھر دہرا دوں' یہ بڑی عظیم بات ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے' اس کے اختیار اور ارادے میں کوئی پابندی نہیں ہے' مطلق اسی Infinite کو کہتے ہیں' کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس کے اختیار و ارادے اور قدرت اور اقتدار پہ پابندی ہی کوئی نہ ہو' آپ سمجھتے ہیں کہ وہ پھر کیا ہوا؟ اور وہ خدا یہ کہتا ہے **کتب علـٰی نفسه** (6:12) ہم نے اپنے اُوپر یہ پابندی عائد کی اور ان پابندیوں کے بعد کہتا ہے کہ **ولن تجد لسنة الله تبديلاً** (33:6) تم ان میں کسی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ یا اللہ! اتنی بڑی لامحدود قوتوں کا مالک اپنے اُوپر پابندی عائد کرتا ہے۔ مجھے تو یہ اختیار ہے' انسان کو تو یہ اختیار ہے' آج پابندی عائد کرے' کل توڑ دے' قدم قدم پہ ہم توڑتے ہیں۔ اپنے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ ہم پھر اس کو کبھی نہیں توڑتے اور اسلامی نظام کے اندر جو ان قوانین کے نافذ کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے جسے ہم ذی اقتدار کہتے ہیں اس کی کیفیت بھی یہ ہونی چاہیے کہ بڑے سے بڑے اقتدار کے ساتھ اپنے اُوپر جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کو کبھی نہ توڑے۔

---

❶ اللہ۔ال الٰہ

قانون کی پاسداری سے ہی انسان کی شخصیت کا مقام متعین ہوتا ہے:

یہ پابندیاں بھی خدا کا قانون عائد کرتا ہے۔ اقتدار جتنا بڑھے گا' اتنی پابندیاں آتی چلی جائیں گی اور پھر پابندی توڑنے نہیں' اسی کو Law (قانون) کہتے ہیں۔ اللہ لا الہ الا ھو (2:55) الہ کوئی نہیں' اقتدار والا کوئی نہیں۔ قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی خود پہلے اپنے اوپر وارد کرے۔ نیچے والے تو شاید پھر بھی کبھی توڑ دیں یہ اُوپر والا ان کو کبھی نہ توڑے۔ انسانوں میں سے ہمارے ہاں اوپر والا رسول کا تصور ہے' اس کے متعلق ہمارا یہ نظریہ ہے اور یہ واقع ہے کہ جو رسول ہے' اس سے معصیت سرزد نہیں ہوتی' وہ کبھی بالارادہ قانون شکنی نہیں کرتا۔ اس سے اُوپر پھر خدا ہو جاتا ہے وہ بلا ارادہ بھی کبھی نہیں کرتا۔ اسی طرح سے نیچے اُترتے چلے آیئے آپ کے ہاں تو مقامات کا تعین اس نسبت سے ہوگا کہ یہ ان قوانین کی پابندی کس حد تک کرتا ہے کہا ہے کہ **ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم** (49:13) جو سب سے زیادہ قانون کی پابندی کرنے والا ہے' وہ سب سے زیادہ صاحب عزت ہے۔

الحی القیوم کی وہ ہستی کہ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا لیکن ہر شے کا خالق:

کہا ہے کہ **اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم** (2:255) اس میں حی کا لفظ ہے حی وہ ہے جو خود زندہ' جسے کسی نے زندگی نہ دی ہو اور جو ہر ایک کو زندگی دینے کا موجب ہو۔ لائف کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے Life Originate کیسے ہوتی ہے؟ بڑا مسئلہ ہے۔ یہ تو سوال نہیں۔ میٹریل ورلڈ کے اندر تو قرآن نے جو قانونِ طبعی ہے اس کو تو بیان کر دیا ہے کہ **جعلنا من المآء کل شئ حی** (21:30) زندگی پانی سے نمود میں آتی ہے۔ یہ دی ہوئی کس کی ہوتی ہے؟ پانی اسے پیدا نہیں کرتا۔ **جعلنا** قرآن نے کہا ہے' ہم نے ہر زندہ شے کو پانی کے ذریعے سے زندہ کیا ہم نے الحی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے طبعی قوانین (Physical Laws) سے ایک ہستی کو وہ لا کر کھڑا کرتا ہے۔ قانون از خود تو نہیں وجود میں آ جایا کرتا۔ الحی زندہ اور جو کسی کا زندہ کردہ زندہ نہ ہو' از خود زندہ ہو۔ یہ خدا کے سوا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں' اس لیے اس کے اُوپر ال ہے یعنی الحی ہے۔ حی تو ہم سب ہیں' الحی ایک ہے جسے کسی نے زندہ نہیں کیا اور ہر ایک کی زندگی کا مدار اس پہ ہے۔ وہ القیوم قائم ہے۔ ویسے تو یہ لفظ توازن کے لیے آتا ہے' کھڑے ہونے کے معنی میں' قائم ہونے کے معنی میں Establish ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ ہر شے جو موجود ہے جس کی Existence ہے۔ القیوم وہ ہے جو اپنے قائم ہونے میں کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر شے اپنے قیام کے لیے اس کی محتاج ہو اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پہلے قیوم ہی صیغہ واحد کا ہے پھر ال اس کے اوپر ہے یعنی زندہ اور زندگی بخش' از خود قائم اور ہر شے کو قیام عطا کرنے والا۔ **لا الٰہ الا ھو** (2:255) ایسا صاحب اقتدار کہ اس کے علاوہ

کوئی اور صاحب اقتدار نہیں۔

کائنات میں کرۂ ارض کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے کی مانند ہے:

آپ دیکھیے عزیزانِ من! خدا کا تصور کیا قائم ہو رہا ہے؟ جو میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) اتنے بڑے کارگہ کائنات کا چلانے والا کہ جس میں یہ زمین اتنی بھی حیثیت نہیں رکھتی کہ جتنی سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت ہو' یہ اس حسن نظم و نسق سے اس کو چلانے والا ہے کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ نیند تو ایک طرف' اسے اُونگھ بھی کبھی نہیں آتی۔ انسانوں نے جو خدا کے کلام میں تحریف کی' تورات بنی' اس میں انسان کو یہ کہنا پڑا کہ چھ دن میں خدا نے کائنات بنائی' تھک گی اور پھر ساتویں دن سو گیا'' آ جیہڑی اتوار دی چھٹی اوندی اے او ایہوئی اے' بات تو یونہی ہے لیکن غالب (1869-1797) کے شوخ الفاظ میں ہے۔ غالب کے وہ جو رفیق حیات تھے انہوں نے آ کر حسن کائنات کے نظم و نسق پہ ایک بڑا لمبا چوڑا لیکچر دیا کہ دیکھو یہ سلسلہ کیسے چل رہا ہے کس خوبی سے چل رہا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب بڑی جاذبیت سے سنتے رہے۔ کہنے لگے کہ بالکل ٹھیک ہے جی چل رہا ہے' چلنا چاہیئے' چل سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مرزا صاحب! آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ کہنے لگے اس لیے کہ اس خدا نے شادی نہیں' نہ کرائی۔

کائنات کے متعلق تورات کا بیان اور ہندوؤں کا تصور:

خدا کا کلام جسے ہم نے تورات کہا ہے وہ محرف ہے۔ اس میں یہ ہے کہ چھ دن سلسلہ کائنات کی تخلیق کی ساتویں دن تھک کر سو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) ہندوؤں کے ہاں یہ ساری کائنات ایشور کا خواب ہے۔ یعنی وہ سویا ہی ہوا ہے۔ کہتے ہیں' غنیمت ہے' جب تک وہ سویا ہوا ہے یہ قائم ہے' جس دن آنکھ کھل گئی کائنات کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ بات وہی ہے جو شوخ انداز میں غالب (1869-1897) کہتا ہے:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی' نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

وہ کہتے ہیں جب ایشور کی آنکھ کھل جائے گی' کائنات ختم ہو جائے گی کیونکہ یہ تو اس کا خواب ہے۔ آج ہمارے ہاں بھی ایک تصور ہے کہ خدا نے کائنات کو گھڑی کی طرح بنا دیا' ایک دفعہ اس کو کوک دے دیا ہے' پھر یہ از خود چل رہی ہے' اس میں پھر خدا کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا' پھر وہ آرام سے کہیں سو رہا ہے یا پکنک پہ چلا گیا ہے یا کچھ کر رہا ہے' بہر حال اس گھڑی کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں رہا۔

عزیزانِ من! قرآن سمجھنا ہو تو مذاہب میں فلسفے کی دنیا کے اندر جتنے باطل عقائد پہلے چلے آ رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہوں تو

پھر پتہ چلتا ہے قرآن کہتا ہے کیوں کہا **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) کہا کہ نیند تو ایک طرف' اُسے اونگھ تک نہیں آتی۔ اُونگھ میں بھی تو انسان بے خبر ہو جاتا ہے اور اتنی بڑی مشینری کا جو چلانے والا ہو' اس کو اگر کہیں ایک دفعہ بھی آنکھ جھپکنے کے لیے بھی' اُونگھ آ جائے پوچھو نہیں یہ سلسلہ کہاں چلا جائے۔ روز ٹرک آپ کے ہاں جو ایکسیڈنٹ ہوتا ہے' پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ ڈرائیور کی آنکھ لگ جاتی ہے اور یہ جو اپولو❶ (Apolo) جا رہا ہے اگر اس کے اندر کا جو پائلٹ ہے اس نے کہیں سیکنڈ کے لیے آنکھ بھی جھپک لی تو مشن کا جو کچھ ہو گا وہ آپ کو معلوم ہے اور جو کائنات کا اتنا عظیم اپولو چل رہا ہے' اس کے پیچھے جو فائنل ذی اقتدار ہستی ہے' اگر اس کو کہیں ذرا سی بھی اُونگھ آ جائے تو اس کا کیا ہو۔ خدا بننا اس کو زیب دیتا ہے۔ **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) اور اس خدا کے نام پہ معاشرہ قائم کرنے والے' نظام قائم کرنے والے ان کو قرآن نے **الطآئفین** (6:165) کہا تھا۔ یہ جو طوائف کرآتے ہیں طائف کہتے ہیں یہ جو پولیس رات کو گردش کرتی ہے' چوکیدار جو گردش کرتا ہے پہرہ دیتا ہے' گھومتا ہے۔ وہ چوکیدار نہیں جو ہمارے ہاں پہلے ہوتے تھے۔ آپ کو پتہ ہے وہ چوکیدار کیا کرتے تھے؟ گھومتے رہتے تھے' کہتے رہتے تھے ''اوسوہری دے آتوں کا ہدی لئی رکھیا اے جے اسی جا گدے رہنا اے تے'' وہ چوکیدار نہیں ہیں' وہ **الطآئفین** (6:156) ہیں۔ وہ چوکیدار جو عالم انسانیت سے کہے کہ تم اطمینان کی نیند سونا' ہم جاگتے ہیں تمہارے پہرہ دینے کے لیے۔ اس لیے کہ یہ اس خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے دنیا میں تھے جس کی صفت یہ ہے کہ **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) اس قوم کے اُوپر تو خواب خوری حرام ہونی چاہیے جس نے انسانیت کا پہرہ دینا ہے' جس نے اس نظم و نسق کائنات کو چلانا ہے۔ خدا کی اس صفت کا انعکاس اس میں ہونا چاہیے: **لا تاخذہ سنۃ و لا نوم** (2:255) ہمارے ہاں جس کو جو ڈیوٹی دی گئی ہے' وہ سو جانا تو ایک طرف رہا' اس میں اس کا جو اونگھ جانا بھی ہے' اس کو خدا سے دور لے جائے گا خواہ وہ ہزار نمازیں ہی کیوں نہ پڑھتا رہے۔ آگے کہا ہے کہ **لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض** (2:255) یہ لہ ملکیت کے لیے بھی ہے اور اس میں تو شبہ نہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے' وہ اس کی ملکیت ہے۔ روز آپ کے ہاں اب یہ بحث چلی ہوئی کہ صاحب! ارض پہ انسان کی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی؟ خدا کو ماننے والا' قرآن کے خدا کو ماننے والا کہتا ہے کہ **لہ ما فی السمٰوات و ما فی الارض** (2:255) سوال ہی نہیں یہاں تو ذاتی ملکیت کا۔ بات دوسری طرف چلی گئی۔ ''لہ'' کے دوسرے معنی ہوتے ہیں کائنات میں جو کچھ ہے' اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے' اس کے متعین کردہ کسی کام کے پورا کرنے کے لیے جو کچھ ہے اس کے لیے بھی ''ل'' آتا ہے۔ یہ ''ل'' نافع ہے' یہ فائدے کے لیے ہوتا ہے دوسرا ملکیت کا ہوتا ہے' دونوں ہی معنی ہیں: ملکیت بھی اس کی اور کائنات کی ہر شے اس کے پروگرام کو سرانجام دینے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ **سبح للہ ما فی السمٰوٰت و الانرض** (57:1) سماء ارض اس پروگرام کی تکمیل کے لیے تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

---

❶ یہ جواتوار کو چھٹی ہوتی ہے وہ یہی ہے۔

❷ Any of series of 17 U.S spaoecrafts designed land people on the moon. the first 10 Apollo craft were used to test various aspects of the programme, the first moon landing (Jully 1969) being achiged by Apollo- 11 the pemaining members of the series also made manned moon landings except Apollo 13, which was sayely taborted.

❸ یعنی وہ ساری رات ہمیں کہتا رہتا تھا کہ ''جاگتے رہنا'' ابے او پگلے! اگر ہمیں ہی جاتے رہنا ہے تو تجھے کاہے کے لیے رکھا ہے۔

ہمارے ہاں کے تراجم میں لفظ یشفع کے استعمال کی نوعیت تو عجیب وغریب ہے:

آگے کہا ہے کہ **من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ** (2:255) دیکھیے شفاعت کے لفظ کے لیے یہاں ''یشفع'' آ گیا۔ اب ہمارے ہاں یہاں سے لیتے ہیں صاحب شفاعت کا ترجمہ سفارش کیا یہ آیتیں لیں کہ صاحب! اس کے ہاں اذن کے معنی اجازت لیے۔ وہ پچھلی دفعہ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کو اذن کے معنی میں کیوں اتنی تفصیل سے تشریح سے سمجھا رہا تھا؟ کیا آپ نے سمجھ لیا جو میں نے کہا تھا کہ یہ معنی سمجھ لیجیے بڑے کام آئیں گے۔ اذن کے معنی میں نے قانون بتایا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ **من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ** (2:255) یہ معنی کرتے ہیں کہ کون ہے جو اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے سفارش کرنے والا ہے جو اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر رہا ہو؟ وہ تعلقات اتنے ہوتے ہیں کہ پہلے تو سفارش کرنے جاتا ہے۔ خدا کی اجازت کے بغیر کون سفارش کرتا ہے۔ یعنی وہ پھر جن کو اس نے اجازت دی ہوئی ہوتی ہے وہ سفارش کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ خدا کے ہاں سفارش کرتے ہیں اور پھر سفارش کرنے والوں کو اس نے اجازت نامے ایشو کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ نہیں، عزیزم! قرآن کا یہ تو تصور ہے ہی نہیں بلکہ یہ سارے کے سارے تصورات ہم نے مجرم قوموں سے مستعار لیے ہوئے ہیں۔ کون ہے جو اس کے ہاں اس کے قانون کے خلاف کسی کی کوئی مدد کر سکے۔ یہ ہے اس آیت (2:255) کے اس ٹکڑے کا مفہوم **عندہ** جہاں خدا ہے، وہاں یہ نہیں ہو سکتا جہاں وہ نہیں ہے، وہاں اس کے قانون کے خلاف ہر دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ عندہ میں آپ نے دیکھا کہ اس نے کیا بات کہہ دی ہے۔ اس کے ہاں ''جس معاشرے اچ رب ہونداا ے ❶'' وہاں کوئی کسی کی قانون کے خلاف مدد نہیں کر سکتا۔

---

❶ جس معاشرے میں رب ہوتا ہے۔

قرآنی نظام کے تمام خدوخال دو لفظ میں ملاحظہ کریں:

یہ آئیڈیل معاشرہ خود قانون شکنی کر تو رہا ایک طرف اس میں تو کسی کی قانون کے خلاف کوئی مدد بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے کہ من

ذا الــذی (2:255) کون ہے وہ کہ ہم وہاں ہوں اور ہمارے قانون کے خلاف کوئی کسی کی مدد کر سکے۔ یہ ہے اسلامی نظام کہتے ہیں کہ صاحب کیا ہوتا ہے اور اس کی تفصیلیں بتایئے تفصیلیں کیا بتایئے یہ ہیں اس کی تفصیلیں۔ خدا نے کائنات کا جو اپنا نظام بتایا ہے اس کا ایک Miniature Form کے اندر محدود پیمانے کے اندر، جو یہاں نظام قائم ہوگا وہ ہوگا جسے آپ اسلامی نظام کہیں گے۔ جس میں یہ کہا جائے گا کہ **من ذا الـذی یشفع عنده الا باذنه** (2:255) دیکھیے کس انداز سے کہا ہے کہ کون ہے "اُٹھے مائی دالال" ذرا چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہے کہ ہم کسی کی قانون کے خلاف مدد کر سکتے ہیں۔ کر کے بتایئے۔ نہیں کر سکتا۔ **یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم** (2:255) یونہی نہیں دھاندلی سے آگے بیٹھا ہوا کہ پتہ ہی کچھ نہیں ہے کہ ہو کیا رہا ہے؟

وحی کے علم اور انسانی علم میں لامنتہا فرق کی ایک مثال:

جو کچھ اس کائنات میں سامنے ہے اور وہ جو پیچھے ہے وہ تو سارا اس کا علم رکھتا ہے۔ کہا جائے گا کہ صاحب انسان بھی تو علم رکھتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ **ولا یحیطون بشیءٍ من علمه الا بما شآء** (2:255) تمہارا علم ہمارے قانون کے مطابق یہ ہے کہ جو علم تم حاصل کر سکتے ہو، تم اتنا ہی حاصل کر سکتے ہو۔ یہ جو علم کلی ہے، وہ ہمیں ہی ہے۔ تم تو یہ The why of it بھی نہیں جان سکتے۔ فلاں قانون ایسا کیوں ہے؟ پانی کیوں اتنی ڈگری پہ جا کر اُبلتا ہے؟ آگ کیوں جلاتی ہے؟ کہا ہے کہ ہمارے علم کو کوئی احاطہ نہیں کر سکتا بجز اس طریق سے کہ جو ہم نے اپنے قانون کے ذریعے دیا ہے۔ اس کے دو ہی قانون ہیں: انبیاء کے لیے وحی کے ذریعے، جو براہِ راست ملتا تھا ختم ہو گیا۔ عام انسانوں کے لیے مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، تفکر، تدبر، تعقل، تعاون ذرائع علم ہیں۔ یہ ہے **الا بما شآء** (2:255) ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق جو تم علم حاصل کر لو اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ کہا ہے کہ **وسع کرسیه السمٰوٰت والارض** (2:255) یہ لفظ کرسی عربی زبان میں علم اور اقتدار دونوں کے لیے آتا ہے۔

قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے تراجم میں عرش کے معنی Material Chair کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں

اب ہمارے ہاں میں نے عرض کیا تھا کہ جو ترجمے آتے ہیں، تفسیریں آتی ہیں ان میں کرسی کے معنی یہ جو Material Chair ہوتی ہے یہ معنی کیے۔ جیسے عرش کے معنی تخت کیا، جب تخت کیا تو وہاں کہیں اس کو بچھانا ہے۔ بچھانے کو جگہ چاہیے۔ کرسی کہیں رکھنی ہے۔ کسی کے متعلق کہا ہے کہ اس کی وسعت ارض وسماوات پہ پھیلی ہوئی ہے۔ جب یہ چیز اس کی کہ اس کو مادی شکل کے اندر آپ کرسی لیں گے اور وہ سما پہ پھیلی ہوئی ہو تو ہماری زمین پہ کہیں کوئی ایک آدھ پایا تو ہوگا ہی تھوڑا بہت۔ پھر اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کی تفسیروں میں اس کی پیمائشیں کی ہوئی ہیں، جیسے جنت کے آب خوروں کی تعداد دی ہوئی ہے۔ عزیزانِ من! بات یہ نہیں، بات سیدھی سی ہے کہ عربی زبان کا قرآن ہے، آپ کی زبان میں بھی جب آپ Chair کہتے ہیں تو آپ چیئر کے معنی یہ Wooden Chair تو نہیں لیتے۔ یونیورسٹی میں چیئر ہوتی ہے، حکومت میں چیئر ہوتی ہے، ایک چیئر مین ہوتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ اقتدار کے معنی ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بنیادی طور پہ اس اقتدار کو کہتے تھے جو علم پر مبنی ہو۔ اسی لیے آپ کے ہاں آج بھی **کراسة** یہ بچوں کی کاپیاں

ہوتی ہیں۔ جدید عربی میں بھی ان کو کراسیة کہتے ہیں کرسیة میں علم اور اقتدار دونوں حاصل ہو۔ یہاں کہا ہے کہ **وسع کرسیه السموٰت والارض** (2:255) ارض تو ایک ہی کہی ہے' سماوات' ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں' اس کا اقتدار' اس کا علم تمام معلوم وغیر معلوم' کائنات کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں خدا کے صحیح تصور کی نوعیت کی اہمیت اور اس کو سمجھنے کا ماحصل:

ذہن میں آتا ہے کہ اتنا بڑا کارگہ کائنات ہے۔ کہا ہے کہ **ولا یؤده حفظهما** (2:255) اس کی نگرانی اور اس کی حفاظت اس کو تھکا نہیں دیتی' وہ اس سے تھکتا نہیں ہے۔ **وهو العلی العظیم** (2:255) کیا عرض کروں دو الفاظ ہیں؟ بلندیوں میں لاانتہا' پہنائیاں یا بلندیاں یہ رفعتیں ہو سکتی ہیں وہ ہے العلی اُوپر کی طرف۔ دوسرا لفظ ہے عظیم۔ عظم کہتے ہیں کہ یہ جو جسم کی بنیادی ہڈیاں ہوتی ہیں جس کے اوپر سارا جسم بنتا ہے۔ یہ کسی شے کی بنیاد ہے۔ پستیوں کے اندر جائیے تو بنیادِ کائنات بلندیوں کی طرف جائیے تو انتہائے کائنات۔ وہاں بھی وہی' یہاں بھی وہی ہے۔ **وهو العلی العظیم** (2:255) انتہائی بلندیوں کے اُوپر بھی وہی' ثریا میں' اس کی بنیادوں میں یہ جسے بنیادی ہڈیاں کہا جاتا ہے' اس میں بھی وہی۔ کائنات کی بلندیوں میں' بنیادوں کے اندر' وسعتوں میں' ارض وسما کے اُوپر' اس کی کرسی چھائی ہوئی ہے۔ یہ اس کی کیفیت ہے۔ علم کے اعتبار سے جو سامنے ہے اس کا بھی علم' جو غائب ہے اس کا بھی علم رکھنے والا ہے۔ **الحی القیوم لا تاخذه سنة ولا نوم** (2:255) دیکھا' عزیزانِ من! ایک آیت کے اندر خدا کا جو منزہ ہی نہیں بلکہ اتنا ارفع واعلیٰ تصور ہے میں پھر آپ سے عرض کر رہا ہوں' کہ وہ کہیں دوسری جگہ آپ کو نہیں ملے گا۔ قرآن نے کیا ہی یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور دیا ہے تاکہ انسان کا صحیح تصور سامنے آ جائے۔ ورنہ خدا یہ جو کچھ ہے ہوا کرے' اگر مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تو چھایا رہے کائنات میں مجھے اس سے کیا مجھے تو اس سے ہے کہ

ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

خدا کا تصور انسان کی سیرت کے ڈھالنے کے لیے ایک Exexutive Standard بن جاتا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے ورنہ اگر ساری دنیا کے انسان خدا کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ بگڑتا نہیں ہے' اگر سب ایمان لے آئیں تو بھی اس سے اس کا کچھ سنورتا نہیں۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جس قسم کا خدا کا تصور اس نے دیا ہے' علیٰ حد بشریت وہ تصور انسان کی سیرت کا ہونا چاہیے اور جس قسم کا اس نے اپنا نظام دیا ہے' اس نظام کا ایک عکس انسان کے معاشرے میں جھلکنا چاہیے۔

---

❶ اس درس کی ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔

تریپنواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (256)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1969ء کی 20 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے سلسلہ نو میں سورۃ البقرۃ کی آیت 256 سے آغازِ کلام کرتے ہیں۔ (2:256)

دین خداوندی کو قبول کرنے کی تیاری شرط دل و دماغ کی پوری رضامندی ضروری ہے:

سابقہ آیت میں جسے آیت الکرسی کہتے ہیں، خدا کا صحیح تصور پیش کیا گیا تھا اور اس تصور کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ اللہ لا الہ الا ھو (2:255) خدا وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں اور یہ کہ لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض (2:255) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے، اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ اتنا بڑا اقتدار تھا اور ہے اور قرآن کا اعجاز دیکھئے کہ اس کے ساتھ ہی جو اگلی آیت آ رہی ہے، سطح بیں نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک ان دو آیات میں کوئی ربط نہیں اور جو ذرا سطح سے نیچے اُتر کر دیکھتے ہیں، وہ اس ربط پہ وجد میں آ جاتے ہیں۔ آیت اگلی یہ لا اکراہ فی الدین (2:256) دین کے معاملے میں کوئی اکراہ نہیں ہے، کوئی زبردستی نہیں ہے۔ زبردستی بھی نہیں بلکہ اکراہ ہے، جبر نہیں ہے۔ ذرا سی ناپسندیدگی بھی اگر کسی میں ہو تو وہ بھی دین کے اندر نہیں آ سکتا۔ کامل پسندیدگی ہو دل اور دماغ کا پورا اطمینان ہو، محکم Conviction ہو، اس کے بعد کوئی دین کے معاملے کے اندر آ سکتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس میں کتنا عظیم ربط ہے۔ اللہ اتنا بڑا صاحب اقتدار ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شے اس کے قانون کے سامنے جھکی

ہوئی ہے، کسی کو مجال انکار نہیں، کسی کو یارائے سرکشی نہیں۔

خارجی کائنات کی اس قدر وسعت کے اندر حضرت انسان کے لیے اختیار و ارادے کی نعمت اور اس کی افادیت کا ذکر:

اسی کائنات میں ایک اور نوع بستی ہے، جسے انسان کہا جاتا ہے۔ کائنات کی دیگر اشیا اور انسان کے اندر ما بہ الامتیاز جو خصوصیت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اشیا قانونِ خداوندی کی اطاعت کے لیے مجبور ہیں مگر انسان صاحب اختیار ہے۔ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) آپ دیکھ رہے ہیں کہ کہاں یہ بات آتی ہے۔ قرآن تو ہر مقام پہ اپنے بنیادی تصورات کو اُجاگر کر کے دیتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے **ما فی السمٰوٰت والارض** (2:256) اور **لا الہ الا** (2:256) ارض کے اندر جو کچھ ہے اسی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے لیکن انسان کا معاملہ یہ ہے کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) سے مجبور کر کے ایک راستے پر نہیں چلا جا رہا ہے۔ حالانکہ **ما فی السمٰوات والارض** (2:255) ہے۔ یہ سماوات کے اندر ابھی تک جن افلاک سماوی کے متعلق کچھ بھی سائنس نے انکشافات کیے ہیں، ان کی رو سے یہ نظر آتا ہے کہ زمین ہی نہیں، زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا سورج ہے اور سورج جمع اپنے نظامِ شمسی سے اس کائنات میں اس کی حیثیت ایسی ہے جیسی صحرا میں ایک رات کے ذرے کی اور سمندر میں ایک قطرے کی۔ غور فرمائیے کہ یہ کائنات کتنی وسیع ہے اور اس میں ایک ایک Planet ایک ایک کرہ کتنا عظیم الجثہ واقع ہوا ہے اور اس کی زنجیروں میں وہ اس طرح جکڑے ہوئے ہے کہ اگر اس کی رفتار میں اگر سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا فرق آ جائے، اگر اس کی کشش میں ذرا سا بھی کہیں اختلاف ہو جائے، ساری کائنات، اس کی کرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر فنا ہو جائیں۔ قانون اور اس کی پابندی اس انداز سے ہے اور کائنات کی ہر شے میں یہ اس قدر کیفیت ہے۔ اسی کائنات میں ہمارے سامنے ایک نوع اس کرہ ارض پہ بسنے والی ایسی ہے کہ جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) انہیں ان کے معاملے میں یعنی دین کے معاملے میں (دین کے معنی ہیں قانون کی اطاعت) کسی قسم کا جبر نہیں۔ کائنات کی دیگر اشیا کو قانون کی اطاعت کے لیے کسی قسم کا اختیار ہی نہیں، اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اطاعت کریں یا نہ کریں، کریں تو اتنی کریں، اتنی نہ کریں اور یہاں ایک مخلوق ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) قانون کی اطاعت کے معاملے میں اس پر کوئی اکراہ نہیں ہے۔

قصہ ابلیس و آدم کی اصل لم جسے ایک تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے:

یہی بات تھی جو قرآن کے اس قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان ملائکہ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب کہا تھا کہ **انی جاعل فی الارض خلیفة** (2:30) میں زمین پر ایک صاحب اقتدار بھیجنے والا ہوں تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اسے کس لیے اس منصب جلیلہ کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ **نحن نسبح بحمدک و نقدس لک** (2:30) جواب دیا گیا تھا کہ **انی اعلم ما لا تعلمون** (2:30) تفصیل تو اس اجمال کی بڑی طول طویل ہے۔ بنیادی نقطہ یہی ہے کہ یہ صاحب اختیار ہے' تم مجبور واقع ہوئے ہو اور اسی لیے اشیائے کائنات کی اس قدر مجبوری کے بعد انسان کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا' اس حسین انداز سے قرآن سامنے لایا۔ اب یہاں کہا ہے کہ **لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی** (2:256) جبر تو نہیں ہے لیکن یہ بھی تو شایانِ خداوندی نہ ہوتا' یہ بھی تو کچھ Fair Play نہ ہوتا کہ انسان کو بتایا نہ جاتا کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط کون سا اور اسے صاحب اختیار بنا دیا جاتا۔ وہ تو بچے کے ہاتھ میں چاقو دے دینے والی بات ہو جاتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کس حسین انداز میں بات کہی جا رہی ہے۔ جو مجبور ہے اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ راستہ صحیح ہے' یہ غلط ہے' یہ ادھر جاتا ہے' یہ ادھر جاتا ہے۔ وہ دوسرے راستے پہ چل سکتا ہی نہیں ہے' اسے اس کا اختیار ہی نہیں ہے۔ جسے اختیار دیا گیا ہے اگر اسے بتایا نہ جائے تو یہ تو بڑی زیادتی ہو جاتی۔ اس لیے اسے صاحب اختیار بنانے کے بعد کہا کہ **قد تبین الرشد من الغی** (2:256) دونوں راستے متمیز کر کے دکھا دیے گئے اور اسے صاحب اختیار و ارادہ بنا دیا گیا۔ یہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) بڑی عظیم حقیقت ہے۔ یہاں اتنا ہی کہا ہے کہ **قد تبین الرشد من الغی** (2:256) رشد اور غوایت عربی زبان کا تبین صیغہ نہایت عمدگی سے واضح ہو جانے والی بات' نکھر کر سامنے آ جانے والی بات بتا رہا ہے۔

خیر و شر کا اخری فیصلہ وحی کے بغیر ممکن ہی نہ تھا اور نہ ہے:

انسان کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟ اضافی نہیں Relative نہیں Relative Right اور Wrong تو ہم قدم قدم پہ آپ فیصلے کرتے ہیں' دھوکے بھی کھاتے ہیں' غلطیاں بھی کرتے ہیں' نقصان اُٹھاتے ہیں۔ جو اس وقت ہماری مصلحت کے مطابق Right سے کل ہی وہ ہماری Expediencey کے مطابق Wrong ہو سکتا ہے۔ یہ تو Relative چیزیں ہیں' فی ذاتہ ایک شے غلط فی ذاتہ صحیح انسانی فلسفے کی جو ساری تاریخ ہے وہ اسی مسئلے کو سلجھانے کی لمبی چوڑی داستان ہے:

What is Right and What is Wrong

یہ نہیں سلجھا سکی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے اسے آسمانی راہنمائی کی ضرورت پڑی۔ فی ذاتہ کیا شے Right ہے اور کون سی

Wrong ہے' غلط کیا ہے' صحیح کیا ہے۔ شر اور خیر کا فیصلہ ہے۔ یہ وحی نے آ کر کیا کہ **قد تبین الرشد من الغی** (2:256) رشد اور غی کے متعلق تو ابھی ذرا آگے چل کر عرض کروں گا **لا اکراہ فی الدین** (2:256) دین کے معاملے میں اکراہ نہیں ہے۔ **قل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر** (18:29) ان سے کہہ دو کہ حق میرے رب کی طرف سے آ گیا' جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے اختیار کر لے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ دوسری جگہ ہے کہ **انا ھدینٰہ السبیل واما اکرًا واما کفوراً** (76:3) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا' جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ دوسری جگہ ہے **وھدینٰھم نجدین** (90:10) ہم دونوں راستے متمیز کر کے اس کے سامنے لے آئے۔ اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ایمان کا تو مادہ ہی ''ام ن'' ہے جس کے معنی ہیں ''امن میں ہونا'' اگر آپ کوئی شے مجبوراً مانتے ہیں تو آپ امن میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ صحیح امن میں تو اسی صورت میں ہو سکتے ہیں کہ آپ اپنے اختیار سے ایک راستے کو اختیار کریں' اس میں Conviction ہونی چاہیے آپ Convince ہونے چاہئیں اس کے متعلق۔

کسی کی عقل کو ماؤف کرنے کے بعد کسی بات کو تسلیم کروا لینا اکراہ کی بدترین قسم ہے:

یہ جو اکراہ ہے' ہمارے ذہن میں تو صرف اتنا ہی آتا ہے کہ صاحب! بزورِ شمشیر کسی کو مسلمان نہیں بنانا چاہیے' یہ اکراہ کی ایک شکل ہے' یہ Physical Compulsion ہے' یہ طبعی اکراہ ہے۔ اس سے تو انسان بچ بھی سکتا ہے' تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے' تھوڑی جرات کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ ہمارے سامنے ہیں' ان کی داستانیں ہمارے سامنے ہیں' آج بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جبراً کسی سے کچھ منوانا چاہا ہے۔ انہوں نے سخت سے سخت تکلیف برداشت کر لی ہیں لیکن بات نہیں مانی۔ غلط اور صحیح تو ایک طرف رہا' ایسے مجرموں کی داستانیں سامنے آتی ہیں کہ جن کو انتہائی درجے کا ٹارچر اور تشدد کیا گیا لیکن انہوں نے نہیں مانا۔ اسے تو انسان Resist کر لیتا ہے لیکن ایک اکراہ ایسا ہے کہ جسے Resist ہی نہیں کیا جا سکتا' اس سے بچنا بہت مشکل ہے اور وہ اکراہ یہ ہے کہ انسان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر جو جی میں آئے منوا لیا جائے۔ یہ ہے وہ اکراہ جس سے بڑی مشکل سے بچا جاتا ہے اور مذہب کی دنیا یہ طریق اکراہ اختیار کرتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جسے جب تک انبیائے کرام کا سلسلہ قائم رہا' اسے معجزہ کہا گیا' جب وہ سلسلہ ختم ہوا تو پھر کرامات شروع ہو گئیں۔ واقعی آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ سڑک پہ آپ چلے جا رہے ہیں' ننگ دھڑنگ غلیظ کثیف میلا کچیلا بو آ رہی ہے' سڑک کے کنارے کسی درخست کے نیچے چار جھنڈیاں گاڑے ہوئے' عجیب قسم کی فضا بنائے ہوئے بیٹھا ہے اور اس کے اردگرد آپ دیکھیں گے' اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ' سمجھدار' پڑھے لکھے' صاحب نظم ونسق' دنیاوی معاملات کے اندر بڑے قابل اور

ہوشیار' سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ اول فول جو بکتا چلا جاتا ہے اس کے خود ہی کچھ نہ کچھ معنی کرتے چلے جاتے ہیں۔ٹھیک فرمایا حضرت صاحب! یونہی کسی کے متعلق اس نے آنکھ اُٹھا کر کہہ دیا کہ نکل جاؤ یہاں سے' وہ کانپنے لگ گیا' تھرتھرا رہا ہے' ڈر رہا ہے' پاؤں پکڑ رہا ہے یا حضرت! معاف کر دیجیے' تباہ ہو جاؤں گا' کہیں کا نہیں رہوں گا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جاؤ ایک کالے بکرے کی سری چوراہے میں جا کر پھینک دو۔ کچھ نہیں سوچتا کہ کیا کہہ رہا ہے' کیوں کر دوں۔ بھاگا ہوا جا رہا ہے' ڈھونڈ رہا ہے' تلاش کر رہا ہے' نہیں ہو پاتا' تو ڈر رہا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ دیکھا آپ نے اکراہ کی یہی کتنی گہری شکل کتنی متشدد صورت ہے۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اکراہ کی یہ جو شکل ہے' جس میں انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کیا جاتا ہے' یہ سب سے زیادہ متشدد شکل ہے۔تلوار نے تو اس طرح سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکایا ہی نہیں جس طرح تو ہم پرستیوں نے اپنے سامنے جھکایا ہے۔ پہلے دن کا انسان' ہم یہ دیکھ رہے ہیں' بادل گرجا ڈنڈوت بجالا رہا ہے' بجلی کڑکی سجدہ کر رہا ہے' طوفان انگیز دریا اُمڈ کے چلا آ رہا ہے اس کے سامنے سجدے کر رہا ہے' بھونچال آ رہا ہے ڈر تا ہے' کانپتا ہے' نذرانے اور منتیں مان رہا ہے۔ یہ کیا چیز تھی؟ اس زمانے میں تو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ابھی بیدار نہیں ہوئی تھیں' آج اس دور میں بھی یہ کیفیت ہے جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ ذرا سا کسی ایک مداری نے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے' یونہی سرخ آنکھیں کیں' حالانکہ دھتورا پی کر وہ سرخ کی ہوئی ہوتی ہیں اور ذرا کڑکڑایا اور بالوں میں ہاتھ دیا اور یوں کیا اور اس میں سے تین چار قطرے' سفید رنگ کے دودھ کے نکلے' پاؤں پڑ گئے یا حضرت کیا ہو رہا ہے یہ؟ یہ ایک ہی چیز ہے کہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت' جس نے اسے صاحب اختیار بنایا تھا' اسے سلب کر لیا یہ مجبور ہو کے رہ گیا صاحب!

ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کے مفہوم کو بدل بدل کر قرآن حکیم کی پوری تعلیم کو ہی بدل دیا گیا ہے:

میں نے عرض کیا ہے یہی وہ چیز تھی کہ جسے پہلے معجزات کا نام دیا گیا اور اس کے بعد نبی کی جگہ لفظ ولی اللہ لائے' نبوت کے لیے ولایت کا لفظ لیا' معجزے کی جگہ کرامات لائے وہ جو سارا نبوت کا سلسلہ جو تھا اس کو آگے جاری کیا' صرف الفاظ بدل دیے جھکانے کی Technique وہی جاری رکھی۔ وہ کہتا ہے کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:225) کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے تلوار کے ذریعے نہیں' ان طریقوں سے جو منوایا جاتا ہے' کیا یہ اکراہ نہیں ہے؟ برادرانِ عزیز! یہی چیز نبی اکرمؐ سے کہی گئی۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں' قرآن اس کا دیا ہوا دین' مذہب یا Religion کی دنیا کی چیز نہیں ہے' بالکل اس سے الگ ہے۔ یہ الدین ہے' مذہب کے ایک ایک قسم کے جتنے باطل تراشیدے تھے ان سب کی اس نے نفی کی تردید کی۔ مذہب سب سے بڑی چیز جو اپنے ثبوت میں پیش کرتا تھا' وہ ہمیشہ معجزہ پیش کرتا تھا۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک دیکھیے ان کی طرف سے بار بار تو ہم پرستیوں کا مطالبہ ہوتا ہے اور ادھر سے کہا یہ جاتا ہے کہ میں جو کچھ

پیش کر رہا ہوں، اسے عقل وفکر کی بنا پر پرکھ کر دیکھو۔ غور فرمایئے مذہب کی اسٹیج پر یہ کھڑا ہوا ہے، مذہب کے ایک ایک حصے کی تردید کرتا چلا جا رہا ہے۔

قران حکیم کا پروگرام نوع انسانی کو اختیار وارادہ اور عقل وفکر کی دولت سے نوازنا تھا:

یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق کہا کہ **ولو شآء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعًا** (10:99) ہمارے لیے کیا مشکل تھا کہ اگر ہم چاہتے کہ انسان ایک ہی راستے پہ چلے جسے ہم دین کی راہ کہتے ہیں، تو ہمارے لیے یہ مشکل کیا تھا ہم اسے بھی اسی طرح سے مجبور بنا دیتے جس طرح کائنات کی باقی چیزوں کو مجبور بنایا تھا۔ **کلھم جمیعًا** (10:99) تمام انسان ایک نوع ہی تو ہے، ہر بکری گھاس کھانے پہ مجبور ہے، ہر مچھلی پانی میں تیرنے پہ مجبور ہے۔ ہر انسان ایک راستے پہ چلنے پہ مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ کہا کہ ہمارے لیے یہ مشکل کیا تھا، ہم پیدا ہی اس کو اس طرح سے کرتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور وہ اس لیے کہ ہم نے جب اس کو صاحب اختیار بنایا تو اے رسول! کیا ان لوگوں کے ان مطالبات کی بنا پر کہ کوئی معجزہ دکھایئے اور اس طرح سے عقلوں کو ماؤف کر کے لوگوں کو ایمان کی طرف لایئے **افانت تکرہ الناس حتٰی یکونوا مؤمنین** (10:99) کیا تو پھر لوگوں کو مجبور کر دے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ رسول کی زبان سے یہ کہلوایا جا رہا ہے۔ مجبور کر کے ایمان دار بنانا ہوتا تو اتنے لمبے بکھیڑے کرنے کی ضرورت کیا تھی، ہم انہیں پیدا ہی ایسا کرتے۔ پیدا کرنا صاحب اختیار وارادہ اور پھر اس قسم کے حربے استعمال کرنا کہ اختیار وارادے کو سلب کر لیا جائے، می نہ سزد خدائے را۔ اسی کو تو استبداد کہتے ہیں، خواہ وہ ان کی اصطلاح میں روحانیت کا ہو خواہ وہ ملوکیت کا ہو۔ **افانت تکرہ الناس حتٰی یکونوا مؤمنین. وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ** (10:99-100) ایمان لانا تو خدا کے مقرر کردہ قانون کی رو سے ہو سکتا ہے اور وہ قانون کیا ہے؟ عزیزانِ من! غور سے سننے کی چیز ہے کہا ہے کہ **ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون** (10:100) جو لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے، ان پہ معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔ اپیل عقل وفکر کو کی جا رہی ہے۔ معجزہ اور کرامت کے معنی یہ ہیں معجزہ تو عجز سے ہے، جہاں انسان کی عقل وفکر عاجز ہو جائے۔ اسی کو آپ یہ کرامت کہتے ہیں جہاں آپ بات سمجھ نہ سکیں کہ یہ کیسے ہوا۔ جونہی بات سمجھ میں آ جاتی ہے، آپ کہتے ہیں ''ہاں مینوں پتہ اے میں وی کرلاں گا[1]'' پھر اس کے بعد اسی قسم کی باتیں بچے کرتے پھرتے ہیں لیکن جب وہ عقل آتی ہے جس مقام پر اسی کو آپ معجزہ کہتے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ایمان لانے کا قانون یہ ہے کہ جو شخص عقل وفکر سے کام نہیں لیتا اس پہ معاملہ گدلا رہ جاتا ہے۔ رجس عجیب لفظ جو قرآن نے استعمال کیا ہے۔ Confuse ہو جاتی ہے اس کے سامنے بات صاف نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ ایمان

لانے اور نہ لانے کا معیار' یہ ہے طریق کہ عقل وفکر سے کام لیجیے بات صاف ہو جائے گی۔ جب تمہارے سامنے بات صاف ہو جائے تو پھر تو عقل اس کو مانے گی۔ اس ماننے کا نام ایمان ہے۔ لہٰذا جب کہا کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) تو آپ نے دیکھا کہ کتنی عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے بیان کر دیا۔ وہی چیز نہیں ہے کہ تلوار کے ذریعے کسی کو مسلمان نہیں کیا جاتا' اکراہ یہ وہ چیز ہے جسے کسی نے آج تک مذہب کی دنیا میں سمجھا ہی نہیں تھا۔ یہ ایمان لانے والے تو کہتے تھے کہ صاحب! ہم تو دیکھ کر ایمان لائے ہیں۔ کیا چیز دیکھ کر ایمان لائے ہیں؟ وہی جو عقل وفکر کو ماؤف کرنے کے بعد بالوں سے دودھ نکلتا تھا۔ عزیزانِ من! ضمناً بات یہ سامنے آ گئی۔

---

❶ ہاں' مجھے معلوم ہے۔ میں بھی یہ کرلوں گا۔

ہمارے ہاں تو معجزوں پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہوئی ہیں:

میں نے گزارش کی ہے کہ قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو معجزے کے مطالبے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ توہم پرستی کا زمانہ' مذہب کے اندر ڈوبی ہوئی وہ قومیں' ان کے نزدیک تو دعوے کی صداقت کا ایک ہی ثبوت ہو سکتا تھا کہ کوئی نہ کوئی کرامت دکھائی جائے' کوئی نہ کوئی معجزہ دکھایا جائے تو وہ مانگتے تھے۔ قرآن بار بار اس کا انکار کرتا ہے' اعتراض کرتا ہے' اس مطالبے کرنے والوں کا مذاق اُڑاتا ہے اور اس کے بعد ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اتنی اتنی بڑی ضخیم کتابیں ہیں جس میں نبی اکرمؐ کے معجزات گنائے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ چیز آپ کے ہاں بنیاد میں داخل کر دی ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے۔ معاف رکھیے اپنے' اس گھر کی نجی محفل میں بیٹھے ہوئے' تو یہ بات کہہ رہا ہوں یہی بات جب باہر جائے گی اور کہا جائے گا کہ صاحب! یہ شخص معجزے کو بھی نہیں مانتا۔ سیدھی سی بات وہ کہیں گے کہ پھر نبوت کو نہیں مانتا' رسالت کو نہیں مانتا' خدا ہی کو نہیں مانتا اور قرآن یہ کچھ کہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ آج اتنی اتنی ضخیم کتابیں موجود ہیں جن کی نسبت سے بات ضمناً سامنے آ گئی ہے' ان میں شق القمر کا معجزہ بھی ہے۔

شق القمر کے سلسلہ میں بیان کردہ روایات کی ایک جھلک اور دیگر اجرام فلک کے متعلق ہمارے تصورات:

عزیزانِ من! بڑی غور طلب بات ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ضمناً آج کے دن میں' آپ جانتے ہیں کہ چاند کی نسبت سے' آج کا دن انسانیت کی تاریخ میں کتنا اہم دن ہے' آج رات جو آنے والی ہے یہ اس کی بات ہے۔ شق القمر کے معجزہ کے متعلق آپ کے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ جتنی روایات ہیں' صحیح ہیں' متواتر ہیں۔ یعنی یہ کسی روایت کے سچے ہونے کے لیے ان کے ہاں صرف صحیح ہونا ہی کم نہیں تھا' متواتر

بھی ساتھ ہے' یہ بہت بڑا معیار ہوتا ہے' جانتے ہیں جو اس کام کو جانتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کہ کفار نے حضورؐ سے معجزہ طلب کیا۔ سامنے پورا چودھویں کا چاند تھا۔ آپؐ نے اُنگلی سے اشارہ کیا' چاند کے دوٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا پہاڑی کے اس طرف سے نکلا دوسرا ٹکڑا پہاڑی کے ایک طرف سے نکلا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک ٹکڑا حضورؐ کے اس بغل میں سے نکلا' دوسرا ٹکڑا اس بغل میں سے نکلا اور پھر اوپر جا کر ایک ہو گیا۔ یہ ہے شق القمر کا معجزہ۔ میں سمجھتا ہوں آپ میں سے ہر شخص نے یہ سق القمر کا معجزہ تو سن ہی رکھا ہوگا۔ یہ اتنا اہم معجزہ گنا جا رہا ہے اور اس پہ پھر عجیب عجیب تفسیریں آ رہی ہیں۔ یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ مالی بار کا ایک راجہ تھا' وہ اس معجزے کو دیکھ کر ایمان لایا۔ یعنی وہ جو مکے والے تھے' جن کے سامنے یہ کچھ ہوا' ان میں سے تو کوئی ایمان نہ لایا' مالی بار کا ایک راجہ تھا' وہ ایمان لایا۔ چھوڑیے ان چیزوں کو۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ چیزیں روایات میں آپ کے ہاں بیان ہوئیں' تفاسیر نے ان کے متعلق تصدیق کی۔ کس تصور کے ماتحت ان کی تصدیق اس زمانے کے ان انسانوں کی علمی سطح اتنی تھی' چاند کو اتنا سا تھال سمجھتے تھے۔ ٹھیک ہے' اتنے سے تھال کا دوٹکڑے ہو جانا' آدھے کا ادھر سے گزر جانا' آدھے کا ادھر سے گزر جانا۔ یہ چیزیں اس لحاظ سے تو ذہن میں آ جاتی تھی۔ چاند کے متعلق تصور ہی یہ تھا یہ جتنے بھی اجرام فلکی سامنے نظر آتے ہیں آپ کے ہاں کی جتنی تفاسیر ہیں ان میں آپ دیکھئے گا' انہوں نے لکھا یہ ہے کہ یہ آسمان شیشے کا ایک ڈل ہے' تارے اس کے اندر یہ ہیرے کے نگوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ چاند اور سورج یہ اتنے اتنے بڑے تھال ہیں۔ گویا علم انسانی یہاں تک تھا۔ اس میں کوئی چیز ہنسنے کی نہیں ہے۔ آج اگر ہم اس سے آگے بڑھ گئے ہیں' اس میں ہمارا بھی کوئی کمال نہیں ہے۔ انسانی علم' اس کے انکشافات اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ہم ان سے Advantageous Position میں ہیں لیکن اصل چیز قابل اعتراض وہاں آتی ہے جہاں ہم یہ کہیں کہ یہ باتیں خدا نے کہیں' اس کے رسول نے پیش کیں اور وہاں یہ کہ چونکہ یہ تھال کے برابر تھا دوٹکڑے ہوا' ادھر آدھا گزر گیا' دوسرا ادھر سے گزر گیا۔ اس کے بعد سائنس کے انکشافات بہتیرا کہتے رہے کہ صاحب! یہ چاند اتنا بڑا تھال نہیں ہے' یہ تو اتنا بڑا ایک عظیم کرہ ہے۔ یہ کون مان سکتا تھا؟

زمین کو گول کہنے پر گیلیلیو کا حشر اور اس کا گردش میں رہنے کا فتویٰ دینے پر ٹیکس جیسی شخصیت کا حشر:

ہم تو خیر پرانے زمانے والے رہے۔ یورپ جو اتنا آگے ہے' کل ہی یہ بات ہے جس وقت ان کے ہاں گیلیلیو نے بات کہی تھی اس کو بھی انہوں نے جا کر کہا تھا کہ پھانی پہ چڑھا دو۔ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زمین گول ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کاپرٹیکس نے جب اس کی گردش کے متعلق یہ چیز بتائی تھی' اس کو بھی پھانسی کے تختے پہ چڑھا رہے تھے۔ کوئی چیز آج ہمارے لیے ہنسنے کی نہیں ہے۔ بات ساری یہ تھی کہ مذہب کا وہاں' اس زمانے میں' اتنا غلبہ تھا کہ علم اور عقل کی کوئی بات بھی جو سامنے آتی تھی' اسے حوالہ دار و رسن کر دیا جاتا تھا۔ آپ آج

بھی اسی مقام پر ہیں۔ جہاں بھی دین کی جگہ مذہب کی گرفت ہے، وہاں عقل وفکر کو آزاد نہیں چھوڑا جاتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ آج تک بھی یہ مانتے چلے آرہے ہیں اور آپ کے ہاں جو نہیں مانتا' اس کو منکر نبوت ورسالت کہا جائے گا کہ چاند واقعی دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ آج اس چاند کے اُوپر انسان پہنچ کر بتا رہا ہے کہ چاند عظیم کرہ ہے۔ مذہب پرست طبقے کی آج بھی یہ کیفیت ہے۔ چند سال اُدھر جو سب سے پہلے اسپٹنگ جب روس نے بھیجا تھا تو بات یہ چلی کہ یہ چاند کے اُوپر چلے جا رہے ہیں۔ یونہی بات تھی' چاند پر چلے جا رہے ہیں۔ یہیں آپ کے اس لاہور میں ایک بہت بڑے مولوی صاحب نے وعظ تحریر فرمایا تھا۔ اتفاق سے وہ پورے چاند کے دن تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ آج تو چاند اتنا بڑا ہے' اس پہ تو خیر جا کے ٹک جائیں گے' اتر جائیں گے۔ اب جو کل کو اس نے سکڑ کے چھوٹا ہونا شروع کیا یہ جو تھوڑا رہ جاتا ہے پھر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سکڑ رہا ہے۔ کہنے لگے خیر ذرا اِدھر اُدھر سرکتے جائیں گے' سرکتے جائیں گے اور انہوں نے وہ جو واعظانہ انداز ہوتا ہے پھر فرمایا کہ ''جدوں 29 نوں ڈوب گیا' تے کتھے جاؤ گے فیر۔ یعنی چنداں نہ جس دن رہیا[1]'' یہ واقعہ ہے کہ دس کو تو زیادہ وقت نہیں گزرا اس زمانے میں آپ کے اس دارالسلطنت کے اندر' ایک بہت بڑے جید مولوی صاحب چاند کے متعلق یہ فرما رہے ہیں۔ ان کا تصور یہ تھا۔

---

[1] جب انتیسواں چاند ڈوب گیا تو پھر کہاں جاؤ گے۔ یعنی جس دن چاندی نہ رہا۔

چاند پر جانے والے راکٹ کے مسافروں سے اہل زمین کا حیرت انگیز حد تک رابطہ:

عزیزانِ من! آج انسان اس چاند کے اوپر جا کر ہمیں بتا رہا ہے اور جا کر اس کو آ کر بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ خبر دینے والے آلات کی تو کیفیت یہ ہے کہ کل ہی یہ بات اخبار میں آئی تھی کہ چاند میں وہ جانے والے تینوں آٹھ گھنٹے تک سوئے رہے تھے۔ اندازہ لگائیے اپنی ان چیزوں کے اُوپر اعتماد کتنا ہے' یہاں ہمارے سیٹ کے اُوپر بیٹھا ہوا' ٹرک کے اُوپر بیٹھا ہوا' ڈرائیور ایک سیکنڈ کے لیے ذرا آنکھ جھپکتا ہے' کھٹ سے حادثہ ہوتا ہے۔ اتنا عظیم ایک راکٹ چلا جا رہا ہے' ڈھائی تین ہزار میل کی اسپیڈ سے۔ اس کے اندر ہر چیز کو اپنی جگہ سیٹ کر کے تینوں آٹھ گھنٹے کے لیے سو رہے ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیسے علم ہوا کہ سو رہے ہیں؟ ان کی طرف سے تو کوئی پیغام نہیں آ رہا تھا' ہو سکتا ہے کہ جاگتے ہوں' تو قیغام آ رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کیا بتایا انہوں نے؟ انہوں نے کہا کہ ان کے دل کی دھڑکن کی جو آواز نیچے آ رہی تھی' وہ سونے والے کی اور ہوا کرتی ہے' جاگنے والے کی اور ہوا کرتی ہے اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ سو رہے ہیں۔ کیا بات ہے۔ خبر ناموں کی یہ کیفیت ہے کہ دل کی دھڑکنیں ریکارڈ ہو رہی ہیں اور دھڑکن سونے والے کی اور جاگنے والے کی میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ کہا گیا کہ پھر وقت معینہ کے اُوپر جی چاہا کہ جگا دوں' ساتھی نے کہا کہ نہیں' انہیں کل

رات بہت لمبا کام ہے، زیادہ جاگنا ہے تھوڑا سا اور سو لینے دو۔ یہاں تک یہ جو چیز ہے یہ ہوئی۔ میں پوچھ یہ رہا ہوں کہ ہم جو دنیا کے سامنے یہ چیز پیش کر رہے تھے کہ حضورؐ نے ایک معجزہ دکھایا اور اس سے چاند دو ٹکڑے ہو کر آدھا ادھر سے گزر گیا آدھا ادھر سے گزر گیا۔ اگر ہم اسے کہتے کہ صاحب اس دور کی باتیں ہمارے ہاں کے مفسرین نے، روایات گھڑنے والوں نے، یہ کیں۔ کہیں غلط ثابت ہوئی، ان کے متعلق ہم نے کہہ دیا کہ یہ ان کا عدمِ علم تھا۔ نبی اکرمؐ کے متعلق یہ بات بیان کی جاتی ہے، خدا یہ کرنے والا بتایا جاتا ہے اور وہ چاند کی کیفیت یہ ہے۔

اس قسم کی روایات بیان کرنے پر ہم دوسروں کو کیا جواب دیں گے:

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ کیا وہ دنیا جس کے سامنے ہم یہ چیز پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں، وہ آپ کے اس دین کو کیا سمجھیں گے اور کیا مذاق نہیں اُڑائیں گے؟ معجزہ آپ چاہتے ہیں؟ آئیے میں آپ کو معجزہ بتاتا ہوں۔ چھٹی صدی عیسوی میں قرآن نازل ہوا۔ 15 ویں اور 16 ویں صدی عیسوی کی میں بات کر رہا ہوں جب گیلیلیو نے (14731543) نے یورپ میں یہ بات کہی کہ زمین گول ہے اور زمین گردش کر رہی ہے۔ یہ ابھی کل کی بات ہے کہ ان کے متعلق ان اربابِ علم نے جو آج آسمان پہ پہنچ رہے ہیں انہوں نے یہ کہہ دیا کہ ان کو پھانسی پہ لٹکا دو۔ یہ کیا بات کہہ رہے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے اندر کسی کا ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ یہ آسمان کے کرے ہیں کیا۔ عوام تو ایک طرف رہا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جتنے صاحب علم تھے ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ معجزہ کسے کہتے ہیں؟ چھٹی صدی عیسوی کے اندر ایک شخص اسی عرب کی سرزمین میں پیدا ہوتا ہے۔ میں پھر دہرا دوں جس سرزمین کی کیفیت یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے بھی دو اڑھائی سو سال بعد یہ، جو احادیث یا روایات آپ کے ہاں کی مدون ہوئی ہیں، یہ دو اڑھائی سو سال بعد ہوئی ہیں، اس میں بھی چیز آ گئی کہ چاند نیچے اُترا تھا، دو ٹکڑے ہوا تھا، آدھا ادھر سے پاس ہوا، آدھا ادھر سے۔ لوگوں کا ذہن ابھی اس سطح پہ تھا تو لوگوں نے اسے تسلیم کیا۔ خود آپ کے ہاں علمی سطح اور ذہنی سطح لوگوں کی ابھی اتنی تھی باقی دنیا والے بھی ان کو ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہی سمجھ رہے تھے۔ یہ کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اتنے مہیب کرے ہیں، یہ چیز کہ ان کے اندر بھی کوئی لائف یا زندگی ہو سکتی ہے۔

قرانی حقائق بذات خود ایک معجزہ ہیں:

عزیزانِ من! آپ چھٹی صدی کا، چھٹی صدی سے پہلے کا سارا ساری دنیا کا لٹریچر اکٹھا کر لیجیے۔ کہیں یہ چیز اشارتاً کنایتاً بھی نہیں

ملے گی کہ یہ جو اجرام ہیں ان کے اندر بھی کہیں زندگی کے آثار ہو سکتے ہیں' کوئی شے زندہ بھی ہو سکتی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کی اس سرزمین میں جو نسبتاً باقی دنیا کے مقابلے میں اور زیادہ تاریک تھی' اس کے اندر ایک شخص جو اَن پڑھ تھا' میں عرض کر رہا ہوں' اس پس منظر میں معجزہ دیکھیے گا۔ زمان کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی' مکان کے اعتبار سے عرب کی سرزمین' انفرادیت کے اعتبار سے وہ شخص جو یہ دنیا کے علوم جس نے کسی سے الف ب تک بھی نہیں پڑھی' وہ شخص یہ کہتا ہے کہ **ومن اٰیٰتہ** (42:29) تم خدا کی نشانیاں مانگتے ہو۔ معجزہ' نشانی' آیت کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معجزے مانگتے ہو؟ اس کے معجزات میں سے اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ **خلق السمٰوٰت والارض** (42:29) اس ارض اور سماوات کا پیدا کرنا۔ سماوات کے اندر اس ارض کے اُوپر جتنے بھی جو کچھ آپ کو یہ نظر آتا ہے' وہ نہیں نظر آتا' جو کچھ بھی اُوپر ہے' اس کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ آتا ہے۔ پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنا اور آگے غور طلب ہے کہ **وما بث فیھما من آبۃ** (42:29) اور ان کے اندر زندہ چلنے والی جو مخلوق ہے وہ۔ یہ ہے اس کی نشانیوں میں سے۔ سماوات میں وہ چھٹی صدی عیسوی میں' عرب کے خطے میں ایک ان پڑھ شخص یہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو زندگی پھیلی ہوئی ہے ان اجرامِ فلکی کے اندر' اس ارض کے اندر' یہ اس کی نشانیاں ہیں اور آگے سینے وہ بات جو ابھی چار سال پانچ سال پہلے تک بڑے سے بڑے سائنس دان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ الفاظ سنیے کہ **وھو علٰی جمعھم اذا یشآء قدیر** (42:29) اور اس پہ قادر ہے کہ جب اس کے قانونِ حیثیت کا تقاضا ہو تو وہ ان کو آپس میں ملا دے۔ اللہ اکبر! آپ معجزہ مانگتے ہیں؟ اسے معجزہ کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے معجزہ کسی انسان کا ذہن اس زمانے میں' یہ تو خیر عرب کا خطہ تھا' ایک ان پڑھ شخص جسے ہم کہتے ہیں اُمی تھا' یونان کا جو خطہ تھا علم وحکمت کے اوپر گیا ہوا' ارسطو اور افلاطون کے دماغوں والے جو لوگ بھی تھے کسی کے تصور میں بھی یہ بات آ سکتی تھی کہ ان کے اندر بھی زندگیاں ہو سکتی ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک دن ایسے مل جائیں گے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے:

آج کی رات میں نے کہا تھا کہ انسان کی تاریخ میں بڑی اہم ہے' ارض وسما مل رہا اور یہ چیز قرآن کے خدا کی طرف ہونے کی ایک شہادت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ **سنریھم اٰیٰتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتٰی یتبین لھم انہ الحق** (41:53) ہم اپنی نشانیاں تمہیں تمہاری اپنی دنیا میں اور اس آفاق کی دنیا میں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تاآنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آئے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ عزیزانِ من! آج ارض (1) اور سما میں سے کسی ایک کرے کا بھی آپس میں جو جمع ہو جانا ہے' مل جانا ہے یہ قرآن کے دعوے کی صداقت کا ایک اور ثبوت ہے اور سوچیے کہ کہاں سے مل رہا ہے؟ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت

ہے۔ یہ قرآن کی صداقت کا ثبوت ہے۔ہم اپنی آیات تمہیں انفس وآفاق کے عالم میں دکھاتے چلے جائیں گے' حقیقت مستور سے ہر وہ پردہ جو اُٹھے گا وہ ہمارے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتا چلا جائے گا اور یہ پردہ کون اُٹھائیں گے؟ یہ اربابِ علم وفضل' یہ سائنٹسٹ' یہ انکشافات کرنے والے' یہ Discover کرنے والے' جب یہ پردہ اُٹھائیں گے یا ہر پردہ' جو اُٹھے گا' قرآن کہتا ہے کہ وہ ہمارے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتا چلا جائے گا۔

---

❶ اس صفر کی مختصر روداد سنیے: (1) 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atm) توڑا گیا۔

❷ 4 اکتوبر 1957ء میں روس نے اسپٹک نامی مصنوعی سیارہ (Sputnik) پہلی بار خلا میں بھیج کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔

❸ 28 فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا۔

❹ 12 اپریل 1961ء میں روس نے پہلا انسان بردار سیارہ خلا میں بھیجا۔روسی خلانورد یوری گاگرین پہلا انسان تھا جو مدار ارضی پہ پہنچا۔

❺ جولائی کی آج ہی کی تاریخ 1969ء کو نیل ایلڈن اکرم سٹرونگ نے پہلی بار چاند کی سطح پر قدم رکھ کر ارض کو سما کے ایک کرّے سے ملا دیا اور پکار اٹھ کہ

"This one small step for a man, one giant leap for mamking"

(انسان کے لیے ایک چھوٹا سا قدم' مگر بنی نوع انسان کے لیے ایک غیر معمولی جست)

حضورؐ کی اپنی ساری زندگی ایک بہت بڑا معجزہ ہے:

برادرانِ عزیز! آج ایک پردہ اُٹھا ہے ❶ قرآن کی آیت موجود ہے کہ **وھو علٰی جمعھم اذا یشآء قدیر** (42:29) دیکھا آپ نے! اسے معجزہ کہتے ہیں اور معجزہ چاہتے ہیں آپ؟ اسے تو خدا کا معجزہ کہیے رسول کا بھی معجزہ ہے۔حضورؐ سے آ کر کہا گیا کہ معجزہ دکھائیے۔آپؐ نے فرمایا کہ **قد بشت فیکم عمرًا من قبلہ افلا تعقلون** (10:16) میں نے تو اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے' کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے ہو کہ یہ ایک سچے کی زندگی ایسی ہوتی ہے یا جھوٹے کی زندگی ایسی ہوتی ہے میری سچائی کے دعوے کی دلیل مانگتے ہو۔اس کی دلیل میری زندگی ہے' جو میں نے تمہارے اندر بسر کی ہے۔اللہ اکبر! کیا تھی یہ زندگی؟

---

❶ یعنی آسمان کے ایک کرّے چاند پہ انسانی قدم رکھنے کا۔

حضور کے بیٹے کی وفات پر سورج کو گرہن؟ جبکہ گرہن کا یہ واقعہ طبیعات کے مطابق تھا:

عرب کے یہ تو ہم پرست لوگ تھے ہوا یوں کہ حضورؐ کے چھوٹے سے بچے کی وفات ہوگئی' ایک ہی بچہ تھا۔اتفاق یہ ہوا کہ سورج کو گرہن آ گیا۔وہ تو پھر بھی چھٹی صدی عیسوی کا سا جاہل زمانہ تھا آج بیسویں صدی میں مہذب ترین کسی شہر کے اندر اگر ایسا کوئی

Incident ہو جائے۔ واقع تو آپ دیکھیے کہ کس طرح اسے اس کی روحانیت کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ یہ سارے قبیلے جوق در جوق آنے شروع ہو گئے کہ ہم حضورؐ آپ کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ چیز میرے لیے بڑی خوش آئند ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کل تو تم میرے اتنے شدید مخالف تھے یہ آج کون سی ایسی بات ہو گئی جس کی وجہ سے تم یوں ایمان لانے کے لیے آ گئے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی صداقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپؐ کے بیٹے کی وفات ہوئی اور اس کے غم میں سورج تک نے سیاہ لباس پہن لیا۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ آپؐ واقعی کوئی مافوق البشر ہستی ہیں۔ آپ کیسے کریکٹر کی بلندی دیکھیے کہ اگر کوئی اور ذرا سا چھوٹے پست کیریکٹر کا ہوتا تو وہ ذہن میں یہ کہہ لیتا کہ ٹھیک ہے مجھے اس چیز سے فائدہ اُٹھا جانا چاہیے اور پھر اس کے لیے جواز یہ کہ میں اپنی ذات کے لیے تو کچھ کر نہیں رہا' یہ تو اللہ کے دین کے لیے ہے۔ جو آج دھڑلے سے فتوے دیے جاتے ہیں کہ نیک کام کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں' واجب ہو جاتا ہے۔ یہ شخص تو یہ دے سکتا تھا اپنے آپ کو یہ فریب کہ اپنے لیے نہیں' اتنے لوگ صاحب! اتنی سی بات کے اُوپر اگر اسلام میں آ جاتے ہیں تو ان کو اسلام میں لے آنا چاہیے' پھر ان کی تعلیم و تربیت سے میں ان کو پکا مسلمان بھی کر لوں گا۔ وہاں کا بڑا مسئلہ حل ہو جاتا' روز کی Problen Solve ہو جاتیں' وہاں کی یہ اتنی بڑی Attemting چیز تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے دلائل اس کے حق میں جاتے ہیں لیکن وہاں تو کیریکٹر کا معجزہ پیش کرنا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ چاند اور سورج کو گرہن خدا کے قانونِ طبیعات کے مطابق لگتا ہے' اسے کسی کے موت اور حیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اگر تم اس بنا پہ مسلمان ہونا چاہتے ہو' تو میں تمہیں کہوں گا کہ تم اپنے ہی مذہب کے اُوپر رہو' میرا دین تو ہم پرستیاں سکھانے کے لیے نہیں آیا۔ عزیزانِ من! یہ ہے معجزہ۔ وہ ہے علم خداوندی کا معجزہ کہ عقل انسانی کل تک یہ تسلیم کرنے کے لیے' یہ تصور کرنے کے لیے کہ یہ اجرامِ فلکی کے اندر بھی کہیں زندگی ہے' عاجز ہوئی تھی۔ یہ بھی ایسی ممکن چیز ہے کہ مل جائیں ان کے رہنے والے یا یہاں اور وہاں کی آپس میں کسی قسم کی کوئی چیز ایسی رابطے کی پیدا ہو جائے؟ یہ علم کا عجز تھا اور یہ سیرت کا عجز ہے کہ ایسے مواقع کے اُوپر اتنی بلندی پہ آ جانا صاحب! تو جو رسول چاند اور سورج کے گرہن کو کہہ رہا ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے' کیا وہ یہ کرے گا کہ اُنگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر کے اپنی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے؟ اور پھر بات سوچنے کی ہے اس کے بعد بھی وہاں کوئی مسلمان نہ ہوا۔

نبی اکرمؐ نے انسانوں کی عقل کو ماؤف کرنے کی بجائے انسانی شعور کو قدم قدم پر جلا بخشی ہے:

معاف رکھیے گا' نقل کفر کفر نہ باشد' کہنے والے نے اس لیے کہہ دیا تھا کہ اس خدا کی ضربِ آخر بھی اُچٹ کر رہ گئی۔ اُف! بات ٹھیک کہہ گیا تھا یعنی اتنا کچھ بھی کیا اور اس کے بعد بھی وہ مسلمان نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) کہا ہے وہ

اکراہ کی شکل تھی جو اس طرح سے قبیلے سارے ایمان لانے کے لیے آ گئے تھے' عقلوں کو ماؤف کر دیا تھا' انہوں نے نہیں کیا تھا۔ یہ واقعہ تھا۔ عقلیں ماؤف ہو گئیں' وہ ماؤف شدہ عقل والوں کو اپنے دین کے شعور میں لینا ہی نہیں چاہتے تھے مگر یہاں طریق ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ان کے کمالات کی کیا صورت ہے صاحب! انہوں نے صاحب! ایک کرامت دکھائی اور دس ہزار ہندو راتوں رات مسلمان ہو گئے۔ انہیں جس کے دین میں یہ لا رہے ہیں' اس کی کیفیت یہ ہے۔ اس کے بعد بھی یہ کچھ بتایا جا رہا ہے۔ اوّل تو یہ ہیں ہی افسانے اور اگر اس طرح سے پھر وہ لائے بھی ہوں گے ''تے او ساہدے ورگے مسلمان ہوئے ہون گے۔ ایہدے نالوں ہندو ہوندے تے چنگا سی ❶'' انہوں نے عقل کو ماؤف کر کے مسلمان بنایا اور ہم نے نسل در نسل پھر عقلوں کو تیاگ کے مٹی کے چونے کے' پتھروں کے' اُوپر جا کر سجدے شروع کر دیے۔ عقل کا ماؤف ہونا یہ ہے یعنی وراثتاً ماؤفِ عقل ہمارے ہاں چلی آ رہی ہے کیونکہ ابتداء ہم ایمان ہی اسی طرح سے لائے تھے۔

---

❶ وہ ہمارے جیسے ہی مسلمان ہوئے ہوں گے۔ اس سے ہندو ہی ہوتے تو بہتر تھا۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اگر ہمارے بڑے اسی طرح سے اسلام لائے تھے تو ٹھیک ہے ''اوہناں دی اگے اولاد اسی ہیں' جیہو جئی او جوتھاں اوہے جئے اسی ❶'' عزیزانِ من! قرآن کا دعویٰ **لا اکراہ فی الدین** (2:256) ہے اور اکراہِ ذہنی جیسا میں نے عرض کیا ہے' سب سے بڑا اکراہ ہوتا ہے آگے کہا کہا ہے **قد تبین الرشد من الغی** (2:256) آپ دیکھیے یہاں قرآن لفظ ہدایت اور ضلالت نہیں لایا۔ وہ بھی دو چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے تقابل میں آتی ہیں۔ یہاں رشد لایا ہے۔ رشد اس ہدایت' صحیح راستے پہ چلنے کو کہتے ہیں جو عقل اور علم کی بنا پہ اختیار کیا جائے۔ رجل رشید اس انسان کو کہتے ہیں جو نہایت دانا' عقلمند ہو' رشادت اس کو کہتے ہیں' ہدایت صحیح راہنمائی تو ہو لیکن اس میں عقل اور علم کی بنا کے اُوپر یہ ہو۔ آپ نے دیکھا **لا اکراہ** کے بعد جو رشد لانا تھا کس طرح قرآن ادھر لے گیا کہ عقل ماؤف کر کے اگر کوئی آتا ہے تو وہ رشد کے اُوپر نہیں ہوگا اور رشد کے مقابل میں **الغی** ہے' یہ ایسا غلط راستہ ہے جو دھوکا کھا کر اختیار کیا جائے۔ دھوکا کھا کر اور یہاں مجھے حضرت عمر کا وہ قول نظر آ رہا ہے کہ جس نے تربیت نبویؐ میں بات کو سمجھنے والا بڑا وافر حصہ پایا تھا کئی دفعہ دہرا چکا ہوں' یہ چیزیں ہزار بار دہرانی چاہئیں کہ جب آپ کے سامنے ایک شخص نے یہ کہا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ حضرت عمر نے کہا کہ بات پوری کرو آدھی کیوں چھوڑتے ہو۔ پوری بات یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ اس کے لیے رشد

نہایت ضروری ہے۔غوایت کے اندر دھوکا کھا کر انسان صحیح راستہ بھی اختیار کرتا ہے مگر قرآن اسے کوئی Creditable بات نہیں کہتا' دھوکے کی بنا کے اوپر یہ چیز ہے **قد تبین الرشد من الغی** (2:256) نکھر کر اُبھر کر نہایت واضح طور پر یہ چیز سامنے آ گئی۔غی اور رشد قرآن کے اندر آ گیا' وحی کی رو سے یہ چیز آ گئی' **فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن بالله فقد استمسک بالعروة الوثقٰی لا انفصام لھا** (2:256) عظیم آیات میں سے ہے۔ویسے تو قرآن کی ہر آیت عظیم ہے لیکن بعض مقاصد کے اعتبار سے جب کوئی چیز Context میں آتی ہے تو یہ چیز سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان لانے کا طریق کیا ہے؟

---

❶ ان کی آگے اولاد ہم ہیں۔جسے وہ بدبخت تھے ویسے ہی ہم ہیں۔

کسی انسان کو ایمان لانے سے پہلے ذہن کے اندر اپنے سینکڑوں بتوں کو ''شہید'' کرنا پڑے گا:

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا کچھ کوئی ہے' اس نے کلمہ پڑھ لیا' ایمان لے آیا۔یہ بھی نو مسلم کے لیے ضروری ہے جیسا میں کہا کرتا ہوں' یہ جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا ہے' اسے تو مسلمان ہونے کے لیے کلمہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی حالانکہ پیدائشاً کوئی شخص نہ کافر پیدا ہوتا ہے' نہ مسلم پیدا ہوتا ہے۔یہ ایک Positive (مثبت) چیز ہے اس ایک چیز کو تو خود آپ کو اختیار کرنا ہے۔اختیار کیسے کیا جائے گا؟ یہ نہیں کہ **من یؤمن بالله** یہاں سے بات نہیں شروع کی بلکہ جس طرح سے اس نے الا الہ تک پہنچنے کے لیے لا الٰہ پہلے کہا تھا لا الٰہ الا اللہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔مسلمان ہونے کے لیے پہلے اسے ماننا پڑے گا: کوئی صاحب اختیار نہیں ہے' کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے' کوئی ایسا نہیں ہے جس کے سامنے جھکا جائے۔پہلے اسے ماننا پڑے گا' اس پر ایمان لانا پڑے گا اگر نہیں ہے تو نہیں ہے۔یہ کون ہیں جن سے انکار ہو رہا ہے؟ وہ سینکڑوں بت جو اس سے پیشتر ہمارے دماغ کے مندر میں بیٹھے ہوئے تھے۔وہ جو بات لباسِ مجاز میں آ رہی ہے حضورؐ نے سمجھائی تھی' بڑی حقیقت تھی کہ مکہ فتح ہونے کے بعد بھی حضورؐ کعبے میں داخل نہیں ہوئے' جب تک پہلے اس کے اندر بسے ہوئے بتوں کو نکال نہیں لیا۔خدا تو ذہن کے اندر آ ہی نہیں سکتا اگر اس کے اندر کوئی اور کرایہ دار پہلے بیٹھا ہوا ہے وہ بڑا غیور ہے۔کہتا ہے پہلے ان کو نکالو۔کیا پتہ ہے کہ انسان کا یہ قلب و دماغ کن کن خداؤں کا مسکن اور معبد بنا ہوا ہوتا ہے۔

''می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر''

انسانی فکر تو ہر آن ایک نیا بت تراشتی رہتی ہے۔

''رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر''

ایک سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے اس کے بعد دوسری زنجیریں اپنے پاؤں میں پہنا لیتا ہے۔دوسری جگہ اس نے کہا ہے:

وہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم حرم اقبال را

اس کم بخت کو نہ کعبے میں جانے دینا۔ وہ اس لیے کہ

ہر زماں در آستیں دارد خداوند دگر

(اقبالؒ: پیامِ مشرق)

بظاہر تو احرام باندھے ہوئے' اس کی آستیں کو دیکھیے' ہر زماں اس کے اندر ایک نیا بت چھپا ہوا ہوتا ہے۔

ہر اس گھر میں شیطان کا بسیرا ہوتا جہاں خدا نہ ہو:

عزیزانِ من! جب تک آپ قلب و دماغ کو اپنے معتقدات و نظریات کے ان خود تراشیدہ بتوں کو باہر نہیں نکالیں گے اس وقت تک الا اللہ تک آپ نہیں پہنچ سکتے اور اس کے ساتھ یہ بھی چیز ہے کہ لا ہی لا آپ کرتے چلے جائیں گے' نکال دیں گے ان میں سے ان تمام باطل نظریات کو' اور اس کے بعد مثبت کے طور پہ الا اللہ نہیں لائیں گے تو پھر بھی آپ مومن نہیں ہو سکتے کہ ''خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں'' خلا رہ ہی نہیں سکتا۔ جسے آپ ان کو نکال کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے سب نکال دیے ہیں غلط ہے۔ جس گھر میں خدا نہیں آتا' اس میں شیطان آ کے بس جاتا ہے۔ لباس مختلف ہوتا ہے اس کا۔ لا ناممکن ہے نفسیاتی طور پہ ناممکن ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ کبھی کوئی خیال آپ کے دماغ میں نہ آئے۔ اس لیے ان کو نکالنے کے ساتھ ہی الا اللہ کو فوراً بسا دینا چاہیے ورنہ اس کے اندر کوئی اور آ بسے گا۔

لا و الا ساز و برگِ امتاں

نفی بے اثبات مرگ اُمتاں

یہ ہے لا اور اِلا اور آپ دیکھیے یہاں لا اکراہ (2:256) کہنے کے بعد **من یؤمن باللہ** نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ **من یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ** (2:256) جو طاغوت سے انکار کرتا ہے اور خدا پر ایمان لاتا ہے' **فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی لا انفصام لھا** (2:256) اس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا۔ کیا بات ہے **انفصام** کے لفظ کی کہ یہ سہارا ٹوٹنا ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز میں' جسے ''تڑاخ'' کہتے ہیں آ گئی یعنی درز سی آ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ وہ محکم سہارا ہے' ٹوٹ کر دغا دینا تو ایک طرف رہا اس میں کبھی درز اور تڑاخ تک بھی نہیں آ سکتی۔ **یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ** (2:256) یہاں اوّل تو یہ طاغوت سے انکار اور خدا پر ایمان تضاد میں آیا ہے۔

لفظ طاغوت کا مفہوم اپنے اندر ہمیشہ طغیانی اور سرکشی کے اثرات لیے ہوئے ہوتا ہے:

برادرانِ عزیز! طاغوت کے معنی اس نے خود واضح کر دیے یعنی وہ جو غیر اللہ ہوگا وہ طاغوت میں آ جائے گا۔ معنی کے اعتبار سے

دیکھیے،طغی سرکش، حدود فراموش، قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کرنے والا، سرکش ہو کر آگے بڑھ جانے والا ہوتا ہے۔ یہ سرکشی اختیار کرنے والا کیا کرتا ہے سنیے! یہ جو طغیانی ہے، وہ لفظ اسی سے نکلا ہے اسے طغیان کہا جاتا ہے دریا کے ساحلوں کے اندر یہ بہنے والا پانی زندگی کا ضامن ہوتا ہے اور ہزار منفعت بخشیوں کا حامل ہے اور وہی پانی جب طغیانی اختیار کر لیتا ہے تو پھر سیلاب کی تباہ کاریاں ہمارے سامنے ہیں اور اَطــغٰی کے معنی ہیں''اسے حد سے متجاوز اور حدود شکن بنایا، اسے طغیان وسرکشی پر اُبھارا۔ اطاغنی حد سے متجاوز اور قانون شکن آدمی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع الطاغون اور اطاغین ہے اور جو سرکشوں کے ہر سرغنہ کو طاغوت کہیں گے یہ عربی کے لفظ ''طـغٰی'' سے نکلا ہے طغية اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر چڑھنا دشوار اور طـاغيةٌ جبار و متکبر اور احمق وسخت گیر تیز معاند انسان کو کہتے ہیں۔ بجلی کی شدید کڑک اور مہیب طوفان کو بھی لیکن اربابِ لغت نے یہ کہا ہے کہ یہ زبان کا لفظ بھی ہو سکتا ہے اور وہاں یہ لفظ پروہت برہمن یا مذہبی پیشوا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہ اللہ میاں حساب لے رہے تھے حساب کر رہے تھے وہ یہاں بیٹھے دیکھ رہے ہیں کہ صاحب! ان کو جہنم میں بھیجا تھا؟ وہ Explanation ہوگا، پھر جنت کے رضوان کے دروازے پہ کھڑا ہے کہ صاحب! کسی کو اندر نہ جانے دینا، جن کے پاس ٹکٹ نہ ہو، یہ کیسے اندر چلے گئے؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! میں نے تو ایک ایک کو دیکھ کر اندر جانے دیا تھا آپ اس کی طرف دیکھیں گے پھر اللہ میاں بھی مسکرا دیں گے، یہ بھی مسکرا دیں گے۔ اس لیے کہ مرشد کا جو چوغا تھا، یہ مرید اس کے کمبل کے تاگے کے ساتھ آپ چمٹ جائیں گے۔ عزیزانِ من! یہ اُمت خرافات میں کھوگئی۔ آج ایک ہی آیت ہوئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کچھ کام کی باتیں ہو گئیں، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

چون واں باب: سورۃ البقرۃ (3) (257 تا 259)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵۷﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1969ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ سورۃ البقرۃ کی آیت 257 سے ہوتا ہے: (2:257)

پچھلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ **فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی لا انفصام لھا** (2:256) جس نے طاغوت کی طرف سے منہ موڑا' اس کا انکار کیا اور خدا کی صداقتوں پر ایمان لے آیا' اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لغت میں طاغوت کا لفظ مذہبی پیشوائیت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ مادے کے اعتبار سے طاغوت' ہر اس فرد' اس قوم' اس نظریہ' اس نظام کو کہیں گے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے لیکن لغت میں اس کے معنی مذہبی پیشواؤں کے دیے گئے ہیں۔ اور یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ مذہب انسانوں کے خودساختہ معتقدات اور نظریات کی پیروی کا نام ہے اور یہ جو مذہب کی دنیا میں خودساختہ ہوتے ہیں تو انہیں مذہبی پیشوا ہی بناتے اور گھڑتے ہیں۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ معنی بھی بالکل صحیح بیٹھتے ہیں۔ کسے باشد جو بھی قوانین خداوندی کی جگہ کسی دوسرے قانون کی اطاعت کرے گا یا کرائے گا' وہ طاغوت میں آ جائے گا اور بدترین طاغویت تو یہ ہے کہ انسانوں کے خودساختہ قوانین اور مسالک اور رسوم ہوں اور انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اسی چیز کو اب آیہ زیر نظر میں ان الفاظ میں دہرایا گیا کہ **اللہ ولی الذین أمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیھم الطاغوت یخرجوھم من النور الی الظلمٰت اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون** (2:257) طاغوت سے انکار اور خدا پر ایمان ہے۔

لغت میں طاغوت کا لفظ مذہبی پیشوائیت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ مادے کے اعتبار سے طاغوت' ہر اس فرد' اس قوم' اس نظریہ' اس نظام کو کہیں گے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے لیکن لغت میں اس کے معنی مذہبی پیشواؤں کے دیے گئے ہیں۔ اور یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ مذہب انسانوں کے خود ساختہ معتقدات اور نظریات کی پیروی کا نام ہے اور یہ جو مذہب کی دنیا میں خود ساختہ ہوتے ہیں تو انہیں مذہبی پیشوا ہی بناتے اور گھڑتے ہیں۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ معنی بھی بالکل صحیح بیٹھتے ہیں۔ کسے باشد جو بھی قوانین خداوندی کی جگہ کسی دوسرے قانون کی اطاعت کرے گا یا کرائے گا' وہ طاغوت میں آ جائے گا اور بدترین طاغوت تو یہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور مسالک اور رسوم ہوں اور انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اسی چیز کو اب آیہ زیر نظر میں ان الفاظ میں دہرایا گیا کہ **اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیٰھم الطاغوت یخرجوھم من النور الی الظلمٰت اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون** (2:257) طاغوت سے انکار اور خدا پر ایمان ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک اولیاء اللہ کوئی الگ گروہ نہیں ہے:

میں نے عرض کیا تھا کہ طاغوت سے انکار نفی ہے' لا ہے' خدا پر ایمان الا ہے۔ اب اس کے بعد کہا کہ ان دونوں سے ہوتا کیا ہے؟ خدا آقا ہے' سرپرست ہے' مددگار ہے' دوست ہے' تقویت بہم پہنچانے والا ہے۔ ولی کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ میں آگے چل کر جہاں یہ اولیا اللہ کا ذکر آئے گا' وہاں یہ عرض کروں گا کہ یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ خدا جب اپنے آپ کو ولی کہتا ہے تو اس کے معنی تقویت دینے والا' سرپرست' آقا' مددگار ہوتا ہے۔ جب وہ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خدا کے ''ولی'' ہوتے ہیں تو وہاں ''ولی'' کے معنی اطاعت گزار کرتے ہیں' فرماں پذیر کے ہوتے ہیں اور قرآن کریم کی رو سے ہر مومن اللہ کا ولی ہوتا ہے' اللہ اس کا ولی ہوتا ہے۔ یہ مومنین میں سے الگ کوئی گروہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس چیز کی تفصیلی بحث تو آگے چل کر آئے گی' ایک مقام ایسا ہی آتا ہے۔ اس وقت میں صرف یہ نہیں کروں گا کہ کہا یہ گیا ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے والوں کو خدا کی تقویت' نصرت' مدد تائید حاصل ہوتی ہے' وہ ان کا سرپرست ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کرتا کیا ہے؟

قرآن کریم نے روشنی کے لیے واحد کا اور ظلمات کے لیے جمع کے صیغے کیوں استعمال کیے ہیں:

یہاں جو اصل بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ **یخرجھم من الظلمٰت الی النور** (2:257) خدا انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی

کی طرف لے آتا ہے۔ یہاں ایسی جامع چیز کہی گئی ہے کہ نگاہِ بصیرت وجد کر اُٹھتی ہے۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن میں روشنی کو نور کہا ہے اور ہر جگہ واحد کے صیغے میں استعمال کیا گیا ہے اور ظلمات ہر جگہ جمع کے صیغے میں آیا ہے جس کے معنی ہم نے تاریکیاں کیا ہے۔ صحیح جواب تو ہمیشہ ایک ہوتا ہے' دو ہو نہیں سکتے اور غلط جواب سینکڑوں ہوتے ہیں۔ روشنی ایک ہی ہوتی ہے' تاریکیوں کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں اور جس دنیا کا یہاں یہ ذکر کیا گیا ہے' یہ یہاں Physical light & Physical Darkness (طبعی روشنی اور طبعی تاریکی) کا تو ذکر نہیں ہے۔ یہ تو انسانی فکر و نظر کی تاریکیاں ہیں' معتقدات اور خیالات کی تاریکیاں ہیں نظام اور تمدن کی تاریکیاں ہیں' بے شمار تاریکیاں ہیں اور سب سے گہری تاریکیاں تو ہم پرستی کی تاریکیاں ہیں۔ یہ ظلمات کے لفظ میں ایک اور چیز بھی بڑی گہری ہے۔ جس جگہ روشنی ہونی چاہیے' وہاں روشنی نہ ہو اور تاریکی ہو' وہاں یہ لفظ آنا چاہیے کیونکہ ظلم کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کہ جہاں کسی شے کو ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ رکھی جائے۔ غلط نظام میں جسے ہم کہتے ہیں ظلم ہو رہا ہے' ٹھیک ہے' اس کی شکلیں بڑی مختلف ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بنیادی چیز اس میں غلط نظام ہے اور غلط نظام میں ہوتا ہی یہ ہے کہ جس چیز کو' جس شخص کو' جس مقام پہ ہونا چاہیے' وہ وہاں نہیں ہوتا' اس جگہ کوئی دوسرا غلط رکھا ہوا ہوتا ہے اور اسی سے ساری مشینری جتنی بھی ہے' وہ بگڑتی ہے۔

دنیا بھر میں تباہ حال تمدنی زندگی کی وجہ جواز:

تمدنی زندگی کے اندر تو چونکہ محسوس طور پہ ہم دیکھ نہیں سکتے' اس لیے جلدی سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی مشین کے اندر پرزوں کو ایک دفعہ نکال لیے اور جب ان کو Re-Assemble کیجیے تو جس پرزے کو جہاں ہونا چاہیے' اسے وہاں نہ رکھیے۔ رکھ تو دیجیے سارے پرزے اس کے اندر لیکن کوئی پرزہ اس مقام پہ نہ ہو' جہاں اسے ہونا چاہیے اور پھر اس کے بعد جو اس مشین کا حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا حشر ہو رہا ہے' جو دنیا میں ہر اس قسم کا حشر ہو رہا ہے کہ جو چیز جہاں رہنی چاہیے' جہاں رکھنی چاہیے وہاں نہیں ہے۔ اس لیے ظلمات بھی ان تاریکیوں کو کہا جاتا ہے کہ جہاں روشنی ہونی چاہیے وہاں روشنی نہ ہو۔ یہ تاریکی کیا ہے؟ قرآنِ کریم اس کے متعلق بتاتا ہے۔

تکذیب کا قرآنی مفہوم اور خدا کی طرف سے عقل و فکر کی عظیم نعمت کی قدر و منزلت:

ایک تو انفرادی طور پہ چیز ہے' جسے ہم بھی آسانی سے سمجھتے ہیں' جہالت کی تاریکی تو ہم بھی کہتے ہیں' عقل کی روشنی ہم بھی کہتے ہیں' علم کی روشنی ہم بھی کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا۔ کہا کہ والذین کذبوا باٰیٰتنا (6:39) جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ یہاں تکذیب کا یہ لفظ بھی بڑا گہرا ہے' انکار کے معنی نہیں ہیں' انکار نہیں کرتے زبان سے اقرار کرتے ہیں' عملاً اس

کی تکذیب کرتے ہیں' اسے جھٹلاتے ہیں۔ جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں وہ **ثم وبکم فی الظلمٰت** (6:39) گونگے' بہرے' عقل وفکر سے کام نہ لینے والے ہیں۔ یہ ہیں تاریکیاں۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم نے انسان کے لیے سب سے بڑی خصوصیت جو دی ہے' وہ عقل وفکر ہے' وہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت اور استطاعت ہے' وہ غور وخوض کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کی استعداد ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ میں ذرا آگے چل کر دوسری آیت میں عرض کروں گا کہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے لیکن بنیادی خصوصیت جو انسان کو دی گئی ہے وہ حیوانات کے اُوپر عقل اور فکر ہے۔ اس سے کام نہ لینے والے صم بکم گونگے بہرے ہیں' وہ **فی الظلمٰت** تاریکیوں میں رہنے والے ہیں۔ آپ دیکھیے گا مذہب کی دنیا میں عقل وفکر سے کام لینا شجر ممنوعہ قرار دیا جاتا ہے۔ وہاں کسی چیز پہ کھڑے ہو کر غور وفکر کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اسی پہ تم کاربند رہو' آنکھیں بند کر کے اس پہ چلتے جاؤ' نہ آنکھوں سے دیکھو' نہ کانوں سے کوئی بات سنو' نہ زبان سے اس کے خلاف کوئی ایک لفظ کہو۔ اندھے بہرے گونگے بنو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو ظلمات میں ہوتے ہیں۔ پہلی چیز یہی ہے یعنی عقل اور فکر سے کام نہ لینے والے' انہیں ظلمات میں کہا گیا ہے اور اس کے برعکس جب ہم نور کہیں گے' روشنی کہیں گے' ظاہر ہے علم کی روشنی ہوگی' عقل وبصیرت کی روشنی ہوگی' فکر اور تدبر کی روشنی ہوگی۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ ہے ایک شے جو انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ ایک دوسری چیز جو قرآنِ کریم نے کہی وہ اجتماعی زندگی کے متعلق کہا ہے۔ داستانِ بنی اسرائیل میں قرآن کریم بتاتا یہ ہے کہ ان کی اپنی محکومیت کے زمانے میں وہاں تین قسم کے استبداد یا لعنتیں تھیں جو ان پر مسلط تھیں: ملوکیت کی ستم کوشیاں جسے فرعونیت کہا جاتا ہے' اس کا استبداد کہا ہے۔ ملوکیت کیا ہے؟ یہ قانون کی حکمت نہیں بلکہ کسی شخص کی حکومت ہے۔ اس کا استبداد ہے۔ ہامان یعنی مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں اور قارون یعنی نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں۔

خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کو قانون دے کر بھیجنے کا مقصد نیز آزادی اور غلامی کا قرآنی مفہوم:

یہ قرآن کہتا ہے کہ یہ تین انسانیت کی لعنتیں تھیں جو اس قوم پر مسلط تھیں اور وہ ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہم نے صاحب ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰ کو بھیجا۔ یہاں دیکھیے! یہ الفاظ یہاں آئے ہیں **ولقد ارسلنا موسیٰ باٰیٰتنا** (14:5) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے قوانین دے کر بھیجا۔ کاہے کے لیے بھیجا کہا کہ **ان اخرج قومک من الظلمٰت الی النو**(14:5) جاؤ اپنی قوم کو ظلمات سے نکال کر' نور کی طرف لے آؤ۔ یہ ساری تاریکیاں تھیں۔ یاد رکھیے! جب ہم محکومی کہتے ہیں تو ہماری اصطلاح میں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کسی غیر قوم کا آ کر کسی دوسری قوم کو اپنے تابع فرمان بنا لینا یہ محکومی ہوتی ہے۔ یعنی کوئی دوسری قوم کسی قوم پر آ کر مسلط ہو جائے اور اپنی حکومت قائم کرے تو یہ اس کی محکوم ہوتی ہے۔ اس سے اس کی آزادی چھن جاتی ہے اور آزادی سے مفہوم ہوتا ہے اپنی حکومت آپ قائم

کرلینا۔ قرآن کی رو سے محکومی اور آزادی کی یہ Definition (تعریف) نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے جماعت مومنین کے لیے مسلمان کے لیے محکومی یہ ہے کہ خدا کے قوانین کے علاوہ کسی اور کے قوانین کے تابع ہو جانا' خواہ وہ اپنی قوم کے ہاتھوں سے کیوں نہ ہو۔ یہاں قوم کا سوال ہی نہیں ہے اور آزادی یہ ہے کہ صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا۔ یہاں غیر قوم اور اپنی قوم کا پھر سوال نہیں ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ وہ قوانین کیا ہیں' وہ نظام کیا ہے' وہ آئین کیا ہے جس کے مطابق تم زندگی بسر کرتے ہو۔ یہ نہیں ہے کہ غیر خداوندی آئین وقوانین اپنی قوم کے ہاتھوں سے اگر نافذ یا مسلط کیے جائیں تو آزادی کہلائے اور کوئی دوسری آ کر مسلط کرے تو اسے محکومی کہا جائے۔ قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو ان تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاؤ۔ اب وہاں جو وادیٔ سینا کی زندگی ہے' وہاں انہیں ان تینوں لعنتوں سے رستگاری ملی۔ انسانی محکومیت کی جگہ خدا کے قوانین آئے' ملوکیت نہیں رہی' مذہبی پیشوائیت ہامانیت نہیں رہی' قارونیت نہیں رہی اور اس کا نام قرآن نے نور قرار دیا' روشنی قرار دیا۔

قرانی اقدار کے مت اگر کسی کے پاس علم' عقل' فہم اور ادراک اختیار وارادہ ہے تو نور ہے ورنہ تاریکی:

میں نے عرض کیا تھا کہ نور علم ہے' عقل ہے' فکر ہے۔ روشنی ہے لیکن تنہا یہی کافی نہیں ہے۔ عقل وفکر انسانی آنکھ ہے۔ جس طرح انسانی آنکھ دیکھنے کے لیے سورج کی روشنی کی محتاج ہے' اسی طرح سے انسانی عقل اور فکر وحی خداوندی کی روشنی کی محتاج ہے۔ ایک فرد کی عقل اسے اپنے مفاد کا تحفظ سجھاتی ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو جائے۔ افراد کے مجموعے قوم کی عقل ہے اس قوم کا مفاد سجھاتی ہے کسی طریق سے ہو جائے اور ظاہر ہے جب یہی اپنی قوم کا تحفظ مقصد ٹھہرا تو پھر کتنی قوموں کے جسم سے خون کے آخری قطرے تک نچوڑ لیے جاتے ہیں تاکہ اپنی قوم کے افراد کے چہرے پر ارغوانی رنگ چھا جائے۔ تنہا عقل تو یہ کرتی ہے' وہ اپنا مفاد سوچتی ہے' دوسرے کا مفاد سوچ نہیں سکتی لیکن وحی خداوندی اس خدا کی طرف سے دیے ہوئے معیار Standards ہیں' قوانین ہیں' جو تمام اقوامِ عالم کا' تمام مخلوق کا نشوونما دینے والا رب العالمین ہے۔ بس یہ فرق ہے انفرادی عقل میں اور خدا کی دی ہوئی روشنی میں کہ یہ انفرادی مفاد کا تحفظ کرے گی' وہ پوری انسانیت کے مفاد کا تحفظ کرے گی۔ یہ پھر صحیح روشنی ہوئی اور یہ روشنی ملتی ہے خدا کی کتاب سے' وحی کی راہنمائی سے۔

انسانی عقل کے پاس اگر وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ عقل اندھی ہوتی ہے:

انسان کی آنکھ میں نے ابھی مثال پیش کی ہے کہ اگر سورج کی روشنی نہ ہو' یعنی خارج میں کوئی بھی روشنی نہ ہو تو انسان کی آنکھ بے کار ہوتی ہے اور اگر روشنی کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو' آپ آنکھیں بند کر لیں تو روشنی آپ کے لیے بے کار ہوتی ہے۔ انسانی عقل اور وحی کی روشنی' جب یہ دونوں اکٹھی ہوں گی تو پھر آپ کو صحیح راستہ مل سکے گا۔ اسی لیے یہ جو میں نے ابھی سورۃ ابراہیم کی 5 ویں آیت تلاوت کی اس

کی پہلی آیت ہے کہ الٓر کتٰب انزلنٰہ الیک(14:1) اے رسول! یہ کتاب' یہ وحی' ہم نے تیری طرف نازل کی ہے لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور (14:1) تا کہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ یہ کتاب اس لیے دی ہے اور اس کے ساتھ رسول کا فریضہ یہ ہے کہ اس کتاب کی روشنی میں الناس کو' نوعِ انسانی کو' تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ آپ سوچیے کہ انسانیت اس وقت جب یہ کتاب اور اس کتاب کا لانے والا دنیا میں آیا ہے کن تاریکیوں کے اندر گھری ہوئی تھی۔ قرآن کے الفاظ میں نوعِ انسانی تو ہم پرستیوں اور تقلید پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مختلف قسم کے استبداد کی بڑی بڑی سلیں اس کے سر کے اوپر تھیں جن کے نیچے یہ کچلی ہوئی تھی۔ اس رسولؐ نے آ کر وحی کی روشنی میں ان زنجیروں کو توڑ دیا' ان سلوں کو سر سے اُٹھا دیا۔ انسانیت ظلمات سے نور کی طرف آ گئی۔

انسانیت کے لیے سب سے بڑی تاریکی مذہبی پیشوائیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے:

اور سب سے بڑی تاریکی جیسا میں نے عرض کیا ہے' مذہب کی پیدا کردہ توہم پرستیاں ہوتی ہیں۔ ان سے انسان نکل ہی نہیں پاتا۔ شروع شروع میں تو ان کے خلاف کچھ پھڑ پھڑاتا ہے لیکن اس کے بعد سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ جو کچھ پہلے کرتے تھے تم نے آنکھیں بند کر کے وہ کیے جانا ہے۔ جب اس کے اُوپر دو چار صدیاں' دو چار نسلیں پڑ جاتی ہیں تو یہ تو فطرت کا ایک قانون ہے' بائیالوجی (حیاتیات) کا ایک قانون ہے کہ انسان یا کوئی بھی جانور' اپنے جس حصے' جس عضو سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے' کچھ عرصے کے بعد فطرت یہ سمجھ کر کہ اس کے لیے یہ بے کار ہے' پھر اس سے وہ چھین ہی لیتی ہے۔ یہ چگادڑ شروع سے اندھے نہیں تھے' ان کی آنکھیں تھیں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں سورج کی روشنی میں بند رکھیں' اس کے بعد فطرت نے کہا کہ ان کو تو اس کی ضرورت ہے نہیں' اس کے بعد ہو ہی یہ گیا کہ وہ روشنی میں آنکھیں کھول ہی نہیں سکتے' انہیں تاریکیاں ہی مرغوب ہیں' پھڑ پھڑا اُٹھتے ہیں جب سورج نکلتا ہے۔ یہ تو غنیمت جانیے کہ ان کے بس کی بات نہیں ہے ورنہ وہ سورج کو طلوع ہی نہ ہونے دیں۔ انسانیت کے چمگادڑوں کی بھی یہی کیفیت ہے' انہیں بھی اندھیرا بڑا راس آتا ہے' اس میں خوش ہوتے ہیں۔ جونہی کسی جگہ سے بھی روشنی کی کرن آئی' انہوں نے پھڑ پھڑانا اور چیخنا شروع کیا۔ آپ سوچیے کہ کیا سورج چمگادڑ کے لیے کوئی کام دے سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اس میں اضطراب پیدا ہو' انتشار پیدا ہو۔

تقلید پرستی کی پٹی عقل شعور اور فہم وفراست کو مفلوج کر دیتی ہے:

یہی چیز ہے کہ جب تقلید کی پٹی قوموں کی آنکھوں پہ بندھ جاتی ہے' اتنا ہی نہیں کہ پھر خدا کی کتاب ان کے لیے بے کار ہو جاتی ہے' خدا کی کتاب کی روشنی اگر کسی جگہ سے آنا شروع کرے تو وہ پھڑ پھڑا اُٹھتے' چلا اُٹھتے ہیں' چیخنا شروع کر دیتے ہیں' چلانا شروع کر دیتے

ہیں۔قرآن کی آواز آئی اور ایک عالمگیر تلاطم برپا ہوگیا۔ یہ کیا ہے؟ چمگادڑ روشنی سے بھاگ رہا ہے۔لہٰذا انسانیت کے لیے وحی کی روشنی اور اپنی عقل کی آنکھ' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے چلیں گے' پھر تاریکیوں سے چل کر یہ روشنی میں آسکیں گے اور جو قوم ایسا کرے گی آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے۔

درودوصلوٰۃ کا مروّجہ تصور اور قرآن حکیم کے ہاں اس کی اصلیت اور مفہوم:

سب سے بڑی نعمت جو دی جاسکتی ہے' ہمارے ہاں بھی اس کے لیے ایک لفظ ہے' جسے ہم درود وسلام کہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں تو قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت ہے جسے سامنے لایا جاتا ہے کہ **ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیمًا** (33:56) خدا اور اس کے فرشتے نبی پر درود وصلوٰۃ بھیجتے ہیں' اے جماعت مومنین! تم بھی یہ کرو۔ میں اس وقت درود کے متعلق بات نہیں چھیڑنا چاہتا' یہ اہم موضوع ہے اور مستقل درس کا متقاضی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسی سورۃ الاحزاب میں چند آیتیں پہلے (33:43) میں ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے (جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے) رسول پر' نبی پر' درود بھیجتے ہیں۔ یہاں کیا ہے کہ **ھو الذی یصلی علیکم وملٰئکتہ** (33:43) جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ خدا اور فرشتے تم پر درود بھیجتے ہیں۔ ترجمہ میں وہی کر رہا ہوں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ چیز پوری جماعت مومنین کے متعلق قرآن کہہ رہا ہے۔ جس Context (ضمن) میں' یہ بات لا رہا ہوں اسے آپ سنیے۔ دو آیتیں پہلے سامنے لے آئیے کہا ہے کہ **یا یھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا وکثیرًا. وسبحوہ بکرۃً واصیلاً** (33:41-42) اے جماعت مومنین! قوانین خداوندی کو نہایت شدت سکے ساتھ ہر وقت سامنے رکھو' ذرا سا ان کو اوجھل نہ ہونے دو اور صبح شام التزاماً' اصراراً' تکراراً' دواماً تم اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہو۔ یہ کچھ کرو گے تو یاد رکھو! اللہ اور اس کے ملائکہ اس کے فرشتے (عام ترجمے کے اعتبار سے) تم پر درود بھیجیں گے۔ اس سے ہوگا کیا؟ یہ جو کچھ وہ کریں گے' اسے ابھی چھوڑ دیجیے کہ وہ کیا کریں گے؟ نتیجہ اس کا کیا ہوگا؟ کہا کہ **لیخرجکم من الظلمٰت الی النور** (33:43) تا کہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں۔ جماعت مومنین کا جسے یہاں ذکر کہا گیا ہے' ان تصورات کو تو چھوڑ دیجیے جو ہمارے ہاں مروج ہیں مثلاً ذکر کے معنی قلب پہ ضربیں لگانا **سجوہ** کے معنی حجرے میں بیٹھ کے تسبیح کرنا ہے۔ قرآن کے معنی لیجیے تو بات ہی کچھ اور بنتی ہے۔ برادرانِ عزیز! ضمناً بات آ گئی کہ اگر یہی چیز مقصود تھی' تخلیق آدم کے وقت فرشتوں نے جو اعتراض کیا تھا کہ یہ کس قسم کی مخلوق پیدا کی جارہی ہے؟ اس کے مقابلے میں جو استحقاق تھا کہ ہمیں حق حاصل ہے کہ یہ مقام ہمیں ملے' اس میں کہا یہ تھا کہ **ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک** (2:30) یہ تسبیح وتقدیس اگر یہی ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ اس میں تو ہم دیکھیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ جواب ملا تھا کہ **انی**

اعلم ما لا تعلمون (2:30) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے کہ یہ کیا کرے گا۔

تسخیر کائنات کے سلسلہ میں آدم کی تخلیق کا وہ مقصد جس کا علم فرشتوں کو بھی نہ تھا:

ظاہر ہے کہ یہ جو نسبح **بحمدک و نقدس لک** (2:30) یہ تو نہیں کہ فرشتے جانتے نہیں تھے' وہ تو یہ کرتے تھے تو اگر آدم کا بھی' انسان کا بھی' انتہائی مقصود یہ ہوتا کہ وہ بھی تسبیحیں پھیرتا رہے تو یہ کہنا کہ تم نہیں جانتے' ہم جانتے ہیں' یہ تو بات ہی غلط ہو جاتی ہے۔ یہی ہوتا تو وہ کہتے کہ صاحب! نہ جاننا تو ایک طرف رہا' ہم تو کرتے ہیں' یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ تم نہیں جانتے' ہم جانتے ہیں۔ نظر آیا کہ وہ کوئی اس سے بات الگ تھی کہ وہ کرنا تو ان کا ایک طرف' وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ انسان کیا کرے گا۔ یہ اس سے کچھ الگ بات ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ مقصود یہ ہے کہ فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قوانین خداوندی کے تابع نوعِ انسانی کے لیے صرف کرنا ہے۔ اور یہ کرے گا۔ اور یہ وہ چیز تھی جس کے بعد قرآن کے الفاظ میں ملائکہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ یہ تسخیر کائنات کا مرحلہ ہے لیکن پھر وہی اگلی بات جو میں نے کہی اس کتاب کی روشنی میں ان قوتوں کا صرف کرنا اور پھر وحی خداوندی کے تابع انہیں صرف کرنا' یہ بات ہوئی تو پھر تکمیل ہوئی۔ یہ نہیں ہوگا تو انہوں نے ٹھیک کہا تھا کہ تم کیا پیدا کر رہے ہو؟ یہ کہ **فیسدوا فیھا و یسفک الدمآء** (2:30) یہ تو فساد برپا کرے گا خوں ریزیاں کرے گا۔ یہاں قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ جماعت مومنین یہ وحی خداوندی کی روشنی میں کرے گی کہ **ھو الذی یصلی علیکم و ملئکته لیخرجکم من الظلمٰت الی النور** (33:43) وہ یہ کچھ کرے گی تو انہیں پھر خدا اور اس کے فرشتے اپنی تقویت کے ساتھ تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں گے۔

قران حکیم کی روشنی انسانی عقل کو ہر قسم کے خطرات سے آگاہ کر دیتی ہے:

عزیزانِ من! یہ تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف آ جانا کتنی بڑی چیز ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پہ دیکھیے کہ اگر رات کو آپ کے کمرے میں تاریکی ہو ذرا سی کہیں سرسراہٹ کی آواز آپ دیکھیے آپ پہ کتنا بڑا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اس اندھیرے میں رسیاں بھی آپ کو سانپ بن کر محسوس ہو رہی ہوتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی دیا سلائی کی جو اس کی تھوڑی سی روشنی ہے' وہ آپ کو رسی کو رسی اور سانپ کو سانپ دکھا دیتی ہے۔ روشنی کا کام یہ ہے کہ وہ ہر شے کو اس کی اصلی حقیقت میں آپ کے سامنے لے آئے۔ یہ سارا خوف' یہ سارا ڈر کاہے کا ہے؟ وہ یہی ہے کہ ہم رسی کو سانپ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بہت بڑی چیز ہے کہ رسی' رسی نظر آئے اور سانپ' سانپ نظر آئے۔ رسی سے تو ہم پرستی کی بنا پہ ڈرے نہیں' سانپ ہے تو اس کے مارنے کی تدبیر کرے۔ یہ چیز روشنی میں ہو سکتی ہے' تاریکی میں نہیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے روشنی میں آنے والے مومنین کے متعلق کہا کہ **لا خوف علیھم و لاھم یحزنون** (2:62) ان پر خوف اور حزن نہیں

ہوسکتا۔عزیزانِ من! ڈرتو اندھیرے میں ہوتا ہے' روشنی میں نہیں ہوتا اور وہ تاریکی' وہ اندھیرا جو غلط معتقدات اور توہم پرستیوں کی بنا پر انسان کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کیے ہوئے ہو'اس میں کتنا ڈر رہتا ہے یہ اپنی تاریخ سے پوچھیے اور ڈر تو وہ شے ہے جس سے انسان مقامِ انسانیت سے گرجاتا ہے۔اب آجائیے پھر اسی آیت کے اُوپر جہاں سے ہم نے بات شروع کی ہے۔کہا ہے کہ **اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیٰھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمٰت**(2:257) اس کے مقابلے میں طاغوت کی کیفیت یہ ہے کہ روشنی آ بھی جائے تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس روشنی سے ان کو تاریکیوں کی طرف لے جائے۔ایک تو یہ تھا کہ روشنی ہی نہ ہو تو یہ بات نہیں۔قرآن کہتا ہے کہ یہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں' روشنی موجود ہوتی ہے۔

قرانِ حکیم جیسی عظیم روشن' مکمل' غیر متبدل اور ہمیشہ کے لیے محفوظ ضابطہ حیات کی نعمت ساتھ ہمارا ناگفتہ بہ سلوک:

یہ روشنی کیا تھی؟ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ خدا کی کتاب تھی جس کے متعلق کہا ہے کہ یہ کتاب **تمت کلمت ربک صدقاً وعدلاً** (6:115) مکمل شکل میں دی گئی' **لا مبدل لکلمات اللہ** (6:34) غیر متبدل شکل میں دی گئی اور **انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون** (15:9) اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا۔یہ محفوظ' مکمل' غیر متبدل کتاب ہے قیامت تک کے لیے رہنے والی موجود ہے' تاریخی شہادات موجود ہیں کہ اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔روشنی کا اتنا بڑا منبع موجود ہے۔مگر پوری قوم تاریکیوں کے اندر ہے۔کون لے گیا ان کو تاریکیوں کے اندر؟ یہ طاغوت لے گیا۔اب کیا ہو؟ کہا کہ **یخرجونھم من النور الی الظلمٰت** (2:257) قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔ساری قوتیں ان کی یہ ہوتی ہیں کہ یہ قوم اس روشنی کی طرف نہ آنے پائے۔کیونکہ اگر یہ روشنی آ گئی تو سب سے پہلے تو یہ مقدسین کا طائفہ بےنقاب ہو کر سامنے آجائے گا کہ یہ ہیں کتنے بڑے دسیسہ کار اور کر کیا رہے ہیں؟ لہٰذا انہیں آنے ہی نہیں دینا چاہیے' وہ ان کو تاریکیوں میں رکھتے ہیں' عجیب عجیب قسم کے پھر حربے استعمال ہوتے ہیں۔پھر اس کے ساتھ قوت کا' طاقت کا' حکمرانوں کے گروہ کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔یہ دونوں پھر آپس میں گٹھ جوڑ ہوتا ہے' یہ قصہ چلتا ہے اور اس کی قوت کیا ہوتی ہے؟ روٹی سے محتاج کردیا جاتا ہے۔دیکھیے! وہی فرعون' ہامان اور قارون پھر اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ہامان اور اس کے جنود یہ قرآن یہ کہتا ہے۔ہامان اور اس کے لشکر کا کام یہ ہوتا ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

کہہ دو کہ تمہارا کام اللہ سے لو لگائے رکھنا ہے۔ یہ دنیا کے دھندے دنیا والوں کے سپرد کر دو' تم کیوں خواہمخواہ میں مغز مارتے ہو۔ ٹھیک ہے ہر قسم کی تاریکیاں تم پہ جو مسلط ہوتی ہیں ان کو کرنے دو' روشنی من کے اندر کی ہوتی ہے۔ ان کو اس کے اندر مست رکھو ان کا یہ فنکشن ہوتا ہے۔ رسیوں کو سانپ بنا بنا کر ان کو دکھائے چلے جاؤ۔ یہ ہے **یخرجونهم من النور الى الظلمٰت** (2:257) روشنی کی موجودگی میں جو قوم تاریکیوں کی طرف رہے اور وہیں رہ کر ان تاریکیوں کے اُوپر مطمئن ہو جائے کتنی بڑی بدنصیبی ہے اس قوم کی اور پھر انسانیت کی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے' وہ چمگادڑ کی نسل سے ہو جاتی ہیں۔ کہا ہے کہ **اولـئک اصحـاب الـنـار** (2:257) ان کی اُمیدوں اور مقاصد اور آرزوؤں کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہے۔ **هـم فيهـا خـالدون** (2:257) ان کو یہاں سے کون نکال سکتا ہے؟ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ کہیں روشنی ہو۔ روشنی کی موجودگی میں تاریکیوں کے اندر ہے' انہیں تاریکیوں سے کون نکالے۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ روشنی سے محروم قوموں کی داستان:

اب قرآن نے پھر اپنے انداز کے مطابق تاریخ کی شہادت کو پیش کیا۔ ملت حنیفا کے موسس اعلیٰ' حضرتِ ابراہیم بڑے بلند مقام پہ فائز ہیں۔ ملوکیت کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مملکت کے سب سے بڑے اسقف اعظم' سب سے بڑے پروہت' کے بیٹے تھے۔ بہت بڑا منصب' بہت بڑا مقام تھا۔ سب سے پہلے تو گھر میں باپ سے یہ چیز کہی کہ آپ کن تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں؟ اپنے ہاتھوں سے ایک مورتی بناتے ہیں' پھر اس کے سامنے جھکتے ہیں' انسانیت کی کتنی تذلیل ہے۔ بات اتنی ہی نہیں تھی۔ قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ انبیائے کرام تو غلط نظام کی جگہ صحیح نظام قائم کرنے کے لیے آتے ہیں۔ حضرتِ ابراہیم اور آلِ ابراہیم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ انہیں ملک عظیم بھی ہم نے دیا تھا۔ بات آگے بڑھی' پروہتوں سے پجاریوں سے بادشاہ تک پہنچی۔ اس دور کی شخصی حکومت کا بادشاہ تھا۔ کہا کہ **الم تر الى الذى حآج ابراهم فى ربه** (2:258) تم نے اس داستان پہ غور کیا کہ جس میں ابراہیم سے اس کے رب کے معاملے میں حجت کی تھی تکرار کی تھی۔ کیوں کی تھی؟ **ان اتٰه الله الملك** (2:258) یہ نہیں کہ حقیقتیں اس کے پاس تھیں' صداقتیں اس کے پاس تھیں' علم تھا' برہان تھا' فکر تھی' نہیں! صرف اس لیے کہ اسے بادشاہت حاصل تھی' اقتدار حاصل تھا۔ قرآن بڑی بات کہہ گیا ہے۔ صاحب اقتدار تو ہر قسم کی عقل کا' فراست کا' علم کا اجارہ دار ہوتا ہے۔ آپ کو یاد نہیں کہ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون فرعون کے ہاں گئے ہیں۔ جب وہاں جا کر بات شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم ان کی بات سنیں؟ اور اس پہ غور کریں؟ جبکہ **وقـومـهـمـا لـنـا عٰبدين** (23:47) اور ان کی قوم تو ہماری محکوم ہے' محکوم قوم کے افراد سے ہم بات سنیں۔ کوئی یہ عقل وفکر کی بات کریں گے؟ یہ اس قابل ہی نہیں

ہیں کہ ان کی بات سنی جائے۔ اقتدار کا نشہ بہت بڑا نشہ ہوتا ہے کہ بات شروع ہوئی ان اتٰہ اللہ الملک (2:258) آگے کہا کہ **اذ قال ابراھیم ربی الذی یحی ویمیت** (2:258) ابراہیم نے کہا کہ سب سے بڑی چیز موت اور حیات ہے۔ میرا رب وہ ہے کہ موت اور حیات اس کے قانون سے وابستہ ہے۔

انسانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی قدرت نے ہر ایک کے لیے قوانین واقدار مقرر کر رکھی ہیں:

عزیزانِ من! یہ موت اور حیات انفرادی موت' انفرادی زندگی' خدا کے طبعی قوانین کے تابع چلتی ہے۔ اسی کے مطابق زندگی نمود میں آئی ہے' اسی کے مطابق پھر اس کی طبعی موت ہوتی ہے۔ حضرتِ ابراہیم نے یہ بات کی۔ جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے آپ دیکھیے جیسے انفرادی زندگی کے اندر یہ صورت ہے قرآنِ کریم اجتماعی زندگی کے متعلق بھی بڑی عظیم چیز پیش کرتا ہے۔ وہ جو ٹکراؤ ہوتا ہے مدینے میں حق اور باطل کی جماعتوں کے درمیان' اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ **لیھلک من ھلک عن بینۃ یحییٰ من حی عن بینۃ** (8:42) اس لیے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو زندہ رہے وہ بھی دلیل اور برہان کی بنا پہ زندہ رہے' جو تباہ ہو وہ بھی دلیل و برہان کی بنا پہ تباہ ہو۔ ہمارے ہاں دھاندلی نہیں ہے کہ اسے تباہ کر دو' اسے زندگی عطا کر دو۔ اس کے لیے واضح قوانین ہیں' دلیل کی بنا پہ یہ ہوسکتا ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ یہ زندہ ہے' یہ اس قوم اس قابل نہیں کہ یہ زندہ رہ سکے۔ **عن بینۃ** (8:42) تو حضرت ابراہیم نے یہ بات کہی تھی کہ ان امور کا فیصلہ اس طرح سے ہوتا ہے لیکن ایک مستبد مطلق العنان آمر حاکم وہ یہ بات کیسے سن سکتا تھا۔ **قال انا احی و امیت** (2:258) اس نے کہا کہ نہیں! ہمارے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے' ہم جسے چاہے زندہ چھوڑ دیں' جسے چاہے مار دیں اور پھر جو وہ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص جس پہ سزا کے طور پر موت کا فتویٰ صادر ہو چکا تھا' پھانسی کا حکم ہو گیا تھا اسے کہہ دیا کہ چھوڑ دو' ایک جو بے گناہ شخص تھا' اسے کہہ دیا کہ تلوار مار کر اسے مار دو۔ کہا کہ دیکھیے! ہم یہ کرتے ہیں۔ یہ بات بڑی نظری سی ہو گئی۔ یہاں سے اس کے بعد یہ ثابت کرنا کہ نہیں! درحقیقت یہ جو چیز ہے' یہ ایک سبب ہے' اصل قانون یہ نہیں۔ انسان جو زہر کھاتا ہے' کیا یہی جاتا ہے کہ زہر نے اسے ہلاک کر دیا' وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے۔ گلا تلوار کاٹ دیتی ہے اس کا تلوار ذریعہ ہوتی ہے۔

کسی نبی یا کسی رسول کی دعوت کا طریق مباحثوں یا مناظروں کی شکل اختیار نہیں کرتا:

میں نے عرض کیا کہ بات یہاں سے نظری ہو جاتی تھی۔ رسول کا' نبی کا' جو طریق ہوتا ہے وہ مناظرے کا' مباحثے کا' نہیں ہوتا۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ کٹ حجتی کرتا ہے تو وہ اس میدان میں آگے نہیں جاتا۔ اس لیے کہ اس کا مقصد کوئی مباحثے میں فتح یا کامیابی حاصل کرنا تو نہیں ہوتا' اس کے سامنے تو حقائق کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ کٹ حجتیوں پہ اُتر آتا ہے تو یہ اس پہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتا' اس پہ

توانائی ضائع نہیں کرتا۔ وہ فوراً دوسرا رُخ لیتا ہے‘ ایک اور چیز سامنے پیش کر دیتا ہے‘ جس کے متعلق وہ دیکھتا ہے کہ محسوس چیز ہے اور اس کا جواب اس سے بن نہیں پڑے گا۔ ہمارے ہاں کسی فلسفی کے سامنے یہی بات آتی اور وہ یہ جواب دیتا یا ہمارے ہاں کے مذہب پرست مناظر کے سامنے یہ بات کہیں آتی تو آپ پھر دیکھتے ساری رات مناظرے میں گزر جاتی اور انجام اس کا یہ ہوتا کہ منہ سے جھاگ چھوڑ رہی ہے‘ آنکھوں سے انگارے نکل رہے ہیں‘ ماتھے پہ جفر کے نقشے بن رہے ہیں‘ پھر ہاتھا پائی تک بھی نوبت آ جاتی اور یہی وجہ ہے کہ کسی مناظرے میں‘ کسی مباحثے میں‘ کبھی کوئی چیز فیصلے تک نہیں پہنچی ہے۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ فریق مقابل کو کسی طرح سے جھٹلا دیا جائے‘ نیچا دکھا دیا جائے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ احقاقِ حق کر دیا جائے کہ صداقت کی بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔ قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ اس کو بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے۔

حضرت موسیٰ کا فرعون سے ایک بنیادی مطالبہ:

کہا ہے کہ **فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم** (20:47) حضرت موسیٰ فرعون کے پاس جاتے ہیں‘ کہتے یہ ہیں کہ ہم آئے اس لیے ہیں کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے‘ انہیں عذاب نہ دے۔ سوال بڑا Definite تھا‘ جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ آبادی کا ایک حصہ یہاں سے نکل کر دوسری جگہ چلا جانا چاہتا ہے‘ تمہارا کچھ نہیں لے جانا چاہتا۔ تم یہ پابندی عائد کر دو کہ وہ اپنے ساتھ مال دولت نہیں لے جائیں گے‘ جائیداد نہیں لے جائیں گے۔ بہت اچھا! ان کو تو جانے دو لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اگر حاکم محکوم کو جانے دے تو حکومت کس پہ کرے؟

انسانوں پر حکومت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کو اپنا محکوم تصور کیا جائے:

محکوم کے بغیر تو حکومت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے اس کو جو ایک لذت ملتی ہے‘ حکومت کے اندر اس کی خاطر ضروری ہے کہ ایک محکوم قوم‘ ایک محکوم گروہ ہر وقت موجود رہے۔ ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے جانے کیسے دے لیکن وہ یہ بات تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ان کو اس لیے باندھے ہوئے رکھتا ہوں کہ میرے اقتدار کی ہوس کی لذت مجھے ملتی رہے۔ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا‘ کوئی دوسری دلیل پاس نہیں تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ فرعون نے ایک تدبیر سوچی۔ کہا کہ موسیٰ! یہ بات تو تم چھوڑ و **قال فما بال القرون الاولیٰ** (20:51) موسیٰ! یہ بات بتاؤ کہ ہمارے بڑے اور یہ جو میرے بڑے بڑے اہلِ دربار بیٹھے ہیں ان کے جو اسلاف اور بزرگ ہیں‘ وہ کس حالت میں ہیں‘ جہنم میں ہیں یا جنت میں ہیں؟ چل بھئی‘ بات بڑی صاف تھی۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب کے عقائد کیا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشرک تھے‘ ان کے آباؤ اجداد بھی مشرک تھے۔ اب انہوں نے یہی کہنا تھا کہ وہ جہنم میں جل رہے ہیں۔ جونہی یہ کہا اور اس نے اشتعال دلایا کہ لو بھئی!

دیکھو تمہارے جو اتنے بڑے بڑے حضرات ہیں، ان کے متعلق یہ شخص کہتا ہے کہ وہ جہنم میں ہیں۔ ایک انتشار پھیل جاتا ہے آگ لگ جاتی ہے، اصل مسئلہ درمیان میں ہی رہ جاتا۔ بات تو یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو بھی میرے ساتھ جانے دو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ میرے اور ان کے اسلاف کی اس وقت حالت کیا ہے، جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں؟ آپ نبی کا انداز دیکھئے۔ انہوں نے کہا کہ **قال علمها عند ربی فی کتٰب لا یضل ربی ولا ینسی** (20:52) یہ جو بات تم نے کہی ہے، اس کے متعلق میرے خدا کو علم ہے کہ وہ کیا ہے، وہ نہ بھولتا ہے، نہ غلطی کرتا ہے۔ تم بتاؤ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

ہم مسلمان صدیوں سے علم کلام کی لاحاصل بحثوں میں اُلجھے چلے آ رہے ہیں:

یہ ہے چیز، عزیزانِ من! ان مباحث کے اندر ہماری کتنی توانائی (Energy) اور وقت ضائع ہو جاتا ہے اور مناحث یہ ہوتے ہیں کہ جنت کے آب خوروں کی تعداد کتنی ہے، جو سدرۃ المنتہٰی ہے، اس کے پتوں کی چوڑائی کتنی ہے یا یہی **بال القرون** وہی اسلاف کے متعلق کہ ان میں سے کون افضل ہے؟ کس کا درجہ بڑا ہے؟ روز یہ بحثیں ہمارے ہاں چلتی ہیں، روز سر پھٹول پہ ختم ہوتی ہیں۔ نبی تو فوراً حقیقت کی طرف آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا علم میرے خدا کے پاس ہے اور تم گھبراؤ نہیں کہ وہاں کوئی دھاندلی ہو جائے گی، بالکل نہیں ہو گی۔ صاحب انصاف بھی ہے، نہ وہ بھولتا ہے، نہ وہ غلطی کرتا ہے، اس میں ٹھیک ٹھیک ان کے ساتھ معاملہ اس نے کر لیا ہو گا جو معاملہ بھی کرنا ہے۔ میرے ساتھ یہ بات کرو کہ بنی اسرائیل کو بھیجتے ہو یا نہیں؟ برادرانِ عزیز! انبیاء کا بات کرنے کا یہ طریق ہوتا ہے۔ مقصود جدل نہیں ہوتا احقاقِ حق مقصود ہوتے ہے۔ اس نے جب یہ چیز کہی تو انہوں نے کہا کہ یہ مجھے نظری بحث کی طرف اُلجھا رہا ہے Academic Discussion ہی ہو، اس کے اندر، فلسفہ چلے، علم کلام کی بحثیں شروع ہوں۔ آپ کو معلوم ہے علم کلام کی بحثیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ کہ مثلاً خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ آپ کو معلوم ہے اس کے اُوپر کتابوں کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ کہو کہ نہیں بول سکتا تو کہتے ہیں کہ وہ تو قادرِ مطلق ہے، ہر قسم کی قدرت حاصل ہے تو اس کی اسے قدرت حاصل ہے یا نہیں کہ وہ جھوٹ بول سکے؟ وہ کہے کہ قدرت حاصل نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ قادرِ مطلق نہ ہوا اور اگر قدرت حاصل ہے تو پھر وہ جھوٹا ہوا، جھوٹ بولتا ہے۔ لگے ہوئے ہیں ان مباحث میں۔ ایک مسئلہ ہے کہ خدا اپنے جیسا خدا پیدا کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ علم کلام جسے آپ کہتے ہیں۔ دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کرتے ہیں بحث چلی ہوئی ہے کہ کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا؟ انبیائے کرام کا یہ مسلک نہیں ہوتا، یہ ظلمات میں رہنے والوں کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ ظلمات سے، تاریکیوں سے، نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نے جب یہ دیکھا تو اس نے سمجھ لیا کہ کٹ حجتی بھی کرتا ہے اور یہ جو حواری درباری ہیں ان کہ یہ نظری مسائل کے اندر اُلجھا رہا ہے۔

نظری مسائل میں اُلجھ کر رہ جانے والی قوم چاند کے نورانی چہرے کی حقیقت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتیں:

برادرانِ عزیز! جب بھی کوئی نظری مسائل میں اُلجھ جائے' پھر حقیقتیں اوجھل ہو جاتی ہیں' مقاصد فنا ہو جاتے ہیں۔ قال ابراھیم اس کا جواب نہیں دیا **فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب** (2:258) میرا خدا وہ ہے کہ جس کے قانون کے مطابق سورج صبح مشرق سے نکلتا ہے۔ اگر تیرا اقتدار ہے تو اسے تو مغرب کی طرف سے نکال کر دکھا۔ نظری مباحث میں اُلجھنے کی بجائے محسوس دلیل کی طرف آ گئے۔ کہا کہ **فبھت الذی کفر** (2:258) وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کائنات کے قانون کے اُوپر کسی کا اقتدار نہیں ہو سکتا۔ جہاں آپ کے ہاں کا جو بڑے سے بڑا صاحب اقتدار بھی ہے' کتنا ہی بڑا قوتوں کا مالک ڈکٹیٹر کیوں نہ ہو' ٹھیک ہے وہ انسانوں کے اوپر تو اپنا حکم چلا سکتا ہے' ایک چھوٹی سی مکھی کو بھی اپنے حکم کے مطابق وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُڑ کر یہاں بیٹھو یہ ہمارا حکم ہے۔ خارجی کائنات میں اس کا حکم نہیں چلتا۔ خارجی کائنات میں جہاں کوئی چیز' جسے کہیں گے حکم چلتا ہے' وہ خدا کا قانون ہی چلے گا۔ ایک قانون یہ ہے اس کے مطابق یہ ہوتا ہے' اس کے دوسرے قانون کے مطابق آپ دوسری چیز کہیں گے۔ انسان اپنے حکم کے مطابق کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم اس کو فوراً اس طرف لے آئے۔ کہو کہ کیا چلتا ہے تمہارا حکم؟ یہ بھی تو تمہاری مملکت ہے۔ **واللہ لایھدی القوم الظّٰلمین** (2:258) یہ پھر وہ ظلمات کے بعد ظالمین کا لفظ آیا۔ جو اس طرح سے یہ کیفیت اختیار کرے کہ تاریکیوں میں رہنا چاہے یا جس مقام پہ کسی کو رہنا چاہیے' وہاں نہ رہے' اس سے اور آگے بڑھ جائے' اس کو ہدایت نہیں مل سکتی' اس کو صحیح راہنمائی نہیں مل سکتی۔

مقام آدمیت کے بعد مقام انسانیت صرف تسخیر کائنات سے ہی حاصل نہیں ہوتا:

یہ چیز میں سمجھتا ہوں کہ آج یہ اور نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ گئی۔ ان قوموں نے تسخیر کائنات میں' خدا کے قوانین کو جاننے میں' پھر جاننے کے بعد ان پر عمل کرنے میں' اتنی بڑی قوتیں حاصل کیں کہ وہ سچ مچ دیکھتے ہی دیکھتے چاند کے اُوپر جا کر سوار ہوئے' وہاں سے واپس لوٹے۔ یہ مقامِ آدم ہے۔ آدم کے متعلق یہ کہا تھا کہ ملائکہ اس کے سامنے جھکے تھے۔ آدم کے متعلق کہا تھا (مثلاً) **وسخر الشمس والقمر** (13:2) اور **سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعاً معہ** (45:13) مقام آدم ہے' آدمی کے مقام کے اوپر وہ پہنچتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کے اخبار میں آپ نے دیکھا ہوگا' کہ اس ایک Week میں جس میں یہ اپولو (Appolo) کے اوپر جانے کے متعلق قوم میں اس قدر Exietment تھی' اس ایک Week کے اعداد و شمار آئے تھے کہ اسی امریکا کے اسی خطے میں کہ جہاں

یہ اپولو والا قصہ جو جا رہا تھا' کتنی ڈکیتیاں ہوئیں' کتنے قتل ہوئے' کتنی فریب کاریاں ہوئیں' کس قدر Kidnaps ہوئے' کس قدر فساد ہوئے' کس قدر خوں ریزیاں ہوئیں اور ایک خبر یہ تھی کہ اس سے پہلے جو خلانورد گیا تھا' غالباً اپولو دسویں میں یا نویں میں' اس کی بیوی نے طلاق کے معاملے میں' وہاں کچہری میں' عدالت میں' نوٹس دے رکھا ہے۔ ایک طرف کیفیت یہ ہے کہ آسمان تک کو مسخر کیے چلے جا رہے ہیں' چاند تک پہ چلے جا رہے ہیں اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ اپنے گھر کے جو مسائل ہیں اس کو حل نہیں کر پاتے۔ قوم کے اندر کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سیاہ رنگ کا نیگرو ہے' یہ وائٹ رنگ کا ہے آج تک یہ مسئلہ حل نہیں کر پایا۔ یہ ویت نام میں بری طرح سے پھنسا ہوا' اُلجھا ہوا ہے' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ ایک طرف سمجھ کی یہ کیفیت ہے کہ چاند تک گیا ہے بغیر کسی قسم کی Mishap کے۔ دوسری طرف معذوری کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو مسائل ہیں اپنی زندگی کے' تمدن کے مسائل' ان کو حل نہیں کر پاتا' کہیں سے روشنی کی کرن اس کو نہیں ملتی۔

نوع انسانی کی اس قدر زبوں حالی کا علاج صرف وحی کی راہنمائی سے ہی حاصل ہو سکے گا:

یہ ہے وہ مقام جہاں عزیزانِ من! وحی کی روشنی کام دیتی ہے۔ آج یہ کہنے والا' یہاں ہوتا کس قدر خوش ہوتا کہ قرآنی بصیرت نے کتنی بڑی بات اس کو سجھائی تھی کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

عزیزانِ من! دو منزلیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا مقام آدمیت ہے' اس سے انسان آدمی کے مقام پہ یہ ایک منزل ہے۔ ان قوتوں کو خدا کی دی ہوئی راہنمائی کے مطابق صرف کرنا دوسری منزل ہے۔ اس سے مقامِ مومن ہو جاتا ہے۔ آج یہ نوع انسان آدم کے مقام پہ ہے' مومن کے مقام پہ نہیں پہنچے۔ اب یہ تین کیٹگریز (شقیں) ہمارے سامنے آئیں۔ ایک تو وہ ہے کہ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کریں اور خدا کی دی ہوئی راہنمائی کے مطابق ان کو صرف میں لائیں' یہ مومن کہلائیں گے۔ دوسرے وہ ہیں کہ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کریں' ان کو اپنے منافع اور مقاصد کے تابع صرف کریں' فساد خوں ریزیاں ہوں' بہر حال یہ مقامِ آدم ہوگا آدمی کے مقام کے اُوپر تو پہنچ جائے گا اور وہ تیسری کیٹگری وہ ہے کہ نہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور جب اسے مسخر ہی نہ کرے' تو ان کے استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ یہ کون ہیں؟ سوچیے! صورت بگیں حالم نہ پرس' یہ ہم ہیں۔ یہی تھی وہ قوم جس کو مخاطب کر کے اقبالؒ

(1877-1938) نے کہا تھا کہ

با آدمے نرسیدی، خدا چہ می جوئی

تم تو مقامِ آدمی پہ بھی نہیں پہنچے، تم خدا کو کس طرح سے پا رہے ہو۔ تلاش خدا کی ہو رہی ہے، مقامِ آدم بھی نصیب نہیں ہے۔ مقامِ آدم کی سیڑھی کے بغیر تو انسان مقامِ انسانیت یا مقامِ مومن پہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ''تو پہلے بندے دا پتر تے بن، آدم دا ترجمہ اے ہووے گا نا پنجابی اچ❶'' یہ ہے عزیزانِ من! فرق یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ **و الله لا یهدی القوم الظالمین** (2:258) جو جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے وہاں نہیں رکھتا، ان کو انسانیت کی منزل مقصود کی طرف راہنمائی نہیں مل سکتی۔ یہ تھا وہ بادشاہ جس نے کٹ حجتی کی اور وہ بھی علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی بنا پر نہیں تھی بلکہ **ان اتٰه الله الملك** (2:258) صرف یہ تھا کہ اس کو اقتدار حاصل تھا، محض حکومت اور طاقت کا گھمنڈ تھا۔ کیا بات قرآن کہہ گیا ہے! اسی بنا پہ وہ سمجھتا تھا کہ صاحب! پوری عقل و فکر جتنی بھی ہے، اس کی Monopoly (اجارہ داری) ہمارے پاس ہے۔ یہ وہی بات ہے جو ہمارے ہاں وہ پنجابی والے کہا کرتے ہیں کہ ''جیہدی کوٹھی اچ دانے، اوہدے کملے وی سیانے۔ گھر کھان نوں ہووے تے اوہناں دے پاگل وی سیانے ہوندے ہیگے نیں۔ روٹی مکی ہووے تے بڑے توں بڑا اعقل مند وی جیہڑا اے، او وی اوس دن پاگل ہو یا ہوندا ہیگا❷۔'' لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کے ہاتھ میں یہ قوت ہو، پھر وہ یہ سمجھ لے کہ عقل اور فکر اور علم و بصیرت اور دانائی و تدبر، یہ سارے کا سارا اس کی اجارہ داری ہو گئی ہے۔ دوسرے کے پاس نہیں رہی ہے۔ پہلے چیز یہ ہے اور او **کالذی** (2:259) بات ذرا بڑی شروع ہو رہی ہے، کوشش کروں گا کہ درس کے وقت کے اندر ہی ختم ہو جائے شاید دو چار منٹ زیادہ ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم ایک دعویٰ پیش کرتا ہے، دعویٰ بہر حال نظری ہوتا ہے، اس کی صداقت کی دلیل میں تاریخ کی گواہیاں، تاریخ کی شہادات و شواہد، پیش کرتا ہے۔ اقتدار کا جابر مالک حاکم کیا کرتا ہے، وہ چیز پہلے بتائی ہے کہ وہ دلیل و برہان کے بجائے طاقت اور گھمنڈ کی بنیاد پر یہ کچھ کرتا ہے۔

---

❶ پہلے تو اس حیوان ناطق کو مقام آدم تک پہنچا (مقام مومن تو اس کے بعد کی منزل ہے) پنجابی زبان میں آدم کا ترجمہ یہ ہوگا۔

❷ جس کے بنگلے اناج سے بھرے ہیں، اس کے احمق بھی عقلمند ہوتے ہیں۔ گھر میں کھانے کو موجود ہو تو ان کے پاگل بھی عقل مند ہوتے ہیں۔ اگر روزی ختم ہو جائے تو جو بڑے سے بڑا اعقل مند ہوتا ہے۔ وہ بھی پاگل ہو جاتا ہے۔

قران حکیم اور تورایت میں بیان کردہ داستان بنی اسرائیل ایک سبق اموز داستان ہے:

آگے آئی بنی اسرائیل کی قوم۔ قرآن کریم نے اس قوم کی داستان کو بڑی ہی شرح و بسط سے بیان کیا ہے، مختلف مقامات پر وہ ان کو

سامنے لاتا چلا جاتا ہے۔ ایک تو اس لیے بھی کہ کم از کم یہ جو میسوپوٹیمیا (عراق) کا متمدن علاقہ تھا' اس میں اس قوم کی داستان ہے' عروج کا زمانہ ہے' محکومی کا زمانہ ہے' پھر یہاں سے نکل کر عروج کا زمانہ ہے' پھر وہاں سے زمانہ اور پھر اس کے بعد The Wandering Jews کا زمانہ ہے۔ یہی بڑی عجیب داستان ہے جس میں مختلف مقامات پہ مختلف کڑیاں قرآن کی دعاوی کی صداقت میں پیش کی جاسکتی تھیں۔ اس لیے قرآن نے متعدد مقامات پر اس داستان کو پیش کیا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ 612 یا 613 قبل مسیح میں بابل کے جابر بادشاہ بخت نصر نے حملہ کیا' بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس ساری قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گیا اور وہاں جا کر محکومیت کے شکنجے میں اس طرح سے ان کو جکڑا کہ ان میں شرفِ انسانیت کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ وہ دور بنی اسرائیل کے اُوپر بڑا ہی الم انگیز دور ہے۔ تورات میں اس دور کے انبیائے بنی اسرائیل کے جو نبی ہیں' ان کے جو نوحے اور مرثیے دیے گئے ہیں' وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ قوم کے دل میں ابھی ''احساسِ زیاں'' تھا۔ میں نے یہ ترکیب اقبال (1938-1877) ہی کے شعر سے لی ہے اور وہ اپنے متعلق' اس قوم کے متعلق بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

قوم مردہ میں دوبارہ زندگی کے آثار کیونکر پیدا ہوتے ہیں:

تورات میں جو اس ایک سو سال کے نوحے دیے ہوئے ہیں' اس سے یہ نظر آتا ہے کہ متاعِ کارواں تو آ گیا تھا' کارواں کے دل سے احساسِ زیاں نہیں گیا تھا اور اس سے اُمید نہ بندھتی تھی کہ اس قوم کو دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔ قریباً کوئی ستاسی سال کا عرصہ یہ وہاں رہے کہ ایران سے وہ بادشاہ اُٹھا جسے قرآن نے ذوالقرنین کہا ہے' تاریخ جسے خرص یا کیخسرو کہہ کر پکارتی ہے' جسے سائرس کہا جاتا ہے۔ وہ آیا اور اس نے آ کر بابل والوں کو شکست دی اور یہودیوں کو یہاں سے نکال کر پھر بیت المقدس میں لے گیا۔ وہاں جا کر ان کے ٹیمپل (صومعہ) کو پھر سے تعمیر کیا۔ ان کو پھر آزادی ملی' ان کو پھر زندگی حاصل ہوگئی۔ یہ قریباً سو سال کا عرصہ ہے۔ ہم جب ذوالقرنین پہ آئیں گے تو وہاں میں تفصیل عرض کروں گا۔ یہ سو سال کا عرصہ ان کی قومی زندگی میں بڑی عبرت انگیز کڑی رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں بہت کچھ لکھا ہے۔ تورات میں ان کے ایک ہزیکل نبی ہیں' اسی زمانے کا ان کا ایک خواب ہے کہ خدا نے مجھے ایک ایسی وادی میں بھیجا جہاں ہر طرف ہڈیاں ہی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کیا ہڈیاں بھی کبھی زندہ ہوسکتی ہیں؟ خداوند خدا نے مجھ سے کہا کہ تو اپنی نبوت تو کر (وہاں یہ اصطلاحیں اسی طرح سے بولی جاتی ہیں) پھر دیکھ تو سہی ان ہڈیوں میں ابھی زندہ ہونے کی صلاحیت ہے۔ تو کہنے لگے کہ پھر انہوں نے نبوت کی پھر ان میں کچھ سرسراہٹ پیدا ہوئی' پھر حرکت پیدا ہوئی' پھر ان کے اُوپر گوشت اور پوست چڑھا اور اس کے بعد پھر وہ دوبارہ زندہ ہوگئیں۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے پوچھا کہ کتنا وقت لگا؟ میرے اندازے کے مطابق تو آنکھ جھپکنے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ سو سال کا عرصہ تھا۔ یہ ہزیکل نبی کا خواب یا جسے وہ اپنے ہاں مقاشفہ کہتے ہیں' یہ چیز وہاں موجود ہے: ان ہڈیوں کا دوبارہ زندہ ہو جانا' نبی خدا کا

پیغامبر' ایک انقلابِ عظیم لاتا ہے۔ وہ ان ہڈیوں کی طرف آتا ہے جن میں ابھی حیاتِ نو کی صلاحیت باقی ہوتی ہے۔ وہ تورات کے الفاظ میں' وہاں آ کے اپنی نبوت کرتا ہے۔ یہ نبوت کرنا بڑی چیز ہے اور پھر ان میں وہ زندگی جو سوئی ہوئی تھی' وہ بیدار ہوتی ہے' اُبھرتی ہے' ہڈیوں پہ گوشت پوست آتا ہے' پھر وہ ایک نئی قوم بن جاتی ہے۔ نبی کا لایا ہوا پیغام انقلاب یہ کرتا ہے۔

فکرِ قرانی تباہ حال قوم کو بھی مایوس نہیں ہونے دیتی:

نہیں اقبال نو اُمید اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

نم سے تو وہی مٹی زرخیز ہوتی ہے جس میں ابھی روئیدگی کی صلاحیت باقی ہو۔ قرآنِ کریم یہی بیان کرتا ہے۔ مثال یہ ہے کہ کوئی بات نہیں اگر تم میں زندہ رہنے کی دل میں ابھی آرزو باقی ہے' وحی کی راہنمائی میں یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں حیاتِ تازہ مل جائے۔

ازسرِنو زندگی کی نعمت کے حصول کا طریق کار ایک مثال کی روشنی میں:

دیکھو! کہا کہ **او کالذی مر علٰی قریۃٍ وھی خاویۃ علٰی عروشھا** (2:259) دیکھیے! یہاں جو ''ک'' ہے **کالذی** اس کے معنی یہ ہیں کہ کہ یا یہ مثال یا یہ تشبیہ یا یہ استعارہ ہے۔ یہاں ک نے بات صاف کر دی ہے کہ Actually ان الفاظ کی کوئی بات نہیں ہے۔ یعنی اس کی مانند' یوں سمجھو یہ ایک مثال ہے جس کو سمجھو۔ ایک شخص کا گزر ہوا ایک ایسی بستی پر کہ جو اپنی چھتوں کے اُوپر گر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ چھتیں بھی گر پڑیں' ایک یہ ہوسکتا ہے کہ اپنی چھتوں کے باوجود ویرانہ بن گئی ہوئی تھیں' وہاں رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ معنی کچھ زیادہ موزوں نظر آتے ہیں کہ مکان ہنوز باقی ہوں' مکین ان میں نہ بس رہے ہوں۔ **قال انٰی یحی ھٰذہ اللہ بعد موتھا** (2:259) اس نے کہا کہ کیا یہ بستی یہ ویرانہ' اپنی موت کے بعد زندہ ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے تو یہ کب ایسا ہوگا؟ **فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ** (2:259) اس پہ خود موت کی سی کیفیت طاری ہوگئی' سوسال تک مردہ رہا' پھر اسے اُٹھا دیا۔ **قال کم لبثت** (2:259) اس سے پوچھا گیا کہ کہو! کتنا عرصہ اس حالت میں رہے؟ **قال لبثت یومًا او بعض یوم** (2:259) اس نے کہا کہ ایک دن یا کچھ دن کا حصہ' ایسا ہی نظر آتا ہے۔ **قال بل لبثت مائۃ عام** (2:259) اس نے کہا کہ نہیں! سوسال کا عرصہ اس پہ گزر گیا۔ **فانظر الٰی طعامک وشرابک لم یتسنہ وانظر الٰی حمارک** (2:259) گدھے کو دیکھو' جو پانی تمہارا تھا اسے دیکھو' جو کھانا تمہارا ہے اسے دیکھو کہ اتنے عرصے میں جس کھانے کو یقیناً خراب ہو جانا چاہیے تھا' گدھے کو بالکل گل سڑ کر ہڈیاں ہو جانا چاہیے تھا' ایسا نہیں ہوا' زندگی باقی ہے **ولنجعلک ایۃً للناس** (2:259) یہ اس لیے ہم نے کیا ہے تاکہ انسانوں کے لیے تمہاری یہ تاریخ ایک نشان بن جائے کہ اگر زندگی کی صلاحیت اور استعداد بالکل مفقود نہیں ہوگئی تو پھر بگڑتا کچھ نہیں ہے۔

رحمِ مادر میں ایک جنین کی جیتی جاگتی مثال

انسان زندہ رہ سکتا ہے' زندگی دوبارہ مل سکتی ہے اور کہا کہ تم ان خوابوں میں یا مقاشفوں کی طرف کیوں دیکھتے ہو؟ **وانظر الی**

العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحمًا (2:259) تم دیکھو تو سہی کہ رحم مادر میں جو جنین ہے' یہاں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ موجود تھا' وہاں تو کچھ بھی نہیں ہوتا' ایک جرثومہ ہوتا ہے' وہاں سے زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ لوتھڑا سا ہوتا ہے' اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں' ان پہ پھر گوشت چڑھتا ہے' پھر اس کے اوپر جلد استوار ہوتی ہے اور وہ زندہ جیتا جاگتا انسان کا بچہ بن جاتا ہے۔ یہ کیوں بنا ہے وہ بچہ؟ اس لیے کہ وہ جو جرثومہ اول تھا اس میں زندگی کی صلاحیت موجود تھی اور پھر قانونِ خداوندی کے مطابق رحم مادر کے اندر اس کی ربوبیت یا پرورش ہوئی۔ بس یہ ہے ساری بات۔ زندگی کی صلاحیت ہو اور پھر نشوونما کا سامان خدا کے قانون کے مطابق کسی قوم کو میسر آجائے تو پھر تو 'ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی' حیاتِ تازہ کی نمود اس میں ہو سکتی ہے لیکن اگر ان میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو' اس جرثومے کے اندر زندگی موجود نہ ہو' اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ موجود ہو رحم مادر میں' اس کی نشوونما اور پرورش قانونِ خداوندی کے مطابق نہ ہو' آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں وہ Abortion (اسقاطِ حمل) تک بھی ہو جاتا ہے۔ دونوں چیزوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

ذاتِ خداوندی نے ہر شے کے لیے اقدار' اصول اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں:

قرآن نے یہ کہا کہ ان تمثیلات کی دنیا سے نیچے اُترو۔ یہ **وانظر** جو ہے' یہ کہا ہے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے یہ بات تو روز دیکھتے ہو کہ رحم مادر میں بچہ کس طرح سے ایک جیتا جاگتا انسان کا بچہ بن جاتا ہے۔ **فلما تبین له** (2:259) جب یوں بات واضح طور پہ اس کے سامنے آگئی **قال اعلم ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر** (2:259) اس نے یہ کہا کہ میں اب جانتا ہوں کہ خدا نے ہر شے کے لیے پیمانے اور قوانین مقرر کر دیے ہیں' ان کے مطابق جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا' وہاں ان کے نتیجے سامنے آجائیں گے۔ جسے بظاہر ہم طبعی موت سمجھ لیتے ہیں' درحقیقت وہ حیات کی نفی نہیں ہوتی۔ حیات' جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' اگر اس کے اندر خوابیدہ ہوتی ہے' اس کے بیدار ہونے کے امکانات ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کے بعد پھر خدا کے نظام کے مطابق وہ قوم اپنے اندر زندگی کو بڑھانے کے' نشوونما دینے کے' سامان پیدا کر لے۔ اس وقت بھی ان کی اُمید ہو سکتی ہے۔ مایوسیاں نہیں طاری ہونی چاہئیں۔ اگر اس میں احساسِ زیاں ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو میں نے کہا ہے کہ حیات کا اس میں امکان ہو' امکان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کو ''احساسِ زیاں'' ہو۔ اگر یہ ہے اور پھر وہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے مطابق اپنی نشوونما کا سامان بہم پہنچا لیتی ہے' پھر سے اس کو حیاتِ تازہ مل سکتی ہے لیکن اس میں ایک کام اس کے کرنے کا بھی ہوتا ہے جو اس حیاتِ تازہ کی ذمہ داری لے کر آتا ہے۔ سب سے پہلے خود رسول اور رسول کے بعد رسول کی روش کے اُوپر چلنے والے جنہیں متبعین سنت کہتے ہیں اس پر وہ عمل کریں۔

ہمارے ہاں اتباعِ سنت کے وسیع تر مفہوم کو محدود تر کر دیا گیا ہے:

ہمارے ہاں تو اتباعِ سنت آپ جانتے ہیں کن چیزوں کے اندر محدود ہو کے رہ گئی۔ اتباعِ سنت تو یہ تھی کہ جس طرح سے اس عظیم پیغامبرؐ نے اس عظیم انقلاب آفریںؐ نے اس قسم کی مردہ قوم کو زندگی ہی نہیں بخشی' اتنا بڑا عروج بخشا کہ ایران اور روما جیسی سلطنتیں ان کے

پاؤں کے نیچے آ گئی تھیں۔ اتباعِ سنت یہ تھا۔ اس کے راستے پہ چلنے والی قوم کی کیفیت یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ اسی طرح سے قوموں کو ذلتوں کے گڑھوں سے نکال کر، عروج کے اُوپر پہنچاتی چلی جاتی۔ جب متبعین سنت کی یہ کیفیت ہو جائے کہ وہ روٹی تک کے لیے دوسروں کے محتاج ہو جائیں تو پھر سینے! جو قومیں بھی دنیا کے اندر اس طرح سے یہ کچھ کرتی چلی جائیں، یا تو پھر ان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے، وہی کہوں کہ ''بٹ بٹ او ہناں ول تکدے رہن ❶'' اور یا یہ کرتے رہیں کہ نہیں صاحب! یہ چیز یہ سب غلط ہی ہے۔ ٹھیک ہے صاحب ذرا سی کروٹ لی پھر سو گئے۔

---

❶ ان کی طرف حسرت و واماندگی سے پکے بکے ہو کر تکتے رہیں۔

عزیزانِ من! اتباعِ سنت یہ تھا کہ اس حالت سے قوم کو اس حالت کے اُوپر پہنچا دیا جائے۔ یہ کرتا ہے سب سے بڑا انقلاب آفریں خدا کا پیغامبر جسے رسول کہا جاتا ہے۔ وہ یہ کچھ کرتا کس طرح سے ہے؟ یہ اگلی آیت میں آئے گا اور وہ بڑی عظیم آیت ہے جس کے متعلق ہمارے ہاں کے عام تراجم میں، پھر تفسیروں میں، پھر کہانیوں میں، یہ کہا گیا ہے کہ حضرتِ ابراہیم نے خدا سے کہا کہ میں دیکھوں کہ تم کیسے مردوں کو زندہ کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں ایمان نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایمان تو ہے لیکن ذرا اطمینان نہیں ہے۔ ان سے کہا گیا کہ کوئی بات نہیں، چار پرندے لو، ان کو ذبح کرو، ان کا قیمہ کرو، پھر ان کی بوٹیاں ملا جلا کر چار پہاڑوں کی چوٹیوں کے اُوپر رکھو، پھر اس کے بعد یوں کرو اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ وہ پھر اسی طرح سے جھٹ سے وہ پرندے بن کر پھڑ پھڑا کر تمہاری طرف آ جائیں گے۔ یہ چیز جو ہمارے ہاں عام طور پہ ہے اگلی آیت میں آئے گی اور اگلی آیت میں، میں عرض کروں گا کہ پچھلی آیت میں کتنی عظیم حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ پھر سے حیاتِ تازہ مل سکتی ہے، مردہ زندہ ہو سکتا ہے، مردہ قوموں کو حیاتِ نو مل سکتی ہے۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **کیف تحی الموتٰی** (2:260) یہ ہے کہ کس طرح سے مردہ زندہ ہوتا ہے؟ یہ پوچھا تھا۔ ابراہیم نے وہ طریق پوچھا تھا کہ میرے ذمے جو اتنا بڑا عظیم کام لگایا گیا ہے کہ اس مردہ قوم کو میں نے زندہ کرنا ہے تو اس کے لیے وہ کیا طریقہ ہے؟ عزیزانِ من! قرآن میں قوموں کو زندہ کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہ 260 آیت ہو گی اور اسے ہم آئندہ درس پہ اُٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؁

❀……❀……❀

پچپن واں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیت 260)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَٮِٕنَّ
قَلۡبِىۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ
ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

عزیزان من! آج اگست 1969ء کی 3 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کے سلسلہ نو کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 260 سے ہوتا ہے: (2:260)۔

پچھلی آیت میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، تمثیلی طور پر بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل بخت نصر کے حملے کے بعد کس طرح قریب سو سال تک محکومی اور غلامی کے شکنجے میں جکڑی رہی۔ اسے قرآن نے ان کی اجتماعی موت سے تعبیر کیا ہے۔ پھر کس طرح کیسرو نے اہل بابل کو شکست دے کر یہودیوں کو ان کی غلامی کے شکنجے سے چھڑایا، پھر سے انہیں بیت المقدس میں آباد کیا، ان کے معبد کو از سر نو تعمیر کیا۔ اور اس طرح سے ایک قومی موت کے بعد بنی اسرائیل کو حیات تازہ سے نوازا گیا۔ ضمناً عرض کر دوں، دو ایک احباب نے مجھے خط لکھا ہے کہ فلاں بات ہمیں وضاحت سے سمجھا دیجئے۔ میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا، جیسا میں

نے پہلے بھی کہا تھا' میں ہفتہ بھر یہیں ہوتا ہوں۔جن صاحب کو کسی معاملے میں کچھ مزید وضاحت مطلوب ہو' وہ مجھ سے وقت لے کر تشریف لے آیا کریں اور اپنے طور پر بات کو سمجھ لیا کریں۔کسی ایک فرد کو کسی اشکال کو رفع کرنے کے لئے درس میں باقی احباب کا وقت ان سے لے لینا مناسب نہیں ہوتا۔ہاں تو میں نے عرض کیا تھا کہ پیچھے سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔اس پر اگلی آیت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔کہا ہے کہ واذا ابراھم رب ارنی کیف تحی الموتٰی قال اولم تئومن قال بلٰی ولکن لیطمئن قلبی قال فخذ اربعةً من الطیر قصر ھن الیك ثم اجعل علٰی کل جبل منھن جزءً ثم ادعھن یاتینك سعیاً واعلم ان اللہ عزیز حکیم (2:260)۔

مردوں کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم کا خدا تعالیٰ سے کیے گئے سوال وجواب کی وضاحت اوران کی نوعیت

مردوں کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابرہیم کا خدا تعالیٰ سے کئے گئے سوال وجواب کی وضاحت اوران کی نوعیت۔ جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ' آخر میں' چند لفظوں میں' یہ بیان کیا تھا کہ اس آیت کے ترجمے اور تفسیر میں جو کچھ کہا جاتا ہے' وہ بہت سے مغالطے پیدا کرتا ہے۔اس میں کہا یہ جاتا ہے کہ جب حضرت ابرہیمؑ نے اپنے رب سے کہا کہ مجھے بتا کہ تُو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ خدا نے کہا' یہ عام ترجمہ اور جو عام طور پر اس کی تفسیر بیان کی جاتی ہے' میں وہ پہلے عرض کر رہا ہوں' کہ کیا تُو اس پر ایمان نہیں لاتا؟ اس نے کہا کہ نہیں! ایمان تو لاتا ہوں لیکن میں اطمینان قلب کے لئے یہ پوچھنا چاہتا تھا۔اب اس کے بعد کہا یہ گیا ہے اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ تم چار پرندوں کو لو اور ان کو سدھاؤ' اپنی طرف ہلاؤ اور پھر ان کو ذبح کرؤ ان کا قیمہ کرو ان کے قیمے کو مکس اپ کرو۔پھر ان میں سے تھوڑا تھوڑا چار پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر رکھو پھر تم انہیں بلاؤ اور تم دیکھو گے کہ وہ کس طرح تیزی سے تمہاری طرف آتے ہیں۔یہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا۔چیز بڑی غور طلب ہے۔اللہ تعالیٰ جو ایک INANIMATE (غیر جاندار) شے کو جس میں زندگی نہیں ہوتی ہے' وہاں سے زندگی کی نمود کرسکتا ہے' زندگی کو ارتقا بخش سکتا ہے۔تو اس کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ کسی ذبح شدہ جانور' پرندے کو بھی وہ ذبح کر دے۔سوال تو اس میں نہیں ہے۔سوال تو یہ ہے کہ یہاں جو بات ہو رہی ہے اگر اس کا یہ مفہوم کر لیا جائے کو کیا اس میں کسی طرح سے اس کی کوئی تک بھی ٹھیک بیٹھتی ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ انہوں نے پوچھا یہ ہے کہ کیف تحی الموتٰی (2:260) وہ یہ نہیں پوچھ رہے کہ یا اللہ! مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا؟ یہ پوچھا جائے تو اس کے جواب میں اگر یہ ہو کہ یوں کرو اور دیکھ لو کہ ہم کس طرح سے ذبح شدہ' قیمہ کردہ' پرندوں کو از سرِ نو زندہ کر دیتے ہیں تو اس کا جواب ہوسکتا تھا۔وہ پوچھتے یہ ہیں کہ آپ یہ

کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ 'کیسے' کا پوچھتے تھے کہ مُردہ کس طرح سے زندہ ہوتا ہے؟ یہ 'کس طرح' کا جواب اگر یہ ہو کہ زندہ کو ذبح کیا جاتا ہے' اس کا قیمہ کیا جاتا ہے' اس کے بعد پھر اس کو آواز دو' تو وہ آجاتا ہے تو مُردے کو زندہ کرنے کا طریق یہ بتایا۔ کیا مُردوں کو اس طرح سے ہی خدا زندہ کرتا ہے؟ اس طریق سے کیا وہ جو خیال پیدا ہوتا تھا کہ مُردہ کیسے زندہ ہوتا ہے' کیا اس کا جواب مل گیا ہے؟ کیا آج بھی' ہمیں بھی' اس کا یہ جواب مل سکتا ہے کہ خدا اس طرح سے مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ سوچنے کی چیز ہے۔ یہ کیف کا یہ جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر 'کس طرح سے' کا جواب یہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسی طرح سے خدا زندہ کرتا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا کہ یہ کیف ہے کہ یہ کیسے زندہ کرتا ہے؟ روزمرہ کی زبان میں اپ یہ کیجئے۔ کوئی شخص ایک بڑی نادر سی چیز بناتا ہے۔ آپ کو دیکھتے ہیں کہ چیز تو وہ بنی ہوتی ہے۔ آپ کو اس کی اس بناوٹ اور خلقت پر تعجب آتا ہے۔ آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ بھئی! تم یہ بناتے کیسے ہو؟ یعنی اسے یہ تو پتہ ہے کہ یہ اس قسم کی چیز بناتا ہے اس میں اسے شبہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنے تعجب کے لئے پوچھتا یہ ہے کہ آپ اسے بناتے کیسے ہیں؟ ہم روز یہ کچھ کرتے ہیں کہ جو کوئی ایسی نئی چیز ہمارے سامنے آئے۔ اصل بات پرندوں کو اپنے پاس بلانے اور پھر انہیں سدھانے کی ہے نہ کہ انکا قیمہ کرنے کی جو بظاہر ہمیں سمجھ میں نہ آئے کہ یہ چیز کیسے بن جاتی ہے' اس کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ بھئی تم بناتے کیسے ہو؟ اور وہ یہ کہے کہ دیکھ لو یہ بنی ہوئی ہے یا نہیں؟ یہ 'کیسے' کا جواب نہیں ہے۔ وہ پوچھتے یہ تھے کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟

اصل بات پرندوں کو اپنے پاس بلانے اور پھر انہیں سدھانے کی ہے نہ کہ ان کا قیمہ کرنے کی

برادارانِ عزیز! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اگر ''کیسے'' کا طریق یہی ہے جو بتایا گیا ہے تو پھر تو ہر مردے کے ساتھ یہ ہونا چاہیئے اسی طرح سے مُردے کو زندہ ہونا چاہیے۔ اس کے آگے چلیے وہاں یہ ہے کہ پرندوں کو لو اور ان کو بلاؤ' سدھاؤ۔ ساری آیت میں کہیں یہ بات نہیں ہے کہ ان کو ذبح کرو' قیمہ کرو۔ یہ اس میں اپنی طرف سے بڑھایا گیا ہے۔ ایک تو وہ ابتدأ چیز ہے کہ یہ اس میں کیف کا جواب ہونا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے پھر اس کا ترجمہ یا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ بات نہیں بنتی۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے' پہلی چیز تو اس کے اندر یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے ہاں کتب تفاسیر میں آئی ہیں۔ حضرات مفسرین علیہ الرحمۃ نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق' قرآن کریم کو سمجھا' اس میں کچھ لکھا۔ یہ ایک انسان کی سمجھ ہے' دوسرا انسان اس سمجھ کے اوپر تنقید بھی کر سکتا ہے' کسی کے مفہوم کے اوپر اعتراض بھی کر سکتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا چلا جائے گا' یہ چیزیں بھی تبدیل ہوتی چلی جائیں گی' ان میں اصلاح ہوتی چلی جائے گی' علم بڑھتا چلا جائے گا اور سمجھ کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ اگر یہ بات یہاں تک رہتی تو وہ کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی کہ اگر پہلے کسی مفسر نے کوئی بات لکھ دی ہے تو بعد کا آنے والا اگر دیکھے کہ اس میں ان کو کہیں سہو ہو گیا ہے' غلطی لگ گئی ہے' ان کا فہم صحیح

نہیں ہے وہ اس سے اختلاف کر لے لیکن پہلی چیز تو ہمارے ہاں یہ ہوگئی کہ نہیں صاحب! اسلاف نے جو کچھ سمجھ لیا ہے اس پر اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ خیر! یہاں تک بھی کسی سے جھگڑا جا سکتا تھا۔ خود ہمارے ہاں بھی تو ایک گروہ ایسا ہے جو آئمہ کی تقلید کو جائز قرار نہین دیتا۔ یہاں تک کہا جا سکتا تھا کہ وہ بھی انسان تھے ہم بھی انسا ہیں ہر ایک کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بات سمجھے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے سلسلے میں اصل دشواری اور اسکا نتیجہ

دشواری یہاں آ جاتی ہے کہ یہ حضرات جو کچھ انہوں نے اپنے ہاں لکھا ہے اس میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ تفسیر ہماری نہیں ہے یہ ایک روایت رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے۔ اور جب بات یہ ہو جائے کہ فلاں آیت کا مفہوم نبی اکرم ﷺ نے یہ سمجھایا کون سا مسلمان ہے جو اس کے بعد جرات کرنا تو ایک طرف دل میں یہ خیال بھی لا سکے کہ میں اس سے بہتر سمجھ سکتا ہوں (معاذ اللہ) یہ ہو نہیں سکتا۔ اب لبوں پر مہر لگ گئی لبوں پر ہی نہیں دل میں بھی آپ یہ خیال نہیں کر سکتے لیکن مشکل تو یہاں آ جائے گی کہ یہ آپ کے ہاں مجبوری تو ہو گی کہ اس سے آپ اختلاف نہیں کر سکے دل میں شکوک کا ابھرنا تو آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس پر کیا کہیں گے؟ زبان پر نہ لایئے نوک قلم پر نہ آنے دیجئے لیکن آپ کا دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے۔ اب اس سے جتنے COMPLEXES پیدا ہوں گے وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔

روایات کو اکٹھا کرنے کے طریق کی وضاحت اور انکی نوعیت

اب آپ روایات کی طرف آئیں۔ جیسا کہ میں دس برس سے یہاں بار بار آپ حضرات کی خدمت میں یہ چیز پیش کرتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ جتنی روایات ہیں ان کے متعلق خود یہ جو احباب ہیں یہ کہتے ہیں یہ منسوب الی الرسول ﷺ ہیں یعنی حضور ﷺ کی طرف ان کی نسبت کی گئی ہے۔ حضور ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال کے بعد یہ مجموعے مرتب ہوئے کسی اس سے پہلے تحریری مواد کی بنا پر نہیں زبانی روایات کے سلسلے میں پانچ پانچ چھ چھ راوی درمیان میں آئے۔ پھر ان کے ہاں یہ چیز بھی مسلّمہ ہے کہ یہ کوئی جو حدیثیں ہیں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نہیں ہیں مفہوم ہے جو سمجھا۔ دو سو سال کے عرصے میں کتنے لوگوں نے ایک نے کہا دوسرے نے اپنے طور پر کچھ سمجھا جو سمجھا اسے آگے منتقل کیا۔ پھر آگے اگر اس میں وضع تحریف وغیرہ کو چھوڑ بھی دیا جائے دانستہ کسی نے کچھ کیا اگر اسے چھوڑ بھی دیا جائے۔ غیر شعوری طور پر یہ جو طریق ہے یہ پروسیس ہے بجائے خویش کہ اس طرح سے دو سو سال کے اندر مفہوم اپنا اپنا آگے منتقل ہوتا چلا جائے آپ دیکھئے بات کہاں سے کہاں جا نکلتی ہے۔ پھر ہر حدیث کے ساتھ یہ چیز کہنی ہوتی ہے پہلے قال رسول ﷺ آخر میں کہا جاتا ہے او کما قال یا رسول ﷺ یہ یا جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا ہو۔ ان کی پوزیشن یہ ہے لیکن ان میں سے کسی بات کے متعلق کچھ کہیے تو یہ کہ یہ

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا انکار ہے بڑی زیادتی ہے۔ وہ حضور ﷺ کے کسی ارشاد کا انکار نہیں کر رہا' وہ کہہ یہ رہا ہے کہ اس ارشاد کی' اس قول کی' نسبت حضور ﷺ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ اور اس کے لئے وہ دلیل دیتا ہے۔

حضرت ابرہیمؑ کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے بیان کردہ ایک روایت

یہاں سب سے پہلے جو روایت میں بات آئی وہ یہی چیز ہے قال اولم تئومن قال بلٰی (2:260) کیا تم ایمان نہیں لاتے؟ کیا تم ایمان نہیں لاتے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! لیکن میں اطمینان چاہتا ہوں۔ اب اس میں روایت میں یہ بات آئی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق ہے جب اس نے کہا تھا کہ رب ارنی کیف تحی الموتٰی (2:260) شک کرنے کا حق ہے۔ گویا یہاں سے یہ مسلمہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ نے اس میں سک کیا تھا۔ خدا کے ایک ایسے اولوالعزم پیغمبر کے متعلق یہ چیز کہ اس نے اس بات میں شک کیا تھا کہ خدا مُردے کو بھی زندہ کر سکتا ہے یا نہیں' ایمان بالآخرت تو ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے لئے بھی ایمان کی شرط ہے۔ موت کے بعد کی زندگی کے لئے بھی شرط ہے۔ اس بنیادی چیز کے اندر ایک عظیم پیغمبر کو رسولؑ کو شک گزرتا ہے۔ ایک رسولؑ کو تو شک گزرا اور حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں شک کرنے کا ان سے بھی زیادہ حق ہے۔

ایک بادشاہ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے ایک مناظر کی قرآنی وضاحت

اگر انبیائے کرامؑ کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ دین کے اتنے بڑے بنیادی اصول کے متعلق شک کرنے لگ جائیں تو ایمان کی جو بنیادی چیز ہے' حصہ ہے' جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ایک پیغمبر شک کرنے لگے دوسرا پیغمبر ان کے شک کی تصدیق پہلے کرے کہ انہوں نے کیا تھا' پھر اپنے متعلق کہے ہمیں ان سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق حاصل ہے۔ تو یہ شک کی بات کس کے متعلق کہی جا رہی ہے؟ یہ ہے (2:260) آیت اور یہ (2:258) آیت آپ کے سامنے گزر چکی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کا بادشاہ کے ساتھ وہ مناظرہ بتایا گیا ہے کہ جہاں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اذ قال ابراھم ربی الذی یحی و یمیت (2:258) ایک ہی آیت پہلے قرآن میں یہ موجود ہے۔ ابرہیمؑ اس بادشاہ سے یہ کہتے ہیں کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے' جو مارتا ہے یا زندہ کرتا ہے۔ اور یہاں یہ چیز' ان کا یہ قول' موجود ہے۔ ابھی ابھی جو اس شخص کے ساتھ مناظرہ کرتے ہوئے یہ کہیں کہ رب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مُردہ کو زندگی بھی عطا کرتا ہے' کیا وہ ابراہیمؑ اس بات میں خود شک میں ہو گئے کہ خدا زندہ کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔

پرندوں کو پکڑ کر انہیں ذبح کرنے اور پھر ان کا قیمہ کرنے کا ذکر قرآن حکیم میں کہیں نہیں ہے۔

عزیزانِ من! غور فرمایا آپ نے؟ ایک آیت پہلے جو ان کی بات آئی ہے۔ اس پر نگاہ نہیں ہے۔ پھر آگے کیف ہے۔ پھر آگے

جو کچھ آ رہا ہے چار پرندے لیجئے' سدھایئے اب اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ان کو ذبح کیجئے' ان کا قیمہ کیجیے اور پھر پہاڑوں کے اوپر رکھیے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ سب کچھ کرنے کے بعد کیا یہ کیف کا جواب ہو جائے گا؟ کہ تو کیسے مُردوں کو زندہ کرتا ہے؟ بات یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ قران کریم میں موت اور حیات کے لفظ آتے ہیں۔ یہ جسے آپ طبعی موت (PHYSICAL DEATH) کہتے ہیں یہ بھی ہے' طبعی حیات (PHYSICAL LIFE) ایک فرد کی' چلنے پھرنے والے کی' یہ بھی ہے۔

تصریف آیات کی بنا پر قرآن حکیم میں موت وحیات کا مفہوم

قرآن کریم تو بے شمار مقامات میں' وہ افراد جو علم اور عقل سے کام نہیں لیتے' جو غلط راستوں پر چلتے ہیں' سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے' ضد پر اڑے رہتے ہیں' جو انسانی سطح پر زندگی بسر نہیں کرتے' حیوانی سطح پر سانس لینے کی زندگی بسر کرتے ہیں' انہیں مردہ کہتا ہے۔ پھر جب وہ عقل و شعور سے کام لیتے ہیں' قرآن کے حقائق کو سمجھتے ہیں' زندگی کی بلند سطح جسے انسانیت کی زندگی میں نے عرض کیا ہے' اس تک پہنچتے ہیں' انہیں وہ زندہ کہہ کر پکارتا ہے۔ افراد میں وہ یہ کچھ کرتا ہے اقوام کے متعلق بار بار وہ یہ کہتا ہے۔ ہمارے ہاں مُردہ قوموں کے لئے ہم روز یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قوموں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے روز ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ہم حیات تازہ' حیات نو' قوم پر صدیوں تک مردنی چھا گئی' پھر اسے ایک نئی زندگی عطا ہوئی کہتے ہیں۔ یہی چیزیں عربی زبان میں استعمال ہوتی تھیں۔ قرآن کریم کے تمام مقامات کو سامنے لانے کا تو وقت نہیں' نہ اس کی ضرورت ہے' دو چیزیں میں نے عرض کی ہیں: افراد جو عقل و فکر سے کام نہ لیں' جو وحی کی روشنی میں نہ چلیں' انہیں قرآن مردہ کہتا ہے۔ کہا ہے کہ او من کان میتاً فاحیینٰہ و جعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمٰت (6:123) کیا وہ شخص جو مردہ ہو پھر اسے زندگی عطا ہو جائے' فاحیینٰہ پھر ہم اس کو زندہ کر دیں' یہیں بات سمجھائی کہ کیا کر دیں؟ اسے ہم ایک روشنی دے دیں' جسے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے انسانوں کی دنیا میں چلے پھرے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں موت کسے کہا گیا ہے؟ زندگی کیا کہی گئی ہے؟ لفظ میتاً ہے اور فاحیینٰہ ہے۔

ہر وہ قوم اور ہر وہ فرد جس کے ہاتھ میں وحی کا چراغ نہ ہو وہ اندھا ہے وہ مردہ ہے

اب اگر ہم وہی ایک ہی معنی PHYSICAL DEATH & PHYSICAL LIFE (طبعی موت اور طبعی زندگی) لیں' یہاں وہی چیز ہو جائے گی کہ سچ مچ کا ایک مردہ ہے' DEAD BODY ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کریں' پھر اس کے ہاتھ میں ایک دیا دے دیں' پھر روشنی دے دیں' پھر وہ اس سے چلے پھرے۔ بات یہ تو نہیں ہے۔ اس وحی کی شمع کا ہاتھ میں نہ ہونا' اسے موت قرار دیا گیا ہے افراد کی بھی اقوام کی بھی۔ اور اس لئے آگے خود ہی کہا کہ کمن مثلہ فی الظلمٰت (2:258) کیا یہ اس کے برابر ہو جائے گا

جو تاریکیوں میں ہی پھر رہا ہے؟ تاریکیوں میں چلنے پھرنے والے، سانس لیتے ہیں، جسے آپ طبعی زندگی کہتے ہیں ہر عنوان سے وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں، زندہ ہیں مگر قرآن انہیں زندہ نہیں کہتا۔ اس کے نزدیک تاریکیوں میں چلنے والے زندہ نہیں کہلاتے۔ وحی کی روشنی میں سفر حیات طے کرنے والے زندہ کہلاتے ہیں۔ افراد کے متعلق میں نے یہ کہا۔ آگے چلیے۔ جماعت مومنین سے خطاب ہو رہا ہے، طبعی طور پر ان کے زندہ ہونے میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

مُردہ قوم جو وحی کا سہارا حاصل نہیں کرتی پھر زندگی پھر وہ اپنا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی رہتی ہے۔

کہا ہے کہ یایھا الذین امنو ااستجیبو اللہ وللرسول اذا دعا کم لما یحییکم (8:24) اے جماعت مومنین! لبیک کہو تم خدا اور اس کے رسول کی آواز پر جب وہ رسول تمہیں کس چیز کی طرف بلائے۔ لما یحییکم (8:24) جو تمہیں زندگی عطا کرے۔ اب ظاہر ہے کہ خطاب تو یہاں زندعوں سے ہو رہا ہے یعنی جو طبعی طور پر زندہ ہیں، ان سے خطاب ہو رہا ہے: یایھا الذین امنوا (8:24) تو زندہ جماعت ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ تم لبیک کہو اس کی آواز پر جب وہ تمہیں بلائے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ یہاں زندگی کی دو سطحیں صاف واضح ہیں۔ ایک وہ ہے جو زندہ ہیں، چلتے پھرتے ہیں، اپنا جنازہ اپنے کندھے پر خود اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک وہ زندہ ہیں جو انسانیت کی زندگی جیتے ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جو اس زندگی کے بعد بھی اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے، بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن نفس شماری کا نام زندگی نہیں قرار دیتا، وہ نفس گدازی کو زندگی قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ طبعی طور پر چلنے پھرنے والے انسانوں سے بھی کہتا ہے کہ تم مُردہ ہو، آؤ زندگی کی طرف، آؤ تمہیں میں وہ آب حیات دوں جو تمہیں فی الحقیقت زندگی عطا کرے، تمہیں انسانی سطح پر جینے کا طریق بتائے۔ یہ کروڑ در کروڑ انسان، ایک طبی پروسیس کے ذریعے سے وجود میں آ جاتے ہیں، پیدا ہو جاتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں۔

زندگی کی سرفرازئیں صرف تارِ نفس میں اسیر رہنے سے حاصل نہیں ہوتیں

قرآن کہتا ہے کہ کیا تم ان کو انسان سمجھتے ہو؟ سنو! اولئك كالانعام بل هم اضل (7:179) وہ انسان نہیں ہیں، حیوان ہیں۔ حیوان کے لفظ پر، تو لفظی معنی زندہ ہی ہیں، ANIMATED کو کہتے ہیں چلنے پھرنے والا زندہ ہے، ڈاکٹر کے CERTIFICATE کی رو سے زندہ ہے لیکن انسانیت کی بارگارہ سے اس کو زندگی کا CERTIFICATE نہیں مل سکتا۔ اس نے کہا کہ آؤ! صرف سانس لینے کو زندگی سمجھنے والو! آؤ تمہیں بتائیں کہ زندہ کسے کہتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو مثالیں ہی کافی ہو جائیں گی ورنہ میں نے جیسا عرض کیا ہے، قرآن کریم کے بے شمار مقامات میں، ان انسانوں کو جو محض کھانے پینے مرنے تک کو زندگی سمجھتے ہیں، مردہ کہا

گیا ہے۔زندہ اسے کہا گیا ہے جو خدا کی عطا فرمودہ روشنی میں سفر حیات کو طے کر کے انسانیت کی سطح پر چلتا ہے۔اور اسی طرح سے افراد سے آگے بڑھ کر جو اقوام زوال اور حبوط کی پستیوں میں گر جاتی ہیں' انہیں وہ مردہ قومیں شمار کرتا ہے اور جو عروف کی زندگی بسر کرتی ہیں انہیں وہ زندہ قومیں کہتا ہے۔وہی جو ایک ہی آیت پہلے بنی اسرائیل کے قصے میں اس نے یہ کہا تھا کہ وہ قوم سو سال تک مردہ رہی' پھر اسے زندگی ملی تھی حالانکہ وہاں سانس لیتی تھی' زندہ تھی' ان کا تو تاریخ میں شمار بھی لکھا ہے کہ کتنے افراد تھے مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ زندہ نہیں تھے۔ تو بات کیا ہوتی ہے؟

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد نوع انسانی کو انسانیت کی منزل سے روشناش کروانا تھا۔

رسول آتا ہے' اس کے ذمے ایک عظیم کام ہوتا ہے۔رسول آتا ہے مردوں کی بستی میں' ان انسانوں کی طرف جو انسانیت کی سطح پر زندگی بسر نہیں کر رہے ہوتے۔اگر وہ پہلے سے ہی اس سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔وہ تو آتا ہی اس وقت جب ظھر الفساد فی البر و البحر (30:41) کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔زبان کے اعتبار سے' قرآن کی اصطلاح میں' وہ مردہ قوموں کی طرف آتا تھا۔ابھی ابھی وہ کہہ رہا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔وہ آتا ہے' مُردہ قوم کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنی نبوت کے آب حیات کو ان مُردوں میں حیات تازہ کی روح پھونکتا ہے۔ہر رسول یہی انقلاب کا پیغام لے کر آتا ہے اور اس کی نبوت اس پیغام کو ایک عملی تشکیل دیتی ہے' وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔منصب نبوت تو یہ ہے کہ وہ خدا سے اس فارمولے کو لیتا ہے' جس سے مردہ زندہ ہوتے ہیں اور پھر رسالت یہ ہے کہ اس کو عملاً متشکل کرتا ہے' اس فارمولے کے ذریعے مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ذرا سوچیے تو سہی عربوں کی وہ حالت' جو نبی اکرم ﷺ کے ظہور قدس سے ذرا پہلے تھی۔کوئی قوم ان کو زندوں میں شمار ہی نہیں کرتی تھی۔کہیں برابر یا مساوات کے طریقے پر ان کے ساتھ برتاؤ کرنا تو ایک طرف' یہ سات پڑوس میں ایران تھا' وہ (ایرانی) ان کے ساتھ جنگ کرنا باعث شرم سمجھتے تھے۔ان مقام سے مُردوں کو بسی میں یہ صور اسرافیل پھونکنے والا آتا ہے۔پانچ سات سو سال کا عرصہ نہیں لگتا' خود اپنی ہی زندگی کے اندر وہ انقلاب پیدا کرتا ہے کہ یہ پھر ساری دنیا میں زندگی بانٹتے پھرتے ہیں۔سوچیے کہ ان کے ہاتھوں سے یہ شمع نورانی نے کس کس مقام میں زندگی کی کرنیں ہویدہ کر دیں۔وہاں سے چلے ہیں' ہندوستان سے ہوتے ہوئے' چین تک زندہ ہوتا چلا جاتا ہے' سپین تک زندگی کی لہر بحر تموج کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے' افریقہ کا سارا صحرا زندہ ہو جاتا ہے ایران اور یہ جو بازنطینی حکومتیں ہیں' ان کے علاقے میں زندگی پھیل جاتی ہے' ہر جگہ زندگی لہریں مارتی ہوئی ابھرتی ہے۔تاریخ HISTORY کے صفحات میں آپ دیکھیے کس طرح

زندگی ایک نئی نمود کے ساتھ آپ کو نظر آتی ہے۔ یہی وہ فریضہ ہوتا ہے جو رسول کے ذمے عائد کیا جاتا ہے کہ جاؤ اور ان قبرستانوں میں جا کران مُردوں کو زندہ کرو۔ منزل بڑی کٹھن نظر آتی ہے قرآن رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك (94:2) دیکھو وہ بوجھ کہ جس نے تیری کمر کو توڑ رکھا تھا' کس طرح سے ہلکا ہو گیا۔ یہ بہت بڑا فریضہ ہوتا ہے صاحب! قوم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ یہ ہزار دلائل اور بصیرت افروز حقائق پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ نہیں صاحب! جس روش پر ہمارے اسلاف چلتے چلے آرہے ہیں' ہم اس پر ذرا ادھر ادھر ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ ان کے غم میں جان گھلا دیتا ہے' وہ اینٹیں مارتے ہیں' وہ پتھر مارتے ہیں۔ یہ حقائق پیش کرتا ہے' وہ استہزا کرتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں۔

معراج انسانیت کے بلند ترین مقام پر جلوہ فروز شخصیت ﷺ کے کردار اور آپ ﷺ کے صبر واستقلال کی ایک جھلک

عزیزانِ من! یہ بڑے صبر آزما مراحل ہیں۔ اور یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ ما اسئلکم علیه من اجر (25:57) میں اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ اتنا بے لوث شخص ہے' اتنا ایثار پیشہ ہے کہ ساری زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ یہ وہ ہے کہ جسے پیشکش OFFER دی جاتی ہے کہ چاہتے ہو تو سارے عرب کی حکومت ہم تمہیں دے دیتے ہیں' دولت تمہارے قدموں میں نچھاور کر دیتے ہیں عام انسانوں کو جن چیزوں کی ہوس اور طلب ہوتی ہے وہ سب مہیا کر دیتے ہیں مگر یہ بات کہنا چھوڑ دو۔ وہ اس حالت میں صاف جواب دیتا ہے جب بظاہر دنیا کے معیار سے کوئی اس کا سہارا نہیں ہوتا۔ وہ ایک جو سہارا دینے والا ہے' وہ اس چچا کو بھی یہ کہہ دیتا ہے کہ اور تو سب بات مانوں گا مگر یہ بات نہیں مانی جا سکتی' میرا تو منصب ہی یہ ہے کہ میں یہ کچھ کروں۔ جنہیں وہ زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے' ان کی طرف سے یہ جواب آتا ہے: پتھر مارے جاتے ہیں' اینٹیں ماری جاتی ہیں۔ اور میں نے جیسا عرض کیا ہے' ان سب سے زیادہ سخت مرحلہ یہ ہے کہ اس کا استہزا اور مذاق اڑایا جاتا ہے۔ آپ ذرا کر کے کہیں دیکھیے' دلیل پیش کیجئے' برہان پیش کیجئے' حقیقت پیش کیجئے' علم اور بصیرت کی رو سے بات کیجیے اور اگلا سننے کے بعد ہنس دے۔ اس کے لیے بہت بڑے جگر کی ضرورت ہے اور وہ جو انقلاب کا پیغام لے کر آیا ہوا ہو' اس کا تو سینہ اتنا کشادہ ہونا چاہیے قرآن کہتا ہے کہ الم نشرح لك صدرك (94:1) یہ ہے شرح صدر۔ اتنی وسعتیں سینے کے اندر آ جائیں' یہ سارا کچھ ہو رہا ہو' نہ تو حوصلہ ہارے' نہ اس کی ہمت جواب دے' نہ چڑ چڑا پن پیدا ہو' نہ اس کو غصہ آئے نہ ہی مریض کی بالیں سے یہ کہہ کر اٹھ جائے کہ اگر تُو اس قدر ہی بدپرہیز واقع ہوا ہے تو جا جہنم میں۔ بڑی برداشت کا مادہ ہونا چاہیے۔ قوم کی یہ حالت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کا فریضہ حیات اور مخالفت کی انتہا اور پھر قوم کی ذہنی سطح کا ماجرا

نبی سے یہ کہا جاتا ہے کہ جاؤ! اس قبرستان میں جا کر ان مُردوں کو زندہ کرو۔ اس قوم کی طرف حضرت ابرہیمؑ آئے تھے۔ سوچیے! گھر میں باپ تھا، قوم کی ذہنی سطح یہ تھی کہ وہ باپ سے کہہ رہے ہیں اور وہ کسی عام حیثیت کا انسان نہیں، اس زمانے کی بادشاہت میں وہ سب سے بڑا پروہت ہوتا تھا، وہ بادشاہ سے بھی زیادہ اقتدار کا مالک ہوتا تھا۔ وہ ہے باپ، یہ اس سے کہتے ہیں کہ ابا جان! یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ ہاتھ سے ایک مورتی گھڑتے ہیں، پھر اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ جواب یہ ملتا ہے کہ اس کے بعد اگر تم نے یہ دہرایا اور باز نہ آئے تو یاد رکھو! دیس نکالا کر دوں گا۔ کہا کہ ابا جان! کیا میری بات کا یہ جواب ہے؟ اس نے کہا کہ خاموش رہو۔ یہ آگے بڑھ کر بات کرتے ہیں، ایسا عمدہ وہ انداز ہے، جب بات آئے گی وہ جوان کے مندر میں جا کے آپ نے یہ کیا ہے، ان سے دو باتیں کی ہیں اور وہ لاجواب ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ مبہوت ہو گئے، سارے پروہت لاجواب ہو گئے۔ اس کے بعد تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر ان کی بات کو مان لیتے۔ کیا کیا انہوں نے؟ وہی جو ہر مذہب کرتا ہے، دہائی دیدی: بھاگو، دوڑو، تمہارے اسلاف کی بے عزتی ہو گئی، تمہارے معبودوں کو گالیاں دیں، ان کے ٹکڑے کر دیئے پکڑو، لاؤ، اس کو جلا دو، زندہ آگ میں ڈال دو۔ برادران من! جواب یہ مل رہا ہے۔ یہ جواب ملتے ہیں، وہ دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ یہ ہے جو اس کے ذمے کام لگایا جاتا ہے، جو مشن اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔

ناگفتہ بہ حالت میں خدائے علیم سے حضرت ابراہیمؑ کا استفسار

جب یہ کہا جاتا ہے کہ جاؤ! یہ کام کرو، یقیناً یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ اس بات کو تو خدا کہنے والا ہے، اس پر تو میرا یقین ہے، جو تُو کہتا ہے کہ ٹھیک ہے مردے زندہ ہو جائیں گے، اس قوم کو حیات تازہ مل جائے گی، یہ میرا ایمان ہے لیکن مجھے جو تُو کہتا ہے کہ تُو کر، میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیسی عجیب منطق کی بات ہے۔ کسی اپنے سے بڑے سے، کسی استاد سے، کسی معلم سے، اس کی بات پر تو یقین ہے کہ یہ جو کچھ کرتا ہے، وہ ٹھیک ہے، دیکھا ہوا ہے۔ اب اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تُو بھی کر، وہ اس کے بعد پوچھے گا کہ صاحب! اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ اس لئے کہ اگر میں نے اپنے طریق پر شروع کیا تو وہ ہو سکتا ہے کہ وہ طریق غلط ہو۔ محنت بھی میں کروں، کوشش بھی کروں، اس کے بعد اس کا نتیجہ مرتب نہ ہو تو وہ تو آپ سوچتے ہیں اس سے کتنی COMPLICATIONS (الجھنیں) پیدا ہو سکتی ہیں۔ خود اس کے اپنے دل میں ہی، اپنے میں نہ ہو، تو وہ جتنا سامنے کی دنیا ہے، جن کو دعویٰ کیا تھا کہ دیکھو میں تمہیں زندگی عطا کر کے بتاتا ہوں، سب کچھ کر لیا، اس کے بعد کوئی بھی زندہ نہیں ہوا، کسی فرد کو زندگی نہیں ملی، قوم کو حیات تازہ نہیں ملی، تو دنیا کیا کہے گی؟ یقیناً اس کو اس پروگرام کے متعلق بھی یقین ہونا چاہیے کہ یہی صحیح پروگرام ہے، جس کے مطابق چلنے سے یہ چیز ہو جائے گی، یہ نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔ ایمان تو ہے اس

چیز پر کہ تو کہتا ہے تو ہوسکتا ہے' مجھے اطمینان اس صورت میں ہوگا جب تُو خود مجھے بتائے کہ اس کے کرنے کا طریقہ یہ ہے تا کہ میں اسی طریقے کے اوپر چلوں۔ میں TRIAL & ERROR (سعی وخطا) کے طریقے پر نہ چلوں کہ تجرباً ایک طریق میں نے اختیار کیا' کچھ عرصے کے بعد جا کر دیکھا کہ اوہو! یہ تو بات غلط نکلی اور پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اتنی لمبی عمر کس کی ہے؟ اتنی فرصت کو کس ہے؟ پھر نا کام تجربے کے بعد جو دنیا کہے گی' وہ بھی تو سوچیے۔ اس لئے رسول TRIAL & ERROR (سعی وخطا) سے یہ کچھ نہیں کرتا اس کے سامنے ایک طریق بھی اس کا متعین ہوتا ہے کہ کیسے کرنا ہے۔ یہ پوچھا تھا ابرہیمؑ نے۔

عزیزانِ من! سوچیے کہ ان میں کوئی بات شک کی بھی آتی ہے؟ سوال کسی قدر دلیل کے اوپر' برہان کے اوپر مبنی ہے۔ ایک ایسا تقاضا جو ہر دل میں ابھرتا ہے جس کے ذمے اس قسم کا کام لگایا گیا ہو۔ کہا ہے کہ کیف تحی الموتیٰ (2:260)۔ اور آپ دیکھیے کہ طریق کیا بتایا جاتا ہے؟

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ چار پرندوں کی مثال ہر مردہ قوم کیلئے باعث تقلید ہے۔

آج سے چھ ہزار سال پیشتر بھی' آج بھی' ہر رسول کے دور میں' ختم نبوتﷺ کے بعد' ہر اس قوم کے لیے' جو زندہ ہونا چاہے' جو دوسروں کو زندگی عطا کرنا چاہے' یہ طریق ہر ایک کے لئے ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز اسی صورت میں فائدہ بخش ہوسکتی ہے کہ اس سے ہم بھی یہ سیکھیں کہ وہ طریق کیا ہے' جس سے مُردوں کو زندگی ملا کرتی ہے ورنہ یہ (معاذ اللہ) اساطیر الاولین تو نہیں ہیں' اگلوں کی کہانیاں تو نہیں ہیں جو قرآن کہتا ہے لیکن کہانیاں جو بظاہر اس میں نظر آتی ہیں' وہ کہانیاں نہیں ہیں' وہ آج ہمارے لیے بھی طریق کار ہے' ہمارے لیے بھی وہ دلائل و براہین ہیں' ہمارے لیے بھی حقائق ہیں' کہانیاں نہیں ہیں۔ حضرت ابرہیمؑ کو دقت کیا تھی؟ ہر نئے داعی کی دقت کیا ہے؟ سامنے وہ ہیں جو اس قسم کے ناکامیوں کی طرف لے جانے والے پامال راستے ہیں ان پر جم کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تقدس کا ہالہ ان کے گرد ہے۔ یہ جو جانے والوں کے نقوش ہیں' ان کو وہ خضر کے نقوش سمجھتی ہیں کہ جو ان کو آبِ حیات کی طرف لے جانے والی چیز ہے' اس سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جو ان کو ذرا ادھر سے ہٹانے کیکوشش کرتا ہے' یہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں' اس کو زندہ جلانے کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ اس قوم سے تخاطب ہے۔ جو یہ بات کہتا ہے وہ اس سے مانوس ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں' سنتا ہی کوئی نہیں ہے۔''

''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت''۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں۔ احساس اس کا ہو جاتا ہے' کیا کیا جائے؟ ایک مثال بیان کی' یہ عظیم چیز ہے۔ کہا کہ تمہیں شکایت یہی ہے کہ تم انہیں بلاتے ہو' یہ تمہاری طرف آتے نہیں ہیں۔ کہیں جبراً پکڑ بھی لیتے ہو' جونہی ان کو وقت ملتا

ہے پھر سے اڑ جاتے ہیں۔ آپ نے پرندوں کو سدھانے والے کو دیکھا ہوگا۔ سدھائے ہوئے پرندے کے متعلق اب تو ہمیں پتہ نہیں اس سے پیشتر ہم دیکھتے تھے صبح کے وقت عام طور پر جب اشنان کے لیے وہ ہندو جایا کرتے تھے ہاتھ میں ایک پنجرہ ہوتا تھا ایک چکور پنجرے سے باہر نکالا ہوا ہوتا تھا۔ وہ پنجرہ لے کر دور آگے آگے جا رہا ہے اس کے بال و پر سب موجود ہیں قوت پرواز بھی ہے باغ یا جنگل میں سے چلا جا رہا ہے اس جنگل یا باغ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے اڑنے والے پرندے اپنی اس نوع کو آوازیں دے رہے ہیں۔ اڑنے کی طاقت موجود ہے ادھر سے آواز بھی آ رہی ہے دیکھ رہا ہے لیکن یہ اس پنجرے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ پنجرے کے اوپر جا کر بیٹھ جاتا تھا اس کا دروازہ اگر بند ہوتا تھا تو چونچ سے کھولتا تھا۔ یہ وہی پرندہ تھا کہ جس دن اس کو لائے تھے پتہ نہیں کتنے جتن کر کے اس کو اس پنجرے میں قید کر کے رکھنا پڑتا تھا کہ جونہی ذرا اس نے موقع پایا اور اڑ گیا۔ وہ پنجرے کی تیلیاں توڑتا تھا تمہارے ہاتھ کو کاٹتا تھا اس حالت میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ یہ نیا نیا لایا ہوا پرندہ تھا۔ پہلی دفعہ جب اس قوم کو اس قسم کی دعوت دی جاتی ہے تو اس کی کیفیت یہ وہی ہے۔ اس چکور کو اس تیتر کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے آپ کو معلوم ہے درمیان میں کیا ہوا تھا؟ یہ اس سے پوچھا جس نے کبھی اس کو سدھایا ہو۔ اس میں اتنے بڑے استقامت کی برداشت کی حوصلے کی ہمت کی التزام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک غیر مانوس پرندے کو سدھانا اور سدھا کر اس مقام تک پہنچانا کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جاوے بال و پر سمیت چھوڑ دیا جائے وہ دور دور نکل جائے۔ اسے آواز دی جائے تو پھر اڑتا ہوا تمہاری طرف آ جائے۔ اس نامانوس پرندے کو اس مقام تک پہنچانے کے لئے آپ سوچتے ہیں کہ کیا طریق ہوتا ہے؟ یہ کہ طبعیت میں بڑی نرمی ہو استغناء ہو جسے صبر کہتے ہیں وہ تھکے نہیں اور نہ دو چار دن کے بعد اگر یہ صورت ہو تو شاید اس کو ایک تھپڑ دے یا اس کو چھوڑ ہی دے کہ جاؤ جہنم میں۔ لیکن نہیں عزیزان من! یہ کرنا پڑتا ہے اس داعی انقلاب کو جو اس قسم کی قوم کی طرف آتا ہے جو حقیقت سے نامانوس ہوتی ہے روشنی کی کرنیں جن کو چمگادڑ کی طرح ستاتی ہیں۔ ان چمگادڑوں کی بستی کو اس نے سورج کی روشنی میں لانا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ کتنا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ مقام تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ کھڑے تھے کہ یا اللہ! میں ان سے بات کرتا ہوں یہ یا تو سنتے ہی نہیں ہیں بھاگ جاتے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں پتھر مارتے ہیں قریب ہی کوئی نہیں آتا۔ کہا کہ ابراہیمؑ! یہ اتنی جلدی کی بات نہیں ہے ''بڑا من مارنا پیندا اے ایہدے وچ[1]'' مختلف قسم کے چار پرندے لو جن میں کوئی باہمی موانست بھی نہ ہو۔ کوئی عرب ہو کوئی عجم ہو کوئی ایرانی ہو کوئی رومی ہو کوئی صہیب ہو کوئی افریقہ کا حبشی بلال ہو لوان کو۔ نامانوس تمہارے قریب نہیں آئیں گے۔ پھر کیا کرو؟ سنو! ہمارے ہاں عام طور پر ایک ان پڑھ سا تھا ''چھوڑ کیندے سی اوہناں نوں اوچڑی مار[2]'' جو عام طور پر سدھایا کرتے تھے۔ وہ ایک پرندے کو ایک حیوان کو اس طرح سے سدھا لیتا ہے کہ اس کے بعد انہیں وہ چھوڑ دیتا ہے تو اس کی آواز پر واپس آ جاتے ہیں۔ تو کیا تم انسانوں کو اپنی طرف اس طرح سے مانوس نہیں کر سکتے؟

---

❶ اس میں بڑا ہی پتہ مارنا پڑتا ہے۔
❷ انہیں ''چیوڑ'' کہتے ہیں یعنی چڑی مار۔

لفظ صرھن کا مفہوم سدھانا ہوتا ہے

یہ ہے طریقہ ابراہیمؑ! ان پرندوں کو سدھانے والوں کو دیکھو۔ یہ پرندے لیتے ہیں۔ کہا کہ فصرھن الیک (2:260) قرآن نے ایک لفظ میں بات کر دی۔ صرھن کے معنی ہی ''سدھانا اور ہلانا'' ہوتا ہے۔ ''الیک'' اس طرح سے ان کو ہلاؤ کہ چھوڑ و تو تمہاری طرف آئیں' پھر چھوڑ و تو بھی تمہاری طرف آئیں: فصرھن الیک (2:260)۔ پھر یہی نہیں کہ تمہارے پاس آ کے تمہارے قریب قریب ہونگے یہاں تک پھر تم سے مانوس ہو جائیں گے' چھوڑ و' مختلف پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر جا پہنچیں جانے دو۔ ثم ادعھن (2:260) پھر ان کو آواز یاتینک سعیاً (2:260) اڑتے ہوئے تمہاری طرف آئیں گے۔

قوموں کے سدھانے کے لیے محض قانون کی گرفت کافی نہیں ہوتی

رسول یہ جماعت پیدا کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یاد رکھو! اس کے لئے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ دیکھا آپ نے واعلم ان اللہ عزیز حکیم (2:260) ٹھیک ہے اس نے زندگی کی یہ قوت عطا کی ہے لیکن اس کے لیے حکمت کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ بات دھاندلی سے نہیں ہو سکے گی' محض قانون کی زنجیروں میں سزا کے استبداد میں جکڑنے سے قومیں مانوس نہیں ہوا کرتیں۔ سدھانے سے اس کو مانوس کیا کرو' اتنی کشش اپنے اندر پیدا کرو کہ نامانوس وحشی پرندوں کی طرح کے انسان لپک جھپک کر تیری طرف اڑتے ہوئے ''سعیاً'' بھاگتے ہوئے' تیری طرف آئیں۔ یہ کیفیت پیدا کرو۔ آپ نے غور فرمایا کہ کیف کا جواب کیسے ملا ہے؟ کہ کس طرح یہ مردے زندہ ہو گئے؟ ابراہیمؑ! یہ ہے طریقہ۔ اس طرح سے گھبراؤ نہیں' زچ نہ پڑ جاؤ' مایوس نہ ہو جاؤ' یہ کچھ کرنا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے حسن سلوک کی گواہی تو قرآن حکیم نے دے رکھی ہے

عزیزان من! اور یہ ہے سب سے بڑی چیز جو رسول کے متعلق کہی گئی کہ یہ بنیادی خصوصیت ایک رسول کے اندر ہونی چاہیے جو ایسی نامانوس قوم کو اپنی طرف یوں کرنا چاہے۔ اس کی کیفیت کے لئے قرآن کریم نے بتایا کہ فبما رحمۃ من اللہ (3:159) یہ خدا کی بڑی رحمت تھی کہ لنت لھم (3:159) تو بڑا ہی نرم مزاج واقع ہوا ہے۔ اس پرندے کے ساتھ سختی اور درشتی کر کے دیکھیے کیا وہ آتا ہے آپ کی طرف؟ کہا کہ لنت لھم (3:159) یہ نرم مزاج واقع ہونا بڑی چیز ہے۔ ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک (3:159) اگر تو کہیں ترش رو' سخت مزاج کا ہوتا' یہ تیری طرف آ کے اردگرد آنے کے بعد بھی بکھر جاتے۔

بات تو یہ ہے کہ آگے چل کر مجھے اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی لیکن آیت نے تو ساتھ ہی وضاحت کر دی' میں کیوں انتظار کروں۔

دنیا بھر کی قوموں کے لیے تمدنی اصلاح کا ایک غیر متبدل اصول

تولـنـت لهـم (3:159) ہے یعنی نرم دل واقع ہوا ہے۔عزیزان من! ایک بات کو سمجھ رکھیے! کہ دنیا میں اصلاح کا بہترین طریق' کونسا ہے؟ تو میں کہوں گا THE ONLY یعنی وہ ایک ہی طریق ہے۔اور وہ ہے کہ AFFECTION دیئے چلے جایئے۔مشکل یہ ہے کہ اس کے متعلق ہماری زبان میں تو ایک لفظ وہ ''محبت اور پیار'' ہی کا ہے لیکن یہ کچھ اس لفظ سے الگ چیز ہوتی ہے۔ AFFECTION دیئے جایئے' محبت دیئے چلے جایئے۔اب جسے آپ قریب کر رہے ہیں' اس میں کئی کمیاں ہونگی' کئی نقائص ہونگے کئی باتیں ایسی ہونگی جو تمہیں اچھی نہ لگیں' ناپسندیدہ ہوں' ناخوشگوار ہوں' یہ چیزیں ہونگی۔اب اگر صورت یہ ہو کہ آپ اس کو قریب لانا چاہتے ہیں' AFFECTION دیتے ہیں' اس کی طرف سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی ہے جو آپ کو ناگوار خاطر گزرتی ہے' پسند نہیں ہے تو آپ اسے کسی بات پر جھٹک دیتے ہیں۔بظاہر تو نظر آئے گا کہ وہ محروم رہا لیکن درحقیقت آپ اپنے مشن کے اندر ناکام ہو گئے۔آپ کا تو مشن یہ ان کو سدھا کے قریب رکھنا تھا۔اور اگر آپ یہ چاہیں کہ صرف وہ آئیں کہ جن میں کوئی نقص نہ ہو' کوئی ناپسندیدگی کی بات ہی نہ ہو آپ کے معیار کے اوپر باون تولے چار رتی پورے اتریں تو پھر ان کی اصلاح کی ضرورت ہی کیا ہے' وہ تو تم سے بھی زیادہ اصطلاح یافتہ ہیں۔یہاں تو تمہیں انہیں پاس لانا ہے کہ جن کے اندر یہ چیزیں موجود ہیں۔کیا کرو؟ کہا کہ بنیادی حقیقت تو یہ دیکھ کہ اس کے اندر وہ صلاحیت ہے وہ ادھر آنا چاہتا ہے اگر اس میں یہ چیز ہے تو پھر یہ چھوٹی چھوٹی سی فروگزاشتیں' سہو' لغزشیں' نقائص' ناخوشگوار باتیں' اگر ان سے ہوتی ہیں تو فاعف عنهم (3:159) اس سے درگزر کر۔اگر تو ان کو جھٹک دے گا تو وہ پھر ان چیزوں سے متاثر تو ہو گیا لہذا اس پر تھپڑ نہ مار۔ٹھیک ہے ان چیزوں کا کچھ نقصان تو ہو گا اور اب کیا ہو گا؟ کہا کہ و استغفر لهم (3:159) ان کے لیے سامان حفاظت پیدا کر' ان کی ان سہو و لغزش سے جو انہیں نقصان ہونا ہے' اس سے محفوظ رکھنے کا تُو انتظام کر۔ان میں تو ابھی یہ ایسی چیزیں ہیں۔چنانچہ انتظام تو یہی ہو گا جو قرآن نے کہا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنے کا طریق

وہ انتظام یہ ہے عزیزان من! ان لـحسانت یذهبن السیاٰت (11:114) یہ جو ناہمواریاں ہوتی ہیں' ان کا دور کور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہمواریاں پیدا کرتا چلا جا۔ان کے اندر زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں کو ابھارتا چلا جا اور ان کی یہ جو چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہیں' وہ اس طرح ان کے نقصانات سے محفوظ رہ جائیں گے۔اس کے لئے تو قرآن نے کتنی بڑی اجازت دیدی ہے۔

کبائر الاثم کے متعلق وہ کہتا ہے کہ و اجتنبوا کبائر من الائم (42:37) کبائر اور اثم سے بچو الا اللّمم (52:32) یہ جو یونہی روزمرہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی سی ناگوار باتیں ہو جاتی ہیں' ان کے اوپر خوامخواہ کے لیے جفر کے نقشے بنانے نہ شروع کر دیا کرو۔ انسان ہیں' یہ چیزیں ہر ایک سے ہوتی ہیں' ان کو اتنی اہمیت نہ دو بنیادی چیزوں کے اوپر نگاہ رکھو۔ بنیادی چیزوں میں اگر یہ جو تمہارے گرد آتے ہیں' اس میں تم دیکھو کہ ان میں انسان بننے کی صلاحیت ہے چاہتے بھی ہیں' تمہاری طرف قریب آ رہے ہیں تو ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر ان کو نہ جھٹک دو۔ بلکہ ان کے لیے ایسا انتظام کرو کہ وہ ان کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہیں۔ اور ان کو کیا مقام دو؟

داعی انقلاب کی مجلس اور کسی معلم' مرشد یا طریقیت کی مجلس میں فرق

عزیزانِ من! سوچیے: یہاں' اس سے آنے سے پہلے' تصور میں لایئے اپنے ہاں کی کسی اس لغزش کو جس میں ایک صاحب' خواہ وہ استاد ہی کی حیثیت میں کیوں نہ بیٹھے ہوں' اور روحانیت کے مسلک کے اوپر بیٹھے ہوئے کا تو پوچھو ہی نہیں' صاحب! جتنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں' سر جھکائے ہوئے ہیں' آنکھیں نوائے ہوئے ہیں' کسی کی مجال نہیں کہ ذرا سی بھی ایک زبان کھول سکے' جو کچھ حضرت صاحب کا ارشاد ہے یعنی وہ کیسی بے تکی کیوں نہ ہانکتا چلا جائے یہی ہوگا سبحان اللہ۔ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ کوئی اپنی زبان ان کے آگے کھول سکے۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ جرأت دلاتے نہیں ہیں۔ جونہی ذرا کسی نے کیا اور انہوں نے وہ آنکھیں' جو کسی انداز سے سرخ کی ہوئی ہوتی ہیں' یوں ان کی طرف دیکھا' دوسرے نے کہا بھسم کر کے رکھ دیں گے۔ برادران عزیز! یہ سارا جتنا یہ آپ کے ہاں کا جو طریق ہے' جسے روحانیت کی زنجیریں کہتی ہیں' یہ صرف FEAR COMPLEX (خوف کا الجھاؤ) ہوتا ہے' خوف طاری کیا ہوا ہوتا ہے' ان کے دلوں کے اندر ڈر رہتا ہے۔ غیر مرئی چیزوں کا خوف ہوتا ہے۔

مردوں کے اندر زندگی کی روح پھوکنے کا ایک نادر اصول اور ایک نادر پیمانہ

بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ یہ اس داعی انقلاب کی یہ مجلس ہوتی ہے جس نے ان مردوں میں حیات نو پیدا کرنا ہوتا ہے' مقام ذرا دیکھیے۔ یہ مقام ہی کیا ہے ہمارے ہاں کے کسی معلم کا یا جسے آپ مرشد طریقت کہتے ہیں' اپنے ذہن میں جو صرف خدا ہوتا ہے' مقام ہی ان کا کیا ہے رسول کے مقابل ہیں۔ دونوں نسبتیں دیکھیے اور پھر یہ چیز دیکھیے کہ فاعف عنھم (3:159) بھی ہوا ہے و استغفر لھم (3:159) اور اس کے بعد ہے کہ و شاور ھم فی الامر (3:159) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کر۔ اللہ اکبر! کیا مقام عطا کر دیا ہے انہیں صاحب! یہ ہے تکریم انسانیت' یہ ہے تعظیم احترام آدمیت۔ سوچو تو سہی! ان کے ساتھ مشورہ کیا کر' حکم ہو رہا ہے کہ شاور ھم فی الامر (3:159)۔ دیکھا آپ نے یہ جو غیر مانوس پرندوں کو سدھانے والا تھا کیا مقام ہے! آپ دیکھ رہے ہیں کیف

تحی الموتیٰ (2:260) کا جواب کیسے مل رہا ہے؟ کیسے زندگی عطا کی جائے؟ عزیزان من! قریب آنے والے کی ان چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے اوپر درگزر کر کے محبت اور AFFECTION دیے چلے جاؤ اور اس کے دل میں اپنی RESPECT پیدا کرو۔ یعنی وہ محسوس نہ کرے کہ وہ تو دنیا میں کچھ ناکارہ شے ہے' ذلیل شے ہے' یہ نہ ہو۔ اس کے دل میں یہ چیز ابھارو کہ وہ بھی شرف انسانیت کا حامل ہو سکتا ہے' اس میں SELF CONFIDENCE (خود اعتمادی) پیدا کرو۔ رسول جیسی ہستی ان سے مشاورت کر رہی ہے۔ کتنا بڑا SELF CONFIDENCE (خود اعتمادی) پیدا ہوتا ہوگا! کتنی بڑی اس سے اپنی RESPECT ان میں پیدا ہوتی ہوگی! اس کے مقابلے میں ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر آپ وہ کیفیت پیدا کیجیے جو ہمارے ہاں کی ان مجسلوں کے اندر پیدا ہوتی ہے خواہ وہ آپ کی درس گاہیں ہوں' خواہ وہ آپ کی روحانیت کی مسندیں ہوں۔ جس طرح سے وہاں ڈانٹ پڑتی ہے' جس طرح سے وہاں سامنے والے کی جھڑپیں ہوتی ہیں' جو ہواں کیفیت ہوتی ہے۔

احترام آدمیت سے عاری عقلوں میں انسانوں کی نفساتی کیفیت

عزیزان من! سامنے والا تو ایک طرف رہا' ساری قوم کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے' افراد ہی کو نہیں' اقوام کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص بڑے فخر سے اپنے آپ کو بندہ گنہگار' عاصی' پر معاصی' لکھنے لگ جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ اس کا ذرا ترجمہ کر کے ان سے کہیے کہ اپنے ساتھ نیچے لکھے عبدالواحد جرائم پیشہ' اس کا ترجمہ ہی یہ ہے' یہ پُر معاصی ایک دن کی معصیت نہیں ہے' اس کا ترجمہ جرائم پیشہ ہے' یہ کیا ہوتا ہے؟ SELF RESPECT نکل جاتی ہے دلوں سے۔ کہا ہے کہ شاورھم فی الامر (3:159) دیکھا کیف تحی الموتیٰ (2:260) کا پروگرام کیسے چل رہا ہے۔ یہ جو قریب آجاتے ہیں' ان کے متعلق یہ جو بڑے بڑے طرہ باز خان ہوتے ہیں' ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے اس رسول سے' وہ تو عادی ہوتے ہیں اپنے مقام کے۔

استبدادی قوتوں کے زخم خوردہ سب سے پہلے احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں

حضرت نوحؑ سے سلسلہ نبوت کی بات شروع ہوتی ہے۔ وہ آواز دیتے ہیں اور وہ ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' سارا قرآن یہ بتاتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی دعوت پر وہ لوٹ آتے ہیں جن کی استبداد کے مجسموں نے روٹی چھینی ہوئی ہوتی ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ وہ آتے ہیں۔ یہ تو دعوت عام ہوتی ہے' اس میں تو سوال ہی نہیں ہے کہ یہ چھوٹے آئیں یا بڑے آئیں' وہ تو چھوٹے اور بڑے ہر ایک کو دعوت دینی ہوتی ہے بلکہ یہ جو بزعم خویش بڑے ہوتے ہیں' ان کو تو سب سے پہلے دعوت دینی

ہوتی ہے' سب سے بڑا بگاڑ تو وہاں ہوتا ہے۔

بڑے بڑوں کی وہ فرعونی کیفیت جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے

جب حضرت صالحؑ نے یہ پوچھا تھا کہ اتنی بڑی قوم جو ایسے بگڑی ہوئی ہے' اسے کیسے سنواروں؟ تو کہا گیا تھا کہ گھبراؤ نہیں! یہ جوان کے ہاں کا دارالخلافہ ہے اس میں بڑے بڑے نو بدمعاش ہیں' بس وہ سیدھے ہو گئے تو ساری قوم سیدھی ہو جائے گی۔ بڑے بڑوں کو تو ضرور لانا ہوتا ہے' ان کو دعوت دی جاتی ہے سات آٹھ ہزار سال پیشتر اور آج کی زندگی دونوں کو سامنے رکھیے۔ ان کی طرف سے شرط یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ جو چھوٹے چھوٹے پیشوں والے لوگ ہیں' یہ نائی' دھوبی کنجڑے وغیرہ کیا ہم آ کر ان کے برابر بیٹھیں یا یہ ہمارے برابر بیٹھیں گے؟ انہیں اپنے گرد سے نکال دیجیے پھر ہم آتے ہیں۔ ٹھیک ہے انتخاب لڑنا ہو تو پھر تو یہ ٹھیک بات ہوگی کہ ان میں سے تو زیادہ سے زیادہ ایک ووٹ ہوگا اور یہ اگر سردار صاحب آ گئے تو چار گاؤں کے ووٹ آ جائیں گے۔ وہ کرے گا یہی۔ یا ان کی طرف سے تو یہ آئیں گے تو ان کو لنگر کی روٹی کھلانی پڑے گی اور وہ صاحب دیگ کا سامان لے کر آئیں گے اس لیے وہی بڑے ٹھیک ہیں۔ ان تمام مجالس میں آپ دیکھیں گے' وہاں بھی نام روحانیت کا ہوتا ہے' جو معیار ہوتا ہے' وہ دولت ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت نوحؑ سے یہی کہا کہ ان کو نکال دیجیے۔ ان کی طرف سے جواب ملتا ہے ایٰقوم لا اسئلکم علیه مالاً (11:29) پہلی بات تو یہ ہے کہ یاد رکھو! تم اپنے لیے وجہ شرف جو سمجھ رہے ہو مال و دولت سمجھ رہے ہو' اسی بنا پر تم نے مجھ سے یہ تقاضا کر دیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے مال کا بھوکا نہیں ہوں' میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ ان اجری الا علی اللہ (11:29) میں تو خدا ایک مشن لے کر اٹھا ہوں' میرا اجر' معاوضہ' اس خدا کے متعین کردہ مشن کے اندر موجود ہے' اس کے نتائج میرا معاوضہ ہوں گے' تمہارا مال میرے لیے نہیں ہوگا۔ وما انا بطارد الذین اٰمنوا (11:29) اور یہ جو تمہارا تقاضا ہے کہ ان کو تو دھتکار دو میں قطعاً یہ نہیں کرنے کا' یاد رکھو! میں انہیں نہیں دھتکار سکتا۔ جو صلاحیتیں ان کے اندر ہیں' جس کشش و جذب سے یہ آتے ہیں' انہیں محض اس لیے چھوڑ دوں کہ یہ غریب ہیں' محض اس لیے کہ تمہارے معایر کے مطابق ''کمی'' ہیں۔ کمی کیا ہے؟ ''کم کرن والے'' یعنی کام کرنے والے تو ان کے نگاہوں میں ذلیل ہوتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے ہمارے ہاں یہ کمی گاؤں کے اندر آپ کو معلوم ہے کنہیں کہا جاتا ہے؟ ان کا جرم یہ تھا کہ ''اے کم کردے ہوندے سن [1]''۔ میں ان کو نہیں دھتکار سکتا صاحب! افوہ۔ یہ تو رہے حضرت نوحؑ۔

---

❶ یہ کام کرتے تھے۔

صاحب ضرب کلیم کو فرعون کے ساتھ حسن کارانہ انداز سے پیش آنے کی ہدایت

داستان حضرت نوحؑ یا کشمکش صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون تو آپ کو معلوم ہے۔فرعون کے لیے انہ طغٰی (20:43) کہا گیا کہ جاؤ بڑا ابھر گیا ہے' بہت زیادہ سرکش ہو گیا ہے' اس کی طرف جاؤ۔ دونوں بھائیوں سے یہ کہا جا رہا ہے۔ وہ کاہے کے لیے جاتے ہیں۔ اس کا تختہ الٹنے کے لیے۔ اتنی بڑی مہیب جنگ لڑنے کے لیے جا رہے ہیں' جاتے جاتے ان کو کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان میں سے ایک ہدایت کیا ہے؟ کہا کہ ازھبا الٰی فرعون انہ طغٰی (20:43) خود کہا ہے کہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہاں جاؤ اور ایک دو اس کو تھپڑ۔ نہیں' بلکہ کہا فقولا لہ قولاً لیناً (20:44) بات نرمی سے کرنا' تیزی میں نہ آ جانا۔ پہلے یہ کرو۔ کیوں یہ کرو؟ لعلہ یتذکر او یخشٰی (20:44) ہو سکتا ہے کہ تم نرمی سے بات کرو تو بات سننے پر آمادہ ہو جائے' نصیحت پکڑ لے' اپنی غلط روش کے نتائج سے ڈر جائے۔ اور اگر یہ ہو جائے تو پھر ٹھیک ہے ''جیہڑا گڑ دتیاں مرے اوہنوں زہر کا ہنوں دینا ہیگا اے[1]'' کیا چیز ہے؟ صاحب ضرکلیمؑ کو اس کی طرف بھیجا جا رہا ہے جس کے لیے اعلان ہو رہا ہے کہ انہ طغٰی (20:43) وہ سرکش ہو گیا ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ اس سے نرمی سے بات کرنا۔ حضور نبی اکرم ﷺ تک ہم آ رہے ہیں۔ حضور ﷺ کو اسی قسم کے یہ طریق بتائے جا رہے ہیں کہ کس طرح سے یہ غیر مانوس' تمہاری طرف مانوس ہونگے؟ کہا ہے کہ ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ (6:52) یہ جو تیرے پاس جمع ہو جاتے ہیں' یہ صرف خدا کا جو پروگرم ہے' اس کو پورا کرنے کے لیے آتے ہیں' اس طرح سے یہ لوگ آ جاتے ہیں۔ یاد رکھو! ان کو دھتکارو نہیں۔

---

❶ جو گڑ دینے سے مر جائے اسے زہر کیوں دیا جائے۔

نوعِ انسانی کی حد تک مقام نبوت کی ذمہ داریوں کی اہمیت اور ان کی نوعیت

یہ وہی چیز ہے کہ چھوٹی چھوٹی ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ناگوار گزرتی ہیں کہا کہ ان کو دھتکارو نہیں۔ یہ جو چیز ہو جاتی ہے' اس کے لیے ایک تو پہلے یہ سمجھ لو کہ ماعلیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء (6:52) تم ان کے حساب کے ذمہ دار نہیں ہو' تم اپنے حساب کے ذمہ دار ہو' یہ اپنے حساب کے ذمہ دار ہیں' یہاں تک تو یہ بات ہے۔ ان کو سمجھاتے چلے جاؤ۔ اور اگر رسول نے یہ دھتکارنا کر دیا تو سنیے عزیزان من! فتطردھم فتکون من الظلمین (6:52) اگر تم نے ان کی ان چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کے اوپر دھتکار دیا تو یاد رکھو! تو بھی ظالمین میں سے ہو جائے گا۔ اللہ اکبر! یہ کیا ہو جائے گا؟ اپنے مشن میں فیل ہو جائے گا' ناکام رہ جائے گا۔ انسانیت انہی تاریکیوں میں رہ جائے گی کہ جس میں اس وقت وہ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کتنا بڑا ظلم کر دے گا تو انسانیت کے اوپر اتنے سے برے کو دھتکارنے سے کہ کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو گئی یہ انسانیت کے اوپر ظلم ہو جائے گا۔

مقام نبوت برداشت، استقامت، بردباری، بلند ظرفی، اور بلند نگہی کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر جلوہ افروز ہوتی ہے

عزیزان من! دیکھا کتنی بڑی ذمہ داری ہے! میں نے کہا تھا کہ اس کے لیے بڑے تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، بڑی برداشت کی ضرورت ہوتی ہے، استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ و اصبر نفسك مع الذین یدعون ربھم بالغدوۃ و العشی (18:28) بڑے تحمل سے کام لے، بڑی برداشت سے کام لے، التزاماً استقاماً اس چیز کے اوپر چلتا چلا جا، دیکھنا کہیں TEMPER نہ LOOSE کر دینا، مایوس نہ ہو جانا، دھتکار نہ دینا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے: و اصبر نفسك مع الذین (18:28) دیکھتے ہیں آپ وہ نامانوس پرندے کو سدھانے والے کی کیفیت کیسے بیان ہوتی چلی جا رہی ہے! بڑی ہمت سے، بڑے صبر سے کام لینا ہے۔

عزیزان من! وقت تھوڑا رہ گیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جو موضوع ہے وہ پورا سامنے آ جائے کیونکہ یہ اس کا ایک گوشہ ہے، بات تشنہ ہی نہیں رہ جائے گی بلکہ اس سے کچھ الجھاؤ پیدا ہو جائے گا، اس لیے زیادہ تفصیل میں، میں نہیں جاتا۔ دوسری آیات میں یہ کہا ہوا ہے کہ اپنے ان ساتھیوں کے اوپر اپنی نرمی لطافت AFFECTION کے بازو پھیلا دے۔ وہ بالکل ایسے ہی ہو جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پیروں کے نیچے لیتی ہے اپنی یہ کیفیت رکھ۔ حوالے لکھتے چلے جایئے۔ یہ ہیں: (15:88, 26:215)۔

عیسائیت کے نام پر خود ساختہ تعلیم اور اس کا عملی نتیجہ

یہ سب کچھ ہوا، اب اگلا مقام آتا ہے۔ عیسائیت ہمارے سامنے آتی ہے، حضرت عیسیٰ کی پیش فرمودہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نہیں، جس میں انسانوں نے تحریف کی یہاں MERCY, MERCY، رحم رحم رحم ہے کوئی قانون نہیں، کوئی عدل نہیں، مکافات عمل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عملی زندگی کے اندر یہ ناکام ثابت ہوگئی۔ انہوں نے اس لبادے کو اتارا اور گرجا کے اندر جا کے کھونٹی پر ٹانگ دیا کہ یہ ہے اس کا صحیح مقام۔ عملی زندگی تو صرف اتنے سے نہیں چل سکتی۔ پہلا مقام یہ ہے۔ انہی میں، جن یہ چیزیں پیش کی جا رہی ہیں، جب یہ چیز یقین تک پہنچ جائے کہ اس میں صلاحیت نہیں رہی، یہ آنا ہی نہیں چاہتا، ضد کرتا ہے، سمجھنا نہیں چاہتا، خوامخواہ کے لیے کٹ حجتیاں کر رہا ہے، مخالفت کے اوپر ہی اترا ہوا ہے، کوئی جو طریق اس قسم کا ہے، یہ اس پر کارگر نہیں ہو سکتا، اس قسم کے لوگ بھی آئیں گے۔

وحی کے پیش کردہ حقائق کو کسی صورت بھی تسلیم نہ کرنے والوں سے حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جانا ہوگا

کہا کہ ان الذین کفرو اسوآء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون (2:6) جنہوں نے پہلے ہی فیصلہ

کرلیا ہوکہ ہم نے ماننا ہی نہیں ہے' وہ کہتے ہیں کہ لاکھ ان کو سمجھاتے چلے جایئے وہ اس طرح نہیں آ ئیں گے۔تو کیا ان کے لیے بھی پھر یہ ہے کہ تم اپنا ٹائم WASTE (ضائع) کرتے چلے جاؤ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں صلحایت نہیں ہے' پتھر پر پانی ڈالتے چلے جاؤ کہ اس میں سے کھیتی اُگے گی۔ جذباتی دنیا میں تو ایسا ہوسکتا ہے' حقائق کی دنیا میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ پہلا مرحلہ اس کے لیے یہ کہا گیا کہ نہیں! اگر ایسا مقام آجاتا ہے' جب تُو یہ دیکھ لیتا ہے کہ یہ مقام آ گیا ہے' اس کے لیے یہ کہا کہ و اصبر علٰا ما یقولون (73:10) جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کا ردعمل یہ نہ ہو کہ تُو بھی بپھر جائے۔ پھر ایسے مقام پر کیا کرو؟ مجھے یقین ہے کہ اب یہ جو چیز ہے' اس میں صلاحیت نہیں ہے نہیں ہوسکتا کہ ناکام رہوں گا' وقت بڑا تھوڑا سا ہے اور انقلاب بہت بڑا لانا ہے۔ کہا کہ و اھجرھم (73:10) الگ ہوجا ان سے لیکن الگ کس طرح سے ہوجا؟ کیا گالی گلوچ سے؟ کیا لٹھ مار کر؟ کیا سر پھاڑ کر؟ نہیں بلکہ و اھجر ھم ھجراً جمیلاً (73:10) بڑے حسن کارانہ انداز سے الگ ہوجا۔ پھر کیا؟ کہ یہ جو اتنے اتنے سرکش ہیں؟ انہیں کیا کرو؟ کہا کہ او ذرنی و المکذبین اولی النعمة و مھلھم قلیلاً (73:11) یہ جو دولت کے نشے میں بدمست ہیں' خود بھي یہ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی خدا کے راستے کی طرف نہیں آنے دیتے' پھر ان سے الگ ہوجاؤ کیا بات ہے صاحب! انداز کہنے کا! کہ اسے میرے پاس چھوڑ دے ''میں آپ نبڑ لاں گا ایہدے نال[1]''۔

---

1. میں خود ہی ان سے نپٹ لوں گا۔

خدا تعالیٰ کی رحیمی اور رحمت اللعالمین کی رحمانیت انسانوں کی بدعملی کو آخری وقت تک نظر انداز کرتی ہے

یہ جو خدا انہیں اس وقت تک جھپٹا نہیں مارتا' وہ اس لیے ہے کہ یہ رحمت للعلمین درمیان میں کھڑا ہوتا ہے۔ قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ہم اس لیے اس بستی پر عذاب نہیں لائے کہ تُو ان کے اندر تھا۔ یہ اٹھ کر چلے جانا کیا ہے؟ ھجراً جمیلاً (73:10) یہ وہ مقام ہے جہاں ایک مشفق شفیق ہمدرد ڈاکٹر مریض کی بالیں سے یہ کہہ کر اٹھ کر چلا جاتا ہے کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے۔
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

اس کا یہاں سے اٹھ کر چلے جانا اپنی آغوش میں بڑی قیامتیں رکھتا ہے۔ یہ مقام ہے جسے ہجرت کہتے ہیں۔ رسول کا یہ کہہ کے چلے جانا کہ ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ حضرت ابرہیمؑ نے یہ کہا کہ انی ذاھب الی اللہ (37:99) بھئی! ٹھیک ہے تم اگر اسی طرح سے ہلاک ہونا چاہتے ہو تو میں تو اب تمہیں نہیں بچا سکتا' میرے بس میں یہ بات نہیں رہی' میں چلا اس فضا کی طرف جو میرے خدا کے پیغام

کے لیے زیادہ مساعد فضا ہے۔ دوسرے مقام پر یہ ہے کہ جاتے ہوئے ہی وقل سلٰم (43:89) گالی نہ دے کے جا پھر بھی یہ دعا دے کہ جا کر اللہ کرے کہ تُو سلامت رہے۔ کیا قلب ہے اس پیغامبر کا!

اسوہ ابرٰہیمی کی ایک جھلک

عزیزان من! کن حالات میں یہاں سے اٹھ کر جا رہا ہے' مار کھا کر پٹ کر گالیاں کھا کر استہزا کرانے کے بعد اور جاتے ہوئے بھی کہتا ہے قل سلٰم (43:89)۔ ابرٰہیمؑ نے اپنے باپ سے یہ کہا میں جانتا ہوں تُو اس طرح نہیں آتا لیکن اس کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ تُو اس تباہی سے بچ ہی جائے۔ قل سلٰم (43:89)۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے۔ کہا ہے کہ کن لوگوں سے اعراض برت؟ میں نے عرض کیا ہے کہ ان سے جو ضد پر آ جائیں جو سمجھانہ چاہیں' جو ایک ہی دلیل دیے چلے جائیں کہ جو اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے' ہم اسی کے اوپر چلیں گے' ہم اس کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک اور کیٹگری (شق) اس نے کہی ہے کہ جو دین کو لھو و لعب سمجھے' SERIOUSLY لے ہی نہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں کا اب ایک دور ہم نے نوجوانوں کا ہی پیدا کیا ہے اس میں ان کا قصور نہیں ہے' ہم نے ان کے سامنے مذہب ہی ایسا پیش کیا کہ جو تماشا تھا' انہوں نے اس کو کھیل تماشا سمجھ لیا۔ یہ ان کی طرف سے مایوسی نہیں ہے' یہ وہ مقام ہے جہاں وہ اس معاملے میں واقعی SERIOUS (سنجیدہ) ہوں ہی نہ اس معاملے میں ان کے متعلق بھی یہ کہہ دیا۔ ان کے حوالے یہ ہیں: (6:70, 53:29, 7:198)۔ یہ وہ مقام ہے کہ وہی ابراہیمؑ جو اس طرح سے اتنی کوشش سے مُردوں کو زندگی کے لیے سدھارے تھے' ان کو اپنی طرف مانوس کر رہے تھے' انہوں نے کیا' ہمیں کہا گیا کہ یہ تمہارے لیے بھی اسوہ ہے۔ جب یہ مقام آ جائے کہ قد کانت لکم اسوۃً حسنۃ فی ابراھم والذین معہ (60:4) اب اسی ابرٰہیمؑ کا یہ اسوہ ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ وہ اسوہ کیا ہے؟ کہا کہ اذ قالو القومھم انا برآئو منکم ومما تعبدون من دون اللہ (60:4) یہ تم اور خدا کے علاوہ جن کی تم محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' میں ان سے بیزار ہوں کفرنا بکم وبدآء بینکم وبینکم العدواۃ البغضآو ابدا (60:4) تم اور ہم میں کھی ہوئی ایک دشمنی ہو گئی۔ ابداً کہنے سے یہ ہو گیا کہ بس ہمیشہ کے لیے یہ مایوسی کی بات ہو گئی' یہ کوئی صورت نہیں ہے۔ آپ اس انقلاب کو دیکھیے۔ اس مقام پر یہ اعلان کر کے کہ ہمیشہ کے لیے یہ چیز ہو گئی' کہا کہ حتی تئو منو اباللہ وحداً (60:4) نہیں نہیں نہیں! باز آفرینی کی ایک شکل پیدا ہو سکتی ہے' تم خدا کی صداقتوں پر ایمان لے آؤ' بس ٹھیک ہے' پھر گلے سے لگ جائیں گے۔ باز آفرینی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سے بیزاری' اور بالکل علیحدگی اس لیے ہے کہ ٹائم WASTE ضائع ہو جائے گا وقت توانائیاں ضائع ہو جائیں گی۔ اس میں تم نے زندگی دینی ہے' جس میں زندگی کی صلاحیت موجود ہو۔ جس کو ڈاکٹر DECLARE کر دے کہ نہیں

صاحب! اب DEATH (موت) ہی ہے' پھر اس پر وقت ضائع کرنا' دوائیاں دے کر INJECTION دینے کے بعد' یہی دوائیاں کسی اس کے کام آ جائیں گی جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔

ہجرت کے باوجود مخالفین کی یلغار اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اس کا ردعمل

عزیزانِ من! یہ ہے ہجرت۔ پھر نبی وہاں جاتا وہاں جانے کے بعد ان کو تو وہ چھوڑ دیتا ہے لیکن یہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے یہ وہاں بھی اپنی مخالفت کو جاری رکھتے ہیں۔ کیا اس مقام کے اوپر پھر وہی عیسائیت کی تعلیم ہے کہ یہ تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارتے ہیں' تم دوسری گال سامنے کر دو؟ یہ شکست خوردہ سینٹ پال کی تعلیم ہو سکتی ہے' خدا کی اور اس کے رسول کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جب یہ مقام آ گیا' یہی رسول جس سے کہا گیا تھا کہ تُو بڑا نرم دل ہے' اگر تیرا قلب کہیں سنگ دل ہوتا تو معاملات بگڑ جاتے۔ اب یہی رسول ہے جب یہ مقام آ گیا ہے کہ وہ آٹھ کر اس مشن کو مٹانے کے لیے' وہ میدان جنگ میں اتر آئے ہیں' وہاں وہ عیسائیت کی تعلیم نہیں آتی' وہاں خدا کی اصلی تعلیم آئے گی اور وہ یہ ہے کہ یایھا النبی جاھدوا الکفار و المنفقین و اغلظ علیھم (66:9) اے نبی! اب ان کے مقابلے میں' یہ جو کھلے ہوئے دشمن اور مار آستیں تھے' تمہاری اپنی قوم کے افراد بنے ہوئے تھے' زبان کے اوپر ان کی ہمدردیوں کے دعوے اور ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے خنجر تھے۔ اب ان کے خلاف جہاد کے لیے کھڑا ہو جا اور ان کے اوپر سختی کر جتنی سختی کی جا سکتی ہے۔

عزیزانِ من! اب یہ آپریشن کا وقت آ گیا۔ جب انگلی کا ناسور اتنا زیادہ زہر آلودہ ہو جائے کہ وہ کسی مرہم سے اچھا نہ ہوا اور اس کا زہر باقی جسم کو بھی مسموم کیے چلا جا رہا ہو تو اس وقت پھر ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ اب اس انگلی کو کاٹ دینا' باقی جسدِ انسانی کی حفاظت کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔ اسلام میں جہاد کے یہ معنی ہیں۔ اور اگر سرجن کو نشتر چلاتے ہوئے دل میں اگر رحم کا جذبہ آئے اور ہاتھ کانپ جائے تو آپ پھر سمجھ سکتے ہیں کہ اکا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہاں ہاتھ نہیں کانپنا چاہیے۔ رحمآو بینھم اشدہ علی الکفار (48:29) باہم ریشم کی طرح نرم اور جب مقابلہ یہاں کفار سے آ کر پڑ جائے تو ان سے چٹان کی طرح سخت۔ یہ وہی رسول ہے۔ ان کو زندہ رکھنے کے لیے' جن میں زندگی کی رمق و صلاحیت ہے' یہ زہر آلود جتنے بھی WEAPONS (ہتھیار) استعمال ہو رہے ہیں' ان تمام کو آپ کو لے کر دفن کرنا ہوگا' پھر زندگی عطا کریں گے۔

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں پروگرام کیا آ رہا ہے؟ ایک یہ چیز ہے جو قرآن نے ہمیں سکھائی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے بات تو ایسی تھی کہ شاید ایک نشست میں ختم نہ ہوتی لیکن میں چاہتا تھا کہ دوسرا فیز (مرحلہ' رخ) آپ کے سامنے لے آؤں تاکہ وہ جو تصور ہے صرف عیسائیت کا وہی ہمارے ذہن میں نہ ہو' یہ دوسرا فیز بھی سامنے آ جائے لیکن میں اسے پھر دہراؤں کہ یہ جو سمجھنے کی تڑپ لے کر' دل

میں آیا ہو جو زندہ رہنے کی آرزو لے کر کسی کے پاس آیا ہو اس کے لیے قرآن نے ہمیں بتا دیا کہ یہ ہے طریق۔

نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے برعکس ہماری بدعملی کی ایک مثال

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں یہ بات آ گئی کہ اس قدر نرم دل' اس قدر پرکشش' پر جذب شخصیت کہ غیر مانوس پرندے' بھاگے ہوئے' آواز کے اوپر آئیں دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئیں۔ ایک وہ اور ایک اس کے بعد ہمارے ہاں کی کیفیتیں کہیں جا کر کسی مسجد' کسی درسگاہ میں دیکھیے۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے ایک دوست' ایک دفعہ' یہ دلی کی بات ہے' وہاں نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ پتلون شرٹ میں تھے' اسی طرح سے چلے گئے پائنچہ کہیں ذرا نیچا تھا نماز میں کھڑے ہو گئے۔ کھڑے کھڑے جو ساتھی تھا' وہ بھی نماز میں تھا رکوع میں گئے تو جھکے' جب اس کی نظر ان کے پائنچے پر پڑی اس نے اپنی نماز توڑی' لاحول ولاقوۃ کہا' بیٹھ گیا اسی طرح سے' اس کی وہ پتلون کو نیکر بنایا اور پر کیا۔ اور جب پھر وہ سلام پھیرا اور اس کے بعد جو وہاں اس کھڑے ہوئے کے ساتھ ہوئی ہے' اسے تو پوچھو نہ بن بھاؤ کی پڑی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ دوبارہ مسجد میں نہیں گیا۔ یہ ہوتا ہے نتیجہ۔ ذرا ذرا سی چیزیں' وہی جنہیں قرآن نے کہا تھا کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر نہ گرفت میں کر لینا' اس پر نہ جھلا اٹھنا۔ AFFECTION دیئے جاؤ جاذب بنتے جاؤ' جو مہمات ہیں' جو کبائر ہیں' ان پر نگاہ رکھو' ان چیزوں پر نہ جاؤ۔ وہ ہمارے ہاں' وہ ساری چیزیں تو نگاہ سے اوجھل ہوئیں اور ساری چیز رہ گئی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اوپر۔

سورۃ عبس میں ایک اندھے صحابی کے واقعہ کی نوعیت اور اسکی اصل حقیقت

عزیزان من! یہ تھی وہ چیز۔ پانچ سات منٹ کی آپ سے اجازت لیتا ہوں' تا کہ بات ختم ہو جائے' مکمل ہو جائے۔ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ عبس میں بڑی عجیب تلقین کی۔ کہا وہ جو تمہارے پاس اس غرض کے لیے آئے کہ اس کو زندگی مل جائے' اصلاح ہو جائے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے' آپ ﷺ نے یہ کیا تھا۔ پھر وہی روایت آ جاتی ہے کہ ایک اندھے صحابیؓ تھے آپ ﷺ کے پاس وہ آئے قرآن سیکھنے کے لیے اور آپ ﷺ نے صاحب منہ موڑ لیا اور منہ بسور لیا اور ترش رو ہو گئے اور ڈانٹ دیا۔ قرآن جن کے متعلق یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے' کیا اتنی بڑی تاکیس کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت ہو گی؟ نہیں' یہ حضور ﷺ کی بات نہیں ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے' ہو سکتا ہے کسی کی بات ہو' نہ بھی ہو' وہ بات یوں سمجھا تا ہے جیسے کہ ایک واقع ہوتا ہے۔ کہا کہ عبس و تولی. ان جآئه الاعمی (80:1-2) ترش رو ہو گئے' ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں منہ بسور لیا' رخ بدل لیا' اعراض برت لیا۔ کس بات سے؟ کہ ان کے پاس ایک غریب اندھا آ گیا ہے۔ اچھا؟ یہ ری ایکشن (ردعمل) ہو رہا ہے۔ وما يدريك لعله يزكى (80:3) تمہیں اس بات کا کیا معلوم؟ یہ چیز آتے ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ

نہیں صاحب! یہ تو بے کار چیز ہے' کچھ نہیں ہے۔ تمہیں کیا علم ہے کہ یہاں آنے کے بعد یہ کتنی بڑی پاکیزگی اور نشوونما حاصل کر لے۔ تمہارا FIRST IMPRESSION (پہلا تاثر) یہ ہونا چاہیے کہ جو آیا ہے' اس کے ساتھ اس طرح سے جذب وکشش سے پیش آؤ' ملاتفت اور نرمی سے پیش آؤ' اس کو اپنے قریب کرو۔ کیا عجب ہے کہ وہ اس سے کیا کچھ نہ بن جائے۔ او یذکر فتنفعه الذکرٰی (80:4) اگر اتنی بلندیوں پر نہ بھی پہنچے تو کم از کم نصیحت تو اس سے حاصل کرے' نصیحت پر عمل کرے' یہ کچھ فائدہ تو ہوگا لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اما من استغنٰی . فانت له تصدٰی (80:5-6) اس کے برعکس وہ' یہ ہماری آپ کی بات ہو رہی ہے' پھر یہ نہ ذہن میں رکھیے گا کہ نبی اکرم ﷺ سے (معاذ اللہ) کہا جا رہا ہے' کیا حضور ﷺ کی سیرت یہ تھی؟ کہ دوسری طرف وہ ہے محض اس لیے کہ ذرا بڑا آدمی ہے اور وہ تمہاری ان چیزوں سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے لیکن تیری کیفیت یہ ہے کہ تُو بہت زیادہ اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ کیا بات قرآن کر گیا ہے! فانت له تصدٰی (80:6) اس کی طرف جھک جھک کر تُو جا رہا ہے۔ وما علیك الا یزکٰی (80:7) یعنی یہ شخص جو آپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا کہ وہ ہدایت کی بات سنے یا اس کے اوپر عمل کرے' وہ اگر ان چیزوں سے ہدایت یافتہ نہیں ہو رہا' اس کا تمہارے ذمے کوئی الزام نہیں عائد ہو جاتا' تم اس بات سے بری الذمہ ہو۔ یہ چیز غلط ہے۔ و اما من جآئك یسعٰی . وھو یخشٰی . فانت عنه تلھّٰی (80:8-10) اور وہ جو دل کے جھکاؤ کے ساتھ کھنچے کھنچے تمہاری طرف آ رہا ہے' کچھ سیکھنے کے لیے' کچھ اپنی اصلاح کرنے کے لیے' کچھ سمجھنے کے لیے' محض اس لیے کہ معاشرے میں اس کی حیثیت بڑی کم سی ہے' اس کی طرف سے بے رخی برتنا' تمہارے ہاں نہایت بری بات ہے' یہ غلط ہے۔ کلا انھا تذکرۃ . فمن شآء ذکرہ (80:11-12) یہ تو ایک پوری انسانیت کے لیے کھلی ہوئی نصیحت کی چیز ہے: جو چاہتا ہے اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔ تیری کیفیت یہ ہے کہ جو چاہتا نہیں ہے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے' محض اس لیے کہ بڑا ہے' یہ جو اس طرح سے چاہ کے تمہاری طرف آ رہا ہے' محض اس لیے کہ معاشرے میں اس کی پوزیشن ایسی نہیں ہے اس سے بے رخی برت رہا ہے' ڈانٹ رہا ہے دھتکار رہا ہے۔ عزیزان من! یہ بات نہیں ہے۔ اس سے وحشی پرندے مانوس نہیں ہوا کرتے' اس سے مُردوں کو زندگی نہیں ملا کرتی۔

انسانی زندگی کا سرمایہ حیات انسان سے نفرت کی بجائے اسکے جرم سے نفرت میں ہے

عزیزان من! یہ ہے میری قرآنی بصیرت کے مطابق سورۃ البقرۃ کی آیت 260 کا مفہوم' جس میں حضرت ابرہیمؑ نے پوچھا تھا کہ مردوں کو زندگی بخشنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور طریقہ یہ بتایا تھا کہ اپنے اندر اتنی کشش پیدا کر کہ تمہاری طرف غیر مانوس اور وحشت انسان کھنچے ہوئے چلے آئیں۔ اس کے لیے صبر' تحمل' برداشت' استقامت' التزام' ان چیزوں کی ضرورت ہوگی اور یہ بھی کہ وسعت نگاہ ہو' قلب کا

ظرف ہو‘ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر گرفت نہ کرنے لگ جاؤ‘ نفرت نہیں ہو۔عزیزان من! بس ایک بات یاد رکھو! کہ نفرت نہیں ہو۔اگر کسی سے اس کی اس بات کے متعلق یہ چیز سرزد ہوتی ہے‘ تو کہو کہ یہ غلط ہے اس انسان سے نفرت نہ برتو کہ یہ احترام آدمیت کے خلاف چلا جائے گا۔کسی کے خلاف نفرت نہیں۔جو مجرم فرد (PERSON) ہے‘ اس کے خلاف نفرت نہیں‘ اس کے جرم کے خلاف آپ نفرت برتیے کہ اس جرم کے ارتکاب کے باوجود وہ آدمی تو رہتا ہے۔آدمی کا احترام تو باقی رکھیے‘ جو حقوق آدمیت ہیں‘ ان سے اس کو محروم نہ کیجیے۔جو اس سے ایک حرکت سرزد ہوئی ہے‘ اس کی اصلاح کیجئے‘ اس کو برا کہیے‘ اس شخص کو نہیں۔

انسان کی محبت انسان کو زندگی عطا کرنے کا موجب بنتی ہے

بات ہے یہ بڑی نازک سی لیکن ہے بڑی اہم۔محبت اور نفرت بالکل دو متضاد چیزیں ہیں۔یہ جتنی چیزیں آپ چاہتے ہیں کہ کسی کو زندگی ملے‘ محبت کرتے چلے جایئے اور اس کے برعکس جو ہمارے ساتھ وہ گیا ہوا ہے‘ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے‘ یہ محض اس لیے ہے کہ یہ طبقے کہ جنہوں نے ان لوگوں کو کوئی روشنی دکھائی تھی‘ ان کیکیفیت یہ ہے‘ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جو ذرا سا بھی ان کے وضع قطع میں معیار کے اوپر نہ اترے‘ اتنا جھاڑو‘ اتنا دھتکارو کہ توبہ کر کے چلا جائے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

خوئے دل نوازی سے قوموں کو زندگیاں ملتی ہیں۔

عزیزان من! جو شخص بھی خدا کا پیغام دینے کے لیے آگے بڑھے‘ اس کے لیے ”یہ خوئے دل نوازی“ ضروری ہے۔یہ ہے طریق جس کو اختیار کرے۔یہی اسوۂ ابراہیمؑ ہے یہی سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

چھپن واں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 261 تا 265)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ
سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ
حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ
اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1969ء کی 10 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 261 سے ہو رہا ہے: (2:261)۔

قرآن حکیم کی طرف سے قوموں میں حیاتِ تازہ کی نمود کیلئے ایک نسخہ کیمیا کا ذکر

سابقہ آیت میں یہ عظیم حقیقت سامنے آئی تھی کہ ایک داعیٔ انقلاب نے یہ پوچھا تھا کہ قوموں کو حیاتِ تازہ کس طرح سے مل سکتی ہے؟ وہ طریقہ کیا ہے کہ جس سے ان مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونکا جائے اور قیامت موجود کا نمود ہو جائے۔ کہا یہ گیا تھا کہ یہ لوگ اپنی عادات میں راسخ ہو چکے ہیں، جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے غیر شعوری طور پر اس پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں اور اسی کو راہ ثواب سمجھ رہیں ہیں۔ یہ غلط معتقدات، باطل کی نظریات اس قدر ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں کہ اس سامری کے بچھڑے کی محبت کو ان کے دل سے نکالنا بڑا صبر طلب مرحلہ ہے۔ اس لیے یہ آواز جو تم انہیں دیتے ہو، انہیں بڑی غیر مانوس اور غیر معروف سی نظر آتی

ہے، وہ اس سے دور بھاگتے ہیں، بدکتے ہیں، تمہارے قریب نہیں آتے۔ اس کا طریقہ یہی ہے جس کے مطابق ان وحشی پرندوں کو سدھایا جاتا ہے: صبر، برداشت، استقامت، تحمل، محبت، کشش، جاذبیت۔ انہیں قریب کرتے چلے جاؤ، قریب تر لاتے چلے جاؤ۔ بڑا وقت لگے گا، بڑا صبر آزما مرحلہ ہوگا لیکن اس کے بغیر یہ مانوس نہیں ہوسکیں گے۔ اور جب یہ مانوس ہو جائیں گے تو تم نے سدھائے ہوئے پرندوں کو دیکھا ہے کہ پھر انہیں دور دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی اڑا کر بھیج دیا جائے، ایک اشارہ کرنے سے وہ دوڑتے ہوئے، پھڑ پھڑاتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ اگر تم نے اس انداز سے التزاماً، اصراراً، تکراراً ان کو اس آواز پر مانوس کر دیا تو پھر، تم دیکھو گے کہ کس طرح سے یہ تمہاری آواز پر لبیک کہتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

جہانِ نو کیلئے ایک جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے

یہ ہے طریقہ قوموں میں حیات نو کی روح پھونکنے کا۔ اس سے ایک جماعت کی تشکیل ہوتی ہے اور یہی وہ جماعت ہے جو پھر وہ انقلاب برپا کر دیتی ہے جس سے ان قبرستان کے مُردوں میں تازہ زندگی آ جاتی ہے۔ انقلاب کے لیے ایک ابتدائی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے، یہ انفرادی پروگرام نہیں ہے، یہ اجتماعی پروگرام ہے۔ اسی لیے محمد رسول ﷺ کے ساتھ جو والذین معہٗ ہے، ناگزیر ہے۔ یہ وہ والذین معہٗ کی جماعت ہے جو اس طرح سے تیار کی جاتی ہے۔ جماعت تیار ہوئی۔ آپ غور کیجیے مرحلہ کتنا صبر آزما، جاں گسل تھا کہ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں، حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر نبوت قیامت تک پھیلی ہوئی ہے کہ آخری نبی ﷺ ہیں، آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری ہے۔ تیئس سالہ حیات نبوت ہے، اس میں سے تیرہ سال کی زندگی پچاس فیصد سے بھی زیادہ، یہ ان کی وحشی غیر مانوس پرندوں کو مانوس کرنے کے اندر صرف ہو جاتی ہے۔ اس تیرہ سالہ زندگی کا ماحصل عام ظاہر بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو بہت معمولی ہے، بدر کے میدان میں تین سو تیرہ مجاہدین تھے لیکن جب یہ جماعت وجود میں آ گئی تو پھر یہ جو باقی دس سال تھے، اس دس سال میں انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو دس صدیوں میں بھی ممکن نہیں ہوا کرتا۔

معاشی نظام کو وحی کی روشنی میں متشکل کیئے بغیر کوئی نظام بھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا

پہلا مرحلہ اس داعیٔ انقلاب کے لیے، اس قدر استقامت اور اس قدر التزام اور برداشت کا تھا۔ اب یہ نہیں کہ یہ صرف داعیٔ انقلاب کے لیے تھا، اگلا مرحلہ خود اس جماعت کے لیے شروع ہوتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ جیسے داعیٔ انقلاب، صحابہؓ جیسی جماعت، عام اصطلاح میں جسے آپ روحانیت کا ایک جم غفیر کہیے۔ لیکن کوئی پروگرام، کوئی نظام، کوئی انقلاب، جب تک اس میں معاشیات کا دخل نہ ہو، کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اور یہی چیز ہے کہ جو اس کے بعد پہلی آیت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مثل الذین

یــنفقون اموالھم فی سبیل اللہ (2:261) اب انفاق فی سبیل اللہ کے لیے آیت آئی۔ جماعت بن رہی ہے' اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے' اس پروگرام کی تکمیل کے لیے' نہایت ضروری ہے کہ تمہارے پاس پیسہ ہو۔ اب پروگرام کی ابتدا ہو رہی ہے۔ پروگرام کی ابتدا میں آپ دیکھتے ہیں' محنت ہی محنت پڑتی ہے اور جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے' اس کا کوئی ریٹرن نہیں ہوتا' دیئے ہی چلے جانا ہے' دیئے چلے جانا ہے۔ اگر داعیٔ انقلاب کے لیے یہ مرحلہ صبر آزما تھا تو یہ جو اس کے متبعین کی جماعت تھی' ان کے لیے بھی یہ مرحلہ کچھ کم ہمت طلب نہیں تھا کہ آپ دیئے چلے جا رہے ہیں اور اس کے ریٹرن کے متعلق کچھ ذہن میں آ ہی نہیں رہا کہ اس میں سے کبھی کچھ ملے گا بھی یا نہیں۔ یہ بڑا ہمت طلب مرحلہ ہے۔

قرآنی نظامِ حیات کے لئے قرآن حکیم کی طرف سے کھیتی کی مثال پیش کی جاتی ہے

یہی وجہ ہے کہ پہلی ہی آیت میں جو بات کہی گئی' وہ وہی مثال ہے جو قرآن کریم اس نظام کے لیے عام طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ ہے کھیتی کی مثال' کسان کی مثال۔ یہاں وہی مثال دی گئی ہے جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھتے ہیں۔ اور اب تو آپ نے سمجھ لیا کہ اللہ کی راہ کیا ہوتی ہے؟ اس قسم کا انقلاب لانا جس میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جائے۔ یہ اللہ کی راہ ہے۔ جو لوگ اپنا مال اس مقصد عظیمہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں' ان کی مثال کہا کہ کھیتی میں بوئے جانے والا ایک دانہ ہے جس کے ایک ایک دانے میں سے سات سات بالیں نکلتی ہیں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اس ایک مثال میں وہ جو داعیٔ انقلاب سے کہا گیا تھا' وہی کچھ ان متبعین سے یہاں کہہ دیا۔ آپ کسان کی زندگی دیکھیے' یہ تو اب یہ چیز ہے کہ کسان کو پہلے دن سے یہ پہلے معلوم ہے کہ جو کچھ میں کرتا ہوں' آخر الامر اس کا کتنا بڑا نتیجہ میرے سامنے آئے گا لیکن آپ سوچیے کہ اس سے پہلے یہ چیز مشہود طور پر اپنے سامنے نہ دیکھی ہو' محض نظری طور پر سمجھائی گئی ہو' اور کہا یہ گیا ہو کہ جو کچھ تم کرو گے' سات سات سو گنا اس کا حاصل اور ریٹرن تمہیں ملے گا لیکن عملاً ابھی یہ چیز سامنے نہ آئی ہو' اس کے لیے کتنے محکم یقین کی ضرورت ہے اور کسان کا مرحلہ کتنا بڑا ہے صبر آزما یہ مرحلہ ہوتا ہے۔

ان دیکھے نتائج پر کسان کی بھرپور محنت اپنے اندر ایک عظیم سبق لئے ہوئے ہے

اسی لیے قرآن کریم مثال ہمیشہ کھیتی کی دیتا ہے' یہ بری عجیب مثال ہے۔ کسان بیج ڈالنے سے بھی پہلے جتنی محنت زمین کی تیاری پر کرتا ہے' اسے آپ دیکھیے اس کا خون پسینہ ایک ہو جاتا ہے' دن رات اس میں محنت کر رہا ہوتا ہے۔ آج کل کی اس گرمی میں' گھروں کے اندر' پنکھوں کے نیچے بیٹھے ہوئے دم گھٹتا ہے' ذرا باہر جا کر دیکھیے تو سہی' یہ جو کھیت تیار کرنے والا ال کستان ہے' آج کل کرتا کیا ہے؟ وہ ہمارے کہتے ہیں کہ ''جٹ فقیر ہو جاندا ہیگا اے[1]'' یہ اتنا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ کچھ کرتا ہے۔ گھر میں ساری پونجی یہ تھوڑے سے دانے

ہوتے ہیں' بچوں کے لیے روٹی نہیں ہے' لیکن ان سے وہ دانے اٹھا کر لے جاتا ہے' چھین کر لے جاتا ہے' باہر جا کر مٹی میں ملا آتا ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ آج تو یہ چیز ہمارے لیے کوئی وجہ حیرت نظر نہیں آتی کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس میں سے کیا ہوگا؟ پہلے یہ دیکھا نہ ہو کہ اس میں سے کیا ہوا کرتا ہے اور کیا ہوگا اور وہ یہ مانتے چلے جائیں کہ ہاں صاحب! یہ جو چار دانے گھر میں رکھے ہیں' انہیں بھی لے جا کر باہر مٹی میں ملا آؤ' بڑے ہی یقین محکم کی ضرورت ہے۔ پھر مٹی میں ملا کر آ کے سو نہیں جاؤ' روز صبح جاؤ درانتی کھرپا' کچھ آلات کشاورزی بیل' ان کے ساتھ اور محنت کی چیزیں روز صبح جاؤ' سارا دن محنت کرتے چلے جاؤ' شام کو خالی ہاتھ گھر واپس آ جاؤ۔ ایک دن نہیں' دو دن ہیں' مہینہ نہیں' دو مہینے نہیں' کرتے چلے جاؤ کرتے چلے جاؤ۔ کہتا ہوں ذرا دیکھیے تو سہی پھر اس چیز کو ذہن میں رکھیے کہ پہلے سے یہ چیز سامنے نہ ہو کہ یہ اس کے لیے کیا ہوا کرتا ہے اور ذرا یہ کر کے بتائیے۔ یہاں دیانت دار بننے کے لیے اگر

---

❶ جاٹ' گنوار' محنت کار بھک منگا ہو جاتا ہے۔

باشد شب باشد' شب دیگر نمی باشد

چار دن کرنے کے بعد کہتا ہے کہ نہیں' صاحب! اس معاشرے کے اندر چل نہیں سکتا' یہ جو چیز ہے بڑی مشکل ہے قدم قدم کے اوپر انسان کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور پھر بالآخر ملتا کیا ہے' دیکھا ہے ہم نے یہ چیز قدم قدم کے اوپر قدم ڈگمگاتے ہیں۔

ملائکہ کا نزول تو خدا تعالیٰ کے احکامت کی دل وجاں سے پیروی کے ساتھ مشروط ہے

کسان کا قدم نہیں ڈگمگاتا' شام کو خالی ہاتھ آتا ہے' دوسری صبح پھر اسی طرح سے چلا جاتا ہے' اسی تن دہی کے ساتھ وہی مشقت ہے۔ اس لیے کہ اس کا یقین ہے کہ ان لاذین قالو اربنا الله تم استقامو اتتنزلو اعليهم الملئكة (41:30) جنہوں نے کہہ دیا کہ الہ ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے اور پھر اس پر جم کر استقامت سے کھڑے ہو گئے یہ ہیں وہ لوگ جن کے اوپر ملائکہ اترا کرتے ہیں۔ اترتے تو ہیں لیکن کب اترتے ہیں؟ تیرہ سال مکے کی زندگی کے قریباً ڈیڑھ دو سال مدینے کی زندگی کے پندرہ سال کی اس قدر صبر آزما مشقتوں کے بعد بدر کے میدان میں ملائکہ اترے تھے اس سے پہلے تو نہیں اترے تھے۔ یہ کس چیز کا نتیجہ تھا؟ قـالـو ا ربـنـا الـلـه (41:30) تو پہلے دن انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ثـم استقامو (41:30) کی جو منزل تھی' یہ تھی جو پندرہ برس لے گئی' جو پہلا نزول ملائکہ ہوا ہے۔ اور پھر جب نزول ملائکہ ہوا ہے تو پھر تو علی التواتر وہ آتے چلے گئے۔ یہ جو درمیانی مرحلہ ہوتا ہے' یہ ہے صبر آزما مرحلہ۔ زمین میں بیج ڈالنے اور اس کے بعد کھیتی کے پکنے کا مرحلہ' یہ ہے جو مثال قرآن دیتا ہے۔ پھر اس میں یہ چیز ہے کہ ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے آتے ہیں۔ والـلـه يضعف لمن يشآء (2:261) جو اس طرح سے صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد لینا چاہتا ہے' ہم

سے لے کر دیکھے کہ ہم ایک دانے کے بدلے میں کتان دیتے ہیں لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے کتنے صبر آزما مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے:

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک

قطرے کو گہر ہونے تک کے لیے

دام ہر موج میں ہے حلقہ صدکام نہنگ

اس کے لئے غالب (1797-1869) کے الفاظ میں ''دام'' ہوتے ہیں لیکن ملتا اسے ہی ہے کہ جو اس طرح سے اس پروگرام کو اختتام تک پہنچا دیتا ہے۔ راستے میں جس مقام پر بھی کہیں کوئی کسان تھک گیا اور اس نے تھک کر یہ کہہ دیا کہ جہنم میں جائے اس قسم کا پروگرام۔ چار مہینے ہو گئے' صبح سے جاتے' شام کو مزدوری کر کے گھر آتے' اس سے تو اچھا ہے وہ مل مزدور جو صبح کو جاتا ہے رات کو تین روپے لے کر چلا آتا ہے' میں کیوں مصیبت میں پھنس گیا۔ جہاں اس نے حوصلہ توڑا' ہمت ہاری' وہیں اس کا جو پروگرام ہے' مبدل بہ شکست ہو گیا پھر آگے کچھ نہیں اگے گا' اگی ہوئی کھیتیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

جگر خوں ہو تو پھر ہوتی ہے نظر پیدا

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا دونوں آیتوں میں' کتنا گہرا ربط ہے۔ داعئ انقلاب کے لیے ان غیر مانوس وحشی پرندوں کو سدھانا ہے' یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔ یہ جو اس کے بعد جماعت مرتب ہوئی ہے' اس جماعت کے اراکین کے لیے ان کو کسان کا سا صبر چاہیے' محنت ہی منت کرتے چلے جائیں۔ اب کیا معلوم ہے کہ اس محنت کی دوران' ان میں سے کتنے تھے' جو اس دنیا سے ہی چلے گئے۔ بظاہر تو ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو خدا کی راہ میں جان دے رک جانے والے ہیں' وہ جب اپنا خوں بہا دیکھتے ہیں کہ جو بعد میں آنے والے ہیں' ان کو مل رہا ہے' تو اس سے وہ وہاں خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جو یہاں کر رہے تھے' وہ بھی اپنے لیے کوئی خود غرضی کی چیز نہیں تھی' ایک مقصد عظیم سامنے تھا' اس مقصد کے حصول کے لیے یہ کچھ کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی کو اس دوران میں طبعی موت آ جاتی ہے تو کوئی بات نہیں ہے' یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے' جتنا کچھ بھی اس نے کیا ہے' اس کا CONTRIBUTION اس کے لیے ہے۔ وہ جو نظام پختگی تک پہنچے گا' کامیابی تک پہنچے گا' اس میں سے ہر ایک کے ایک ایک سانس کی قیمت ہوگی' وزن ہوگا۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے آ جائیں' وہ دارالہجرت کے اندر نہ بھی پہنچیں راستے میں ہی اگر ان کی موت آ جائے تو خدا کے ہاں ان کا اجر ہوتا ہے' اس نے بھی اس چیز کے لیے CONTRIBUTE کیا ہے۔ یہ تو پروگرام ہے

گول کیپر گھنٹہ بھر تک گول کے اندر کھڑا رہتا ہے' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بھی گینداس تک نہیں آتا' ٹیم جب کامیاب ہوتی ہے تو اس کو برابر کا حصہ ملتا ہے۔ جولوگ فی سبیل اللہ اس پروگرام کی تکمیل کے لیے اپنا مال کھلا کرتے ہیں' ان کی مثال کسان کی اس کھیتی کی طرح ہے جس میں ایک دانہ زمین میں ڈالا' سات سات سودانے بن کر آ گیا۔ واللہ یضعف لمن یشآء (2:261) یوں اللہ بڑھا کردیتا ہے' اسے جو بڑھا کر لینا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ وہ دانے اسی دن چکی میں پیس لیتا' روٹی پکا لیتا' ایک دانہ ایک ہی دانے کی قیمت میں واپس ملتا' وہ دو دانے نہیں بن سکتے تھے' چکی میں پیش لینے والے نے نہیں چاہا کہ اس کو زیادہ ملے' اس کو زیادہ نہیں ملا۔ جس نے چاہا ہے' زیادہ ملے' وہ اس کو کھیت میں لے گیا ہے لمن یشآء (2:261) جو زیادہ لینا چاہتا ہے اس کو زیادہ مل جائے گا۔

خدا تعالیٰ کے ہاں میزان عدل کے دستور راہیں

قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں ایک چیز آتی ہے کہ یہ جو حسانت پر کار فرما ہوتے ہیں' ان کو ان کی (عام الفاظ میں) نیکیوں کا بدلا کہیں زیادہ ملتا ہے۔ ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ صاحب! یہ زیادہ بدلا کیوں؟ زیادہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک دانہ بونے سے' وہ ایک ہی دانہ نہیں اگتا' اس میں سے سات سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے' برائی کا بدلہ اتنا ہی ملتا ہے۔ یہ جو دانہ کسی نے بویا ہے اگر وہ دانہ ناقص تھا آپ دیکھیں گے کہ وہ ایک ہی دانہ ضائع ہوتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ اس کے گھر میں جو سیر بھر گیہوں رکھا ہے' وہ بھی ساتھ ہی ضائع ہو جائے۔ کیسا عجیب ہے یہ عدل! بے شمار مقامات پر قرآن میں یہ چیز آئی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنی وہ برائی ہوتی ہے۔ یہ حسنات ہیں کہ جن کا بدلہ اتنا زیادہ ملتا ہے۔ کہا ہے کہ من جآء بالحسنة فله خير منها (28:84) حسن پیدا کرنے والے جو اعمال ہیں ان کا بدلہ ان سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ کسان کا ایک دانہ سات سات سو دانے پیدا کرتا ہے۔ ومن جآء بالسيئة فلا يجزى الذين عملو االسيات الاما كانو ا يعملو ن (28:84) اور یہ جو برائی ہے' اس کی سزا' اس کی پاداش' اس کا نتیجہ' وہ اسی کی مثل ہوتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' یہ بے شمار مقامات پر ہے اور ان مقامات میں ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ہم کسی پر ظلم زیادتی نہیں کرتے ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ زیادتی ہو جاتی ہے کہ اگر ایک ناقص دانہ ڈالنے سے یا اس پر پروگرام کے مطابق جتنی محنت درکار ہوتی ہے وہ نہ کی جاتی یہ ہے وہ چیز جس کو آپ برائی کہتے ہیں یعنی اس پروگرام کے مطابق کام نہ کرا۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ اولئك حبطت اعمالهم (9:69) ان کے اعمال رائیگاں گئے' محنت تو رائیگاں گئی' اس کا دانہ ایک ہی ضائع ہوا ہے۔ لیکن اگر اس پروگرام کے مطابق یہ بیج صالح ہوتا اس میں اگنے کی صلاحیت ہوتی' یہ بڑی شرط ہے زمین ایسی ہوتی جس میں کھیتی پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی' اس پر جو قانون زراعت کے مطابق یہ محنت

کرتا تو پھر ایک ایک دانے کے اس کو سو سو دانے ملتے۔ واللہ یضعف لمن یشآء واللہ واسع علیم (2:261) دیکھیے! یہ واسع کہاں آیا ہے؟ اس کے اندر کتنی وسعتیں ہیں کہ ایک دانہ سات سات سو دانے بن کر آپ کے گھر میں لوٹتا ہے۔

خارجی کائنات کی مانند قرآن حکیم اپنے معاشی نظام کو بھی قدم بہ قدم آگے سے آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے

یہ جو چیزیں ہیں، یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوگئیں کہ صاحب کبھی یہ ہوگیا ہے، کبھی نہیں ہوا ہے۔ ''عالم'' نہیں ہے، یہاں ''علیم'' ہے جو کہا ہوا ہے کہ یہ مسلسل اس کے علم کے مطابق یہ سب ہوتا ہوا چلا جارہا ہے، جذباتی چیز نہیں ہے، ہنگامی چیز نہیں ہے کہ کبھی رو میں آئے تو صاحب! اتنا کچھ بخش دیا اور نہیں موڈ آئی ہوئی تو جو کچھ دیا ہے، اس سے دوگنا چھین لیا۔ یہ سوال نہیں ہے وہاں ظلم نہیں ہوتا، یہ وسعتیں بھی اس کے علم پر مبنی ہوتی ہیں۔ زراعت کے علم سے جو وسعتیں ہوتی ہیں، وہ تو ہمارے سامنے ہیں۔ قران کریم نے یہی تو مثال دی ہے۔ اس کے بعد آگے ایک اور بات کہی ہے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام کو جب ہم دیکھتے ہیں، یہ چیز ایک مرتب طریق کے اوپر تو کبھی بعد میں سامنے آئے گی اور میرے ذہن میں ہے کہ شاید اس کے لیے کتنے ہی درس درکار ہونگے کہ وہ میں عرض کروں کہ کس طرح BY STAGES، منزل بہ منزل، درجہ بہ درجہ قرآن پہلے قدم سے آخر تک، کیسے لے جاتا ہے۔ اس پورے کا نام نظام ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ کوئی اگر صدقے اور خیرات ہی کو نظام سمجھتے ہیں، وہ ابتدائی دور کی چار آیتیں لے لیتے ہیں، انہیں پیش کر دیتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! قرآن کتنا خیرات پر زور دیتا ہے تو گویا خیرات نظام ہی خیرات ہوگیا۔

معاشی نظام کے سلسلہ میں قل العفو تو قرآن حکیم کی آخری منزل ہے

کوئی EXTREMIST (انتہا پسند) ہوتا ہے تو وہ آخری درجے کی کوئی آیات ہیں، جن کے اندر کہا ہے کہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کتنا کچھ اس کے لیے دے دیں؟ جواب ہوتا ہے کہ قل العفو (2:219) ان سے کہو کہ جتنا ضرورت سے زیادہ ہے سارے کا سارا۔ وہ پہلے ہی درجے کے اندر ان آیتوں کو لے آتے ہیں، وہ یہاں فٹ نہیں بیٹھتیں۔ نظام باطل کا ہے ابھی، کچھ افراد اس کے لیے تیار ہوئے ہیں، نظام متشکل نہیں ہوا، حکم ان کو یہ دیدیا جائے کہ جتنا کچھ تمہارے گھر کے اندر ہے وہ سارے کا سارا دے دو وہ پوچھتا ہے کہ دوسرے دن میں کہاں سے کھاؤں؟ اب سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ رازق ہے، وہ تمہیں دے گا اور وہ جس طرح سے اللہ رازق ہوتا ہے وہ تو ہمیں پتہ ہے، بات سمجھ میں نہیں آتی، فٹ نہیں بیٹھتی۔ کہتے ہیں کہ یہ نظام چل نہیں سکتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ نہیں دیکھا جارہا کہ پروگرام اور نظام بتدریج پہلی اسٹیج سے آخری اسٹیج تک جاتا ہے۔ اور قرآن کریم کو تیئس سال میں نازل ہوا ہے۔ نازل ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، نبی اکرم ﷺ نے پہلے دن آواز بلند کی ایک ہی مسلمان خود حضور ﷺ کی ذات دنیا میں بنا، دوسرا مسلم نہیں ہے۔ اب جو آواز بلند کرتے

چلے جاتے ہیں' ایک ایک دو دو کر کے آتے چلے جاتے ہیں' جماعت بنی شروع ہو گئی' نظام کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلے ہی دن یہ چیز نہیں ہو سکتی جو نظام کے آخری درجے میں جا کر ہو گی۔

قرآن حکیم کی تعلیم اور اس کے نظام کو 23 سال میں مکمل کرنا بھی ایک حکمت ہے

آپ دیکھیں شروع میں یہ جو ان چیزوں پر تاکید کی گئی ہے' ترغیب دی گئی ہے' تحریص کیا گیا ہے کہ اس طرح سے دوسروں کی ضروریات کے لیے مال دو' خرچ کرو' خیرات دو' صدقات دو' یہ جو چیزیں ہیں' یہ اس دور کی چیزیں ہیں جس میں نظام اپنی تکمیل تک نہیں پہنچا' آغاز میں ہے' ابھی زندگی انفرادی زندگی ہے' ابھی یہ اس انداز کی اجتماعی زندگی شروع نہیں ہوئی۔ نظام کو سمجھنا ہو تو ہمیشہ اس چیز کو ذہن میں رکھیے کہ یہ نظام تیئس سال میں تکمیل تک پہنچا تھا۔ راستے میں ہر مرحلے کے لیے' ہر منزل کے لیے' ہدایات اور احکام موجود ہیں۔ اس طرح سے ان چیزوں کو رکھیے' بات آپ کے سمجھ میں آ جائے گی۔ یہ سب سے ابتدائی دور ہے۔ اب یہاں ترغیب و تحریص سے یہ چیز ہو رہی ہے' انفرادی طور پر ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ ساتھ ہی کہا گیا کہ الـذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله ثـم لایتبعون ما انفقوا مناً و لا اذًی لهم اجرهم عندربهم و لا خوف علیهم و لا هم یحزنون (2:262) وہ لوگ جو دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کچھ دیتے ہیں اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے سر پر احسان نہیں دھرتے' پھر ان کے اوپر مصیبت نہیں بن جاتے۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کے اجر ان کے خدا سے ملے گا اور اجر یہ ہو گا کہ انجام کار ایک ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا کہ جس میں کسی قسم کا کسی کو نہ خوف ہو گا' نہ حزن ہو گا۔ آپ یہ دیکھیے کہ ابتدائی احکام میں یہ کتنی گہری چیز کہہ دی۔

خیرات اور صدقات قرآن کے معاشی نظام کی ابتدائی ترجیحات میں سے ہیں

خیرات کا تصور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' ہنگامی ضرورت اور شے ہے' بطور نظام حیات اگر آپ اسے دیتے ہیں' اس سے زیادہ باعث تذلیل انسانیت کچھ اور ہو سکتا ہے؟ کسی شخص کو آپ بطور خیرات کے کچھ دیں اور خیرات کے اوپر زندگی بسر کرنے والے جو ہیں' ذرا ان کو دیکھیے تو سہی کہیں کوئی انسانیت کی رمق آپ کو نظر آتی ہے؟ نہیں' وہ بے چارے کچلے جاتے ہیں' وہ شرف انسانیت سے محروم ہوتے ہیں ان کی اوپر نگاہ نہیں اٹھ سکتی' یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

خیرات کے چند ٹکڑوں کا نتیجہ ایک وقت کی روٹی عمر بھر کی غلامی

خیرات کوئی نظام زندگی نہیں ہو سکتا۔ انفرادی طور پر ابتدائی دنوں میں اس کی ضرورت پڑی ہے۔ آپ دیکھیے اس کے ساتھ یہ چیز کہہ دی ہے کہ دیتے ہیں تو اس کے بعد لفظ یہاں آیا ہے کہ لا یتبعون ما انفقوا مناً و لااذًی (2:262) اس مناً کے معنی تو ہیں'

جسے ہم احسان کہتے ہیں لیکن یہ وہی لفظ ہے ''آ من جیہڑا ہونداا ے چلیہاں سیراں دا[1]'' کہ اسے پاؤ بھر آٹا دیا' من بھر کی سل اس کے سر پر رکھ دی' پھر دیا ایک من اور رکھ دی۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیا کر رہے ہو تم ان کے ساتھ؟ اس کے متعلق ابھی میں عرض کرتا ہوں۔ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ قول معروف و مغفرۃ خیر من صدقۃ یتبعھا اذًی (2:262) یہ دے کر اگر یہ کچھ کرنا تھا تو اس سے تو بہتر تھا' تم کہہ دیتے کہ بابا! معاف کرو اور اس طرح سے اس کو اس تکلیف سے تو محفوظ رکھتے' یہ جو عذات اس کے لیے بن گیا' ایک وقت کی روٹی دی' عمر بھر کا غلام بنایا۔ وہ جو کئی بار بات آ چکی ہے اور کئی بار آنی چاہیئے' اصل یہ ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں نظام ہے نہیں' ہم جانتے ہی نہیں نظام کے اندر کی زندگی ہوتی کیا ہے؟ یہ انفرادی زندگی ہے' خیرات کو ہمارے ہاں اتنا بڑھا چڑھا کر نیک کام بتایا گیا ہے کہ اس سے زیادہ تصور ہی ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔

---

[1] یہ جو چالیس سیر کا ایک من ہوتا ہے۔

گداگروں کا وجود ہی دولت مندوں کیلئے ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے

انفرادی طور پر ایک جماعت کا موجود رہنا آپ کو معلوم ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ صاحب! ایک ایسا نظام ہونا چاہیئے' جس میں کوئی بھوکا ننگا نہ ہو' اس کے جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے' یہ قرآن اور اسلام اور خدا اور رسول کے منشا کے خلاف ہے۔ اگر کوئی بھوکا ننگا نہ رہے تو پھر یہ خیرات دینے والے خیرات کس کو دیں اور پھر یہ ثواب کیسے حاصل کریں؟ یعنی ان کو ثواب پہنچانے کے لیے ایک جماعت کا مستقل طور پر رکھنا بڑا ضروری ہے۔ اگر چور نہ رہیں تو صاحب! یہ تھانہ ہی نہ رہے۔ بیس آدمی ملازم ہیں' روٹی کھاتے ہیں اور گزر کرتے ہیں کہ عجیب انتظام آپ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہاں کوئی جرائم پیشہ ہی نہ ہو یعنی ان کی موجودگی کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ہاں جرائم پیشہ موجود رہیں۔ یہ دولت مندوں کے لیے ہے کہ وہ خیرات دے کر صدقہ دے کر ثواب حاصل کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے ہاں گداگروں کی جماعت محتاجوں کی' مفلسوں کی' رہے۔ آپ منطق پر غور فرمائیے۔ کہا کہ یہ ابتدائی ایام کی چیز ہے' یہ انفرادی طور پر ابھی ہو رہا ہے۔

مملکت اسلامیہ کی پیشانی پر جلی حروف سے لکھی جانے والی عبارت

میں عرض کروں گا کہ جب یہ نظام آگے آ جائے گا تو کوئی فرد کسی دوسرے فرد سے لے کر کچھ نہیں کھاوے گا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہو گا۔ وہاں تو آپ کے ہاں کا نظام جسے آج کی اصطلاح میں مملکت یا سٹیٹ کہتے ہیں' وہ اپنے بڑے دروازے پر لکھ کر لگا دے گا کہ نحن نرزقکم و یاھم (6:151) ہم تمہارے اور تمہارے بچوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ اور آپ کو پتہ ہے کہ جو چیز نظام کی طرف سے

ہوتی ہے' پھر اس میں تو کسی فرد کا احسان نہیں ہوتا لیکن یہ چیز پہلے دن سے ان کے ذہن میں ڈالی جا رہی ہے کہ اگر نظام قائم نہیں' بات انفرادی ہے لیکن اس میں یاد رکھیے! اگر ذرا سا جذبہ تمہارے دل میں یہ آ گیا کہ ہم نے یہ کر کے کسی کے سر پر احسان دھرا ہے' تمہارا سب کچھ دیا دلایا ہوا باطل ہو جائے گا۔ اس سے اچھا ہے کہ تم کہہ دو کہ نہیں بابا! معاف رکو۔ کیا بات ہے! وہ تو صرف طبعی تکلیف ہے' اس کی بھوک کی تکلیف ہے' اسے تو برداشت کر لینا آسان ہے' یہ جو تم اس کی انسانیت کو کچھ رہے ہو' یہ اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ کہا کہ مغفرۃ (2:262) اسے اس عذاب سے بچا لو۔

معاشرتی زندگی میں باہمی رفاقت کے متعلق انقلابی کیفیت کی شکل وصورت

کیا بات یہاں قرآن نے مغفرۃ کی کہی ہے۔ ان دینے والوں کے متعلق کہا کہ جذبہ تمہارے اندر یہ ہونا چاہیے کہ لا نرید منکم جزآء و لا شکوراً (76:9) کتنی بڑی بلندیوں پر پہنچا رہا ہے ابتدائی دور میں! یہاں تک پہنچا رہا ہے قرآن کہ ہم تم سے اس کا معاوضہ تو ایک طرف' ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ آپ دیکھیے کہ قرآن مومن کے قلب میں تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ دینے والے کے دل کی یہ کشائشیں کہ شکریہ کا متمنی نہیں ہے دوسرے سے صاحب! کیوں متمنی نہیں ہے؟ قرآن یہ نہیں کرتا ہے کہ حکم دیتا ہے کہ صاحب! دیکھو' تمہارے دل میں شکریہ کا خیال تک نہ آئے' حکماً تو یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی' وہ تو بات RATIONALLY سمجھاتا ہے' دلیل و برہان سے یہ بات سمجھاتا ہے کہ یہ ہونی نہیں چاہیے۔ کیوں نہیں ہونی چاہیے؟ اگر تو صورت یہ ہے کہ دوسرے کو آپ بھیک دیتے ہیں خیرات دیتے ہیں' تو دل میں یہ بات آ جاتی ہے' آ سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! والذین فی اموالھم حقاً معلوم للسآئل والمحروم (70:24-25) تمہارے مال میں ان کا حق ہے' وہ تو اپنا حق لینے کے لئے آئے ہیں اور جسے تم اس کا حق دیتے ہو' حق دینے کے بدلے میں پھر تم اس سے جزا اور شکریہ کے متمنی ہوتے ہو!!۔

قرآن حکیم کی تعلیم تو دلوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے

دیکھا آپ نے قرآن نے دلیل کیسی دی! وہ یوں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہ ایمان ہے کہ میرے پاس جو زائد دولت ہے' یہ ان کا حق ہے' میرے پاس صرف امانت رکھی ہوئی ہے جس وقت ان کو ضرورت ہوگی' وہ آ کے مانگ کر لے جائیں گے۔ یہ تو الٹا اس کا شکریہ ادا کرے گا کہ شکریہ! تم نے مجھے اس کی حفاظت کی زحمت سے بچا لیا' روز سنبھالتا پھرتا تھا' تم آ گئے بھئی! لے لو اپنی یہ چیز' کتنا بوجھ اترا میرے سر سے۔ شروع میں قرآن دلوں کے اندر اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔

ایک بات جو کئی دفعہ آئی' جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ چیزیں تو درس میں بار بار آئیں گی۔ جب آئیں گی' انہیں دہرانا ہوگا' اس

طرح سے سمجھنے میں پختگی آ جاتی ہے۔ یہ ایک ٹکڑا قرآن کریم کا لے اڑتے ہیں' ہر جگہ اس کو صاحب چسپاں کیا جاتا ہے: ھل جزآء الاحسان الا الا حسان (55:60) چل بھئی! احسان کا بدلہ تو احسان ہے صاحب!

احسان کا بدلہ تو حسن کا پیدا کرنا ہوتا ہے کسی کو غلام بے دام بنا لینا نہیں ہوتا

ابھی ابھی میں نے عرض کیا کہ وہ کہتے ہیں لا نرید منکم جزآء و لا شکوراً (76:9) ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں' نہ شکر یہ تک کے متمنی ہیں۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ھل جزآء الاحسان الا الاحسان (55:60) احسان کا بدلہ تو احسان ہے' تم نے اس پر احسان کیا' اب اس پر اس چیز کا فریضہ ہو گیا کہ یہ تم پر احسان کرے۔ جب تک وہ یہ قرض اتارے نہیں' وہ تمہارا مقروض رہے اور پھر مقروض اس قسم کا کہ یہی نہیں کہ آپ اس کے بعد کہیں کہ تمہاری ہم نے فلاں مقام پر دس روپے کی مدد کی تھی نہیں' پھر اس کے بعد وہ ہر بات آپ کے فیصلے کے مطابق کرے' ہمیشہ کے لئے آپ کا غلام بے دام بنا ہوا ہو۔ پھر یہ جملے ہوتے ہیں: احسان نا فراموش: طوطے چشم آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ کیفیت یہ ہے' کہہ رہے ہیں صاحب! دیکھیے کس ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ ووٹ تو ہم انہیں دیں گے جنہیں ہم زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے بھئی! آج آتی ہیں ٹکے ٹکے کی باتیں' وہ دن بھول گئے' بھوکے آ رہے تھے' روتے ہوئے آ رہے تھے' بھیک مانگ رہے تھے آ کے' اس وقت' دیا تمہارے منہ میں لقمہ کتے کی طرح' اور آج یہ کیفیت ہے۔ مجھے تو اسی وقت دنیا کہتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ نیکی کرتے ہوئے اس پر احسان کر رہے ہو' بڑا احسان فراموش ہے صاحب! ٹھیک ہے صاحب! گئے تھے ان کے پاس لیا تھا' ان کا احسان' اب کریں کیا؟ وہ تو اسی صورت میں اتر سکتا ہے کہ خدا کرے یہ بھوکا مرے' روتا ہوا میرے پاس آئے' پھر اسی طرح سے اس کے منہ میں' میں لقمہ دوں' احسان کا بدلہ اترا صاحب! اب ساری عمر یہ دعائیں مانگے گا کہ یا اللہ! اس پر بھی وہ حالت ہو۔ اگر وہ نہیں ہوتی تو وہ صاحب لٹھ لیے ہوئے کھڑا ہے۔ اور جب پوچھو کہ صاحب! تم احسان کا بدلہ مانگتے ہو؟ کہتا ہے کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ ھل جزآء الاحسان الاالاحسان (55:60)۔ کیا قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ لانرید منکم جزآء و لا شکوراً (76:9)؟

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم عربی والے قرآن کا اردو میں ترجمہ کرتے ہیں

عزیزان من! جس معنی میں ہم احسان لیتے ہیں' احسان کے معنی جو ہم لیتے ہیں' یہ عربی زبان تو ایک طرف' قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں ایا ہی نہیں ہے۔ یہ مناً کا لفظ ہے من کا لفظ ہے۔ وہ تو مصیب یہ ہے کہ وہ عربی زبان کا قرآن ہے' ہم اردو ن میں اس کو سمجھتے ہیں۔ جن معنی میں اس کے الفاظ ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں' وہی معنی ہم قرآن کو پہنا دیتے ہیں۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہے ہی نہیں' احسان کرنا ہو گا انتظار کرتے رہو ساری عمر۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ''حسن پیدا کرنا''۔ حسن

کے معنی ہیں ''صحیح تناسب پیدا کر دیا' صحیح PROPORTION کسی کی پیدا کر دینا''۔ یہ جسے آپ کہتے ہیں ضرورت رک گئی' جسے اپ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر بدحالی آ گئی' بدنصیبی ہوگئی' یہ کیا ہوتا ہے؟ زندگی کا توازن بگڑا ہوا ہوتا ہے' اس میں کسی چیز کی کمی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں جس چیز کی کمی ہے اور اس سے حسن بگڑ گیا ہے' اس کمی کو پورا کر دینے کو احسان کہتے ہیں۔ و بالوالدین احساناً (2:83) اگر احسان کے یہی معنی ہوں تو پھر تو آپ نے ماں باپ کو احسان کے نیچے دبا رکھا ہے۔ کیا یہ ہیں احسان کے معنی؟ قرآن حکیم نے تو یہ کہا ہے کہ کما ربّیٰنی صغیراً (17:24) تم بچپن میں اس قابل نہیں تھے کہ آپنے لیے آپ کچھ کھانے پینے کا انتظام کر سکتے' انہوں نے یہ کیا تھا تمہاری اس کمی کو پورا کر دیا تھا بڑھاپے میں اب ان میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکیں' تم ان کی ضروریات کو پورا کرو۔ ان کے صحیح توازن میں کمی واقع ہوگئی تھی کمی کو پورا کر دیا۔ کیا ہوا؟ کہ حسن پیدا کر دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو تم نے بگڑے ہوئے حسن میں جو کمی رہ گئی تھی' وہ اس میں پوری کر دی تو اس کا بدلہ اس کے سوا کیا ہے کہ حسن پیدا ہو گیا۔ یہی کرنا تھا۔ یعنی احسان فی ذلتہ احسان ہے۔

ہر انسان کا ہر عمل بذات خود اسکی جزا ہوتی ہے

ہم قرآن کے ان الفاظ پر غور نہیں کرتے۔ اس نے یہ کہا ہوا ہے جسے آپ جزا کہتے ہیں وہ جزآء بما کانو ایعلمون (32:17) جو تم عمل کرتے ہو وہ خود اس عمل کی جزا ہوتا ہے' اس کے اندر اس کی جزا ہوتی ہے' کہیں باہر سے کوئی چیز نہیں آتی۔ ایک چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ہم نے مزدور لگایا' اس نے ہمارا کوئی کام کیا' شام کو ہم نے اس کو تین روپے دیئے۔ یہ جو اس نے کام کیا ہے' اس کام میں اس کا کوئی INTEREST (دل چسپی) نہیں نہ اسے یہ پتہ ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں؟ کیوں یہاں سے یہ کھدا رہے ہیں؟ کیوں یہ یہاں لگوا رہے ہیں؟ اسے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کی ریٹرن تو ہمیں ملنی ہے' مکان ہمارا بن رہا ہے' اس نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ اس کو جس چیز میں دیا جا رہا ہے' وہ اس کام میں نہیں ہے جو ہم نے مقرر کیا تھا وہ ہم دیتے ہیں۔ جزآء بما کانوا یعملون (32:17) اس کا بدلہ جو تم کرتے ہو وہی اس کا بدلہ ہوتا ہے۔ صبح کے وقت تم سیر کر کے آتے ہو' سیر کر کے آنے کے بعد کیا آپ گھر میں اپنے والد سے یا بیوی سے یا کسی سے یہ کہتے ہیں کہ ''سٹو اٹھیانی' او کا ہدی اٹھیانی؟ او تین میل تر کے آیا ہیگا؟[1]''۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ ہے بدلہ اس کا؟ اس کا بدلہ تو اس کے اندر تھا: آپ نے سیر کی' آپ کی صحت ٹھیک ہوئی۔ جزآء بما کانوا یعلمون (32:17) کرتے ہو وہ خود اس کا بدلہ بنتا چلا جاتا ہے۔ عزیزان من! وہ یہ چیز پیدا کرتا ہے۔

---

1. ایک اٹھنی ادا کرو۔ وہ کاہے کی؟ جی تین میل چل کر آیا ہوں۔

ایمان کا کوئی بدلہ یا اسکی کوئی ریٹرن باہر سے وصول نہیں کی جاتی

پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب! ایمان کی ضرورت کیا ہے؟ ایمان کی یہ ضرورت ہے کہ اس کی ریٹرن کہیں باہر سے نہ طلب کرو۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ لا نرید منکم جزآء و لا شکوراً ان اجری الا علی اللہ (10:72) بے اجر تو کوئی کام دنیا میں نہ رہتا ہے نہ کوئی کر ہی سکتا ہے اس کا سوال ہی نہیں ہے' یہ ناممکن ہے۔ اجر و راجر میں فرق ہوتا ہے۔ قلی کو آپ تین میل کے فاصلے کے اوپر بھیجتے ہیں اس کا اجر آٹھ آنے ایک روپیہ ہے' آپ سیر کے لیے تین میل جاتے ہیں آپ کا اجر اس سیر کے اندر ہے۔ اجر دونوں کو ملا ہے۔ اجر اور اجر میں فرق ہے۔ اس نے یہ کہا تھا لا نرید منکم جزآء و لا شکوراً (76:19) تم سے نہیں بدلہ مانگتے' وہ تو ہر رسول آ کر پہلے کہتا تھا کہ لا اسئلکم علیہ من اجر (6:91) میں تم سے کوئی بھی بدلہ نہیں مانگتا ان اجری الا علی اللہ (10:72) یہ بھی نہیں ہے کہ بے اجر کر رہا ہوں' کام تو بے اجر رہ ہی نہیں سکتا' اسے تو باطل کہتے ہیں کہا کہ اولئک حبطت اعمالھم (2:217) کہتے ہیں اگر کام بے اجر رہ جائے تو' اجر اس کا ہوتا ہے اجر کہیں اور سے ملتا ہے یا اس کی شکل اور ہوتی ہے۔

خدا کے ہاں سے ملنے والے اجر کی نوعیت زندگی خوف و حزن سے پاک ہو جاتی ہے

قرآن عجیب چیزیں کہہ جاتا ہے۔ یاد رکھو! اس دینے کے بعد پھر من بھر کا باٹ اس کے سر پر نہ رکھ دو کہ اسی کے بوجھ تلے دب کر مرتا چلا جائے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس کے بغیر دو اور پھر اس کے بعد تم دیکھو کہ اس کا بدلہ کیا ملتا ہے؟ یہ کہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون (2:62) علیھم کے معنی یہی نہیں کہ دینے والوں کے اوپر کوئی خوف نہیں رہے گا' یہ تو سب ہیں جو اس وقت صاحب احتیاج ہیں' جو اس وقت احتیاج دوسروں کی پورا کر سکتے ہیں' ایسا نظام قائم ہو جائے گا کہ اس میں نہ ان کو بھوکے مرنے کا خوف و حزن ہوگا' نہ ان کو دولت کے چھن جانے کا خوف و حزن ہوگا۔

کسی عمل کا اجر حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک نفسیاتی کیفیت کی نشاندہی EGO کی SATISFACTION کی شکل میں

اگلی چیز ایک اور کہی' اس سے بھی اہم۔ اس سے بدلہ نہیں مانگ رہا۔ اپیل ہو رہی ہے حاکم کی طرف سے کہ یہاں HOSPITAL بنے گا' اس کے لیے چندہ دینے کی بات ہوگئی۔ دیتے ہیں' ہسپتال بھی بن جاتا ہے' دینے والوں کا جذبہ آپ نے دیکھا کہ کیا ہوتا ہے؟ یہ قرآن کی ایک اور چیز آئی۔ آپ دیکھیے قرآن بھیجنے والے کی نگاہ کس طرح انسانی نفسیات کے اوپر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یایھا الذین امنو الاتبطلو اصدقتکم بالمن و الاذی (2:263) یہ تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ کالذی اس شخص کی طرح یعنی اپنا یہ جو دیا ہوا

ہے تمہارا۔ صدق کے معنی ہیں کسی چیز کو سچ کر دکھانا۔ قرآن کے الفاظ بڑے معجز نما ہیں۔ یوں ہوتی ہے ایمان کی تصدیق۔ کہا ہے کہ اس کو باطل نہ کر دو یوں احسان دھر کے' یوں اذیت پہنچا کے۔ کالذی ینفق ماله رئآء الناس (2:263) گویا اس کی طرح جو محض دوسروں کو دکھانے کی خاطر یہ کرتا ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد کہ اپنے عمل کو باطل نہ ہونے دو

یہ اور چیز آ گئی۔ یہ اس ایک فرد سے معاوضہ نہیں مانگ رہا' لوگوں کو دکھانے کے لیے یہ کچھ کر رہا ہے۔ عزیزان من! قرآن کریم نے اسے بدترین جرم قرار دیا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ کیوں ایسا قرار دیا گیا ہے؟ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ جو فنڈز کی اپیل ہو رہی تھی' اس کے لیے سب نے بڑھ چڑھ کے دیا' روز ہم دیکھتے ہیں اس قسم کے جو چندے ہوتے ہیں' اس کے بعد مثلاً ہسپتال بننا ہے تو وہ بن گیا ایک مقصد پورا ہو رہا ہے۔ وہ ان کو کہتا ہے کہ تم نے اپنا دینا جو ہے باطل کر دیا۔ تو یہ ایک چیز جو طبعی طور پر تھی وہ تو سامنے کھڑی ہو گئی۔ یہ باطل کیا ہوا ہے؟ اس نے ان سے تو اجر مانگا نہیں ہے لیکن' اب گیا قرآن گہرائیوں میں' اس سے اس کے اپنے EGO کی SATISFACTION (تسکین) ہو رہی ہے پندار نفس کی تسکین ہو رہی ہے۔ دے اس کے لیے رہا ہے' یہ اجر مانگ رہا ہے۔ اگر اس چندے کا کہیں اعلان نہ ہو' اس کے لیے کہیں TABLETS نہ لگی ہوئی ہوں' ڈپٹی کمشنر صاحب PRESIDE نہ کر رہے ہوں' دوسر لوگ جو ہیں اسی برادری کے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ رہے ہو' یوں شہرت نہ ہو رہی ہو' یہ کچھ نہ ہو رہا ہو' یہ کسی کو ایک پائی نہیں دے گا۔ صبح سے پتہ نہیں کتنے صاحب احتیاج اس کے دروازے سے محروم واپس چلے گئے' ایک پیسہ نہیں اس نے دیا کیونکہ کمرے کے اندر وہ مانگ رہے تھے۔ شام کو باہر اس جلسے میں گئے ہیں' صاحب اتنا بڑا اپر تپاک RECEPTION (استقبال) ہوا ہے بہت بڑا ہار بھی گلے میں ڈالا گیا ہے' یہ سارا ہجوم بھی ہے' بڑھ چڑھ کر وہاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں' پانچ ہزار دس ہزار' کہتے ہیں' جی دیکھیے! پانچ کا دس انہوں نے کر دیا' اچھا جی میرے بیس ہزار۔ روپیہ بھی مل رہا ہے HOSPITAL بھی کھڑا ہو رہا ہے' قرآن کہتا ہے کہ تم نے اپنا عمل باطل کر دیا۔

انسانی اعمال کو باطل ہونے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے

باطل کر دیا کے کیا معنی ہیں؟ ذرا سی مشکل بات ہے کوشش کروں گا عام الفاظ میں واضح کرنے کی۔ یہ جو عام نظریہ حایت ہے کہ انسانی زندگی یہی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) مادی زندگی ہے' اس میں ساری چیزیں اسی MATERIAL MEASURE سے مانی جاتی ہیں۔ مادی طور پر روپیہ روپیہ ہے' HOSPITAL کا کمرہ ہے' دونوں مادی

چیزیں ہیں۔ٹھیک ہے اس میں نمود ہے' شہرت ہے' نام ہے' افسروں کی نگاہوں کے اندر بڑا بننا ہے' اپنی برادری میں معزز ہونا ہے' ساری چیزیں آپ دیکھ رہے ہیں اس مادی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا تعلق جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے EGO کی SATISFACTION (تسکین) سے ہوا' خالص EMOTIONAL (جذباتی) ہوا' بالکل جذباتی ہوا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوں تو پھر یہ ایک پیسہ بھی نہیں دے گا۔اس کے محرکات یہ ہیں' ان کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے۔ یہ اس قسم کی چیز کسی محکم نظام کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ایک حاکم کو تبدیل ہونے دیجیے' پھر اس کے بعد دیکھیے جہاں تک وہ پارک بنا ہوا ہوتا ہے وہیں تک کھڑا ہوتا ہے۔وہ رو رہا ہوتا ہے اس جانے والے کی جان کو' اس دینے والے کی جان کو۔ کتنے سہروں میں جا کر آپ دیکھیں گے کہ بہت بڑی TABLET (تختی) بھی لگی ہوئی ہے کہ فلاں کمسنر صاحب کے ہاتھ سے یہ تعمیر کا پتھر رکھا ہوا' آپ دیکھتے ہیں کہ باغ کے دروازے میں ایک کواڑ لگا ہے تو دوسرا نہیں لگ سکا۔کیا ہوا تھا؟''کہ جی او بدل گئے سن فیراؤ'۔ دیکھتے ہیں آپ۔ان محرکات کی بنا پر محکم نظام نہیں بن سکتا۔

ظاہریت سے بچنے کیلئے قران حکیم کی راہنمائی انسانی ذات پر ایمان لانے میں ہے

قرآن کیا کہتا ہے اس کے مقابلے میں؟ وہ کہتا یہ ہے کہ زندگی یہی مادی زندگی نہیں ہے۔عزیزان من! یہ ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہے جو مادی نہیں' جو طبعی نہیں' جو فزیکل نہیں' یہ وہی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں' اس کی PERSONALITY کہتے ہیں۔مقصود حیات یہ ہے کہ اس انسانی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ بنیادی اصول قران نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! تمہارے مادی جسم کی' طبعی جسم کی' پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں تم خود کھاتے ہو' لیتے ہو' اپنے لیے استعمال میں لاتے ہو اور تمہاری ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جو تم دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتے ہو۔ اجر اور بدلہ تمہیں ملتا ہے۔وہ کس شکل میں ملتا ہے؟ کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ نشوونما یافہ ذات ہے جو یہاں کی زندگی میں' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو جماعت بنتی ہے' اس قسم کے لوگوں کی' ان کی یہ زندگی بھی بڑی شوکت اور حشمت کی اور حسن اور خوبصورتی کی زندگی ہوتی ہے لیکن اصل چیز وہ یہ کہتا ہے کہ اس طرح سے تربیت یافتہ ذات مرنے کے بعد کی زندگی میں' اگلی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔عزیزان من! یہ ہے ایمان۔ یہ ایمان باللہ کہ خدا نے اس قسم کی اقدار دی ہیں کہ جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے' ایمان بالآخرت کہ نشوونما یافتہ ذات زندگی کے اگلے ارتقاوی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ایمان' اللہ اور آخرت پر۔غور کیجیے قران کیا کہتا ہے کہ وہ لوگ جو لوگوں کو دکھانے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں' لا یومن باللہ والیوم الآخر (2:264) ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔آپ دیکھ رہے ہیں کس طرح سے اس نے ان کو اس صف سے ہی نکال دیا۔مسلمانوں کی صف میں ہیں' مردم شماری کے رجسٹر میں نام ہے' نمازیں بھی

پڑھتا ہے' روزے بھی رکھتا ہے' نیکی کے کام بھی کر رہا ہے' جذبہ آ گیا اندر رئـآء الناس کا۔ قرآن نے بیک جنبش قلم اس شخص کو نکال کر رکھ دیا کہ لا یـومـن بـاللـه و الیوم الاٰخر (2:264) یہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اللہ اور آخرت پر ایمان تو دل کے اس جذبے کا نام تھا۔

قرآنی تعلیم کو پیش کرتے وقت اس میں اپنے خیالات کی ملاوٹ شرک عظیم ہے

عزیزانِ من! یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا اور میں عرض کر دوں کہ کبھی بھی قرآن کے متعلق کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہوں گا' یہ تو بہت بڑا شرک ہوتا ہے۔ دور بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے' یہ اگلی ہی آیت کے اندر ہے۔ کہ و مثـل الـذین ینفقون اموالھم ابتـغآء مرضات الله (2:265) دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ کاہے کے لیے خرچ کرتے ہیں؟ تشبیتاً من انفسھم (2:265) اپنی ذات کے اثبات کے لیے جو خرچ کرتا ہے۔ رئـآء الـنـاس کے مقابلے میں قرآن نے خود بات بتا دی۔ اپنی ذات کی DEVELOPMENT (نشوونما) کے لیے' اس کی INTEGRATION کے لیے۔ یہ لفظ اس کے لیے زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن نے دوسری جگہ جو ذات کے خلاف کہا ہے۔ وہ ہے۔ فجورھا (91:8) کہا ہے کہ اس کا DISINTIGRATE (منتشر) ہو جانا۔ یہاں اس کے لیے تثبیت کہا ہے' INTEGRATION یہ صحیح ترجمہ ہے اس کا انگریزی زبان کے اندر۔ جو DEVLOPED PERSONALITY ہے وہ INTEGRATED ہوتی ہے' اسی کو انسان کی ایسی سیرت کہتے ہیں جس میں یہ نہیں ہوتا کہ کبھی یہ ہے اور کبھی وہ ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ یہیں کہا ہے کہ تشبیتاً من انفسھم (2:265) یہ ہے تمہارا مقصد' یہ ہونا چاہیے۔

انسان کے اپنے پندارِ سرکشی کو ہی قرآن نے شیطان کے الفاظ سے تابیر کیا ہے

عزیزانِ من! اب اس میں آپ دیکھ لیجئے کہ کسی دوسرے سے بدلہ مانگنا تو ایک طرف رہا' یہ رئـآء الـناس (2:263) والی بات بھی اس کے اندر نہیں ہوگی' وہ تو دوسروں کو دکھانے کے لیے یہ کر ہی نہیں رہا' وہ تو خود اپنی ذات کی تشبیـت (2:265) کے لیے یہ کچھ کر رہا ہے۔ اور یہی چیز ہے قرآن کریم نے رئـآء الـنسا (2:263) کے لیے جو لوگ یہ کرتے ہیں' سنیے! اس کے لیے لفظ کیا استعمال کیا ہے؟ یاد رکھیے! آپ کو معلوم ہے قرآن کریم کی رو سے شیطان' انسان کے FALSE EGO کے' پندار نفس کے وہ جذبات ہیں' جو اس کو سرکشی کے اوپر ابھارتے ہیں' اسے قرآن نے شیطان کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ و الـذیـن ینفقون اموالھم رئآء الناس (4:38) وہ لوگ جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی خاطر صرف کرتے ہیں و لا یـومنون بالله و لا بالیوم الاٰخر (4:38) اور وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ وہی الفاظ ہیں جن کو پھر یہاں دہرا دیا گیا ہے۔ ان کے لیے کہا کہ و مـن یـکـن الشیطن له قریناً فسآء

قریناً (4:38) ان کا قرین ان کے ساتھ بیٹھا ہوا در اصل شیطان ہوتا ہے۔ کتنا برا ہے یہ قرین! محرک کیا ہوتا ہے اس قسم کے خرچ کرنے کا؟ اپنی EGO کی SATISFACTION (تسکین) پندارِ نفس کی تسکین' بس یہ ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں۔ نہ خدا پر ایمان ہے نہ آخرت پر ایمان ہے۔

ذات انسانی کی ماہیت اور اس کی نشو ونما کے بنیادی اصولوں کی وضاحت اور صلوۃ کی اہمیت کے خدوخال

عزیزانِ من! خدا اور آخرت پر ایمان' اپنی ذات پر ایمان کے معنی ہوتے ہیں۔ مادے کی پیدا کردہ نہیں' طبعی قوانین کے تابع نہیں خدا کی توانائیوں میں سے بخشی ہوئی ایک توانائی جو اس کی عطا کردہ اقدار کے تابع نشو ونما پاتی ہے' موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا' اس سے آگے چلتی ہے یہ ایمان بالآخرت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو دوسری چیز پھر وہ شیطان ہے' اپنے EGO کے سرکش جذبات ہیں' ان کی تسکین کے لیے یہ کچھ یہ کرتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی صف میں نام ہے' مردم شماری کے رجسٹر میں نام ہے' اتنا ہی نہیں ہے' نمازیں پڑھتا ہے' آپ کو پتہ ہے ان نمازیوں کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے؟ کہا کہ فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون (107:4-5) تباہی ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز' سلوۃ کے مقصد سے غافل ہیں' نگاہ مقصد پر ہے ہی نہیں۔ کون ہیں یہ؟ الذین ھم یرآئون (107:6) صلوۃ کو وہ سمجھے ہیں جو لوگ دیکھتے ہیں جس کو اس کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں۔ بھئی! یہ کچھ جو کرتے ہیں کہ لوگ دیکھیں' نمازی کہیں' پھر اس کے لیے تو جس وقت وہ نماز پڑھتے ہیں وہ تو تھوڑا سا وقت ہوتا ہے' اتنے میں کسی نے دیکھا نہیں' مسجد کی چار دیواری کے اندر ہوتا ہے' پھر ایک بہت بڑا سائن بورڈ لٹکا ہوا ہوتا ہے ''محراب پے گیا متھے تے[1]''۔ مقصد ہر وقت یہ ہے۔ بہت اچھا! نماز ضائع ہوئی' کہتا ہے کہ نماز ضائع نہیں ہوئی' یہ نمازی تباہ ہوگئے۔ کیا ہوا اس سے؟ کہتا ہے کہ اس سے ہوا یہ ویمنعون الماعون (107:7) رزق کے ان چشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا' بند لگا کر اپنی ذات کے لیے روک لیتا ہے۔

---

1 پیشانی پر محراب (نشان) بن گیا۔

قران حکیم تو انسانی اعمال کی غرض وغایت کو متعین کر دیتا ہے

دیکھتے ہیں یہ رئآء الناس (4:38) کیا چیز ہوگئی پھر؟ صلوۃ تو ایک اس چیز کے مشق کے لیے تھی کہ ان صلوتی و نسکی و محییا و مماتی للہ رب العلمین (6:162) میری صلوۃ' میرے فرائض زندگی' میری زندگی' میری موت' ساری کی ساری تیری ربوبیت عامہ کے لیے وقف ہے۔ اور اگر سلوۃ کے بعد ہوا یہ ہے کہ تیری ربوبیت عامہ کے راستے کے اندر بند لگانے شروع کر دیئے ہیں'

وہ کہتا ہے کہ ویل للمصلین الذین (107:4) اور تباہ ہی ہو گیا یہ جو نمازی کم بخت ہے۔ نماز پڑھ کر معاشرے کے اندر اعتماد جما تا ہے' رزق کے سرچشموں کے آگے بند لگا تا ہے' اور یہ تباہ ہو گیا۔ یہ رئآء الناس (4:38) عزیزان من! آپ نے دیکھا ان لوگوں کے متعلق کیا کہا ہے؟ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ بڑی گہرائی سے قرآن سمجھنے کی چیز ہے۔ رئآء الناس (4:38) کے لیے چندہ دیا ہے ٹھیک ہے HOSPITAL کا کمرہ بنانا تھا' بن گیا' یہ ساری چیزیں طبعی فائدہ کے لیے ہیں' یہ کچھ ہو گیا۔ قرآن اسے دنیاوی فائدے کہتا ہے' پیش پا افتادہ مفاد کہتا ہے۔ دیکھیے! وہ یہ نہیں کہتا کہ جو ایسا کرنے والے ہیں' ان کی یہ چیزیں بھی نہیں ہوتیں' وہ تو روز ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' یہ سب کچھ ملتا ہے' یہ ہو جاتا ہے' ہوتا۔ کیا نہیں ہے؟ وہ جس سے اس کی زندگی کی اگلی منزلوں کو سنورنا تھا' وہ نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم شعبہ بازی پر مبنی اعمال کو اخروی زندگی کے ترازو میں تو تا ہی نہیں

عزیزان من! یہ مقام ہے جہاں انسان وجد میں آ جاتا ہے کہ یہ واقعی خدا کا کلام ہے۔ مذہبی دنیا میں کسی انسان یہاں تک نگاہ نہیں جا سکتی۔ کس قدر CLEARLY یہ چیز ہے کہ یہ سارا کچھ ہوتا ہے من کان یرید الحیوۃ الدنیا و زینتھا نوت الیھم اعمالھم وھم فیھا لایبخسون (11:15) مقاصد یہ ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! ایک ہسپتال بن جائے' کمرہ بن جائے' یہ مجھے مل جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں طبعی قانون کے مطابق ہوتی ہیں' طبعی قانون کے مطابق ملتی ہیں' ہم اس کو دیتے ہیں: دنیا' اس کی زینت کی چیزیں' آسائشیں آرائشیں یہ ساری چیزیں ملتی ہیں۔ وھم فیھا لایبخسون (11:15) ذرا سی بھی اس میں کمی نہیں ہوتی۔ بالکل ٹھیک ہے کہ سو روپیہ دیا ہے' سو روپے کی جتنی اینٹیں آتی ہیں' پوری اس میں آ جاتی ہیں رئآء الناس (4:38) کے لیے ہو' کچھ بھی ہو' اس میں اتنا آ جاتا ہے' وہ کہتا ہے بالکل نہیں' اس میں کمی ہوتی لیکن اولئک الذین لیس لھم فی الاٰخرۃ الاالنار (11:16) مستقبل کی زندگی میں ان کے لیے سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہے۔ وحبط ماصنعو افیھا و بطل ما کانوا یعملون (11:16) یہاں پہنچنے کے بعد' اس درجے میں جانے کے بعد' یہاں ان کے اعمال غارت گئے' یہاں باطل ہوئے' وہاں یہ اعمال نہیں ہیں۔

انسانی اعمال کا اجر تو ہر دو دنیاؤں میں ملتا ہے لیکن ایک بہت بڑے فرق کے ساتھ

ان معاملوں میں بہت سی آیات ہیں قرآن کریم کی۔ کیا عجیب چیز ہے کتنا RATIONAL جاتا ہے! کہا ہے۔ من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزد لہ فی حرثہ (42:20) جو مستقبل کی کھیتی چاہتا ہے' وہ ہم اسے دیتے ہیں' بڑھا کر دیتے ہیں' ایک دانے

کے دس دس دیتے ہیں۔و من کان یرید حرث الدنیا نئوته منها (42:20)اور جو یہیں ان سے کچھ خرید لینا چاہتا ہے' ٹھیک ہے' اسے ہم دے دیتے ہیں' مل جاتا ہے لیکن و ماله فی الاٰخرة من نصیب (42:20) مستقبل کی زندگی میں پھر اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔تم لینا ہی یہ چاہتے تھے' تمہیں یہ مل گیا' وہ جو تم لینا ہی نہیں چاہتے تھے اس میں کیسا حصہ تمہیں ملے گا۔آپ دیکھتے ہیں کس طرح سے قرآن دونوں دنیائیں الگ کر کے رکھ دیتا ہے۔دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ کل نمدھو لآئو ھو لآء (17:20) یہ جو دونوں جماعتیں ہیں دونوں کو ہمارا قانون طبعی مدد دیتا چلا جاتا ہے۔کیا چیز ہے صاحب! جو بھی اپنی کھیتی میں قاعدے کے مطابق محنت کرتا ہے' وہ ہر چرن سنگھ ہو یا عبداللہ ہو' کہتا ہے ہمارا طبعی قانون دونوں کو مدد دیتا چلا جاتا ہے' یہ کچھ مل جاتا ہے۔بس فرق آگے جا کر پڑتا ہے کہ اس کی نگاہ یہیں تک تھی' یہی کچھ ملا' وہ تشبیتاً من انفسھم (2:265) کرتا تھا یہ کچھ بھی ملا' اتنے روپوں کی اتنی اینٹیں تو اس کی بھی آ گئیں لیکن یہ جو اس کا مقصد اور اس کا جذبہ تھا' وہ دوسرا تھا' وہ دوسرا تھا اس کا جو اجر ہے جسے آپ کہتے ہیں ذات کی نشوونما سے آگے چلنا۔

دنیا اور آخرت میں ہر دو آجروں کی کیفیات میں فرق کی بنیادی وجہ

ایک بڑی اہم آیت ہے۔کونسی آیت اہم نہیں ہے؟ یعنی میرے ریفرنس کے اعتبار سے۔یہ لوگ جنہوں نے یہ سارا کچھ دیا' ان میں وہ بھی شامل تھے کہ جنہوں نے محض اس مقصد کے لیے دیا جسے قرآن لمرضات اللہ (2:265) کہتا ہے۔یہ بھی تھے جنہوں نے رئآء الناس (4:38) کے لیے دیا' چندے کی فہرست میں دونوں کا نام یکساں لکھا ہوا ہوتا ہے' چیزیں بھی ان کے روپے کی اتنی اتنی آ گئی ہوئی ہیں۔یہ دونوں چلے گئے' آگے اب وہاں جانے کے بعد ان میں سے یہ جو ایک ہے اسے قرآن کے الفاظ میں سمجھانے کے لیے جہنم کی طرف لے گئے' یہ جو ہے اسے جنت کی طرف لے گئے۔اب وہ کہہ رہا ہے کہ اللہ میاں! ہم دونوں اسی ایک ہی جلسے میں تھے تو ایک ہی طرح کی اپیل ہوئی تھی اور ہم نے ایک ہی جیسے وہاں پیسے دیئے تھے اب یہ کیا ہو رہا ہے؟یوم معرض الذین کفرو اعلی النار (46:20) جہنم کے کنارے پر لے گئے تو اس نے یہ کہا کہ صاحب! ہمیں یہ کیا بات ہے یہ فرق کیوں؟ سنیے جواب! ازھبتم طیبتکم فی حیاتکم الدنیا و استمعتم بھا (46:20) تم وہیں اس کا بدلہ لینا چاہتے تھے' وہیں دے دیا تھا تمہیں' مل گیا تھا؟ ذرا کمی نہیں کرتے ہم تو۔تم نے وہیں مانگا تھا وہاں دے دیا۔فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تتکبرون فی الارض بغیر الحق (46:20)۔کیا بات کہہ گیا ہے؟ کہتا ہے کہ وہاں یہی بڑا بننا چاہتے تھے بڑا بننا چاہتے تھے حق کے بغیر۔

قرآن حکیم خوف و حزن سے پاک استکبار بالحق کی کبریائی اور غیر حق کی کبریائی کی وضاحت پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن نے بڑے بننے کو مطعون قرار نہیں دیا' کبریائی تو خدا کی شان ہے' انسان کے اندر بھی ہونی چاہیے۔ فرق یہی ہے وہ بالحق ہوتی ہے' یہ بغیر حق ہوتی ہے۔ دیکھیے! بغیر حق قرآن کیسے عجیب چیز کہہ گیا ہے؟ EGO اور PERSONALITY میں فرق کیا ہے؟ ہمارے ہاں سائیکولوجی کے سٹوڈنٹ تو دونوں میں فرق جانتے نہیں ہیں' یہ تو WEST (مغرب) کی سائیکولوجی ہے وہ تو ایک ہی چیز ہے۔ یہ تو فرق قرآن کرتا ہے کہ ایک کا جو استکبار ہے بغیر حق ہوتا ہے' یہ جو روز استکبار میں بڑے بڑے پھنے خاں نظر آتے ہیں تو آپ دیکھیے کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے اندر وہ توانائی پیدا کرنا چاہتا ہے' جو حسن سیرت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے' یہ استکبار بالحق ہے۔ عزت' کبریائی اسے بھی حاصل ہے۔ دونوں میں فرق ہے' یہ بالحق ہوتا ہے' وہ بغیر حق کہتا ہے۔ کہتا ہے کنتم تستکبرون (46:20) دیکھیے! قرآن کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کسی چیز کو چاہ کر' مانگ کر لینا۔ تم دیتے وقت چاہتے یہ تھے کہ بڑائی مل جائے' بغیر حق چاہتے تھے' ٹھیک ہے وہ تمہیں وہیں مل گئی تھی۔ اس نے اس بڑائی کی تمنا نہیں کی تھی' بڑائی اسے بھی ملی ہے' اس کی ذات میں نشو ونما ہوا تھا۔ تمہارے بورڈ کے سامنے خان بہادر لکھا گیا' تمہیں بھی بدلہ ملا ہے' اس کو بھی مل رہا ہے۔ اس کا استکبار بالحق تھا' تمہارا جو تھا بغیر حق تھا۔ اس لیے وہی جواذھبتم طیبٰتکم فی حیوٰتکم الدنیا واستنتمتعتم بھا (46:20) تم لینا ہی وہاں چاہتے تھے تو ہم نے ظلم نہیں کیا' جو تم نے دہائی دیدی کہ یا اللہ! دونوں کا تو عمل ایک جیسا تھا ہمیں محروم کیے جا رہا ہے' اس کو دیئے جا رہے ہو؟ کہا یہ بات نہیں تھی' تم نے جتنی قیمت اس کی مانگی تھی' ہم نے تو پوری پوری قیمت دیدی تھی' ہم کسی سے بے انصافی نہیں کرتے۔ کہو یہی مانگا تھا تم نے؟ پھر کہوں کہ مل گیا تھا؟ ٹھیک ہے تمہارا حساب بے باک ہوُا' اب کیا مانگتے ہو؟ یہ وہ تھا قرض اللہ قرضاً حسنہ (2:245) اس نے ہمیں قرض دیا تھا۔ اب مانگ رہا ہے اس لیے اسے اب ہم دے رہے ہیں۔ کالذی ینفق مالہ رئآء الناس ولا یئومن باللہ والیوم الاٰخر (2:264)۔

جماعت موفین کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ وہ جماعت تیار کرتا ہے۔ آپ سوچ لیجیے کہ اس قسم کی جماعت جب تیار ہو جائے' اس کے ہاتھوں سے جو نظام استوار ہوگا' دنیا کے اندر اس کے نتائج کیا ہونگے۔ جو اپنے لیے یہاں کسی سے بدلہ مانگتا ہی نہیں ہے تشبیتاً من انفسھم۔ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فتر کہ صلداً (2:264) کیا مثال ہے؟ ایک تو کھیتی وہ ہے کہ زمین میں ہل جوتا' کتنی کتنی گہری زمین کھودی' پھر اس میں دانہ ڈالا۔ ایک یہ ہے پتھر کی سل کے اوپر کسی طرح ذرا ذرا سی مٹی جم گئی' اس میں ایک دانہ ڈال دیا' وہ کہتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ بظاہر وہ زمین نظر آتی ہے' اس زمین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہی بارش جس نے اس زمین سے اتنی بڑی کھیتی

اگائی تھی، وہ بارش زور سے آتی ہے تو یہ ساری مٹی بہا کر لے جاتی ہے، چٹان کی چٹان باقی رہ جاتی ہے۔ اس دن تو یہ دونوں ہی زمینیں نظر آتی تھیں۔ قرآن کریم نے زمین اور زمین میں فرق بتایا۔ کہا کہ لا یقدرون علی شیء مما کسبوا (2:264) محنت بھی اس نے کی تھی، ٹھیک ہے کچھ حاصل نہ ہوا، اس کے بعد کہا کہ واللہ لا یھدی القوم الکفرین (2:264) جو اس طرح سے کفر کرتا ہے، اس کو بھلا کامیابی کے راستے کی طرف راہنمائی کیسے مل سکتی ہے؟ زمین ہی یہ بنائی تھی، چٹان کی چٹان ذرا ذرا سی پر مٹی پڑی ہوئی تھی بارش کا ایک تیز چھینٹا آیا اور اسے بہا کر لے گیا۔ و مثل الذین ینفقون اموالھم ابتغآء مرضات اللہ و تثبیتاً من انفسھم (2:265) اور اس کے مقابلے میں دوسرے لوگ جو مستقل اقدار خداوندی سے ہم آہنگی کی خاطر، اپنی ذات کی نشوونما کی خاطر، یہ کچھ کرتے ہیں ان کی مثال یہ ہے کہ بربوۃ اصابھا وابل فاتت اکلھا ضعفین (2:265) زمین ہے وہ بھی نشیب کی نہیں ہے زیادہ بارش بھی ہو تو ڈبو نہ دے، یہ بھی بڑی خوبی ہوتی ہے، زمین ذرا اونچی جو ہوتی ہے۔ زمین اونچی بھی ہو اچھی زمین ہو، زور کا بارش پڑے، وہ کہتا ہے کہ دوگنی فصل دیدیتی ہے۔ وہی بارش جو اس پر پڑی، وہ ساری بہا کر لے گوی۔ وہی بارش اس پر پڑی اس میں دوگنی کھیتی ہوئی۔ دیکھا اسباب ایک ہی قسم کے ملتے ہیں، دونوں کے نتائج مختلف ہو جاتے ہیں۔ فان لم یصبھا وابل فطل (2:265) زور کی بارش نہ بھی ہو، اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ یونہی اگر ذرا سا بھی چھینٹا اس میں پڑ جائے، پھر بھی کھیتی نکل آئے گی۔ یعنی اسباب کی نسبتاً کمی بھی رہ جائے پھر بھی نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔

غیر متبدل اصولوں کی پیروی پر غیر متزلزل باعمل ایمان کا نتیجہ، جنگ ستمبر 1965 کی زندہ مثال اور پھر ہماری احسان فراموشی کی ایک جھلک

وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ تم میں سے اگر دس ہو گے تو سو کے اوپر بھاری ہو جاؤ گے۔ وہ اسباب کی جو کمی ہے وہ یہ جو ایمان یا جو نظریہ زندگی ہے جو اس کی زیادتی ہے، وہ اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ مشن کے ساتھ، اپنے مقصد کے ساتھ، والہانہ عشق اور وابستگی ہے اس کے لیے جان دینے کی تڑپ جو دل کے اندر ہے، اسباب کی تعداد کی کمی اس کو یہ جذبہ پورا کر دیتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ باقی چیزیں تو ہم صرف فطری طور پر ہی سمجھتے رہے، مثال دینی پڑتی تھی کوئی چودہ سو سال پیشتر کی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے لیے ہمیں دور نہیں جانا پڑا، ستمبر 1965ء نے ہمیں اپنی آنکھوں سے دکھا دیا۔ مقصد کا والہانہ عشق، سامان اور تعداد کی کمی کو کس طرح سے پورا کر دیا کرتا ہے۔ کس وقت بات یاد آ گئی ہے! یہ بڑی زود فراموش قوم ہے۔ ہمیں پہلے گلہ تھا کہ اس نے قائداعظمؒ (محمد علی جناحؒ) جیسے محسن کو بھلایا۔ وہ بات تو پھر بھی شاید معاف ہو جانے کے قابل ہو گی، اس قوم نے ستمبر 1965ء کو بھلانا شروع کر دیا ہے۔ معاف رکھیے گا، چھوٹا منہ بڑی بات، فطرت ان کے اس جرم کو

کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اس قوم کی زندگی کا راز اس میں تھا' فطرت کچھ ان کے ساتھ خاص طور پر مہربان واقع ہوئی ہے۔ اگر میں کہیں تحریک پاکستان کے اندر جاؤں اور آپ کو وہ تاریخ بتاؤں' اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ میں ایک ایک سانس اس کے اندر تھا۔ تمہیں بتاووں کہ کس کس قسم کے کچھ مواقع ایسے آئے تھے' جن کی توجیہہ بھی ہم نہیں بیان کر سکتے تھے کہ یہ کیسے یوں ہو گیا؟ عجیب چیز تھی صاحب! اتنی بڑی مملکت ایک قطرہ خوں بہائے بغیر صاحب! مل گئی۔ یہ بہت بری چیز تھی۔ بڑی قدر نا شناس قوم ہے' ہم نے اسؒ کو بھلا دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس کے بعد ان کی تقریروں پر شاید آ حری مہر لگ گئی۔ معلوم نہیں کیوں پھر ایک چیز' ایک؟ انمول چیز آ گئی' پھر 1965ء کی جنگ میں وہاں وہ جو چیز نیزوں کے اوپر بیٹھ کر کیا کرتے تھے یعنی ہماری تخریب کے لیے پورے سامان' میدان جنگ میں آ گئے' وہ ان تمام چیزوں کو لے کر' بدر کا میدان ہمارے سامنے آ گیا' پھر ایک موقع آیا۔ عزیزان من! ان مواقع کے اوپر اور نہیں یہ کم از کم ہم جو لاہور والے ہیں انہیں تو کچھ سوچنا چاہیے۔ عزیزان من! ان آنے والے درندوں کے پاؤں کی آہٹ ہمارے کانوں میں آتی تھی' بچیاں یہاں کھڑی ہوتی تھیں۔ وہاں سے' اتفاق سے' ایک عزیز تھا' جو میدان جنگ سے ٹیلی فون کر لیتا تھا' لمحہ بہ لمحہ اس کے ٹیلی فون پر کان ہوتے تھے' وہ کہتا یہ تھا کہ یہ جو ہم نے حصار کھینچا ہے' اگر اس میں کہیں ایک جگہ بھی دراڑ پڑ گئی یا شگاف آ گیا' تو پورا سیلاب لاہور کو بہا کر لے جائے گا۔ ہم سوچتے تھے کہ ان بچیوں کے متعلق کیا کریں؟ بھاگنے کا راستہ نہیں تھا' ہوتا بھی تو جی نہیں چاہتا تھا۔ سوائے اس چیز کے کہ پہلے ان کو ختم کیں اور پھر خود ختم ہو جائیں' کوئی تیسرا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

عزیزان من! اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کی ان خدمات کو تو یہ قوم یاد رکھتی مگر افسوس صد بار افسوس یہ کہ اس کے بعد کس طرح سے یہ قوم انہیں بھولی ہے! پھر اس قسم کی دھاندلیوں میں' پھر اسی قسم کی ناانصافیوں میں' پھر اسی قسم کی قانون شکنیوں کے اندر یہ قوم بہہ گوی ہے۔ عزیزان من! کہیں اگر وہ کسی وقت کسی قسم کی قانون شکنی کر بیٹھتے' اگر وہ کہیں مال غنیمت کا جذبہ ان کے اندر آ جاتا اور اس کے اوپر آگے بڑھ کر وہ نقشہ ہو جاتا جو قاحد کے میدان میں پیدا ہوا تھا' سوچو کہ ہم کہاں ہوتے' یہ بچیاں کہاں ہوتیں۔ آیئے یہ قوم اور کچھ نہیں تو اپنی غیرت کو ہی آواز دے' انہیں نہ بھلا' ان کا خون آج بھی ہم سے بلند آواز سے اپنی قیمت مانگ رہا ہے۔ وہ تھے کہ جن پر ایک چھینٹا پانی کا پڑا لہلہاتی کھیتیاں اگ پڑیں۔ یہ چیز جو قرآن کہتا ہے کہ اسباب کی کمی بھی ہو تو یہ جو ایمان کی زیادتی ہوتی ہے' یہ بھرپور نتائج پیدا کرتی ہے۔ واللہ بما تعملون بصیر (2:265) یہ نہ سمجھو کہ ہم کر رہے ہیں' پتہ نہیں ملے گا' نہیں ملے گا' رائیگاں ہی چلا جائے گا۔ ایک ایک کے عمل کے اوپر اس کی نگاہ ہے' دیتا ہے' جھولیاں بھر بھر کے دیتا ہے بشرطیکہ کرنے والا مرضات اللہ تثبیتاً من انفسھم (2:265) کرے۔ نہ تو من والا اذی (2:264) کے لیے کہ اس کے سر کے اوپر احسان کا بوجھ ڈالا ہوا ہے نہ رئاء الناس (2:264) کے لیے کہ نقد بہ نقد اس کی قیمت وصول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو بھلا دے اور اس مقصد کے لیے کرے یعنی مرضات اللہ

(2:265) کے لیے قانون خداوندی کے نظام سے ہم آہنگی کی خاطر' میں یہ کچھ کر رہا ہوں' نتیجہ اس کا' بدلہ اس کا مجھے ملتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو؟ قانون خداوندی کے نظام سے ہم آہنگی کی خاطر میری ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں ایک نظام کی تشکیل ہوتی ہے' انفرادی طور پر میری ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا کہ یہ ہے وہ طریق۔

خدائے کریم ورحیم کسی کے حق عمل کو نظر انداز نہیں کرتا یقیناً جذبہ صادق وسائل کی کمی کو پورا کر دیتا ہے

عزیزان من! داعی انقلاب کو یہ کہا تھا' یہ مرحلہ بڑا ہمت طلب ہے' یہ تمہاری آوازیوں کے نامانوس وحشی ان کو پرندوں کی طرح سدھاؤ ان کو سکھا مانوس کر ان کو قریب تر لا' محبت محبت محبت دیئے چلا جا' AFFECTION دیئے چلا جا۔ قریب آ گئی' جماعت بن گئی' اب جماعت کی طرف آ رہے ہیں۔ آ گئے تم! بسم اللہ! لو بھئی! کام شروع کرو۔ مما رزقنٰھم ینفقون (2:3) قرآن کے پہلے صفحہ کے اوپر لکھ کر رکھ دیا: مما رزقنٰھم (2:3) یہ بات نہیں کہ صاحب! میرے پاس روپیہ نہیں' دولت نہیں' جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے' جو کچھ تمہیں ملا ہوا ہے' اس میں سے کھلا رکھو۔ کھلا رکھنے کے لیے یاد رکھو' قریش نے بھی تو اپنا سب کچھ خرچ کر کے' ہزار کا لشکر لے کر وہ آ گئے تھے' انہوں نے بھی تو یہ کیا تھا' کیا فرق تھا ان دونوں کے اندر؟ فرق یہی تھا کہ وہاں استکبار بغیر حق تھا وہ مظلوموں کے اوپر چڑھ دوڑے تھے' یہاں حق کی خاطر کبریائی تھی' یہاں اپنی ذات کی نشوونما کے لیے تھی' یہاں اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے تھی: لرب العٰلمین (183:6) اور اسی کو اس نے عالمگیر انقلاب کہا ہے یوم یقوم الناس لرب العٰلمین (183:6) جس میں انسانیت کوئی اور مقصد رکھے بغیر صرف خدا کی عالمگیر ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی' وہ یوم الدین ہوگا۔

یوم الدین کو قائم کرنے کا سب سے بڑا ثبوت عالمگیر نظام ربوبیت کو عملاً متشکل کرنے میں ہے

عزیزان من! یہاں قران کریم نے اس جماعت کے لیے یہ چیز کہہ دی۔ اگلی آیت کے اندر بھی یہی چیز آ رہی ہے۔ بڑے ہی حسین انداز میں آ رہی ہے' اس CONTEXT (حوالے) میں آپ دیکھتے ہیں کہ کڑی سے کڑی کیسے ملتی چلی جا رہی ہے۔ اور وہاں جا کر آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ جو اپ کے ہاں آج انشورنس کی شکل ہے' قرآن چودہ سو سال پیشتر اس کے متعلق کس قسم کا ایک حسین اندازہ دے رہا تھا اور خبر دے رہا تھا۔ اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔ آج ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 265 تک پہنچ گوے۔

ستاونواں باب: **سورۃ البقرۃ** (3) (آیات 266 تا 270)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۗءُ ښ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا
كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ
بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ
وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1969ء کی 17 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 266 سے ہو رہا ہے ((2:266۔

سابقہ درس کے تسلسل کی یاددہانی

سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ پوچھا تھا کہ قوموں کو حیاتِ نو کس طریق سے ملا کرتی ہے؟ مرے ذمے جو یہ عظیم فریضہ سپرد کیا گیا ہے کہ اس قسم کی مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونکوں، اس قوم کو تازہ زندگی عطا کروں۔ یہ تو میری بات تک سننے کے لیے تیار نہیں، یہ تو مجھ سے بھاگتے ہیں، قریب نہیں آتے، **کیف تحی الموتٰی** ((2:260 وہ کیا طریقہ ہے جس سے ان مُردوں کو زندگی مل جائے؟ اس کے لیے کہا یہ تھا کہ ابراہیمؑ! تم نے دیکھا ہے کہ جنگل کے وحشی پرندوں کو کس طرح سے سدھایا کرتے ہیں، یہ ان سے زیادہ وحشی اور غیر مانوس تو نہیں ہیں۔ اپنے اندر اتنی کشش پیدا کرو، ان کے ساتھ اس قدر محبت سے، شفقت سے، انس سے، AFFECTION سے، پیش آؤ کہ آہستہ آہستہ بتدریج یہ تمہارے ساتھ گھل جائیں، مانوس ہو جائیں۔ اور پھر جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد تو ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے سدھائے ہوئے، مانوس کیے ہوئے، پرندوں کو اگر دور دور پہاڑوں پر بھی چھوڑ دیا جائے

ایک مخصوص معنی پہنا رکھے ہیں اور ہم ان معنی کے خول سے باہر نکلتے ہی نہیں ہیں۔ 'آخرت' کا یہ لفظ جب بھی ہمارے سامنے آئے گا' ہمارا تصور مرنے کے بعد کی زندگی کی طرف جائے گا' دوسری طرف تصور جاتا ہی نہیں ہے۔ یہ معنی اتنے پختہ اور جاگزیں ہوگئے ہیں کہ اس کے سوا ذہن میں دوسری چیز آتی ہی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' یہ زندگی برحق ہے لیکن اسکے یہی معنی تو نہیں ہیں' یہ آخرت مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے محدود تو نہیں ہے۔ آخرت تو ہر مستقبل کو کہتے ہیں' ہر انسان کی زندگی میں ہر آنے والا سانس اس کی آخرت ہے' زندگی کے آنے والے دن اس کی آخرت ہیں' ایک قوم میں ایک نسل کے بعد دوسری آنے والی نسل اس کی آخرت ہے اور پھر پوری انسانیت کے ارتقائی منازل جو وہ طے کرتی جا رہی ہے ہر آنے والی منزل آخرت ہے اور پھر مرنے کے بعد کی زندگی بھی آخرت ہے۔ لہذا ہر جگہ یہی معنی نہیں کرنے چاہئیں کہ جونہی ہم نے آخرت کہا اور اس کے معنی ہم نے مرنے کے بعد اٹھا لیے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کسان یہ کیوں محنت کیے چلا جا رہا ہے' مسلسل متواتر خالی ہاتھ واپس لوٹ رہا ہے؟ اس لیے کہ وبالاخرۃ ھم یوقنون (2:4) مستقبل پر اس کا ایمان ہے کہ پانچ چھ مہینے کی بات ہے' اگر میں نے خدا کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق یہ محنت کی' زمین اچھی ہوئی' بیج صالح ڈالا تو یہ کچھ وقت ہے جس میں صرف محنت ہی محنت ہے' پھر قرآن کے الفاظ میں ایک ایک دانے میں وہ سات سات بالے اور ایک ایک بال میں سات سات سو دانے پیدا کرے گا۔ میں عرض کروں عربی زبان میں یہ جو سات ہے' جو سبع ہے اس کے معنی صرف SEVEN(7) نہیں ہوتے اس کے معنی ''متعدد بکثرت'' بھی ہوتے ہیں جیسے ہم کہتے ہے: تمہیں سینکڑوں بار میں نے کہا ہے کہ ایسا نہ کیا کرو' ہزار بار تمہیں سمجھایا ہے' میں وہاں بیسیوں مرتبہ گیا ہوں۔ اس کے معنی بیس سو ہزار نہیں ہوتے' اس کے معنی کثرت ہوتی ہے: 'تعداد ہوتی ہے' وہ ہوتا ہے جسے ہم متعدد (SEVERAL) کہتے ہیں۔ قرآن میں سبع کا لفظ آتا ہے ہمارے ہاں دس بیس سو ہزار کا لفظ آتا ہے۔ ایک ایک دانے سے' اتنے اتنے دانے نکلیں گے۔ یہ ہے آخرت پر ایمان' مستقبل پر ایمان۔

اگر کسی شخص کا آخرت پر ایمان نہ ہو تو وہ اپنے کسی عمل کو بھی ثمر بار ہوتے نہیں دیکھ سکتا

اب جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ کسان کے لیے تو اب یہ آسان ہے۔ وہ ہر کسان دیکھتا چلا آرہا ہے کہ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے اس لیے اس کو کسی ایسے یقین اور ایمان کی ضرورت نہیں لیکن اگر کبھی اس سے پہلے ایسا نہ ہوا ہو یا انہیں نے اپنی زندگی میں کم از کم' ایسا نہ دیکھا ہو اور پہلی مرتبہ ان سے یہ کہا جائے کہ یہ کرو اور اس کے بعد وہ روز دیکھیں کہ محسوس نتیجہ سامنے نہیں آرہا' اس کے لیے ایک یقین محکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں غلط معاشرے کے اندر دیانت اور امانت سے زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرنے والے الا ماشاءاللہ چند قدم پر جا کر گھبرا جاتے ہیں' مایوس ہو جاتے ہیں تو وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ وہ کسان ہوتا ہے جس کو آخرت پر ایمان نہیں ہوا' یہ روز کر کر کے

تھک جاتا ہے کہ کیا پا لیا میں نے دیانت دار رہ کر؟ کیا حاصل ہو مجھے ایمان دار ہو کر؟ روز مصیبتیں آتی ہیں' روز تکلیفیں برداشت ہوتی ہیں۔ یہ ساتھ والے لوگ' دیکھیے کہاں سے کہاں نکلتے جا رہے ہیں؟ یہ گھبرا گیا' اس نے اپنی کچی فصل کاٹ کر چارے کے طور پر بیلوں کو ڈال دی۔ بڑا صبر آزما مرحلہ اور اس مرحلے میں سے صرف جو بالاخرۃ ھم یوقنون (2:4) ہے' وہی آگے لے جا سکتا ہے' کوئی اور چیز آگے نہیں لے جا سکتی۔ اب یہاں نیا معاشرہ متشکل ہو رہا ہے اس میں دیئے چلے جانا ہے' دیئے چلے جانا ہے' مصیبتیں آ رہی ہیں' اذیتیں برداشت ہو رہی ہیں' تصادم ہو رہا ہے' ٹکراؤ ہو رہا ہے' کچھ مل نہیں رہا اور کچھ پتہ نہیں کہ اس میں عرصہ کتنا لمبا لگے گا۔ کونسی چیز ہے جو ان کو ستائے رکھے گی' اس مقام پر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دی گی؟

اگر کسی نے سعی مسلسل کی ہو تو پھر اس کا لگایا ہوا کھجور کا درخت ہزار ہزار سال پھل دیتا ہے

بالاخرۃ ھم یوقنون (2:4) یہ ایسا معاشرہ بننے والا ہے جس میں جتنی تمہاری بقایا زندگی ہو گی' اس میں بھی امن' سلامتی' آسائشیں' خوشگواریاں اور آنے والی نسلیں' وہ تو معلوم نہیں کہ تمہاری اس کھیتی کے کتنی فصلیں وہ کاٹتی ہوئی لے کر چلی جائے گی۔ یہ تو کھجور کا درخت ہے' پھل دینے کے لیے تو چالیس سال چاہئیں لیکن ایک دفعہ جب یہ زمین گیر ہو جاتا ہے' ہزار ہزار سال کے درخت تو ہمارے یہاں لاہور میں بھی لگے ہوئے موجود ہیں۔ اصلھا ثابت و فرعھا فی السمآء (14:24) یہ وہ بیج ہیں جن درختوں کی جڑیں پاتال میں اور ان کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوتی ہیں لیکن یہ چالیس سال تک کون انتظار کر سکتا ہے؟ وہ جسے آخرت پر ایمان ہو ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ وہ اس کی جگہ کیلا بولے گا' چھ مہینے میں پھل لیا' پھر اس کے بعد کاٹ دیا' اگلا پھل وہ دیتا ہی نہیں' دیتا تو ہے' چھ مہینے میں ایک ہی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے یہ عرض کیا ہے۔ یہ معاشرہ پھر کیا کرتا ہے؟

روٹی کیلئے مستقبل کی فکر انسان کیلئے ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے

ہم میں سے ہر ایک کو یہاں مستقبل کی فکر پریشان کیے رکھتی ہے۔ یہ ایماندار' یہ دیانت دار' غلط معاشرے میں گھبراتا اس لیے ہے کہ اس وقت تو کسی نہ کسی طرح سے یہ ہے کہ بھئی! میں اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہا ہوں' کل کو کیا ہو گا؟ غلط معاشرے میں مستقبل کی جو INSECURITY ہے۔ وہ انسان کے پاؤں میں لغزش لے کر آتی ہے' کل کو کیا ہو گا' مجھے کون پوچھے گا' میرے بچوں کی خبر گیری کون کر سکے گا؟ قرآن ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے کہ جب وہ قائم ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ معاشرہ اعلان کرتا ہے کہ نحن نرزقکم و ایاھم (6:151) ہم تمہارے اور تمہارے بچوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ وہ تو یہ اس وقت اعلان کر سکتا ہے' جب یہ معاشرہ متشکل ہو چکا ہو گا۔ اس معاشرے کی تشکیل کے دوران جس قدر سعی و کاوش اور ہمت کرنی پڑے گی' ہو سکتا ہے کہ ان کے حصے میں تو کچھ نہ آئے' بدر

کے میدان میں شہید ہونے والوں کے حصے میں اس دنیا کے نقطہ نگاہ سے کیا آیا تھا؟ لیکن ان کی بوئی ہوئی فصل آج تک ہمارے جیسے نالائق بھی اس میں سے کچھ نہ کچھ کھا ہی رہے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ جو مستقبل ہے' اس کے اوپر نگاہ رکھو اور پھر دیکھو کہ یہی آج کی تمہاری محنت' آج کا یہ معاشرہ جو تم صحیح متشکل کرتے ہو' کل کے لیے تمہارے ہاں کتنا سکیورٹی کا سامان بہم پہنچا دیتا ہے۔

انسانوں کے خودساختہ نظامِ زندگی کے نشیب وفراز کے خدوخال کی ایک قرآنی مثال اور پھر اس کا علاج

عزیزانِ من! اب آیت شروع ہوتی ہے وجد میں آ جائیے کے عجیب مثالیں قرآن پیش کرتا ہے! کہا کہ ایود احدکم ان تکون له جنة من نخیل و اعناب تجری من تحتها الانهر له فیها من کل الثمرٰت (2:266) ذرا ایک ایسے شخص کی مثال یا اپنی ہی مثال سوچو! تمہارے پاس لہلہاتے ہوئے کھجوروں کے' انگوروں کے باغات ہیں بڑی آسائش سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ اور پھر وہ WELL IRRIGATED بھی ہیں سیراب ہو رہے ہیں پانی فراوانی سے مل رہا ہے' درخت جوان ہو رہے ہیں' پھل دے رہے ہیں' پانی مل رہا ہے' بڑی موج میں گزر رہی ہے' یہ چیز ہے۔ کہا کہ سوچو تو سہی کہ یہ سب کچھ ہو مگر و اصابه الکبر و له ذریة ضعفآء (2:266) خود بوڑھا ہو گیا' بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ فاصابها اعصار فیه نار فاحترقت (2:266) اور اچانک ایک دن ایک ایسی جھلسا دینے والی تیز ہوا چلی کہ جس نے ان تمام درختوں کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ کہا کہ سوچو تو سہی! ایسے وقت میں کیا تمہاری حالت ہوگی؟ زمانے کے ایسے حادثات آ سکتے ہیں کہ آج جو تمہارے ہاں رزق کا ذریعہ بالکل SECURED ہے' کل کو وہ نہ رہے۔ کہا کہ اس وقت کے لیے تمہارے پاس کیا انتظام ہے؟ یہ جو اس وقت تم کوشش کر رہے ہو' ایک ایسا معاشرہ متشکل کر رہا ہے کہ وہ جس قدر بھی اس قسم کے حوادث آئیں آتے رہیں' تمہیں کوئی فکر نہیں ہوگی یہ جھیلے گا اس لیے کہ اس نے ذمہ لے رکھا ہے کہ نحن نرزقکم و ایاهم (6:151) ہم تمہارے اور تمہارے بچوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ یہ جو آج تم اس قسم کا معاشرہ متشکل کرنے کے لیے محنت کر رہے ہو سوچو تو سہی کہ اگر تمہارے اوپر ایسا وقت آ گیا اور کوئی اس قسم کا انتظام نہیں ہوا تو کیا کرو گے؟

کسی فسادانگیز انقلاب برپا ہونے سے پہلے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا طریق

قرآن نے تو مثال ہی دی تھی اور ہم پر تو روز بیت رہی ہے' ہمارے لیے دشواری نہیں ہے ان چیزوں کے سمجھنے میں۔ روز ایسا ہوتا ہے کہ ایک حادثہ آتا ہے' ایک انقلاب آتا ہے' وہ جسے فسادانگیز انقلاب کہتے ہیں' اچھے اچھے انتظامات کیے ہوئے درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر بعض انقلابات تو ایسے آتے ہیں کہ جس میں یاد آ گیا کہ بات تو (2:254) سے شروع ہوئی تھی' ذرا پیچھے چلے جائیے۔ کہا تھا کہ یایها الذین اٰمنوا انفقوا مما رزقنکم (2:254) آج ابھی وقت ہے کہ اس معاشرے کی تشکیل کے لیے صرف کر سکتے ہو'

قبل از وقت اس کے لیے کچھ کرلوقبل ان یاتی یوم لابیع فیہ و لاخلۃ و لا شفاعۃ (2:254) قبل اس کے ایسا حادثہ واقع ہو جائے‘ ایسا انقلاب برپا ہو جائے کہ اس میں پھر نہ تمہارے پاس کچھ رہے‘ نہ کہیں کاروبار کے لیے کوئی تمہارے پاس گنجائش باقی رہے‘ نہ کوئی دوست کام آسکے‘ نہ کسی کی سفارش کچھ کرسکے۔ ایسے مواقع آجائیں گے۔ آج تو سب کچھ ہے‘ کاروبار کے لیے بھی تمہارے پاس ہے‘ کھاتے پیتے ہو‘ بہت کچھ موجود ہے‘ دوست یار بھی بہت ہیں‘ بڑے مقام پر ہو‘ MILLIONAIRE ہو‘ بڑی سفارشیں بھی چل رہی ہیں‘ ٹھیک ہے آج یہ کیفیت ہے۔ آگے کہا ہے کہ من قبل ان یاتی یوم لابیع (2:254)۔ عزیزان من! ہماری پھر نگاہ قیامت پر چلی جاتی ہے کہ کہا ہے کہ وہاں یہ چیز ہوگی۔ کیا کہہ گیا ہے اقبالؒ؟

سخن ز نامہ ومیزاں دراز تر گفتی

بحیرتم کہ نہ بینی قیامت موجود (1)

---

❶ تُو نے نامہ اعمال اور ان کو تولنے کے ترازو کی بات لمبی کی ہے۔ میں حیرت میں ہوں کہ تُو اس قیامت کو نہیں دیکھ رہا جو تیرے سامنے موجود ہے۔

ہم وہ نامہ اعمال اور میزان قیامت کے لیے اٹھار کھتے ہیں۔ اعمال نامہ تو ہر وقت گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے قیامت تو انسان کے ہر سانس میں آتی ہے ”بحیرتم کہ نہ بینی قیامت موجود“۔ مصیبت یہ ہے کہ تُو قیامت موجود کو دیکھتا نہیں‘ آنکھیں بند کرتا ہے‘ اس کو تُو قیامت کے لیے اٹھا رکھتا ہے۔ عزیزان من! یہ قیامت موجود ہمارے اس دور میں تو آئے دن نظر آتی ہے کہ ایک اس قسم کا چکر آتا ہے تو نہ کاروبار کے لیے پیسہ‘ نہ دوست پہچانتا ہے‘ نہ اس میں سفارش چلتی ہے۔ کہا کہ قبل اس کے کہ اس قسم کے حوادث آجائیں‘ قبل از وقت اس کے لیے انتظام کرو۔ یہی وہ چیز ہے جو یہاں کہی گئی ہے۔ لہلہاتے باغات والے‘ اُس زمانے کی اکانومی یہی تھی‘ اس قسم کے باغات کا ہونا‘ پھلوں کا ہونا‘ وہی مثال دی کہ پھر ایک ایسا جھکڑ چلے کہ جس میں یہ سارا قصہ ختم ہو جائے‘ خود ضعیف ہو جاؤ‘ بوڑھے ہو جاؤ‘ بچے چھوٹے چھوٹے رہ جائیں تو ان کے رزق کا انتظام کون کرے گا؟ کیا بات ہے قرآن کی!

آج کے مشکل دور میں تو انشورنس کا سہارا بھی خود ساختہ شریع میں حرام ہے

عزیزان من! آج کسی سے کہا جاتا ہے کہ بھئی! انشورنس ہی سہی‘ اچھی چیز ہے تو اس پر بھی اعتراض ہو جاتا ہے۔ یعنی بھوکے مرنے پر تو ان کوئی اعتراض نہیں ہوتا‘ گداگری پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا‘ یہ ٹھیک ہے کہ جو نظام قرآن متشکل کرتا ہے یا بتاتا ہے‘ وہ ان چیزوں سے بہت اونچا جاتا ہے‘ وہ تو آپ کے ہاں ہے نہیں‘ نہ آپ نے کبھی اس کی فکر کی‘ نہ آپ کے ذہن میں اس کا تصور ہی ہے‘ بر سبیل تنزل

اگر کوئی کسی قسم کا نا نظام اس معاشرے نے کیا ہے کہ ایسا وقت آ جائے کہ تم بوڑھے ہو جاؤ' بچے چھوٹے چھوٹے رہ جائیں' ذرائع آمدنی تمہارے ختم ہو جائیں تو اس وقت کیا کیا جائے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق وہ انتظام ہے' نہ ہونے کے مقابلے میں دنیا والوں نے کچھ انتظام تو کیا ہے۔

قرآنی نظام ربوبیت کے خدوخال سامنے نہ ہونے کے باعث عقل وفکر کو معاف کر دینے والی پیچیدگیاں

وہ آپ کے ہاں قرآنی نظام تو ہے مگر وہ آپ کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ جو کچھ بر سبیل تنزل عام دنیا نے کیا ہوا ہے' اس کے دروازے آپ خود اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ اعتراض ہو جاتا ہے صاحب! اس سے خدا کی رزاقیت کے اوپر حرف آ جاتا ہے خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے' وہ رازق ہے' اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ قرآن کی بات تو بعد میں کہوں گا' چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ عزیزان من! یہ دعوی کہ خدا نے ہر ایک کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے' ہر شام دنیا کی آدھی مخلوق بھوکی سو رہی ہے' کیا یہی ذمہ داری ہے رزق کی؟ آپ اپنے ہاں نگاہ دوڑا کر تو دیکھیے' اپنے قرب و جوار میں جن کے اوپر اس قسم کی مصیبت آ کر پڑ جاتی ہے کہ گھر کا ایک کمانے والا ال ہے اور وہ رات کو حادثے میں کہیں جا کر فوت ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' بیوہ کا کوئی پرسان حال نہیں' اس کے کفن دفن کے لیے بھی کچھ نہیں ہے وہ گھر کا دیگچہ بیچ کر گزارا کرتی ہے اور شام کو اس کے چولہے میں لکڑی نہیں ہوتی۔ یہ FACTS (حقائق) ہیں جن کو ہمیں FACE کرنا ہوگ' خالی عقیدت مندی سے تو بات نہیں چلتی۔ میں اور آپ نے کہہ لیا کہ صاحب! ہمیں خدا کی رزاقیت پر ایمان ہے' میں پوچھتا ہوں کہ اعتراض کرنے والا ال جب یہ اعتراض کرے گا کہ یہ جو رات کو پورا معصوم مظلوم کنبہ بھوکا سو گیا ہے' کیوں نہیں ان کو رزق دیا گیا؟ کیوں نہیں خدا نے اپنی رزاقیت کی ذمہ داری پوری کی؟ لیکن یہ اعتراض ان پر ہے' قرآن پر تو اعتراض ہو نہیں سکتا۔ یہ سارے اعتراضات ہم وارد کرتے ہیں اس لیے کہ ہم نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے' عقائد ہوں یا انسانوں کے خود ساختہ نظریات ہیں۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب! خدا رزق کا ذمہ دار ہے وہ جسے چاہتا ہے روٹی دیتا ہے' وہ خود دیتا ہے جو اس نے روٹی دینی ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں جتنا زیادہ شدت سے کوئی ایسا کہتا ہے' اسے اتنا ہی زیادہ ہم اللہ والا سمجھتے ہیں۔ اللہ پر بڑا بھروسا ہے تو کل اللہ کے اوپر ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے رازق ہونے کی ذمہ داری کس طرح پوری کرتا ہے؟

عزیزان من! سنیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ و اذا قیل لھم انفقو ا مما رزقکم اللہ (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے سامان زیست' رزق' دیا ہے اس میں سے تم ان محتاجوں کے لیے' ان بھوکوں کے لیے' ان کے لیے جن کا اپنا انتظام کوئی نہیں رہا کھلا رکھو۔ یہی بات ہے جو کہی جاتی ہے۔ اب سنیے جواب! ہم یہی جواب کہتے ہیں کہ بھئی! یہ اللہ رازق ہے' وہ کھلائے گا۔ قرآن کہتا

ہے کہ قال الذین کفروا (36:47) کافر یہ بات کہتے ہیں' للذین اٰمنوا (36:47) (کافر) ایمنا والوں سے یہ بات کہتے ہیں کہ انطعم من لو یشآء اللہ اطعمہ (36:47)۔ارے! کیا کہتے ہو؟ یہ کہ ہم ان کے لیے روٹی کا انتظام کریں اور وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ ان کو روٹی دینا چاہے تو وہ روٹی دے ان کو' روٹی دینے کا انتظام تو اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے' تم ہمیں کہتے ہو کہ ان کی روٹی کا انتظام کرو۔ یہاں لو یشآء اللہ (36:47) آیا ہے کہ یہی ہم کہا کرتے ہیں کہ اللہ چاہے تو ان کو خود رزق دے گا' روٹی دے گا۔ قرآن اسے کفار کا قول کہہ رہا ہے۔ اندازہ لگایئے! کہتا ہے کہ ان انتم الا فی ضلل مبین (36:47) کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں۔

مشیت خداوندی کا اگر حقیقی مفہوم ہی سمجھ لیا جائے تو نوید سحر کا سورج طلوع ہو جائے گا

عزیزان من! یہ غور طلب چیز ہے۔ صبح سے شام تک ہم اس کو دہرائے چلے جاتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی مشیت میں نہیں ہے کہ ان کو ملے' غریبی امیری سب اس کے ہاتھ میں ہے' صاحب! جن کو وہ بھوکا رکھتا ہے' وہ رکھتا ہے جن کو وہ دیتا ہے' لاکھوں میں وہ دیتا ہے' ہمیں تم کہتے ہو کہ ان بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو۔ اگر ان کو روٹی ملنی ہوتی تو خدا کیوں نہ ان کو روٹی دیدیتا' اگر وہ چاہتا تو ان کو کیوں نہ روٹی دے دیتا' ہمیں کیوں کہتے ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کفار کا قول ہے یہ لوگ گمراہ ہیں' ضلل مبین میں ہیں۔ کفار مومنوں سے یہ بات کہتے ہیں۔ عزیزان من! وہ انتظام کیا ہے؟ پہلے ہی لفظ میں کہا کہ انفقوا مما رزقکم اللہ (36:47) جو کچھ تمہیں دیا ہوا ہے' جو کچھ تمہارے پاس ہے' اس میں سے اپنی ضرورت سے زیادہ جو ہے' وہ ان کے لیے کھلا رکھو۔ یہ ان سے کہا جاتا ہے اور وہ جواب میں یہ کہتے ہیں۔ برداران عزیز! بعینہ یہی بات ہے جو آج کہی جاتی ہے' جب کہ انتظام کرو اس کا کہ رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے' یہ غریبی اور امیری کے اتنے جو طبقاتی تفاوات ہیں' یہ ختم ہو جائیں۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو اللہ کی مرضی اور مشیت پر ہے' جو اس طرح سے اس نے کسی کو غریب رکھا' کسی کا امیر بنایا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ یہ کن کا قول ہے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ خدا براہ راست' کسی کو روٹی نہیں دیا کرتا' نہ ہی وہ کسی کو براہ راست بھوکا مارا کرتا ہے' یہ تمہارا انظام ہے جس سے تم ان سے چھینتے ہو۔ اور اس کے لیے پھر ان کو رزق پہنچانا انفقوا مما رزقکم اللہ (36:47) تم ان کا انتظام کرو۔ کفار کہتے ہیں خدا انتظام کرے گا' خدا کہتا ہے تمہیں انتظام کرنا ہوگا اور ہم آج بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا ہی انتظام کرے گا۔ خدا یہ کہتا ہے کہ سوچو! نہایت عمدہ آسائش سے زندگی بسر ہو رہی ہے' ذرائع آمدنی نہایت اچھے ہیں' بوڑھا ہو گیا ہے چھوٹے چھوٹے بچے رہ گوئے' نہ بوڑھا کمانے کے قابل ہے' نہ بچے کمانے کے قابل ہے۔ حادثے کا ایک جھٹکا آیا کسی طرح سے بھی وہ آیا اور یہ چیز بند ہوگئی۔ کہا کہ سوچو! ایسے وقت میں کیا کرو گے؟ ہم سے کوئی کہے تو ہم تو اللہ میاں کو بھی یہ کہہ دیں کہ

صاحب! آپ ایسے وقت میں ان کو روٹی دیجیے' رازق تو آپ ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم خیر الرزقین (22:58) ہیں۔ یہ جو بنیادی طور پر رزق کا سامان ہے' وہ سارا ہم نے زمین کے اندر عطا کر دیا ہوا ہے۔ یہ رازقین جو قرآن نے کہا' اور رازق وہ مان رہا ہے۔ اس کے بعد یہ تمہارا انتظام ہے جس کے لیے یہ زیادہ کمانے والے ان کے رازق بن جاتے ہیں کہ جو اپنی محنت کے باوجود اپنا گزارہ نہیں کر سکتے یا جن کا کوئی کمانے والا ل نہیں رہتا۔

مجوسیت کے پیدا کردہ عقائد وتصورات نے قرآن حکیم کی حقیقی تعلیم کو چیستاں بنا دیا ہے

عزیزان من! اگر یہ چیز خدا نے خود کرنی ہوتی تو وہ یہ مثال ہی کیوں دیتا کہ سوچا' اگر ایسا وقت آ جائے تو پھر تم کیا کرو گے؟ ہم تو یہ اس سے کہیں گے کہ صاحب! آپ کریں گے' ہم نے کیا کرنا ہے؟ آپ نے پیدا کیا ہے' ہر ایک کا رزق آپ نے لکھ کر رکھا ہوا ہے' ان پر آفت آ گئی' آپ یہ کیجیے' آپ یہ ہمیں کیوں کہہ رہے ہیں؟ وہ یہ کہتا ہے کہ کذٰلك یبین اللہ لکم الاٰیت لعلم تتفکرون (2:266) بڑی واضح کر کے ہم بات سمجھاتے ہیں' کھول کر بات بیان کر دیتے ہیں لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو غور وفکر سے اس کو سوچے۔ اندھی عقیدت کے اوپر اس کو اللہ کے اوپر ڈال دینا کہ اس کی مشیت میں ہوتا تو یہ ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔ جب تک لعلکم تتفکرون (2:266) وہ تفکر نہیں کرتے' جو تدبر وتفکر کرتے ہیں وہ اسے سمجھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ یایھا الذین اٰمنوا انفقوا من طیبٰت (2:267)۔ عقائد نہ لے کر کہیں بیٹھے رہنا' یہ مجوسیوں کے تھے کہ وہ خود کرے گا' جو کچھ اس نے کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انفقوا من طیبٰت (2:267) اسے کھلا رکھو جو ضرورت سے زیادہ ہے' من طیبٰت ہے نہایت خوشگوار چیزیں ہیں۔

قرآن حکیم کی بلاغت اور دنیا بھر کے معاشی نظام کا حل

آگے میں آگے بات کروں گا یہ من طیبٰت کہا ہے۔ من طیبٰت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض (2:267)۔ کیا بات ہے قرآن کی! اتنے اتنے سے لفظ ہوتے ہیں' ان کے اندر دنیا سمٹ گئی ہوتی ہے۔ دو ہی تو چیزیں ہے: یا صنعت وحرفت ہے یا آپ کے ہاں کی زراعت ہے۔ صنعت وحرفت' ما کسبتم (2:267) جو کچھ تم اپنے لیے تیار کرتے ہو' محنت کرتے ہو۔ اس میں صرف انسان محنت کرتا ہے اور اگلا ہے ومما اخرجنا لکم من الارض (2:267) اور جو کچھ ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں۔ زمین سے نکالنا آپ نے دیکھا۔ یہ اسی کے انتظام کے مطابق نکلتا ہے' اسی کے قونین کے مطابق نکلتا ہے' محنت کرنی ہوتی ہے' انسان کے لیے اس زمین کے اندر یہ دبے ہوئے خزانے ہیں۔ زمین اور اس کے اندر کے خزانے' یہ تو نہ کسی کی ملکیت ہیں یعنی نہ

کسی انسان نے ان کو خود تیار کیا' آج تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم زمین کو کسی اس اس کے مالک سے خرید لیتے ہیں' جس کو ہم قانوناً اپنے ذہن میں مالک سمجھتے ہیں' سوال یہ ہے کہ یہ مالک کیسے بنا؟ کہ جی! اس نے کسی سے خریدی' باپ سے وراثت میں لی۔ بھائی صاحب! ذرا پیچھے چلتے جایئے یہ سب سے پہلے جس نے زمین کے اتنے ٹکڑے کو اپنی ملکیت قرار دیا تھا' اس نے کس سے خریدی تھی؟ کونسے باپ سے یہ وراثت میں لی تھی؟ بات ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ORIGINALLY (ابتداً) جو چیز ہے' یہ غصب ہے اور اس کے بعد جو آگے کسی نے غصب شدہ مال لیا' چوری کا مال خریدنے والا بھی مجرم ہوتا ہے۔ آپ کسی کی کوئی ایسی زمین لے لیجئے جو اس کی ملکیت نہیں ہے' اتفاق سے اس وقت میرے سامنے دو جج صاحبان بیٹھے ہیں' یہ بیع نامہ ہی اسی وقت فسق کر دیتے ہے۔ بیچنے والے کو اپنی ملکیت ثابت کرنا پڑتی ہے۔ ٹھیک ہے ہم اپنے مروجہ رواج' مروجہ قوانین' کی رو سے ثابت کر سکتے ہیں تو کیا قانون خداوندی کی رو سے بھی ثابت کر سکتے ہیں؟ وہ تو اتنا محتاط ہے کہ کسبتــــم (2:267) میں جو کہا ہے کہ تم جو کچھ اس میں اپنے ہاتھ سے محنت کرتے ہو اور زمین کے متعلق یہ لفظ استعمال کیے ہیں کہ و مما اخر جنا لکم (2:267) اس زمین سے تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ ہم نکالتے ہیں' اس میں سے بھی انفاق کرو۔ اخر جنا لکم (2:267) ''ہم نکالتے ہیں تمہارے لیے'' اب اس میں دو چیزیں آ گئیں: انسان اس پر محنت کرتا ہے' بنیادی طور پر جو زمین ہے' یہ کسی اور کی ہے۔ آج بھی آپ کو پتہ ہے کہ وہ زمین کاشت پر دی جاتی ہے' ایک زمین کا مالک ہوتا ہے' ایک کاشت کار ہوتا ہے۔ کاشت کار کو اس کی محنت کا حصہ ملتا ہے' مالک کو اس کا حصہ ملتا ہے' آپ کے ہاں یہی تقسیم ہے۔ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ارض کا مالک خدا ہے' کاشت کار تم ہو' بٹائی کے وقت اپنا اپنا حصہ بانٹ لو۔

عزیزان من! ضمناً بات آ گئی۔ ہمارے ہاں یہ جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تقسیم کی ہے ہم نے یہ دو چیزیں رکھتی ہیں۔ یہ حقوق اللہ کیا ہیں؟ پھر وہی ہمارے ہاں یہ جو پرستش کی چیزیں ہیں' نماز روزہ وغیرہ' یہ حقوق اللہ ہیں اور یہ جو صدقہ خیرات وغیرہ ہے یہ حقوق العباد ہیں۔ قرآن میں تو حقوق اللہ کا لفظ ہی نہیں آیا۔ یہ تقسیم ہی غلط ہے۔ ایک حقه (6:142) جگہ آیا ہے' وہاں اس کے لیے خدا کا جو حق ہے' اس کو کہا جا سکتا ہے۔ دیکھیے! یہ کہاں آیا ہے؟ اور پھر معلوم ہو جائے گا کہ یہ جو اس کا حق ہے' جو اس نے کہا ہے کہ یہ ہمارا حق ہے' وہ جاتا کہاں ہے؟ کہا کہ ھو الذی انشا جنٰت مروشٰت و غیرو معروشٰت و النخل و الزرع مختلفاً اکله و الزیتون و الرمان متشابھاً و غیر متشابھاً (6:142) یہ زراعت کے متعلق ہے' کھیتی کے متعلق ہے کہ فصلیں اگتی ہیں' باغات ہیں' پھل ہیں' یہ سارا کچھ ہے۔ کلو امن ثمرہ اذا اثمر (6:142) جب یہ فصل پک جائے تو اس میں تم کھاؤ' اسی لیے یہ تھا۔ و اٰتو احقه یوم حصادہ (6:142) اور جب فصل کاٹو تو اس میں سے اس کا حق بھی دے دیا کرو' اس کا حق دو۔ یہ ہے جو خدا کا حق ہے۔ یہ حق کس کو ملتا ہے؟ کسے دیا جائے؟ ٹھیک ہے' فصل کاٹ لی' گیہوں کے ڈھیر لگ گئے' بٹائی پر زمین تھی' بٹوارہ کر لیا' اپنا حصہ ہم نے بوریوں میں

بھرلیا یہ اور پڑا ہوا ہے' یہ اس کا حق یہ کسے دیں' مالک تو آیا نہیں' سامنے ہی نہیں ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی' اسی میں سورۃ مائدہ میں یا سورۃ انعام میں یہ ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ پھر ان چیزوں میں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ ہمارا حصہ اور یہ حصہ خدا کا حصہ اور پھر خدا کا حصہ بھی آپ ہی لے جاتے ہیں۔ یعنی پہلے وہ یہ کر لیتے ہیں ''ہر چیز اِمانداری نال کرنی چاہدی اے جی دھکو زوری نال تھوڑا ہیگا؟ اللہ دا حصہ اللہ لئی ساہڈا حصہ ساہڈے نال۔ او فیر او تے آیا نئیں ہیگا لین واسطے۔ اے جس طراں او ہناں دے مختار عم ہوندے نہیں نا او کہندے آ(1)'' اس کا حصہ بھی ہمیں دو۔ ہم اس زمین کے مالک سے پوچھتے ہیں کہ کاشت کار کو تو یہ حصہ ملے گا' آپ کا حصہ ہم کہاں پہنچا دیں؟ کس کو دے دیں؟ کون ہے آپ کا نمائندہ؟

---

1 ہر چیز ایمانداری سے کرنی چاہیے۔ دھکا شاہی سے نہیں۔ اللہ کا حصہ اللہ کے لئے ہمارا صحہ ہمارے لیے۔ پھر وہ (اللہ) تو آیا نہیں ہے لینے کے لیے۔ یہ جس طرح ان کے مختار عام ہوتے ہیں' وہ کہتے ہیں۔

کاشتکاری کی محنت کا معاوضہ اور خدا تعالیٰ کے حصے کی وضاحت

عزیزانِ من! اس کا حصہ لینے کے لیے خدا کی سند ہونی چاہیے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ حقہ ایک ہی جگہ آیا ہے: خدا کا حق' اس کا حصہ۔ بڑی عجیب آیات ہیں' اور قرآنی کی کونسی آیت عجیب نہیں ہے؟ یونہی اپنے جذبہ تحسین کی رو سے کبھی بے ساختہ یہ الحمدللہ نکل جاتا ہے ورنہ

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ افرئیتم ماتحرثون (56:63) ذرا اس چیز پر غور کرو جو تم کھیتی کرتے ہو۔ اور پھر عربی زبان کی بلاغت پر وجد کیجیے۔ یہاں ماتحرثون آیا ہے یعنی صرف کھیتی باڑی کرنا۔ کہا کہ تم کیا کرتے ہو؟ یہ کہ زمین تیار کرتے ہو' اس میں بیج ڈال دیتے ہو' اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ ئانتھم تزرعونہ ام نحن الزارعون (56:64) اس ایک دانے کو جو سو سو دانوں میں اور بالیوں میں تبدیل کرتے ہیں اور اس دانے سے یہ درخت اگ آتا ہے اور اس سے یہ کھیتی اگ آتی ہے' کیا یہ بھی تمہاری کاری گری ہے یا یہ ہم کرتے ہیں؟ کیا بات ہے! جو ماتحرثون ہے' اس میں یہ جو فاعل ہے' یہ انسان ہی ہے۔ یہ غور طلب چیز ہے کہ انسان یہ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو تم کرتے ہو۔ عزیزانِ من! یہ کیسا دیانت دار پارٹنر ہے! یہ تم کرتے ہو' اب آگے یہ کہو ئانتھم

تزرعونه (56:63) وہی یہاں صیغہ آ گیا کیا تم پھر اس دانے کو فصل میں تبدیل کرتے ہو؟ ام نحن الزارعون (56:64) یا یہ ہم کرتے ہیں۔ لو نشآء لجعلنٰہ حطاما فظللتم تفکھون . انا لمغرمون . بل نحن محرومون (56:65-67) اگر اس کے اندر یہ قانون نہ ہو تو کیا تم یہ چار دانے بکھیر کر جھولیاں اور بوریاں بھر کر لے جاؤ؟ یہ تمہارے ہاں کے دانے بھی بھسم ہو کر رہ جائیں، خاک میں مل جائیں، ماتھا پیٹو، ستیاناس ہو گیا تباہ ہو گئے، بیج بھی گیا۔ اس کے قانون کے خلاف اگر کبھی وہتا ہے تو یہ چیزیں واقع ہوتی ہیں۔ کہا کہ جی! پانی ہم نے دیا، بارش برسی سنو! افئیتم المآء الذی تشربون (56:68) یہ پانی جو تم پیتے ہو ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون (56:69) بتاؤ تو کہ یہ بادلوں سے ہم براستے ہیں یا تم برساتے ہو؟ کس کا قانون یہ کچھ کرتا ہے؟ زندگی کا مدار اس پر، ساری زراعت کا مدار اس کے اوپر۔ یہ جو بظاہر ہم نہروں سے پانی دیتے ہیں، کنوؤں سے پانی دیتے ہیں، درحقیقت ان کا منبع بھی وہی پانی ہوتا ہے جو وہ برساتا ہے۔ ضرورت کے مطابق پانی کی شکل میں جو زیادہ بچ جاتا ہے، وہ ریزروائر جو ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں ان کے اوپر برف کی شکل میں کہ گرمی کے موسم میں جب بارش نہ ہو تو سورج کی تمازت سے پگھل کے تمہارے دروازوں کے سامنے سے وہ گزرے، بتاؤ تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟ دیکھیے! کس طرح سے بڑھتا چلا جاتا ہے! لو نشآئز جعلنٰہ اجاجاً فلو لا تشکرون (56:70) اگر یہ سارا پانی کھاری ہوتا جیسا سمندر کا پانی ہے، پھر کیا اس میں سے پی لیتے اور تم اپنی فصلیں اگا لیتے؟ افرئیتم النار التی تورون . و انتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون (56: 71-72) یہ آگ، پانی کے بعد، جس پر مدار ہے حرارت کے اوپر زندگی کا، فصلوں کا، یہ سب چیزوں مدار ہے ٹھیک ہے لکڑیاں اکٹھی کیں، ماچس جلائی، کہتے ہو کہ ہم نے آگ جلائی، یہ لکڑیاں ہیں، لکڑیوں کے اندر یہ چیز کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ یہ چیز دیتی ہے، آکسیجن جاتی ہے، جلاتی ہے، یہ کون کرتا ہے یہ؟ تمہاری لکڑی یا تمہاری ماچس نہیں، ہمارا انتظام ہے، یہ سب کچھ ہے جو ہم کرتے ہیں۔ تم اس میں اتنا کرتے ہو، دیکھیے کس طرح سے یہ بتاتا چلا جاتا ہے کہ اس میں تمہاری محنت کتنی ہے۔ ہم نے یہ کچھ دیا، بنیادی طور پر زمین دی، یہ ہم نے قوانین دیئے ہمارا نظام ہے، اس نظام کی چلانے والی مشینریاں، ملائکہ، لگی ہوئی ہیں، وہ سب کچھ کرتی ہیں۔ یہ ہم کرتے ہیں، تم نہیں کرتے۔ تم اس میں محنت کرتے ہو، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ قانون ہمارا یہ ہے کہ لیس للانسان الا ماسعٰی (53:39) تم اپنی محنت کے حق دار ہو۔ یہ باقی زمین پر ملکیت ہماری تھی، یہ سارا کچھ جو کچھ انتظامات تھے، یہ سارے ہمارے تھے: حرارت، پانی، یہ زراعت کے قانون، نظام، سب ہمارے تھے، صرف محنت تمہاری تھی۔ نحن جعلنھا تذکرةً (56:73) یہ سب باتیں ہم نے کی ہیں کہ تم ذرا ان کو سامنے رکھو جو کچھ ہم کہہ گئے ہیں۔ ہم نے مان لیا کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ جو کچھ پیدا ہوا ہے، یہ جو گیہوں کے ڈھیر لگے ہیں اس میں ہمارا حصہ ہماری محنت کے بقدر ہے، باقی حصہ آپ کا ہے۔ ہم تو اپنا حصہ لے جائیں گے، آپ کا حصہ کس کو دیں؟ وہ وہاں حقہ یوم حصادہ (6:142) جو کہا تھا کہ فصل

کی کٹائی کے وقت اس کا حق ہے' یہاں پوچھا گیا کہ جی! آپ کا یہ حق ہم کس کو دیں؟ کہا کہ متاعاً للمقوین (56:73) بھوکوں کا حصہ ہے' یہ ان کو دے دو جا کر۔ یہ خدا کا حق ہے۔ جا کر بھوکوں کو دے دو۔

خدا تعالیٰ کا حصہ ربوبیت عظمیٰ کی شکل میں ادا کرنا ہوگا

میں نے (73-56:63) میں عرض کیا تھا اور اس سے آگے جو آیت ہے' اس کو تو پوچھیے ہی نہیں۔ کہا یہ چیز کہ ہم نے تم کو سمجھائی ہے' ایک مالک زمین کا حصہ ہے ایک کاشت کار کا حصہ کہا اس میں یہ کچھ ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور اس کو بالکل قانون کے مطابق' انصاف کے مطابق' عدل کے مطابق' یہ چیز تم کہتے ہو۔ ایسی ہی یہ چیز چھوٹے سے پیمانے پر ہم نے یہ کر دی ہے۔ فسبح باسم ربك العظيم (56:74) اسی اصول کی بنیاد پر خدا کی ربوبیت عظمیٰ کے لیے بھی تم جدوجہد کرو۔ سارا نظام ربوبیت یہ ربوبیت عظمیٰ ہو جائے۔ یہ تو چھوٹے سے پیمانے پر بات کہی ہے سارا نظام تمہارا یہ ہونا چاہیے۔

خیبر کی زمین تقسیم کرتے وقت نبی اکرم ﷺ کا کردار اور ہمارے اللہ واسطے روٹی اور برہمن کی گائے کا قصہ

عزیزان من! یہ ہے وہ نظام جس کے ماتحت کہا کہ یہ قائم کرلو گے تو پھر بڑھاپے کے زمانے' میں چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے' ذرائع آمدنی بند ہو گئے' حادثہ ایسا پیش آ گیا' اس شام کو تم بھوکے نہیں مرو گے۔ متاعاً للمقوین (56:73) ہم نے اسٹور میں رکھی ہوئی ہے ساری۔ یہ نظام کسی کو رات کو بھوکا نہیں سونے دے گا۔ یہ ہے ربوبیت عظمیٰ جسے قرآن نے کہا ہے۔ لعلم تتکفرون (2:266) اکہ تم غور و فکر کرو۔ لہذا اے ایمان والو! کھلا رکھو اپنے سامان رزق کو۔ ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض (2:267) بہت اچھا جی! دیں گے ہم۔ فصل کی تقسیم کے وقت اگر مالک یا وہ دوسرا اس کا نمائندہ وہاں نہ ہو تو وہاں تقسیم پتہ ہے وہ کیسے ہوا کرتی ہے؟ ''اوسارے روڑواں والی مٹی والی کنکریاں والی کنک ہوندی اے اوہدی بوری اچ جاندی ہیگی [1]'' وہ اچھی اچھی اپنی طرف لے آتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کی زمین کے اوپر جب بٹوائی یہودیوں کے ساتھ' غیر مسلموں کے ساتھ ہوئی تھی تو بٹائی لینے والے کو جو بھیجا تھا کہ کہنا کہ وہ جو یہودی کاشت کار ہیں' تقسیم وہ کریں''۔ تو کہا اس قسم کی چیز کہ جسے تم خریدے وقت بھی' قیمت کر کے خرید دو' وہ چیز جو ہے اسے کہو کہ اچھا صاحب! یہ خدا کی راہ پر دے دیتے ہیں۔ اب تو خیر ہمارے گھروں سے صبح کے وقت فقیر کو روٹی نہیں ملتی فقیر بھی روتی نہیں مانگتا' وہ بھی نقد مانگتا ہے۔ جس زمانے میں روٹی ملا کرتی تھی' مانگنے والا جو آتا تھا تو بڑی بی یا بچے یہ کہا کرتے تھے ''اوکا کی رات دی روٹی پئی ہوئی ہیگی اے' ہن اوکن کھانی ہیگی اے' دیدے اللہ واسطے [1] رات کی باسی اللہ واسطے۔ اور برہم نے تو ایشور کے نام پر وہ گائے دیدی تھی' وہ جو گنگا میں گئی بہہ گئی' ادھر ادھر سے بڑی کوشش کی کہ پکڑے وہ نہ پکڑی گئی' وہ بالکل لہروں میں بہہ گئی' اس نے کہا'' جا

ایشوردےناں دے دتی(2)''۔ کہا کہ دیتے وقت یہ چیز نہیں کرنا ہے کہ وہ ایسی چیزیں ہمارے نام پر دینا شروع کر دو۔ کیا انداز ہے قرآن کا! کہ جنہیں تم اپنے لئے خریدنے جاؤ تو پوری قیمت پر خریدو نہیں' کہو کہ بڑی ناقص ہیں' کہا ہے کہ ایسا نہ کرو۔ و اعلموا ان الله غنی حمید (2:267) یاد رکھو! جسے تم دے رہے ہو وہ تمہارے دروازے کا بھکاری نہیں۔ بڑی چیز ہے۔ غنی حمید (2:267) وہ مستغنی ہے' سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے' قابل حمد و ستائش ہے۔

---

❶ وہ ساری روڑوں والی' مٹی والی' پتھروں والی گندم اس کی بوری میں چلی جاتی ہے۔

(1) اے لڑکی! رات کی بچی ہوئی روٹی پڑی ہے' یہ اب کوئی نہیں کھائے گا' اب اللہ کی راہ میں دے دو۔

(2) جاؤ! خدا کے نام پر دے دی۔

عزیزان من! کونسی چیز ہے جو اس راستے میں مانع ہوتی ہے؟ یہ جو انفاق ہے' یہ میانی کے دونوں منہ کھلے رکھنے ہیں کہ ادھر سے آتا جائے ادھر سے نکلتا چلا جائے۔ اس میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لیا جائے۔ جس طرح سے جسم کا پرورش کا نظام ہے یہ صرف اپنی ضرورت کے لیے لیتا ہے' جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں کونسی چیز حائل ہوتی ہے؟ یہی چیز حائل ہوتی ہے کہ میاں! ذرا سنبھال کے رکھو' احتیاط برتو' کل کو مصیبت آ گئی تو کون وہاں تمہارا پرسان حال ہوگا' یوں نہیں دیئے جاتے' اپنے بچوں کی بھی کچھ فکر کرو۔ ٹھیک ہے غلط معاشرے کے اندر یہ چیز صحیح ہے' ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن اگر یہی جذبہ صحیح معاشرے کی تشکیل کے وقت میں بھی موجزن ہو جائے تو پھر تو بات بن نہیں سکتی' اس میں تو جو السابقون الاولون ہیں ان کو یہ قربانی کرنا پڑے گی کہ خود کسی طرح سے بھی ہو' جسے تنگی ترشی میں کہتے ہیں' گزارہ کیا جائے' تکلیفیں بھی برداشت کر لی جائیں یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة (59:9) آپ تنگی میں رہ لیتے ہیں' دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے' یہ ہوگی ایسے وقت میں۔ کونسی چیز ہے جو مانع ہوگی؟

عربوں کے ہاں لفظ بخل کا حقیقی مفہوم اور شیطان کا عمل

عزیزان من! قرآن ہے۔ آگے کہا ہے کہ الشیطن یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشآء (2:268) یہ جو تمہارے انفرادی جذبات ہیں وہ ایسے وقت میں محتاجی سے ڈراتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ بخل کرو۔ یہ جو فحشاء ہے ہمارے ہاں تو پھر اس کے معنی وہی فحش کے ہی آتے ہیں' بے حیائی کی چیزوں کے بھی معنی آتے ہیں۔ یہ اس کے عربی زبان میں ثانوی معنی تھے۔ عربوں کے ہاں ان کا جو تصور تھا' اسلام سے بھی پہلے کے جو عرب جاہلیہ کے تھے' ان کے ہاں مہمان نوازی' سخاوت' یہ چیزیں بہت بڑے جوہر گنے جاتے تھے' یہ ان کے ہاں کا شعار تھا۔ ان کے ہاں جو بخیل تھا' جو بخل تھا ان کے ہاں وہ اسے سب سے بڑی بے حیائی کہتے تھے اس لیے کہ بنیادی

معنی بخل کے یہی ہیں۔ اور یہاں تو بات صاف ہوگئی کہ یہ جو شیطان ہے تم کو احتیاج سے‘ فقر سے ڈراتا ہے یامرکم بالفحشآء (2:268) اور اس کے بعد وہ تمہیں کہتا یہ ہے کہ نہ بھئی! اپنے آپ کے لیے سمیٹ کر رکھو۔ بخل یہی ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے لیے کسی چیز کو سمیٹ کر رکھ لینا‘ دوسروں کی ضرورت کے لیے اسے نہ دینا۔ یہ تمہیں اس چیز سے ڈرائے گا۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ میں عرض کرتا کہ قرآن میں یہ جو نظام صلوٰۃ تھا‘ اس کے لیے کہا ہی یہ تھا کہ ان الصلوۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر (39:45) وہ تمہیں بخل سے‘ خودغرضیوں سے روک دے گا‘ منکر ہر وہ چیز ہے جو عقل فریب کار کی سجھائی ہوئی ہو۔ بات پھر قرآن بڑی عجیب کہہ گیا ہے! یہ شیطان کیا ہے؟ یہ انفرادی جذبات پرستی کا تحرک ہے‘ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو صرف اپنے مفاد کی طرف لاتا ہے۔ اور اس لانے کے لیے عقل فریب کار پھر ہزار ہزار حیلے سجھاتی ہے‘ پہلے تو JUSTIFICATORY REASONS (وجوہات جواز) دیتی ہے کہ نہیں‘ تمہیں یہ کرنا چاہیے ''میاں توں اپنی نبیڑ تینوں ہور نال کی[1]'' کل کو تمہیں مصیبت آجائے گی تو کون تمہیں پوچھنے والا ہے۔ اس قسم کے لوگ تو روز روتے ہی رہتے ہیں‘ اپنا انتظام آپ کرتے پھریں۔ پھر ہر طرح سے جائز اور ناجائز طریقے سے سمیٹتے چلے جاؤ‘ سمیٹتے چلے جاؤ۔ یہ سب چیزیں ہیں یہ اس قسم کے انفرادی خودغرضی کے جذبات ہیں جن کے لیے عقل فریب کار اس قسم کے دلائل دے اور پھر اس قسم کے عملی طریقے سجھائے کہ یوں سمیٹو اور یوں لاؤ۔ یہ سب جسے شیطان کہا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ایسے وقت میں کہے گا کہ اپاہج ہو جاؤ گے‘ اپنے لیے سب کچھ رکھو۔ اگلی آیت کے اندر‘ اس کے متعلق‘ اس کا علاج بتایا گیا ہے۔ یہاں تو یہ کہا گیا ہے کہ واللہ یعد کم مغفرۃً منہ وفضلاً (2:268) یاد رکھو! خدا کا نظام ربوبیت تمہیں ہر قسم کی احتیاج سے محفوظ رکھنے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرانے کی ضمانت دیتا ہے۔ انفرادی جذبات سے فقر کے لیے اور نظام ربوبیت سے مغفرۃً منہ کے لیے کہا یہ جس نظام کی دعوت ہم تمہیں دیتے ہیں‘ جس کا وعدہ ہم تمہارے ساتھ کرتے ہیں‘ یہ تمہیں احتیاج سے حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا۔ یہ فقر سے حفاظت کا سامان ہے۔

---

[1] میاں! تم اپنی نپٹاؤ‘ تمہیں دوسروں سے کیا!

مغفرت کا حقیقی مفہوم اور تحفظ خویش کی خصوصیت

ہمارے مگر ہاں‘ ہمارے کہاں تو مغفرت وہاں قیامت میں جا کر ہوتی ہے۔ عربی میں مغفر تو کو کہتے ہیں‘ یہ جو لوہے کی ٹوپی سر پر رکھی جاتی ہے۔ یہ فقر سے حفاظت کا سامان ہے‘ یہ جو ہے کہ محتاج ہو جاؤ گے تو یہ بخل سکھاتا ہے اگلا نقطہ فضلاً ہے کہ وہ تمہیں خوشحالیوں کا وعدہ دیتا ہے‘ یہ کر کے دیکھو‘ خوشحالیاں تمہارے لیے ہونگی۔ یہ وعدہ اس بنا پر ہے کہ واللہ واسع علیم (2:268) ان کی نگاہ تو صرف چار قدم تک جاتی ہے‘ اس کی نگاہ بہت دور تک پہنچتی ہے‘ ان کا علم محدود ہے‘ اس کا علم بہت وسیع ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔

اب یہ بات آئی کہ انسان کے انفرادی جذبات مفادِ خویش سکھاتے ہیں۔ یہ چیز حیوانی سطح زندگی کے اوپر زندگی کا' تقاضا ہے' PRESERVATION OF SELF, THE BASIC INSTINCT (تحفظ خویش کے لیے بنیادی حیات) ہے LIFE کے لیے' جہاں زندگی ہے' تحفظ خویش اس کا بنیادی تقاضا ہے۔ چیونٹی کی ننھی سی جان ہے اس کے سامنے ذرا سا تنکا رکھیے' آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح اضطراب انگیزیوں میں تلملاتی ہے اور پھر اور کچھ نہیں تو کاٹتی ہے۔ یہ کاہے کے لیے یہ کچھ کرتی ہے؟ حفاظت خویش کے لیے' PRESERVATION OF SELF کے لیے۔

عقل خود بیں اور عقل جہاں میں فرق

یہ زندگی کا بنیادی تقاضا ہے' عقل یہ سکھاتی ہے' اس تقاضے کو پورا کرنے کی تدبیریں سکھاتی ہے' یہ سب کچھ سکھاتی ہے لیکن کرتی کیا ہے؟ ہر فرد کی عقل اس کی اپنی حفاظت کی تدبیریں سکھاتی ہے' دوسرے کی حفاظت کے متعلق وہ کچھ نہیں سکھاتی' دوسرے کو تباہ کر کے بھی اپنا فائدہ ہوتا ہے تو عقل یہ سکھاتی ہے۔ یہ جو چیز ہے' یہ جو اس قسم کی عقل ہے کہ جو تمہاری اپنی حفاظت کا بھی سامان بہم پہنچاوے اور انسانیت کی حفاظت کا بھی سامان بہیم پہنچائے' اس عقل کی ضرورت ہے۔ یہ وہ عقل ہے' جسے قرآن کہتا ہے کہ یہ عقل وحی کے ذریعے مل سکتی ہے۔ اور اگلی ہی آیت میں یہ بات آ گئی' کہا کہ یئوتی الحکمة من یشآء و من یئوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً (2:269) یہ جو تمہیں اس قسم کے ARGUMENTS (دلائل) دے رہا تھا' یہ جو تمہیں انفرادیت کے' مفادِ خویش کے دلائل سجھا رہا تھا ان دلائل کا توڑ اگر تمہیں کہیں مل سکتا ہے تو ان دلائل کی رو سے مل سکتا ہے' جو وحی نے دیئے ہیں۔ برادران عزیز! عجیب چیز ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ یہ کچھ کرتا ہے' کرتا رہے' ہم حکم دیتے ہیں تم کو' ایسا کرو۔ وہ تو دلائل دے رہا تھا ابلیس کی تو پہلی بات کی ہی دلیل یہ تھی' جب اس نے سجدے سے' جھکنے سے انکار کیا ہے تو اسے پوچھا گیا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے' تو اس نے دلیل دی تھی کہ خلقتنی من نارو خلقتہٗ من طین (38:76) اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا' مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ کو مٹی کے اوپر فضیلت حاصل ہے جو افضل ہے' اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کم تر کے سامنے سجدہ کرے۔ یہ LOGIC (منطق) ہے' وہ دلاول دے رہا تھا کہا کہ یعدکم الفقر و یامر کم بالفحشآء (2:268) اور یہ چیز وہ دلائل کے اوپر BASE کر رہا تھا۔ اگر یہاں یہ اس چیز کا حکم دے دیا جاتا کہ نہیں اس کے مقابلے میں ہم حکم دیتے ہیں کہ ایسا کرو؟ حکم مانا تو جا سکتا تھا' ان دلائل کا رد تو نہیں مل سکتا تھا' انسان مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ عزیزانِ من! یہ ہیں قرآن کے دلائل' دیکھتے ہیں! کہ ان میں یہاں کیسا ربط آ رہا ہے؟ بظاہر بات نہیں سمجھ میں آتی کہ انفاق کا ذکر ہو رہا ہے' حکمت کی بات درمیان میں آ رہی ہے۔ اس کے اندر کتنا عجیب ربط ہے۔ کہتا ہے ٹھیک ہے' وہ دلائل دیتے ہیں' اس کے مقابلے

میں ہم بھی تمہیں دلائل دیتے ہیں۔

کتاب وحکمت یعنی قانون کے ساتھ اس کی حکمت یہ دونوں چیزیں قانون کا خاصہ ہیں

ایک دلیل وہ ہے جو وحی کی رو سے آتی ہے اور آپ کو معلوم ہے قرآن کریم نے کتاب اور حکمت دونوں کو منزل من اللہ کہا ہے۔ یہ دونوں حدا کی طرف سے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ وہی ہمارے ہاں غلطی ہائے مضامیں ہے یعنی کتاب کو قرآن شریف لے لیا' اب حکمت کی تلاش میں نکلے' یہ بھی منزل من اللہ ہے۔ یہ کہاں سے لیں؟ بات دوسری طرف جائے گی۔ کتاب صرف قرآن نہیں' کتاب اور حکمت دونوں قرآن ہیں' کتاب کے معنی ہوتا ہے'' قانون (LAW) ''۔ اس طرح سے ایک قانون دیا جاتا ہے کہ قانون کی THE WAY OF IT کو سمجھایا نہیں جاتا' حالی قانون ANNOUNCE کر دیا جاتا ہے کہ کل سے ایسا ہوگا۔ ٹھیک ہے ماننا تو ہوتا ہے' دل مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک قانون وہ ہے کہ جس کے ساتھ اس کے جو OBJECTIVES (مقاصد) ہیں' وہ بھی بیان کیے جاتے ہیں'' کیونکہ حالات ایسے پیدا ہوگوے تھے اور اس اس طرح کی خرابیاں آ گئی تھیں اور یہ یہ تدابیر اختیار کی گئیں' ان میں یہ یہ چیز نقائص رہے' لہذا اس بنا پر اب یہ قانون نافذ کیا جاتا ہے تا کہ یہ یہ چیزیں ہوں'' اسے اس کتاب کی حکمت کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم ایسے LAW GIVER ہیں کہ ڈکٹیٹروں کی طرح نہیں کرتے کہ کتاب دیدی' ہم نے قانون دیدیا سمجھایا ہی نہیں کہ ہم نے یہ قانون کیوں بنایا ہے؟ تمہارا اس میں کیا فائدہ ہے؟

ڈکٹیٹر کے ہاں قانون تو ہوتا ہے مگر حکمت نہیں ہوتی

ڈکٹیٹر اس لیے نہیں سمجھاتا کہ ہر قانون کا فائدہ اس کو پہنچتا ہے اور اس کا اعتراف وہ کرنا نہیں چاہتا کہ ہم نے اپنے ہی لیے یہ قانون بنایا ہے۔ دعوی تو اس کا بھی پبلک سرونٹ ہونے کا ہوتا ہے اس لیے وہ اس کی حکمت نہیں دیتا۔ جو قانون دوسرے کے فائدے کے لیے بناتا ہے' وہ پھر اس کی حکمت بھی ساتھ بتاتا ہے کہ یہ بات ہوگئی تھی' تمہارے لیے یہ چیزیوں کی گئی۔ خدا اپنے فائدے کے لیے قانون نہیں دیتا ان اللہ لغنی عن العلمین (29:6) ہر قانون تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ جب تمہارے فائدے کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ قانون کے ساتھ سمجھایا جائے کہ اس متن تمہارا فائدہ کیا ہے۔ عزیزان من! اسے حکمت کہتے ہیں۔ قرآن نے جہاں کہا کہ کتب علیکم الصیام (2:183) قانون ہے' فرض کیے گئے تمہارے اوپر روزے صیام۔ ٹھیک ہے ماننا ہے۔ اس کے آگے آتا ہے لعلکم (2:183) ایک دفعہ'' کتب '' آیا ہے تین دفعہ'' لعلکم '' آیا ہے تا کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے' تا کہ یہ بات ہوتا کہ تمہارے لیے یہ کچھ ہو۔ اور جو'' لعلکم '' ہے وہ سب ہمارے لیے ہے۔ یہ نہیں ہے تا کہ جو ہمارا فلاں کام ہے' وہ سور جائے' وہ تمہارے لیے ہے' تا کہ

تمہارے لیے یہ ہوجاء۔ یہ جو لعلکم ہے یہ اس کی حکمت ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ حکمت' وہ دلائل' THE WHY OF IT' جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یئوتی الحکمة من یشآء (2:269)۔

الحکمة وحی خداوندی کا ہی حصہ ہوتی ہے جو پھر حکمة کی راہنمائی کرتی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ قران کریم کی رو سے یہ جو الحکمة ہے یہ ''ال'' والی ہے' یہ حکمة نہیں ہے' جسے عام عقل کہا جائے گا' یہ الحکمة ہے' قرآن نے اس کو منزل من اللہ کہا ہے۔ بات تو یہ وحی کے اوپر آئے گی جب میں وہاں آؤں گا تو عرض کروں گا۔ یہ اخلاق کے قوانین بیان ہو رہے ہیں اور اس کے بعد کہا جا رہا ہے کہ ذلك مما اوحی الیك ربك من الحکمة (17:39) یہ ہے جو تیرے رب نے تیری طرف حکمت کے لیے وحی کی ہے۔ تو الحکمة خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ہی ملتی ہے' منزل من اللہ ہوتی ہے۔ ایک اور حوالے لکھ لیجیے: (43:63)۔ یہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا ہے کہ یہ ہے وہ حکمت جو ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے دی ہے۔ یہاں الحکمة عام عقل انسانی کا نام نہیں ہے کیونکہ عام عقل انسانی تو وہ فریب کار ہوتی ہے۔ وہ تو ایک قوت ہے جس کو دونوں طرف برتا جا سکتا ہے' چور کو اس کی حکمت یہ سکھاتی ہے کہ کس دروازے سے اندر آیا جائے' کیسے مال لیا جائے' کہاں سے باہر جایا جاوے' گھر والے کو اس کی حکمت یہ سکھاتی ہے کہ مال کو کیسے محفوظ کیا جائے۔ حکمت ایک صلاحیت کا نام ہے' جو اس کا استعمال ہے' وہ یہ ہے۔ اگر انسان اپنے ہی جذبات کے تابع اس کو استعمال کرے' یہی حکمت دنیا کے اندر سارے فسادوں کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ بے وقوفوں کی دنیا نے' بے چاری نے' کیا دنیا کو لوٹنا ہے' اس کو تو ساری دنیا خود لوٹ کر لے جاتی ہے۔ یہ جو لوٹنے والے ہوتے ہیں' وہ بڑے تیز طرار چالاک ہوتے ہیں' ان کی حکمت' ان کی عقل' بری تیز ہوتی ہے۔ عقل تو یہ کرتی ہے۔ عزیزان من! یہ ہوتا ہے جب عقل انسانی کو انسان کے جذبات کے تابع رکھ لیا جائے۔ میں کسی کے ہاں گیا اور وہاں دیکھا کہ اس کی گھڑی' اس کا فاؤنٹین پین' کہیں پر پڑا ہے۔ جی میں آیا کہ اس کو چراؤں' اب وہ جو میری عقل ہے' سدھا رہی ہے کہ اس کے لیے طریقہ کیا اختیار کیا جائے۔ یہ جذبہ تھا کہ میں یہ چرالوں۔ دوسری طرف یہ چیز آتی ہے کہ یہ جذبہ پیدا ہوا اور اس کے تابع وہاں سے ایک دلیل آئی: پہلی دلیل' تو یہ آئی کہ اگر یہ رواج عام ہو جائے کہیں کہ کسی کی کوئی چیز پڑی ہو' جو زیادہ تدبیر کسی طرح اختیار کرلے' وہ لے جائے تو سوچو تمہارا کچھ محفوظ رہے گا؟ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ آج تو اتنی سی TEMPTATION ہے' جب یہ بات آگے بڑھی تو اپنے MOMENTUM (معیار حرکت) سے یہ پھر کہاں تک پہنچے گی۔ اگلی چیز یہ ہے۔ اور پھر یہ چیز کہ اس انداز سے جو چیز تم لے جاؤ گ' اس سے تمہاری ذات کا کتنا نقصان ہوگا۔ یہ سارے دلائل وہ ہیں جو ایسے وقت میں وحی کی رو سے ملی ہوئی جو حکمت ہے' وہ دیتی ہے۔

انسانی جذبات کے متعلق تمام مذاہب میں پایا جانے والا تصور

عزیزان من! قرآن کریم اسی لیے عجیب چیز کہہ جاتا ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ میرے اندر جذبہ پیدا ہوا کہ میں یہ چیز چرا لوں' اس کی جیب کاٹ لوں' اس کو فریب دیدوں' جھوٹ بول لوں' یہ جذبہ ہے۔ نگۂ غلط نے اس کا علاج یہ سوچا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ سارا تصوف' دنیا کا جتنا بھی ہے' وہ یونان کی PLATONISM ہو' عیسائیت کی خانقاہ' ایران کی مجوسیت ہو' ہندوستا کی ویدانت ہو' ہمارے ہاں کا تصوف ہو' بنیاد یہ ہے کہ یہ جذبات شیطان ہیں' ان کو فنا کر دیجیے۔ اور یہ سوچا ہی نہیں ہے کہ یہ فنا ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے فنا کرنے کے لیے انہوں نے ترک دنیا کہا اور کہنے والا اسی دنیا میں بیٹھا ہوا سانس لے رہا ہے' وہ تو اسی دنیا کے ساتھ تعلق قائم کیے ہوئے ہے۔ میں اور باقی چیزیں تو چھوڑتا ہوں' وہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! کم کر دیا' پانی پینا ہی پڑے گا' تیسیر ہی دن سہی کچھ کھانا ہی پڑے گا لیکن میں کہتا ہوں' کچھ نہ سہی' اس دنیا کی جو میٹریل چیز ہے' جس کو ہوا کہتے ہیں' وہ تو ہر سانس میں وہ لے رہا ہے۔ ترک دنیا نہیں ہوسکتا' ترک جذبات نہیں ہوسکتا۔

انسانی جذبات کو کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں فنا نہیں کیا جا سکتا قوت ارادی کی بنیاد پر جذبات پر ہی ہوتی ہے

یہ جو جذبہ تھا کہ میری نجات ہو جائے' میری روحانیت بلند ہو جائے' یہ بھی تو ایک جذبہ ہے۔ کیا شعر یاد آ جاتا ہے:

وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میرے
چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

جذبات یا خواہشات کا ترک اور یہ جذبہ اور خواہش کہ نجات ہو جائے' اسی لیے آپ کو پتہ ہے' تصوف کے اندر جہاں یہ ترک دنیا ترک آلائش کہا جاتا ہے اور اس کے بعد ترک ترک ہوتا ہے۔ یہ شاعری ہے۔ قرآن اس قسم کی باطل فریبیوں میں گمراہ نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط چیز ہے! اس کے تو معنی یہ ہونگے اگر یہ کہا جائے کہ جذبات ایسی قابل نفرت ضرر انگیز چیز ہے کہ ان کو فنا کر دینا چاہیئے' خدا کے متعلق کیا تصور ہوگا؟ کہ وہ ہر انسانی بچہ جو پیدا کرتا ہے' اس میں جذبات پیدا کیے چلا جاتا ہے اور ہم یہاں بیٹھے ہوئے پورا کارخانہ ہم نے لگا رکھا ہے کہ جذبات کو کچھ دیا جائے' مار دیا جائے ''بنا گنے بناوناں پیا ایں' دیکھ اسی کنا مارنے ہیگے آں [1]''

---

1. بے شمار بنائے جا رہے ہو' دیکھ! ہم کتنے ہی انہیں مارے جا رہے ہیں

ادھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

کتنے جذبات تُو بنائے گا، ہم فنا کیے چلے جائیں گے۔ یہ مذاق ہو رہا ہے۔ عزیزان من! قرآن کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ جو جذبات ہیں، یہ کوئی شرک چیز ہیں، یہ فنا کر دینے کے قابل چیز ہیں جو نہیں، بالکل نہیں! جذبات تو عمل کے لیے بڑی بلند طاقت ہے۔ اب دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ جذبات اور جذبات میں کیا فرق کرتا ہے؟ کہتا ہے کہ فان لم یستجیبو الك (28:50) یہ اپنے جذبات کا اتباع کر رہے ہیں، ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ یہاں تک یہ نظر آیا کہ وہ جذبات کا اتباع جو ہے، وہ غلط ہی طرف لے جانے والی چیز ہے۔ یہاں تو یہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ہے کہ و من اضل ممن اتبع ھوٰہ بغیر ھدیً من الله (28:50) آہاہا آہاہا! یہ گمراہی اس لیے ہے کہ یہ اپنے جذبات کو خدا کی دی ہوئی راہنمائی کے تابع نہیں رکھتے ہیں، اس کے علی الرغم صرف میں لاتے ہیں۔ لہذا جذبات کوئی شرانگیز چیز نہیں، وہ قابل نفرت شے نہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو فنا کر دیا جائے، جذبات کو اگر اس کی راہنمائی کے تابع رکھا جائے تو حسن ہی حسن پیدا ہوتا ہے۔ اگر ان کو ادھر سے سرکش اور بے باک کر دیا جائے اور انہیں اپنی ہی عقل فریب کار کے تابع رکھا جائے، پھر یہ شر ہی شر بن جاتے ہیں، صاحب! لہذا علاج جذبات کے فنا کرنے میں نہیں، جذبات کو خدا کی راہنمائی کے تابع صرف کرنے کا نام ہے۔

عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں میں تو بنیادی فرق ہے

اب ہمارے سامنے عقل کی دو قسمیں ہو گئیں اسے یوں کہیے کہ قسمیں تو دو نہیں ہیں، اس کے استعمال کے اعتبار سے یہ اب دو قسم کی ہو گئی۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے ہمارے ہاں کا وہ شخص کہ جسے قرآن کی بصیرت حاصل تھی، اسے کہنے کا خوب انداز ملا ہوا تھا اس نے یہ چیز کہی کہ

عقل خود بیں دیگر و عقل جہاں بیں دیگر است

کیا بات یہ کہہ جاتا تھا کہ بات ساری اتنی ہے: اپنی اپنی ربوبیت تو ہر شخص کرتا ہے، اپنے بچوں تک بھی کرتا ہے، ایک ربوبیت ہے جسے اس نے کہا ہے الحمد لله رب العلمین (1:1) قابل حمد و ستائش ربوبیت یہ نہیں کہ تم اپنی پرورش کر رہے ہو، وہ یہ کہ پوری نوع انسانی کی پرورش کا سامان کیا کر رہے ہو۔ عقل جہاں بھی آپ نے دیکھا کہ کیا کہہ گیا یہ شخص! اور اسی کو دوسری جگہ انہوںؒ نے کہا یہ تو پیام مشرق میں ہے، اور جاوید نامہ میں یہ کہا[1]

---

❶ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

عقل حود بیں غافل از بہبود غیر

وہ عقل جو انفرادی مفاد ہی کو دیکھی ہے، وہ دوسرے کے مفاد کو سوچ ہی نہیں سکتی، وہ اس سے غافل رہتی ہے

سود خور بیند نہ بیند سود غیر

ہر شخص اپنا فائدہ دیکھتا ہے، دوسرے کا فائدہ نہیں دیکھتا۔ اور

در نگاہش سود و بہبود وحی حق بینندۂ سود ہمہ

خدا کی وحی پوری انسانیت کا مفاد دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہ میں ہر ایک کا فائدہ اور بہبود ہوتا ہے۔ یہ ہوا فرق۔ کہا کہ یئو تی الحکمة من یشآء و من یئت الحکمة فقد او تی خیراً کثیراً (2:269)۔ عزیزان من! یہ ہے وہ حکمت: عقل جہاں بیں، جو سود و بہبود ہمہ دیکھتی ہے۔ شیطان عقل بے باک، جو صرف اس ایک فرد کے مفاد کا تحفظ سوچتا ہے یعنی انسان کے اپنے جذبات جو وحی سے سرکش ہو جائیں۔ یہ ہے وہ حکمت جو کہا کہ اس مقام پر تمہارے ذاتی جذبات تمہیں یہ کہیں گے۔ خدا کی دی ہوئی حکمت، رب العالمینی کو دنیا میں عملاً نافذ کرے گی، وہ تمہیں یہ بات کہے گی۔ دی ہوئی تو خدا کی ہے۔

وحی کے حقائق کو سمجھنے کیلئے اولوا الالباب کی صفت کا ہونا ضروری ہے

آپ دیکھتے ہیں آگے قران کیا کہتا ہے؟ کہا کہ و ما یذکر الا اولو االالباب (2:269) لیکن یہ بات بھی وہی سمجھ سکیں گے جو اپنی عقل سے کام لیں گے یعنی وہاں کے جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کو بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یونہی مان لو۔ کہا ہے کہ ان دلائل کو بھی اپنی عقل کی رو سے پرکھو لیکن یہاں عقل کے لیے لفظ اور ذرا حسین لیا ہے: الالبـــاب ''آلب لباب کیندے آں نا اسی، ایس بات والب لباب اے ہیگا[1]'' یہ ہے وہ جو ''لب'' ہوتا ہے ''پنجابی اچ جنوں کیندے تت کڈیا ہویا فلاں نی گل دا[2]'' یہ ہوتا ہے اولوا الالباب، وہ جو عقل کی گہرائیوں تک پہنچتے ہیں، سطحی چیز نہیں ہوتی۔ کیا چیز ہے؟ یہ ہے دلائل کا جواب دلائل سے۔ یہ دلائل جو وحی کی رو سے دو دیئے گئے ان کو سمجھنے کے لیے پھر عقل و فکر کی ضرورت ہے۔ کہا ہے کہ لقوم یتفکرون (10:24)۔ کہا یہ چیز ہے جو تمہیں اس چیز سے روک سکتی ہے۔ بات بڑی عمدہ چل رہی ہے، درمیان میں یہ کچھ کہا کہ و ما انفقتم من نفقة او نذرتم من نذر فان الله یعلمه (2:270) یاد رکھو! جو کچھ بھی تم یہ صرف کر آتے ہوئے یہ بیج کے دانے جو مٹی میں ملا آتے ہو، ان حالات میں جب کہ ابھی وہ نظام متشکل نہیں ہوا، اس کے لیے دیئے چلے جا رہے ہو، IN RETURN کچھ نہیں ملا رہا، یہ نہ سمجھو کہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔ یہاں بھی یہ جذبہ ہوتا ہے کہ کہیں سے چندے کی اپیل ہو ''آ میرے لکھ لینا جی[1]'' کیا ہوتا ہے یہ؟ اس کے علم میں یہ بات آ جائے کہ میں نے یہ دیا ہے، یہ

جذبہ ہوتا ہے یہ۔ عجیب چیز ہے قرآن کہتا ہے کہ فـان الـلـه یعلمه (2:270) یہ نہ کہو کہ یونہی گیا، کسی نے دیکھا نہیں، کسی کے علم میں نہیں آیا، ہمارے علم میں ہے، یاد رکھیے!

---

❶ ہم یہ جو''لب لباب'' کہتے ہیں، اس بات کا لب لباب یہ ہے۔

(2) جسے پنجابی میں کہتے ہیں ''یہ فلاں بات کا ملخص نکلا ہوتا ہے۔

نذر کرنا یا منتیں مانگنے کا مفہوم یا تصور قرآن حکیم کی روشنی میں

یہاں دو باتیں آئی ہیں: ما انفقتم من نفقة او نذرتم من نذر (2:270) جو کچھ تم خرچ کرے ہو (اور وہی لفظی ترجمہ جو ہوتا ہے) اور جو کچھ تم نذر کے طور کے اوپر دیتے ہو۔ اب پھر وہی ہمارے ہاں وقت آ گئی، عربی کا قرآن ہے اردو یا پنجابی میں ہم سمجھتے ہیں منت مانگنی، خدا کے لیے نذر، نہ بھی سمجھ آئے تو ہر روز گلبرگ میں تو کم، شہر میں تو اب بھی وہ آواز آتی ہے: نذر اللہ نیاز حسین۔ یہ نذر مانگتے ہیں۔ اب تو ہم وہاں سے بھی گر گئے وہ اللہ کی نذر تو کم ہوتی ہے، یہ قبروں پر جا کر مزاروں پر جا کر نذریں منتیں ہم مانتے ہیں۔ یہاں یہ چیز آئی کہ جو کچھ بھی تم صرف کرتے او نـذر تـم مـن نذر (2:270) جو کچھ تم اللہ کی منت مانتے ہو (اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے نذر کا) اللہ جانتا ہے۔ اب یہاں یہ چیز آ گئی کہ یہ جو نذر، جو یہ منت ماننا ہے ''صاحب! قرآن شریف اچ لکھیا ہویا اے[2]'' ٹھیک ہے پھر اردو کے تصور، پنجابی کے معنیٰ، کے اعتبار سے یہی چیز ہے لیکن قرآن میں یہ بات نہیں ہے۔

نذر ماننے والوں کی داستان بڑی عجیب ہوتی ہے

ہمارے تصور کے مطابق ہوتا کیا ہے، یہ بھی ہم نے کبھی کھڑے ہو کر سوچا؟ اگر مجھے اس کام میں اتنا فائدہ ہو گیا تو میں اللہ کی منت مانتا ہوں (میں ان کو مقبروں کو اور پیروں کو چھوڑ دیتا ہوں اللہ کی ہی سہی) کہ اگر یہ چیز یوں ہو گئی تو اس میں سے میں جو ہزار روپیہ ہے، اس کے نام پر دے دوں گا اگر یہ اس نے کر دیا تو پھر تو دیدوں گا۔ اگر نہ دیا تو پھر کیا ہو گا؟ ''فیر کاہدا''۔ یعنی جو ہم اس سے کام کرا رہے ہیں، اگر اس نے یہ کر دیا تو پہر میں یہ دوں گا۔ وہ بھی اسے مان لیتا ہے کہ اچھا جی! پھر دے دینا۔ اسے پتہ نہیں ہے (معاف رکھیے گا، عام بات کرنے کی) ہمارے ہاں ایک بڑی عمدہ نسل ہوتی تھی، انہوں نے اس قسم کی نذر کی بات صاف کر دی تھی، پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ یہ جو نذر ماننے والے ہیں، پھر وہ کرتے کیا ہیں؟ میراثی کا بیل گم ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ''یارہویں والے! اے بیل مل جاوئے ت میں یارہ روپیاں دی نیاز دیواں گا[1]''، ابھی نہیں مل رہا تھا، تلاش بھی کر رہا ہے ''اے ستارہویں والے! جے مل جائے، تے ستاراں روپیاں دی نیاز دیاں گا'' کسے دی اکو نجیا دادیاں، اک سوا ک دادیاں۔ منتاں مندا گیا، تے اک نے اوہنوں پوچھیا۔ کہن لگا: او تیرا بیل تے سارا ویہاں روپیہ داسی، اے

جنیاں تو منتاں من لیاں نے' آتے کوئی ڈیڑھ دوسو روپیہ بن گیا۔اے کرنا کی اے؟ کہن لگا: سنگی ہتھ پے جان دے ساریں نوں ڈوڈے دیاں گا[2] ''بیل مل جانے دؤ میں ان سب کو دے لوں گا؟ نذر کی یہ جو کیفیت تھی' اس کے لیے ہمارے ہاں یہ چیز تھی کہ ''وڈی چیرا ویدگی پہلے لئی اے رکھیا' وڈی رشوت'' یعنی وہ سیدھی سی بات ہے کہ رشوت کو اگر کام ہونے کے بعد تک ملتوی کر دیا جائے تو ہونے کے بعد کوئی نہیں دیتا ہے۔ چیرا' یہ جو کشتی ایک طرف سے دوسری میں جاتے ہیں تو وہ جو لیتے ہیں' اسے چرا گی بھی کہتے ہیں' چیرا بھی کہتے ہیں۔ یہ کشتی میں بیٹھنے کا' ریل کا ٹکٹ یا بس کا ٹکٹ ہے۔ یہاں سے جو بیٹھ گیا اور دیا نہیں' وہاں اگلے پار جو چلا گیا' وہاں اگلے پار جو چلا گیا' وہاں جا کے یہ نہیں دیتا تو کیا کر لو گے اس کا' وہ تو پار چلا گیا۔ ویدگی یعنی ڈاکٹر کی فیس پہلے لے لؤ کل کو جو اس مریض کا دم نکل گیا پھر کہاں سے لو گے یا اچھا ہو گیا تو اس کا کیا کر لو گے۔ یہ جو ساری چیزیں تھیں یہ عقل مندوں نے یہ کہا تھا کہ پہلے رکھا لیجیے۔ یہ جو نذر ہے ہمارے وہاں یہ ہوتی تو یہی چیز ہے۔

---

[1] یہ میرے لکھ لیجیے جناب!

(2) یہ قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔

نذر کرنا یعنی ہنگامی حالات میں رضا کارانہ طور پر وہ شے وہ عطیہ جواز خود دیا جاتا ہے

عزیزان من! یہ غور سے سننے کی چیز ہے ہمارے ہاں یہ چیزیں اتنی عام ہو گئی ہیں کہا ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں ہیں۔ جس نے بھی ہمارے ہاں اصلاح کی' اس کو بھی یہ سوجھا کہ صاحب! یہ قبروں پر' مقبروں پر جا کر جو نذر ہے یا منت مانی ہے یہ غلط ہے' خدا کے ہاں جو منت ماننا یا نذر دینا ہے' یہ بالکل صحیح چیز ہے کبھی نہیں سوچا کہ کیا یہ نذر اور منت ہے؟ اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں یہ کروں گا' نہ ہوا تو سوال ہی نہیں کہ وہ کروں۔ خدا کے ساتھ یہ معاملہ؟ وہ تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یوں کیا تو یہ ہو کر رہے گا۔ اس کے مطابق یہ کرنے سے یہ ہو کر رہے تو پھر یہ کہ میں تمہیں دوں گا' اگر تم نے ایسا نہ کیا' ایسا نہیں ہوگا۔ وہ سیدھی بات کرتا تو اس لیے کہ اس نے بیچ میں سے یہ نذرانہ لینا نہیں ہے۔ عزیزان من! نذر یہ نہیں ہے۔ یہ ہے کیا؟ بات تو یہیں صاف ہو گئی تھی' پہلے ما انفقتم من نفقة (2:270) جو کچھ تم مال و دولت میں ہے' وہ دو گے او نذرتم من نذر ا(2:270) یا نذر ہو گی۔ نذر میں ابھی سمجھا تا ہوں۔ پہلی چیز تو یہ صاف ہو گئی کہ یہاں یہ پیسے دھیلے کا معاملہ نہیں ہے۔ دیکھا کیسے بات صاف ہوتی ہے! کیونکہ وہ تو پہلے کہہ دیا کہ جو کچھ تم اس مال میں سے دو گے یا جو کچھ نذر تم اس طرح سے مانو گے۔ تو ہمارے ہاں تو نذر ہوتی ہی ساری پیسوں سے ہے' پہلی چیز یہ غلط ہے۔ اگلی چیز آپ یہ دیکھیے کہ نذر کہتے کس کو ہیں؟ ایک چیز تو یہ ہے کہ اتنی انکم (آمدنی) کے اوپر اتنا انکم ٹیکس دینا ضروری ہے' قانوناً واجب ہے۔ سیلاب آ جاتا ہے' کوئی حادثہ ہو جاتا ہے' جنگ ہو جاتی ہے' حکومت کی طرف سے اپیل ہوتی ہے کہ بھئی! اس کے لیے تم رضا کارانہ طور پر کیا عطیہ دے سکتے ہو؟ یہ جو واجبات

ہوتے ہیں' قانون کی رو سے جو دینا پڑتا ہے' اس کے علاوہ جو رضا کارانہ طور سے از خود دیا جاتا ہے' اسے صدقہ کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ صدقات آئے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو اس قسم کی ایمرجنسی کے وقت میں قانوناً تو وہ ضروری نہیں ہوتی ہیں' رضا کارانہ طور پر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بند ھ ٹوٹ گیا' سیلاب آرہا ہے' کچھ گاؤں میں ایسے متمول ہیں کہ جنہوں نے جھٹ سے کچھ روپیہ اکٹھا کیا اور اس کے لیے وہ کہیں سے ریت لائے' مٹی لائے' چونا لائے' اینٹیں لائے جو روپے سے کام ہوتا ہے۔ جن کے پاس یہ نہیں ہے' انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے کدال لیے' انہوں نے برچھے لیے' وہ بھاگے ہوئے آئے' انہوں نے مٹی کھودنی شروع کر دی' خود ٹوکریاں ڈھوئیں' جا کر ڈالنا شروع کر دیا۔ یہ وہاں کچھ اس قسم کی MANUAL LABOUR کرتے ہیں۔ ایک تو یہ یاد رکھیے کہ قانوناً یہ ان کے اوپر کوئی فرض نہیں تھا۔

لغت کے تحت نذر کا مفہوم عام حالات میں کسی خدمت کو از خود سر انجام دینا ہے

نذر کہتے ہیں اس چیز کو کہ جو قانوناً تو تمہارے اوپر فرض نہ ہو لیکن تم اپنے اوپر خود اس کو فرض قرار دے لو کہ ''میں یہ کروں گا''۔ ہمارے ہاں کی انجمنوں میں' خیراتی کاموں میں' وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! میں اپنی آمدنی کا اتنے فیصد ہر مہینے دیئے چلا جاؤں گا' یہ واجبات نہیں ہوتے' یہ SELF IMPOSED (خود عائد کردہ) ایک چیز ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے ہر وہ چیز کہ جو واجبات میں تو نہ ہو لیکن کسی آنے والے' یہ یاد رکھیے ''ن ذ ر'' اس کا مادہ ہے اس میں یہ پہلو ہوتا ہے' خطرے یا احتمال سے کوئی چیز ایسی کرنا کہ جو حکماً تو نہ کہی گئی ہو' لیکن وہ از خود اس کے لیے اپنے اوپر واجب کر لے کہ صاحب! میں یہ ڈیوٹی دوں گا۔ یہ جو ڈیوٹیاں ہمارے ہاں بٹ جاتی ہیں جی! میں یہ کروں گا' میں یہ کروں گا یہ جو ساری چیزیں ہیں یہ نذور کہلاتی ہیں' یہ نذر ہوتی ہیں۔ قرآن نے مومن کی صفت یہ بھی کہی ہے کہ انذرتم من نذر (2:270) وہ جو اپنے اوپر اس طرح سے چیز واجب قرار دے دیتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں' وہ اس کو بھی پورا کرتے ہیں لیکن یہ عام طور پر وہ چیز ہوتی ہے جو روپے پیسے کی شکل میں نہیں بلکہ عام خدمت کی شکل میں' محنت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسی لیے یہاں ما نفقتم من نفقة (2:270) کے بعد کہا کہ من نذرتم من نذر (2:270) اس کی دلیل قرآن کریم نے دی' منافقین کا ذکر ہے' وہ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ الذین یلمزون المطوعین من المئومنین فی الصدقٰت (9:79) جماعت مومنین میں سے جو ان کاموں کے لیے رضا کارانہ طور پر اتنا کچھ دیتے ہیں تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ان کے اوپر بھی کچھ الزام دھرتے ہیں' طنز کرتے ہیں' ان کی نیت پر شبہ کرتے ہیں' ان کے متعلق بھی عجیب عجیب سی باتیں کرتے ہیں کہ ہاں ہاں جی! تو یہ بات ہو گئی جس کے لیے یہ کر رہے ہیں۔ کہتا ہے کہ ان کے متعلق بھی یہ کرتے ہیں' دینے والوں کے متعلق و الذین لا یجدون (9:79) ہے لیکن وہ لوگ کہ جن کے پاس روپیہ پیسہ دینے کے لیے نہیں ہوتا الا جھدھم (9:79) لیکن وہ بے چارے اپنی محنت دے سکتے ہیں۔ وہ جب آتے ہیں تو ان کے متعلق فیسخرون منھم (9:79) یہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ لو بھئی! یہ آ گئے ہیں نظام قائم کرنے والے ''ٹوکریاں چکیاں ہو یاں[1]''۔ منافق کی کیفیت یہ ہے کہ دینے والوں پر الزام دھرتے ہیں کہ جی! پتہ نہیں کہاں سے یہ غیب سے آ گئے

جوسارے کچھ ہیں ''ٹھیک ہی جی اوہدے وچوں دیندے پئے نیں(1)''۔ یہ جو دوسرا طبقہ ہے جن کے پاس یہ دینے کے لیے نہیں لیکن وہ رضا کارانہ طور پر جھدھم اپنی محنت کو لے کر حاضر ہو گئے ہیں' ان کا یہ مذاق اڑاتے ہیں یہ قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہو گئی ما انفقتم من نفقة او نذرتم من نذر (2:270) جو کچھ تم پیسے کی رو سے اس کے لیے خرچ کر دیا جن کے پاس یہ نہیں ہے' وہ اپنی جہد دیں' اپنی کوششیں اپنی محنت' وہ اس چیز کو لے کر جو حاضر ہو جائیں' کچھ بھی ان میں سے جو کچھ تم کرو گے' اس نظام کے قیام کے لیے فان اللہ یعلمه (2:270) خدا اس کو جانتا ہے۔ اور یاد رکھیے و ما للظلمین من انصار (2:270)۔ یہاں لفظ ظلام عجیب آیا ہے۔ دینے کو تو اور بھی دیتے ہیں' کام بھی وہ کرتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے۔ ظلم میں نے عرض کیا تھا ''جس مقام پر کسی چیز کو ہونا چاہیے اس کا اس مقام پر نہ ہونا''۔ یہ عربی زبان کے اندر ظلم ہے۔ دیتے ہیں جس مقام کے اوپر یہ دینا چاہیے' وہاں نہیں دیتے جس مقصد کے لیے یہ دینا چاہیے وہ اس مقصد کے لیے نہیں دیتے' یہ ظالمین ہیں۔ یاد رکھیے! یہ وہ لوگ ہیں جو دیتے بھی ہیں لیکن آپ دیکھو گے کہ وہ جو میں نے پہلے کہا تھا کہ جس میں بیع نہیں ہے' جس میں دوستی کام نہیں آئے گی' جس میں سفارش کام نہیں آئے گی' من انصار کہا' اس قسم کے دینے والوں کا اس وقت کوئی دوست نہیں ہوا کرتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو پچھلی دفعہ میں نے عرض کی تھی کہ یہ لوگ وہاں قیامت میں کہیں گے جیسے ہم کہتے ہیں خدا کے ہاں سے اس کا اجر مانگیں گے کہ ہم نے بھی تو یہ کچھ دیا تھا۔ جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ اذهبتم طيبـاتـكـم مـن حيـاتـكـم الدنيا (46:20) تم نے اس کا بدلہ اپنی دنیا کی زندگی میں ہی لے لیا تھا' حاکم خوش ہونا پیدا ہو' EGO کی SATISFACTION (تسکین) ہو' جو بھی اس قسم کے تمہارے مطالبے تھے' خواہشات تھیں' معاوضے تھے' قرآن کہتا ہے تم یہ لے چکے ہوئے ہو۔ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے لیکن تم نے جو اس کی قیمت مانگی تھی' وہ تمہیں مل گئی تھی' اب تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں: و ما للظلمین من انصار (2:270)۔ برادران عزیز! سورۃ البقرۃ کی آیت 270 تک ہم آ گئے' 271 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

---

(1) اے گیارھویں والے! اگر یہ بیل مل جائے تو میں گیارہ روپے کی نیاز دوں گا۔

(2) اے ستارھویں والے! اگر مل گیا تو ستر روپے کی نیاز دوں گا۔ کسی سے کہا کہ اکیاون کی دونگا' ایک سو ایک کی دونگا' وہ نیازیں مانتا چلا گیا۔ ایک نے اس سے کہا کہ بھائی صاحب! تمہارا بیل تو صرف بیس روپے کا ہے۔ یہ جتنی تو نے منتیں مانگی ہیں وہ تو کوئی ڈیڑھ سو کی ہو گئی ہیں۔ یہ کیا کرتے ہو؟ وہ کہنگ لا کہ ذرا گردن ہاتھ آنے دو۔ پھر دیکھ کہ میں کس طرح سب کو جُل دے جاتا ہوں۔

(1) مزدوری کی ٹوکریاں جو اٹھائی ہوئیں۔

(1) ٹھیک ہے جی! یہ وہاں سے ادا کر رہے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

اٹھاونواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 271 تا 280)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا
تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ
مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۗ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا
سَلَفَ ۗ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ۗ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي
الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ
الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ
اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۗ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

عزیزان من! آج اگست 1969ء کی 24 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 271 سے ہو رہا ہے: (2:271)۔

ذات خداوندی اور مومن کے مابین مال و جان کی خرید و فروخت کے معاہدے کی نوعیت

سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ اس نظام نو کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں نے اس کے حق و صداقت کو تسلیم کر لیا ہے، وہ اسے قائم کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے خدا سے ایک معاہدہ کیا ہے کہ ہمارا مال اور جان دونوں ماسِ مقصد عظیم

اس دینے میں یاد رکھیے کہ یہ ابھی ابتدائی دور ہے‘ نظام اپنی آخری شکل میں متشکل نہیں ہوا کہ جہاں افراد دوسرے افراد کی براہ راست مدد نہیں کرتے بلکہ وہ نظام کے ذریعے سے مدد ہوتی ہے‘ ابتداوی صورت ہے‘ اس میں ضرورت مندوں کی مدد انفرادی طور پر کی جائے گی۔

ایسی مالی معاونت جو ہر آن دوسرے کیلئے ذہنی اذیت کا باعث بنی رہے وہ تو انسان کی اپنی ذات کیلئے زہر قاتل ہے

اس انفرادی طور پر مدد کرنے میں پہلی چیز یہ کہی گئی کہ جس کی مدد کی جائے گی‘ اس کے متعلق یہ نہ ذہن میں تصور آ جائے کہ ہم نے اس کے پور بڑا احسان کیا ہے اور پھر ساری عمر اس کو اس احسان کے بوجھ تلے دبائے رکھو اور یوں ایک مادی مدد تو اس کی کرو اور ذہنی طور پر اس کو ہمیشہ اذیت کے اندر رکھو۔ ایسا دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے اس نے کہا کہ ایسا دینے کے بجائے تو تم اگر یہ کہہ دیتے کہ بھئی! معاف کیجیے‘ وہ زیادہ بہتر تھا۔ مادی اور طبعی تنگ دستی یا تکلیف تو برداشت کی جا سکتی ہے مگر یہ جو ذہنی کوفت اور ذیت پہنچائی جاتی ہے‘ یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر یہ کہا کہ اس دینے میں یاد رکھو! یہ رئآء الناس (2:264) کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ دیکھتے ہیں یا نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک روپیہ دینے اور روپے سے کسی چیز کے خریدنے کا تعلق ہے‘ وہ تو بہر حال روپے کا وہی آئے گا حتیٰ کہ اگر آپ اپنی جائز حلال کمائی کے روپے سے کوئی چیز خریدیں گے‘ وہ بھی اتنی آئے گی‘ چوری کے مال سے خریدیں گے‘ رشوت کے مال سے خریدیں گے‘ چیز تو اتنی ہی آئے گی۔ یہ جو قرآن فرق کرتا چلا جاتا ہے‘ یہ اصل چیز ہے‘ جہاں سے زندگی کا ایک دوسرا نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ رئآء الناس (2:264) کے لیے بھی اگر کوئی شخص دیتا ہے ہزار روپے چندہ دیا‘ جیسا میں نے عرض کیا تھا‘ اس نے دس ہزار روپے کا دیا‘ اگر ایک بلاک بنا دیا ہے‘ کہیں رفاہ عامہ کے لیے وہ بن گیا ہے‘ اس میں یہ کام تو ہو رہا ہے‘ یہ چیز کونسی ہے جو نہیں ہوئی‘ جس سے روکا گیا ہے؟ قرآن بیک وقت دو کام کرتا ہے یہ جو مادی ضروریات ہیں وہ پوری کرتا ہے اور انسان کی ذات کی نشوونما کا سامان کیے چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے دینے کے لیے اسی لیے اس نے اپنے ہاں TERM (اصطلاح) ہی زکوٰۃ تجویز کی ہے‘ اس کے معنی ہی ''نشوونما پا جانا'' ہیں۔ جو کچھ دیا جاتا ہے مادی زندگی کے اعتبار سے‘ وہ چیزیں خریدی جا سکتی ہیں‘ بنائی جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے مادی اور طبعی ضرورت پوری ہوتی ہیں‘ اس کا زکوٰۃ اصل مقصد دینے والے کی ذات کی نشوونما ہے۔ جہاں ان کی پرورش کا سامان دیا جاتا ہے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہے جو عام طور پر جو نظام دنیا میں ہیں‘ اس سے قرآن کے نظام کو متمیز کرتا ہے۔ رئآء الناس (2:264) نہیں ہوگا حتیٰ کہ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ انہیں بدترین قسم کے مصلی قرار دیتا ہے: الذین ھم یرآؤن (107:6) کہ جو نمازیں بھی ان کی رئآء الناس (2:264) کے لیے ہوتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مثلاً نماز جو آدمی پڑھتا ہے‘ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے‘ جہاں کھڑا ہے‘ لوگ تو

اسے دیکھیں گے، جو کچھ یہ دے رہا ہے؛ ایسے مواقع آئیں گے؛ جہاں لوگ دیکھیں گے کہ اس نے اس راستے میں کچھ دیا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ خفیہ سازش ہو رہی ہے؛ اندر اندر کچھ ہو رہا ہے؛ بارہ کسی کو علم نہ ہو۔ یہ تو مواقع آئیں گے تو اب کیا یہ رئـــاء الـنـــاس (2:264) نہیں ہو جائے گا؟

قرآن حکیم کی تعلیم انسان کو نفسیاتی طور پر نہایت مخلص اور مضبوط شخصیت کی مالک بنا دیتی ہے

عزیزان من! دیکھیے قران کتنی باریکیوں تک جاتا ہے۔ وہاں پچھلی آیت میں رئـآء الـنـاس (2:264) سے روکا ہے اور یہاں یہ کہا کہ ان تبـدوا الـصدقٰت فنعماھی و ان تخفوھا و تؤتو ھا الفقرآء فھو خیر لکم (2:271) یہ کوئی بات نہیں ہے، تم جو کہو کہ صاحب! اس طرح سے، یوں دینے سے، دوسرے دیکھ لیتے ہیں، کیا کیا جاوے؟ ایسے مواقع تلاش کیے جائیں کہ صاحب! دیا اس طرح سے جائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو؟ اس نے کہا کہ یہ بات نہیں تھی جو رئـآء الناس کی کہی گئی تھی، ایسے مواقع ہیں جہاں کھلے بندوں تم نے کچھ دینا ہے۔ ٹھیک ہے اس میں دؤ یہ بھی بہت اچھی چیز ہے۔ ایسے مواقع ہیں جہاں تم نے اس طرح سے نہیں دینا ہے؛ اپنے طور کے اوپر اخفا کے طور پر دینا ہے؛ وہ بھی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ اس چیز کو فنـعـماھی (2:271) کہا ہے؛ کھلے طور پر جو دینا ہے تو رئاء میں اور اس میں کیا فرق ہوا؟ دل کی کیفیت کا فرق ہے۔ عام طور پر اعمال یکساں ہی ہوتے ہیں؛ جہاں فرق جا کر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے دل کی کیفیت کیا ہے، جسے ہم نیت کہتے ہیں۔ وہ قران نے کہا تھا کہ یہاں دینے والے وہاں پہنچ کر کہیں گے کہ اللہ میاں! یہ دوسروں نے بھی دیا تھا، اس کے بلدہ میں تو یہاں ان کو جنت مل رہی ہے، یہ آسائشیں مل رہی ہیں اور ہم نے بھی دیا تھا تو ہمیں تو یہ کچھ نہیں دیا جا رہا تو یہ کیا معنی ہیں؟ انہیں کہا گیا تھا کہ بھئی! اس لیے کہ تم نے جو دیا تھا، اس کے بدلے میں جو تم لینا چاہتے تھے، وہ تم نے وہاں لے لیا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہ ہے رئـآء الناس اپنے EGO کی SATISFACTION (تسکین) کے لیے، پندار نفس کی تسکین کے لیے، لوگوں میں POPULARITY WIN کرنے کے لیے، شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ جذبہ کیا ہے جس کے ماتحت آپ یہ کرتے ہیں، یہ تھی وہ چیز ورنہ اگر اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہاں جو چیز تمہارے پیسے سے بنتی تھی، وہ وہاں بن چکی تھی، وہ تو دونوں کے پیسوں سے بن جائے گی: رئـآء الناس (2:264) والے سے بھی اور جس نے اس جذبے سے دیا ہے۔ دونوں کے پیسے سے وہ چیز یکساں طور پر بن جائے گی۔ یہ کیا چیز تھی جو یہ انہوں نے وہاں لے لیا اور دوسروں نے یہاں نہیں لیا؟ کیسا عجیب فرق قرآن نے کیا ہے! تم نے وہاں لے لیا تھا، جو تم لینا چاہتے تھے۔ یہ وہیں جنہوں نے وہاں یہ نہیں لیا تھا۔ وہ کون تھے؟ جنہوں نے یہ کہا تھا کہ لا نرید منکم جزآء و لا شکوراً (76:9) ہم تم سے اس کا بدلہ لینا تو ایک طرف رہا، ہم شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ برداران عزیز! یہ ہے دل کی وہ وسعت، یہ ہے وہ چیز جسے للٰہیت

کہتے ہیں، جس میں صلہ اور تحسین کا جذبہ بھی نہیں ہوتا' اتنا معاوضہ بھی یہ نہیں لینا چاہتا' یہ ہے وہ چیز۔ یہ نہیں ہے کہ یوں کھلے بندوں نہیں دینا چاہیے' قرآن نے فرق کیا رئآء الناس میں اور کھلے بندوں دینے میں' فرق ہے دل کی کیفیت کے اوپر۔

قرآن حکیم کا پیش کردہ نظام دوسرے نظاموں سے متمیز کیونکہ ہے؟

عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو قرآن کے نظام کو دنیا کے دیگر نظاموں سے بالکل متمیز کر دیتی ہے۔ وہاں یہ شے یہ نہیں ہوتی' جذبہ محرکہ یہ نہیں ہوتا' یہ وہیں پیدا ہو سکتا ہے جو انسانی سات میں ایمان رکھے' اس کی نشوونما کو زندگی کا مقصد بنائے اور مرنے کے بعد کی جو زندگی ہے اس کے اوپر اپنا ایمان رکھنے والا ہو' یہ وہاں ہو سکتا ہے۔ اگر یہ چیزیں نہیں ہیں تو جذبہ محرکہ کچھ اور ہوگا' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے بنیادی فرق۔ اس لیے یہ نہ کہو کہ جس دینے کے اندر یہ ہو کہ صاحب! کوئی دوسرا دیکھ لیتا ہے وہ رئآء الناس (2:264) کے اندر آ جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ فنعما ھی (2:271) وہ بہت اچھا ہے یوں بھی وہ دوسروں میں تعریف ہوتی ہے' تم کوئی خفیہ کام' کوئی سازشیں نہیں کر رہے' کھلے بندوں دو۔ ایسا وقت ہے کہ تنہائی میں کسی کی انفرادی طور پر مدد کرنی ہے' وہ بھی کرو خیر لکم و یکفر عنکم من سیاتکم (2:271) اب یہ دیکھیے جو ناہمواریاں کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہیں' ان کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ یہ جن کی احتیاج کی وجہ سے ناہمواریاں پیدا ہوئی ہوئی ہیں' وہ ناہمواریاں دور کر دیجیے ھل جزآء الاحسان الا الاحسان (55:60)۔ یکفر عنکم من سیاتکم و اللہ بما تعلمون خبیر (2:271) بات یہ ہے ساری' یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو علم ہے یا نہیں' جو کچھ تم کرتے ہو' اسے اس کا علم ہے کہ جس نے یہ قوانین بنائے ہیں کہ ذات کی نشوونما کیسے ہوگی۔ اب سوال یہ سارا پیدا ہو گیا' دل کی کیفیت کا بدلنا اس کے اندر یہ چیز پیدا ہونا ہے ورنہ چندوں کی اپیل تو MATRIALISTIC WORLD (مادی دنیائے حیات) میں بھی ہوتی ہے خدا کے نہ ماننے والے جو ہیں' ان کے ہاں بھی یہ چیزیں ہوتی ہیں' دیتے بھی ہیں لوگ بہت بہت دیتے ہیں۔ یہ جواب فرق ہے' یہ کیسے پیدا ہوگا؟ یہ پیدا ہوگا خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کے تابع لیکن اس راہنمائی کی صورت کیا ہے؟

دوسروں تک ہدایت کا پہنچانا تو رسول کا فریضہ ہے لیکن انکے دلوں کو بدلان اس کے ذمہ نہیں

عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز آ رہی ہے۔ آپ اپیل کر سکتے ہیں لوگوں کو تحریص دلا سکتے ہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کی خاطر سے بھی کوئی یہ چیز کر دے دلوں کے اندر کی یہ کیفیت جو ہے وہ آپ نہیں بدل سکتے۔ اسے قرآن ہدایت سے تعبیر کرتا ہے اور اس لیے یہیں درمیان میں یعنی انفاق کی باتیں آ رہی ہیں' آگے بھی یہی کچھ آ رہا ہے' درمیان میں ایک ٹکڑا قرآن لے آتا ہے کس خوبصورتی سے لاتا ہے! دیکھیے اس کے اندر ربط کتنا ہے! وہ کہتا ہے کہ یہ جو فرق ہے' یہ کاہے ہے؟ کہا کہ لیس علیک ھداھم و لکن اللہ یھدی من یشآء

(2:272) رسول سے کہا جا رہا ہے یہ دل کی کیفیت کا بدلنا' یہ نیتوں اور ارادوں کا بدلنا تیرے اوپر یہ واجب نہیں ہے۔ اب یہاں بہت اہم بات شروع ہوتی ہے۔ ہدایت پہنچانے والا وہ ﷺ ہے کہ جس سے بڑھ کر ہدایت پہنچانے والا لال آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھا اور اس کے بعد تو سلسلہ نبوت ہی ختم ہو گیا' آئے گا ہی نہیں۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ لیس علیك هدٰهم (2:272) تیرے ذمہ کیا ہے؟ رسول کے ذمے کیا ہے؟ ما علی الرسول الا البلٰغ (5:99) رسول کے ذمے پہنچا دینا ہے۔ رسول تو کہتے ہی پیغامبر کو ہیں۔ اس کے ذمے پہنچا دینا ہے۔ اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں دیکھیے کس طرح واضح تر الفاظ میں کہا کہ انك لا تهدى من احببت (28:56) جسے تُو محبت بھی کرتا ہے' جس کے متعلق دل و جان سے چاہتا ہے کہ اس کے اندر کسی طرح یہ تبدیلی پیدا ہو جائے' نہ تیرے بس کی بات ہے' نہ تیرے ذمے یہ فریضہ عائد ہو گیا ہے کہ تُو دلوں کو بدل کر رکھ دے۔

ذہنی تبدیلی ہر بنی آدم کو خود کرنا ہو گی

تیرا فریضہ پہنچائے چلے جانا ہے۔ یہ دلوں کو بدلنے والی جو صورت ہے یعنی ہدایت پالینا' ہدایت کی بات پہنچا دینا' یہ تیرے ذمہ ہے اور پھر اس کو پالینا اس کے مطابق چلنا' تبدیلی پیدا کرنا' یہ جو چیز ہے یہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ ولٰكن الله يهدى من يشآء (2:272) جو اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا ہے' اس میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے مگر تُو نہیں کر سکتا۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ اور یہاں ہمارے ہاں جونہی یہ لوگ داروغہ ہے' لٹھ ہاتھ میں لیا' اب یہ سمجھ رہیں ہیں' ہمارا فریضہ ہے کہ یہ کر کے رہیں گے صاحب! اور رسول اللہ ﷺ سے قرآن کہہ رہا ہے' خدا کہہ رہا ہے کہ لا تهدى من احببت (28:56) تُو کر ہی نہیں سکتا من احببت کہا ہے قرآن تو کسی کو کتنا ہی عزیز کیوں نہ رکھے' کتنا ہی کیوں نہ چاہے' کتنی بھی محبت کسی سے کیوں نہ کرے' تُو نہیں کر سکتا ولٰكن الله يهدى من يشآء (2:272) جو خود اندر پیدا کرنا چاہتا ہے' اسی کے اندر یہ چیز' خدا کے قانون مشیت کے مطابق' پیدا ہو گی جو پیدا کرنا چاہتا ہے۔

من یشآء کا قرآنی مفہوم خدا کا قانون ہوتا ہے

میں یہاں پھر یہ عرض کر دوں کہ یہ من يشآء جو ہے' جس کے متعلق ہمارے ہاں اتنی بحثیں بھی چلتی ہیں اور اس کی وجہ سے اتنی غلط نگہی پیدا ہو جاتی ہے کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے' جسے وہ چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ من يشآء کے اس ایک ترجمے سے آپ دیکھیے' بات کہاں جا پہنچتی ہے؟ انسان نہ خود ہدایت حاصل کر سکتا ہے' رسول بھی نہیں کر سکتا' خدا جسے چاہے وہ کر سکتا ہے' جسے وہ چاہے ہدایت پر لا سکتا ہے' جسے وہ چاہے گمراہ کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ساری ذمہ داری انسان کی ہوتی ہے' جنت اور جہنم تو ہوتا ہی اس کے اوپر طے ہے جو غلط راستے پر چلتا ہے' اسے جہنم میں بھیج دیتا ہے۔ چلیے! جنت تو کہہ لیجیے کہ صاحب! انعام خداوندی ہے' یہ جہنم کی جو سزا ملی

رہی ہے یعنی یہ کیوں مل رہی ہے اگر خدا ہی نے اس کو غلط راستے کے اوپر لگا دیا۔ اور پھر (معاذ اللہ' معاذ اللہ) وہاں تو ابلیس اور خدا کا جو مکالمہ ہے' اس میں یہ چیز ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تُو کر کے دیکھ' میں دیکھ کس طرح ان کو غلط راستوں پر لگا تا ہوں۔ اور اگر یہ چیز خدا کی طرف منسوب کر دی جائے تو آپ دیکھیے بات کہاں جا پہنچتی ہے۔ من یشآء کا دھڑلے سے' ہمارے ہاں' ہر قرآن میں آپ دیکھیں گے' یہ ترجمہ کیا جاتا ہے' یہ چیز عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ''خدا چاہتا ہے''۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربی قاعدے کی رو سے بھی من یشآء کے معنی ہیں کہ ''جو لینا چاہتا ہے''۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے من یشآء کی ترکیب میں وہ معنی بھی جو جاتے ہیں کہ ''خود خدا کو فاعل قرار دیا جائے''۔ یہ معنی کیوں ہیں؟ ایک تو میں نے یہ عرض کر دیا کہ اگر یہ چیز ہو کہ انسان اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہے' خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تو اسکے اعمال کی ذمہ داری پھر اس کے اوپر قطعاً نہ رہی' پھر جزا و سزا کا سارا مسئلہ ختم ہو گیا اور سارا قران اس پر بھرا پڑا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ من یشآء کا ترجمہ یہ ہے کہ ''جو انسان چاہتا ہے' خود ایسا کرنا' اس کے لیے ایسا ہو جاتا ہے''۔ خدا کے لیے یہ چیز نہیں ہے' یہ ترجمہ نہیں کرنا چاہیے' میں یہ کہتا ہون کیوں؟ میں کون ہوں یہ کہنے والا؟ عزیزان من! قرآن یہ کہتا ہے۔ میں نے رزق کے معاملے میں آپ کو پچھلی دفعہ یا ایک دو درس پہلے یہ عرض کیا تھا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہے رزق دیدے' اس کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ یہ کفار کا قول ہے' وہ یہ بات کہتے ہیں۔

اپنی ذمہ داری خدا پر ڈالنا شیطان کا فعل ہے

اب یہ ہدایت کی بات آئی کہ خدا جسے چاہے ہدایت دیتا ہے' یہی چیز ہے کہ صاحب! یہ خدا جسے چاہے ہدایت دیدے جسے چاہے گمراہ کر دے ان کے مطابق من یشآء کا یہ ترجمہ ہے۔ کہا ہے کہ سیقول الذین اشر کوا (6:149) یہ لوگ جو مشرک ہیں' شرک کرنے والے ہیں' وہ یہ بات کہیں گے کہ لو شآء اللہ ما اشر کنا (6:149) اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک ہی نہ کرتے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ مشرکین کا قول ہے' وہ یہ بات کہتے ہیں۔ و لا اٰبائونا (6:149) نہ ہم شرک کرتے' نہ ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے لو شآء اللہ (6:149) اگر اللہ چاہتا تو۔ و لا حرمنا من شیء (6:149) نہ ہم ان چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ کہ کذلك کذب الذین من قبلھم (6:149) جس طرح سے یہ سچ کو جھٹلا رہے ہیں' ان سے جو پہلے تھے' وہ بھی اسی طرح سے سچ کو جھٹلایا کرتے تھے۔ حتیٰ ذاقوا باسنا (6:149) تا آنکہ ان کی گمراہی کے بدلہ میں' پھر ان کے اوپر ہمارا عذاب آ گیا۔ کہا کہ قل ان سے پوچھو' ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا (6:149) پہلی چیز تو یہ ہے کہ علم کی بنیادوں کے اوپر ہی آ کر تم بتاؤ تو سہی کہ یہ ہے قابل تسلیم بات جو تم یہ کہتے ہے یعنی خالص علم کی بنا کے اوپر۔ ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون (6:149) یہ

اپنی قیاس آرائیاں ہیں' ان کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں' چلے ہوئے ہیں' اندھیرے میں تیر لگا رہے ہیں' علم کے اوپر نہیں ہے' خدا کی طرف سے یہ بات نہیں ہے۔

اختیار وارادہ کی قوت ہی انسان اور حیوان میں تمیز پیدا کرتی ہے

خدا کی طرف سے قل فلله الحجة البالغة (6:150) ہم یہ ایک ایسی دلیل دیتے ہیں' جو بالکل نشانے پر جا کر لگ جائے۔ سنیے! دلیل کیا ہے؟ اگر یہ ہو کہ خدا چاہتا تو ہدایت پر لے آتا تو کیا خدا یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ جو ہم نے پیدا کیے ہیں' یہ سارے گمراہ رہیں یا ان میں سے اکثریت گمراہی اختیار کرے۔ اگر ہمارے چاہنے پر ہوتا فلو شآء لھدٰکم اجمعین (6:150) ہمارے چاہنے پر ہوتا تو ہم پیدا ہی تمہیں ایسا کرتے کہ غلطی پر چل ہی نہ سکتے۔ محض یہ چیز کہ انسان غلطی کے اوپر چل سکتا ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا نہیں یہ چیز کہ اس کی مشیت ہو جسے وہ چاہے وہ چلا دے۔ دیکھا یہ الحجة البالغة (6:150) کیا قرآن کہتا ہے؟ نشانے پر لگنے والا تیر' دل میں اتر جانے والی دلیل: کیا مشکل تھا ہماری مشیت میں اگر ہم یہ چاہتے کہ انسان غلط راستے پر چلتے ہی نہیں سارے حیوانات جتنے بھی دنیا میں باقی ہیں انسان کے علاوہ' ان کے متعلق ہم نے کیا ہی یہ ہے کہ جس راستے پر چلنا مقصود تھا' اس کے اوپر وہ چلنے پر مجبور ہیں۔ (حجت بالغہ)۔ اسی کو قرآن نے دہرایا ہے کہ وقالوا لو شآء الرحمٰن ما عبدنٰھم (43:20) یہ مشرکین کہتے ہیں کہ ہم جو بتوں کو پوجتے ہیں' اگر خدا کی مشیت ہوتی' اگر اللہ یہ ایسا چاہتا' ہم کبھی بھی ان کی عبادت نہ کرتے۔ مالھم بذٰلك من علم (43:20) وہی بات ہو گئی' علم کی بارگاہ میں بھی اگر یہ اس چیز کو لے جاویں' وہاں سے بھی ان کی تردید ہو کہ بالکل غلط چیز ہے۔ انھم الا یخرصون (43:20) وہی چیز ہے کہ اپنی قیاس آرائیں کی گمراہیوں کے اندر پھر رہے ہیں۔ ام اٰتینٰھم کتباً من قبلہ فھم بہ مستمسکون (43:21) یا اس سے پیشتر کوئی آسمانی کتاب ایسی تھی' جس میں ایسا کچھ لکھا ہوا تھا۔ یعنی یہی نہیں کہ قران میں یہ بات ہم نے کہی ہے' وحی کی رو سے اس سے پیشتر بھی کبھی یہ بات نہیں کہی گئی کہ جسے چاہیں ہم ہدایت پر لے آئیں' جسے چاہیں ہم گمراہ کر دیں۔

تقلید پرستی انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے

بات کیا ہے؟ بل کانوا انا وجدنا اٰبآئنا علٰی امة وانا علٰی اٰثرھم مھتدون (43:22) بات یہ ہے کہ اسلام جس طریقے پر چلتے جا رہے' اسی طریقے کے اوپر خود چلتے جا رہے ہیں' ہم کہتے یہ ہیں کہ ہم اسلاف کے راستے سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتے۔ جب ثابت کیا جائے کہ یہ جو راستہ ہے' یہ تو غلط ہے' وہ کہتے ہیں کہ اچھا! اگر صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اللہ چلا دیتا' ہم اس کے ذمہ دار ہی نہیں ہیں۔ آباؤ اجداد کی تقلید' سلف کا اتباع کہتا ہے' یہ ہے اس کی وجہ۔ محبت تو ان کی دل میں ہے اور کہتے یہ ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم صحیح

راستے کے اوپر ہوتے۔ کتنی بڑی چیز قرآن کہہ گیا ہے! میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو چیز ہے ولٰکن اللہ یھدی من یشآء (2:272) قرآن میں، یہ الفاظ یہ من یشآء کی ترکیب اکثر مقامات پر آتی ہے۔ میں نے اسی لیے قران کی آیات آپ کو دے دی ہیں، جن میں اس نے کہا ہے کہ یہ مفہوم دینا کہ اللہ چاہتا تو صحیح راستے پر ہوتے، یہ مشرکین کا قول ہے، یہ کفار کا قول ہے اس کے لیے علم نہیں، کسی آسمانی کتاب میں یہ بات نہیں کہی گئی۔ اس لیے ان کے معنی جہاں آئیں گے وہ یہی ہوگا کہ ''ان کو ہدایت پہچا سکتا ہے، تُو ہدایت کے راستے پر نہیں لگا سکتا، اس پر وہی لگے گا جو لگنا چاہے گا، جو لگنا ہی نہ چاہے اس کو کوئی بھی نہیں لا سکتا''۔ تو یہ جو چیز کہی گئی ہے کہ اس دینے میں جذبہ محرکہ کونسا ہنا چاہیئے، وہ ہے دل کے اندر تبدیلی اور دل کے اندر تبدیلی نہ تو خدا انسان کو مجبور پیدا کرتا ہے نہ رسول مجبوراً یہ کرسکتا ہے، یہ تو خود انسان جو چاہے تو اس کے اندر یہ تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے دوسرا نہیں کرسکتا۔

انسان کے لئے صرف وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ خود کوشش کرتا ہے کسی کی صحت دوسرے کو منتقل نہیں ہوتی

عزیزانِ من! درمیان میں یہ ٹکڑا قرآن لے کر آ گیا۔ و ما تنفقوا من خیر فلانفسکم (2:272)۔ کتنی بڑی چیز ہے؟ یہ جتنی بھی چیز تم اس طرح بھلائی کی کرتے ہو، وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے۔ اب جو فیصلہ کرلے کہ میں نے اپنی ذات کی نشوونما کے لیے یہ کرنا ہے، وہ تو اس راستے پر چلے گا جو انسانی ذات میں بھی RELIEVE نہیں کرتا، اس کی نشوونما میں BELIEVE نہیں کرتا، ان اصولوں میں BELIEVE نہیں کرتا، اس کے لیے یہ سوال ہی نہیں ہے فلانفسکم (2:272)۔ اور فلانفسکم (2:272) میں عزیزانِ من! دیکھ لیجیے من خیر (2:272) ہر قسم کی بھلائی آتی ہے۔ یہ جو ہم اپنی نیکیوں کا ثواب منتقل کرتے رہتے ہیں قرآن کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ یہ چیزیں انتقال کے قابل ہی نہیں ہیں، یہ چیزیں TRANSFERABLE (قابل انتقال) نہیں ہیں۔ آپ اپنی صحت اپنے عزیز ترین بھائی اور بیٹے کو بھی نہیں دے سکتے، اسے اپنی صحت کے لیے آپ ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ GUIDANCE (راہنمائی) کرسکتے ہیں پابندیاں لگا سکتے ہیں، یہ کچھ تو ہے، آپ اپنی صحت منتقل نہیں کرسکتے۔ فلانفسکم (2:272) جو پرہیز کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔

نوعِ انسانی کی فلاح کیلئے پروگرام کی تشکیل اپنی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے

وما تنفقوا من خیر فلانفسکم وماتنفقون الا ابتغآء وجہ اللہ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لاتظلمون (2:273) یہ یاد رکھیے! یہ جو کھلا رکھنا ہے، یہ جو مال کو دینا ہے، یہ کاہے کے لیے ہے؟ اس پروگرام کی تکمیل کے لیے جو خدا نے متعین کیا ہے۔ عجیب چیز قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ وجہ اللہ (2:272) جو کہتا ہے وجہ طریق ہوتا ہے، وہ راستے ہوتا ہے جو

منزل کی طرف لے جانے والا ہو۔ جسے ہم کہتے ہیں محض خدا کے لیے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں: ''اپنے کسی ذاتی مفاع کے لیے نہیں' ذاتی عزت نفس کے لیے بھی نہیں' بلکہ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو خدا نے نوع انسانی کی فلاح کے لیے متعین کیے ہیں''۔ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم (2:272) اور یہ یاد رکھو' شروع میں جو بات آئی تھی' کسان والی بات تھی' جو کچھ بھی تم صرف کرتے ہو' وہ پورے کا پورا تمہیں واپس ملتا ہے۔ پورا ہی نہیں' وہاں تو کہا تھا کہ سات سات گنا ہوتا ہے۔ وانتم لا تظلمون (2:272) یہ بات تو یقین میں رکھیے کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی' کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی' جسے ہم لے کر نہیں کھا جائے گے کہتے ہیں لیکن یہ چیز کہ ہے کہ اس کا ایمان ہونا چاہیے کہ یہاں صرف کیا ہوا اس طرح سے لوٹ کر ملے گا۔

نظام کو بدلنے کی بجائے گداگروں کو پالنے کا رواج مزید برباد کر دے گا

عزیزان من! لوٹ کر تو اس نظام کے ذریعے سے لگتا ہے جو آپ اس طرح سے متشکل کرتے ہیں ورنہ غلط نظام کے اندر آپ جو اس طرح سے گداگروں کو دیتے چلے جاتے ہیں' وہ تو آپ کو لوٹ کر ملنا تو اے طرف رہا' ان کی حالت کبھی بہتر نہیں بنا سکتا۔ ہزاروں سال سے آپ کے ہاں انفرادی گداگری کی خیرات آپ کرتے چلے آ رہے ہیں' ہر شہر میں' ہر قریہ میں گداگروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ عبوری دور کے لیے تھوڑے سے وقت کے لیے تو یہ چیز ہے جب تک نظام متشکل نہ ہو' مستقل طور پر غلط نظام کے اندر انفرادی طور پر گداگروں کے متعلق یہ کرتے چلے جانا' گداگری کو تقویت دینے کے متراد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہاں کہا ہے کہ یاد رکھو! ہم نے جو کہا ہے کہ تم فقرا کو اگر خفیہ طور پر بھی کچھ دیدو تو اچھا ہے تو اب ذہن میں یہ آ گیا کہ ''جی قرآن کیدا اے فقریاں نوں دیا کرو[1]''۔ اب وہ جو فقیر ہیں' وہ اپنے ذہن میں ہم نے یہ بنا لیا' یہ جو پھرتے ہیں بھیک منگے۔

---

1. قرآن کریم کہتا ہے کہ فقیروں کو دیا کرو۔

قرآن حکیم نے فقرا کن کو کہا ہے اور ان کی پہچان کیا ہے؟

آپ' عزیزان من! بات سمجھے نہیں۔ للفقرآء الذین (2:273) آؤ ہم تمہیں بتائیں فقرا کن کو کہتے ہیں؟ پہلی چیز تو فقیر کے متعلق میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم کے الفاظ میں جائیے تو معلوم ہوتا ہے قرآن کیا کہہ جاتا ہے؟ یہ کونسے لوگ ہیں جن کو ضرورت پڑ گئی ہے؟ فقیر کہتے ہیں ''تازہ پودا'' جو آپ کہیں لگاتے ہیں اب تازہ پودے کی جڑیں اتنی لمبی نہیں ہوتیں کہ وہ دور تک پہنچ کر خود اپنے لیے سامان نشو و نما حاصل کر لیں وہ پابہ گل ہو جاتا ہے۔ اس کے گرد آپ ایک کھالا بناتے ہیں' اس میں آپ خاط طور پر پانی ڈالتے ہیں' نئے پودوں کے اگر الگ کھالے بناتے ہیں' آپ ان میں الگ پانی دیتے ہیں۔ باقیوں کے مقابلے میں یہ جو (مثلاً) جامن کھڑا ہے اس کے

لیے یہ ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا سامان خود حاصل کر لیتا ہے۔ یہ جو نیا پودا ہے' جو اپنا سامان حاصل نہیں کرتا' لیکن نشوونما کی اس میں صلاحیت ہے' اس کو اس کی ضرورت ہے کہ آپ خارجی طور پر اس کھڑے ہوئے پابہ گل کی کچھ مدد کریں۔ فقیر کہتے ہیں "اس کھالے کے جو اس پودے کے گرد کھودا جاتا ہے"۔ نشوونما کی صلاحیت ہے' حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ یہ پابہ گل ہو گیا ہے' خود ادھر ادھر سے اپنے لیے سامان حاصل کرنے کے CHANCES نہیں ہیں' مواقع نہیں ہیں' حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں' یہ ہیں وہ لوگ للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللہ (2:273) جو اس نظام کے کسی معاملے میں' کسی پروگرام کے سلسلے میں' کسی ایک مقام پر گھیر لیے گئے ہیں۔ لا یستطیعون ضربا فی الارض (2:273) وہاں سے نکل بھی نہ سکتے۔ دیکھا! یہ چھوٹے پودے کی اور فقیر کی مثال کتنی برجستہ ہے۔ جسے میں نے کہا تھا کہ پابہ گل ہو جائے' اتنی ابھی توانائی نہ ہو جائے کہ اپنی جڑوں کو پھیلا کر دور دور سے یہ چیزیں لے جائے' قرآن کہا ہے احصروا گھیر لیے جائیں لا یستطیعون ضربا فی الارض (2:273) جا بھی کہیں نہ سکیں۔ کیفیت کیا ہو؟ کیا بات ہے ان فقرا کی! ہزار تو نگریاں ان کے اوپر نثار ہیں۔ کہا ہے کہ یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف (2:273) وہ جو ان کا اپنے اوپر SELF CONTROL ہے' اس سے کیفیت یہ ہے کہ یہ جو دوسرے لوگ ہیں' جاہل ناواقف' جو ان سے ناواقف ہیں' وہ ان کو سمجھتے ہیں کہ نہیں' یہ تو بڑے مال دار لوگ ہیں۔ من التعفف حاجت اور ضرورت کے باوجود تھڑ دلا نہ ہونا' اتنا SELF CONTROL ہو کہ کسی دوسرے کو محسوس نہ ہو سکے۔ برادران عزیز! فقرا کی DEFINITION (تعریف) آپ دیکھیے۔ تعرفھم بسیمٰھم (2:273) صرف وہ دور بین نگاہیں جو آثر اضطراراً نمودار ہو جاتے ہیں' چہرے کے اوپر ضرورت کے اور پریشانی کے اور بھوک کے' ان سے وہ پہچان لے کہ ان کو ضرورت ہے۔ لا یسئلون الناس الحاقاً (2:273) لپٹ لپٹ کر مانگنے والے نہیں۔ یہ ہیں وہ فقرا جن کے لیے کہا گیا ہے کہ انہیں دو۔ ما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم (2:273) یہ ہے وہ جہاں تم دو گے' ہم لکھیں' وہ حساب تمہارا' ہم اس کے بدلے میں تمہیں دیں گے' اس سے بہت زیادہ' سات سات گنا۔

کیا انسان کا دوسروں کے ساتھ اس حسن عمل کا اجر قیامت تک اٹھا رکھا جائے گا

یہ ہیں وہ لوگ جو تمہاری مدد کے محتاج ہیں۔ اس سے یہ ایک گداگروں کا مستقبل گروہ آپ CREATE نہیں کرتے' یہ تو CIRCUMSTANCES (حالات) کے اندر گھرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں' اور اپنا کیریکٹر اتنا بلند ہوتا ہے کہ کسی کو محسوس تک نہیں ہونے دیتے کہ ہم صاحب احتیاج ہیں۔ یہ دینے والے وہ لوگ ہیں الذین ینفقون اموالھم بالیل والنھار سراً و علانیةً فلھم اجرھم عند ربھم (2:274) جو یوں دیتے ہیں سراً و علانیةً پھر وہی ضرورتاً ظاہرہ طور پر بھی' عندالضرورت خفیہ طور پر

بھی' یہ دینے والے جو ہیں' دن رات دینے والے' ان کا اجران کے خدا کے ہاں ہے۔ بہت اچھا جی! کیا یہ اجر صرف قیامت کے اندر ہی ہو گا؟ وہیں ہے یہ اجر؟ اس اجر پر تو ہمارا ایمان ہے کہ ہوگا۔ وہیں نہیں یہاں بھی' کیفیت ان کی کیا ہوگی؟ غور سے سننے کی چیز ہے۔ کیا چیز ہے جو ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ہو؟ سب سے بڑی جو چیز ہے' وہ یہ ہے کہ ہمیں کسی قسم کا خوف نہ ہو' ہمیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں کیا ہوگا؟ کہا کہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون (2:274) نہ خارج سے کسی قسم کا خوف' نہ دل کے اندر سے اٹھنے والی افسردگی اور پریشانی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ انفرادی زندگی میں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کو خوف نہ ہو۔ یہ جو خوف کا انتظام ہے وہ تو صرف آپ کے ہاں کی نظام کی زندگی ہے۔

زندگی میں کسی قسم کا خوف وحزن کا نہ ہونا تو سب سے بڑا اجر ہے لیکن یہ انفرادی طور پر ممکن نہیں

خوف تو وہ خوف تھا جو 6 ستمبر (1965ء) کی صبح کو آپ کے ہاں لاہور میں یہاں جو میں بار بار دہرایا کرتا ہوں اور بار بار اسے دہرانا چاہیے کہ خوف تو وہ خوف تھا کہ ان یورش کرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ ہمارے کان میں آتی تھی تو اس طرح سے دل دہل جاتے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگلے ہی ثانیہ پر کیا ہونے والا ہے۔ انفرادی طور پر ہم اس کا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس خوف سے بے خوفی کیسے پیدا ہوئی تھی؟ اسی 6 ستمبر 1965ء کی دوپہر کو فضا کے اندر ایک للکار ہوئی تھی' جس نے یہ چیز کہہ دی تھی کہ مت خوف کھاؤ' آپ کے مجاہدین کی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار' نہر کے کنارے پر کھڑی ہوگئی ہے' جب تک وہ زندہ ہیں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوسکتا۔ لا خوف علیھم (2:274) اس نے آواز دی' و لا ھم یحزنون (2:274) ہمارے قلوب کو تسکین حاصل ہوگئی۔ سترہ دن تک ہم نے اس جنگ کو یوں دیکھا' جیسے کوؤں کا تماشا دیکھا کرتے ہیں' و لا ھم یحزنون کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ عزیزان من! انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ ایک نظام تھا' اس کا کرم تھا' اس کا احسان تھا کہ اس سے پیشتر یہ خطہ زمین ملا' اس کا احسان تھا کہ اس کے اندر فوجی عسکری تقویت کا ایسا نظام ہمیں مل گیا۔ یہ ان جان دینے والوں کا احسان تھا کہ جو اس وقت للکار کر وہاں جا کر کھڑے ہوگئے حالانکہ نظر آتا تھا کہ وہاں سے بچ کر نہیں آسکتے' تم جیو ہمارا کیا ہے' ہم جانیں دیدیں گے۔ عزیزان من! یہ نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سارا کچھ کہا کہ یاد رکھو! جب امن کا زمانہ ہے' اس وقت یہ باندھ باندھ کر نہ رکھو' خرچ کرو' اس راستے میں خرچ کرو' اس نظام کی تقویت کے راستے میں خرچ کرو تاکہ انجام کار یہ کیفیت ہو کہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون (2:274) ایک خرچ کرنا دوسرے کو دینا' یہ تھا۔

دوسروں کے ساتھ تعاون کا ایک دوسرا رخ جس کا نتیجہ خدا اور اس کے رسول کی خلاف جنگ ہے

عزیزان من! یہاں سے اب دوسرا رخ آتا ہے' یہاں بھی دینے والے سامنے آتے ہیں۔ یہ دینا کیا ہے؟ اسے قرآن کریم نے الربو

کہا ہے۔ضرورت مند مدد کے لیے آتا ہے' وہ کچھ مانگتا ہے' اس کی ضرورت پورا کرنے کے لیے آپ دیتے ہیں (مثلاً) سو روپیہ دیتے ہیں۔اس سے کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو روپیہ واپس دینا ہوگا۔ایک دینا یہ تھا کہ جس کے صلے میں آپ نہ معاوضہ چاہتے ہیں' نہ ستائش چاہتے ہیں' نہ شکریہ چاہتے ہیں۔ایک دینا وہ ہے۔عزیزان من! یہ چیز بڑے غور سے سننے کی ہے۔مسئلہ سود کا آ گیا' اس لفظ سے بات کی اہمیت سامنے آئے گی' ربٰـــو کا تو لفظ ہی ہمارے ہاں استعمال نہیں ہو رہا۔ان ترجموں نے ہی تو ہمارا ستیاناس کیا۔سود کا مسئلہ آ گیا۔دینا یہ بھی ہے' مدد یہ بھی ہو رہی ہے' آپ اس کی ضرورت پوری کر رہے ہیں' ایک وہ دینا ہے' ایک یہ دینا ہے۔اس دینے کے متعلق تو قرآن نے خدا کے راستے میں دینا۔کہا: لا خوف علیهم و لا هم یحزنون (2:274)۔یہ جو دینا ہے یہ اس قسم کا ہے اس کے متعلق پتہ ہے کہ کیا کہا ہے؟ یہیں چار آیتیں آگے بات آجائے گی (2:279) ابھی آتی ہے۔فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله و رسوله (2:279) ایسا کرنے والوں کو اعلان کر دو کہ اگر اس سے باز نہیں آؤ گے تو یہ خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہوگا۔برادران عزیز! بڑی عظیم چیز کوئی ہوگی' یہ بہت بڑی انقلابی چیز آ گئی ہے۔قرآن میں کوئی اور ایسی چیز نہیں جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ ایسا کرنے والوں سے کہہ دو کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے' صرف مملکت کے خلاف اعلانیہ بغاوت کرنے والے جو ہیں' ان کے متعلق تو یہ چیز ہے' وہ تو اعلانیہ بغاوت کرتے ہیں' وہ تو جنگ ہے۔یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق ذہن میں ہی نہیں آتا کہ یہ کوئی اتنا بڑا جرم ہے جسے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اس روش سے باز آ جاویں اگر باز نہیں آتے تو خدا اور رسول کی طرف سے ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

ایک نظام کے بالمقابل دوسرا نظام اور انکے بنیادی خدوخال کی وضاحت

عزیزان من! یہ کیا چیز ہو گی؟ یہ اتنا بڑا جرم ہو گیا اس سے بڑی بغاوت کوئی نہیں۔اسلام' دین کہیے' خدا کی راہنمائی نبی اکرم ﷺ والذین معہٗ کی تمام مسلسل جدوجہد' یہ ساری کی ساری ایک ایسا نظام قائم کرنے کے لیے تھی جس میں تمام افراد انسانیہ کی پرورش کا سامان بلا مزدور معاوضہ' بلا جذبہ تحسین وصلہ اور شکریئے کے ہوتا چلا جائے۔اس قسم کا نظام کا قائم کرنا' جس میں انسان کی عزت نفس قائم ہو' ضرورمند کی جو ضرورتیں ہیں افراد کی طرف سے نہیں' وہ نظام کی طرف سے پوری ہوتی چلی جائیں۔یہ نظام قائم کرنا اسلام کی بنیادی اصول ہے دین کا مقصد یہ ہے۔خدا کی حمد بھی اس لیے ہے کہ الحمد الله رب العلمین (1:1) کہ وہ ربوبیت علمینی کرتا ہے۔

ربو کا معاشی نظام جس کی بنیاد فاضلہ دولت پر ہوتی ہے

برادران عزیز! اسلام کا مقصد یہ ہے۔اور اس کے برعکس ایک نظام وہ ہے جو ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتا ہے تو اس کے معاوضے میں اس کی منت میں سے چھین کر لے جاتا ہے۔یہ جو اس کے اوپر اس نے زائد لیا ہے' یہ کیا ہے؟ اس بیچارے نے محنت کر کے

کچھ کمایا ہے۔ دو متضاد نظام ہو گئے: ایک نظام وہ ہے کہ جس میں محنت کرنے کی سکت نہیں رہی ہے' یہ بھی اتفاق سے نہیں رہی ہے' اس کی بھی نشو و نما اسی طرح سے ہو رہی ہے' احترام انسانیت کے اوپر بھی ٹھیس نہیں آنے دی جا رہی۔ اس کے بالکل متضاد ایک نظام وہ ہے کہ جس میں دوسرے کو محتاج بنایا جاتا ہے تاکہ وہ آپ کے پاس آئے۔ میں نظام کہہ رہا ہوں۔ وہ CAPITAL ECONOMIC SYSTEM جس کے اندر چند افراد کو کھلی چھٹی دی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیں۔ جتنا وہ زیادہ سمیٹیں گے' وہ سمیٹنا آسمان سے تو اترے گا نہیں' معاشرے کے اندر جو دولت ہے' وہی ہے جو وہ لیے جائیں گے' اس لیے سمیٹ لیے جانے کا فطری نتیجہ ہو گا کہ بہت سے لوگ ہوں گے جن کے پاس نہیں رہے گا۔ یہ جو احتیاج ہے' یہ غلط معاشرے کا نتیجہ ہے' غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہے کہ ایک کے ہاتھوں سے چھن جاتا ہے۔ اس سے پہلے چھین لیا جاتا ہے' چھیننے کے بعد وہ ضرورت کے لیے آتے ہیں' ان کی ضرورت پوری کی جاتی ہے اور اس کے بعد وہ جو محنت کر کے پھر کماتا ہے' اس محنت کا جو ماحصل ہے' اس کو چھین لیا جاتا ہے' محتاج سے محتاج تر بنا دیا جاتا ہے۔ عزیزان من! ایک دفعہ قرض لے لینے والا' ساری عمر سر ہی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ بالکل متضاد معاشی نظام ہے' اسے نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ الربٰو کے معنی ہی نظام سرمایہ داری ہے۔ کہیں گے کہ صاحب! بہت BOLD ہے جو چیز تم نے کہہ دی ہے۔ یہ BOLD نہیں ہے۔ بات ذرا گہری چلی جائے گی لیکن بڑی اہم ہے اس لیے ضرورت ہے کہ گہرائی میں جایا جائے۔ روپیہ شے کیا ہے؟ پہلے زمانے میں بارٹر سسٹم ہوتا تھا' گاؤں کے اندر' زمیندار نے گیہوں پیدا کیا' وہیں گاؤں کے اندر کمہار بیٹھا ہوتا تھا' اس نے اس کے لیے برتن بنائے' زمیندار کو برتن کی ضرورت ہے' کمہار کو روٹی چاہیے' وہ اس سے برتن لے گیا' اس نے اس سے گیہوں لے لیے۔ ضرورتیں پوری ہوتی تھیں' نظام یہ تھا' بڑا ٹھیک نظام تھا' چلا جا رہا تھا۔ جب ذرا آبادیاں پھیلیں تو یہ مشکل ہو گیا کہ یہاں سے یہ گیہوں سر پر اٹھا کر دس میل کے فاصلے پر لے جائے یا بیس میل کے فاصلے پر' وہاں سے وہ برتن اٹھا کر لے آئے یا دوسری ضرورت کی چیز۔ اس سہولت کے لیے یہ COIN یا سکہ جسے کہتے ہیں' کی ایجاد ہوئی کہ یہ نہ اٹھا کر لے جانا پڑے' ایک سمبل ایک نشان ہو' وہ اس کو دے دیا جائے کہ بھئی! یہ چیز تم تو برتن دے دو جس کو یہ دکھاؤ گے وہ تمہیں اتنی گیہوں دے دیگا جتنی گیہوں میں نے لا کر تمہیں دینی تھی۔ یہ ہے اس سکے کی ساری کہانی اس لیے یہ وجود میں آیا تھا۔ اگر یہ ایک جگہ ڈھیروں پڑا ہوا ہے یہ کچھ اگا نہیں سکتا' یہ خود بخود زیادہ نہیں ہو سکتا۔ سو روپیہ کہیں رکھ چھوڑ یئے دس سال کے بعد بھی گنیے' سو کا سو ہی ہو گا' اگر کوئی لے نہیں گیا تو۔ اس میں سے خود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس روپے کو اکٹھا کر کے یہ ایسی شکل دے دینا کہ یہ آپ کا سو کچھ عرصے کے بعد ڈیڑھ سو بن جائے' یعنی آپ اسی طرح بیٹھے رہیں' آپ کچھ نہ کریں' آپ کا سو ڈیڑھ سو بن جائے' اسے نظام سرمایہ داری کہتے ہیں کہ سرمایہ خود اپنا اضافہ کرتا چلا جائے۔ معاوضہ کس چیز کا ملنا چاہیے؟ قرآن نے کہا ہے لیس للانسان الا ما سعٰی (53:39) معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ جس نظام میں LABOUR جو ہے' وہ معاوضے کی چیز نہیں ٹھہرے' معیار معاوضہ جو ہے یا بڑھوتی جو ہے' وہ

کیپیٹل ہو جائے' سرمایہ ہو جائے COINS ہو جائیں' سکہ ہو جائے' روپیہ ہو جائے' وہ نظام سرمایہ داری کہلاتا ہے۔

عقلِ انسانی کی چابکدستی کی ایک مثال

قرآن کا نظام ربوبیت اور نظام سرمایہ داری دو ایسی متضاد چیزیں ہیں کہ قرآن اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اعلان جنگ یہی نہیں تھا کہ کوئی مہاجن تھا' وہ سود پر روپیہ دیتا تھا۔ کس کس قسم کے سود ہوتے تھے تاکہ اس اس قسم کے سود حرام قرار دیئے جائیں۔ اسی میں جو نوعتیں بعد میں پیدا ہوئی ہیں' وہ حساب نہیں آتا' یہ جو الربٰو ہے' یہ تو اس کے اس دور کے لیے ہے' جس قسم کے وہاں ہوتے ہیں۔ یعنی بھتہ ہے۔ اور آگے چلئے' اس دور کے اندر بینکوں کا یہ سود صاحب! کیا ہے؟ کہ جی' وہ تو اس میں آتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اب انگریزی کے لفظ ہمارے ہاں INTEREST & USERY یہ کچھ آ گئے صاحب۔ COMMERCIAL INTEREST ایک اور DEFINITION آئی' یہ بڑی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں اگر کوئی شخص اپنی ذاتی ضرورت کے لئے' آپ کے پاس آ جائے' اس کو دیا جائے' اس میں اگر آپ زائد لے لیتے ہیں' یہ تو سود حرام ہے۔ اور اگر کمرشل PURPOSE (مقصد) کے لیے کسی کو دے دیں ایک دوکاندار ہے' تجارت والا ہے' تجارت کرتا ہے' اس میں وہ یہ چیز کہتا ہے کہ صاحب! مجھے اس میں سے دس ہزار روپیہ قرض دے دیجیے تو ٹھیک ہے' اس کو قرض دیجیے' اس میں جو زائد لے لینا ہے یہ حرام نہیں ہو سکتا۔ اسی پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں' اس کے اوپر فتوے لیے جا رہے ہیں۔ میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ بار بار اس کے اوپر بحث چلی جا رہی ہے۔ قرآن کریم کی دو ہی آیتوں کو لے لیتے تو اس ساری بحث کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ دو ہی آیتیں میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں سے جو بات شروع کی ہے' یہ (2:275) آیت ہے جو میں کہہ رہا ہوں' یہ (2:279) تھی جو میں نے یہ کہا تھا کہ یہ خدا اور رسول کی طرف اعلان جنگ ہے۔ دیکھیے کس طرح سے قرآن نے DEfINITION (تعریف) کر دی کہ یہ سود ہوتا کیا ہے؟

ربٰو جس کو ہمارے ہاں سود کہا جاتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے پھر بیع اور ربٰو میں کیا فرق ہے

ربٰو ہے کیا چیز جو حرام ہے؟ کہا کہ ان سے کہو جو اس روش پر چل رہے ہیں' اس سے باز آ جائیں اس کو چھوڑیں۔ و ان تبتم (2:279) اگر تم اس روش سے توبہ کرو' باز آ جاؤ' واپس آ جاؤ تو کیا صورت ہوگی؟ ایک ہی چیز اس میں ہو سکتی تھی پھر عرض کر دوں کہ اپنے اصل سے کچھ زائد لینا یہ چیز تھی۔ اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا' یہ آیات 275 پھر میں مسلسل بھی لوں گا' کہ ذٰلك بانھم قالوا انما البیع مثل الربٰوا (2:275) یہ ''من حرامی حجتاں ڈھیر والے'' وہ کہتے ہیں صاحب! اگر یہ بات ہے کہ اپنے اصل کے اوپر زائد کچھ نہیں لے سکتا تو تجارت میں بھی تو یہ ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن نے یہ نہیں کہا وہ تو یہ کہتے ہیں کہ انما الربٰوا مثل البیع

(2:275) لـربـوا البیع جیسا ہے اس کے اندر ایک طنز دیکھیے کہ لـربو حرام آپ قرار دیتے ہیں بیع کو آپ حلال قرار دیتے ہیں تو بیع بھی تو لربو ہی کی طرح ہوتی ہے اصل تو اس کے اوپر بھی تو ہے کچھ ملتا ہے۔ احـل الله البیع و حـرم الربوا (2:275) بیع کو حلال قرار دیا ہے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔

تجارت میں محنت کا معاوضہ ہوتا ہے ربٰو میں صرف سرمائے کا

اب یہاں ایک اور فرق آ گیا۔ تجارت میں اصل کے اوپر کچھ زائد ملتا ہے۔ یہ کیا زائد ملتا ہے؟ لیس لـلانسان الا ماسعٰی (53:39) تجارت میں انسان اس اصل کے ساتھ محنت کرتا ہے یہ جو اس کے اوپر جسے ہم منافع کہتے ہیں زائد لیتا ہے وہ اپنی محنت کا معاوضہ لیتا ہے۔ خالی اس روپے کو دے کر آپ بیٹھا نہیں رہتا اور جو روپیہ ہے وہ نہیں پیدا کرتا زیادتی اس کی منت پیدا کرتی ہے محنت کا معاوضہ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآنی نظام کے اندر تجارت میں بھی یہ چیز نظام کے متعین کرنے کی ہوگی کہ یہ جو تجارت کرنے والا ہے اس نے جو محنت کی ہے اس میں سے اس محنت کا معاوضہ یہ کتنا لے سکتا ہے۔ آج کی تو تجارت ربـو سے بھی زیادہ حرام ہوگئی ہوئی ہے وہ ربـو میں تو پھر بھی کوئی PERCENTAGE % ہوتی ہے کہیں نہ کہیں تو اس کی LIMIT (حد) ہوتی ہے تجارت میں تو LIMIT (حد) ہی کوئی نہیں اور یہ آپ کے ہاں ساری جائز ہوتی ہے۔ کیا کیا چیزیں جائز ہوتی ہیں غلط تصورات کے اندر؟ تجارت میں منافع کی کوئی حد نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کی شریعت کہ جس نے روپے کی ماحصل کو جائز ہونے کا فتوی دے رکھا ہے

لیجیے صاحب! معاوضہ تو اس نے محنت کا لینا تھا اس محنت کے معاوضے سے جتنا زائد لیتا ہے وہ اصل کے اوپر زائد لیتا ہے کیپٹل کے اوپر زائد لیتا ہے وہ ربـو ہے۔ جسے ہم SLEEPING PARTNER کہتے ہیں تجارت کرنے والے کو روپیہ لگا دیا صاحب! ہم نے وہاں اتنا روپیہ لگایا ہوا ہے۔ لگا دیا گھر بیٹھے ہوئے ہیں اس میں سے منافع میں سے حصہ چلا آ رہا ہے اس میں یہ سـعـی کہاں آئی؟ سعی کہاں ہے؟ LABOUR کہاں ہے؟ محنت کہاں ہے؟ یہ آپ کے ہاں جائز ہے۔ آپ کے ہاں کی شریعت کی رو سے اسے جائز قرار دیا ہوا ہے۔ مثلاً زمین کی بٹائی ہے! زمین کا ایک مالک بن بیٹھا دوسرا کاشتکار اس کے اوپر سارا سال محنت کرتے کرتے مر جاتا ہے یہ بیٹھا ہوا ہے سال کے بعد جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس میں سے جو بھی مقرر کیا ہے آدھا یا چوتھا حصہ یا ٹھیکے کا روپیہ وہ کاہے کا ہے؟ یہ کیپٹل تھا۔ کسان آتا ہے آکر کہتا کہ میاں صاحب! یہاں ایک زمین کا ٹکڑا مجھے مل رہا ہے ہزار روپیہ دے دیا جائے تو میں وہ لے لوں بچوں کا پیٹ پل جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہزار چھوڑ پندرہ سو میں خرید لو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ہزار پر اگر یہ کہے کہ صاحب! دس روپے

زائد لوں گا‘ سارے گاؤں میں مشہور ہو جائے گا ’’سود خوار سود خوار‘‘ بری بری بات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ ٹھیک ہے‘ تم اس جھمیلے میں کیوں پڑتے ہو‘ وہ زمین ہزار روپے کی میں خرید لیتا ہوں‘ تم جاؤ اس میں ہل چلاؤ‘ کاشت کرو۔ ٹھیک ہے زمین یہ خرید لیتا ہے‘ ہل یہ چلاتا ہے‘ سال کے بعد ہزار روپے پر تو دس روپے لینے تھے اب یہ جو اس طرح سے لا رہا ہے‘ وہ بٹائی کا سو روپیہ لا رہا ہے۔ یہ جائز ہے۔ آج اگر یہ چیز ہے کہ صاحب! COMMERCIAL INTEREST جائز قرار دو‘ بینک کا سود جائز قرار دو‘ تو وہاں آپ کے ہاں یہ بھی چیز جو چلی آ رہی ہے۔

ربٰو اور سرمائے کے سلسلہ میں قرآنی وضاحت

برادران عزیز؟ SIMPLE اصول ہے لیس للانسان الا ما سعٰی (53:39) معاوضہ محنت کا ہے۔ کیپٹل کے اوپر جو کچھ زائد محنت کا معاوضہ نہیں بنتا اسے ربٰو کہا جاتا ہے‘ نام شکل اس کی کچھ بھی کیوں نہ رکھ لی جائے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر تم اس سے باز آ ؤ گے فلکم رؤس اموالکم (2:279) صرف اصل زر لے سکتے ہو لا تظلمون و لا تظلمون (2:279) تم پر بھی زیادتی نہ ہو کسی اور پر بھی زیادتی نہ ہو۔ یا تظلمون کے معنی ظلم سے کمی کرتے ہو تو تمہارے اصل میں بھی کمی نہ ہو‘ اس کی محنت سے جو اس نے کمایا ہے‘ اس میں بھی کمی نہ ہو۔ لہٰذا ہر وہ سسٹم جس میں معاوضہ محنت کا نہ ہو‘ سرمائے کا وہ معاوضہ ہو الربٰوا ہے۔ اور عام انداز سے ہی جسے ہم یونہی حرام کہہ دیتے ہیں‘ ایسا حرام نہیں‘ ایسا حرم ہے یہ نظام کہ ایسے نظام کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

اب آیئے قرآن کی آیات کی طرف۔ پیچھے سے صدقات‘ انفاق‘ بغیر کسی قسم کے صلہ‘ شکریہ‘ تحسین کی تمنا کے‘ بغیر کسی قسم کی غرض کے دیئے جا رہے تھے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جو میری ضرورت سے زائد ہے‘ اس سے دوسروں کی ضرورت پوری کرتا چلا جائے گا۔ مقصد ہی یہ ہے۔ اس کے برعکس یہ چیز ہے کہ اپنا محفوظ سرمایہ محفوظ رہے دوسرے کی محنت کو یہ کھینچ کر لے آئے۔ یہ دوسرا نظام ہے۔ وہاں کہ یہ تھا کہ اپنا کمایا ہوا بلا معاوضہ کے دوسرے کی ضرورت کے لیے دیدو کہا کہ یہ تو خدا کی راہنمائی کے علاوہ ہو نہیں سکتا‘ اس سے دل کی کیفیت بدلنی پڑے گی۔ ایک دل کی کیفیت یہ ہے کہ دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے‘ ایک دل کی کیفیت یہ ہے کہ دوسروں کے چھیننے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ یہ جو دوسروں سے چھیننے کے لیے پاگل ہو رہا ہے تو وہ کس انداز کا پاگل ہو رہا ہے؟

نظام سرمایہ داری میں انسان کی نفسیاتی کیفیت اور لفظ تکاثر کا مفہوم

عزیزان من! یہاں سے ربٰو کی بات شروع ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے کہا کہ الذین یا کلون الربٰو لا یقرمون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس (2:275) ان کی کیفیت یہ ہے کہ دوسروں کی کمائی کو کسی نہ کسی طرح سے سمیٹ لیں‘

جھپٹ لیں‘ کیفیت ان کی حالت اضطراب کی ہے‘ پاگل کی سی کیفیت ایسے ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو۔ کیا مثال ہے صاحب! سانپ کے ڈسے ہوئے کی جو پیاس کی شدت ہے‘ اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے‘ یہ پاگل پن کا تڑپنا ہے‘ وہ پیاس بجھتی نہیں ہے‘ وہ اس زہر کی جو ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ بغیر محنت کیے دوسرے کی محنت میں سے جو آتا ہے‘ تو پھر اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر (102:1-2) ضرورتیں تو پری ہو جاتی ہیں‘ ان کی ایک حد ہوتی ہے مگر یہ جو تکاثر ہوتا ہے‘ جو دوسرے سے بڑھنے کی ہوس ہوتی ہے‘ یہ اس کی تو کوئی حد نہیں ہوتی‘ قبر تک لیے چلی جاتی ہے انسان کو۔ جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو یہ اس قسم کی کیفیت ہوتی ہے۔

محنت کے معاوضے کے علاوہ سرمائے کا معاوضہ ربٰو ہے

ذٰلك بانهم قالو انما البيع مثل الربٰوا (2:275) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کیپٹل کے اوپر یہ جو منفعت ہے‘ جو منافع ہے‘ اپنے اصل کے اوپر کچھ زائد لینا‘ جب انہیں یہ کہا گیا تو انہوں نے اعتراض کیا کہ بیع میں بھی تو‘ تجارت میں بھی تو‘ یہ چیز ہوتی ہے۔ بیع خرید و فروخت دونوں کے لیے یہ بیع و شرح کے لفظ عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ کہا کہ اس میں یہ نہیں ہوتا۔ اب یہ جو فرق ہے‘ میں نے عرض کیا کہ فرق اتنا ہی کہ بیع کے اندر اصل کے ساتھ محنت کرتا ہے‘ منافع اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ اگر بیع یہ شکل اختیار کر لے کہ وہ منفع محنت کے معاوضے تک محدود نہ ہو‘ کیپٹل کا بھی اس کے اندر معاوضہ آ جائے‘ وہ حصہ ربٰو میں شامل ہو جائے گا۔ اسلامی نظام میں یہ چیز نہیں ہوگی ورنہ وہ بیع اور ربٰو ایک دوسرے کے مثل ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! بیع کو حلال کیا‘ ربٰو کو حرام کیا‘ بیع میں بھی ربٰو کی اگر صورت آ جائے گی وہ حرام ہو جائے گا۔ کہا ہے کہ فمن جآله موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف (2:275) جس تک یہ بات پہنچ جائے اور دل میں اتر جائے اور پھر یہ اپنی روش چھوڑنا چاہے جو پہلے ہو چکا‘ وہ ہو چکا۔

قانون کے نفاذ کا طریق اور اس کی علت

قانون میں بھی یہ ہے کہ جب بھی قانون کو نافذ کیا جاتا ہے‘ اس تاریخ سے کیا جاتا ہے جو اجرا کی تاریخ ہوتی ہے‘ PRIOR EFFECT (پہلے) سے نہیں نافذ کیا جاتا۔ قرآن کا بھی یہ اصول ہے فله ما سلف و امره الى الله (2:275) یہ معاملہ کہ یہ پہلے حرام نہین تھا قانون نہیں آیا تھا‘ ہدایت نہیں آئی تھی‘ یہ جو معاملہ ہے‘ یہ خدا کی طرف کا ہے۔ ومن عاد فاولئك اصحٰب النار هم فيها خٰلدون (2:275) لیکن جو اس کے بعد پھر یہ روش اختیار کرے گا پھر اس کے عذاب سوزاں ہوگا۔

ربٰو انسانی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ عذاب سوزاں کیوں ہوگا؟ یہ چیز کیوں ہوگی؟ اب آئی علت اس کی حکمت اس کی عجیب چیز ہے۔ کہا ہے کہ یمحق اللہ الربٰوا و یربی الصدقٰت (2:275) بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ ربٰو میں سے تو بڑھتا ہے دولت بڑھتی ہے۔ جو کسی کو یوں دے دیا جاتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تمہیں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ درحقیقت جو ربٰو ہے وہ دولت کو مٹاتا ہے جو قومی WEALTH ہوتی ہے اس کو آہستہ آہستہ وہ مٹاتا چلا جاتا ہے اور جو چیز بڑھتی ہے وہ صدقات ہیں جو اس طرح سے دیا جاتا ہے۔ وہ ہے حقیقت میں جو بڑھتا ہے ربٰو بڑھتا نہیں ہے۔ بات دور چلی جائے گی اگر میں بتاؤں کہ آج INTEREST کی سرمایہ داروں کے نظام کے اندر بھی جو تھیوری ہوگئی ہے جو کہتے ہیں کہ جو ZERO INTEREST 'جو صفر INTEREST جو ہے وہاں تک وہ لے جا رہے ہیں۔ آج یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس نظام کے اندر جو اس طرح سے آتا ہے اس کے بعد قومی دولت من حیث الکل کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ طبقہ ایسا پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جو محنت نہیں کر سکتا۔ NATIONAL WEALTH یا قومی دولت محنت سے پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا طبقہ پیدا ہوتا چلا جائے محنت کے بغیر دولت آتی چلی جائے محنت کرنے والا طبقہ کم ہوتا چلا جائے تو NATIONAL WEALTH گھٹتی چلی جائے گی۔ کہا کہ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ جو یوں دیدیا جائے وہ گھٹا ہے جس سے کچھ ریٹرن میں ساتھ آئے وہ بڑھتا ہے۔ کہا کہ تم نے غلط سمجھا ہے۔ انفرادی طور پر INDIVIDUALLY نہ لو اجتماعی طور پر قومی حیثیت سے نظام کی شکل میں لو تم دیکھو گے کہ یہ گھٹتا ہے وہ بڑھتا ہے۔ گھٹنے اور بڑھنے میں ربٰو یا سود کی ایک اور قسم کی چیز سامنے آگئی۔

سود در سود کا معاملہ ضعف اور اضعافاً کے مفہوم میں فرق

ہمارے ہاں کے اس دور میں بھی ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہے کہ نہیں صاحب! قرآن کریم کی رو سے جو سادہ سود SIMPLE INTEREST ہے اور جو مرکب سود (COMPOUND INTEREST) ہے وہ ہے حرام۔ مرکب سود حرام ہے ''اوہدے اچ چوہا پے گیا ہویا ہونداہیگا[1]''۔ آیت تو جھٹ سے لے آتے ہیں اللہ ان کو دے قرآن نے کہا ہے کہ یاایھا الذین اٰمنو الا تاکلوا الربٰو اضعافاً مضٰعفۃً واتقوا اللہ لعلم تفلحون (3:130) اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ اے ایمان والو! تم ربٰو کو نہ کھاؤ اضعافاً مضٰعفۃً وہ جو دوگنا دوگنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ صاحب! یہ وہ جو ہے کہ وہ سال کے بعد سود اصل زر میں مل جاتا ہے پھر اس کے اوپر سود پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے اضعافاً مضٰعفۃً (3:130)۔ برادران عزیز! یہ عجیب چیز ہے۔ وہاں یہ کہا تھا کہ ربٰو نظر آتا ہے کہ بڑھتا ہے درحقیقت قومی دولت گھٹتی ہے۔ قرآن کریم نے کس خوبصورتی سے یہ چیز کہی ہے! امام راغب نہایت

عمدگی سے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ آپ میرے لغات القرآن میں بھی دیکھیے۔ اس کا اضعافاً مادہ ضعف ہے ض کی زیر سے ہے اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کا دوگنا ہونا یہ وہی چیز ہے جسے تم سمجھتے ہو کہ ربٰو سے بڑھتا ہے یہ ابن فارس کہتا ہے۔ امام راغب کہتا ہے کہ درحقیقت یہ مضافعۃً سے ہے ضعف جس کے معنی ہیں ''کم(2)'' ہونا۔ قرآن کی بلاغت ہے ایک ہی مادے کے ایک زبر اور زیر (ضعف اور ضعف) سے اس نے ایسا حسین انداز میں فرق کیا کہ تم جسے سمجھتے ہو کہ وہ چیز ضعف ہے، بڑھ رہی ہے، حقیقت میں وہ ضعف ہے، کم ہو رہی ہے، کمزور ہو رہی ہے۔ اس کی تفسیر آ گئی یمحق اللہ الربٰوا (2:276) کم ہوتا ہے مگر نظر یوں آتا ہے کہ بڑھ رہا ہے، یہ اضعافاً نظر آتا ہے، بڑھ رہا نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت مضاعفۃ ضعف سے ہے یہ گھٹ رہا ہے۔ اور یہاں ضعف کہا کہ یہ یہاں کمزوری پیدا کر دیتا ہے۔ کس طرح سے کمزوری پیدا کر دیتا ہے؟ یہاں پھر 276 ویں آیت پر آ جائے، ربٰو کم ہوتا ہے، صدقات بڑھتے ہیں۔ واللہ لا یحب کل کفار اثیم (2:276) کمزوری پیدا کر دیتا ہے۔ یہ چیز تھی کہ محنت کی سکت باقی نہیں رہتی، محنت کا عادی نہیں رہتا، قوم مضمحل ہو جاتی ہے۔

---

(1) اس میں چوہا داخل ہو گیا ہوتا ہے (اور وہ اس سے ناپاک ہو گیا ہوتا ہے)۔

(2) امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن''، مطبع یمنیہ، مصر 1324ھ دیکھیے۔

کسی چیز کو چھپا کر رکھنے کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے

یاد رکھو! ربٰو کے اندر قوم کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس میں پہلی چیز تو یہ کفار ہے دولت تو کھلی ہوئی رہنی چاہیے کہ یہ ہے میری ضروری کے لیے اور یہ زائد ہے، ہر ایک کو معلوم ہو کہ جو زائد ہے وہ دوسروں کے لیے ہے۔ کسی چیز کو چھپا چھپا کر رکھنا یہ ہے، کفار۔ کفر کے معنی ''چھپانا'' ہوتا ہے۔ چھپا چھپا کر رکھنا پہلی چیز تو یہ ہے کہ نہیں جی! وہ ہے ہی نہیں، زیادہ روپیہ کہاں ہمارے پاس ہے، وہ آتا ہے، خرچ ہو جاتا ہے، کوئی چار روپے یونہی بچا کر رکھے ہیں۔ اچھا! آپ یہ کہتے ہیں تو اچھا جی! کسی طرح سے اپنا پیٹ کاٹ کر تمہاری ضرورت کو تو پورا کرنا ہوتا ہے صاحب! HIDDEN WEALTH دور جدید کی اصطلاح ہے، اس سے پیشتر یہ اصطلاح کم تھی۔ چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے یہ کفار (2:276) کہہ دیا تھا، یہ HIDDEN WEALTH ہوتی ہے۔

اثیم کا قرآنی مفہوم

اگلی چیز اثیم ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ گنہگار کر دیا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے عربی زبان میں ناقۃ الاثمۃ کسے کہتے تھے؟ ایسی اونٹنی جو تھک کر مضمحل ہو گئی ہو اور وہ اپنی قطار سے پیچھے رہ جائے۔ اثیم وہ ہیں جن کے قوائے عملیہ مضمحل ہو جائیں، تکان ہو

جائیں، تھک جاویں، دوسری زندہ قوموں کے ساتھ ٹلنے کے قابل نہ رہیں، تکان کی وجہ سے ''ڈار تو پچھاں رہ جاوے اونٹنی (1)'' اثیـــم ہے۔ کہتا ہے کہ قوم کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے، پھر اس میں ان چیزوں کو چھپاتی ہے، محنت کرنے کی عادی نہیں رہتی، اثیــم ہوجاتی ہے۔ یہ پسندیدہ بندے نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس محنت کرنے والے ہوتے ہیں، کما کرلاتے ہیں، ان میں چھپانے کی بات ہی نہیں ہے۔ ان میں محنت کی سکت روز بروز بڑھتی ہے، یہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

---

(1) وہ اونٹنی جو اپنی قطار سے پیچھے رہ جائے۔

INVESTMENT کے تحت حاصل کردہ روپے کی نوعیت

برادران عزیز! اب رہا یہ COMMERCIAL INTEREST، روپیہ INVEST کیجیے، دوسرے کے روپے کے اندر جا کر مل گیا، وہاں اس نے اس سے کچھ کاروبار کیا، روپیہ بڑھا، اسے آپ نے منافع کہہ لیا، دیوی داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ کہتے ہیں کہ صاحب! اس میں تو کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے لیکن خدا نے تو یہ کہا ہوا ہے کہ واللہ محیط بالکفرین (2:19) ہم تو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ عزیزان من! غور فرمائیے، میں جب ان بحثوں کو دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس میں ساری دنیا کے حوالے (REFERENCES) ہوتے ہیں، اگر کوئی چیز نہیں ہوتی تو وہ خدا کی کتاب اس میں نہیں ہوتی۔ اور اگر اس کی طرف آجائیں تو اس کے بعد کسی اور حوالے (ریفرنس) کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کہا ہے کہ تمت کلمت ربك صدقاً وعدلاً (6:15) اس نے تو ضابطہ جتنا بھی تھا مکمل کردیا۔ فات ذا القربی حقه و المسکین ابن السبیل (30:38) یہ دیئے چلے جاؤ، ضرورت مندوں کو دیئے چلے جاؤ گردوپیش کو دیئے چلے جاؤ یہ ان کا حق ہے یہ حقــــہ ہے یعنی ضرورت مند کا حق ہے۔ فی اموالهم حق معلوم للسآئل و المحروم (70:24) وہ AS OF RIGHT (بطور حق) لے سکتے ہیں اس لیے دیئے چلے جاؤ۔ اولئك هم المفلحون (30:38) یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ آگے دیکھیے آیت آئی کہ و ما اتیتم من رباً لیربو ا فی اموال الناس فلا یربوا عندالله (30:39) تم اس طرح سے مال دیتے ہو جو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر جا کر بڑھ جائے۔

قرآن حکیم کے نزدیک کمرشل انٹرسٹ کے ذریعے روپیہ بڑھتا نہیں بلکہ کم ہوتا ہے

عزیزان من! اسی کو کمرشل انٹرسٹ والی کہتے ہیں یعنی کسی دوسرے میں انوسٹمنٹ کرنا۔ یہ جو ہے کہ لیربوا فی اموال الناس (30:39) دوسروں کے مال کے اندر شامل ہوکر اور تمہارا بھی بڑھ جائے۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے، یوں بڑھتا ہوا تو نظر آتا ہے لیکن فـــلا

یـربـوا عند الله (30:39) خدا کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا۔ عزیزان من! ساری بحث یہاں طے ہوگئی۔ جسے کمرشل انٹرسٹ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ وہ سود نہیں ہے' یہ تو کاروبار ہو رہا ہے' اس کے روپے میں کچھ ہم نے بھی ملا دیا ہے' اسے بھی منافع ہوا ہے' ہمیں بھی منافع ہوا ہے۔ قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ اندازہ لگائیے قرآن کی جامعیت کا حالانکہ اس انداز کی یہ چیز غالباً اس زمانے میں ہوتی نہیں ہوگی جسے آج ہم یوں کہہ رہے ہیں لیکن قرآن اس کو بھی لا رہا ہے کہ جو اس انداز سے دیتے ہو لیـربـوا فـی امـوال الناس (30:39) تاکہ لوگوں کے مال میں مل کر بڑھ جائے۔ یہ تمہارے نزدیک بڑھتا ہے' خدا کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا۔ وما اٰتیتم من زکوٰۃ تریدون وجـه الله فاولئك هم المضعفون (30:39) یہ جو تم دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتے ہو' ان سے کچھ لینے کے لیے نہیں' محنت غصب کرنے کے لیے نہیں' یہ ہے جو حقیقت میں بڑھتا ہے اور یہی ہے کہ جس قوم کے مال کے اندر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یـمـحـق الـلـه الربٰوا ویربی الصدقٰت (2:276) ربٰو کا جو نظام ہے' اس میں WEALTH (دولت) کم ہوتی ہے' ذہنیت چھپانے کی ہو جاتی ہے' بخل اور تنگ نظری پیدا ہو جاتی ہے اور قوم اثیم ہو جاتی ہے' قوم محنت سے جی چرانے لگ جاتی ہے' آہستہ آہستہ مضمحل ہو جاتے ہیں قوائے عملیہ۔ ان الـذیـن امـنوا وعملوا الصّٰلحٰت واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ لهم اجرهم عند ربهم (2:277) ہاں وہ لوگ جو خدا کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں' صلاحیت بخش کام کرتے ہیں' نظام صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور سامان نشوونما بہم پہنچاتے چلے جاتے ہیں' یہ ہیں جن کی اجر خدا کے ہاں ہے۔ کیا اجر ہے؟ کہا کہ لا خـوف عـلـیهـم ولا هـم یـحـزنـون (2:277) یہ ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں خوف اور حزن باقی نہیں رہتا۔ یـایـهـا الذین اٰمنوا اتقوا الله (2:278) اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ وذروا مـا بـقـی من الربٰو ان کنتم مؤمنین (2:278) ایمان کا دعویٰ ہے' آج کے اعلان کے بعد جو باقی رہ گیا ہوا ہے' کسی کے ذمے پرانے تمہارے سودے کے مطابق بھی ہے آج اس کو ربٰو چھوڑ دو۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله (2:279) اگر یہ نہیں کرو گے تو پھر اسے اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ سمجھو۔ وان تبتم فـلـکـم رؤس اموالکم لاتظلمون ولاتظلمون (2:279) اور اگر تم اس سے باز آ جاؤ گے تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو تاکہ نہ تم پر زیادتی ہو' نہ دوسرے پر زیادتی ہو۔

ربٰو کے نظام میں WEALTH کی کمی کے علاوہ بخل' تنگ نظری اور اثیم کے باعث انسان محنت کا عادی ہی نہیں رہتا

عزیزان من! اصل زر لینے کے لیے بھی اب بات آئی۔ یہ تو آ گئی قانون کی بات عجیب چیز ہے قرآن' قانون کی رو سے تو یہ کہتا ہے

لیکن مومن کا قلب تو اس سے آگے ہونا چاہیے۔ کہتا ہے کہ وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ (2:280) جو مقروض ہے اب اس کے بعد اس سے تم نے زیادہ تو کچھ لینا نہیں۔ اب یہ بات آ گئی کہ صاحب! پھر ٹھیک ہے جو واپس اتنا ہی مجھے لینا ہے تو پھر جلدی سے جلدی واپس دے۔ قرآن دیکھیے۔ پہلے یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ جلدی واپس آ جائے' وہ تو اسے لینا ہی نہیں چاہتا۔

ایک مقروض کی کہانی سود کی زبانی

آپ کو اس پٹھان کا قصہ معلوم ہے' سو روپیہ دیا ہوا تھا' ہر مہینے پچیس روپے وہ آ کر لے لیتا ہے' وہ پچیس روپے مہینہ سود کا ہے۔ تنگ آ گیا دو تین سال دیتا رہا ہزاروں دے چکا' دوستوں سے فریاد کی' انہوں نے کہا اچھا بابا! یہ لو چندہ کر کے اس کو سو روپیہ دیدیا! وہ آئے تو اس کو دے دینا' اصل دے دینا۔ وہ آیا اس نے یہ کہا کہ خان بڑا مہربانی' یہ آپ کا وہ جو سو روپیہ ہے یہ لو' وہ کہتا ہے' یہ ہم نہیں لے گا' تم نے ہم کو غیر سمجھا ہے' ہمارا تمہارا گھر ہے' ایک گھر ہے تمہارے پاس رہے تو کیا' ہمارے پاس رہے تو کیا۔ نہیں نہیں رکھو۔ اس نے صاحب! وہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ کہنے لگا کہ اچھا اگر تم مجبوراً کہتا ہے تو ہم چار مہینے نہیں آئے گا' چار مہینے کا سود آ گیا' پچیس کے حساب سے پھر آئے گا ''اوہنوں اصل تے لینا ای نئیں ہیگا[1]''۔

---

(1) اس نے اصل زر تو لینا ہی نہیں ہے۔

قرآن کی زبانی مقروض کی کہانی

عزیزان من! قرآن کو یوں پڑھا کیجیے۔ اللہ جانتا ہے' وجد آ جاتا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد یاد رکھو! زیادہ نہیں ملے گا۔ وہ اللہ میاں ہے' وہ جھانک کر دلوں کے اندر دیکھتا ہے کہ جب یہ ہوا تو پھر یہ کہیں گے کہ بابا! دو پیسے میرے' اب میں کیوں چھوڑوں' وہ جو جذبہ تھا کہ رکھو تم' تمہارا ہمارا گھر ایک ہی ہے' اب تو گھر ایک نہیں رہا' اب وہ کہے گا کہ دو۔ کہا کہ دیکھو اگر وہ تنگ دست ہے' اس کو مہلت دو۔ اب مومن کی کشادہ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ قانون نہیں ہے: نیست ایں کار فقیہاں اے پسر۔ یہ قانون کی حد سے آگے بات جا رہی ہے۔ اس کو مہلت دو۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ عزیزان من! آگے ہے کہ وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون (2:280) اور اگر وہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ دے سکے' صدقہ کر دو' اس کو چھوڑ و۔ ان کنتم تعلمون (2:280) اے کاش! تمہیں اس کا علم ہو جائے کہ اس کا کیا بدلہ تمہیں ملے گا۔ اللہ اکبر! عزیزان من! یہ ہے مقام جو آپ کو قانون سے آگے لے جاتا ہے ٹھیک ہے قانون کی حد تک آپ وہاں تک ٹھیک تھے' اب یہ مقام مومن آیا کہا کہ یؤثرون علی انفسھم ولو کان بہ خصاصۃ (59:9) دوسروں کی مصیبت کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں' خواہ خود تنگی میں ہی کیوں نہ رہنا پڑ جائے۔ یہ مقام مومن ہے۔ چھوڑ دے اس چیز کو جو کچھ بھی ہے لیکن یہ چھوڑنے والی

جو بات ہے یہ غلط معاشرے کے اندر یہ ادھر مصیبت ہو جاتی ہے۔ وہ آپ کو میں نے بتایا تھا قرض کی قسمیں' قرآن کریم نے کہا تھا کہ قرض حسنہ دیا کرو۔ اس کے معنی ہی یہ تھے کہ اس میں ساتھ ریٹرن یا کچھ سود کی بات نہیں ہے۔ میں علط معاشرے میں کہہ رہا ہوں۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہے کہ اس میں صاحب احتیاج معلوم نہیں ہونے دیتا کہ مجھے احتیاج ہے چہ جائیکہ وہ اس کے بعد قرض واپس نہ کرے۔ مومن کی بات ہو رہی ہے۔ غلط معاشرے میں' میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو دیا جاتا ہے' یہ جو کچھ اس سے وہ سود وصول کرنے والا ل ہوتا ہے' اس کا تو وہ بل بھی جلدی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ جو حسنہ ہے جس میں کچھ ساتھ لینے کی یہ صورت نہیں ہوتی' تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ وتا ہے کہ جب وہ آیا کہ صاحب! وہ قرضہ لیا تھا' آپ نے سو روپیہ وہ دے دیجیے'' اگوں ہنس پئے قرض (ہنسنا) ہے اصل اچ' جدوں منگن آئے تے ہس پئے آدمی [(1)]'' یہ قرض ہنسنا ہے یہ قرض حسنہ غلط معاشرے میں قرض ہنسنا ہو جاتا ہے'' اوہس کے ٹال دینداا ے اوہنوں جناب [(2)]''۔ زائد یہ لے نہیں سکتا کیونکہ ربٰو ہے' اسے بھی پتہ ہے لینے کے لیے اصل آتا ہے' تو ہنس دیتا ہے غلط معاشرے میں تو انسان ہر طرح سے پٹتا ہے۔

---

(1) ہنس دیئے۔ اصل میں یہ قرض ہنسنا ہے۔ جب مانگنے آئے تو آدمی ہنس دے۔

(1) جناب! وہ اسے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔

قرآنی معاشرے کے خدوخال

عزیزان من! اس لیے یہ چیز تو اس معاشرے کی ہے اور غلط معاشرے کے اندر میں یہ بات نہیں کہہ رہا کہ انفرادی طور پر یہ نہیں کر سکتے' یہ تو قرآن تشکیل معاشرے کے پہلے کی باتیں کر رہا ہے' معاشرہ متشکل ہونے کے بعد تو ربٰو کا سوال ہی نہیں ہوتا کسی کے پاس ضرورت سے زائد پیسہ رہنا ہی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (2:219) پوچھتے ہیں کتنا دوسروں کو دیدیں' کہہ دو کہ جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے' وہ سارے کا سارا دیدو۔ پیسہ ہی نہیں رہنا تو دوسرے کو سود پر یہ کیا قرضہ دے گا کیپٹل ازم کہاں سے آئے گا؟ سرمایہ داری کہاں سے آئے گی؟ اس میں آ ہی نہیں سکتی۔ یہ تو وہ دور ہے جس میں ابھی وہ چیز متشکل نہیں ہوئی۔ اس دور کے اندر قرآن قانوناً یہاں یہ کہتا ہے کہ آج کی تاریخ سے پھر زائد وصول نہیں کرنا' اصل کرنا' تنگ دست ہے مہلت دیدو استطاعت نہیں ہے واپسی کی اور فراخ حوصلگی سے کام لو' اسے چھوڑ دو۔ دوسری طرف یہ ہے کہ جس نے لیا ہوا ہے' وہ بھی تو مومن ہے' وہ بھی تو یہ نہیں کرے گا کہ اب مجھے چونکہ سود نہیں دینا' اس واسطے اس کے پیسے کا کیا ہے' دیکھا جائے گا۔ اور قانون کی رو سے تو اگر میں غلطی نہیں کرتا' قانون جاننے والے یہ جانتے ہونگے کہ شاید کورٹ کے اندر تو ایسا قرضہ' جس کے اوپر سود نہیں ہوتا' اس کی شاید ڈگری نہیں ملتی'

''شاید'' میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ عزیزانِ من! غلط معاشرے کے اندر تو یہ ہوتا ہے لیکن غلط معاشرے میں بھی انفرادی طور پر یہ جو چیزیں ہیں' یہ مفقود نہیں ہو جاتیں ہمیں یہ نہیں انتظار کرتے رہنا چاہیے کہ ہاں صاحب! جب وہ معاشرہ متشکل ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد ''سارے اسی مومن بن جاواں گے (1)'' یہ سوال نہیں ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ''در جوانی توبہ کردم شیوۂ پیغمبری'' غلط معاشرے کے اندر مشکل تو ہوتی ہے' اس میں شبہ نہیں ہے لیکن پھر ثبات تو اسی میں ہوتا ہے کہ اس کے باوجود یہ کچھ کرے لیکن لینے والے جو ہیں ان کو بھی یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس نے وقت پر مدد کی تھی اس لیے اس کی جو واپسی ہے ہمیں بغیر تقاضے کے کر دینی چاہیے۔

---

(1) ہم سب مومن بن جائیں گے۔

قرآن حکیم اپنے پیش کردہ نظامِ حیات کو بتدریج منزل بہ منزل انتہا تک پہنچاتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ چیزیں اس معاشرے کے ابتدائی دور میں ہیں۔ اگلی آیت پھر اس سلسلے میں آئے گی کہ جب تم انفرادی طور پر لین دین کرو تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ اس چیز کو اتنی اہمیت ہے کہ قرآن کریم میں سب سے لمبی یہ آیت ہے جو آگے آئے گی۔ عزیزانِ من! اب وقت ہو گیا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت 280 تک ہم آگئے' 281 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

انسٹھواں باب: سورۃ البقرۃ (3) (آیات 281 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۸۱) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ
مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰٮهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْــَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ
لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲) وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ
وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ
يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸۳) لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ
اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَمَلٰٓٮِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲۸۵) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰٮنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۶)

عزیزانِ من! آج اگست 1969ء کی 31 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 281 سے ہوتا ہے: (2:281)۔

نگاہِ بازگشت اصل سے اوپر جو کچھ انسان لیتا ہے وہ ربو ہے وہ دوسرے کی کمائی ہے

اگرچہ یہ آیت ضمناً سابقہ درس میں بھی سامنے آگئی تھی لیکن ربط کا تقاضا ہے کہ میں اسے پھر دہرادوں۔ اور اسی سے آپ یہ دیکھیے کہ قرآنِ کریم کی آیات، جن میں سطح بیں نگاہوں کو کوئی ربط نظر نہیں آتا، ان میں کتنا گہرا ربط ہوتا ہے۔ بات پیچھے سے ربٰو کے متعلق چلی

اس کی محنت کے ماحصل میں سے کچھ لے جاتے ہیں اور یہ قرآن کی بارگاہ میں سب سے بڑا جرم ہے کسی کی محنت کو لے جانا' اسے غصب کر لینا' اسے EXPLOITE کر لینا یہ ہے اصل جو اس جرم کی سنگینی ہے۔ ربٰو بڑھوتی ہے۔ کسی کی ضرورت کے لیے اگر آپ چند دن کے استعمال کرنے کے لیے کچھ دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ تو آپ کو واپس مل جاتا ہے' آپ اس سے اوپر جو کچھ لیتے ہیں' وہ دوسرے کی محنت کا ماحصل ہوتا ہے اور کسی کی محنت کو EXPLOITE کر لینا یہ قرآن کے نظام میں سب سے بڑا جرم ہے۔ برادرانِ عزیز! ربٰو کی آیات چلی آ رہی ہیں۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ احکام کی آیات ہیں' اسی لیے کہاں سے ہمارے ہاں فقہ کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں ٹھیک ہے آیات تو احکام کی ہیں لیکن احکام کے ساتھ جو قرآن حکمت بیان کرتا ہے' نگاہ تو اس پر ہونی چاہیے۔ حکمت تو یہی ہے کہ کسی کی محنت' کوئی دوسرا نہ لے جائے۔ اور یہاں احکام ختم کیے کہاں کہ واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لا یظلمون (2:281) ساری دنیا میں ربٰو کا عام دور دورہ تھا۔ اسے سود اور بیاج کے لفظوں میں نہ لیجیے یہ ''محنت کرنے والے کی محنت سے کچھ غصب کر کے لے جانا'' ہے

یہ کہنے کے بعد کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے' یہ کہا کہ یاد رکھو! اب ایک ایسا دور آ رہا ہے۔ ہمارے سامنے تو جب یہ اس قسم کی آیتیں آتی ہیں واتقوا یوما ترجعون فی لی الله (2:281) تو ہم تو ہمیشہ قیامت تک اس کو اٹھا لیتے ہیں کہ ڈرو اس دن سے کہ جب تم نے پھر خدا کو طرف جانا ہے۔ یہ خدا کی طرف جانا قیامت ہی کے دن کی بات نہیں۔ ترجعون فیه الی الله (12:281) یہ ہے کہ جس میں تم ہر معاملے کو خدا کی طرف لے جاؤ گے والی الله ترجعوا الامور (12:210) ہر معاملے کا فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق ہو گا۔ اب وہ دور آ رہا ہے کہ جس دور میں ہر معاملے کے فیصلے کے لیے تمہیں خدا کی طرف جانا ہوا' یوں کیجیے اس ترجمہ' بات صاف ہو جاتی ہے۔ ترجعون فیه الی الله (12:281) میں دیکھتے ہیں آپ کیا الفاظ آئے ہیں! جس دور میں تمہیں ہر معاملے کے فیصلے کے لیے خدا کی طرف جانا ہا گا' وہ دور آ رہا ہے' آ گاہ کیا جا رہا ہے۔ تو کا ی ہوگا اس دور میں جس میں ہر معاملے کے فیصلے کے لیے خدا کی طرف جانا ہوگا؟ کہا کہ ثم توفی کل نفس ما کسبت (2:281) جس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ دور آ رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں کتنا گہرا ربط ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں محنت کوئی کرتا ہے' دوسرا غصب کر کے لے جاتا ہے' محض اس لیے کہ اس نے کوئی ایسی چیز جسے آپ دولت یا سرمایہ کہتے ہیں' اس کے پاس ضرورت سے زائد تھا' تم نے اس سے استعمال کے لیے لیا' وہ تم نے اسے واپس دے دیا اور واپس دینے کے ساتھ ہی تمہاری محنت میں سے وہ غصب کر کے لے گیا۔ کہتے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے کہ جس میں توفی کل نفس ما کسبت (2:281) ہر فرد کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ' ماحصل' ملے گا وهم لا یظلمون (2:281) کسی پر کوئی ظلم اور زیاتی نہیں ہوگی۔ اور اگر ظلم کے معنی ''کمی'' کے کرتے ہیں تو بات وہی ہے کہ کسی کے محنت کے ماحصل اور صلہ

میں سے کمی نہیں ہوگی' وہ دور آرہا ہے۔ یہاں صرف ظلم کہا ہے' قرآن نے دوسرے مقام پر ایک ور لفظ بھی کہا ہے۔

اس دور میں کوئی کسی کی محنت کو ہڑپ نہیں کر سکے گا

عزیزانِ من! کیا جامعیت ہے قرآن کریم کی کہا کہ ومن یعمل من الصلحت وھو مئومن (20;112) ان لوگوں کو قطعاً اس بات کا خوف نہیں ہوگا کہ کوئی ان کی محنت کے ماحصل میں سے کمی کر جائے گا یا ہڑپ کر جائے گا' ہضم کر جائے گا' کھا جائے گا۔ مامون ہوں گے' وہ اس فکر سے محفوظ ہوں گے' وہ اس خوف سے کہ کوئی ان کے محنت کے ماحصل میں سے کھا جانا تو ایک طرف' ہضم کر نانا تو ایک طرف' کمی بھی نہیں کر سکے گا۔ اور یہ ہے وہ دور جس کے متعلق کہا کہ اب وہ دور آرہا ہے اور اس کہنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ دعویٰ کیا' نبی اکرم ﷺ والذین معہٗ مقدس ہاتھوں سے وہ نظام متشکل ہوا کہ جس میں پھر کسی کی محنت سے کوئی شخص نہ کچھ غصب کر کے لے جا سکتا تھا' نہ ظلم کر کے لے جا سکتا تھا۔ عزیزانِ من! قومیں ظلم کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہیں' ظلم یہی ہے کہ کسی شخص کو اس کا DUE' جو واجب ہے' وہ قاعدے قانون کے مطابق نہ ملے' کوئی دوسرا اسے لے جائے۔

قومیں تباہ ہی اس وقت ہوتی ہیں کہ جب ان میں احساس زیاں باقی نہ رہے

عزیزانِ من! جب کسی معاشرے کے اندر ظلم عام ہوتا ہے تو اس میں دو قسم کے ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس سے پیشتر ان چیزوں کو برداشت کرتے جاتے ہیں' کرتے جاتے ہیں' بالآخر ''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت'' وہ درد سے بھر آتا ہے۔ اگر اعصاب کمزور ہو گئے' اس وقت تو وہ مہاتما بدھ فلسفہ لے کر آتا ہے کنہار ہو جاتا ہے کہ یہ ساری دنیا شر ہی ہے' یہاں خیر کا نام نہیں ہے۔ شر کا مقابلہ ہم کر نہیں سکتے تو کیا کیا جائے؟

تجھ پر قابو نہیں' دل پر تو ہے قابو اپنا

اپنے آپ کو فنا کر لیا جائے' اتنی افیون کھائی جائے کہ اس چیز کا احسان ہی مر جائے۔ جو صاحبِ احساس ہوتے ہیں' اگر اعصاب کمزور ہیں تو وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں اور اس کے بعد پھر جو انسانیت کو اس سے نقصان پہنچتا ہے' آپ غور کیجیے کہ احساس والے تو اس طرح سے سمٹ کر سکڑ کر افیون کھا کر عدمِ احساس کے عالم میں' تزکیہ SELF (نفس) کے لیے اپنے آپ کو فنا کر دینے کے لیے' دنیا کو ترک کر دیں' گوشوں میں بیٹھ جائیں' ظلم کی قوتیں بے باک تر ہو جائیں۔

ظلم کی قوتوں کی بے باکی اور مہاتما بدھ کا فلسفہ حیات سینٹ پال کی سوچ اور پھر عیسائیت کا زوال

ظلم کی قوتیں اس قسم کے نظریئے اور فلسفے کو تھپکیاں دیتی ہیں' آدھی دنیا سے زیادہ مہاتما بدھ کے اس فلسفے کے پیراؤ ہو گئی ہو کہ ٹھیک

ہے صاحب! شر اور ظلم کو مٹایا نہیں جا سکتا اس لیے اس کے لیے یہی ہے کہ کنارا کش ہو کر ایک طرف ہو جایئے۔ نتیجہ اس کا باقی دنیا میں تو چھوڑ دیجئے خود ہندوستان کے اندر برہمنیت نے جو سر اٹھایا ہے اور وہ استبداد اور مظالم کیے کہ آج تک وہاں وہ سلسلہ جاری ہے۔ صرف اس لیے کہا احساس کرنیوالوں نے یہ فلسفہ اپنے اوپر عائد کر لیا کہ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے سلامتی اس میں ہی ہے کہ اپنے آپ کو عدمِ احساس کی آگ مین بھسم کر کے فنا کر دیا جائے۔ اگر حساس قلوب ہوں' کمزور اعصاب ہوں اور INTELLECTUALY ذہنی طور پر تیز ہوں پھر اس قسم کا فلسفہ دے دیتے ہیں۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں انسان بدھ کے زمانے سے آج تک' آپ دیکھیے' یہی وہ کیفیت تھی' جو سینٹ پال نے کی پھر آ کر عیسائیت میں کی۔ وہ عیسائیت کی صحیح آسمانی تعلیم کہ جو ظلم کو مٹانے کے لیے سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو گئی' اسی تعلیم کو اس شخص نے آ کر یہ کہہ دیا کہ ظلم مت نہیں سکتا تو اپنے سر پر رکھ کر اس کے گھر چھوڑ آؤ۔

انسانی سوچ کے دو رخ جن کے تباہ کن نتائج کا ماحصل بڑا ہی قابلِ غور اور باعث عبرت ہے

یہ کیا چیز تھی؟ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بہت بڑی سازش تھی لیکن اگر سازش نہ بھی کہا جائے' نہایت نیک نیتی بھی کہا جائے تو یاد رکھیے! تین چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں: (1) انسانیت کے دکھوں پر ظلم اور استبداد کے ہاتھوں سے ستائے ہوئے انسانوں کے قلوب حساس' اعصاب کمزور ہوں' ذہن اونچا ہو تو یہ شخص بہت بڑا تباہ کن فلسفہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور اگر یہ صورت نہیں ہے تو دوسری طرف طبائع میں سرکشی پیدا ہو جاتی ہے' اس معاشرے کے اندر نارگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی طبقے ہوتے ہیں: ایک طبقہ یوں اپنے آپ کو فنا کر کے' الگ ہو جاتا ہے' ظلم کی قوتیں بے باک ہو جاتی ہیں' دوسرا طبقہ' وہ ہے جس کے دل سے قانون کا احترام اُٹھ جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ قانون وانون کوئی شے نہیں ہے۔ انارکی کے معنی یہ ہوتے ہیں' حتٰی کہ انارکی کی انتہا وہ جا کر کمیونزم میں لے آتے ہیں کہ LAW LESS SOCIETY ہو گی' حکومت کی حکمرانی کی' قانون کی' آئین کی' کوئی جرورت نہیں ہے صاحب! آپ سوچیے کہ یہ کیا کیفیت پیدا کرے گا؟ انسانوں نے ممتدن زندگی بسر کرنی تھی' تمدنی زندگی کے اندر آئین اور قانون کوئی شے نہیں ہے اس کے اُٹھ کے توڑو۔ اس کا نتیجہ یہ کہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ قومیں ہمیشہ ظلم کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہیں اور یہ ہے کہ وجہ جس طرح سے تباہ ہوتی ہیں۔ انصاف کا احترام کرنے والے بھی' دیانت سے جینے والے بھی' آپ نے دیکھے ہوں گے' اپنے ہاں بھی چلتے ہیں' وہ مقابلہ چلے جاتے ہیں بڑی ہمتوں سے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک مقام آ جاتا ہے' جہاں آ کر وہ کہتے ہیں کہ نہیں' صاحب! یہ بات غلط ہے' ہو ہی نہیں سکتا' یہ اصول ہی غلط ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ یہ لوگ سمٹ کر گوشوں میں' کونوں کھدروں میں' جا بیٹھتے ہیں۔ اور جیسا میں نے عرض کیا' یہ تو انفرادی ذہن ہے اور اگر وہ INTELLECTUALLY ذہنی طور پر اونچا ہوا ہے تو وہ اس کو پھر فلسفہ بنا کر بتا دیتا ہے۔

سینٹ پال کے فلسفے کی نوعیت تو بری خطرناک ثابت ہوئی ہے

آپ حیران ہوں گے جو میں کہ رہا ہوں' اس کو کہیں پڑھنا نہ شروع کر دیجیے گا۔ بدھ کا فلسفہ تو خیر بہت کم ہمارے سامنے آتا ہے' سینٹ پال نے اس فلسفے کو ماڈرن LANGUAGE (زبان) میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ کے اعصاب مضبوط نہ ہوں' پاؤں میں استقامت نہ ہو' قرآن کے اصولوں کے اوپر یقینِ محکم نہ ہو' اس کی کسی کتاب کو نہ پڑھیے گا۔ وہ ایک تیز ندی کی طرح آتا ہے' بڑے بڑوں کے پاؤں اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہ کہتا کیا ہے؟ یہ کہ ظلم کا مقابلہ نہیں ہوسکتا' یہ غلط پالیسی ہے' صحیح چیز یہ ہے کہ اپنے آپ کو تم تباہ کر دو' ظلم کا حساس ختم کرو' اپنے آپ کو تباہ کرلو' اس کے بعد جو ہوتا ہے دوسروں کے ساتھ ہوتا رہے گا۔ اور اس کے لیے پھر جو دلائل دیتا ہے صاحب! میں نے کہا کہ INTELLECTUALLY HIGH ذہنی طور پر بلند سطح کا ہو تو پھر پوچھو نہیں کہ آدمی کیا کر جاتا ہے۔

انسان کی غلط نگہی کے برعکس قرآن حکیم کا پیغام کو اسکی راہنمائی کا نتیجہ

قرآن نے کہ ہے کہ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (2:281)۔

ما کسبت: یہ ہے کہ ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے گا' قطعاً اس کے اوپر ظلم نہیں ہوگا۔ اور ظلم نہ ہو' اس کے بعد پھر پوچھیے کہ انسانیت کتنی ترقی کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہ تو آکاس بیل ہوتی ہے جو انسانی معاشرے پر کم بخت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا' ربٰو کی آیات کے بعد' آخری یہ آیت دینا کتنا گہرا ربط ہے۔ اور میں کہوں گا کہ احکام کی علت اس کے اندر بتا دی اور یہ تبان دیا کہ قرآن جو آیا ہے تو محض وعظ کہنے کے لیے نہیں آیا کہا ہے کہ واتقوا یوما (2:281) دوسروں کی محنت کو غصب کرنے والو! ڈرو اس آنے والے دور سے کہ جس میں کسی کی محنت کو کوئی دوسرا نہیں لے جاسکے گا' ڈرو اس آنے والے دور سے۔ یہ تھا وہ آنے والا دور جو نبی کرم ﷺ کے مقدس ہوتھوں سے متشکل ہوا۔

قرآنی نظام یا معاشرہ متشکل ہونے تک کے لئے عبوری انتظامات کے سلسلہ میں حکمناً راہنمائی کی تفصیل

پھر بات اگلی شروع ہوئی۔ یہاں تو ربٰو تھا۔ جب تک وہ نظام قائم نہیں ہوتا' ضروریات ایک دوسرے کو پڑتی ہیں' اس کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر کسی کے پاس فالتو ہے' دوسرے کو ضرورت ہے تو بطور قرض کے دے دیجیے واپس آجائے گا' اس کی محنت سے کچھ نہ لیجیے۔ اور یہ دیکھیے کہ بات تو اتنی سی ہے کہ قرض دے دیجیے۔ انسانی معاملات کے اندر قرآن کریم' حسنِ معاملہ کے لیے اتنی تاکید کرتا ہے کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرض لیتے دیتے وقت تحریر ہونی چاہیے۔ یہ کس قسم کی ہونی چاہیے؟ قرآن کریم

میں سب سے زیادہ لمبی آیت وہی ہے‘ اس لیے کہ آپ دیکھیں گے معاشرے کے اندر بہت سے بگاڑ اسی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ لین دین کے معاملے کو انسان قانون اور ضابطے کے مطابق نہیں کرتا۔ اُس وقت تو یہ کہتا ہے کہ صاحب! آپس کی بات ہے‘ کونسی بات ہے‘ ٹھیک ٹھیک ہے ’’کوئی تہاڈرے تے ساہنوں اعتبار نئیں ہیگا تے (1)‘‘ اور اس کے بعد پھر آپ دیکھتے ہیں اس میں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن نے حکماً یہ کہہ دیا کہ یایھا الذین اٰمنوا اذاتداینتم بدین الیٰ اجل مسمًّی فاکتبوہ (2:282) یہ حکم ہے کہ جب تم کسی مدت کے لیے کسی کو کوئی قرض دو‘ تو اسے لکھ لیا کرو یہ فاکتبوہ حکم ہے۔ اب اس کے بعد لکھ لیا کرو کہ آگے اب تفصیل چلی آ رہی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآنِ کریم معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی سی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا۔ بری چھوتی سی بات معمولی نظر آتی ہے‘ اس کے جو عواقب ہیں‘ وہ برے دور رس ہوا کرتے ہیں۔ فاکتبوہ لکھ لیا کرو۔ و لیکتب بینکم کاتب بالعدل (2:282) تم میں سے جو لکھنا جانتا ہے‘ وہ اسے لکھے‘ لکھنے والے کے اوپر یہ تاکید ہے کہ وہ بھی عل کے ساتھ لکھے۔ اس زمانے میں ابھی لکھنا پڑھنا عام نہیں تھا لیکن ایسا بھی گیا غزرا معاشرہ نہیں تھا کہ عام طور پر ہمارے ذہنوں میں یہ بات پیدا کر دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ لین دین کو چھوٹا موٹا معاملہ بھی ہو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والا عدل کے عدل کے ساتھ لکھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں اتنے لکھنے والے موجود تھے۔ اور یا یہ کہیے کہ پھر یہ اسلام کی برکت تھی کہ اگر وہ صحیح بات ہے کہ مکے میں ظہورِ اسلام کے وقت سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو اس کے بعد پھر اسلام نے جو علم کے اوپر اس قدر تاکید کی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی وقت کے بعد اتنے لکھنے والے وہاں موجود ہوگئے تھے کہ یہ چیز کہی کہ جب بھی کوئی معاملہ اس قسم کا کرو‘ اسے لکھ لیا کرو اور کاتب عدل کے ساتھ لکھ لیا کرے۔ لکھنے پڑھنے کی تو صورت یہ ہے خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ ٹھیک ہے قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ نبوت کے زمانے تک آپ بھی نہیں لکھنا پڑھنا جانتے (2) تھے لیکن اس کے بعد تو پھر لکھنے پڑھنے کی تاکید تو اس انداز سے حضور ﷺ نے کی کہ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین تک جانا پڑے تو کیا یہ ہوسکتا تھا کہ آپ ﷺ وہاں خود مدینے میں یا مکے میں بیٹھے ہوئے علم بھی حاصل نہ کرتے؟ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ تو بہت بڑا استبداد ہے کہ ایک شخص جو باقیوں کو یہ کہتا ہے کہ علم کا حاسل کرنا ہر مسلمان عورت اور مرد‘ دونوں‘ پر فرض ہے ہو خود علم ہی حاصل نہیں کرے گا؟ جیسا میں نے ابھی عرض کیا کہ جو علم حاصل کرنے کے لیے چین تک بھیج رہا ہے وہ آپ خود کیا اسی طرح سے بیٹھا رہے گا؟ یہ جو چیز تھی اس سے پیشتر تو‘ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اس سے بھی بہت بڑا ایک نتیجہ اخذ کیا کہ یہ بات نہیں تھی کہ تو نے چپکے چپکے سے چالیس برس تک دنیا بھر کی کتابیں پڑھ ڈالیں‘ وہ سارا جتنا تصوف اور وحدت الوجود کا فلسفہ ہے‘ وہ محی الدین ابن عربی کی کتابوں سے لے لیا اور اس کے بعد چپکے سے پھر نبی بن گئے۔ یہ بڑی چیز تھی جھو کہی گئی ہے کہ اس سے پیشتر تو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا اس لیے یہ سوال ہی نہیں ہے کہ کہیں تم نے اور کی کچھ کتابیں پڑھ لیں اور اس کے بعد دعویٰ

نبوت کر دیا۔ ایسا شخص کہ جو اس سے پیشتر لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور وہ پہلی وحی جو اس کے اوپر آئی ہے آج بھی وہ دنیا کے علوم میں سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو یہ چیز اس کے لیے بھی بطور دلیل اور حجت کے آ جاتی تھی جو عام طور پہ کہا جاتا تھا کہ صاحب! عیسائیوں کے پادریوں کی اور یہودیوں کی، عبرانیوں کی، ان کی، کتابیں پڑھیں، ان کی باتیں سنیں، وہ دہرا دیں۔ بہرحال بات ضمناً آ گئی تھی کہ یہ نہیں تھا کہ نبی اکرم ﷺ ساری عمر ان پڑھ ہی رہے تھے۔ قرآن کی شہادت ہے اس نے خاص طور پر کہا کہ من قبلہ (29:48) نبوت سے پہلے تیری یہ حالت تھی، نبوے کے بعد نہیں تھی۔ اور پھر ایک مملکت کا سربراہ ہے کیا اس کی یہی کیفیت ہو گی؟ یہ باقی عمر وہ لکھنا پڑھنا بھی نہ سیکھ لے؟ کاتب کو چاہیے کہ عدل کے ساتھ لکھے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے قرآن کریم کی یہ سب سے بڑی آیت ہے ولا یاب کاتب ان یکتب کما علمه الله فلیکتب (2:282) بات تو لین دین کی ہو رہی ہے، ہدایات عمومی ہیں، جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے، وہ بخل نہ برتے اگر کسی کو اس کے علم سے استفادہ کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے تو وہ پھر کہے ''جا اوئے جا میں نئیں ویلا ہیگا کی میں تیرے واسطے پڑھیا ہیگا سی؟[3]'' یہ بات نہیں ہے جس کو تمہارے علم کی ضرورت ہے، یہ قرآن نے پہلے کہا ہے۔

---

(1) اگر آپ کے اوپر اعتماد نہیں ہے تو لے جائیے۔

(2) یہ چیز صرف سابقہ آسمانی کتب کے متعلق کہی گئی ہے۔ تلاوت کا لفظ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے تفصیل کیلئے دیکھیئے از پرویز: لغات القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ، گلبرگ، لاہور۔

(3) جا بے جا! میں فارغ نہیں ہوں۔ کیا میں نے تمہارے لئے پڑھا تھا؟

لفظ رزق کا قرآنی مفہوم

وما رزقنٰهم ینفقون (2:3) تو رزق کے معنی صرف یہ روٹی اور اناج کے نہیں ہیں۔ ''ہر وہ چیز جو انسان کی نشوونما کے لیے ملتی ہے، رزق میں داخل ہوتی ہے''۔ اور رزق جو ملا ہے کیس کو جو بھی سامانِ نشوونما ہے، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے جو کچھ ملتا ہے، وہ بھی رزق میں داخل ہوتا ہے۔ عربی زبان کی رو سے اور قرآن کے استعمال کی رو سے، اسے بھی تم نے کھلا رکھنا ہے۔ ینفقون کے معنی ہوتا ہے ''گرہ باندہ کر بیٹھ جانا'' کہا ہے کہ یہ نہ کرو اسے کھلا رکھو جسے بھی اس کے استفادہ کی ضرورت ہے، اس کے لیے تمہارا علم بھی کھلا ہونا چاہیے۔ کاتب کو یہ نہیں چاہیے یہ کہ وہ لکھنے سے انکار کرے۔

انسانی علم حاصل کرنے کی صلاحیتوں کا معاملہ ہو یا زمین کی پیداواری صلاحیتوں کا معاملہ انہیں خدا اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے

یہاں ایک بات کہی کہ کما علمہ اللہ (2:282) علم اُس نے حالانکہ خود حاصل کیا لیکن کہا یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں یہ علم حاصل کرایا، علم حاصل کرنے کی صلاحیت تو کدا کی عطا کردہ وہتی ہے علم حاصل کرنے مین محنت تو تم نے کی تھی لیکن بنیادی طور پر جو صلاحیت ہے، وہ تو ہماری دی ہوئی ہے۔ وہی بات آ گئی جو پچھلی دفعہ میں نے زمین کے معاملے میں کہا تھا جو خدا نے یہ کہ تھا کہ تم اس پر محنت کرتے ہو، پھر فصل پیدا ہوتی ہے، تم تو ہماری زمین میں محنت کرتے ہو، یہ صلاحیت ہماری عطا کردہ ہے سورج کی روشنی ہماری ہے، حرارت ہماری دی ہوئی ہے پانی ہمارا ہے، ہوائیں ہماری ہیں۔ اس بزنس میں، اس کاروبار میں اتنا ہمارا محنت تمہاری، اب جو فصل کاٹنے کا وقت آ گیا ہے تو کہا ہے کہ حقہ خدا کا جو اس میں SHARE حصہ اسے دید و تو تمہاری تو صرف محنت ہے، اس میں پانی محنت کے برابر لے لیجئے، باقی سارا جتنا بھی ہے، وہ اس کا حق ہے۔ وہ وہیں کہہ دیا جب پودھا گیا کہ صاحب دیں کس کو؟ یہ کون ہے وصول کرنے والا؟ کہا تماعًا للمقوین (56:73) یہ بھوکوں کا حصہ ہے ان تک پہنچا دیا جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، اس میں محنت اس کی اپنی ہوتی ہے۔ اس کی تحصیل، اس کے حصول کی صلاحیتیں، جتنی ہیں، وہ اسے مفت ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ انہی مفت ملی ہوئی کو یہ کہتا ہے کہ خدا کی عطا کردہ ہوتی ہیں اور اسی لیے وہ کہتا ہے کہ جو کچھ بھی تم کماتے ہو وہ تمہارا اور ہمارا ایک مشترکہ کاروبار ہوتا ہے۔ تم نے محنت کی، ہم نے (آج کی اصطلاح میں) یہ اتنا بڑا سرمایہ انوسٹ کیا ٹھیک ہے تم اپنی محنت لے جاؤ، ہم اس میں سے کچھ نہیں مانگتے، ہمارا حصہ ہمیں دے دیجیے۔ اور وہ ہم کہاں خرچ کریں؟ جو بھی صاحب احتیاج ہین ان کو دے دیجیے۔ کیا نظام ہے!

کمیونزم اور اسلام میں فرق کی نوعیت یہ ہے کہ خدا انسان سے اپنی حصہ طلب کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں بنیادیں اسلام کے نظام کی۔ لوگ مماثلت ڈھونڈتے ہیں کہ ہاں صاحب! دیکھیے قرآن کی رو سے بھی زمین پر ملکیت نہیں ہے، کمیونزم کی رو سے بھی زمین پر ملکیت نہیں ہے، اس لیے قرآن اور کمیونزم ایک ہوا۔ چل بھئی! اتنے سے ہی ایک ہوا یہ جو بنیاد ہے اس کی بنا کے اوپر آپ دیکھیے کہ ایک ہوتا ہے۔ یہیں تو سارا فرق آ کر پڑتا ہے۔ وہاں انسان کے لیے کمیونزم میں کوئی جذبہ محرکہ ہی نہیں ہوتا کہ جو کچھ کہ جو کچھ یہ حاصل کرتا ہے، اس میں سے کیوں کسی دوسرے کو دیدے۔ یہ جذبہ محرکہ اس سے پیدا کرتا ہے کہ جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے، یہ مشترکہ کاروبار ہے۔ کمیونزم کے معنی یہ ہو گئے اس میں اشتراک ہے لیکن اس اشتراک میں کون کون شامل ہیں؟ تم شامل ہو اور خدا شامل ہے۔ ٹھیک ہے، تمہارا حسہ تمہارے پاس، ہمارا حصہ ہمیں دیجیے، ہمارا یہ جو حصہ ہے ان کو جن میں اتنا کمانے کی صلاحیت نہیں یا جن کے کاروبار ساکن ہو گئے ہیں ان میں بانٹ دیجیے۔

قارون کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی اور قرآن حکیم کا ارشاد

قارون نے کیا کہا تھا؟ جب اس سے کہا تھا کہ تمہارے پاس اتنی دولت آ گئی ہے تو بھئی! لا تنکس نصیبك فی الدنیا (28:77) کہا پہلے تو کہ کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا نہ بن جاؤ اور یہ؟؟؟؟؟؟؟؟ کہ اگر کسی اور کو نہیں دیتا تو اپنے آپ پر ہی خرچ کر تو نے۔ یہ جاننانوے کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں، کبھی ان کو دیکھیے وہ دو وقت کی روٹی کی بجائے ایک ہی وقت کی روٹی رکھ لیتے ہیں، وہ بھی چار پیسے بچاتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ خزانہ کم بخت کے پاس اتنا ہے کہ اسے یہ کہنا پڑا کہ تو اگر میر نہیں بنتا، نہ بن اپنے تو بن۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے کہا گا کہ نصیبك فی الدنیا (28:77) اوادھر دنیا میں تیرا اپانی حصہ ہے، کم بخت! اس کو تو اس کے ساتھ حاصل کر۔ اور پھر یہ کہ جو باقی ہے، یہ تمہارا نہیں ہے۔ اس نے یہ کہا تھا، دلیل یہ دی تھی کہ نہیں! یہ جو کچھ حاصل کیا ہے یہ میں نے اپنے علم و ہنر کی بنا پر حاصل کیا ہے، اس لیے یہ میرا ہے، کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں دخل اندازی کرے۔ اور جواب دیا گیا تھا کہ اس سے پوچھو کہ یہ علم و ہنر کی صلاحتیں اس نے کہا سے خریدی تھیں؟

مملکت کا نظام صرف جذبات ے تابع نہیں چلتا وہ قربانی کا طلب گار بھی ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ ہے وہ بیناد جہاں آپ کے ہاں کے اسلام کے نظام کا اور دنیا کے دوسرے تمام نظاموں کا فرق پڑتا ہے۔ وہاں یہ بنیاد نہیں ہے، اسی کا نام ایمان باللہ ہوتا ہے۔ یعنی ہر صلاحیت کے متعلق یہ ایمان ہو کہ یہ تیری عطا کردہ ہے اور پھر اس سے کہ پوچھنا ہے کہ بتا، اس کا جو حصہ تیرا ہے اس کی بنا پر جو مجھے ملا ہے، میں وہ کسے جا کر دے دوں۔ نظام اس طرح سے چلتے ہیں، محض جذبات کے رور پر نہیں چلا کرتے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ کہا یہ کہ کما علمه الله (2:282) عزیزانِ من! ایک سیدھی سی آیت ہے کہ قرض کے لین دین جو معاملات ہیں انہیں لکھ لیا کرو۔ آپ دیکھیے کہ قرآن! اس کے اندر کیا کچھ کہتا چلا جاتے ہے کما علمه الله (2:282) اسے کہا کہ و لا یاب کاتب (2:282) صرف انکار کرنا ہی نہیں، بلکہ دل گرفتگی اس کے اندر یہ آتی ہے، یونہی ذرا سا محسوس کرنا کہ ''کی مصیبت پے گئی روز آ جاندا اے خط پڑھ دو جی، کہ خط لکھ دو جی[1]'' کہا کہ یہ نہیں کیونکہ کما علمه الله (2:282) تمہیں جو علم حاصل ہوا ہے، محنت تو تمہاری تھی، جو زیادہ تھی صلاحیت تھی، اس کا حصہ ہم تجھ سے مانگتے ہیں۔ الیملل الذی علیه الحق (2:282) ہدایات سنیے جس نے قرض لیا ہے، وہ املا کرائے، اس دستاویز کو وہ لکھائے۔ عزیزانِ من! چھوٹی سی بات ہے، قانون کی جامعیت دیکھیے! و لیتق الله ربه و لا یبخسمنه شیئًا (2:282) لکھنے والا یہ لکھائے یعنی وہ ہے جو خود نہیں لکھ سکتا، یہ لکھا رہا ہے اس سے کہا جا رہا ہے، لکھتے ہو تو قانونِ خداوندی کو نگاہ میں رکھو اس میں کوئی ذرا کمی نہ کرو جو وہ کہہ رہا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے وہ جو سکھنے والی بات ہوتی ہے وہ اب تو فن بن گیا ہے وہ صاحب! اس لکھنے کے اندر ہی وہ کچھ ہو جاتا ہے کہ پوچھیے ہی نہیں صاحب! فان کان

الذی علیه الحق سفیھًا او ضعیفًا او لا یستطیع ان یمل ھو فلیملل ولیه بالعدل (2:282) لکھنا پڑھنا نہیں جانتا لیکن اگر وہ ایسا بے چارہ بے وقوف سا ہے‘ کمزور ہو گیا ہے‘ لکھا بھی نہیں سکتا‘ تو یہ جو اس کا ولی ہے‘ اس کا سرپرست‘ اس کو دوست ہے وہ لکھائے‘ قرض دینے والا پھر نہ بھی نہ لکھائے۔ پھر کہا کہ واستشھدوا شھیدین من رجالکم (2:282) اس پر دو مرد گواہ مقرر کر لیجیے۔

---

(1) کیا مصیبت پڑی ہے کہ روز آ بیٹھتا ہے کہ جناب! یہ خط پڑھ دو‘ یہ خط لکھ دو۔

زندگی کے معاملات میں عورت کی گواہی کا معاملہ اور اس کی حقیقت

اب آ گئی وہ آیت‘ بڑی اہم‘ ہے میرے جو بیٹیاں اور بہنیں ہیں‘ وہ غالبًا اس پر کان کھڑے کریں گی۔ کہا ہے کہ فان لم یکونا رجلین فرجل و امراتٰن ممن ترضون من الشھدآء (2:282) دو مرد نہ ملیں‘ ایک مرد ملے اور دوسرا نہ ملے‘ تو اس کی جگہ دو عورتیں لو۔ چل بھئی! مل گئی ایک چیز‘ ہو گئی کھڑی عمارت ثریا تک۔ بقول ان کے قرآن کہتا ہے کہ عورتیں ناقص ہوتی ہیں‘ دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہاں سے یہ چیز کہی اور سنی؟ کہ صاحب! وہ دیکھ لیجیے لکھا ہوا ہے کہ اگر ایک مرد نہ ملے تو دو عورتیں لو۔ ٹھیک ہے جو! لکھا ہوا ہے۔ برادرانِ عزیز! غور طلب چیز یہ ہے کیونکہ لکھا ہوا ہے۔ پوری آیت آگے تک ذرا دیکھ لیجیے کہا ہے کہ ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخرٰی (2:282) اگر ان میں سے ایک عدالت میں کھڑی ہے‘ ذرا تصور میں لائیے آج تعلیم بھی اتنی عام ہو گئی ہے‘ بہرحال عورتیں ہیں پہلی عورتوں کے مقابلے میں کچھ معاملات میں بھی آگے بڑھ گئی ہیں‘ سمجھ بوجھ بھی ہو گئی ہے‘ اخبارات بھی گھروں میں آتے ہیں‘ لڑکیاں بچیاں بھی پڑھی ہوئی ہوتی ہیں‘ اس کے باوجود پہلی دفعہ ان میں سے کسی عورت کو لے جا کر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجیے‘ صاحب! یہ تو بے چاری عورت ہے‘ اچھے بھلے مرد کو پہلی دفعہ جا کر آپ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجیے اور پھر دیکھیے وہاں ہوتا کیا ہے؟ اس نے کیا دعویٰ دائر کیا کہ اس نے مجھے مارا ہے‘ عدالت میں جا کے کھڑا ہو گیا اور مارنے والا سامنے کھڑا تھا‘ اب مجسٹریٹ اسے پوچھ رہا ہے کہ ہاں بتاؤ بھئی! تمہیں اس نے مارا تھا؟ اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور خاموش ہے۔ کہتا ہے کہ بتاؤ تمہیں اس نے مارا تھا؟ ہونٹ کانپ رہے ہیں‘ رنگ زرد ہار رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ او بتاتا کیوں نہیں؟ کہتا ہے جی پانی۔ پانی پانگ رہا ہے‘ یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

معاشرتی طور پر دورِ اولیٰ میں عورت کی حالتِ زار

عورت پہلی مرتبہ جا کر کٹہرے میں کھڑی ہو‘ آج یہ کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ کس زمانے کی عورت کا ذکر ہو رہا ہے‘ قرآن سے پوچھیے

بات صاف کر دیتا ہے۔(43:17) میں کہا ہے کہ عورت کی کیفیت ان کے ہاں یہ ہے کہ لڑکی پیدا ہوتی ہے' باپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جھاتا ہے' چھپتا پھرتا ہے' سوچتا ہے کہ اسے اپنی بے عزتی کے لیے زندہ رکھوں یا آج ہی دبا دوں اس کو؟ پوزیشن معاشرے میں عورت کی یہ ہے' لڑکی کے پیدا ہونے پر گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد ہے کہ او من ینشوء ا فی الحلیته(43:18) زیادہ سے زیادہ اس کے لیے کیا یہ جاتا ہے کہ اس بے چاری کو گڑیا کی طرح کچھ زہور بنوا دیئے جاتے ہیں اور یوں رکھا جاتا ہے کہ اس کو نہ تعلیم نہ تربیت' نہ کسی قسم کے معاملات میں دخل اندازی یعنی عرب معاشرے میں جاہلیتِ عرب کے اندر جب عورت کی یہ پوزیشن ہو کہ اس کی پیدائش رنگ سیاہ پڑ گئے اور پھر اگلی بات قرآن نے کیا کہی کہ جہاں عورت کی کچھ عزت افزائی بھی ہوتی ہے تو اتنی ہوتی ہے کہ اس کو بس چار زیور بنوا دیئے جاتے ہیں۔ کہا کہ اس سے ان باچاریوں کی کیفیت کیا ہوگئی؟ وھو فی الخصام غیر مبین (43:18) اور تو یہ بے چاری اپنا مقدمہ بھی کہیں پیش نہیں کر سکتی اپنا معاملہ بھی جہاں کہیں اس کا آتا ہے' زبان منہ میں رکھنے کے باوجود گونگی ہوتی ہے' باتی کرتی ہے تو غیر مبین بات ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ عورت' جس عورت کو گواہی کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ بڑی نیچرل سی بات ہے' کہیں جانا ہو' ہمارے ہاں آج تک بھی یہ چیز تھی کہ بری بوڑھیاں ہمارے ہاں کی جانے لکھیں' کبھی اکیلی نہیں جاتیں' شادی میں جانا ہو' کہیں پرسہ پر جانا ہو''نی بھیناں میرے نال چلیں ذرا تھوڑا[1]'' ایک کو ساتھ لیتی ہے' وہ اپنی جنس میں سے اس کی تقویت ہوتی ہے۔ وہاں سارے غیر ہوتے ہیں' یہ اپنی جنس میں سے کسی کو ساتھ رکھتی ہے' اسے بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔ ہ جو قرآن نے دوسری ساتھ رکھی ہے یہ محض اس کا حوصلہ بندھانے کے لیے ہے۔

---

(1) ارے بہن! ذرا میرے ساتھ چلنا۔

دو عورتوں کی شہادت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی وضاحت

سنیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ اگر یہ دو شہادت کے لیے پیش ہوئیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ ایک کی شہادت پہلے لے لی جائے' پھر اس کے بعد دوسری کی شہادت بھی لی جائے جب یہ ایک مرد کے برابر ہوگی۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ان دونوں کی شہادت لی جائے۔ کہا یہ ہے کہ اس دوسری کو وہاں ساتھ کھڑا کرا اگر یہ کھری کہیں CONFUSE ہوگئی ہے بے چاری تو وہ ساتھ والی کہہ دے کہ نہیں نہیں ایسے ہوا تھا تو پھر اسے یاد آئے کہ اس طرح ہوا تھا۔ یہ اتنی سی بات ہے بس۔ پھر سن لیجئے قرآن نے یہ نہیں کیا کہ ان دونوں کی شہادتیں لی جائیں۔ غور طلب چیز یہ ہے' دو شاہد نہیں ہیں ایک کے برابر' ایک کی شہادت ہے۔ شہادت میں یہ امکان تھا' وہ غیر مبین جو ہے' فی الخصام جو اپنے جھگڑے میں اپنا معاملہ بھی پیش کر سکتی' مردوں کی کچہری میں جا کر یہ کیفیت ہو سکتی ہے اور یہاں تضل آیا

ہے اس کے معنی ہوتا ہے CONFUSE ہو جانا کسی معاملے کے اندر کسی بات کو بھول جانا۔ دوسری اس لیے ہے کہ احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ (2:282) دوسری اس کو یاد دلا دے۔ قرآن نے یہ یہاں سے عورت کی ابتدا کی اور یہاں سے ابتدا کرنے کے بعد پھر قرآن نے عورت کو کیا کہا۔ وہ تو موضوع ہی الگ ہے، جب کبھی قرآن میں ذکر آئے گا کہ عورت کو قرآن نے کہاں سے کہاں پہنچایا اور کیا بنا دیا تو عرض کروں گا۔ یہ جو عورت کا خاص موضوع ہے کہ وہ بات کرنے میں غیر مبین واقع ہوئی ہے، قرآن کہتا ہے کہ پھر اس کے بعد کیا ہو۔ پھر میں ضمناً عرض کر دوں کہ آپ جنت کی حوروں کی طرف چلے جائیں گے، یہاں اس دنیا میں تو آپ کو حور جوئی عورت نہیں مل رہی، ہماری جو بیٹیاں اور بہنیں ہیں، یہ حوروں کی صفات نہیں رکھ سکتیں، وہاں جا کر آپ کو اس کے لیے ڈھونڈنا پڑے گا۔ برادرانِ عزیز یہ یہیں ہیں۔

عورت کی نشط کا ثانیہ دور

قرآن کہتا ہے کہ انا انشأنٰھن انشاء (56:35) ہم اب عورت کو ایک نشاۃِ ثانیہ دینے والے ہیں، ایک نئی مخلوق اس کو بنا دینے والے ہیں، اس عورت کو جو اپنے جھگڑے میں بھی غیر مبین واقع ہوئی تھی، جس کی پیدائش پر باپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا، اس عورت کو ہم ایک نئی نشاۃ دینے والے ہیں۔ عزیزانِ من! سنیے قرآن کا لفظ فجعلنٰھن ابکارًا (56:36) اس کے بعد بلکل نئی مخلوق بن جائے گی اور اس نئی مخلوق کی کیفیت کیا ہوگی؟ عربًا اترابًا (56:37) مرد کی ہم رِگل ایک مٹی سے دونوں بنے ہوئے عربًا فصیح البیان عرب اپنے آپ کو نہایت فصیح البیان' کہتے تھے کوئی مقابلہ نہیں کرتا۔ کہتا ہے یہ جو غیر مبین ہے، اب وہ قرآن کی تعلیم و تربیت سے نشاۃ ثانیہ ہوگی۔ کیا بات ہے! بات کہنے کی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں اس کے معنی کیا لیے جاتے ہیں فجعلنٰھن ابکارًا (56:36) بات کہنے کی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں اس کے معنی کیا لیے جتے ہیں ۔ میرے بچیاں اور بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ تفسیروں میں دیکھیے گا جس قدر SEX PERVERSTION ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی، فوراً ذہنوں کے اندر وہی چیز آتی تھی۔ بات کو چھیڑیئے نہیں۔ ایک بالکل نئی مخلوق ہم بنا دین گے اور عربًا اترابًا (56:37) اس کی کیفیت ہوگی

عورت اور مرد کی تخلیق تو ایک ہی مٹی سے ہوئی ہے

عزیزانِ من! دو الفاظ اترابًا ہم رِگل کے کہتے ہیں، تراب تو آپ کو پتہ ہے کہ مٹی کو کہتے ہیں کہا ہے کہ مرد و عورت ہم رِگل ایک مٹی کے بنے ہوئے عربًا جیسے فصیح البیان اپنے آپ کو کہتے ہیں، یہ فصیح البیان ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب اس کی کیفیت یہ ہو جائے گی تو پھر

تو یہ اپنا معاملہ جھگڑ سکے گی ہے پھر یہ اس کی کیفیت ہو گی کہ یہ ان معاملات کے اندر CONFUSION سے باہر لائے۔

یہی عورت جب مملکت کی سربراہ بن جائے گی اور وہاں پھر وہ اپنی گواہ خود آپ ہی ہو گی

عزیزانِ من! قرآن کریم مرد اور عورت کو بعضکم لبیض کہتا ہے' ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں جس طرح سے کہتے ہیں زندگی کے ہر گوشے کے اندر ان کو ہم دوش چلاتا چلا جاتا ہے کہتا ہے کہ ان المسلمین و المسلمٰت و الموء منین و الموء منٰت و التــانتیــن و القٰـنتٰـت (33:35) آپ اس آیت کو دیکھیے صاحب! ہر شعبے میں دونوں کو ہر گوشے میں برابر دکھایا ہے حتیٰ کہ وہ اتشائحُون سائحٰت (66:57) بھی کہتا ہے یعنی سیر و سیاحت کرنے والے مرد اور سیر و سیاحت کرنے والی عورتیں۔

قرآن کے نزدیک زندگی کے معاملات میں تحریری گواہی کی حکمت

یہ بات دوسری طرف چلی گئی۔ کہا ہے ہے دو شاہد مقرر کر لیا کرو' اگر مرد نہ ملے تو دو عورتیں اس میں رکھ لیں تاکہ یہ صورت ہو۔ و لا یـاب الشہد ء أاذد مادعوا (2:282) گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں۔ ولا تسئموا ان تکتبوہ صـغیـرًا او کبیـر اً لـیٰ اجلـہ (2:282) یاد رکھو! اس معیاد کے اندر جو قرض یا پھر دہرا دیا کہ قرض چھوٹا ہو' بڑا ہو' معاملہ ضرور لکھ لیا کرو۔ بڑی تاکید ہو رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا حکمِ حاکم مرگِ مفاجات؟ ڈکٹیٹر کا حکم نہیں ہے' قرآن نے کتاب' قانون دیا ہے۔ اب حکمت آئی ہے کیا ہے کہ ذٰلکم اقسط عنداللہ و اقوم الشھدادۃ و ادنیٰ الا ترتابوا (2:282) یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ بعد کو تمہارے ہاں جھگڑا نہ نکل آئے۔ جھگڑے کی بات پیدا ہو تو لکھت والی چیز یعنی کاغز تمہیں بتا دے کہ کیا ہے۔ خدا کے نزدیک تو بہتر یوں ہوا کہ ہم نے کہا ہے تم نے مانا ہے' باتے اصل میں یہ ہے۔ ادنی الا تـرتابوا (2:282) اس سے سب کی گنجائش باقی نہیں رہے گی' جھگڑا نہیں پڑے گا' تمہارے تعلقات نہیں بگڑیں گے اس لیے ہم یہ کہہ رہے ہیں اور الا ان تـکـون تـجـارـۃً حاضرۃً یـدیـرو نھا بینکم فلیس علیکم جناح الا تکتبوھا (2:282) لیکن یہ جو آپ کان داری کا کاروبار کرتے ہیں ذرا سی چیز کہ وہ ایک بنڈل دینا بھئی! گاہک آیا ہوا ہوتا ہے' وہ اپنے پاس ہوتا نہیں' دوسرے کان دار سے وہ کہتا ہے کہ ذرا ایک بنڈل دے دینا' وہ لے گیا' آدھے گھنٹے کے بعد لوٹا دیا' کہا کہ اس کے لیے ضرورت نہیں ہے۔ یعنی اگر اس میں بھی سارا دن لکھت پڑھت ہوتی رہے اور دو گواہ بھی مقرر کیے جاتے رہیں تو پھر ہو چکا کاروبار۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس کتاب کی بلندیوں پر جاتا ہے' ثریا کی باتیں کر رہا ہے' ہمارے جو چھوٹے چھوٹے معاملے ہیں ان میں DETAIL (تفصیل) تک چلا جاتا ہے۔ و اشھـدو ا اذاتبـایعتم و لا یـضأ ر کاتب و لا شھید (2:282) یہ جو تجارت ہے اس مین تو یہ کچھ کرو پھر اس میں جو بیع ہے' اس کی اور بات کی' وہ لمبے سودے

جوتم کرتے ہو'اس میں کہا کہ یہ لکھ لیا کرو۔ یہ جو تجارۃ حاضرۃً تدیر و نھا (2:282) ہے' وہ جو یوں لوٹ پلٹ کرتے رہتے ہو' دن بھر اس میں تو یوں کرو۔

گواہی دینے والے کے تحفظ کو یقینی بنانا ہا گا

لیکن اگر وہ بزنس کا معاملہ لمبا پڑنے والے ہے' تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچے' مصیبت مین ہی وہ ساتھ نہ پھنس جائے۔ یہاں تو لوگ اس لیے گواہی نہیں دیتے کہ وہ جو مقدمے والے ہیں ان کو تو کن پریشانی ہوتی ہے' یہ بے چارے مفت میں ہی مارے جارہے ہوتے ہیں صبح سے شام تک گئے ہوئے ہیں وہاں بیٹھے ہوئے ہیں' ایک پارٹی آ کر زور ڈال رہی ہے' پھر دوسری آ رہی ہے کہ تو دیکھ شہادت دے کے۔ جو کچہری میں مارے گئے تھے وہ شہادتیں ہی تو لکھوانے گئے تھے بے چارے۔ اور روز یہ کچھ ہوتھے۔ کہاں پہنچتا ہے قرآن! کہا کہ ولا یضآ ر کاتب و لا شھید (2:282) جو گواہ یا کاتب ہیں' ان کو کوئی اذیت نہ پہنچے یاد رکھو! وان تفعلوا فانہ فسوق بکم (2:282) اگر ایسا کرو گے تو یاد رکھو! صحیح پیٹرن سے نکل جاؤ گے۔ واتقو اللہ (2:282) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یعلمکم اللہ (2:282) یہ باتیں خدا تمہیں سکھا رہا ہے واللہ بکل شیءٍ علیم (2:282) وہ خدا جو علیم واقع ہوا ہے۔

سفر کے دوران باہمی لین دین کی صورت میں دی گئی قرآنی ہدایت

وان کنتم علیٰ سفرٍ ولم تجدو اکاتبًا فرھٰن مقبوضۃ (2:283) اگر سفر میں ہو کا معاملہ کیا ہے' کاتب مل نہیں رہا' تو کیا کریں؟ کرو یہ کہ کوئی چیز دوسرے کی امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لو۔ یہ جو آپ کے ہاں رہن ہوتا ہے۔ رہن تو بالقبضہ ہوتا ہے۔ یہ بالقبضہ کیا ہوتا ہے؟ ''کی جی سوونئیں' مکان رہن رکھ لیا سی اوہدا[1]'' مکان کا کرایہ جتنا ہے وہ وصول کیے چلے جاتے ہیں' وہ اصل میں سے منہا نہیں کرتے۔ اور گاؤں میں تو وہ جو زمین رہن رکھ لیتے ہیں بس پھر یہ ساری زمین ان کی ہوگئی اس کی آمدنی کھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں سے وہ لیا صاحب! قرآن نے جو کہا کہ رہن رکھ لیا کرو۔ ارے وہ تو کہا ہے کہ اگر کاتب وہاں لکھنے والا نہ ملے تو اس کے لیے بطور ضمانت یہ اس کی چیز کوئی لے لیا کرو اور اس کی بھی یہ کہا ہے کہ فان امن بعضکم بعضًا فلیوء دالذی ائو تمن امانتہ (2:283) لیکن اگر تمہیں اس کے اوپر اعتماد ہو کہ مکر نہیں جائے گا تو پھر ٹھیک ہے۔ اب کہا کہ دیکھو بھئی! یہ جس نے قرض لیا ہے' تمہارے بھائی نے' تجھ پر اعتماد کیا ہے' اس امانت میں خیانت نہ تم کرو ایمانداری سے اس کو آ کے لوٹا دو۔ ولیتق اللہ ربہ (2:283) پھر وہی بات ہر معاملے میں خدا درمیان میں آتا ہے۔ یہی تو بنیاد ہے۔

---

(1) جی! سود نہیں' اس کا مکان رہن رکھ لیا تھا۔

صرف قانون کی بنا پر کوئی معاشرہ تشکیل نہیں پاتا

عزیزانِ من! خالی قانون سے کبھی معاملات نہیں سدھر سکتے' اخلاق نہیں بن سکتے قانون تو صرف ان مجرموں کے لیے ہوتا ہے جن میں اخلاقی حسن باقی نہ ہو۔ معاملات جو صاف رہتے ہیں' اخلاق کی بنا پر رہتے ہیں۔ قرآن بنیاد رکھتا ہے۔ جہاں اللہ درمیان میں لاتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے قلوب کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرو' قانون صرف ان مجرموں کے لیے رکھ دو کہ جن کے اندر اخلاق کی حس بیدار نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم کے نزدیک مجرمین کو سزا دینے کا مقصد انکی قانونی حس کو بیدار کرنا ہی ہوتا ہے

ان کو سزا بھی جو قرآن دیتا ہے تو وہ ان کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے دیتا ہے' تربیت کے لیے ان کو الگ رکھتا ہے' تعلیم کے لیے الگ رکھتا ہے۔ ولا تکتموا الشھادة (2:283) شہادت چھپاؤ نہیں۔ امن یکتمھا فانه اٰثم قلبه (2:283) آہا ہا آہا ہا!! گواہی کو چھپانے والا' کہتا ہے ٹھیک ہے' چھپا تو دیا' اس کے بعد اس کے قلب پر ایک افسردگی اور اضمحلال چھایا رہتا ہے کہ میں نے حقیقت کو چھپایا ہے' جری القلب نہیں رہتا' بے باک نہیں رہتا۔ ایک سچ کو کہیں چھپائے اور اس کے بعد آپ دیکھیے کہ آپ کی بے باک جرآئتیں کس قدر افسردہ ہو جاتی ہیں' ہر وقت پتے پتے سے ڈر رہتا ہے کہ صاحب! اس نے اگر کہہ دیا اوئے جھوٹے بے ایمان! وہ معاملہ یوں ہوا تھا جیسے تم نے عدالت میں جا کہ کہا تھا۔ وہ ہر شخص کے سائے سے ڈر لگتا ہے۔

سچے معاشرے میں جھوٹے شخص کی قلب و نگاہ کی جرات پژمردہ ہو جاتی ہے

میں آج کے معاشرے کی بات نہیں کر رہا۔ یہاں ہر ایک کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ بھی جھوٹا' میں بھی جھوٹا۔ معاشرے میں ابھی برائی سمجھنے کا احساس ہو اور وہاں اگر کسی نے شہادت کو چھپایا ہو اور غلط بیانی کی ہو یا اس کے بعد پھر وہ اس معاشرے کے اندر آئے تو اس مین جو کیفیت ہوگی قرآن نے ایک لفظ کہا ہے کہ فانه اٰثم قلبه (2:283) بظاہر تو وہ کچھ نہیں نظر آئے گا' اس کے ماتھے پر لکھا ہوا تھوڑا ہو گا لیکن اس کے قلب کی جرائتیں پژمردہ ہو جائیں گی۔ برادرانِ عزیز! جھوٹے کے اندر کبھی جرآتیں باقی نہیں رہتیں' یہ تو صداقت کا ہی ایک کرشمہ ہے کہ انسان کی جرآئتیں بڑی بے باک ہوتی ہیں' کتنے دھڑلے سے کھڑا ہو کر کہتا ہے: جس کا حساب پاک ہے' اس کو محاسبہ سے کونسا ڈر ہو سکتا ہے۔ ایک جھوٹ بولیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کے قلب کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ واللہ بما تعملون علیم

(2:283)۔ پھر وہی بات آ گئی' چھپالیا' تم نے عدالت سے چھپالیا' تم نے اپنے ہم جولیوں سے چھپالیا لیکن اُس سے تو نہیں چھپا سکتے جس کی نگاہ قلب کے اوپر ہے۔

سورۃ بقرہ کی آخری آیات کی اہمیت اور پھر خداوندی حقیقت کو آخر پر لانے کا مقصد

عزیزانِ من! اس کے بعد سورۃ البقرہ وہ آخری آیات آ گئیں۔ یاد رکھیے گا جیسے ہر آیت کے آخر میں جو خدا کی صفت بیان ہوتی ہے' میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا تھا' اس پر سے یوں گزر جایا کرو کہ کہیں اس نے غفور رحیم کہہ دیا' کہیں اس نے علیم و بصیر کہہ دیا' کہیں خبیر کہہ دیا ۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہاں اس نے کوئی کافیہ لا ہے یا ردیف کے لیے یہ الفاظ لانے ہیں۔ یاد رکھیے! اس صفتِ خداوندی کا اس آیت کے نفسِ موضوع سے بڑا گہرا تعلق ہوتے' جو وہاں قرآن لاتا ہے۔ قرآن کی آیت کے جو بیشتر مفہوم تھے' اپنا بھی یہ عرض کروں گا' یہ جو آخر میں قرآن خدا کی صفت لایا تھا اس سے اس مفہوم پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ بات کیا کہنا چاہتا ہے۔ اسی طرح سے ہر سورۃ کے آخر میں جو قرآن آیت یا ایک دو آیات لاتا ہے' اس کے اندر وہ SUM UP کر کے رکھ دیتا ہے' اس میں ارتکاز ہوتا ہے ''تت کڈ کے رکھ دیندا ہیگا اوس چیز دا[1]'' سورۃ البقرہ قریباً اڑھائی پارے کی یہ پہلی سورۃ ہے۔ بات کیا کہنا چاہتا تھا وہ قابلِ غور تھا۔

---

(1) اس چیز کا ملخص نچوڑ نکال کر دیتا ہے۔

انسانی زندگی کا اس خارجی کائنات سے ربط

ساری قابلِ غور چیز انسانی قلب کے اندر اس کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا' ان کو قوانینِ خداوندی کے چینل کے اندر لیتے چلے جانا ہے' قدم قدم کے اوپر اپنی کمزوریوں پہ نگہداشت کرنا ان کمزوریوں کے بدلنے کی' کہا ہے کہ ان کی جگہ اپنے اندر صلاحیتیں بیدار کرنے کی تمنائیں اور آرزوئیں پیدا کرتے چلے جانا ہے اب یہ دیکھیئے کہ سب سے پہلے اقتدارِ خداوندی آتا ہے' کہا ہے کہ للہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض (2:284) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے' سرگرمِ عمل ہے۔ لہذا تم بھی تو کائنات ہی کا ایک جزو ہو' تمہاری ہستی بھی اسی لیے ہے کہ تم بھی اس کے پرگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل رہو للہ مافی السمٰوٰت و مافی الارض (2:284) کے بعد کہا کہ و ان تبدو امافی انفسکم او یخفوہ یحاسبکم بہ اللہ (2:284) تم جو کچھ ظاہراً عمل سے کرو حتیٰ کہ جو کچھ تمہارے دل کے اندر بھی گزرے' وہ اندر چھپا کر رکھو لیکن یاد رکھو! تم لوگوں کی نگاہوں سے چھپا سکتے ہو' خدا کی نگاہوں سے نہیں چھپا سکتے۔ عزیزانِ من! یہ خدا کی نگاہیں کیا ہیں؟ یہ کس طرح پہنچتی ہیں؟ کیا کوئی OBJECTIVELY (خارج سے) ہے جو اس طرح سے لکھ رہا ہے؟ کیا کوئی سی آئی ڈی کا ایک افسر ہے کہ جس کا مجمع کا اندر پتہ نہیں

چل رہا؟ میں سمجھتا ہوں کہ سارے سامعین قرآن سننے آئے ہیں کہ نہیں جی! اس میں تو وہ بھی وہوتے ہیں، تمہیں کیا پتہ؟

انسانی عمل کا ہر ہر پہلو اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی اس کا نامہ اعمال ہے

عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے۔ کوئی غیر نہیں ہے کہ انسان کی ذات ہے جسے خدا کے قانون کے تابع سرگرمِ عمل رہنا ہے یہ ہر شخص کے اندر ہے ہر شخص کا عمل حتیٰ کہ اس کا ارادہ اور نیت، اس کی ذات پر ایک نقش منقش کر دیتی ہے، یوں کہیے کہ ایک نشان اس پر پڑ جاتا ہے۔ نشانات دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو اس ذات کی تقویت کا اور نشوونما کا باعث بنتے چلے جاتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو اس کے اضمحلال اور ضعف: (DISINTIGRATION) کا موجب بنتے چلے جاتے ہیں، ساتھ کے ساتھ نیت تک، ارادے تک، اس پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی انسان کی ذات ہے جو اس کا اعمال نامہ کہلاتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارا اعمال نامہ تمہاری گردن میں لٹکا ہوا ہے، آج لپٹا ہوا ہے، ظہورِ نتائج کے وقت یہ کتـابًا یلقهُ منشورًا (17:13) ہو جائے گی یعنی کھول کے سامنے آ جائے گی، تم سے کہا جائے گا اقـراء کتٰبك (17:14) اپنا اعمال نامہ آپ پڑھ آج تو خود اپنے لیے کـفـی بـنـفسیك الیومَ علیك حسیبـاً (17:14) حساب کرنے کے لیے محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ باتی ساری انسان کی اپنی ذات کی ہے یہی کـرامًـا کـاتبیـن (82:11) ہیں جو اس کے اوپر ہیں یہی اس کے اعمال نامے ہیں یہی وہ نگاہیں ہیں جسے خدا کی کہا گیا ہے کہ کوئی شے بچ نہیں سکتی، انسان کا کوئی عمل نیت ارادے تک بھی اپنا اثر پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس میں CAPTURE ہوتا رہتا ہے۔ اس کا ایک پروسیس یہ ہے کہ آہستہ آہستہ آہستہ اس میں ACCUMULATIVE EFFECT (مجموعی اثر) پیدا ہوتا رہتا ہے، وہ چیز جمع ہوتی رہتی ہے جسے وہ ثقلِ موازنہ اور خفتِ موازنہ، کہتا ہے، یعنی پلڑے کا جھکنا پلڑے کا اٹھنا۔ دونوں پلڑوں میں یہ پرچیاں پڑتی چلی جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری ہے تو تباہی ابھی نہیں آتی اگر یہ دوسری طرف پرچیاں زیادہ پڑتی چلی گئی، میں استعارتاً بیان کر رہا ہوں نا اور اگر وہ جھک گیا تو تباہی آ گئی۔ عزیزانِ من! یہ ہیں اعمال نامے، یہ ہیں اس کی کتابیں، یہ ہیں ظہورِ نتائج یہ ہے جنت اور یہ ہے جہنم، اس دنیا میں بھی، مرنے کے بعد بھی انسان بچ نہیں سکتا کہ خودکشی کر لوں تو معاملہ ختم ہو جائے گا، اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ انسان کی ذات اس کے جسم کے ختم ہونے کے بعد باقی رہتی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا، یہ نہیں مر سکتی، تیرا جسم مر جائے گا۔ تو یہ ہے جو تیری ذات ہے، باقی سب کچھ تیرا ہے یہ تو آگے چلا جائے گا خود اپنا اعمال نامہ بن کر۔ ان تبدو ا مـافـی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ (2:284) اور یہ کون کرتا ہے اتنا نظام کا خیال اور ارادہ تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کرے؟

اس ارض وسما کو تخلیق کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل وزن کئے بغیر نہ رہ جائے

عزیزانِ من! یہ تو مکافاتِ عمل کا بہت بڑا موضوع ہے لیکن یہاں تو سرِ دست صرف ایک آیت ہی اپنے سامنے رکھیے یہ بری عظیم آیت ہے و خلق اللہ السمٰوٰت الارض بالحق و لتجزٰی کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون (45:22) سارا تخلیقِ ارض وسما' یہ کارگہٗ کائنات' حق کے ساتھ ہم نے تخلیق کیا ہے ایک تو یہ ہے کہ اس کو بالحق تخلیق کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کاہے کے لیے؟ لتجزٰی کل نفس بما کسبت (145:22) تا کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا نتیجہ مل کر رہے۔ عزیزانِ من! یہ کارگہٗ کائنات اس لیے سرگرم عمل ہے انسان کہاں بچ کر چلا جائے گا؟ اس کے الفاظ میں یحاسبکم به الله (2:284) لہٰذا کیا یہ کمکپا دینے والی بات ہے؟ کہا کہ ڈرنے والی بات نہیں ہے فیغفر لمن یشأ و یعذب من یشأ ء (2:284) تم میں سے جو چاہتا ہے اس تباہیوں سے بچنا بچ سکتا ہے' جو تباہ ہونا چاہتا ہے تباہ ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یونہی یہ کارگہ کائنات چل رہا ہے جو سامنے آیا پیس کر رکھ دیا۔ جو حفاظت کا سامان اپنے لیے مہیا کرنا چاہتا ہے وہ محفوظ رہے گا' جو تباہ ہو جانا چاہتا ہے تباہ ہو جائے گا۔ و اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر (2:284) ہم نے تو ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔ اندازے بنا دیئے ہیں ان پیمانوں کے اوپر کنٹرول ہمارا ہے۔ یہ ہوگا کیسے؟ انسانی معاشرے کے اندر' ہر شخص کا عمل نتیجہ خیز کیسے ہوگا؟ ایک معاشرہ ہے جس معاشرہ کی بنیاد ہے۔

اس ضابطہ حیات پر خدا کا رسول سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے

عزیزانِ من! عظیم چیزیں آ رہی ہیں۔ کہا ہے کہ اٰمن الرول بما انزل الیه من ربه و المئومنون (2:285) رسول پر جو خدا نے نازل کیا ہے رسول اس پر خود ایمان لاتا ہے۔ یہ بڑی گہری چیز ہے۔ جو چیز کسی شخص کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ اس پر ایمان لاتا ہے' اس کو صحیح سمجھ کر اس کی صداقت پر ایمان لاتا ہے' وہ تو تخلیق ہی اس کی اپنی ہوتی ہے۔ وحی جسے آپ کہتے ہیں کہ یہ رسول کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتی' یہ خالص OBJECTIVE TRUTH (معروضی صداقت) ہوتا ہے۔ باہر سے خارج سے' اس کو دیا جات ہے' اس کا نزول ہوتا ہے۔ رسول پر وحی نازل ہوئی' اس کو مل گیا' اس کے بعد اب آگے کیا بات ہے؟ اس نے اس وحی کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے کہ اس کو پرکھ لو اس کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ یہ کام رسول پہلے خود کرتا ہے۔ قرآن عجیب چیز کہہ رہا ہے کہ جس رسول نے آگے دنیا کو دیا ہے وہ رسول پہلے اپنی اس وحی پر خود ایمان لاتا ہے' اس کی صداقتوں کے اوپر ایمان لاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وحی حاصل ہو جانے کے بعد کس طرح سے رسول کو قرآنِ کریم عام سطح پر لے آتا ہے۔ کہتا ہے کہ انما انا بشر مثلکم (41:61) کیونکہ ہر بشر کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود ایمان لائے' رسول سب سے پہلے یہ کرتا ہے اس کے اوپر خود ایمان لاتا ہے ولموء منون اور پھر باقی مومن ایمان لائیں۔ کل اٰمن بالله و ملئته و کتبه و رسوله (2:285) یہ تمام

ان میں سے مومن، رسول سمیت اللہ پر ایمان لاتے ہیں، ملائکہ پر ایمان لاتے ہیں، کتابوں پر ایمان لاتے ہیں، رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ موضوع آگے چل کر میرے سامنے آئے گا یہ ایمان کے پانچ اجزا کہے جاتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان کے معنی کیا ہیں؟ کیا ہوتا ہے ان پہ ایمان لانے سے؟ کیا ہوتا ہے ان کے انکار کرنے سے۔ یہ موضوع آجائے گا ہے ایک درس کا یا بعد میں چل کے دوتین درسوں کا ۔میں اس وقت آگے بڑھ جاتا ہوں۔

مذاہت عالم کے تمام بزرگوں کی تعظیم کرنا ہر مسلمان کا فرضِ اولین ہے

کہا ہے کہ نانفرق بین احد من رسله (2:285) یہ عظیم آیت ہے۔ کہا یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آیا، ہر بستی میں نبی آیا، بعض کا ہم نے ذکر کیا، باقیوں کا ذکر نہیں کیا، تم نے مجملاً ہر ایک کے اوپر ایمان لانا ہے۔ جو قوم اپنے میں سے کسی بڑے بزرگ کو کہے کہ ہمارے ہاں کے مذہب کا بانی ہے، کہو کہ ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہو۔ اور یہ مان، یہ کس حیثیت سے مان لوگے؟ لا نفرق بین احد من رسله (2:285) ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ کتنی بڑی TOLERANCE ہے! TOLERANCE تو ایک INDIFFERENT ہونے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ مثبت طور پر تمام مذاہبِ عالم کے بڑے بڑے اسلاف اور بزرگوں کی تعظیم کرنا قرآن سکھاتا ہے۔ تم تو ان میں سے کیس کے حق میں بھی گستاخی کا کلمہ نہیں کہہ سکتے، ہم تو اس کے رسول ہونے پر ایمان لانے کے لیے مکلّف مجملاً سہی۔ اور ایمان ایسا کہ ہم فرق نہیں کر سکتے اس میں اور دوسرے رسولوں کے اندر۔ یہ ایمان ہے۔

ایمان لانے کے بعد کرنے کچھ فرائض کی پابندی اور ان کی وجاھات

ایمان لے آؤ پھر اس کے بعد ٹھیک ہے۔ تو کیا اب راوی عیش لکھتا ہے؟ نہیں قالوا ایمان لے آنے کے بعد اب کہتا ہے کہ ہمارا یہ مسلک شروع ہوگا کہ قالوا سمعنا (2:285) کہو اس رسول سے کہ ہم نے یہ سن لیا۔ سون لینے کے بعد پھیر کیا کیا؟ پھر یہ کہہ دیا کہ ''ایہہ اثواب فلاں نے نوں پہنچا دتا جائے؟[1]'' نہیں بلکہ سمعنا و اطعنا (2:285) ہم نے سنا، لیجیے ہم اطاعت کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! اب ایمان کی تکمیل ہوتی ہے یہ سمعنا و اطعنا غفرانك ربنا و اليك المصير (2:285) دنیا کے ہر شر سے، دنیا کی ہر تخریبی قوت سے، اگر پناہ مل سکتی ہے تو اسی حصار میں مل سکتی ہے۔ اے میرے رب! کہ یہ ایمان ہو، یہ عمل ہو، یہ نظام بنے، اس نظام کا اولین مرکز خود رسول کی ذاتِ اقدس ﷺ ہو، اس کی بات سنو اور اس کے بعد آپ سر جھکا دیں: اطعنا (2:285) کہا کہ یہ احکام یہ قوانین یہ ضوابط جو تمہیں دیئے گئے ہیں، ہوسکتا ہے کہ بعض طبائع پر یہ ہو کہ صاحب! کچھ پابندیاں سخت سی ہیں، پہلہ چیز پابندیاں عائد ہی

کیوں کی گئی ہیں، ہونی ہی نہیں چاہیے۔ لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (2:286) یہاں بھی ایک معنی غلط لیے جاتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خدا کسی شخص کے مکلّف نہیں ٹھہراتا، پابند نہیں بناتا، اس کی کوئی ایسی RESPONSIBILITY (ذمہ داری) عائد نہیں کرتا ق الا وسعھا (2:286) جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔ اب وسعت کی بات اگر ہر شخص پر چھوڑ دی جائے تو وہ تو لاکھوں روپے رکھ کر زیادہ سے زیادہ فقیر کو ایک پیسہ دے گا وہ کہے گا کہ اور دے وہ کہے گا ''اسی اینے جوگے ای ہیگے آں بابا[1]''۔ وسعت خود اگر آدمی نے آپ ہی معین کرنی ہو تو پھر تو آپ سچ سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ لیے جاتے ہیں۔ ذرا سا کام کیا اور اس کے بعد کہا کہ لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (2:286)۔ ابھی تو یہی چیز نہیں ہے لیکن معنی تو اس کے اور ہی ہیں۔

---

(1) اس کا ثواب فلاں کو پہنچا دیا جائے۔

(1) اوردو۔ وہ کہے گا کہ بابا! بس یہی ہماری بساط ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں ذات انسانی میں وسعت پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں

ارشاد ہے کہ یہ جو پابندیاں تمہیں نظر آتی ہیں، ان پابندیوں سے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جو تمہاری ذات ہے، وہ محدود ہو جائے گا وہ گھٹ جائے گی۔ ادھر اُدھر سے جو ہم نے چاردیواریاں کھینچیں، پابندیاں عائد کر دیں، قیود حدود لاگو کر دیں، یہ نہیں، یہ بات نہیں ہے یہ جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، اس لیے الا وسعھا ان سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہوگی۔ ''می شود از جبر پیدا اختیار'' عزیزانِ من! ایک ڈسپلن کے اندر علکھنے سے صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ پانی پہاڑوں سے جو آتا ہے اس کو CHANNELIZE کیا جاتا ہے، اسے دریا یا نہر یا ندی کہتے ہیں، وہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ اس کو بے باک چھوڑ دیا جائے تو وہ سیلاب بن جاتا ہے۔ یہ جتنی حدود مقرر کی ہیں، قرآن نے کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کی پابندی کرتے چلے جاؤ تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ نیکی کے لیے تو لفظ ہی خیر ہے۔ عربی زبان میں ''خیر اور اختیار'' کا تو مادہ ہی ایک ہے۔ جتنے خیر کرتے چلے جاؤ، اختیارات کی وسعتیں بڑھتی چلی جائیں۔ ان پابندیوں کی جس قدر اطاعت کرتے چلے جاؤ، اتنی ہی تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی چلے جائے۔ لہٰذا انہیں کسی مستبد حاکم کی طرف سے، ڈکٹیٹر کی طرف سے، عائد کردہ جکڑ بندیاں نہ تصور کرو۔ لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (2:286) خدا جو تم پر یہ حدود و قیود عائد کرتے ہے تو یہ اس لیے عائد کرتے ہے کہ اس سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (2:286) ذات کے متعلق ہمارا قانون یہ ہے کہ وہ جو چیز غلط کرتی ہے، اس کا نقصان بھی اسے ہی اٹھانا پڑتا ہے، جو صحیح کام کرتی ہے اس کا فائدہ بھی اسی کو پہنچتا ہے۔ یہ پابندیاں اس لیے ہیں کہ وہ صحیح کام کرے، صحیح چینل کے اندر رہے، اس سے

اس کا فائدہ ہوگا' فائدہ ہوگا تو وسعت ہوگی۔

لفظ کسب اور اکتسب میں فرق اور پھر اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! پھر دو الفاظ ہیں' ان پر غور کیجیے: لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (2:286) مادہ دونوں کسبت اور اکتسبت کا ک س ب ہے ایک ہی مادہ ہے' عربی زبان ہے' باب بدل جانے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ سنیے اور جھوم جائیے! لھا ما کسبت لھا آیا ہے عربی زبان میں جو ل آتا ہے وہ عام طور پر فائدے کے لیے آتا ہے اسے ''ل'' نافع کہتے ہیں۔ علیھا آتا ہے کسی کے خلاف کوئی بات جو جائی ہے' اس کے لیے آتا ہے۔ لھا اس ذاکت کے لیے فائدکن چیزوں میں ہے؟ کسب اور اکتسب' کسب کے معنی ہوتے ہے وہ کام جو اپنی خاطر اور دوسروں کی خاطر مشترکہ کیا جائے' ذات کو فائدہ پہنچتا ہے' ان کاموں سے وہ جو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اکٹھا کر کے کرتی ہے' اپنا بھی فائدہ' دوسروں کا بھی فائدہ۔ اور اکتسب کے معنی ہوتا ہے ''وہ کام جو صرف اپنے فائدے کے لیے کیا جائے''۔ علیھا ما اکتسبت (2:286) جس میں باقی نوعِ انسانی کا فائدہ بھلا کر اپنی ہی ذات کے فائدے کے لیے کرتے ہو' اس کا تمہیں نقصان پہنچتا ہے اور جو کام ایسا کرتے ہو کہ میرا بھی بھلا اور دوسروں کا بھی بھلا' اس کا فائدہ تمہیں پہنچتا ہے۔ کسب اور اس کتسب کے اندر' دو باب بدل گئے۔ قرآنِ کریم میں دو عظیم اصول سامنے پیش کردیئے وامامایںفع الناس فیمکث فی الارض (13:17) بقا اسی کے لیے ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہے۔ اس کے لیے VERB (فعل) اسی مادے سے کسب کے اوپر آئے گا۔ اور جس میں صرف اپنا فائدہ ہو' اس کے لیے اکتسب آتا ہے۔ جو کام ایسے کرو جس میں تمہارا بھی بھلا ہو' دوسروں کا بھی بھلا ہو' اس کا فائدہ تمہیں ہوگا جو صرف اپنی ہی ذات کے لیے کرتے ہو یاد رکھو! اس کا نقصان تمہیں اٹھانا ہوگا۔ کہا کہ یہ ایک معاشرہ قائم کرو' اس معاشرے میں کام کرنے والے چلے جارہے ہیں' قدم جانبِ منزل اٹھ رہے ہیں' خدا کی طرف سے منزل کا تعین ہوگیا ہے' قافلے کی شکل میں جارہے ہیں۔

دل کے ارادے کے ساتھ کسی عمل کے کرنے اور کہیں کوئی لغزش کے سرزد ہونے میں بنیادی فرق ہے

ٹھیک ہے کہیں لغزش بھی ہوجاتی ہے' کہیں سہو بھی ہوجاتا ہے' کہیں نسیان بھی ہوجاتی ہے' آرزوئیں دل میں مچلتی ہیں کہ ربنا (2:286) اے کہ جس نے ہماری ذات کی نشو ونما کا ذکہ لے رکھا ہے! ہماری آرزو یہ ہے کہ لغزش ہوگی' خطا بھی کہیں ہوگی اس لیے لا تئو اخذنا ان نسینا او اخطنا (2:286) دل اگر ارادوں سے اگر کہیں کوئی چیز ہم جرم کی کریں تو یہ ٹھیک ہے' اس کی تو گرفت ہونی چاہیے' یونہی کہیں پاؤں میں لغزش آجائے' بھول جائیں' نشانہ خطا ہوجائے' اس پر یہ چیز نہیں ہونی چاہیے ہماری آرزو یہ ہے عزیزانِ

من! سب سے بڑی چیز اس میں بھی وہی چیز آئی جو میں کہا کرتا ہوں کہ جونہی انسان اپنی کسی غلطی کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرا کر آدم کی سنت کے اتباع میں اعتراف کر لیتا ہے' اور کہتا ہے کہ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم ترحمنا و لنکوننا من الخسرین (7:23) ہاں! میں نے اپنے آپ پر زیاتی کی ہے۔

اعتراف جرم کئے بغیر اصلاح کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا

عزیزانِ من! جونہی اس چیز کا اعتراف کیا میں اپنی اس غلطی کا ذمہ دار ہوں تو اصلاح ہو گئی آپ کی۔ اس جونہی ابلیس کی طرح یہ کہا کہ میں ذمہ دار ہوں' تُو نے مجھے گمراہ کرایا ہے' کہا کہ قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے جسے کہتے ہیں کہ ابلیس مردود ہو گیا۔ مردود ہو گیا یہ تھوڑا ہے کہ ''اوہناں نے کہیا چوکیدا نوں کڈ دیو باہر اینوں[1]'' اس ذہنیت کی اصلاح نہیں ہو سکتی' اصلح اس ذہنیت کی ہوتی ہے جو اس چیز کا اعتراف کرے کہ میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں۔ یہاں اسی شدتِ آرزو کا اظہار ہے۔

---

(1) انہوں نے چوکیدار سے کہا کہ انہیں نکال باہر کرو۔

شدت ارزو کا دوسرا نام دعا ہے نیز لاتُحَمِّل کا لغوی مفہوم

عزیزانِ من! جب آرزوئیں شدت اختیار کر کے بے ساختہ زبان پر آجاتی ہیں تو اسے دعا کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ ربنا لا تئو اخذنا ان نسینا او اخطنا ربان و لا تحمل علینا اصرًا کما حملته علی الذین من قبلنا (2:286)۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصد یہ بتا تا گیا ہے کہ ویضع عنهم اصرهم و لا غللتی کان علیهم (7:157) یہ اس لیے آیا ہے کہ نوعِ انسانی نے اپنے آپ کو جن زنجیروں میں جکڑ لیا ہے' ان کو توڑ دے' جن بوجھل سلوں کو اپنے سر کے اوپر رکھ لیا ہے' ان کو اتار کر پھینک کے۔ آرزو یہ ہے کہ ہاں! باقی قوموں نے جو اپنے آپ کو جن خود ساختہ جکڑ بندیوں میں جکڑ لیا تھا اور جن سلوں کے نیچے اپنے آپ کو دبا دیا تھا' کہ ہماری آرزو ہماری یہ ہے کہ ہماری یہ حالت نہ ہو جائے۔ یہ جو لا تحمل (2:286) اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تُو ہمارے سر کے اوپر ایسی سل نہ رکھ دینا' دیکھنا کہیں ''مرجاوں گے اسی[1]'' یہ نہیں ہے' تم نے کہیں ایسا نہ کر دینا بلکہ یہ آرزو ہے ہے' ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو جائے جو پہلی قوموں کے ساتھ ہوا۔ تیرے دین نے' تیرے نظام نے' جو بھی پابندیاں عائد کی تھیں' وہ ذات کی وسعت کے لیے تھیں۔ انسانوں نے پھر خود ساختہ پابندیاں عائد کیں۔ یہ انسانوں کی خود ساختہ عقیدت مندیاں' ارادت مندیاں ہیں ان کا خوف ہے' ان کا ڈر سر پر سوا ہے' یہ رسول' یہ قیود یہ آپ کے ہاں کی خود ساختہ شریعتیں' قدم قدم کے اوپر جکڑی پابندیاں ہیں' انسانیت ایک قدم بھی اپنی آزادی سے نہیں چل سکتی۔ کہا کہ ہماری آرسو یہ ہے کہ ہم ایسے نہ ہو جائیں۔ ربنا و لا تحملنا

مـالا طـاقة به (2:286) اس کا بھی ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ یا اللہ! جس کی ہم میں طاقت نہیں ہے کہیں وہ بوجھ ہمارے اوپر نہ لاد دینا۔ یعنی اگر کہیں یہ نہ کہ اتو وہ لادے گا' وہ مرجائیں گے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ وہی ہے جو پہلی سورۃ الفاتحہ میں بھی غلط ترجمہ ہو کرتا ہے کہا تھا کہ صراط الذین انعمت علیھم (1:6) دکھا ہم کو سیدھی راہ' ان کی جن کے اوپر تو نے انعام کیا۔ غیر المغضوب الیھم و الضألیں (1:7) (1) ان کی راہ نہ دکھا دینا جن پر تُو نے غضب کیا تھا۔ یعنی گویا وہ بھی یہ دکھایا کرتا ہے'' کہیا کہ جی ساہڈے نال نہ اے کر دینا' ایناں نال تے تسی او کیتا ہیگا سی نا(2)''۔ ذرا سا غلط ترجمہ کہاں لے جاتا ہے! صراطِ مستقیم ان کی راہ ہے کہ جو تمہاری انعامات عافتہ قومیں ہیں' وہ ان کی راہ نہیں ہے کہ جن کے اعمال جھلس گئے اور جو CONFUSION کی وادیوں کے اندر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ ہے ترجمہ۔ یہاں بھی یہ چیز آئی کہ ولا تـحملنا مالا طاقته لنا به (2:286) یہ نہیں کہ وہ بوجھ نہ ہمارے سروں پر ڈال دینا کہ جن کے برداشت کرنے کی طاقت ہم مین نہ ہو۔ کہا یہ ہے کہ جو بھی یہ بوجھ آتے ہیں' ان کے اٹھانے کی طاقت عطا کرتے چلے جانا' یہ نہ ہو کہ جو نظام کی پابندیاں آتی ہیں' ان پابندیوں کے اٹھانے کی ہم میں اتنی طاقت نہ ہو۔ ادھر سے پابندی آئے' ادھر سے طاقت ہو۔

---

(1) ہم مرجائیں گے۔

(2) کہا کہ جی! ہمارے ساتھ یہ نہ کر دینا ان کے ساتھ تو آپ نے کیا ہی تھا۔

کوئی معاشرہ بھی حقوق اور ذمہ داریوں کے توازن کے بغیر استحقام پر ہیزی حاصل نہیں کرسکتا

عزیزانِ من! RIGHTS & ABLIGATIONS 'حقوق اور ذمہ داریاں' ان دو چیزوں میں' اگر توازن رہے' معاشرہ صحیح رہتا ہے۔ غلط معاشرے میں مستبد حاکم' کے حقوق ہی حقوق ہوتے ہیں' جو ماتحت ہوتے ہیں ان کی سب ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس استبدادی معاشرے کا ردِعمل ہمارے ہاں اب یہ ہوا کہ یہ جو نیچے والے تھا' یہ اپنے حقوق حقوق مانگتے چلے جارہے ہیں' اب ان کی ذمہ داری کوئی نہیں ہو رہی۔ آپ دیکھیے جو DEMANS آتی ہیں یہ تنخواہ مقرر ہو جانی چاہیئے' یہ الاؤنس ملنا چاہیئے' یہ اس قسم کا میڈیکل فری ہونی چاہیئے' تمہارے ہاں یہ ہونا چاہیئے' یہ وہنا چاہیے یہ سب حقوق ہیں۔ ان میں کہیں بھی یہ نہیں کھا ہوتا کہ ہم اس کے مقابلے میں یہ ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کرتے ہیں' ہم یہ کریں گے۔

مزدور کا مزدوری لیتے وقت اور آجر کا مزدوری دیتے وقت رعونت اور محتاجی کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے

میں کہہ یہ رہا ہوں کہ میں ان کو قصوروار نہیں ٹھہراتا' ردِعمل ہمیشہ EXTREME (انتہا) پر ہوتا ہے۔ مستبد نظام جو دنیا میں چلا آرہا ہے جتنے بھی مستبد اوپر صاحب قوت تھے انہوں نے ہمیشہ اپنے حقوق گنائے ہیں DIVINE RIGHTS OF THE KING

آئے ہیں اَن داتا' ہوَنا آیا ہے' مزدور کو مزدوری دیتا ہے تو مزدور اپنا حق سمجھ کے نہیں مانگ سکتا۔ سارا دن کام کر کے باہر ایک کونے میں جھکا ہوا کھڑا ہوتا ہے کہ جی! میں صاحب سے کہتا ہے میں نے کام کیا ہے پیسے دو۔ اس وقت نہ کہنا' میاں صاحب' دیکھتے نہیں ہو حقہ پر رہے ہیں ''ہجے نہ کہیں اوئے مزاج ٹھیک نئیں ہیگا[1]'' ۔یعنی کانپ رہا ہے' غریب سارا دن محنت کر کے اپنا حق لینے کے لیے۔EXTREME END ہے دوسری طرف آیا یہ کہا کہ روز کے حساب سے تمہیں پانچ روپے دینے پڑیں' کہیں نہیں کہا کہ اس کے معاوضے میں مجھے یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ جو ذمہ داری ہوَاس کو اٹھانے کے لیے' اس کو برداشت کرنے کے لیے' اتنی ہی ہمت کی توفیق بھی عطا فرما دے تا کہ دونوں چیزیں متوازی چلتی رہیں۔

---

(1) ابھی نہیں کہنا۔ ارے! ان کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔

آخر انسان غلطیوں کا ازالہ کیونکر کیا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! قرآن تو پوچھو نہیں کیا کیا چیزیں ضمناً کہہ جاتا ہے۔ کہا کہ و اعف عنا و اغفرلنا و راحمان(2:286) ۔یہاں پھر وہ چیز غلط مفہوم سے آئے گی کہ ہمیں معاف کر دینا' ہمیں بخش دینا' ہم پر رحم کرنا۔ یہ کیا کہا جا رہا ہے؟ یہ تو اسی کی تفسیر کہی جا رہی ہے جو توفیق مانگی تھی۔ کیا توفیق مانگی تھی؟ غلطیاں ہو جائیں گی' پھر کیا کیا جائے؟ ان الحسنات یذھبن السیاٰت (11:114) یاد رکھو! ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں' مایوس نہ ہو' اتنی ہمواریاں اور اتنے تعمیری کام کرو کہ ان کا جو تعمیری نتیجہ ہے' اس تخریبی نتیجے کو ڈھانپ لے ۔تھرڈ کوارٹر کے اند تمہارے بہت کم نمبر آئے تھے' فیل بھی ہو گئے تھے' تین مہینے ابھی باقی ہیں' اتنی محنت کرو کہ سالانہ میں اتنے نمبر آئیں جو پچھلے تین کوارٹرز کے جو تمہارے DEFECT تھے' ان کو بھی وہ پورا کر کے آگے چلے جائے۔ واعف عنا (2:286) یہ آگے بڑھ جانے والی بات ہے۔ یاد رکھو! سیاٰت صرف حسنات سے دور ہوتی ہیں' محض دعائیں مانگنے سے نہیں ہوتیں۔ سیاٰت ایک عمل تھا' جو تم نے کیا ہے' اس عمل کو RECTIFY کرنا ہے' عمل سے کیا جائے گا۔ عام عمل تو غلط کرے ہوَاس کے جو بُرے نتائج ہیں' ان سے بچنے کے لیے محض دعائیں مانگتے ہو۔ دعا بھی وہ ہے جو تسبیح والی ہے۔ کہا کہ استغفر اللہ ابی من کل ذنب و اتوبوا علیہ چلا جا رہا ہے بازار میں سارا کچھ ''بیاج دے پیسے اگر ان دیا اے ہٹیوں ہٹیوں'' یہ ہم نے خود ایک بہت بڑے مولوی صاحب کو دیکھا ہے اور وہ تسبیح جو ہے' ساتھ چل رہی ہے اس استغفر اللہ ابی من کل ذنب و اتوبوا علیہ کہے جا رہا ہے

سیات کو صرف حسنات سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے دعائیں مانگنے سے نہیں

عزیزانِ من! غلط کام کیا جاتا ہے' اس کے غلط نتائج سے بچنے کے لیے اچھا کام کیا جائے گا یہ ہے ان الحسنات یذھبن

السیات ۔ وارحمنا (2:286) رحم کے معنی MERCY نہیں ہیں، رحم کے معنی وہ مرہم ہے، جو جلے ہوئے کا علاج ہوتا ہے۔ جہاں بھی اپنی غلط روش سے ایسی کوئی چیز آ جائے، اس کے لیے خدا نے اس کا ANTIDOTE بنا دیا ہوا ہے، یہ خدا کی طرف سے ANTIDOTE مل جانا، یہ ہے اس کی رحمت۔

مولٰنا کا لفظ بڑا ہی عظیم لفظ ہے جو صرف خدا تعالٰی کی ذات کے لیے ہی مختص ہے

آگے کہا کہ انست مولٰنا (2:286) یہ مولا کا بڑا عظیم لفظ ہے انست مولٰنا (2:286) کارساز، کارفرما، سرپرست، ان تمام چیزوں کے لیے صحیح قانون دینے والا، پھر اتنی بری قوتوں کا مالک کہ ہر قانون اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس قسم کا وہ سرپرست، اس قسم کا کارساز، اس قسم کا دوست ہے۔ یاد رکھیے! قرآن کریم نے صرف خدا کو مولٰنا کہا ہے۔ اس کے بعد تو آپ کو معلوم ہے مولٰنا ''پھر اوآ کے مولا نا ہو گیا[1]'' یہ وہی ہے اور پھر آپ کو پتہ ہے یہ کیا ہو گیا۔ مولا کتنی بڑی چیز تھی۔ یاد رکھیے! مولنا خدا نے اپنے آپ کو کہا ہے، ہمیں سکھایا ہے یہ کہو کہ انت مولنا (2:286) کوئی اور مولنا نہیں ہو سکتا ۔ کسی اور کو بھی اگر آپ نے یہ کہا ہے مولنا شرک ہو جائے گا، خدا کے ساتھ اور مولا اپنے لیے تجویز کر لو گے۔ لیکن تم کیوں کہ کہنے سے کون سی بات ہو جاتی ہے؟ اس کو تم ہم نے مولا رکھا ہی نہیں ہے، مولا تو ہمارے ہاں او ہی بنے ہوئے ہیں، قدم قدم کے اوپر آقا ہمارے بنے ہوئے ہیں صاحب! تو زبان سے کہہ لینے سے کیا ہو جائے۔

---

(1) پھر وہ آ کر مولا نا ہو گیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لٰہذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)